قومی زبان

کراچی

انجمن ترقی اردو

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

قومی زبان

جلد ۳۲ [illegible] شمارہ ۱

جنوری سنہ ۱۹۶۸ء

انجمن ترقی اُردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

ت: فی پرچہ ایک روپیہ

قیمت: سالانہ دس روپے

زیر تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات

اب تک زیر تعمیر اردو کالج کے لئے مبلغ دو لاکھ پندرہ ہزار چار سو پچپن روپے اٹھاسی پیسے (۲،۱۵،۴۵۵ و ۸۸) جمع ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ماہ جو رقوم موصول ہوئی ہیں انکی تفصیل یہ ہے:

عطیات

۱۔ کراچی میونسپل کارپوریشن	مبلغ پندرہ ہزار روپے
۲۔ راتا ٹریکیٹر اینڈ ایکوپمنٹ لمیٹڈ لاہور	مبلغ چار ہزار روپے
۳۔ علی آٹوموبائلز۔ کراچی	مبلغ دو ہزار روپے
۴۔ نمکو لمیٹڈ۔ کراچی	مبلغ دو ہزار روپے
۵۔ سسٹر کرسٹین، ہیڈ مسٹریس آور لیڈی فاطمہ اسکول۔ کراچی	مبلغ پانچ سو روپے
۶۔ بیگم مریم عباسی صاحبہ۔ کراچی	مبلغ دو سو اکیاون روپے
۷۔ انٹرنیشنل اسٹیل اینڈ جنرل ایجنسیز۔ لاہور	مبلغ ایک سو روپے

رسائد کی فروخت سے مندرجہ ذیل حضرات اور اداروں نے رقوم جمع کرائیں۔

۱۔ جناب ایم منظفر احمد صاحب ایڈیشنل ڈائریکٹر آف انڈسٹریز، کراچی	مبلغ ایک ہزار ایک سو روپے
۲۔ جناب حامد حسین پانی والا صاحب	مبلغ تین سو انتالیس روپے
۳۔ جناب ایس جی محبوب علی صاحب ریجنل الیکشن کمشنر۔ ڈھاکا۔	مبلغ اکتیس روپے ستر پیسے
۴۔ جناب ظفر الحسن صاحب ریجنل الیکشن کمشنر۔ کراچی	مبلغ تیس روپے

فہرست

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

پروفیسر حمید احمد خاں
وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

اُردو ذریعۂ تعلیم

ہر تمدن اپنے عہد کی تہذیب کا پرتو اور ہر تہذیب اپنے عہد کے تمدنی مظاہر کا عکس ہے جو آبادیاں بجلی کی روشنی کی فراوانی سے رفتہ رفتہ نور بن گئی ہیں وہ دن کے جلسوں کی بجائے رات کی تقریبات پر اصرار کرتی ہیں اور صبح خیزی ان کی خصوصیت نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ ایک خاص قسم کا تمدن ایک خاص قسم کی شخصی عادت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح کلائی کی گھڑی اور موٹر اور ہوائی جہاز کے تمدن نے ہمیں ادائے فرائض کی بجا آوری میں بھی وقت کی پابندی کا عذاب ناک تصور دیا اور ساتھ ہی اس تصور کے مبرم تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا کی۔ الغرض یہ بالکل ظاہر ہے کہ تہذیب اور تمدن ایک دوسرے کو بے شمار معلوم و نامعلوم طریقوں سے متاثر کرتے ہیں۔

میں اس عام عمرانی اصول کی روشنی میں اپنے مطلب کا ایک نکتہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ گذشتہ ڈھائی تین سو برس کی تاریخ نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ اپنی تہذیبی روایات کو قائم رکھنے کے لئے ہمیں ایک کارگر، کارکشا اور توانا تمدن کی ضرورت ہے زندگی کے وہ سب ہنگامے جو شمع و شراب و شیرینی سے لے کر سحر خیزی و تہجد گزاری تک پھیلے ہوئے ہیں، اگر برپا ہوتے ہیں تو کسی تنومند اور سازگار تمدن کی قوت ایجاد کا سہارا لے کر۔ تاریخ کے طالب علم پر یہ نکتہ بالکل واضح ہے کہ جن تہذیبی قدروں کو کسی زندہ تمدن کا سہارا میسر نہ رہے۔ انہیں اپنا وجود قائم رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ تہذیب ایک نازک پودا ہے جس کی زندگی کی شرط یہ ہے کہ اس کی جڑیں کسی مضبوط زمین میں پیوست ہوں۔ اٹھارہویں صدی میں یورپ کا صنعتی انقلاب ایک نئی معیشت اور اس معیشت کے نئے معاشرتی لوازم اپنے ساتھ لایا۔ گویا صنعتی تمدن کے ساتھ صنعتی دور کی نئی تہذیب بھی جلوہ گر ہوئی۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ صنعتی انقلاب کے باوجود یورپ کی قدیم تہذیبی روایات اور مقامی ضروریات نے قدم قدم پر یورپی سائنس کے اکتشافات کا رُخ مقرر کیا۔ اس طریق کار کی کئی چھوٹی بڑی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ عمارتوں کی مرکزی حرارت کاری سے لے کر خاص خاص امراض کے جراثیم کی دریافت اور ان کے علاج تک نشاط زندگی کے مخصوص ذرائع کی پیدائش سے لے کر پورے نظام سرمایہ داری کے قیام تک اور پھر

اقامتی اُردو کالج

کی

تعمیر میں حصہ لیجئے

اُردو آپ کی

اردو کالج آپ کا

اس کالج کی زیرِ تعمیر عمارت میں ایک اینٹ آپ بھی رکھئے

اختر حسین (ہلالِ پاکستان)
صدر انجمن ترقی اُردو

اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ ہمیں اپنے میدانوں اور کوہساروں کو کرید کر اپنے دریاؤں اور سمندروں کو کھنگال کر اپنی قومی ضروریات پوری کرنی ہیں ہمارا دائرہ کار نہ برطانیہ ہے نہ امریکہ، ہماری سائنسی تحقیقات کا موضوع کسی نہ کسی طرح پاکستانی معیشت، پاکستانی معاشرت پاکستانی جغرافیہ پاکستانی تاریخ سے جا ملے گا۔ اور جا ملنا چاہیئے۔ جس طرح ہر ملک کا سائنس داں اپنی ایجاد و اختراع کے ذریعہ سے اپنی قوم کے تمدن کا خالق ہوتا ہے۔ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ پاکستانی سائنسداں اسی طرح ایک پاکستانی تمدن کی بنیاد نہ رکھے۔ اسی قسم کے جدید قومی تمدن کی تخلیق میں پاکستانی تہذیب کی بقا کا راز مضمر ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے بیشتر سائنسی مفکرین بتدریج سائنٹفک سوسائٹی کی تحریک سے وابستہ ہو رہے ہیں اور اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اپنا کھانا پرائی ہنڈیا میں پکانا ایک سعی لاحاصل ہے۔ سائنس داں بھی خواہ کتنا ہی بڑا موجد اور خلاق کیوں نہ ہو اپنے ذہن کی مدد سے سوچتا ہے۔ ذہن خواہ ایک سائنس داں کا ہو یا ایک عام آدمی کا، اس کی بنیادی خاصیت یہ ہے کہ حسّی تصویروں سے کہیں زیادہ لفظوں کی مدد سے کام کرتا ہے اور کن لفظوں کی مدد سے؟ بالعموم انہیں لفظوں کی مدد سے جنہیں اس کی اپنی تہذیب کی زبان اس کی سوچ کی زنجیریں بے تکلف گوندھتی چلی جاتی ہے جہاں تکلف کا ذرا سا روڑا راہ میں آیا وہیں اس کے سوچ نے ٹھوکر کھائی۔ دوسرے کی زبان میں سوچنا ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسرے کے ذہن سے سوچنا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر زبانوں میں ہماری ذہنی کاوشیں بالعموم یوں دکھائی دیتی ہیں جیسے ہم نے دوسروں کے خیالات کا چربہ اتارا ہے۔ مقام عبرت ہے کہ انگریزی زبان بولتے اور لکھتے ہمیں اب سوا ڈیڑھ سو برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن دنیا کے سائنسی افکار کے سرمایے میں ہمارا حصہ اتنا حقیر ہے کہ اس کا وزن ہماری کثرت تعداد اور مسلمہ ذہانت سے دور کی بھی نسبت نہیں رکھتا۔

اس صورت حال کے باوجود بھی کبھی کبھی بعض بزرگ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ سائنس کے مضامین صرف انگریزی میں ادا ہو سکتے ہیں اور صرف انگریزی میں ہی ادا ہونی چاہیئے۔ میرے نزدیک پاکستان میں سائنس کی دشمنی کا حق اس سے بہتر طریقے پر ادا نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف جن لوگوں کو قوم کی زندگی میں سائنس کی بنیادی اہمیت کا احساس ہے ان کا تقاضا ہے کہ اب وقت آ پہنچا ہے کہ سائنس کے دروازے پاکستان کی اپنی تہذیبی زبانوں پر کھول دیئے جائیں تاکہ جمہور ملک صحیح سائنسی بصیرت سے بہرہ اندوز ہو سکیں اگر قانون قدرت یہ ہوتا کہ عقل کی بات انگریزی کے سوا اور کسی زبان میں نہ کہی جا سکتی تو ظاہر ہے کہ ناروے اور ڈنمارک، فرانس اور جرمنی اور روس میں سائنس کی ترقی کے امکانات ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے ہوتے۔ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ مگر چونکہ ان ممالک کی زبانیں انگریزی سے دور کا رشتہ رکھتی ہیں۔ اس لئے ہمارے انگریزیت پسند بزرگ ان زبانوں میں سائنس کی ترقی کو انگریزی ہی کے فیضان نظر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں مجھے یہ معلوم نہیں کہ جاپان میں انگریزی کے استعمال کے بغیر سائنسی اور تکنیکی ترقی کا جو عالم ہے اس کی توجیہ انگریزی پر انحصار رکھنے والے مفکرین نے کے مطابق کیا ہے اسی طرح چین کا حال ہے اسے آزاد ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں، یہ عظیم ملک اپنے دفتری اور سائنسی معاملات میں چینی زبان کے استعمال پر مصر ہے اور اس کے باوجود آئے دن خلائے بسیط میں نئی سے نئی ہوائی اڑاتا رہتا ہے لیکن سچ

نظام سرمایہ داری کے استحکام کی غرض سے تسخیر عالم، اور تسخیر عالم کے لئے تباہ کن ہتھیاروں کی ایجاد تک کتنی بے شمار منزلیں ہیں۔ جہاں سائنس نے اپنی مشہور بے غرضی اور ناطرفداری کے باوجود یورپ کی خاص اغراض اور خواہشات کا ساتھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یورپی سائنس کی حیثیت محض علمی اور نظری بھی رہی ہے اور اس حد تک علمی اور کاروباری بھی کہ اس نے یورپ کی خواہش و ضرورت اور یورپ کی روایت کے تقاضوں کو حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے۔

ہمارے قدیم تمدن اور ہماری قدیم تہذیب کے درمیان اسی قسم کا رشتہ صدیوں تک قائم رہا۔ مصیبت کا آغاز اس وقت ہوا جب مشاہدے اور تجربے کی مدد سے یورپ نے مظاہر کائنات کا گہرا مطالعہ شروع کیا اور ہم نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ یہ ہماری تاریخ کا بہت بڑا سانحہ ہے۔ کیوں کہ اس غفلت کا خمیازہ ہمیں اس طرح بھگتنا پڑا کہ پہلے ہماری سیاسی آزادی سلب ہوئی اور پھر ایک غیر قومی تمدن کے نفاذ نے ہماری تہذیبی اقدار کا گلا گھونٹنا شروع کیا اگر ڈھائی تین سو برس پہلے ہم نے مغربی دنیا میں سائنس کے ظہور پر توجہ کی ہوتی تو ہم نہ صرف ملک کے تحفظ کے لئے مناسب اسلحہ سے لیس ہوتے بلکہ ہمیں ایک ایسا سائنسی تمدن وضع کرنے کی توفیق بھی ملی ہوتی جو ہمارے تہذیبی روایات کے لئے ناسازگار نہ ہوتا۔ اب کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ہم نے ہوا کا رخ پہچان کر غالب اقوام کے تمدن کو قبول کرلیا ہے۔ مگر یہ تمدن جس کارخانے میں سے ڈھل کر نکلا ہے وہاں وہ اوزار دستیاب نہیں ہوتے جو ہماری اپنی تہذیب کی چولیں اور بیرونی تمدن کے چوکھٹے میں ٹھیک طرح سے بٹھا سکیں۔

سائنس اور سائنس پر مبنی ٹیکنالوجی محض انسان کی مادی ضروریات کو پورا نہیں کرتی بلکہ اس پورے عمل میں ایک تہذیبی پہلو بھی شامل رہتا ہے۔ یوں دیکھئے تو پاکستان کے سائنس داں حضرات کو ملک کے تحفظ کے ذرائع ہی ایجاد نہیں کرنے ہوں گے۔ بلکہ معاشی خوشحالی کے وسائل مہیا کرکے ایک نئے پاکستانی تمدن کی بنیاد بھی رکھنی ہوگی۔ جس کی مدد سے ہماری تہذیبی روایت پروان چڑھ سکے اس سلسلے میں سب سے پہلا اور سب سے اہم کام جو کرنے کا ہے فقط یہ ہے کہ ہم تحریر و تقریر کے ذریعہ سے سائنس کے بنیادی تصورات کو عام کردیں اس کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ عام فہم اردو میں سائنسی معلومات کی تبلیغ و اشاعت بڑی کثرت سے کی جائے۔ بلکہ یہ بھی کہ قوم کے نوجوانوں کی قوت مشاہدہ کو جستجو کے لطف سے آشنا کیا جائے، نیز مشاہدے کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے میں جو مزا ملتا ہے اس سے کوئی چھوٹی یا بڑی درس گاہ خالی نہ رہنے دی جائے۔ قومی زبان کے ذریعہ سے یہ عظیم الشان کام بڑی سہولت اور کامیابی کے ساتھ سرانجام پا سکتا ہے۔ جب تک یہ پہلی منزل سر نہ ہوگی۔ ہمارے لئے سائنس کے میدان میں بڑے کارنامے ناممکن رہیں گے۔ کیوں کہ بہت اونچی چوٹیاں پہاڑوں کے اسی سلسلے میں پائی جاتی ہیں جس کے ارد گرد بے شمار ٹیلے اور ٹیکرے میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اس ضمن میں پہلی اہم بات یہ ہے کہ ہنگامہ خیز قسم کی نظریاتی تحقیقات اگرچہ بڑی دلکش چیز ہے لیکن اس سے پہلے ہمیں معلوم نظریات پر حاوی ہو کر ان سے اپنی قوم کی فلاح کے لئے عملی صورتیں پیدا کرنی ہیں۔ ان میں سب سے اہم ملک کی حفاظت اور آزادی کے استحکام کا سوال ہے۔ اور اس میں ملک کے سائنس داں بڑا قابل فخر حصہ لے سکتے ہیں پھر ملک کی زرعی اور معدنی دولت سے استفادے کی

اے۔ آر۔ زبیر
وائس چانسلر انجینیرنگ یونیورسٹی

اردو میں سائنسی کتابیں

خواتین و حضرات! میں سائنس کانفرنس کے صدر اور دوسرے اراکین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس مبارک تقریب کے لئے منتخب کیا۔ یہ دیکھ کر میں بے حد خوش ہوا ہوں کہ کانفرنس کے کارپردازوں نے اردو کی سائنسی کتابوں کو اس نمائش میں یکجا کر کے ایک اہم فرض ادا کیا ہے اور ایک بار پھر ثابت ہوگیا کہ سائنس کسی ایک قوم کی میراث نہیں بلکہ حکمت کی بات ہر اس شخص کا مال ہے جو اس کے لئے سعی کرتا ہے۔

یہ مسلم ہے کہ یورپ میں علوم کا شوق مسلمانوں کے زیر اثر پیدا ہوا جس سے یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں سائنس کی ایک روایت (کبھی کم کبھی زیادہ) ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اس کی تفصیل سارٹن نے اپنی کتاب INTRODUCTION TO THE HISTORY OF SCIENCE میں نہایت اچھی طرح دی ہے۔

یہ روایت مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں بھی پہنچی! کم از کم انجینیرنگ اور ریاضی میں ان کے کمال کا ثبوت ہمیں ان بے شمار باغوں اور نہروں سے ملتا ہے جو مسلمان بادشاہوں کے حکم سے جاری ہوئیں۔ دور کیوں جائیے لطف اللہ مہندس اور ان کا خاندان لاہور ہی سے متعلق تھا، جن کے روشن کارنامے تاریخوں میں ملتے ہیں۔ پھر ہم پر دور غلامی آیا اور انگریز اس ملک پر قابض ہو گئے۔

انگریزوں کے زمانے میں تعلیم کا انداز بدل گیا، اور مشرقی علوم کی جگہ مغربی علوم نے لے لی۔ اگرچہ یہ علوم اس ملک میں آہستہ آہستہ پھیلے، پھر بھی اٹھارویں صدی کے آخر میں اردو میں سائنس کی کتابیں وجود میں آگئی تھیں۔ چنانچہ حیدرآباد میں شمس الامرائنے سائنس پر چھ رسالے لکھے، اور شاید اردو میں سائنسی موضوعات پر یہ پہلے رسالے تھے، جو سنہ شمسیہ کے نام سے ۱۸۳۷ء میں شائع ہوئے۔
۱۷۹۲ء میں دہلی کالج قائم ہوا تو اس میں مغربی علوم اردو میں پڑھائے گئے۔ اس ضرورت کے تحت سائنس اور ریاضی کی کتابیں

ص۱ سائنٹفک سوسائٹی (پاکستان) کی نویں سالانہ کانفرنس نومبر ۱۹۶۷ء کے آخر میں لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ سوسائٹی نے ۲۸ نومبر کو سائنسی کتابوں کی ایک نمائش کی تھی جس کا افتتاح جناب اے آر زبیر نے فرمایا، یہ موصوف کا افتتاحی خطبہ ہے۔

پوچھئے تو میرے لئے سب سے سبق آموز فن لینڈ کی علمی و ادبی تاریخ ہے۔ یہ چھوٹا سا ملک مسلسل پانچ چھ سو سال تک سویڈن اور روس کے قبضے میں رہا۔ سو ڈیڑھ سو برس ہوئے جب اسے کسی حد تک اختیار حاصل ہوا تو اس نے انگریزی یا سویڈش یا روسی زبان کے بجائے اپنی زبان میں دفتری اور سائنسی کاروبار کی طرح ڈالی۔ فن لینڈ کی قومی زبان اس وقت محض ایک دیہاتی بولی تھی۔ اہل فن لینڈ نے اسی دیہاتی بولی کی صلاحیتوں پر تکیہ کیا اور آج کیفیت یہ ہے کہ فن لینڈ کی زبان میں سائنس کے ہر شعبے یہاں تک کہ جوہری طبیعات پر بھی مستند کتابیں موجود ہیں۔

اگر ہم یہ سوچیں کہ کوئی وقت ایسا بھی آنا چاہیئے جب ملک میں ہر فرد و بشر صحیح علمی یا فنی یا سیاسی نظریات کا قائل نظر آئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے انسانی فطرت سے بہت زیادہ نیک توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ قیام پاکستان تک پاکستان کو ایک مہمل، ناقابل عمل اور مضحکہ خیز منصوبہ قرار دینے والے افراد کی خود مسلمانوں میں کمی نہ تھی لیکن ہمیں معلوم ہے کہ تاریخ کے اٹل تقاضے ہماری قومی آزادی کی صورت میں پورے ہو کر رہے۔ آج علمی دنیا میں ہم اسی قسم کی ذہنیت سے دوچار ہیں جو بیس بائیس برس پہلے سیاست و معیشت کے عالم میں ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل رہی تھی۔ مجھے اس صورت حال سے منغض یا مایوس ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ قوم کا اجتماعی شعور قومی سطح پر استعمال کرنے کے حق میں دو ٹوک فیصلہ کر چکا ہے۔ اس فیصلے کا پورا ہونا اسی تاریخ عمل کی رو سے مقدر ہے جس نے استقلال پاکستان بن کر جمہوری قوتوں کی فتح پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ اگر چند ذی اثر افراد سمندر پار سے آئی ہوئی ایک غیر ملکی زبان کو دائمی طور پر قومی زبان کی ان دیکھی، ان ہونی اور من گھڑت حیثیت دینے کی فکر میں ہیں یا علاقائی زبانوں کا نام لے کر ملت پاکستان کی طے شدہ قرارداد کو پارہ پارہ کرنے کی نیت رکھتے ہیں تو انہیں واضح رہے کہ ہماری قوم کی ناقابل تسخیر متحدہ قوت انہیں اسی بے پناہ تاریخی عمل کے دھارے میں بہا لے جائے گی جس میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے آفتاب نے برطانوی وائسرائے اور بھارتی نیتاؤں اور بھارت پسند مسلمانوں کی مزاحمت کو خس و خاشاک کی طرح بہتے دیکھا تھا۔ ہمیں اردو یا انگریزی کے متعلق منطقی بحث میں پڑنے کے بجائے اب ملک کو سائنسی تحقیق و اکتشافات کی راہ پر ڈالنا ہے۔ اس وقت ضرورت یہ ہے کہ ہم سائنس کی تعلیم قومی زبانوں کے ذریعے سے عام کریں اور پھر یہ ثابت کریں کہ جب قومی زبان کا سہارا لیا جاتا ہے۔ تو دل و دماغ بیدار ہو کر تحقیق کی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اور انسان کی نگاہوں پر علوم و فنون کے نئے افق کھلنے لگتے ہیں۔

موجود ہے، لہٰذا اس کو ترقی دینا کچھ مشکل نہیں۔

بعض لوگ مشکلات کے پہلو پر بہت زور دیتے ہیں، مگر مشکلات کہاں نہیں ہوتیں۔ جتنی دیر آپ مشکلات کا غم کھاتے رہیں گے، وقت ضائع کریں گے۔ اصل تدبیر یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم کے سلسلے میں علمی قدم اٹھا ہی لیا جائے پھر دیکھئے اردو میں سائنسی تصنیف اور تحقیق کتنی ترقی کرتی ہے۔

اس نمائش کے سلسلے میں ایک امر لائق توجہ یہ ہے کہ اس میں ہر علم کی کتابوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے، انگریزی دور کے شروع سے ۱۸۵۷ء تک دوسرا ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک اور تیسرا ۱۹۰۰ء سے آج تک۔ اس تقسیم سے یہ فائدہ مدِنظر ہے کہ سائنسی تصنیف کی تحریک کا عہد بہ عہد ارتقا سامنے آجائے۔

اس نمائش کی افادیت ظاہر ہے۔ اس لئے میں کچھ زیادہ کہہ کر آپ کا وقت نہیں لینا چاہتا اور خدا کے نام سے اس نمائش کا افتتاح کرتا ہوں۔

اردو میں لکھی گئیں۔ اس کالج کے اہم مصنفوں میں مولوی ذکاءاللہ اور ماسٹر رام چندر خاص طور سے قابل ذکر ہیں لیکن ابھی یہ تحریک ترقی کر رہی تھی کہ ۱۸۳۵-۱۸۳۶ء میں لارڈ میکالے نے انگریزی ذریعۂ تعلیم کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا جس کی وجہ سے اردو میں سائنسی تعلیم وتا کا سلسلہ رک گیا۔ تاہم سر سید احمد خاں نے ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کر کے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ ادھر لاہور میں ۱۸۶۵ء انجمن پنجاب کے زیر اثر علوم مفیدہ کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا اور جب اس انجمن کی کوششوں سے پہلے ۱۸۶۳ء میں لاہور یونیورسٹی اور بعد ازاں اورینٹل کالج، پھر پنجاب یونیورسٹی وجود میں آئی تو بڑی دیر تک سائنسی تصانیف کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ اس دور کی کتابیں آج آپ اس نمائش میں بھی دیکھیں گے۔ اگر بیسویں صدی میں حکومت کی تعلیمی حکمت عملی نے اردو ذریعۂ تعلیم اور اس کے ساتھ میں سائنسی تصنیف وتالیف کا خاتمہ کر دیا، تاآنکہ جامعہ عثمانیہ نے جو ۱۹۱۸ء میں قائم ہوئی تھی، ۱۹۲۶ء سے تمام علوم کی تعلیم کا واحد ذ اردو کو قرار دے دیا۔ اس کے زیر اثر اردو میں سائنس کی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ وجود میں آگیا۔ ان میں سے بیشتر ترجمے ہیں مگر بعض ا بھی ہیں۔ مولانا وحید الدین سلیم نے اصطلاحات بنانے کے اصولوں پر ایک عمدہ کتاب لکھی جو آج بھی بیحد مفید ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی یہ علم تقسیم ملک تک جاری رہی۔ قیام پاکستان کے بعد، بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کا دفتر کراچی میں قائم کیا، اور ایک ار کالج بھی جاری کیا۔ چنانچہ جو کام حیدرآباد اور دہلی میں ہو رہا تھا اسے پاکستان میں بڑی شد و مد کے ساتھ جاری کیا۔ اس کالج کی ضرورتوں بہت سے سائنسی نصابات تیار ہوئے جو اس نمائش میں موجود ہیں۔

۱۹۶۰ء میں قومی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں حکومت نے اردو اور بنگلہ کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس وجہ سے دو مرکزی بورڈ (ایک بنگلہ کے لئے دوسرا اردو کے لئے) قائم ہوئے۔ یہ بورڈ دوسرے پروگرام کے علاوہ، سائنسی، نصابی اور اعلیٰ کتا لکھوا رہے ہیں چنانچہ جو کام ہوا ہے وہ اس نمائش میں موجود ہے۔

اسی کے زیر اثر کراچی یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹیوں دونوں نے اردو کو متبادل ذریعۂ تعلیم قرار دیا اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی یونیورسٹیوں میں ایک ایک دارالتالیف سائنسی علوم کے لئے قائم کیا۔ یہ کوششیں بھی آج آپ کے سامنے ہیں۔ اسی طرح زرعی یونیورسٹ لائل پور نے بھی اردو تصانیف کے لئے ایک مرکز قائم کیا ہے۔

دوسرے اداروں میں محکمہ زراعت مغربی پاکستان، مجلس ترقی ادب لاہور، مکتبۂ فرینکلن لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہو نے بھی اس سلسلے میں مفید کام کیا ہے۔ ان اداروں کی نمائندہ کتابیں اس نمائش میں دیکھ سکیں گے۔

مذکورۂ بالا اداروں کے علاوہ فیروز سنز، پبلشرز یونائیٹڈ، علمی کتب خانہ، مکتبۂ کارواں، آئینہ ادب، شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ بھی اپنی سائنسی کتابیں اس نمائش کے لئے بھیجی ہیں، اور اس لحاظ سے ان اداروں کی خدمات بھی قابل توجہ ہیں۔

سائنسی کتابوں کے اس ذخیرے کو دیکھ کر یہ امر محتاج ثبوت نہیں رہتا کہ اردو میں سائنسی کتابوں کی کمی نہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر مناسب سرپرستی کی جائے اور ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی سے ان کے لئے مارکیٹ پیدا کی جائے تو اردو میں سائنسی تصنیف کی تحریک کو بہت جلد ترقی ہو سکتی ہے کیونکہ اردو میں (عربی کے زیر اثر اور بعد میں انگریزی زمانے سے) ایک علمی روایت

جلیل قدوائی

مولوی محمد یحییٰ تنہا مرحوم

مولوی محمد یحییٰ تنہا مرحوم سے میری پہلی ملاقات اپنی نوعیت بلکہ ظرافت کی وجہ سے مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ یہ ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دفتر رجسٹرار میں ملازم تھا۔ سید راس مسعود مرحوم کو یونیورسٹی میں بہ حیثیت وائس چانسلر تشریف لائے چند سال ہو چکے تھے بلکہ زیادہ صحیح یہ کہ موصوف کے علی گڑھ سے استعفا دے کر چلے جانے کے کم و بیش ایک سال پہلے کا واقعہ ہے۔ جو لوگ علی گڑھ کی اُس زمانے کی تاریخ سے واقف ہیں انھیں معلوم ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے لئے کتنا پُر آشوب زمانہ تھا۔ مسعود مرحوم نے اپنی قابلیت، محنت، ہمت، دل سوزی اور اولوالعزمی سے مسلمانوں کی اُس عظیم درسگاہ کو زمین کے متعلق افسوس کہ آج ہم ایسا نہیں کہہ سکتے، تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔

اپنے متعدد اصلاحی کاموں کے سلسلے میں مسعود مرحوم کو علی گڑھ نے ماضی میں اردو کی جو شاندار خدمات انجام دی تھیں یونیورسٹی میں اُس کی شایانِ شان اردو کی تعلیم کا انتظام موجود نہ ہونے کا بے حد قلق تھا۔ اگرچہ اردو ہر امتحان میں بطور لازمی مضمون شامل تھی مگر اس کی تعلیم کی صورت عجیب مضحکہ خیز تھی یعنی مادری اور غیر مادری زبان کے نام سے برائے نام چند ہلکی پھلکی کتابیں یا انتخابات موجود تھے جو امتحان پاس کرنے کے لئے کافی سمجھے جاتے تھے۔ بہت سے طلبا تو غیر مادری اردو کا سستا اور آسان سا نصاب پڑھ کر امتحان پاس کر لیتے تھے۔ اردو میں نمبر بھی سختی سے نہیں دیئے جاتے تھے کیونکہ یہ کسی طالب علم پر بڑا ظلم سمجھا جاتا تھا کہ وہ اردو کی وجہ سے امتحان پاس کرنے سے رہ جائے۔

مسعود مرحوم کی غیرت قومی اس تماشے بلکہ اردو کے ساتھ غداری کو برداشت نہ کر سکی۔ انہوں نے اردو میں ایم اے اور آنرز کی جماعتیں کھولنے اور اسے بی اے اور انٹرمیڈیٹ میں اختیاری مضمون کے طور میں جاری کرنے کی اسکیم تیار کی جس میں آگے چل کر اعلیٰ تحقیقی کام کی بھی گنجائش رکھی تھی۔ انھیں کی توجہ تھی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں میں دفتر رجسٹرار سے دو سال کی رخصت حاصل کر کے الٰہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں اول درجہ میں ایم اے کرنے کے بعد اپنی ملازمت پر واپس آ چکا تھا۔ فی الحال اردو کے شعبہ میں ایک ریڈر کی اسامی قائم کی گئی تھی جس پر تقرر کے لئے اشتہار دیا جا چکا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ اگر رشید صدیقی صاحب کو جو اس وقت لکچرر تھے ریڈر منتخب کر لیا گیا تو مشتہرہ اسامی کے لئے درخواست گزاروں میں سے کسی مناسب شخص کو اُن کی جگہ لکچرر مقرر کر دیا جائے گا بشرطیکہ متعلقہ امیدوار بھی اسے پسند کرے۔ امیدواروں میں ایک میں بھی تھا۔

ایک دن ایک ادھیڑ عمر کے قد سے پستہ قد، دبلے پتلے، سانولے رنگ کے ایک صاحب جن کی مختصر سی داڑھی تھی شیروانی زیب تن کئے،

یہ مضمون ۲۳ دسمبر ۱۹۶۷ء کو کراچی میں منعقدہ یوم تنہا کے جلسے میں پڑھا گیا تھا جس کی صدارت جناب سید ہاشم رضا نے کی تھی۔

کی تحریروں سے متاثر ہو چکے تھے۔ ہم میں ایسے خوش قسمت کہاں ہیں جنہوں نے ان بزرگوں کو دیکھا ہو مگر میں نے کم از کم حالی کو تنہا صاحب کی ذات میں جلوہ گر دیکھا۔ حالی کے جو اوصاف سُنے، شرافت، محبت، سچائی، ایثار، دل سوزی، نیک نفسی، انسانی ہمدردی، درد قومی سبھی کو اُن کی ذات میں مجتمع پایا۔ اور حالی کے معنوی پہلوؤں یعنی نثر و نظم، تذکرہ و تنقید، سیرت و سوانح اور ان کے اصول تحریر میں بھی نسبتاً کم تر پیمانہ پر سہی انھیں ان کا شریک اور مقلد دیکھا۔ اگر بڑی یا آج کل کی اصطلاح میں چونکا دینے والی بات نہ سمجھی جائے تو بابائے اُردو کے بعد حالی کا سچا پرستار تنہا بلکہ صرف تنہا صاحب کو سمجھتا ہوں۔

وہ علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں کے لئے وقف تھے۔ ہر وقت تلاش و تحقیق و تدقیق میں سرگرداں! موجودہ دور کے بعض نام نہاد اہلِ علم کی طرح کاٹا اور لے دوڑی والی نہیں بلکہ طلب علم میں انسان کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دینے والی تحقیق۔ میرے علم میں اُردو میں اُن کے سے دُھن کے پکے بزرگ صرف ایک اور گذرے ہیں، مولانا احسن مارہروی، جن کا اوڑھنا بچھونا علم کی جستجو تھا اور جن کی جوتیاں سیدھی کرنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی۔ ان بزرگوں کو اپنے ریاض سے نیک نامی مقصود ہوتی تھی نہ مالی منفعت۔ وہ ع

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!

کے قائل تھے۔ اُن کی تپش دل اُن کا انعام تھا، وہی اُن کی زندگی کیلئے حرارتِ غریزی کا کام دیتی تھی۔

دیکھئے اُن کی تپشِ دل نے اُردو میں بعض کتنے خوبصورت گل کھلائے ــ جی ہاں! تپشِ دل نے گل کھلائے، پژمردہ نہیں کئے۔ دُنیا کی ہر چیز کی طرح پھولوں کے لئے بھی حرارت لازمۂ حیات ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا

جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو

سو اس پرتو سے تنہا صاحب نے کتنے غنچے وا کئے؟ میرے علم میں ان سے آٹھ دس کتابیں منسوب ہیں جن میں سے خاص خاص یہ ہیں، سیر المصنفین، مرأۃ الشعرا، شاعرانہ خیالات، تاب و تب، خیالات ارونگ، تاریخ امریکہ، تاریخ مغربی یورپ، مختصر تاریخ ادب اُردو۔ ان میں سے سیر المصنفین اور مرأۃ الشعرا میں سے ہر دو کی دو دو ضخیم جلدیں ہیں یعنی ہر کتاب ایک ہزار صفحات پر محیط ہے۔ اور یہ ان کے نام اور کام کو بقائے دوام دلانے کی ضامن ہیں۔ ان تذکروں، بالخصوص اول الذکر کے لکھنے میں انھوں نے غیر معمولی محنت اور جرأت سے کام لیا ہے۔ یعنی اول تو اردو نثر کی تاریخ لکھنا گویا ایک پہاڑ کاٹنا جس کی اُن سے قبل کسی کو ہمت یا توفیق نصیب نہیں ہوئی (سوائے مولانا احسن کے جنھوں نے "تاریخ نثر اردو" مرتب کی مگر وہ دراصل اپنے دوسرے نام کے مطابق "نمونۂ منثورات" زیادہ اور تاریخ کم ہے)۔ دوسرے مصنفین اور ان کی تصانیف کے بارے میں ایسی رائے دینا جس میں ذرہ برابر رورعایت اور جانب داری سے کام نہیں لیا گیا ہے یہ مشکل کام تھا جس سے آزاد مرحوم اپنے تذکرۂ شعرا آبِ حیات میں کامیابی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے۔

تنہا صاحب کی رایوں سے اختلاف ہو سکتا ہے اس لئے کہ ادب ایک ذوقی چیز ہے، ریاضی کی طرح دو اور دو چار والا دو ٹوک کا مسئلہ نہیں، مگر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کی رائیں بے لاگ نہیں۔ اظہار رائے میں یہی غیر جانبداری بے باکی اور بے خوفی اس لئے کہ مروجہ رایوں سے بھی

آنکھوں میں شفافیت لیے ایک مسکینیت کے ساتھ مسکراتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے اور بلا کسی رسمی تکلف کے میرے پاس آکر پوچھنے لگے: "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ شعبۂ اردو کے اشتہار کے جواب میں میری درخواست آپ کے دفتر میں وصول ہو چکی ہے؟" میں نے عرض کیا۔ "جی نہیں! مجھے کچھ خبر نہیں اور ہوتی بھی تو میں براہ راست کسی امیدوار سے اس مسئلہ پر کوئی بات نہیں کر سکتا۔" غالباً اسی شام کو خواجہ غلام السیدین صاحب کے ہاں (جہاں کم و بیش ہر روز شام کو ہماری نشست ہوتی تھی) میرا اور ان صاحب کا باقاعدہ تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ تنہا صاحب ہیں۔ اور ہر دو کے درمیان قدیم خاندانی تعلقات چلے آتے ہیں اگرچہ سیدین صاحب اس وقت ان سے کچھ ضرورت سے زیادہ شوخی ہی سے کام لے رہے تھے۔ اُن کا علمی کام اس وقت تک کافی حد تک سامنے آچکا تھا اور میں اُنھیں اپنا بزرگ سمجھتا تھا مگر سیدین صاحب نے مجھے اُن کا حریف بنا کر پیش کیا۔ میں نے عرض کیا میرا اور تنہا صاحب کا کیا مقابلہ اور بے شک مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں ایسا قابل اور تجربہ کار شخص شامل ہو جائے۔

تنہا صاحب میری زبان سے اپنے حق میں یہ تعریفی کلمات پورے اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ سنتے رہے اور یونیورسٹی کے نواح میں اقامت کی صورت حال اور نقل مقامی اور تعلیمی سال کے درمیانی حصہ میں اپنے بچوں کی درس گاہ کی تبدیلی وغیرہ جیسے مسایل پر باتیں کرنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا انھیں پورا یقین تھا کہ ان کا علی گڑھ میں تقرر ہو جائے گا مگر اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ رشید صاحب ریڈر مقرر ہو گئے اور مولانا احسن مارہروی مرحوم جو انٹرمیڈیٹ کالج میں لکچرر تھے نئے انتظام کے تحت ایف اے کی جماعتیں یونیورسٹی میں مدغم کر دیئے جانے کے سبب یونیورسٹی میں بلا لیے گئے۔ ایک جونیئر لکچرر کی جگہ قایم ہوئی جس پر میرا انتخاب ہو گیا۔ مگر تنہا صاحب کا کردار ملاحظہ ہو۔ مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ بڑی گرم جوشی سے مجھے مبارک باد دی اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس واقعہ کے بعد سے میری اُن کے ساتھ نیازمندی قائم ہو گئی اور ایسی کہ ان کی وفات کے دم تک قایم رہی بلکہ شاید آج پہلے سے زیادہ ہے۔

اُن میں ایک بھولپن تھا جو ہر بات کا آسانی سے اور بے چون و چرا یقین کر لیتا ہے۔ ایک سادگی، بلکہ سادہ دلی جو ہمارے بزرگوں کے مزاج کا خاصہ تھی سے

مرا بہ سادہ دلی ہائے من توان بخشید
گناہ کردہ ام و چشم آفریں دارم!

وہ خوش فہم، خوش امید، خوش خیال تھے جس کے ڈانڈے خام خیالی سے مل جاتے ہیں۔ کم کو بہت زیادہ سمجھ لیتے تھے؛ ذرا سے سہارے پر بڑی بڑی امیدیں قایم کر لیتے تھے۔ اس نے اُن کی زندگی کو مایوسیوں سے دوچار رکھا۔ اس کی وجہ سے انھیں مسلسل ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا ع

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپایدار ہو گا!

وہ فرشتہ نہیں تھے مگر ان کے فرشتہ صفت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ وہ دُنیا دار نہ تھے۔ ظاہرداری انھیں چھو کر نہیں گئی تھی۔ اُنھوں نے جان کر کسی کے ساتھ برائی نہیں کی اور اپنے حریفوں کو کبھی حریف نہیں سمجھا۔ اِن باتوں کی اُن میں صلاحیت ہی نہ تھی۔ فراخ دلی اُن پر ختم تھی، اور عالی ظرفی اُن کا طرۂ امتیاز تھی۔

اُنھوں نے حالی کی جوتیاں سیدھی کی تھیں اور محمد حسین آزاد اور وحید الدین سلیم کے چراغ سے چراغ جلایا تھا۔ اس سے پہلے نہ سرسید

محمد معین الدین دردائی ایم اے علیگ

بہار کی ایک قدیم مثنوی

یہ جاننے کے بعد کہ چھٹی صدی قبل مسیح سے پانچویں صدی بعد مسیح تک یعنی لگ بھگ ایک ہزار سال تک پورے ہندوستان کی سیاسی، تمدنی، مذہبی اور علمی تاریخ مگدھ کے مرکز پر گھومتی رہی ہے ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ ایران و عرب سے صوبہ بہار کا گہرا تعلق اور زبان و ثقافت کا لین دین بہت قدیم اور پرانا ہے اور بلا شبہ بہار کی قدیم بھاشاؤں پر عربی و فارسی کا اثر دیا تھا بودھ خصوصاً موریا خاندان سے پڑنے لگا ہوگا۔ اور یہاں اسی وقت سے "اردو"[ل] کی بنیاد پڑی ہوگی پھر سلطنت موریا کو کمزور دیکھ کر باختر کے یونانیوں اور سیا کا (تورانی) قوم نے جب مگدھ پر حملہ کیا ہوگا تو ان کے ذریعہ ایرانی یونانی اور تورانی زبانوں کے اثرات مگدھ کی پراکرت پر کافی پڑے ہوں گے۔

چٹرجی صاحب کا خیال ہے کہ مگہی زبان میں تخلیقاتی ادب کا پتہ نہیں ملتا اور لوک گیتوں اور عوامی کہانیوں سے زیادہ اس میں ٹھوس چیزیں نہیں ملتیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ صوبہ بہار کی تین اہم بولیوں مگہی، بھوجپوری اور میتھلی میں بھوجپوری سے قطع نظر مگہی اور میتھلی دلیش کے عرفانی شاعر ودیاپتی کو کون بھلا سکتا ہے۔ ان کی دو مشہور کتابیں کیرتی لتا اور کیرتی پتا کا موجود ہیں جس میں کیرتی لتا میں بہت زیادہ ریختہ پن پایا جاتا ہے۔

اردو زبان کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں ہمیں سیاسی اثرات سے زیادہ سماجی اسباب پر نظر رکھنی ہوگی۔ کیونکہ یہ بات اب بالکل ظاہر ہوگئی ہے کہ فاتحین اور ان کی فوجوں سے زیادہ اردو زبان کے "خالق" صوفیائے کرام اور بزرگان دین ہیں۔ پروفیسر سید حسن عسکری صاحب نے اپنے گرانقدر مقالہ "قرون وسطیٰ کے بہار میں اسلامی تصوف کی تاریخی اہمیت" میں بہت تفصیل سے ان اثرات کا ذکر کیا ہے جو اسلامی تصوف نے صوبہ بہار پر ڈالے۔ ان کا خیال ہے کہ صوفیا کی رواداری اور وسیع المشرب تحریک

ل ۱۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو دہلی میں جو "کل ہند اردو کانفرنس" ہوئی تھی اس کی سبجکٹ میٹنگ میں ڈاکٹر محمود صاحب نے یہ تحقیقی نکتہ ظاہر فرمایا تھا کہ "اردو" سنسکرت کے لفظ اردو سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں مکسچر (یعنی زبانوں کا مکسچر)

اختلاف کیا ہے مرآۃ الشعرا میں بھی پائی جاتی ہے اور یہی سچی اور صحیح تنقید کی بنیاد ہے۔ ان کتابوں کی ان صفات پر تنہا صاحب کی زندگی ہی میں انھیں اپنے عہد کے کم و بیش تمام سربرآوردہ نقادوں سے داد مل چکی تھی اور موخرالذکر کتاب یعنی مرآۃ الشعرا کو برٹش میوزیم میں جگہ مل چکی ہے۔

ان کی دوسری کتابوں کا مختصر تذکرہ یہ ہے کہ "شاعرانہ خیالات" ان کی مختلف انگریزی نظموں کے اردو تراجم کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے اپنی جوانی کے عہد کے مشہور زمانہ شاعر فصیح الملک جہاں استاد نواب مرزا خان داغ دہلوی کے رنگ میں غزل کہنے سے اپنی شاعری کی ابتدا کی تھی مگر حالی، آزاد اور سلیم کے زیر اثر بعد میں غزل گوئی ترک کردی، اور مختلف موضوعات بشمول قومی مسایل پر براہ راست نظمیں لکھنی شروع کیں۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد ان نظموں کو مرتب کیا اور اس مجموعہ کا نام تب و تاب رکھا۔ خیالات ارژنگ میں اس امریکی مصنف کے چند دلچسپ خاکوں کے ترجمے جمع کردیے گئے ہیں۔ تاریخ امریکہ سنہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تھی اور اردو میں امریکہ کے بارے میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ اب اور کتابیں بھی ملتی ہیں مگر اس کی افادیت اور افضلیت مسلم ہے۔ تاریخ مغربی یورپ کی دو جلدیں ہیں۔ ایک جلد طبع ہو چکی دوسری مسودہ کی شکل میں اُن کی نشانی ہمارے پاس باقی ہے۔ معلوم نہیں کب شائع ہو۔ اسی طرح مختصر تاریخ ادب اردو جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اپنے موضوع پر مختصر مگر مفید رسالہ ہے مگر ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ شاید کیا یقیناً اور بھی مسودات ہوں گے جو اشاعت پذیر ہونے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ تنہا صاحب اپنی زندگی میں اپنی جملہ تصانیف شائع نہیں کرا سکے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی اہل قلم اپنے جملہ علمی و ادبی کارنامے اپنی زندگی میں دنیا کو مطبوعہ شکل میں پیش کردے۔ شاید ہم میں سے کئی دوستوں کو اس امر کا علم ہو گا کہ بعض کتابوں کی اشاعت کی تنہا صاحب اپنے ساتھ حسرت لے گئے۔ مثال کے طور پر اُن کی بڑی تمنا تھی اور اُنھوں نے اپنے آخری ایام میں اپنی ضعیفی اور معذوری کے باوجود اس حال میں کہ انھیں دو قدم چلنا کیا اپنا سنبھالنا مشکل تھا عزیزی حسن یحییٰ (عندلیب میرٹھی) کے سہارے مختلف مقامات کے چکر کاٹے اور متعدد منصوبے بنائے کہ کسی طرح اُن کی سیر المصنفین کی تیسری جلد بھی زیور طبع سے آراستہ ہو جائے جو انھوں نے مکمل کرلی تھی اور جو اس قابل قدر تذکرے کو متاخرین نثر نویس یعنی بابائے اردو، سید سلیمان ندوی اور ابوالکلام آزاد وغیرہ تک لے آتی ہے۔ مجھے وہ وقت نہیں بھولتا جب وہ اپنی وفات سے کچھ ہی دن پہلے گرتے پڑتے کم و بیش پینتیس ۳۵ چالیس سیڑھیاں چڑھ کر ہم لوگوں کے پاس اس سلسلے میں صلاح و مشورے کے لئے انجمن ترقی اردو تشریف لاتے تھے!

تو کیا لے حضرات! آج کے اس جلسہ میں ہم حسب معمول صرف ع

نشستند و گفتند و برخاستند

ہی پر عمل کرکے رہ جائیں گے؟ گو یہ تو عمل نہیں بے عملی ہوئی۔ کیا ہمیں اُن کی حسرت پر کوئی ملال نہیں ہونا چاہئے؟ کیا ہمیں اس امر کا عہد نہیں کرنا چاہئے کہ ہم انکی تمنا کو پورا کرنے کیلئے ہر ممکن جدوجہد کریں گے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کی افادیت اور اہمیت مناسب طریقہ پر مختلف اشاعتی حلقوں یا متعلقہ سرکاری محکموں میں محسوس کرائی جائے تو اس کی اشاعت کا انتظام ضرور ہو سکتا ہے۔ پھر کیوں نہ ہم سب مل کر اس سلسلے میں کوئی مفید قدم اٹھائیں؟ شاید یہ کام ایک کمیٹی کے سپرد کیا جا سکتا ہے یہی کمیٹی اُن کی دوسری غیر مطبوعہ تصانیف، مسودات، خطوط وغیرہ کی اشاعت کے مسئلہ پر بھی غور کر سکتی ہے اور ایک لائحہ عمل مرتب کر سکتی ہے۔ اس قسم کے کاموں کی تکمیل مرحوم کی مناسب اور مستقل یادگار ہوگی۔ صرف تعاریف اور مقالات سے کچھ نہیں ہوگا۔

م موسیٰ رضا علیہ السلام بن سیدنا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بن سیدنا جعفر صادق علیہ السلام بن سیدنا امام باقر علیہ السلام بن سیدنا امام زین العابدین علیہ السلام بن سیدنا امام حسین علیہ السلام شہید دشت کربلا بن سیدنا علی مرتضیٰ بن ابی طالب علیہ السلام

سید فضل علی صاحب چار بھائی تھے ۔ سید فضل علی صاحب خورد، و سید افضل علی، سید جمعیت علی و سید معصوم علی چاروں اولادیں مسماۃ بی بی فاطمہ کے بطن سے تھیں جو سید کرم علی صاحب کی پہلی بیوی تھیں۔

سید فضل علی صاحب کی شادی مسماۃ بی بی واصلہ سے ہوئی تھی جن سے ایک صاحبزادے سید ابوالقاسم کا پتا چلتا ہے۔ مجھلے اور چھوٹے بھائی سید افضل علی اور سید معصوم علی کا حال نہیں معلوم ۔ سنجھلے بھائی حکیم سید جمعیت علی صاحب جو راقم الحروف کے جد اعلیٰ تھے، کی شادی موضع ارجن سرتھوا سب ڈویژن بہار شریف ضلع پٹنہ میں نواب عتیق اللہ* کے پوتے سید فضل اللہ کی منجھلی صاحبزادی مسماۃ بی بی مدینہ سے ہوئی اور وہ یہیں مقیم ہو گئے اور ۱۲۰۳ فصلی میں وفات پاکر سرتھوا ہی میں سپرد خاک کئے گئے ۔ آپ کا مزار اقدس آج بھی موجود ہے ۔ بزرگوں کی زبانی پتا چلتا ہے کہ سید فضل علی اور سید جمعیت علیؒ یہ دونوں بھائی حضرت مخدوم پاک قدس سرہ کے مرید تھے ۔ بلکہ سید جمعیت علیؒ کو اپنے پیر سے خلافت بھی حاصل تھی ۔

سید فضل علی صاحب مصنف مثنوی مذکورہ کے سنہ پیدائش اور سنہ وفات کا پتا تو نہیں چلتا لیکن ان کے والد سید کرم علی صاحب کا سنہ وفات راقم الحروف کے خاندانی بیاض میں ۱۱۷۷ فصلی تحریر ہے ۔ اور سید فضل علی صاحب چونکہ سید کرم علی صاحب کے سب سے بڑے لڑکے تھے ۔ اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ اپنے والد کی وفات کے وقت یعنی ۱۱۷۷ فصلی میں سید فضل علی صاحب کم از کم بارہ برس کے ہوں گے ۔ اس بنا پر ان کی پیدائش کا سال ۱۱۶۵ فصلی یعنی ۱۷۵۳ء قرار دیا جاسکتا ہے۔

مثنوی زیر بحث کے سنہ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا لیکن اس کے ایک مخطوطہ کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:

"تاریخ سوم ماہ فروری ۱۸۱۹ء مطابق بست پنجم ماگھ ۱۲۲۶ فصلی موافق ہفتم ربیع الثانی ۱۲۳۴ھ نبوی روز چہار شنبہ بوقت گزشتہ یک پاس شب بہ مقام قصبہ صاحب گنج ۔ بہ خط خام خادم الخلال بندہ شیخ محمد افضل مالک موضع مقصود پور ادگانواں صوبہ بہار ضلع بہار تھانہ بہار اولیٰ نقل از خاص کتاب فضل علی مصنف است"

مندرجہ بالا عبارت سے کئی باتیں صاف ہو جاتی ہیں ایک تو یہ کہ اس مثنوی کی کتابت ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۲۲۶ فصلی مطابق

---

* نواب عتیق اللہ صاحب کئی سال تک دہلی میں درباری امرا میں شامل رہے ۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد جب اپنے وطن موضع براہیم پور تھانہ خضر سرائے ضلع گیا واپس ہوئے تو لگ بھگ بیس میل کا علاقہ جاگیر کی حیثیت سے انھیں عطا ہوا ۔ اور وہیں رہ کر اپنی بقیہ زندگی فراغت سے گزاری ۔ یہ علاقہ برابر بہار سے پورب سلاؤ تک تھا ۔ جعفرہ، کنڈوہ، سرتھوا، محمودہ وغیرہ مواضعات اس میں شامل تھے ۔

نے ہندو سنسکرتی اور مسلم تہذیب کو مخلوط کرنے میں بڑی مدد کی ہے اور اس کے نتیجہ میں " بہاری ریختہ " وجود میں آئی۔

ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب نے اپنی تصنیف " بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا " میں اس بہاری ریختہ کو تین دور میں تقسیم کیا ہے۔ " پہلا " اردوئے قدیم " جس میں ریختہ پن کے ساتھ کچھ لسانی پنجابیت بھی ملتی ہے۔ دوسرا " عہد وسطیٰ " جس میں بہاری ریختہ کھڑی بولی سے بہت زوروں پر متاثر ہو رہی تھی۔ تیسرا " معیاری عہد " جس میں کھڑی بولی بہار کے اردو ادب پر چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

میری رائے میں بہاری ریختہ کی داغ بیل تو چھٹی صدی ہجری قبلی مسیح ہی سے پڑ گئی تھی جب کہ سارے بھارت کی سیاسی، تمدنی مذہبی اور علمی تاریخ مگدھ دیس کے مرکز پر گھوم رہی تھی۔ اور پورے مشرقی ایشیا اور مشرق وسطیٰ سے بہار کا تعلق پیدا ہو چکا تھا یہ پہلا دور لگ بھگ تغلقوں کے زمانہ تک چلا جاتا ہے۔ دوسرا دور تیرہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے جس میں ہمیں صوفیائے کرام کے ملفوظات، اشعار، فالنامے، رگھ مندرے، نسخے اور نقش وغیرہ بہ کثرت ملتے ہیں۔ لیکن مستقل تصنیف کی شکل میں کوئی چیز اب تک منظر عام پر نہیں آئی ہے یہ دور سترہویں صدی عیسوی تک چلا جاتا ہے اس کے بعد بہاری ریختہ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس کو اختر صاحب نے " معیاری عہد " لکھا ہے اس دور کی کتابیں نظم و نثر کی فی منظر عام پر آرہی ہیں اور صوبہ بہار کے اہل قلم حضرات اس تحقیقی کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہو رہے ہیں۔ زیر بحث مثنوی " ہیر رانجھا " بھی اسی معیاری عہد کی تصنیف ہے۔

اس مثنوی کے مصنف میر فضل علیؒ ہیں۔ جیسا کہ کتاب کے آخر میں مصنف نے اس کا اظہار کیا ہے ؎

تو پاوے گا اسی دم اپنے پی کو   کر کر راہ سنا فضل علی کو

میر فضل علیؒ موضع رہوئی سب ڈویژن بہار شریف ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے آپ کے والد ماجد کا نام سید کرم علی تھا آپ کا سلسلۂ نسب[1] یہ ہے۔

سید فضل علی بن سید کرم علی بن سید سیف الدین بن سید محمد امین، بن سید معصوم معروف بہ مرشد بنگالہ بن سید مخصوص بن سید جان بن سید زیا بن سید خاند بن سید خوند بن سید بڑے بن سید سالار بن سید خضر الدین بن سید مبارک بن سید علی مشیر بن سید علی اکبر بن سید علی اصغر بن سید عبد اللہ بن سید علاؤ الدین بن سید محمد شہید بن سید نوح بن سید ابراہیم بن سید عبد الرزاق بن سید عبد المطلب بن سید یوسف بن سید امام حسن بن سیدنا امام موسیٰ رضا علیہ السلام بن سیدنا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بن سیدنا

---

[1] اس نسب نامہ کے لئے میں اپنے برادر مکرم جناب حکیم محمد اشرف جہانگیر صاحب کا ممنون ہوں جن کو علم الانساب سے خاص دلچسپی ہے اور اردو فارسی ادب کا بھی بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں ان ہی کے پاس یہ نسب نامہ خاص سید فرزند علی صاحب برادر زادہ سید فضل علی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا محفوظ ہے۔

ہیر رانجھا سنہ ۱۲۰۱ھ (مخطوطہ کے سنہ کتابت کے مطابق) سے یقینی کئی سال پہلے کی تصنیف ہے گویا یہ مثنوی راسخ کی مثنویوں کے دور کی ہوئی ۔ اس کے بعد چودھویں صدی ہجری کے شعرائے بہار کی کئی مثنویاں ملتی ہیں جن میں اکثر منظر عام پر آ چکی ہیں ۔

اس مثنوی میں ہیر رانجھا کا وہی مشہور قصہ ہے جو غالباً سب سے پہلے پنجابی زبان میں نظم ہوا تھا ۔ اور اس کے بعد مختلف زبانوں میں منظوم ہو کر مشہور عوام ہوا ۔ قصہ یوں ہے ۔

" رانجھا صوبہ سرحد کے ہزارہ نامی شہر کا ایک نوجوان تھا جس نے خواب میں ایک حور پیکر نازنین کو دیکھا اور دل و جان سے عاشق ہو گیا ۔ خواب سے بیدار ہوا ۔ تو دریا کی طرف دیوانہ وار چلا ۔ وہاں اس کو ایک کشتی نظر آئی ۔ کشتی کے ملاح کو اپنی بانسری سے خوش کر کے وہ کشتی پر سوار ہو گیا ۔ وہاں اس کو اپنے خواب کی محبوبہ ہیر سے ملاقات ہو جاتی ہے اور ہیر بھی اس کو دل دے بیٹھتی ہے کچھ دیر دونوں اس کشتی پر رہتے ہیں پھر ہیر اپنے گھر لوٹتی ہے اور اپنے باپ سے سفارش کر کے رانجھا کو ملازم کی حیثیت سے اپنے گھر بلا لیتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے وصل سے شادکام ہوتے رہتے ہیں ۔ شدہ شدہ اس کی خبر ہیر کے باپ کو بھی ہو گئی اس لئے فوراً اپنی قوم کے ایک نوجوان سے اس کی شادی ٹھیک کر دی اور اپنے سمدھی کو لکھ بھیجا کہ اپنی بہو کو جلدی رخصت کرا کر لے جائے ۔ سمدھی نے منظوری کے خط کے ساتھ نامہ بر کو انعام و اکرام دے کر رخصت کیا ۔ ہیر کا باپ جواب پڑھ کر بہت خوش ہوا اور برہمن کو بلا کر اچھا لگن نکلوایا اور دن تاریخ مقرر کر کے سمدھی کو آگاہ کیا ۔ بارات تاریخ معینہ پر آ گئی ۔ لیکن بارات کے آتے ہی ہیر کو بخار آ گیا ۔ اور وہ بیمار ہو گئی ۔ انتظار دیکھ کر ہیر کے باپ نے اس کے دولہا کے ساتھ ہیر کو رخصت کر دیا ۔ اتفاق سے رانجھا بھی مزدور کی حیثیت سے سامان لے کر دولہا والوں کے ساتھ چلا ۔ راستے میں اس سے کچھ کرامت ظاہر ہو گئی ۔ جس کی خبر ہیر کے باپ کو لوگوں نے کر دی ۔ اور کہا کہ کوئی دوسرا مزدور دیجئے یہ تو جادوگر ہے ۔ چنانچہ ہیر کے باپ نے دوسرا مزدور دے دیا ۔ اس واقعہ سے رانجھا فرط غم سے بے خود ہو گیا ۔ اور فقیری لباس پہن کر دیوانہ وار دشت و بیاباں کی راہ لی ۔ ادھر ہیر کا بھی غم سے برا حال تھا ۔ اور خدا سے بار بار دعا کرتی تھی کہ اے خدا اب تو میں رانجھا کی ہو چکی میری عصمت کو محفوظ رکھ ۔ ہونے والی بات گھر پہنچ کر جیسے ہی ہیر کے شوہر نے قربت کا ارادہ کیا فوراً بیمار ہو گیا اور حکیم نے تا صحت اس کو ہیر کے پاس جانے سے منع کر دیا ۔ دوسری طرف رانجھا کا حال سنئے کہ وہ ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا کہ اس کی ملاقات ایک درویش کامل سے ہو گئی ۔ اس نے اس کو عشق حقیقی کی لذت سے

۱۸۱۹ء میں ہوئی ۔ دوسرے یہ کہ اس نسخہ کے کاتب شیخ افضل مالک موضع مقصود پور اڈگانواں ہیں ۔ جو موضع رہوئی سے قریب ہے۔ قیاس غالب ہے کہ کاتب نسخہ ہذا شیخ افضل صاحب سید فضل علی صاحب کے مخصوص دوستوں میں ہوں گے ۔ اور یہ دونوں ایک رتبہ اور ایک مشرب کے بزرگ گزرے ہیں ۔ تیسرے یہ کہ یہ نسخہ مصنف کی کتاب خاص سے نقل کیا گیا ہے ۔ اور اس سے پہلے کوئی نقل اس مثنوی کی نہیں ہوئی ہے جس سے تصنیف کی قربت زمانی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اور یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ۱۸۱۹ء (جو اس مثنوی کے نسخہ کا سنہ کتابت ہے) سے کچھ سال پہلے یہ مثنوی نظم کی گئی ہو گی ۔ اور کاتب نے اپنے دوست کی زندگی ہی میں اس کی نقل کی ہو گی ۔

یہ مخطوطہ جو بسم اللہ سے تمت تک بالکل مکمل ہے میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے جس کے لئے میں اپنے بزرگوں کا منت گزار ہوں اور ان کے لئے دعائے خیر کرتا ہوں ۔

اس نسخے کی کتابت ارولی کاغذ پر پختہ ساہی اور خط شکستہ میں ہے ۔ اور اس کے کل پینتیس ۳۵ صفحات ہیں ۔ ہر صفحہ نو انچ لمبا اور چھ انچ چوڑا ہے ۔ ہر صفحہ میں سطروں کی تعداد مختلف ہے بعض میں دس بعض میں پندرہ بعض میں سولہ بعض میں سترہ اور صرف ایک میں اٹھارہ سطریں ہیں ۔ کل اشعار کی مجموعی تعداد چار سو پچاسی ۴۸۵ ہے ۔

مثنوی ہیر رانجھا جہاں پر ختم ہوئی ہے وہاں مصنف نے "قصہ دیگر" لکھ کر ایک دوسرا قصہ نظم کیا ہے ۔ جو خالص صوفیانہ انداز میں نصیحت آمیز طور پر لکھا گیا ہے ۔ اس منظوم حصے کے اشعار کی مجموعی تعداد سینتالیس ۴۷ ہے ۔

یہ مثنوی بحر ہزج مسدس میں لکھی گئی ہے ۔ جس میں محذوف اور مقصور کے زحافات ہیں (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل)

سید فضل علی صاحب ہی کے ہم وطن قاضی عبدالغفار غفا ہیں ۔ جن کی تصنیف جواہر الاسرار مصنفہ ۱۱۱۷ھ کو کچھ عرصہ ہوا میں نے مختصر تعارف کے ساتھ شائع کر دیا ہے ۔ اور اس کا تفصیلی تذکرہ دوبارہ ہمارے مکرم دوست ڈاکٹر اختر اورینوی صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی نے اپنی کتاب "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" میں کیا ہے ۔

صوبہ بہار کی قدیم مثنویوں کا اگر ہم جائزہ لیں تو ہمیں سب سے قدیم مثنوی شاہ آیت اللہ جوہری کی "گوہر جوہری" ملتی ہے جس کا تفصیلی تذکرہ ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب نے اپنی گراں قدر تصنیف مذکور میں کیا ہے ۔ اور مصنف کے حالات کے ساتھ ساتھ مثنوی کا اقتباس بھی پیش کر دیا ہے ۔ مثنوی گوہر جوہری ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء کی تصنیف ہے یعنی زیر بحث مثنوی ہیر رانجھا ہی کے لگ بھگ ۔ کیونکہ پیش نظر ہیر رانجھا کے مخطوطہ کا سنہ کتابت ۱۸۱۹ء ہے اگر اس مثنوی کی تصنیف کو تیس چالیس سال قبل بھی یعنی ۱۷۷۹ء مان لیا جائے تو دونوں مثنوی کے سال تصنیف میں صرف اکتیس ۳۱ برس کا فرق رہ جاتا ہے ۔

دوسری مثنوی حضرت جوہری کے ایک ہم وطن اور ہم عصر شاعر خواجہ امین الدین امین کی پیش کی جا سکتی ہے جس کے کچھ اشعار "تذکرہ گلشن ہند" میں ملتے ہیں اس کے بعد ہمیں راسخ عظیم آبادی کی مثنویاں ملتی ہیں ۔ راسخ عظیم آبادی ہی کے ہم عصر سید فضل علی صاحب بھی ہیں ۔ کیونکہ راسخ کی پیدائش ۱۱۶۲ھ اور وفات ۱۲۳۸ھ میں ہوئی ۔ اور سید فضل علی صاحب کی مثنوی

جنھوں نے عشق کی بازی کو کھیلا لیا دونوں جہاں کا اس نے پالا

مثنوی کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے سے

ارے دل غور کر کیا کیا مزا ہے جدھر ہوں دیکھتا بہتر خدا ہے
جو دیکھا ہر طرف ساری خدا ہے نہیں ذرہ کوئی اس سے جدا ہے
وہی ہر ایک کا مقصود جاں ہے نہاں آنکھوں سے گو ہے پر عیاں ہے
اسی کے نور سے شمس و قمر ہے اسی کا نور ہر جا جلوہ گر ہے
وہی دریائے دل میں موج زن ہے اسی کے رشحہ سے رنگیں چمن ہے
دلا کیا جلوۂ نور خدا ہے کہ جس کا شمہ یہ ارض و سما ہے
کیا ہے اس نے حسن و عشق پیدا دو عالم کو کیا ہے مست و شیدا

پھر نعت رسولؐ میں چند اشعار کہے گئے ہیں سے

یہ کلمہ مشتہر ہے ہر طبق میں کہا لولاک حق نے اس کے حق میں
نہیں جبریل کو جس جا رسائی کیا اس جا میں جا فرمانروائی
کہاں جبریل کو اس جا ہے یارا رسائی ہو جہاں وہ جلوہ آرا
مکان لامکاں اس کا مکاں ہے خدائی ذات احمدؐ سے عیاں ہے
جہاں ہے جلوۂ ذات محمدؐ دو عالم پرتو یک نور احمدؐ
وہ احمد رحمۃ للعالمین ہے جھکی جس در پہ عالم کی جبیں ہے
زبان خام کو طاقت کہاں ہے کرے نعت اس کی جو معجز بیاں ہے
درود حق صدا بر جان او باد دگر بر آل و بر یاران او باد

اس کے بعد قصے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے سے

اسی پردہ زمیں پر یک جواں تھا کہ رانجھی نام عالم میں عیاں تھا
وہ تھا باشندۂ تخت ہزارا بھرا تھا حسن سے تن اس کا سارا

رانجھی کے حسن کی تصویر اس طرح کھینچی جاتی ہے سے

وسے سج اس طرح اپنی بنائے بہار حسن جیوں گلشن میں آئے
رکھا چیرا زری کا سر کے اوپر خیالات اس پری کا دل میں لے کر
کمر باریک پر کاچھا چڑھا کر گلے دھانی دوپٹا ٹک لگا کر

آشنا کر دیا - اور مرد با خدا بنا دیا - وہاں سے مانگتا کھاتا رانجھا ہیر کی سسرال پہنچا اور اس کے دروازے پر صدا لگائی - ہیر نے عام سائل سمجھ کر اپنی نند سے کہا کہ فقیر کو بھیک دے دے اس کی نند جیسے ہی بھیک دینے گئی رانجھا نے بھیک بھرا چیل اس کے در پر پھینک دیا - ہیر کو جب لونڈیوں سے خبر ہوئی تو اسے بڑا غصہ آیا اور اس کو گستاخ فقیر سمجھ کر دھکے دے کر نکلوا دیا - بیچارا رانجھا آہ و زاری کرتا ہوا وہاں سے روانہ ہوا اور ایک جگہ دھونی رما کر بیٹھ گیا - رفتہ رفتہ وہ مرجوعۂ خلائق ہو گیا - ایک روز ایک عورت اس کے ہاں پہنچی - اس کی مراد جب پوری ہو گئی تو رانجھا نے اس سے یہ خدمت لی کہ وہ ہیر کو حالت سے باخبر کر دے - ہیر کو اس کے ذریعے جب حقیقت حال سے آگاہی ہوئی تو اس نے اپنی نند کو راز دار بنا یا - اس کی نند کا بھی کوئی عاشق تھا جو عرصے سے غائب تھا - رانجھا نے اپنی دعا اور کرامت سے اس کے عاشق کو ملوا دیا - اس کے شکریہ میں اس کی نند بھی ہیر سے رانجھا کو ملا دینے کے لئے تیار ہو گئی - اور ترکیب یہ نکالی کہ ہیر کے پیر میں تنکا چبھا کر شور کر دیا کہ سانپ نے کاٹ لیا - گھر میں کھلبلی ہو گئی - ہیر کا دولہا دیوانہ ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگا آخر ہیر کی نند نے رائے دی کہ فلاں باغ میں ایک درویش کامل ہے وہ اگر جھاڑ دے گا تو یقینی اچھی ہو جائے گی - چنانچہ اس کو بلوایا گیا - رانجھا اس کوٹھری میں گیا جہاں ہیر پڑی ہوئی تھی - اور اندر سے دروازہ بند کر دیا اور اپنی کرامت سے ہیر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور دونوں اس جگہ سے لاپتا ہو گئے - دیر ہونے پر جب دروازہ کھولا گیا تو معلوم ہوا دونوں غائب ہیں - ہیر کا دولہا سر پیٹ کر بیٹھ گیا - وہاں سے رانجھا ہیر کے ساتھ الوپ ہوا تو ایک نگر میں ظاہر ہوا - وہاں کے باسیوں نے ان دونوں کو ستایا اور نگر کے راجہ سے شکایت کی - راجہ کا آدمی بلانے کو آیا تو آزردہ ہو کر رانجھا نے ایک آہ کی اور اس آہ کے اثر سے پورا شہر جلنے لگا - وہاں سے پھر رانجھا مع ہیر کے غائب ہو گیا - تب اس نگر کے لوگوں نے اپنی غلطی کو سمجھا اور پچھتانے لگے کہ درویش کامل کو ستانے کی سزا پائی "

یہاں قصے کو ختم کر کے مصنف نے وعظ و پند شروع کر دیا ہے اور عشق حقیقی کا درجہ بتاتے ہوئے صوفیانہ کیف اور رنگ پیدا کر دیا ہے - مثلاً ؎

نہیں برہ کی اگ ہوتی جس کے جاں میں درندہ رہتے ہیں دونوں جہاں میں

عجب یہ عشق کا سودا ہے یارو دیئے سے نقد جاں ملتا ہے یارو

کسی کے دیکھنے کا ہے پیاسا　　بھٹکتا پھرتا ہے ہو کر اوداسا
مقرر تشنۂ دیدار ہے یہ　　نشہ میں عشق کے سرشار ہے یہ
یہ متوالا برہ کا ہو رہا ہے　　اسی کے واسطے یہاں سو رہا ہے
غرض ہیر عشق کی ماتی کھڑی تھی　　یہ باتیں ہر کسی کی سن رہی تھی

بارات آنے کے بعد ہیر کو بخار آ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے اُس کا دولہا شبِ زفاف میں ہیر سے قربت کرنے سے رہ جاتا ہے۔ اس کو ہیر تائیدِ الٰہی سمجھتی ہے اور اس جذبے کا اظہار اس طرح کرتی ہے ؎

خدا مالک تو ہے دونوں جہاں کا　　تو ہے آگاہ ہی سِرِّ نہاں کا
سوا رانجھی نہ شوہر جانتی ہوں　　نہیں دولہا کوئی بھی مانتی ہوں
اگر دولہا ہمارا ہے وہی ہے　　مجھے رانجھی ملا تو حق سیتی ہے
میں ہوں حرمت اسی کی تو بچالے　　میری فریاد تک جلدی خدا لے
مجھے اس دم جو تو نے تپ دیا ہے　　میری حرمت گئی کو رکھ لیا ہے
توہیں ہے کارساز ما غریباں　　توہیں ہے رہنمائے ما اسیراں
پدر نے گرچہ سونپا اس جواں کو　　توہیں ہے جانتا سرِ نہاں کو
کہ جیسے اس گھڑی حرمت بچایا　　ملا رانجھی سے جلدی یا خدایا
وہ دولہا ہے نہیں منظور میرا　　ملا رانجھی ہمارے سے بسیرا

دلگیر اور دل شکستہ ہو کر رانجھا فقیری لے لیتا ہے اور دشت و بیابان کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ ناگہ ایک درویش کامل سے اس کی ملاقات ہو جاتی ہے اور اس سے وہ فقیری بخشنے کی استدعا کرتا ہے۔ ان دونوں کی جو گفتگو ہے وہ بہت دلچسپ ہے اور اس سے "عشق مجازی" اور "عشق حقیقی" کی حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے ؎

بھٹکتا جا رہا یک دشت اندر　　وہاں بیٹھا ہوا تھا یک قلندر
کہا رانجھی نے اس مردانِ حق کو　　فقیری دیجئے اس مستحق کو
تفقد کیجئے اے میرے رہبر　　کہ جس سے وصلِ حق ہو میرے اوپر
کہا درویش نے اے میرے بابا　　اگر پرہیز بد سے توں کرے گا
اگر حور و ملک سے زن ہو خوشتر　　نہ اوس کو دیکھنا بابا نظر بھر
تب اوس دم دوں گا میں تجھ کو فقیری　　فقیری میں بھری ساری امیری
کہا رانجھی نے اے مردانہ مولا　　ترازو میں یہ دل کے میں نے تولا

سنہری بانسلی ایک ہاتھ میں لے　　جہاں بیتاب ہو جس کی ندا سے

رانجھی کا حسن دیکھ چکے اب ہیر کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو ؎

چلی جس دم وہ دریا کے کنارے　　کرشمہ ناز سے قد کو سنوارے
ہزاروں ساتھ لے اپنے سہیلی　　کوئی بیلی تھی اور کوئی چنبیلی
وہ پہنچی اس طرح دریا کنارہ　　کہ جیوں چاروں طرف مہ کے ستارا
جو پہنچی پاس کشتی کے وہ مہ رو　　تو کیا ہی دیکھتی ہے اک جواں کو

ایک جگہ رانجھی اپنی معشوقہ کی تعریف کرنا چاہتا ہے لیکن کر نہیں پاتا ذرا اس وقت کی بے لبسی ملاحظہ ہو ؎

نشہ میں عشق کے یہ سوچتا ہے　　یہ ملک دلبری میں بادشا ہے
نہیں لیلیٰ اسے کہنا روا ہے　　کہوں کیا اس کو اسرارِ خدا ہے
عجب ہے شکل اس گل کی انوکھی　　یہ شیرینی سے زیادہ ہیگی میٹھی
جو دیکھے گا اسے برباد ہو گا　　مثال کوہ کن فرہاد ہو گا
زلیخا بھی نہیں پاوے گی اس کو　　لگا ہوں میں کبھی بھاوے گی اس کو
زلیخا اس کے جلوے میں نہاں ہے　　مگر یہ یوسف نامی یہاں ہے

مثنوی میر حسن میں اس وقت جب کہ شہزادہ بے نظیر کل کے گھوڑے پر سیر کرتا ہوا ایکا یک بدر منیر کے باغ میں اتر آتا ہے اور وہاں شہزادی بدر منیر کو دیکھ کر غش کھا جاتا ہے۔ بدر منیر کی سہیلیوں کی بوکھلاہٹ جس قدر دلچسپ ہے اس سے کم دلکش نہیں رانجھی کو پلنگ پر سویا دیکھ کر اس کی سہیلیوں کی "چہ میگوئیاں" ہیں۔ ؎

کہا کس ہی نے سن اے مہر انور　　یہ ہے سالار جنّوں کا مقرر
ترے ماںجھی پہ سایا ہے اسی کا　　ترا ماںجھی ستایا ہے اسی کا
ترا بیہوش کیوں ماںجھی پڑا ہے　　نشہ جن کا مگر یہ دلربا ہے
اسی کے واسطے بے ہوش ہے وہ　　اسی کے سایہ میں مدہوش ہے وہ
کسی نے آ کہا جھوٹی ہے بہنا　　کرو موقوف جن کا نام لینا
مگر اس کا کنہیا نام ہے گا　　نہ جانوں کیا ایسے یہاں کام ہے گا
سرہانے بانسلی کی ہے نشانی　　مقرر یہ کنہیا ہے دیوانی
جبھی وہ دیکھتا ہے خوبصورت　　ذرا اپنی دیکھا محبوب صورت
کسی نے آ کہا اندھی ہوئی ہے　　یہ ہے عاشق کسی کا آدمی ہے

وہ پہنچی اس طرح دریا کنارہ   کہ جیوں چاروں طرف رہ کے ستارہ

بہاری اردو کی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے اختر اورینوی صاحب نے اس کی تین خصوصیات بتائی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کی زمین بہاری "اب بجز لشین" ہیں یعنی مگہی، بھوجپوری اور میتھلی۔ دوسری یہ کہ بہاری بولیوں میں پنجابی اثر قبول کرنے کا وہ مادہ نہیں تھا جو قرابت لسانی کی وجہ سے ہریانہ دہلی، مغربی اتر پردیش، راجستھان وغیرہ میں تھا۔ تیسری یہ کہ دہلی سے مسلسل سیاسی ادبی ثقافتی تعلقات ہونے کی وجہ سے وہ لسانی تبدیلیاں جو دارالسلطنت میں ہو رہی تھی دکن کی بہ نسبت بہار میں زیادہ جلد ظاہر ہوئیں اور دہلی کی زبان پر جو تبدیلیاں ہوتی تھیں بہار ان کو فوراً قبول کر لیتا تھا۔ دہلی میں کھڑی بولی کا غلبہ ہوا تو بہاری اردو پر بھی کھڑی بولی کا غلبہ نمایاں ہو گیا۔ اب آیئے اس بیان کی روشنی میں زیر بحث مثنوی کا لسانی تجزیہ کیا جائے۔

فضل علی صاحب راسخ عظیم آبادی کے ہم عصر ہیں اور یہ مثنوی راسخ کے دور میں لکھی گئی ہے جس میں بہار کی ادبی اور تصنیفی زبان کافی صاف شستہ اور ستھری ہو گئی تھی لیکن مثنوی ہیر رانجھا کی زبان اس مناسبت سے اتنی صاف نہیں بلکہ مگہی بولی کا زیادہ اثر پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کے مصنف کو اپنے وطن سے باہر جانے کے مواقع نہ ملے اور اسی لیے باہر کی زبان سے متاثر ہونے کا کم موقع ملا ہوگا۔ دوسرے یہ بھی کہ فضل علی[1] صاحب باقاعدہ شاعر نہ تھے وہ ایک صوفی منش بزرگ اور منعم پاک قدس سرہ کے خلیفہ تھے ان کا مشغلہ زیادہ تر رشد و ہدایت اور پیری مریدی تھا۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے بطور پند و نصیحت اور صوفیانہ اسرار کو پیش نظر رکھ کر اپنے مریدوں کی ہدایت کے لیے اور ان کی دلچسپی کے مطابق لکھتے تھے برخلاف اس کے راسخ کو عظیم آباد سے باہر بھی جانے کے مواقع حاصل ہوئے جس کی وجہ سے ان کی زبان بہت صاف ستھری اور شستہ ہے۔ اور اس پر بجائے مگہی کے کھڑی بولی کا اثر غالب ہے۔ علاوہ ازیں راسخ عظیم آباد کے باقاعدہ شاعر تھے۔ اور اسے وہ فن اور مشغلے کے طور پر برتتے تھے اور اپنے دور کے شعرا میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔

مثنوی ہیر رانجھا میں فارسی ترکیبیں کثرت سے ملتی ہیں بلکہ بعض جگہ پورے کا پورا شعر فارسی ہی میں کہہ دیا ہے، اور جہاں جہاں فارسی ترکیبوں کا استعمال کیا گیا ہے وہ اتنا برمحل اور خوبصورت انداز سے کہ اس سے کلام کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ جیسے رانجھی کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا گیا ہے ؎

اسی پردۂ زمیں پر ایک جوان تھا   کہ رانجھی نام عالم میں عیاں تھا

بہ ملک خویش چوں خورشید او بود   جمال ناز نیناں صید او بود

---

[1] فضل علی صاحب کی شادی خسرو پور بی بی واصلہ سے ہوئی تھی۔ اس خاندان کے لوگ جناب سید شاہ جعفر حسین صاحب، سید شاہ باقر حسین اور سید شاہ اصغر حسین صاحبان بفضلہ بقید حیات اور ہند و پاک میں ممتاز اور سربرآوردہ ہیں۔

کہ جس کے عشق کی ہے یہ کمائی — جنھوں نے راہ مجھ کو یہ دکھائی
نہیں میں چھوڑ سکتا اس پری کو — اگر ہیں آپ کہتے بہتری کو
قلندر نے سنا اس کے بیاں کو — و سمجھا دل میں اس راز نہاں کو
تبسم کر کہا رانجھی کو بہتر — پکڑتا ہاتھ ہوں تیرا مقرر
اگر صید نگاہ ہیر کا ہے — مقید زلف کے زنجیر کا ہے
مگر دل بیچ رکھنا یاد مولا — بہ ظاہر ہیر کا باطن اسی کا
نہو غافل کیا کر یاد حق کا — نہیں ہو جاوے گا ناری حمق سا

"ہر جگہ تو ہی تو ہے" یعنی کثرت میں وحدت کے مسئلے کو تصوفانہ رنگ میں درویش کامل، رانجھا کو کیسے پیارے انداز میں سمجھاتے ہیں ؎

وہی ہر ایک رنگ میں مچا ہے — جدھر دیکھوں ہوں ہر ہر ہو رہا ہے
بچے، اس کے سوا نہیں دوسرا ہے — اسی کا پوجنا ہر دم روا ہے
یہ توں جو دیکھتا ہے شکل میٹھی — سبھی کو پوجنا دھوکے کی ٹٹی
اور اس صورت سے اور ہی کچھ مزا ہے — سب ہی گنبد میں ایک ہی کی صدا ہے

ہیر کے در سے دھکا کھانے کے بعد رانجھی ایک عورت کے ذریعے اپنا پیغام ہیر تک بھیجتا ہے ذرا اس کا زور بیان ملاحظہ ہو ؎

کہے گی ہیر سے میری کہانی — کہ ایک جوگی مٹی اس کی جوانی
وہ رانجھی نام ہے اپنا بتاتا — وہ جوگی ہو تیرے ملنے کو آیا
تو بیٹھی گھر میں سکھ آرام پاوے — و عاشق در پہ تیرے دھکے کھاوے
خرد مندوں نے کیا بہتر کہا ہے — بتوں کی ذات بے شک بے وفا ہے

چند پُر تاثیر اور پیاری تشبیہیں بھی ملاحظہ ہوں ؎

کہوں کیا اس گھڑی کے میں پھبن پر — رکھے دھانی دوپٹہ گورے تن پر
جو موج حسن پر اوس کے نظر کی — لہر چوں سبز پانی میں قمر کی

دوپٹا اس کے منہ پر سے اٹھایا — و چھائیں سبز منہ پر سے مٹایا

ان دونوں میں اکثر جگہ فرق بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً دونوں نے قصے کا آغاز تخت ہزارہ سے کیا ہے۔ دونوں نے ہیرو (رانجھے) کے
ری بجانے کے شوق اور فنی کمال کا ذکر کیا ہے۔ دونوں اس پر متفق ہیں کہ رانجھے کو ہیر سے ملانے میں ہیر کی نند سہتی کا ہاتھ تھا۔ جس
پنی بھاوج کو چالبازی سکھائی کہ جھوٹ موٹ سانپ کاٹے کا مکر کیجیے اور اس کے ایسا کرنے پر اس نے اپنے بھائی سے کہہ کر
ہ کو جوجوگی بنا "کالے باغ" میں بیٹھا تھا، جھاڑنے کے لیے بلوا بھیجا۔ اور اسی کے بعد یہ دونوں وہاں سے نکل بھاگے لیکن وارث شاہ
موقع پر ہیر کی نند سہتی کو بھی اس کے عاشق مراد بلوچ کے ساتھ فرار ہو جانے کا ذکر کیا ہے۔ اور آگے جاکر جب کھیڑے ان کے
ب میں نکلے تو سہتی اور مراد تو نہ پکڑے گئے لیکن ہیر پکڑی گئی۔ ان باتوں کا ذکر فضل علی صاحب نے نہیں کیا ہے اس کے علاوہ
نی کئی اختلافات ہیں۔ مثلاً فضل علی صاحب نے لکھا ہے کہ رانجھا خواب میں ایک حور پیکر نازنین کو دیکھتا ہے اور اس پر عاشق
تا ہے۔ نیند سے بیدار ہو کر وہ دریا کی طرف دیوانہ وار جاتا ہے۔ وہاں اتفاق سے اس کو ایک کشتی کھڑی ملتی ہے۔ جب پر سوار ہونے
س کی ملاقات ہیر سے ہوتی ہے اور وہ وہی اس کے خواب کی محبوبہ نکل آتی ہے۔ لیکن وارث شاہ نے اس کو دوسری طرح لکھا
ایک مرتبہ جھنگ سیال کا ایک آدمی تخت ہزارہ آیا اور رانجھا کا مہمان ہوا باتوں باتوں میں اس نے جھنگ سیال کی عورتوں کے
وجمال کی ایسی تعریف کی کہ رانجھا کو اس دیس کی عورتوں کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا اور وہ ایک دن روانہ ہو گیا۔ راستہ
کشتی سے اس نے دریا پار کیا اس پر ہیر کا پلنگ بھی لایا جا رہا تھا۔ رانجھا مسلمان تھا اور ہیر کا باپ چوچک جھنگ سیالوں کی
سردار تھا۔ کسی نے ہیر سے شکایت کر دی کہ اس کا پلنگ کسی فقیر نے خراب کر دیا۔ وہ غصے میں دریا کنارے سہیلیوں کے ساتھ رانجھا
نے کے لیے پہنچ گئی۔ اور وہاں پہنچ کر اس پر ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی کیوپڈ کا تیر دل کے پار ہو گیا۔ اور وہ
گھائل ہو گئی۔

فضل علی صاحب نے ہیر اور رانجھا دونوں کے فرار ہونے کے بعد قصے کو ختم کر دیا ہے لیکن وارث شاہ نے اس کے آگے ہیر کا
جانا پھر وہاں سے راجہ کے فیصلے کے مطابق ہیر کو رانجھا ہی کے حوالے کیا جانا۔ بعدہ رانجھا کا ہیر کو لے کر جھنگ (یعنی ہیر کے گھر)
آنا بھی لکھا ہے۔ آخر میں قصے کا خاتمہ اس طرح کیا ہے کہ ہیر رانجھا کے جھنگ آنے کے بعد سیالوں کی جب بہت زیادہ بدنامی ہونے
سیالوں نے رانجھا سے کہا کہ تم اپنے گھر ہزارہ سے باضابطہ بارات لاؤ۔ تب تمہارے ساتھ ہیر کی شادی کر دی جائے گی ادھر رانجھا بارات
کا انتظام کرنے کے لیے اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ ادھر سیالوں نے ہیر کو زہر کا پیالہ پلا کر مار ڈالا۔ اور رانجھا کو اس کی اطلاع کرا دی۔ جیسے ہی رانجھا
کے مرنے کی خبر ملی وہ ایک چیخ مار کر گرا اور جاں بحق تسلیم ہو گیا۔

فضل علی صاحب کے مقابلے میں وارث شاہ کے ہیر رانجھا کا پلاٹ زیادہ فطری اور حقیقت سے قریب ہے۔ اس میں قصہ پن بہت
پایا جاتا ہے اور رومانیت اور مستی سے بھرپور بھی ہے۔ فضل علی صاحب کے ہیر رانجھا میں سادگی اور روانی تو ہے لیکن وہ قصہ پن اور
نیت کی فضا نہیں پائی جاتی ہے۔ اس میں خشکی ہے جگہ جگہ پند و نصائح کا ذکر کر کے یا تصوف کے بعض مسئلوں پر اظہار خیال کر کے اس کی افادیت
سے زیادتی کی ہو لیکن دلکشی اور دلچسپی میں کمی کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وارث شاہ کی ہیر رانجھا حد درجہ مقبول اور پر تاثیر ہے۔

اس مثنوی میں ہندی الفاظ بہت زیادہ ملتے ہیں ۔ اس کی بڑی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ ان صوفیائے کرام کو چونکہ مزاج کا بڑا پاس تھا ۔ اور فضل علی صاحب بھی صوفی بزرگ اور صاحب رشد و ہدایت تھے اس لیے ان کے کلام میں ہندیت کا غلبہ کچھ زیادہ تعجب بات نہیں ۔ ان ہی کے ہم وطن لیکن ان سے کئی سال قاضی عبدالغفار غفا گزرے ہیں ۔ ان کی تصنیف جواہر الاسرار ۱۱۱۱ھ کی ہے یعنی ہیر سے ستر اسّی سال پہلے کی لکھی ہوئی ۔ اس کی زبان پر کبیر داس کی زبان کا دھوکا ہوتا ہے ۔ جس کی وجہ بھی میرے خیال میں وہی مزاج ہند کے پاس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ۔

آجکل کے لحاظ سے اس مثنوی کی زبان میں کافی فرق پایا جاتا ہے ۔ مشتے نمونہ از خروارے درج ذیل ہے : ۔

ہیگا ۔	بجائے	ہوگا	جیو ۔	بجائے	جی
جیوں	"	جیسے	دو	"	وہ
کسی ہی نے	"	کسی نے	ان ہی سے	"	یہاں سے
سیتی	"	سے	توں	"	تو
ایسے	"	اسے	توں ہی	"	تو ہی
ادسے	"	اُسے	اوستے	"	اُن سے
مقرر	"	یقینی	کبھیں	"	کبھی
دیکھتا ہے	"	معلوم ہوتا ہے	رہوں ہوں	"	رہتی ہوں
نرباہ	"	نباہ	پوکارا	"	پکارا
جاگہ	"	جگہ	نین	"	نے

لکھنے کے سیاق میں بھی اکثر جگہ فرق معلوم ہوتا ہے

بلا بھیجونگا	بجائے	بلا بھیجونگا
رہ لوالے	"	رہنے والے
سونا تھا	"	سنا تھا
سبھونہ	"	سبھوں نے
نئی	"	نہیں

ہیر رانجھا کی داستان کو سب سے پہلے پنجابی زبان کے مشہور شاعر وارث شاہ نے نظم کیا تھا اور اس کی مقبولیت ایسی ہوئی کہ شاید ہی پنجاب میں کسی قصے کی کتاب کو ہوئی ہو ۔

فضل علی صاحب کی مثنوی ہیر رانجھا اور وارث شاہ کی ہیر رانجھا قصے کے لحاظ سے جہاں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے

بہار کوٹی

سیماب اور جدید نظم

علامہ سیماب نے شعرِ مہذّب کے مخترع ہونے کا دعویٰ ان الفاظ میں کیا ہے " سلسلہ شعرِ مہذب کا مرے گھر سے چلا" شعرِ مہذب سے ان کی مراد غالباً رکاکت اور ابتذال سے پاک شعر ہے ۔ ان کا دعویٰ لفظ بہ لفظ صحیح ہے ۔ اس لیے کہ جس دور میں سیماب کی شاعری کا آغاز ہوا " شعرستان ہند" کی فضا رکیک اور سوقیانہ اشعار سے گونج رہی تھی اور رسمی اور سپاٹ شاعری وجہ گرمیٔ بزم سخن بنی ہوئی تھی ۔ شعرِ اردو کی ارتقائی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے گواہ ہیں کہ ؎

ادب کو اُس کے انفاسِ جواں نے زندگی بخشی

شعرِ اردو کی تاریخ تو وہ ہے جو ہمارے ناقدین نے مرتب کی اور جس میں بڑا ہاتھ مغربی ادب سے متاثر طبقے کا ہے اور پھر اس کے بعد ترقی پسند گروپ کا ۔ اور دوسری تاریخ وہ جو قارئین کے ذہنوں میں ان کے خاموش مطالعے نے ثبت کی اور میں اسی تاریخ کو مستند سمجھتا ہوں ۔ مغربی ادب سے متاثر طبقے نے یا یوں کہیے کہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے ہمارے بعض شعرا کے ساتھ جو ستم ظریفیاں روا رکھیں وہ کسی منصف مبصر سے پوشیدہ نہیں ۔ سیماب کو جی کھول کر ان کے نقادوں نے تختۂ مشق بنایا ۔ انھوں نے سیماب کی کھل کر مخالفت تو نہیں کی لیکن انھیں اور ان کے کام کو اس طرح نظر انداز کیا جیسے وہ کہیں تھے ہی نہیں ۔ سیماب مسلم یونی ورسٹی مخاطب کرکے چیختے رہے ؎

اے عروسِ علم و تدبیر و عمل، عمرت دراز
جذبۂ پابندیٔ تقلید کو تعطیل دے
درسِ دیرینِ حرم کو فرصتِ تکمیل دے

لیکن کسی نے پروا نہ کی ۔ وہ کہتے ہی رہے ؎

تعالی اللہ ارمن تاج سر افرازیاں تیری
عروجِ اکبر و شاہِ جہاں کے عہدِ رفعت میں
ترے گھر میں پڑی بنیاد اس ایوان عالی کی
ادب کہتے ہیں جس کو اصطلاحِ علم و حکمت میں

اور مولوی اسمٰعیل نے سب سے پہلے ہمارے ادب کو اس صنف سے آشنا کیا جس کو ہم آج نظم جدید یا صرف نظم کہتے ہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ یہ بزرگ اپنے مشن میں کس حد تک کامیاب ہوئے مگر اسمٰعیل اور آزاد کی معریٰ اور آزاد نظمیں بتاتی ہیں کہ وہ اپنی مساعی سے مطمئن نہ تھے۔ ان سے ایک طویل وقفے کے بعد عظمت اللہ اور پھر تصدق حسین خالد اور ان کے ساتھیوں نے نئے تجربے شروع کیے۔ موجودہ ترقی پسند نظم خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کہے اسی موخرالذکر گروپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں نے تصدق حسین خالد اور ان کے ساتھیوں کی زبان سے اُن کی آزاد نظمیں اس وقت سنی ہیں جب کسی نے ترقی پسندی کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ جہاں ایک طرف نئے حالات اور نئے تصورات کو نظم کا لباس دینے کے لیے نئی ہیئت کی تلاش جاری تھی وہیں دوسری طرف ان حالات اور تصورات کو پرانے سانچوں میں ڈھالا جا رہا تھا۔ اس تجربہ گاہ میں سرور جہان آبادی چکبست۔ شبلی۔ ظفر علی خاں۔ اکبر۔ اقبال۔ سرور۔ صفی اور سیماب پیش پیش تھے۔ اقبال۔ سرور اور سیماب ہیئت کا بھی تجربہ کر رہے تھے اور ان کے دوش بدوش نوجوان اختر شیرانی بھی ہیئتی تجربہ میں شریک تھا۔ در اصل اس نظم کے تاثر کا راز ہیئت کی تلاش ہی میں مضمر ہے کسی تصور کے اظہار کے کیسے سے الفاظ مناسب ہوں گے اور یہ الفاظ کس صحیح بحر میں کھپ کر زیادہ ہم آہنگی۔ توازن اور زور پیدا کر سکیں گے اسی نکتے کو سمجھ لینا ہی صحیح نظم نگاری ہے۔ سیماب نے اس راز کو سمجھ لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مرکزی تصور ہی نظم کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور یہ کہ مرکزی تصور کا وقار ہیئت کی تلاش سے وابستہ ہے محسوسات کو پوری شدت کے ساتھ دوسرے میں منتقل کرنے کے لیے ہیئت۔ ساز اور آہنگ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ نظم کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کس طرح کلائمکس کی طرف رجوع ہو کر نقطۂ اختتام پر پہنچتی ہے۔ یہ سمجھ لینا ہی نظم نگار کی معراج ہے۔ اردو میں بہت کم نظمیں ملیں گی جن میں ٹکنک کا کوئی خاص التزام پیش نظر رکھا گیا ہو۔ اختر شیرانی کی نظمیں اس لیے پسند کی گئیں کہ ان میں رس تھا۔ اقبال اس لیے مقبول ہوئے کہ وہ اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ جوش اس لیے سراہے گئے کہ ان کے یہاں بغاوت اور انقلابیہ نعرے تھے اور ہمیں ان نعروں کی ضرورت تھی۔ جب مولانا نیاز نے سیماب کی نظم "موجدِ اعظم" کے متعلق کہا تھا کہ آرٹ کے اعتبار سے یہ نظم بلند پایہ نہیں۔ سیماب کے پرستاروں کو تکلیف تو ضرور ہوئی تھی مگر ذرا سے غور کرنے پر انھیں نیاز کے قول کی صداقت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ آرٹ سے نیاز کی مراد عروض کی موشگافیاں نہ تھیں بلکہ جدید نظم کی وہی ٹکنک تھی جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ سیماب کی چند نظموں کو چھوڑ کر تمام کی تمام نظمیں ٹکنک کے اعتبار سے بلند ہیں۔ اور اُن کی ساٹھ سالہ مشق و ممارست کا اقتضا بھی یہی تھا۔ وہ زبان کی حیات باطنی اور جذبات کی غیر آشکار گہرائی سے واقف تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ادب ذہن کا وہ جوہر گراں مایہ ہے جو اکتساب علوم و فنون کے بجز صرف ادراک اور معارف کی قوت سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ شعر وہی ہے جو سماعت سے گزرتے ہی روح کو چھو لے اور جسے بار بار سننے کے بعد بھی سماعت کی تشنگی باقی رہے۔ خود سیماب سے اُن کی شاعری کے متعلق سنیئے:۔

"میری ابتدائی شاعری میں صوفیانہ بغیر سنین اور بازاری عنصر کبھی نہ تھا میں

تری ہی خاک سے پیدا ہوئے میر اور غالب بھی ہیں تیرے ہی عناصر کارفرما میری خلقت میں
ستاسی سال بعد میر ہے تخلیق غالب کی یہی وقفہ ہے میری اور غالب کی ولادت میں

مگر کسی اللہ کے بندے نے کان نہ دھرا - ایسا کیوں ہوا - کیا سیماب کے ان داعیات سے ناقدین ادب کو چڑھ ہوگئی تھی یا واقعی سیماب قابل اعتنا ہی نہ تھے ؟ - میرا تدریجی تاریخی مطالعہ (جس کا تعلق اس تاریخ سے ہے جو قارئین کے ذہنوں میں ثبت ہے اور جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے) کہتا ہے کہ اس میں سیماب کا نہیں ناقدین کا قصور تھا - میں سیماب کو ۱۹۲۴ء سے خاموشی کے ساتھ پڑھتا اور سنتا رہا ہوں اور تقابلی طور پر ان کے ہم عصروں کو بھی، اور مجھے سیماب کے اس قول میں کہ "جہاں منزل پہ میرے کارواں کے بعد پہنچے گا" بڑی صداقت نظر آتی ہے۔

ترقی پسند ادب کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ناقد بھی میدان میں آیا اور ترقی پسندی کے فروغ و احیا کے لیے اس نے کیا کیا اور کس کس طرح کیا یہ کسی سے پوشیدہ نہیں - یہاں بھی سیماب کے ساتھ ظلم ہوا - پھر جب ہم متذکرہ بالا دونوں گروہ کے ناقدین کی تنقیدی کتب پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ سیماب کا ذکر بڑی مدھم لے میں کیا گیا ہے تو ہمیں یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ سیماب ایسے ہی تھے جیسا انھیں پیش کیا گیا ہے۔

سیماب نے اپنے شعری نظریات کا جگہ جگہ اعلان کیا ہے اور غالباً انھیں نظریات کی توثیق کے لیے انھیں شاعر اور اس کے متعلقات پر مندرجۂ ذیل عنوانات سے دس نظمیں لکھنی پڑیں۔ (۱) شاعرِ امروز (۲) شاعر کا نصب العین (۳) شاعر اور سروش (۴) شاعر کا مذہب (۵) شاعر (۶) شاعر کا دل (۷) شاعر کی موت (۸) شاعر کی تربیت (۹) شاعر کا نغمہ (۱۰) قصر الادب - ان نظموں سے شاعر کے نصب العین کی تعین اس طرح کی گئی ہے۔

"نقوشِ نو سے مصروفِ گریز نہ ہو - کاروانِ رفتہ کے دھندلے نشان قدم پر سجدہ ریزی نہ کرے - اس کا ہر شعر ترجمانِ دردِ قوم ہو - محفل میں رجز گاتا ہوا جائے - چاندنی راتوں میں بیداری کی دولت تلاش کرے - رہ گزار جنگ میں حدی خوانی کرے نظم آزادی اپنے خون سے لکھے - لبِ گفتار سے شعلے تراشے - اسے قبل سحر آوازِ سروش آئے - اس کے احساس پر کیفیت کی بارش ہو - شہپر جبریل کی صدا سنے - اس کے دامن پر رگِ گل سے لہو ٹپکے - ساغرِ خورشید میں شراب لا - فام چھلکائے - پھولوں کے ورق پر قطرۂ شبنم سے طرح کا مصرع لکھا ہوا دیکھے - آگ سے عطرِ گلاب نچوڑے - شوالے کی چوکھٹ پر نماز پڑھے"۔

اور یہ صرف داعیات ہی نہیں - سیماب نے انھیں عملی جامہ پہنانے میں اپنی عمرِ عزیز کا آخری لمحہ تک صرف کر دیا - ظاہر ہے کہ اس شاعری کے لیے تنگنائے غزل کافی نہ تھا - اور سیماب کو بھی نظم کی طرف آنا پڑا - آج ہم جس صنفِ شعر کو نظم کہتے ہیں وہ مخمس - مسدس - مسمط - مثلث - مستزاد - قصیدہ - مرثیہ - قطعات - رباعی اور مثنوی سے الگ کچھ اور ہے - شعرا کے اتنے اصناف یقیناً غزل سے الگ ہو کر اظہار خیال کے لیے وضع کیے گئے ہوں گے لیکن قدما نے ان اصناف کو جس طرح برتا اور ان میں جن تصورات کو پیش کیا وہ ان کے ماحول اور دور رس کی پیداوار کیوں نہ ہوں بڑی حد تک دور از کار رکھتے - حالی محمد حسین آزاد

اور جذبۂ ستائش کا یہ حق ادا نہیں کر سکتا تھا۔ گوتم بدھ بھی اسی قبیل کی نظم ہے۔

"سوسائٹی" اور "مزدور" میں سیماب کا دل دھڑک رہا ہے۔ مزدور کو اُن کے دلِ دردمند کی پکار کہنا چاہیئے جس میں دکھے ہوئے دل کی آواز گھلی ملی ہے ؎

گرد چہرے پر پسینے میں جبیں ڈوبی ہوئی — آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
جا رہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا — ہانپتا، گرتا، لرزتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا
مضمحل واماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال — چار پیسے کی توقع، سارے کُنبے کا خیال
اپنی خلقت کو گناہوں کی سزا سمجھے ہوئے — آدمی ہونے کو لعنت اور بلا سمجھے ہوئے
اس کے دل تک زندگی کی روشنی جاتی نہیں — بھول کر بھی اس کے ہونٹوں پر ہنسی آتی نہیں

نظم ختم ہوتے ہوتے تیور بدل جاتے ہیں اور مزدور کی مصیبت کا واحد سبب سرمایہ داری کو سمجھتے ہوئے سرمایہ دار سے خطاب کرتے ہیں ؎

دیکھ اے قارونِ اعظم دیکھ اے سرمایہ دار — نامرادی کا مرقع بے کسی کا شاہکار
گو ہے تیری ہی طرح انسان مگر مقہور ہے — دیکھ اے دولت کے اندھے سانپ یہ مزدور ہے

"ہندوستانی ماں کا پیغام" میں ہندوستانی عورت کے حقوق جس طرح ٹھکرائے گئے ہیں اور اسے جس طرح رفتہ رفتہ معطل بنا یا گیا ہے اس کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے ؎

پہلے جو زُلفیں رسن تھیں ظلم رانوں کے لیے
اب فقط کالی گھٹا ہیں عیش خانوں کے لیے
پہلے جو تیور تھے بجلی اب حیا آسودہ ہیں
جن سے کف اُڑتا تھا اب وہ لب مسی آلودہ ہیں
درسِ آزادی کا دیتی کیا تجھے آغوش میں
میں تو خود ہی قید تھی اک محبسِ گل پوش میں

ہمارے گھروں کو محبسِ گل پوش کہنا سیماب ہی کا کام تھا۔ خود غرض بیٹے سے ہندوستانی ماں اَزراہِ استحقار پھر کہتی ہے ؎

زر پرستی کے لیے بن جائے جو ملت فروش
بے حمیت ہو، وفا دشمن ہو، اور غیرت فروش
اُس سے بڑھ کر اور قسمت کا کوئی ہیٹا نہیں
[illegible]

شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں
میری شاعری کا موضوع حسن محض یا عشق محض ہے - میں خیالات کو صداقت
پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں - مجھے تمام اصناف سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے
مگر میں نظم - غزل اور رباعی کو اظہار خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں"

ان خیالات کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا وہ شعر کو ایک روحانی پیغام، ایک سرمدی نغمہ اور ایک ایسی روح لطیف تصور کرتے ہیں جو سننے والے اور پڑھنے والے کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکے - ان کے نزدیک شعر وہی ہے جو داخلی محسوسات یا خارجی تاثرات کا صحیح ترجمہ ہو اور واقعیت سے بھرپور ہو - سیماب محسوس شاعری کے قائل ہیں - زبان کی بلند پائگی اور متانت الفاظ تراکیب کی چستی، جذبات کا اچھوتا پن ہی ان کے ادب کی جان اور شاعری کی روح ہے -

ان کی نظمیں "سری کرشن"، "گوتم بدھ"، "سوسائٹی"، "مزدور"، "شاعر امروز" اور "تیرے ماضی کی یاد میں" ہیئت، ساز و آہنگ، اسلوب، اور عمدگی کے اعتبار سے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے - ان نظموں میں ان کا دل پوری قوت سے دھڑک رہا ہے - "تیرے ماضی کی یاد میں" وہ "شعر مہذب" کی قیود سے آزاد نظر آتے ہیں لیکن اس چیز نے نظم کو زیادہ وقیع اور پر تاثیر بنا دیا ہے - اس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے ؎

وہ التفات وہ رجحان، وقت عرض سخن
وہ انکھڑیوں کا جھکانا دم خطاب ترا
وہ آرزو سے کھٹکتا ہوا سوال مرا
وہ رنگ و بو سے مہکتا ہوا جواب ترا
وہ تیرے کیف ترنم میں میرا کھو جانا
وہ میرے گرم تنفس سے اجتناب ترا
وہ اپنے کیف میں خود اک طرح کی مدہوشی
وہ اک مجسمۂ آلودۂ شراب ترا
مری خوشی پہ وہ تیرا تبسم رنگیں
وہ میرے جذبۂ برہم پہ اضطراب ترا

سری کرشن میں ؎

ہوا طلوع ستاروں کی دل کشی لے کر سرور آنکھ میں نظروں میں زندگی لے کر

سے لے کر آخری شعر تک عجیب والہانہ پن اور سرمستی ہے - میرا خیال ہے کہ کوئی ہندو شاعر اور کرشن بھگت بھی عقیدت مندانہ

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

پورن سنگھ ہنر

امرتسر سے دیرینہ نسبت ہے لیکن آپ کے والد ماجد جب تجارت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے تو آپ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۳ء کو وہیں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب علم جیوتش میں مہارت تامہ رکھتے ہیں اور اس فن پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی تعلیم لالہ چندو دیال سنگھ ہائی اسکول میں ہوئی اور وہیں سے میٹرک پاس کیا اور پھر ادیب فاضل۔ آپ ابھی ہائی اسکول میں داخل ہی ہوئے تھے کہ خوش قسمتی سے علامہ تاجور نجیب آبادی اسکول میں اردو ٹیچر مقرر ہو کر آئے اور آپ کو اردو فارسی پڑھانے لگے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً بزم آرائی شروع کر دی چنانچہ یہیں سے آپ کی شاعری کا آغاز ہوا۔

حسن اتفاق سے پنڈت میلا رام وفا بھی لاہور میں آپ کے ہمسایہ تھے اور ڈاکٹر منوہر سہائے انور پی ایچ ڈی بھی لاہور ہی تھے۔ علامہ موصوف کے دولت کدہ پر یہ دونوں حضرات بھی تقریباً ہر روز رونق افروز ہوتے یہاں شعر و سخن کا چرچا رہتا آپ بھی حظ اٹھاتے آپ اکثر دیال سنگھ ہائی اسکول اور ایس پی ایس ہال کے مشاعروں میں بھی شامل ہوتے اور اپنا کلام سناتے۔ علامہ تاجور کے رسالہ "ادبی دنیا" کی ترتیب و تدوین میں بھی کچھ عرصہ تک ضروری خدمات انجام دیتے رہے۔ علامہ کی انجمن ارباب علم کے پرچے میں بھی آپ کا کلام شائع ہوتا تھا۔ علامہ نے اردو مرکز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ حضرت اصغر گونڈوی جگر مراد آبادی اور حضرت یاس یگانہ سے اس ادارہ کے طفیل میں تین سال تک بے تکلف اور پُر خلوص تعلق رہا۔

۱۹۲۶ء میں چند ناگزیر حالات کے باعث آپ کو امرتسر آنا پڑا یہاں بارہ تیرہ سال تک رسالہ چمن کی ادارت آپ کے تفویض میں رہی۔ رسالہ "چمن" کی ادارت کے زمانے میں آپ کو پانچ چھ مرتبہ دہلی لکھنؤ کانپور آگرہ الہ آباد بنارس، پٹنہ اور حیدر آباد دکن کے ادبی مراکز پر جانے کا موقع ملا اس ادبی سفر کی روداد رسالہ چمن امرتسر میں شائع ہوئی۔ "کشتری ہتیشی" ہفت روزہ ماہنامہ سیار کی ادارت بھی تا دیر کی۔ پنجاب اور یوپی کے اکثر مشاعروں میں شرکت کی "زمانہ" کانپور "چاند" الہ آباد "آجکل" دہلی وغیرہ میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا رہا ہے۔

مشق سخن رسالوں کی ادارت اور دیگر حالات نے کچھ مدت تک تعلیمی سرگرمیوں پر پہرہ بٹھائے رکھا بہر حال ۱۹۳۵ء میں

سرزمین تاج پر متعدد نظمیں ہیں جنھیں " ارض تاج " کے عنوان سے کتاب کے آخری حصے میں شریک کیا گیا ہے۔ ان میں سرزمین تاج سے والہانہ محبت کا جذبہ رچا ہوا ہے۔ متعدد سیاسی نظمیں بھی ہیں جو قدرے ہلکی ہیں اور غالباً اس لیے کہ وہ سیاست میں کسی خاص مسلح نظریے کے علمبردار نہ تھے، بہت سی ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں صرف دماغ - کہنہ مشقی اور قوت شعری کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور تاثر مفقود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کبھی کچھ شعر ہو گیے اور انھیں مناسب عنوان دے کر نظم کی شکل دے دی گئی ہے۔

مجموعی حیثیت سے سیماب اردو کے بلند ترین نظم نگار ہیں - اور بقول نیاز ان کی افضلیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ شعر کہتے کہتے اتنا منجھ گیے تھے کہ جو کچھ بھی کہتے تھے ان میں بڑی توانائی ہوتی تھی۔

اسیروں میں فقط اک میں ہوں جو شاکی نہیں اس کا — چمن میں ورنہ ہر سو شکوۂ صیاد ہوتا ہے
بہار آئے خزاں آئے اسے دونوں برابر ہیں — دلِ بلبل ہمیشہ مائلِ فریاد ہوتا ہے

ایک سننے کی بات لایا ہوں — شکوۂ التفات لایا ہوں
پھر نہ شاید سنا سکوں تم کو — لب پہ مشکل سے بات لایا ہوں
دھوم تیرے کرم کی سن کر میں — آرزوئے نجات لایا ہوں
رشک ہے خود حیات کو جس پر — وہ طریقِ حیات لایا ہوں
ملک الموت مجھ سے کہتا ہے — میں پیامِ حیات لایا ہوں
نگہِ صبر سوز کے آگے — میں شکستِ ثبات لایا ہوں

کچھ تصنع نہیں غزل میں تہنر
قلب کے واردات لایا ہوں

کیوں آئے دل میں موت کا ارماں کبھی کبھی — کرتے رہو جو پرسشِ پنہاں کبھی کبھی
کنجِ قفس بہشتِ فراغت سہی مگر — تڑپا گئی ہے یادِ گلستاں کبھی کبھی
تدبیر کے بغیر بھی مل جاتی ہے مراد — ہوتا ہے خود بخود ہی یہ ساماں کبھی کبھی
کیوں عالمِ خیال کو جاؤں میں چھوڑ کر — دیکھا ہے اس میں جلوۂ جاناں کبھی کبھی
اٹھتا ہے میرے سینۂ پرسوز سے دھواں — ہم شکل گردِ بادِ بیاباں کبھی کبھی
میری ہستی کو خندۂ شادی نہ چاہیئے — ہنستا ہے اپنے حال پہ انساں کبھی کبھی

چاہو اگر فلاح دو عالم تو اے تہنر
لیتے رہو دعائے بزرگاں کبھی کبھی

پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا اور پیشہ معلمی اختیار کیا جو آج تک جاری ہے۔

لاہور کی اقامت کے دوران اور سیر و سفر کے سلسلے میں جن گرامی قدر شعرا کا ذکر آیا ہے آپ کو ان کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کے بہت مواقع حاصل رہے ہیں۔ ان کے فیضِ صحبت سے آپ نے بہت استفادہ کیا۔ ابتدا میں جناب وفا سے چند غزلوں پر اصلاح لی اور بعد میں باقاعدہ طور پر ڈاکٹر منوہر سہائے انور ایم اے پی ایچ ڈی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ جناب جوش ملسیانی سے بھی آپ نے استفادہ کیا ہے۔ آپ کے قدیم و جدید کلام کا ایک انتخاب "آہنگِ غزل" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ آپ نے ہر صنفِ شعر میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل گو شاعر کی حیثیت سے آپ کا نام پنجاب کے ان قابلِ ذکر شعرا میں ہوگا جن کی خدمات کو اردو ادب کبھی نہیں بھلا سکتا۔ غزلوں کی زبان شیریں اور صاف ہے۔ عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ غزلوں میں استعمال نہیں کرتے غزل میں گہرائی لطافت اور تازگی پائی جاتی ہے۔ چند غزلیں ملاحظہ فرمائیے۔

ہم تم ہیں اور رات عجیب اتفاق ہے　　　پھر رقصِ کائنات عجیب اتفاق ہے
ہے برگِ گُل سے الفت کبھی نوکِ خار سے　　　نیرنگِ التفات عجیب اتفاق ہے
ہے اعتبار مجھ کو بھی تیرے ثبات کا　　　اے حسنِ بے ثبات عجیب اتفاق ہے
میں مستحق نہ تھا کرمِ بے حساب کا　　　مجھ پر یہ التفات عجیب اتفاق ہے
اٹھی مری طرف بھی تمہاری نگاہِ لطف　　　تم اور التفات عجیب اتفاق ہے
ہر ذرے کی نمود کو دعویٰ ثبات کا　　　ہر ذرہ بے ثبات عجیب اتفاق ہے
پہلے حیات تھی مری نظروں میں ایک موت　　　اب موت ہے حیات عجیب اتفاق ہے

وارفتگیٔ شوق میں اب بھی کمی نہیں　　　وہ آ گئے ہیں اور مجھے آگہی نہیں
مانوس ہو گیا ہوں مصائب سے اس قدر　　　اب خستگیٔ دل سے بھی دل خستگی نہیں
عالم فروز برقِ تجلی سہی! مگر　　　یہ کیا کہ اذنِ دید کبھی ہے کبھی نہیں
پھر ربط ہی ازل سے ابد تک کہاں رہا　　　کہتے ہیں جس کو موت اگر زندگی نہیں
بامِ عروج پر وہ پہنچنے نہ پائے گا　　　رازِ فتادگی سے جسے آگہی نہیں

کبھی محوِ تخیل جب دلِ ناشاد ہوتا ہے　　　جہاں کی حد سے باہر اک جہاں آباد ہوتا ہے
جو زندانِ خودی کو توڑ کر آزاد ہوتا ہے　　　وہی معنی شناسِ عالمِ ایجاد ہوتا ہے
تلاشِ رہبرِ کامل کی جو پروا نہیں کرتا　　　وہ رہرو ہر قدم پر دفعتہ برباد ہوتا ہے

نسیم سروری

اُردو ادب کے غیر ادبی مآخذ

(۱۲)

تاریخ مظفّری

تصنیف

نواب محمد علی خان انصاری

پاک و ہند کی جن تاریخوں کو اہمیت دی جاتی ہے، اُن میں ایک تاریخ مظفری بھی ہے۔ اہلِ علم، خاص کر تاریخ نویس اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ ایلیٹ کے پیشِ نظر یہ تاریخ بھی تھی۔ اورکین نے تو اپنی تاریخ " زوالِ سلطنتِ مغلیہ" کی بنیاد اسی کتاب پر قائم کی تھی۔

اس تاریخ میں امیر تیمور سے لیکر عالی گوہر شاہ عالم ثانی تک کے حالات ہیں۔ چودھری نبی احمد خان سندیلوی کا بیان ہے کہ مصنف نے اپنے انگریز دوستوں کی فرمائش سے ۱۸۱۰ء میں یہ تاریخ مرتب کی اور مظفر جنگ مبارز الملک خانخانان معین الدولہ نواب محمد رضا خان کے ساتھ تعلقات ہونے کی وجہ سے مصنف نے کتاب کا نام "تاریخ مظفری" رکھا [1]

کتب خانۂ انجمن ترقی اُردو (پاکستان) میں بھی اس کتاب کا ایک مخطوطہ ہے۔ یہ نسخہ کلاں تقطیع کے (۴۰۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق اور واضح ہے؛ ۱۲ سطر کا مسطر اور کسی قدر جلی قلم استعمال کیا گیا ہے۔ شروع میں مصنف کا دیباچہ اور آخر میں بمذکرہ کے عنوان سے خاتمہ ہے۔ خاتمے کی عبارت، سے واضح ہے کہ محمد مجاہد الدین خان نے، محمد شرف الدین خان کے مطالعے کی غرض سے ۱۲۵۳ھ میں بمقام فرخندہ بنیاد حیدر آباد اس کی کتابت کی۔ کاتب ذی فہم ہے۔ اور جس نسخے سے یہ نسخہ نقل کیا گیا ہے، وہ صاف و مستند ہوگا۔ اس لئے کتابت کی اغلاط بہت کم ہیں۔

تاریخ مظفری کو چار جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی جلد دیباچے کے صفحہ ۴ سے شروع ہوتی ہے، اور چوتھی جلد کا خاتمہ صفحہ ۴۰۳ پر ہوا ہے، جلد کا آغاز و اختتام اہتمام سے نہیں کیا گیا، گزشتہ جلد کے خاتمے کے بعد صفحہ پر جو چند سطریں بچ رہی تھیں وہیں سے نئی جلد شروع کر کے حاشیہ میں آغاز جلد کی صراحت کی گئی ہے۔

---

[1] ۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں: "مورخین ہند" از حکیم سید شمس اللہ قادری ص۷۱ اور "تذکرۂ مورخین ہند" از چودھری نبی احمد سندیلوی ص۱۳۵

ہفت مقالہ

(فارسی زبان و ادب)

یہ رسالہ "اردو" کے ایسے مضامین کا انتخاب ہے جو فارسی زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ یہ انتخاب ممتاز ماہر ایرانیات سید حسام الدین راشدی نے کیا ہے۔ اِس مجموعے میں مندرجہ ذیل مقالے شامل ہیں۔

- تصنیفات شیخ فرید الدین عطّار — حافظ محمود شیرانی
- شاہ نامے کا دیباچہ قدیم — حکیم شمس اللہ قادری
- فردوسی کا مذہب — پروفیسر شیخ محمد اقبال
- رباعیاتِ عمر خیام — عبدالباری آسی لکھنوی
- فارسی زبان کے زیرِ سایہ اُردو کی تدریجی ترقی — ڈاکٹر سید عبداللہ
- نواب صمصام الدولہ شہنواز خاں (صاحب مآثر الامرا) — محمد حسین محوی صدیقی

انجمن ترقی اُردو

بابائے اردو روڈ

کراچی نمبر ا

یں چند شاعروں کا یہ حوالہ بھی مفید ہوگا۔

(۱) عبدالقادر، بیدلؔ صہ۱۱۳

(۲) شیخ حسین شہرتؔ

(۳) موتمن الدولہ نواب اسحٰق خان اسحٰقؔ صہ۱۴۹

(۴) شیخ حفیظ اللہ، آثمؔ صہ۱۵۰

(۵) میر حیدر، تجریدؔ صہ۱۵۷

(۶) میرزا لطف اللہ بیگ المخاطب بہ نصرت اللہ خان، نثارؔ صہ۱۶۰

(۷) میرزا محمد رضا، قزلباش خان، اُمیدؔ صہ۱۶۱

(۸) عمدۃ الملک امیر خان، انجامؔ صہ۱۶۲

(۹) نواب آصف جاہ، نظام الملک، آصفؔ صہ۱۷۰

(۱۰) محمد نظام، معجزؔ صہ۱۸۵

(۱۱) محتشم علی خان، حشمتؔ صہ۱۸۹

(۱۲) سراج الدین علی خان آرزوؔ صہ۲۲۳

(۱۳) علی قلی خان والہؔ داغستانی صہ۲۳۰

(۱۴) شاہ قابل، محمد پناہ، قابلؔ صہ۲۴۲

(۱۵) شیخ عبدالرضائے اصفہانی، متینؔ صہ۲۷۳

(۱۶) سید غلام حسین، سالکؔ صہ۲۸۱

(۱۷) راجہ رام نراین، موزوںؔ صہ۲۹۵

(۱۸) علی ابراہیم خان، علیؔ صہ۲۹۵

جیسا کہ عرض کیا گیا، ان (۱۸) شعراء کا ذکر ان کے انتقال کے ضمن میں ہے، اس لئے بعض شعراء کی صحیح تاریخ انتقال دستیاب ہوجاتی ہے۔ علی ابراہیم خان کی شخصیت تاریخ ادب اُردو میں ان کے تذکرہ گلزارِ ابراہیم کی وجہ سے بہت بلند ہے، اس لئے ان کے انتقال کے حال میں ایک اچھا مواد دستیاب ہوتا ہے۔

کتاب کا آغاز " ذکر بانوی عصمت مآب النقوا دلپسر انشن " سے ہوا ہے۔ اس کے بعد " ذکر مختصری احوال حضرت صاحبقران گیتی ستان امیر تیمور گورگان نور اللہ مرقدہٗ " ہے۔ پھر با بر بادشاہ اور اس کی اولاد و احفاد کے واقعات شروع ہوتے ہیں۔ چوتھی جلد جو صفحہ ۲۵۸ سے شروع ہوئی ہے " ابوالمظفر جلال الدین عالی گوہر شاہ عالم ثانی " کے واقعات سلطنت کے لئے مخصوص ہے۔ کتاب آصف الدولہ نواب یحییٰ خان کے واقعۂ رحلت پر ختم ہو جاتی ہے یہ واقعہ ہے سلخ ربیع الاول ۱۲۱۳ھ (مطابق ۱۷۹۸ء) کا۔

حکیم سید شمس اللہ قادری اور چودھری نبی احمد سندیلوی نے تاریخ مظفری کے جن نسخوں کا حوالہ دیا ہے وہ انجمن ترقی اردو کے زیر بحث نسخے سے کسی قدر اختلاف کے حامل ہیں۔ لیکن ان اختلافات پر بحث کرنا، میرے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ اتنا عرض کروں گا کہ انجمن کا نسخہ کسی مستند نسخے کی نقل ہے۔ اور تاریخ کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کیلئے کافی اہمیت کا حامل ہے۔

اس نسخے کے کاتب نے عنوانات کے لئے سرخ روشنائی استعمال کی ہے، درمیان میں جو ذیلی عنوانات آئے ہیں وہ بھی سرخ ہیں۔ ہر باب بادشاہ کے ذکر سلطنت سے شروع ہوتا ہے۔ تمام واقعات کو ترتیب وقوع کے لحاظ سے " سال جلوس " کے تحت ترتیم کیا گیا ہے۔ جنگ و قتال اور رزم و پیکار کے واقعات کے علاوہ موضوع سے گریز کر کے، دوسرے حالات بھی بیان کئے ہیں جن میں زیادہ تر حالات معروف و غیر معروف اشخاص سے متعلق ہیں، اس طرح اولیا، صلحا اور علما و شعرا کے بارے میں تاریخ مظفری سے بڑی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

چونکہ کاتب نے جیسا کہ بیان کیا گیا، ذیلی عنوانات بھی سرخ روشنائی سے لکھے ہیں، اس لئے حسب مذاق و ضرورت مضامین انتخاب کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ مصنف نے یہ انداز اختیار کیا ہے کہ محاربات و فتح و شکست کے واقعات کے ساتھ کوئی اور واقعہ بیان کرنا ہو تو " ہمدریں سال " کا لفظ استعمال کیا ہے یہ " ہمدریں سال " بھی کاتب نے سرخی سے لکھا ہے، لیکن افسوس کہ بعض جگہ یہ التزام موجود نہیں، جس کی وجہ سے اس ضخیم جلد کی ایک ایک سطر پڑھے بغیر ہر اہم واقعہ کو الگ کر لینا ممکن نہیں۔

تاریخ مظفری سے میں نے جو شعراء نکالے ہیں وہ (۷۱) ہیں۔ ان میں (۱۸) شعراء کا ذکر مختلف صفحات میں ان کے انتقال کے سلسلے میں ہے۔ اور (۵۳) شعراء کا مسلسل ایک تذکرہ الگ ہے جو احمد شاہ بن محمد شاہ کے جلوس ششم کے آخر میں (صفحہ ۲۰۷ تا صفحہ ۲۱۹) قلمبند کیا گیا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ ان (۵۳) میں زیادہ تر عہد قدیم کے فارسی گو شعراء ہیں۔ اور وہ بھی ایران و توران کے۔ مصنف نے بھولے سے بھی کسی اردو شاعر کا ذکر نہیں کیا بہادر شاہ اول کے آغاز سلطنت سے شاہ عالم ثانی کے اختتام سلطنت کا درمیانی زمانہ اردو شعر و ادب کی ایک خاص تاریخ رکھتا ہے، خود اردو زبان نے اسی زمانے میں مدارج ترقی طے کئے اور یہی وہ دور ہے جس میں ایسے نامی گرامی شاعر پیدا ہوئے، جن پر آج بھی اردو زبان ناز کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ مظفری کا مصنف فارسی شعر و ادب سے اس قدر مرعوب تھا کہ وہ اردو کے شاعروں کو ہیچ سمجھتا تھا، ورنہ اس کے علاوہ کچھ اور خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

مختلف صفحات میں جن (۱۸) شعراء کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں بعض ہندی نژاد ضرور ہیں، لیکن وہ بھی فارسی گو ہیں، ان میں بھی فارسی کے ایسے شاعر ہیں، جو تفنن طبع کے طور پر گاہے گاہے ریختہ بھی کہتے تھے۔ اور چونکہ ان گاہے گاہے ریختہ کہنے والوں کا ذکر شعرائے اردو کے تقریباً ہر تذکرے میں موجود ہے۔ اور اردو زبان و شعر کی تحقیق میں ان شعراء کی " طبع نقاد " کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے، اس لئے " اردو ادب کے غیر ادبی ماخذ " کے سلسلے

محمد مسعود احمد

آقائے سرہندی

ڈاکٹر ایچ. آئی. سدا رنگانی (H.I. Sadarangani) کی تصنیف "Persian Poets of Sind." (فارسی گویان سندھ) نظر سے گذری۔ یہ کتاب ڈاکٹر موصوف نے "ڈاکٹر آف فلاسفی" کی ڈگری کے لئے بمبئی یونیورسٹی میں بطور مقالہ پیش کی تھی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں موصوف کو اسی پر مذکورہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی تھی۔ اس مقالہ کو سندھی ادبی بورڈ کے "قومی ادبی تاریخ کی ترقی کے منصوبے" (Sclema contriluting towards The develop ment of national History and Liteature) کے تحت بورڈ کے سکریٹری محمد ابراہیم ایم جویو نے سنہ ۱۹۵۶ء میں پہلی بار طبع کرایا۔

اس مقالے کے پانچ ابواب ہیں۔ پہلے باب میں ابتدائی دور سے لیکر ساموں کی حکومت تک کے فارسی گو شاعروں کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں ارگون، ترخان اور مغلیہ عہد کے فارسی گو شاعروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں کلہوڑا عہد حکومت کے فارسی گو شاعروں کا تذکرہ ہے، چوتھے باب میں تالپوروں کی حکومت کے فارسی گو شاعروں پر بحث کی ہے۔ اور پانچویں باب میں برطانوی دور حکومت کے فارسی گو شاعروں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

جس باکمال صوفی شاعر کے متعلق ہم اس مقالے میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں یعنی حضرت محمد حسین خان صاحب سرہندی رح (متوفی سنہ ۱۳۶۸ھ)۔ ان کا تعلق بھی برطانوی عہد سے ہے۔ اس لیئے ہم متذکرہ بالا ابواب میں سے صرف پانچویں باب کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت سرہندی کے متعلق کچھ عرض کریں گے۔

ڈاکٹر سدا رنگانی (Sadarangani) نے اپنے مقالے میں برطانوی عہد حکومت (سنہ ۱۸۴۳ء تا سنہ ۱۹۴۷ء) کے مندرجہ ذیل فارسی گو شاعروں کے نام گنائے ہیں:۔

۱۔ میر شہداد خان حیدری — متوفی سنہ ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء [1]

۲۔ میر صابر علی صابر — متوفی سنہ ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء [2]

۳۔ فقیر قادر بخش بیدل — متوفی سنہ ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء [3]

۴۔ میر حسین علی خان حسین — متوفی سنہ ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء [4]

مخطوطات انجمن ترقی اردو

(فارسی۔عربی)

انجمن میں فارسی اور عربی مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے ان مخطوطات کی اجمالی فہرست سید سرفراز رضوی، مہتمم کتب خانۂ خاص انجمن ترقیٔ اردو نے مرتب کی ہے جس میں ہر مخطوطے کے بارے میں ضروری اور بنیادی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ متعدد مخطوطات کے عکس بھی شائع کئے گئے ہیں۔ طباعت بذریعہ آفسٹ

قیمت: تین روپے پچاس پیسے۔

انجمن ترقیٔ اُردو

بابائے اُردو روڈ

کراچی۱

آسامی شود یا نوشتہ ہمیں مقابل نگاشتہ ہماں ؟ ـــــ

دانۂ رمان کجا، لعل بدخشاں کجا؟

قطرہ زیبق کجا، کوکب رخشاں کجا؟

لیکن بحکم ؎

ہمیں بس گرچہ من کاسد قماشم

کہ در سلک خریدارانش باشم " [1]

حضرت سرہندی رح ازراہ عجز و انکسار جو کچھ فرما رہے ہیں اس سے ان کے مزید کمال کا اندازہ ہوتا ہے ـــ ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ ... باکمال شاعر جو نہ صرف شاعر بلکہ ایک جلیل القدر عالم بھی تھا اس کے حالات بیان کریں اور ڈاکٹر سدارنگانی کی فروگذاشت کی تلافی کریں

حضرت محمد حسین جان صاحب سرہندی رح (متوفی سنہ ۱۳۶۸ھ) حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی (متوفی سنہ ۱۶۲۴ء)[2] علیہ الرحمۃ ... اولاد میں سے ہیں ـ سکھوں کی تباہ کاریوں سے پہلے حضرت مجدد صاحب علیہ الرحمۃ کی اولاد سرہند شریف میں متمکن تھی۔ لیکن جب اورنگ زیب ... علیہ الرحمۃ (متوفی سنہ ۱۷۰۷ء) کے صاحبزادے بہادر شاہ اول (متوفی ۱۷۱۲ء) کے لقب سے تخت نشین ہوئے[3] اور ملک میں حالات دگرگوں ... ہوئے تو پنجاب سے سکھوں نے سر اٹھایا۔ باغی گروہ کی رہبری بندہ بیراگی کر رہا تھا۔ اسی شخص نے سرہند شریف کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ... تباہی کی وجہ سے حضرت مجدد صاحب علیہ الرحمۃ کی اولاد اس شہر سے ہجرت کر گئی۔ کچھ حضرات رام پور چلے گئے۔ کچھ لوگ حجاز چلے گئے اور کچھ ... خراسان میں اقامت گزین ہوئے۔

حضرت محمد حسین جان سرہندی رح کے اجداد میں حضرت شاہ غلام حسین اور شاہ غلام حسین بن حضرت شاہ غلام محمد علیہ الرحمۃ، احمد شاہ ... ابدالی کی درخواست پر پشاور میں ٹھہر گئے۔ جو اس زمانے میں خراسان کے ماتحت تھا۔ ان دونوں حضرات کا وصال یہیں پر ہوا۔ پشاور چھاؤنی ... کے قریب ان کے مزارات مرجع خلائق ہیں۔

شاہ غلام حسن صاحب رح کے صاحبزادے حضرت غلام نبی رح پشاور سے قندھار تشریف لے گئے اور وہیں رحلت فرمائی۔ ان کے ... بعد ان کے فرزند حضرت فضل اللہ رح اور پھر ان کے بعد ان کے فرزند حضرت شاہ عبد القیوم رح بھی قندھار میں رہے اور یہیں رحلت فرمائی۔ حضرت ... محمد حسین جان سرہندی رح کے والد بزرگوار حضرت خواجہ عبد الرحمن صاحب رح بن حضرت عبد القیوم رح کی ولادت سنہ ۱۲۴۴ھ میں قندھار

---

[1] حضرت سرہندی رح : خیابان سرہندی، ص ـ ۳

[2] H. A. R. Gibb : Mohammadanism, P. 125.

[3] S. M. Edwardes & H. L. O. Garrett : Mughal Rule in India. P. 101.

۵۔ اخوند محمد قاسم قاسم — متوفی سنہ ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء [5]

۶۔ نواب اللہ داد خان صوفی — متوفی سنہ ۱۸۸۲ء [6]

۷۔ قاضی غلام علی جعفری — متوفی سنہ ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء [7]

۸۔ پیر محمد حزب اللہ شاہ مسکین — متوفی سنہ ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء [8]

۹۔ سید میر جان اللہ شاہ عاشق — متوفی سنہ ۱۸۹۳ء [9]

۱۰۔ مرزا احمد علی احمد — متوفی سنہ ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء [10]

۱۱۔ مخدوم محمد ابراہیم خلیل — متوفی سنہ ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء [11]

۱۲۔ سید غلام محمد شاہ گدا — متوفی سنہ ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء [12]

۱۳۔ منشی رسول بخش راہی — متوفی سنہ ۱۹۱۲ء [13]

۱۴۔ غوث بخش خاکی — متوفی سنہ ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء [14]

۱۵۔ میر علی نواز علوی — متوفی سنہ ۱۹۲۰ء [15]

۱۶۔ مولوی بہاء الدین بہائی — متوفی سنہ ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء [16]

تعجب ہے کہ ڈاکٹر سدارنگانی (sadarangani) نے حضرت محمد حسین جان صاحب سرہندیؒ (متوفی سنہ ۱۳۶۸ھ) کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ آپ اپنے وقت کے ایک باکمال شاعر تھے۔ آغا عبداللہ جان صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"در ہمہ علوم و فنون خصوصاً علم ادب و علم تاریخ وسعت معلومات و ید طولیٰ داشتند در شعر گوئی و لغات فارسی و عربی و قواعد ہر دو زبان بے نظیر و ماہر بودند" [17]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف سے یہ غلطی سہواً ہو گئی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ اپنی عزلت گزینی اور نام و نمود سے بے نیازی کی وجہ سے فاضل موصوف سے چھپے رہے ہوں۔ حضرت سرہندی رح کی اس تحریر سے ان کی طبعی انکسار کا پتا چلتا ہے :-

" حاشا و کلا کہ بار ایشان مضمار فصاحت و بلاغت دعوائے مقابلہ کردہ باشم، و با فارسان میدان ذلاقت و طلاقت یارائے مسابقہ، شخصے در تمام عمر مشق خوشنویسی می کند و دیگر احیاناً گاہ گاہے قلم بدست می گیرد۔ آیا ممکن است کہ خط ایں مماثل نگارش

---

[17] آغا عبداللہ جان : انیس المخلصین ، ص ۔ ۱۹

بناشد مسجد زیبالہ الحمد	بیا جنات عدن را بکن سیر
چو شد آغاز و انجامش بخوبی	فدا سالش بگو اتمام بالخیر

۱۳۲۴ھ

حضرت محمد حسن جان صاحب حضرت خواجہ عبدالرحمٰن صاحب رح کے مقبرہ شریف اور دوسری تعمیرات سے فارغ ہو کر اور رس وغیرہ کر کے مع اہل و عیال ٹکھڑ سے ہجرت کر کے ٹنڈو سائیں داد تشریف لائے۔ آج بھی حضرت موصوف کی اولاد یہاں متمکن ہے جن میں حضرت آغا عبداللہ جان اور آغا محمد ہاشم جان صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات علم و فضل اور تقویٰ میں اپنی مثال آپ ہیں (مدظلہم العالی)۔

حضرت عبدالرحمٰن علیہ الرحمۃ (متوفی ۱۳۱۵ھ) نے چار ازواج کیں سب سے اولادیں ہوئیں مگر سوائے آخری زوجہ کے باقی تینوں کی اولادیں حضرت کی زندگی ہی میں فوت ہو گئی تھیں۔ آخری بیوی سے دو فرزند اور ایک دختر تولد ہوئیں۔ فرزند اکبر حضرت محمد حسن جان رح (متوفی ۱۳۶۵ھ) و فرزند اصغر حضرت محمد حسین جان صاحب سرہندی رح (متوفی ۱۳۶۲ھ) تھے۔ جن کے کمال شاعری کا آگے چل کر ہم ذکر کرتے ہیں۔

حضرت محمد حسین جان سرہندی رح اپنے زمانہ کے جید عالم اور صوفی و باکمال شاعر و ادیب تھے۔ آغا عبداللہ جان صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"در علوم عقلیہ و نقلیہ صاحب کمال بودند از خدمت والد شریف خود و دیگر فضلاء وقت علوم مروجہ خواندہ بودند از ہمہ ایں زمانہ تا پہرغ اقبال وہ مطالعہ کتب روز و شب اشتغال داشتند۔ ہمہ علوم و فنون خصوصاً علم ادب و علم تاریخ وسعت معلومات و ید طولیٰ داشتند در شعر گوئی و لغات فارسی و عربی و قواعد ہر دو زبان بے نظیر و ماہر بودند۔ مجلس ایشاں با وقار و تمکین بود بلیغ توجہ التفات او شاں کسے را جرأت چون و چرا نمی شد۔ مگر مباحثہ علمی و گفتگوئے کتابی را بسیار دوست داشتند۔ ازاں خفہ و ملول نمی شدند بلکہ ہر یکے سلسلہ جنبانی سوال و جواب می کردند و ازاں خوش می شدند"۔ [1]

حضرت محمد حسین جان صاحب سرہندی رح کے حالاتِ زندگی پر کوئی خاص کتاب تصنیف نہیں کی گئی۔ آغا عبداللہ جان صاحب نے حضرت محمد حسن صاحب رح کے حالاتِ زندگی میں مونس المخلصین کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں تذکرۃً حضرت سرہندی رح کا ذکر آگیا ہے وہاں سے کچھ معلومات حاصل کیں اور کچھ باتیں حضرت سرہندی رح کی کلیات "خیابان سرہندی" سے لیں۔ اس طرح مختصراً اہلِ ذوق کے لئے یہ مواد فراہم کیا ہے۔

خیال یہ تھا کہ شاید کلیات "خیابان سرہندی" کے دیباچے سے بہت کچھ معلومات فراہم ہو جائیں گی مگر یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ

---

[1] آغا عبداللہ جان: مونس المخلصین۔ ص۔ ۱۹

میں ہوئی۔ ۱۲۷۰ھ میں اپنے والد ماجد کے وصال کے بعد مسند پر جلوہ افروز ہوئے۔ ۱۲۹۷ھ میں حجاز ہجرت کی اور وہاں ۱۳۰۲ھ تک قیام کرنے کے بعد واپس سندھ آئے اور موضع ٹکھڑ میں آباد ہوگئے۔ آپ کی ہجرت اور قیام سندھ کا پس منظر یہ ہے:۔

تیرھویں صدی ہجری کے آخری ربع میں افغانستان کے اندر سیاسی اختلال پیدا ہوگیا انگریزوں نے موقع غنیمت جانا اور خراسان حملہ کر دیا۔ امیر شیر علی والئی کابل فرار ہو کر ترکستان چلا گیا اور راستہ ہی میں فوت ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یعقوب خان کابل میں تخت نشین ہوا لیکن انگریز اس کو قید کر کے ہندوستان لے آئے۔ شیر علی کا دوسرا بیٹا ایوب خان قندھار کی طرف سے انگریزوں کا مزاحم ہوا اور اس نے تین سال تک انگریزوں کا ناطقہ بند کر رکھا۔ اسی اثناء میں ایوب خان کا چچا زاد بھائی امیر عبدالرحمٰن ایک جمعیت کے ساتھ تخت و تاج کا مدعی بن کر روس کی طرف سے آیا۔ اور انگریزوں سے ساز باز کر کے عہد و پیمان کر لیا۔ چناں چہ انہوں نے اس کو امیر کابل بنا دیا اور خود ہندوستان آگئے۔ ولایت خراسان کا نظم و نسق بھی اسی کے زیر اثر آگیا۔ اسی لئے امیر عبدالرحمٰن نے ایوب خان کے مقابلے کیلئے قندھار پر حملہ کر دیا جہاں حضرت محمد حسین جان سرہندی رح کے والد بزرگوار حضرت خواجہ عبدالرحمٰن رح مقیم تھے ــــ علماء دین نے امیر عبدالرحمٰن کو انگریزوں کا پٹھو قرار دے کر اس سے جہاد کا حکم دے دیا۔ مگر تقدیر نے ساتھ نہ دیا چناں چہ ایوب خان شکست کھا کر ایران چلا گیا۔

جب قندھار پر امیر عبدالرحمٰن کا تسلط ہوگیا تو اس نے ان علماء پر بڑے مظالم کئے جنہوں نے ایوب خان کا ساتھ دیا تھا۔ حکومت کی انہیں سختیوں سے مجبور ہو کر حضرت خواجہ عبدالرحمٰن رح ۱۲۹۸ھ میں جنگل کی طرف نکل گئے۔ پھر ۱۲۹۷ھ میں ارغستان سے کوچ کی اور قلات بلوچی، بھاگ ناڑی، گڑھی یاسین، سکھر وغیرہ سے ہوتے ہوئے مٹیاری تشریف لائے اور ٹکھڑ میں ایک سال (۱۲۹۸ھ تا ۱۲۹۹ھ) تک قیام کیا۔ ایام حج میں یہیں سے کراچی اور وہاں سے بمبئی تشریف لے گئے کیونکہ اس زمانے میں کراچی سے جہاز نہیں جایا کرتے تھے۔ حضرت موصوف بمبئی سے حجاز تشریف لے گئے اور پانچ سال حجاز میں قیام کیا۔ (۱۲۹۷ھ تا ۱۳۰۲ھ)[1] پھر واپس آکر سندھ میں ٹکھڑ کے مقام پر اقامت گزین ہوئے۔[2]

حضرت خواجہ عبدالرحمٰن رح کے وصال سے دو تین سال قبل موضع ٹکھڑ کے ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا کیونکہ دریائے سندھ نے اپنا رخ اس طرف موڑ لیا تھا۔ ان حالات کے تحت ٹنڈو غلام علی کے ایک رئیس میر غلام علی تالپور جو حضرت کے مرید بھی تھے کی درخواست پر حضرت موصوف نے ٹنڈو محمد خان کے قریب ٹنڈو سائیں داد میں قیام کا فیصلہ کر لیا اور اپنے فرزند ارجمند حضرت محمد حسن جان صاحب رح کو مکان کی تعمیر اور دیگر ضروری انتظامات کے لئے موضع مذکور میں بھیج دیا۔ سوء اتفاق جب مکان تعمیر ہوگیا تو اسی سن یعنی ۱۳۱۵ھ میں حضرت خواجہ عبدالرحمٰن رح کا وصال ہوگیا۔ چناں چہ آپ کو ٹکھڑ کے جانب شمال کوہ گنجہ کے دامن میں دفن کر دیا گیا۔ چند سال بعد احاطہ میں مسجد بھی تعمیر ہوگئی۔ شاہ اسداللہ ٹکھرائی نے اس کی تاریخ کہی تھی جو لوح کاشی پر کندہ کر کے نصب کر دی گئی۔ قطعہ تاریخ:۔

---

[1] محمد حسن جان رح : انیس المریدین۔

[2] آغا عبداللہ جان : مونس المخلصین۔

however, the gradual elemination of the Persian language." ۱؎

آگے چل کر موصوف لکھتے ہیں:۔

"The British influence, thus, dried up to a great extent the spontaneous springs of Persian". ۲؎

حضرت سرہندیؒ نے بھی دیباچہ کلیات میں اپنے زمانہ میں فارسی زبان وادب کی کس مپرسی کا اس طرح ذکر کیا ہے:۔

"دریں زماں حسرت افزا کہ در ہند و سندھ زبان فارسی در معرض زوال ست و در ورطۂ نزع وارتحال، از اوج رفعت و عزت روش در حضیض انحطاط و انخفاض است و در محض احتقار و انقراض۔ فضلائے ہند برائے ارتقائے زبان خود بہ جان کوشیدہ اند و زبان اردو را بہ آسمان ہفتم رسانیدہ و شعراء سندھ برائے تلفیق و تنسیخ لسان خویش کوشاندہ و در مسلک تحقیق و تعمیق آں پویان" ۳؎

ایسی حالت میں فارسی میں شعر گوئی کی طرف متوجہ ہونا ادب نوازی اور فارسی دوستی کی بیّن دلیل ہے:۔

"ایں شکستہ بال برائے خدمت زبان فارسی و طیبیت معاشران نارسا اشعار فراگندہ خود را کہ چوں طرۂ مہ وشاں شکستہ و پریشاند از پارہائے پاریدہ و اقعہائے از ہم پاشیدہ و حواشی کتب دیدہ فراہم آورد بہ رغم زمانہ بہ صورت جمع تدوین مزیّن و نو آئین ساخت سہ ایں تکلف ہائے من در شعر من کلمینی یا حمیرا ی من است" ۴؎

اور جب ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن حالات اور جس ماحول میں آپ نے شعر گوئی کی وہ نہایت ہی اختلال و انتشار کا زمانہ تھا۔ اور ملک زوال و انحطاط کی طرف جا رہا تھا۔ ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کا یکسر فقدان تھا جو شعر گوئی کیلئے کم از کم ضروری ہے تو بے ساختہ لب سے تحسین و آفرین نکلتی ہے۔

دیباچہ کلیات میں ملکی حالات کی طرف خود اس طرح اشارہ فرماتے ہیں:۔

"آں جا کہ بار زندگانی آں قدر گراں کردہ باشند کہ بہ صعوبت تمام شبے بروز و روزے

۱؎ Dr. H.I. Sadarangani : Persian Poets of Sind. P. 236 and 235.

۲؎ (as above)

۳؎ حضرت سرہندیؒ : خیابان سرہندی، ص ۳ و ۴

حضرت موصوف نے ازراہ انکسار ذاتی حالات لکھنے سے اعراض کیا۔ چناں چہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"داب شعراء است کہ دراوائل دواوین سوانح عمری خود را بالاستیعاب بیان کنند و جور وجفائے زمانہ غدار و فلک ستم شعار با مبالغہ اغراق وا نمایند۔ حقیر بجہت

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

ازیں شیوہ اعراض دارد و ازیں وتیرہ اغماض ؎

زمحشر بگذرد گوشے بیانم اگر احوال خود گویم کماہی

واگر کسے را خواہ مخواہ ایں حالت کدورت سمات دیدنی باشد زبر آئینہ بداں پے بردنی در قصیدہ دالیہ عرفی می تواں دید و بہ ابلغ وجہ دراں جامی تواں شنید بہرحال من بعجز و قصور معترفتم" [1]

حضرت محمد حسین جان سرہندی رح نے طبیعت سلیمہ پائی تھی۔ اس لئے فطرتاً شعر گوئی کی طرف مائل تھے۔ مگر آپ نے ہم عصر شعراء کی طرح شاعری کو اپنا پیشہ یا مسلک نہیں بنایا تھا بلکہ تفنن طبع کے طور پر گاہے ماہے اشعار کہہ لیا کرتے تھے اور بڑے استاد تھے۔ خود تحریر فرماتے ہیں :۔

" بندہ شاعری را شعار خود نہ ساختہ است نہ موزونی را وظیفہ لیل و نہار خود، ایں اشعار احیانی ست و ایں ازراہ اتفاقی۔ چہ باید کرد کہ طبع موزوں نالہ موزوں بلا بد موزوں باشد و از دل تفتہ موئے کہ برخیزد ناچار بہ سوزش معروف ؎

طرازی طلعت و گوئی مکش آہ!

فروزی آتش و گوئی مزن جوش"

حضرت سرہندی نے عالم شباب میں شاعری شروع کی۔ دیباچہ کلیات میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں :۔

" در اوائل عہد شباب و آوان نادانستن خطا از صواب شمہ از ناگفتنی ہا گفتہ شدہ، و بہ تقاضاء طبعی خوردہ از ناسفتنی ہا سفتہ" [2]

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سابق صوبہ سندھ میں فارسی زبان کا چرچہ قریب قریب ختم ہوگیا تھا۔ فارسی کے زوال و انحطاط کا آغاز تو برطانوی دور حکومت کے آغاز (۱۸۴۳ء) سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سدارنگانی لکھتے ہیں :۔

One great change noticeable in Sind on the advent of British was,

---

[1] حضرت سرہندی رح : خیابان سرہندی ، ص ۔ ۴

[2] " " : " " ، ص ۔ ۳

شیوۂ تغزل از سالہائے فراواں متروک است و مسلک ہوا و ہوس غیر مسلوک ؎

بنائے عمر خرابی گرفت چند کنم
بہ رنگ و بوئے کساں خانۂ ہوس آباد ؟
مرا ازاں چہ کہ سیمیں برے است در کشمیر !
مرا ازاں چہ کہ نوشیں لبے است در نوشاد ![1]

وفات

حضرت محمد حسین جان سرہندی رح کا وصال ماہ صفر ۱۳۶۸ھ میں ہوا۔ آغا عبداللہ جان صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

" افسوس کہ دریں ایام در ماہ صفر ۱۳۶۸ھ بعمر ہشتاد و سال ازیں دارِ فانی بہ سرائے جاودانی رحلت نمودند رحمہ سبحانہٗ و تعالیٰ ! و جنازہ اوشاں را بہ مقبرہ حضرت کلاں در کوہ گنجہ آوردند " [2]

آپ کی وفات کا واقعہ بڑا سبق آموز ہے ۔ یہ واقعہ احقر کو حضرت قبلہ محترم و مکرم محمد اسحاق جان صاحب سرہندی سے معلوم ہوا جو حضرت محمد حسین جان صاحب سرہندی رح کے پوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ آخر وقت میں حضرت کی حالت بڑی نازک ہو گئی تھی۔ نزاکت طبع کے تحت کراچی سے ایک حاذق اور ماہر طبیب کی خدمات حاصل کی گئیں ۔

جب اس امر کی اطلاع حضرت کو دینے گئے تو یہ دیکھ کر حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ حضرت کے سامنے کتب احادیث کھلی ہیں اور مطالعہ میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ کبھی اس حدیث کو دیکھتے ہیں تو کبھی اُس حدیث کو ۔ عرض کیا گیا کہ کراچی سے ایک حکیم کو بلایا ہے انشاء اللہ کل صبح تک پہنچ جائے گا۔ یہ واقعہ شب کا ہے۔ فرمایا کہ صبح کو حکیم کی ضرورت ہی نہ رہے گی ۔

رات ایک دو بجے تک مطالعہ فرماتے رہے تین بجے کے قریب آپ لیٹ گئے اور چادر اوڑھ لی اور کلمہ پڑھتے ہوئے جان ، جان آفرین کے سپرد کر دی ؎

تا دوست رسیدیم چو از خویش گزشتیم
از خویش گزشتن چہ مبارک سفرے بود :

اس سے میں اندازہ یہ ہوا کہ اللہ جل مجدہٗ کے دربار میں حاضری کے لئے اس کے حبیب لبیب حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے آداب سیکھے جا رہے تھے ۔ اللہ اکبر ! کیسی بزرگ ہستیاں تھیں کہ جن کی زندگی اور موت سب اسی کیلئے تھی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

---

[1] حضرت سرہندی رح : خیابان سرہندی ، ص ۔ ۳ و ۴
[2] آغا عبداللہ جان : مونس المخلصین ، ص ۔ ۱۹

بہ خشب رسانیدہ می شود کہ او ماغ شعر و نازک خیالی باشد؟ و جائے کہ منزل و مراحل حیاتی آں
چناں دشوار گذار نمودہ باشند کہ بہ اشکال تمام سپرے شوند کرا برائے نظم و خوش بیانی فارغ بالی سے

چوں لالہ روزن گلخن بود گر یبانم — ازیں چہ سود کہ در باغ کشتہ اند مرا

گفتہ اند کہ گریہ ہم دل خوشی می خواہد سے

کے شعر تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد — یک نکتہ دریں معنی گفتیم و ہمیں باشد"[1]

یہی نہیں بلکہ اس زمانہ میں قدردانوں کا بھی فقدان تھا. خود فرماتے ہیں :-

"مشکل این است کہ در نقادان سخن ذوق سلیم و طبع مستقیم مفقود است و در مدعیان این فن
ذوق و تمیز صحیح و سقیم معدوم و مطرود. در مذاق این حیوانان ناطق و انسان ناحق آں چہ شعر باشد
یا او ناشے آں ہماں یکساں است و آں چہ نظم باشد تلخ و شیریں آں جملہ بہ یک عنوان :-

در شہر بہائے ہیزم و عود یکے است — این جا بہ مثل خلیل و نمرود یکے است

در گوش کسانے کہ دریں انجمن اند — آواز خر و نغمۂ داؤد یکے است" [2]

جب قدردانوں اور سخن فہموں کا کال ہو تو پھر صلہ کی امید تو ایک خیال موہوم ہے۔ خود تحریر فرماتے ہیں :-

"در ماحولے کہ نہ امید صلہ باشد و نہ توقع تحسین و در زمانے کہ نہ گوش استماع باشد و نہ چشم
آفریں، شعرے کہ گفتہ شود لابد چوں گل خود رستے بے لطافت و نزاکت باشد و چوں میوۂ ناکاشتہ
بے طراوت و حلاوت سے

بہ چہ امید در زمانۂ کور — شاہد طبع روشناس کنم؟

کس زبان مرا نمی فہمد — با عزیزاں چہ التماس کنم؟"[3]

آخری جملے تو حضرت سرہندی رحمۃ اللہ نے از راہ انکسار تحریر فرمائے ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کا پورا کلام سرتاسر "لطافت و نزاکت" اور "طراوت و حلاوت" سے بھرپور ہے —— ہاں تو عرض یہ کر رہا تھا کہ حضرت سرہندی رحمۃ اللہ نے ان حالات میں شعر گوئی کی جب کہ نہ ماحول سازگار تھا، نہ ملک میں امن و امان اور نہ سخن فہم و نکتہ سنج۔ ایسے حالات میں شعر کہنا بجائے خود کمال تھا اور پھر چاند اشعر کہنا تو کمال بر کمال تھا۔
حضرت سرہندی رحمۃ اللہ نے آخر عمر میں شعر گوئی ترک کر دی تھی گو کہ کلیات کی اسی زمانے میں تدوین ہوئی۔ دیباچہ خیابان سرہندی میں تحریر فرماتے ہیں :-

---

[1-3] حضرت سرہندی رح : خیابان سرہندی، ص ـ ۳

خواجہ حافظ شیرازی رح (متوفی ۷۹۱ھ) کی[1] ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے :۔

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب ! الخ

اس پر سرہندی رح کہتے ہیں :۔

تعالی اللہ چہ شیریں کارم امشب — ز وصل آں پری بیدارم امشب !
مہم چوں تاب بیرازدر در آمد — ز عکسش بر بسر انوارم امشب !
ز بخت عاشقاں خواب دو چشمش — شکنج زلف برّد از کارم امشب !
فقلت الیک اشکو من فراقک — بگفتا شکر کن غم خوارم امشب !
بدہ ساقی پیاپے آتش آب — ندیم مطرب و خمارم امشب !
چو دل خود کام از معشوق شد گشت — من از ہر حد جہاں بیزارم امشب !

خداوند کہ سرہندی چو حافظ
ز جام بیخودی سرشارم امشب !

خواجہ حافظ کی ایک اور غزل ہے جس کا مطلع ہے :۔

بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم
بہار توبہ شکن می رسد چہ چارہ کنم ؟

اس پر سرہندی رح کی یہ غزل ہے :۔

اگر شبے مہ روئے ترا نظارہ کنم — کتان ہستی خود را ز شوق پارہ کنم
چو شمع طور برافروختم ز سر تا پا — کہ تا بہ سنگ دلش جائے چوں شرارہ کنم
یقیں کہ معجزہ شق القمر شود ظاہر — چو ماہ را بہ سوئے عارضت اشارہ کنم
بیا بہ میکدۂ ما کہ سر عالم قدس — بہ یک دو جرعۂ مے بر تو آشکارہ کنم
ز غصہ جاں بہ لب آمد نسیم صبح کجاست ؟ — شمامۂ کہ از و زندگی دوبارہ کنم
توانم آنکہ سکینم ز جام و بادۂ چنگ — دلے بہ کف نگہ دل ربا چہ چارہ کنم ؟

بیا بیا کہ گہر ہائے نظم سرہندی
برائے گردن دولت تو طوق و پارہ کنم

---

[1] Reuben Levy : Persian Literature . P — 76.

حضرت آغا محمد حسین جان سرہندی کی اور علمی تصانیف کے علاوہ ایک کلیات موسوم بہ "خیابان سرہندی" ہے۔ صاحب مونس المخلصین اس طرح اس کا ذکر کرتے ہیں :-

"یک کلیات مطبوعہ مشتمل بر غزلیات و قصائد و تاریخہا و رباعیات و دیگر صنائع و بدائع شعر بہ دلاوند کہ
ازاں کمال بلاغت و براعت ایشاں ظاہری شود" سلہ

جیسا کہ آغا عبداللہ جان صاحب نے تحریر فرمایا یہ کلیات قریب قریب تمام اصناف سخن پر حاوی ہے۔ اس میں قصائد و قطعات، رباعیات اور مثنویات و مناجات وغیرہ سب کچھ موجود ہیں۔ اور پھر اس میں آپ کا عربی اور پشتو کا کلام بھی شامل ہے۔ جس سے موصوف کی زباں دانی اور موزونیٔ طبعی کا علم ہوتا ہے۔ تاریخ گوئی پر تو آپ کو بڑا عبور حاصل ہے۔ دیوان میں بیشتر قطعات تاریخ ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مشکل صنعتوں میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے اور بڑی کامیابی کے ساتھ، جس سے آپ کے ادبی اور فنی کمال کا پتا چلتا ہے۔

حضرت خواجہ محمد حسین جان صاحب سرہندی نے فارسی کے اساتذہ شعراء کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ اس سے بھی ان کے کمال شاعری کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً نظامی (متوفی سنہ ۵۹۴ھ)، عمر خیام (متوفی سنہ ۱۱۱۱ء)، سعدی (متوفی سنہ ۶۹۱ھ)، رومی (متوفی سنہ ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء)، خسرو (متوفی سنہ ۷۲۵ھ)، حافظ (متوفی سنہ ۷۹۲ھ)، جامی (متوفی سنہ ۸۹۸ھ)، عرفی (متوفی سنہ ۹۹۹ھ)، کلیم (متوفی سنہ ۱۰۶۱ھ)، اور بیدل (متوفی سنہ ۱۱۳۳ھ) وغیرہ کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں :- سلہ آغا عبداللہ جان : مونس المخلصین، ص۔ ۱۹

شیخ سعدی علیہ الرحمہ (متوفی سنہ ۱۲۹۲ء) کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے :-

معلمت ہمہ شوخی و دلبری آموخت
جفا و ناز و عتاب و ستمگری آموخت

اس غزل پر سرہندی علیہ الرحمہ نے یہ غزل کہی ہے :-

زلعل نوش لبت قند شکری آموخت　　　زلیف سنبل تو گل معطری آموخت
طرب ز جلوۂ تو یاد و سرو کشید　　　فرح ز خندۂ تو مدح پروری آموخت
بہار از گل روئے تو صد چمن آراست　　　بہشت از بر حسن تو نوبری آموخت
متاع ناز و ادائے ترا بے نقد ربود　　　خریدن از دل عشاق مشتری آموخت
دلم چو طرۂ شمشاد صد شکن دارد　　　چرا کہ از قد تو سرو سروری آموخت

حمید بہ صاحب کمال کہ سرہندی
بہ طرز خاص ز سعدی سخن دری آموخت

سلہ آغا عبداللہ جان : مونس المخلصین، ص ۔ ۱۹
سلہ Paulan Leavy: . Persian Literature P-60-P76

اس غزل پر سرہندی علیہ الرحمہ یوں فرماتے ہیں :۔

قدِ تو نشانید ز پا سروِ رواں را		خدِ تو ستانید زمہ دادِ کتاں را
چوں مرغ دلم دامِ خمِ زلفِ تو بندست		پس بہر کہ چشمِ تو کشد تیر و کماں را
از ابروئے چشمت شگفت آمدہ زانکہ		محراب نشیں دیدہ کسے بادہ کشاں را
ما عیش بہاراں نہ شناسیم چو نرگس		تا دیدہ کشادیم بدیدیم خزاں را

سرہندی ازاں بست لب از شربتِ وصلش
کزا بروئے او دید ہلالِ رمضاں را

مرزا بیدل (متوفی ۱۱۳۳ھ[1]) کی طرز پر یہ غزل کہی ہے :۔

حباب حیرتم ، بیتابیٔ یکدم زدن دارم		نگاہ حسرتم در چشمِ نومیدی وطن دارم
چہ امکاں پریدن زیں چمن ، تنگ تعلق را		کہ من بر پائے دل زنجیر از اں مشک ختن دارم
چو مضمون جدید از مبدا فیاض می آیم		کہ با اہلِ جہاں در کنہ ہستی یک سخن دارم
تجرد کسوت موہوم ہستی بر نمی تابد		ز سوزِ دل چو آتش رختِ عنائی بہ تن دارم
چہ باک از ہجر جاں کاہش کہ از یمن خیال او		پری در شیشۂ دل بر در بر و جانٔ بدن دارم
دریں دریا چو موج از خویش بردم می روم بیروں		کہ از بیرونِ عالم جذبۂ حُبّ الوطن دارم

شگفت از داغہائے دل مرا صد لالہ سرہندی
چو غنچہ در دل خود جمع سامانِ چمن دارم

بلبلِ سندھ کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے :۔

ماہ تابے عجبے ، حسن شبابے عجبے !
لب عنابے عجبے ، رو چو گلابے عجبے !

اس کے جواب میں سرہندی علیہ الرحمہ نے یہ غزل کہی تھی :۔

رخ گلابے عجبے ، زلف نقابے عجبے !		آفتابے عجبے ، زیر سحابے عجبے !
بے تو چو ماہیٔ بے آب بہ گلشن ما راست		اضطرابے عجبے ، رنج و عذابے عجبے !
خال بر کنجِ لبش ہر کہ بہ بیند گوید		دہ ذبابے عجبے ، شکر نابے عجبے !

---

[1] سید شمس اللہ قادری : اردوئے قدیم ، ص — ۱۱۳

حضرت امیر خسرو دہلوی (متوفی ۷۲۵ھ)[1] کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے :-

خبرم رسیدہ امشب کہ نگار خواہی آمد
سر من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد

اس غزل پر سرہندی علیہ الرحمہ نے یہ غزل کہی ہے :-

تو بود ایں امیدم کہ بہ کار خواہی آمد　　پے ایں دل رمیدہ بہ شکار خواہی آمد
ز سر جہاں گذشتم بہ رہ تو خاک گشتم　　بہ امید آں کہ روزے بہ مزار خواہی آمد
بخزان رنگ زردم کہ دل از تو داغدار ست　　بہ ہوائے لالہ غارت بہ بہار خواہی آمد
ز تو اے قرار دلہا خبرم رسیدہ امشب　　کہ تو بر قرار سابق بقرار خواہی آمد
مروائے دل از دعا یش حذرے کن از جفایش　　ز خدنگ دل ربایش کہ نگار خواہی آمد

سرہندیا! چہ گوئی کہ شنیدہ ام بکویت
کہ برائے مشک موئے بہ تتار خواہی آمد

قدسی اور عرفی (متوفی ۹۹۹ھ)[2] کے تتبع میں یہ غزل کہی ہے :-

بر در گہت نہادن و مردن گناہ من　　دیدن ز خاک بر نہ گرفتن گناہ کیست ؟
از دیدن تو چشم نہ بستن گناہ من　　دل بردن و جفا بہ نمودن گناہ کیست ؟
دل دادن و دوا طلبیدن گناہ من　　پیش آمدن نقاب کشادن گناہ کیست ؟
گفتن ز عشق خود نہ نہفتن گناہ من　　پیش رقیب رفتن و گفتن گناہ کیست ؟
قربان شدن فدائے تو گشتن گناہ من　　رنجیدن و ز خویش براندن گناہ کیست ؟

سرہندی ایں مطالبہ گفتن گناہ من
وہ وہ نگفتن و شنیدن گناہ کیست ؟

کلیم ہمدانی (متوفی ۱۰۶۱ھ)[3] کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے :-

فصل گل روئے تو جواں ساخت جہاں را
حسن تو ازیں باغ بدر کردہ خزاں را

---

[1] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی ، ص - ۲۵۷

[2] شبلی نعمانی : شعر العجم ، ج - ۳ ، ص - ۹۱

[3] " " : " " ، ص - ۱۸۷

گر بہ کلک اثر کشی رد فاق ۔ نہ شود چرخ بے اثر ۔ اد فق
بہر سلب متاع عمر رفیق آستین بر نوشتہ تا بر فق

صنعت اظہار مافی الضمیر مشکل ترین صنعت ہے۔ مگر حضرت سرہندی رح نے بڑی کامیابی اور مہارت کے ساتھ اس میں یہ رباعی لکھی ہے :-

از دیدہ فراق یار دل می بسر زد از آفت حُب کندن دل سخت سزد
سختی فن عشق شود عزت شخص نقش قدم ملک ہوس دل چو نہ زد

اس رباعی میں مصرع اول کے لئے '۱'، مصرع دوم کے لئے '۲'، مصرع سوم کے لئے '۴' اور مصرع چہارم کے لئے '۸' کا ہندسہ فرض کیا ہے۔ فقرۂ جامعہ " رباعی تفہم گل وقند " تجویز کیا ہے۔

قاعدہ یہ رکھا ہے کہ ایک شخص سورۂ کافرون میں سے کوئی سا بھی حرف سوچ لے اور پھر بتائے کہ جو حرف سوچا ہے وہ رباعی کے کن کن مصرعوں میں ہے۔ پس جن جن مصرعوں میں وہ حرف ہو ان کے اعداد جمع کرکے ترتیب کے ساتھ فقرۂ جامعہ مذکورہ میں دیکھ لیں وہی حرف ہوگا جو سوچا گیا ہے۔ مثلاً حرف 'س' سوچا۔ اب یہ حرف صرف مصرع اولیٰ میں ہے۔ جس کا عدد '۱' ہے۔ فقرۂ جامعہ کا پہلا حرف 'ر' ہے۔ اس لئے جواب 'ر' ہے۔

حضرت سرہندی رح کو تاریخ گوئی میں بھی بڑا ملکہ تھا۔ آپ نے اپنے مرشد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی تاریخ وفات نکالنے کا ایک عجیب اور ہمہ گیر فارمولا بنایا ہے۔ زمین و آسمان میں جس نام سے ان کی تاریخ وفات ۱۳۱۵ھ نکالنا چاہیں یہ فارمولا استعمال کریں تاریخ نکل آئے گی۔ فارمولا یہ ہے :-

{ (ربِ^سلہ × ۲ + ۱) (۳) ÷ ۲ } ۴۰۵ + ۱۰۰

آپ نے بہت سے احباب کی تاریخ وفات کہی ہے۔ قطعات تاریخ دیوان میں موجود ہیں۔

حضرت سرہندی رح کو فی البدیہہ اشعار کہنے میں بھی بڑا ملکہ حاصل تھا۔ مثلاً امام غزالی رح (متوفی ۱۱۱۱ء[2]) کی مشہور تصنیف عجائب المخلوقات پر آپ نے بداہتاً یہ اشعار فرمائے :-

زہے کتاب مشرف عجائب المخلوق بدل کشائی وبہجت دہی رواں منجوق
غرائب فقراتش روائح دلہا لوادر کلماتش ترانۂ معشوق
زخوش طرازی او فرق آسمان بزمین زخوبی صورتش جنگ مانوی مشقوق
عجائبات مکین و مکاں در و مضمر کوائفات زمین و زماں بہ او ملصوق

سلہ اس مقام پر مفروضہ عدد یا نام کے اعداد رکھیں۔
سے H. A. R. Gibb : Mohammadanism . P— 108 .

دل دیوانۂ ما از نگہ مست تو شد از شرابے عجبے، مست و خرابے عجبے!
خوش فتادہ است خط سبزۂ تو بر دفتر حسن گشتہ بابے عجبے، زیب کتابے عجبے!
خوش بود گر کنی از دولت وصلش آباد بہ تو لبے عجبے، خانہ خرابے عجبے!
شکر از لب بہ فشاں بہر زکوٰۃ حسنت تند لبے عجبے، داد جوابے عجبے!
غنچۂ طبع من از گفتۂ بلبل بشگفت از خطابے عجبے، داد جوابے عجبے!

از رخ خوب تو سرہندی عاجز دارد
صبر و تابے عجبے، نقش بر آبے عجبے!

آغا محمد حسین جان سرہندی ؒ نے مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ غنیؔ کاشمیری، واقفؔ اور طرازی وغیرہ کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا حضرت سرہندی علیہ الرحمۃ نے مشکل صنعتوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے، مثلاً صنعت مقلوب میں ان کا یہ شعر ہے ؎

مراکش شوخ تبت خویش شکارم
مرادمرگ درد گرم دارم

اسی طرح صنعت غیر منقوطہ میں ان کے یہ اشعار ملتے ہیں :-

دل آرا وعدۂ مہر و کرم کرد سرورِ وصل او دل را ارم کرد
دگر رہ طالع سعدم مدد کرد کہ سرو ماہ رو را ہم حرم کرد
مسلسل دام دلہا طرۂ او مرا در مردم عالم علم کرد
دمادم طرۂ طرار دل دار دلم را مصدر درد و الم کرد

مگر سرہندی محرم اسرار آمد
کہ درس علم و اسرار حکم کرد

صنعت تجنیس میں یہ اشعار ملتے ہیں :-

طبع ہر شخص یاس کردہ شفیق جام پُر خون آرزو ز شفق
بادۂ بزم عشرتش غساق جلوۂ صبح خور میش غسق
زخم دلہا بخندد از افلاق چوں بگرید بہ زہر خندہ فلق
بہ سموم خزاں بکن مشتاق ز نسیم بہار غنم مشتق
کردہ بر بحر داں حیاتی سفاق کردہ دلہائے اہل فضل دوشق
میہمانان قصر سبع طباق خون دل میخورد ز ہفت طبق

(۴) بحر سریع، بطرز ع
ہست کلید در گنج حکیم الخ نظامی (متوفی ۶۳۱ھ) [1]

(۵) بحر متخلخل، بطرز ع
چنداں کہ گفتم غم با طبیباں الخ حافظ (متوفی ۷۹۴ھ)

حضرت سرہندی رح کے دیوان میں ایک مثنوی بھی ملتی ہے جس کا مطلع ہے :-

خداوندا بعشقم آشنا ساز
زحسن خویش بر من پرتو انداز

اس مثنوی میں تقریباً تین سو اشعار ہیں۔ اس کا مقطع ہے :-

دریں نافہ کہ بوئے زلف یار ست
ز سرہندی نگاریں یادگار ست

حضرت سرہندی رح نے رباعیاں بھی کہی ہیں جو ان کے دیوان میں شامل ہیں۔ چند رباعیاں یہ ہیں :-

عاشقانہ

در عالم بے ثبات ایں دمو ہیچ	ایں مال و منال و جاہ و خیل در مہ ہیچ
چیزے کہ عزیز دل داتا باشد	آں حسن و کرشمہ ست دیگر ہمہ ہیچ

مولائے کریم با عنایت باشد	با بندۂ خود بہ لطف و رافت باشد
بے صرفہ جفا مکن مبادا در حشر	جور تو ز جرم من زیادت باشد

در خاک سیہ تا تو گرفتی منزل	من بے تو شدم خاک بسر پائے بہ گل
بر من شدہ از رفتنت اے راحت دل	مردن آساں و زندگانی مشکل

فلسفیانہ

گویند کہ در وجود اجسام جسیم	چارہ نبود بجز ہیولائے قدیم
گویم کہ ہماں وجود اصلی باشد	ظلی ست ہمیں و وصف قیوم قویم

اجسام و جواہر جہان زیر و زبر	بے مادۂ و علت اند بے عین و اثر

---

[1] دولت شاہ سمرقندی : تذکرۃ الشعراء ، ص ۔ ۴۷

سہ چار بیت شکستہ بہ کلک ستہ ہندی

بہ محضر فضلائی البدیہہ شد مرزوق

اسی طرح ایک محفل میں آپ نے فی البدیہہ ایک قصیدہ کہا جس کی تشبیب کے چند اشعار یہ ہیں :-

بیا بہ صحن گلستاں کہ در رسید بہار — بکن نظارۂ نقش صنایع دادار
چمن ز رنگ شقائق نمونۂ جنت — دمن ز بوئے ریاحین چوں طبلۂ عطار
عروس باغ چو برقع کشاد از رخ خود — سحاب در و گہر بر سرش نمود نثار
مگر کہ خضر در ایں بوستاں چمن پیراست — کہ آب خضر روان است در بن اشجار
عذار لالہ و گل بیں کہ سازدت فارغ — ز عشق حسن رخ شاہدانِ شیریں کار
ز رشک نکہت گیسوئے ضیمران بنگر — کہ در میانۂ گلزار می شود گلزار
بہ صحن باغ نہادست تودہائے عبیر — بہ دوش باد فروبستہ نافہائے تتار
ببیں کہ چہرۂ سوری چہ شمعہا افروخت — کہ شد چمن چو سپہر بریں پر از اقمار
بہ روئے سنبل و لالہ چوں افگنی نظرے — گماں بری کہ بیک جا غنودہ لیل و نہار
منادل از ورق برگ گل ہمی خواند — ہمیشہ آیت "جنات تحتہا الانہار"
عروس غنچہ چوں از جام لالہ شد سرمست — بدست باد برانداخت پردہ از رخسار

علم عروض میں مہارت اور کمال کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ عبدالرحیم علیہ الرحمہ (متوفی ۱۳۱۵ھ) کی مدح میں چودہ ابیات کا ایک قصیدہ لکھا ہے۔ جس پر عمل توشیح کیا جائے تو پچاس بیت نکلتے ہیں جو ان پانچ بحروں پر مبنی ہیں :-

(۱) بحر ہزج مثمن سالم، بطرز ع

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا الخ حافظ (متوفی ۷۹۲ھ) [1]

(۲) بحر ہزج مسدس مقصور، بطرز ع

الٰہی غنچۂ امید بکشائے الخ جامی (متوفی ۸۹۸ھ) [2]

(۳) بحر رمل مسدس مقصور، بطرز ع

بشنو از نے چوں حکایت می کند الخ رومی (متوفی ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء) [3]

---

[1] Reuben Levy: Persian Literature. P — 76.

[2] عنایت اللہ : کیمیائے سعادت (ترجمہ)، ص — ۱۹

[3] E.G. Browne: Literary History of Persia, P. 518.

خواہی کہ دل آزردہ نگردی از غم　　　دل را نہ کنی بہ آرزوہا مدغم
امید مبند تا نگردی نومید　　　بے باک بجو بہ خواب مانند غنم

زنہار ازیں پنج بلا کن پرہیز　　　کز شومی آنہاست جہاں درد آمیز
ہر محنت بے سود از انہا خیزد　　　خوف و غم و شرم و غضب و خواہش نیز

بد اشتہ دل زہر چہ در گیہاں باش　　　دل بستہ مکن بہیچ و چوں مہماں باش
ایں مال و منال بلکہ پا و سر و دست　　　از خویش مدان ز خویش رو گرداں باش

چند عاشقانہ اشعار ملاحظہ ہوں :۔

گر مقام دلم بدانستی تو　　　زلف را بر زمیں کجا میداشت!

بدستش بود رنگ از خون عشاق　　　خدایے رنگ گرداند حنا را!

الا اے یار مہ سیما کجائی ؟　　　چہ باشد گر شبے چوں مہ برائی

مہ ہجراں ہماں دم سلخ گردد　　　ہلال ابرویت را چوں نمائی

نہال صبر کہ در دل نشاندہ ام عمرے　　　بیا بیا کہ تو آں نخل را رطب باشی

خالش بہ کنج لب یکے طرۂ مشک فام دو　　　وائے بہ حال مرغ دل دانہ یکے و دام دو
در رخ و زلف او ببیں صبح وصال و شام ہجر　　　آہ ز تیرہ بختی ام صبح یکے و شام دو

ل؎ اسی زمین میں مرزا سودا (متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) کا بھی ایک قصیدہ ہے، جس کا مطلع ہے :۔
چہرۂ مہروش ہے ایک سنبل مشک فام دو　　　حسن بتاں کے عہد میں سحر ہے ایک شام دو

قایم بذمت خویش و باذات خویش دارند جہاں حکم عرض یا جوہر

متصوفانہ

از خلق رمیم و راہ صحرا گیریم دشتے بگزینیم و دراں جا گیریم
در ماتم خویش خاک بر سر پاشیم تا آنکہ بزیر خاک ماوی گیریم

یارب ز کار سخت آساں طلبم آساں طلبم گر از تو احساں طلبم
در فائدہ ام چو ہیچ نقصان تو نیست پس فائدہ چون نقصان طلبم

اے کز تو بجز تو نیستم جائے گریز با خواہش تو کراست یارائے ستیز
خواہی کہ کنم گناہ و گوئی کہ مکن ایں خواہش و گفتن ست کج وامدریز

از ملک خود آمدہ بفرمان تو ایم در ملک تو ماندہ ہم بہ پیمان تو ایم
ہم زود بہ ملک عدم خود بردیم خوش دار کہ یک دو روز مہمان تو ایم

اے کاش ز فکر این و آں پاک شویم وز نیک و بد زمانہ بے باک شویم
انسان گشتیم و سخت نقصان کردیم از خاک شدیم کاش پس خاک شویم

گویند دریں جہاں نہ تارست و نہ پود ویں ہستی او ہست نمودی بے بود
گویم کہ عدم بسان ناش عدم ست ہر سو کہ نگہ کنم وجود ست وجود

اخلاقیانہ

نیکی بہ کسے مکن بہ امید وفا چوں نیست جزائے نیکوئی غیر جفا
چوں گشتہ وفا زوار فانی، فانی زنہار، وفا مجوئے زنہار وفا

چیزیکہ دراں بہر تو لذت باشد چوں سیر شدی ازاں ملالت باشد
دانستہ شد ازیں کہ درحقیقت لذت لذت نہ، ولیک دفع حاجت باشد

چو بادے بر سر سویت د زیدی　　سرِ خود را فدا دانستہ بودم
سرِ تسلیم بر خاک در تو　　حریف نقشِ پا دانستہ بودم
دل بیمار خود را دانہٴ حال　　بہ از حَبِ الشفاء دانستہ بودم

حضرت آقائے محمد حسین سرہندیؒ (متوفی ۱۳۶۸ھ) کے متذکرہ بالا حالات، ان کی علمی وسعت معلومات، فنی اور ادبی مہارت و کمال اس بات کی مقتضی ہے کہ ان کا شمار برطانوی دور کے سندھی فارسی گو شعراء کی صف اول میں ہو۔ ہم طرح غزلیں، منتخبہ اشعار اور رباعیات جو اوپر پیش کی گئیں ان کو پڑھ کر، دل، آقائے سرہندی رح کے اس دعویٰ کی تصدیق کرتا ہے کہ ؎

نہ شعر است ایں کہ سرہندی سراید
زُلالے ہست از کوثر گرفتہ

یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ "تذکرہ شعرائے سندھ" مؤلفہ اسد اللہ نظر سے گذرا۔ اس میں خواجہ محمد حسین جان سرہندیؒ کے متعلق چند مزید امور پر روشنی پڑتی ہے جو یہ ہیں :-

خواجہ محمد حسین جان سرہندی رح کی ولادت باسعادت افغانستان علاقہ قندھار میں بمقام ارغستان ۱۲۹۰ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد محترم حضرت خواجہ عبدالرحمٰن رح نے جب انگریزوں کے خلاف امیر عبدالرحمٰن سے جنگ کی تو آپ کی عمر شریف اس وقت صرف ۱۱ سال کی تھی۔ مگر اس صغر سنی کے باوجود جذبۂ جہاد کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اس جنگ میں حصہ لیا اور خوب خوب داد شجاعت دی۔

جب آپ کے والد محترم نے امیر عبدالرحمٰن کے مظالم سے تنگ آکر حجاز کی طرف ہجرت کی تو آپ ان کے ہمراہ تھے پانچ سال کے عرصۂ قیام میں آپ نے وہاں مدرسہ صولتیہ میں تعلیم حاصل کی اور بعد میں ایک باکمال عالم ہوئے۔

حجاز سے واپسی کے بعد والد محترم کے ساتھ سابق صوبہ سندھ کے موضع ٹکھڑ میں آکر اقامت گزیں ہوئے۔ آپ کے برادر معظم حضرت آغا محمد حسن جان تو والد معظم کے وصال کے بعد موضع ٹنڈو سائیں داد میں مقیم ہو گئے مگر آپ یہیں رہے۔ اور ابتداء قیام سے اپنی زندگی کی ۴۲ بہاریں یہاں گزاریں۔ اس کے بعد آپ سامارو شریف میں آکر اقامت گزیں ہوئے۔ اور یہیں انتقال فرمایا ؎

خندہ لعلشے درد دل غمزہ خدنگ جاں گسل   معجز دل برے نگر نامہ یکے پیام دو
سجدہ بہ طاق ابرواں بردو بلائے جاں سلام   واہ نماز عاشقاں سجدہ یکے سلام دو

ازاں نامہرباں امشب بسویم تو   نہانی یک پیام آمد، خوش آمد
بہ خوابم در شب یلدائے ہجراں   رخش ماہِ تمام آمد، خوش آمد
خدنگ غمزہ آتش در جہاں زد   مہ ام بالائے بام آمد، خوش آمد

اے ماہ مپوش چہرہ ہرگز   دانی شب زلف را سحر نیست!

سرہندی خستہ خوردہ تیرے   از چشم تو و ترا خبر نیست!

نگاہ مست تو دُردِ مے مغانۂ ما   بہارِ جلوۂ تو برق آشیانۂ ما

قدِ تو نشانید ز پا سرو رواں را   خدِّ تو ستانید ز مہ داد کتاں را

چو مہ از ہالہ رویش در شب تار   ز چشم اختراں چادر گرفتہ

یارب کے آں زلف سیاہ از روئے رخشاں بگذرد   آں صبح وصل آید پدید ایں شام ہجراں بگذرد
گل می شود خوار و خجل بلبل ز عشقش منفعل   روزیکہ آں آرام دل سوئے گلستاں بگذرد
بر من مکن جور ایں قدر از آب چشم کن حذر   در کویت از دیوار و در ترسم کہ طوفاں بگذرد

ز درد ہجر تو مرغ دل ما   ہمی پرّد اگرچہ بے پر افتاد
عجب دارم ز خال ہندوئے تو   کہ در جنت چساں ایں کافر افتاد
منم شیدائی بخت تیرۂ خویش   کہ با زلف نگارم ہمسر افتاد
ز حال زار سرہندی چہ پرسی؟   کہ بر شمعے گذار صرصر افتاد

نئی کتابیں

عصرِ جامعہ ۱۹۶۷ء (تنقیدی ادب نمبر) مدیرہ حامد، جامعہ سندھ، حیدرآباد کے شعبۂ اردو کا علمی مجلہ ہے اس کا مقصد اجرا علم وادب کی خدمت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یونی ورسٹی کے طلبہ کی تربیت ہو۔ اس لیے ناگزیر تھا کہ اساتذہ کے پہلو بہ پہلو تلامذہ کی کاوش ہائے فکر و تحقیق بھی موجود ہوں۔ ۱۹۶۶ء میں اس رسالے کا ایک بلند پایہ "قومی شاعری نمبر" نکلا تھا اس مرتبہ "تنقیدی ادب" کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ نمبر اپنے موضوع تنقید پر نہایت بیش قیمت مضامین کا مجموعہ ہے۔

نمبر کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں پاک و ہند کی یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کے رشحات قلم ہیں اور حصہ دوم میں جامعہ سندھ کے طلبہ کے مضامین ہیں۔ حصہ اول متعدد اساتذہ علم و ادب وفن کی شخصیات، افکار اور ان کی علمی و ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے حصہ دوم تنقید کی تعریف، تاریخ، ارتقا، افکار و نظریات، تحقیق و تخلیق اور پھر تنقید کے عملی نمونوں پر مشتمل ہے۔ اس میں مختلف مکتبہ ہائے فکر کے ادیبوں اور مختلف اصناف علم و ادب کی نمائندہ کتابوں کو موضوع نقد و نظر بنایا گیا ہے۔

اساتذہ کے مضامین تو حاصل رسالہ ہیں ہی، تلامذہ نے بھی اپنے اپنے موضوعات کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے ان کے مضامین میں بھی ندرت، جدت اور معلومات ہیں۔ یہ نمبر بڑے سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے اور حسن ترتیب نے اسے تنقید کے موضوع پر ایک مستقل تصنیف بنا دیا ہے۔ جس میں علمی و عملی تنقید کا کوئی پہلو نظرانداز نہیں ہوا ہے تقریباً پونے تین سو صفحات کا یہ نمبر اپنے موضوع پر ہر طرح مفید اور لائق مطالعہ ہے۔ (ابوسلمان شاہجہانپوری)

الزبیر (کتب خانہ نمبر) مدیر: مسعود حسن شہاب　کتب خانوں کی علمی و قومی افادیت کے باوجود اس موضوع پر کوئی رسالہ نمبر شائع کرنے کی جرأت کیوں کرتا کہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ملک میں کتنے ہوں گے اور بازار میں اس کی مانگ ہی کیا ہوگی۔ تجارتی نقطۂ نظر سے

انجمن کی نئی مطبوعات

(جو عنقریب شائع ہو رہی ہیں)

۱۔ مقاماتِ ناصری۔ میر ناصر علی کے انشائیوں کا مجموعہ۔ مرتبہ نا انصار ناصری
۲۔ تذکرۂ عُروس الاذکار۔ مصنفہ نصیر الدین نقش　　مرتبہ افسر امروہوی
۳۔ کندمالا (ڈراما)۔ مصنفہ ون نگا اچاریہ　　مترجم صمدانی نقوی
۴۔ شمالی ہند کی نثری داستانیں (نظر ثانی شدہ ایڈیشن) ڈاکٹر گیان چند
۵۔ شمالی ہند کی منظوم داستانیں ــــــ ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۶۔ اشاریہ اُردو۔ رسالہ "اردو" کے چالیس سالہ شماروں کا اشاریہ۔
۷۔ لغت کبیر اُردو (جلد اول) بابائے اردو مرحوم
۸۔ انگریزی ادب کی تاریخ　ڈاکٹر احسن فاروقی
۹۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد دوم) اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست
۱۰۔ ابیاتِ سلطان باہو۔ مترجم عبدالمجید بھٹی
۱۱۔ تاریخ سلطنت مسلمانانِ روس۔ مزمل یٰسین
۱۲ اُردو تھیٹر۔ جلد چہارم۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی
۱۳ تذکرہ ہمیشہ بہار۔ مصنفہ کشن چند اخلاص۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

ہے۔ اور اس طرح یہ شرح جامع شروح دیوان غالب بن گئی ہے۔ دیوان غالب کی یہ مکمل شرح ہے اور فاضل شارح نے اس میں تشریح الفاظ و محاورات کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے۔

کتاب کے دیباچے میں دیگر مطبوعہ و غیر مطبوعہ شرحوں پر تبصرہ کیا گیا ہے اس کے بعد "تسامحات و زلّات غالب" کے عنوان سے کلام غالب میں عروض اور زبان و بیان کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

اس شرح کے ابتدائی حصے میں "یادگار غالب" سے ماخوذ غالب کے حالات زندگی بھی ہیں۔ اور کتاب کا ایک قیمتی حصہ شارح کے خود نوشت سوانح حیات ہیں۔ اس طرح کتاب کے ابتدائی نوّے صفحات مذکورہ مختلف مباحث کی نذر ہیں صفحہ اکیانوے سے شرح دیوان غالب شروع ہوئی ہے۔

حضرت شاداں نے ہر شعر پر تفصیلی بحث کی ہے، اور متعلقہ شعر کا کوئی پہلو ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ پہلے کے شارحین سے انھوں نے جا بجا اختلاف بھی کیا ہے، البتہ مقالات پر مولف نے جو منطقیانہ انداز اختیار کیا ہے وہ ان کے وسیع علم و فضل کا آئینہ دار ہے۔ اس شرح کو ہر اعتبار سے غالبیات میں ایک مفید اور قابل قدر اضافہ قرار دیا جاسکتا۔

بڑے سائز کے ۹۱۶ صفحات کی یہ کتاب شیخ مبارک علی ناشر و تاجر کتب، لاہور نے دسمبر ۱۹۶۸ء میں پہلی بار شائع کی ہے سفید اور اخباری کاغذ کے اختلاف کے ساتھ پندرہ اور بارہ روپے اس کی قیمت ہے۔ (ابو سلمان شاہجہان پوری)

سیرت رسول اللہ صلعم

مصنف : پروفیسر سید نواب علی

ناشر : مکتبۂ افکار رابسن روڈ کراچی

قیمت : بارہ روپے

ضخامت : ۴۷۰ صفحات

برگزیدہ ہستیوں کی سوانح حیات کا مطالعہ ہمیشہ سے افراد و اقوام کے کردار کی تعمیر میں مفید ثابت ہوتا رہا ہے۔ عرب میں اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کی روایت بہت پرانی ہے۔ اسی بنا پر محمد رسول اللہ صلعم کی حیات کے تمام گوشوں کو شروع میں یکجا کر لیا گیا تھا جن کے مطالعے سے پیغمبر اسلام کی ذات و صفات کے سارے رموز آشکار ہو جاتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں بیسویں صدی کا ربع اول اردو کے مشاہیر اہل قلم کی جولانگاہ رہا ہے۔ اسی زمانے میں رسول اکرمؐ کی زندگی پر جدید انداز میں تین کتابیں لکھی گئیں۔ شبلی کی "سیرۃ النبی" قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی "رحمۃ للعالمین" اور پروفیسر سید نواب علی کی "سیرت رسول اللہ"

سرسید نے سب سے پہلے ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب "خطبات احمدیہ" کی صورت میں دیا تھا۔ اس وقت سے سیرت رسولؐ سے دل چسپی رکھنے والے علماء مستشرقین کی غلط بیانیوں اور نکتہ چینیوں کا جواب دینے کی کوشش کرتے رہے

[illegible]

اس موضوع پر نمبر شائع کرنا قطعی طور پر خسارے کا سودا ہے - اردو اکادمی بہاولپور نے اس موضوع پر الزبیر کا یہ نمبر شائع کرکے بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے -

چھ سو تینتیس صفحے کا یہ ضخیم نمبر سات حصوں میں منقسم ہے لیکن بنیادی طور پر اس کے دو حصے ہیں - رسالے کے ابتدائی حصے میں کتب خانوں کی افادیت، ان کی اہمیت اور تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے بعد ملک اور بیرون ملک کے سرکاری کتب خانوں، مختلف تعلیمی، تحقیقی اور علمی اداروں کے کتب خانوں اور اہل علم و صاحبان ذوق کے ذاتی کتب خانوں کا تعارف کرایا ہے -

اس نمبر میں ۷۰ حضرات کے ۷۱ مضامین شامل ہیں - حصہ لینے والے پاک و ہند کے مشہور اہل قلم ہیں اور انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی کے وہ عظیم الشان کتب خانوں کے سوا اس میں ملک و بیرون ملک کے تقریباً ہر قابل ذکر کتب خانے کا ذکر آگیا ہے - بعض ذاتی کتب خانوں کے تعارف اور تذکرے میں بڑی فیاضی کا ثبوت دیا گیا ہے لیکن یہ حضرات اپنے ذوق کتب اندوزی اور کتب خانوں کے اہتمام کی وجہ سے واقعی داد کے مستحق، لائق تحسین اور قابل رشک بھی ہیں -

یہ نمبر نہایت مفید، جامع اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے - اردو صحافت کی تاریخ میں اس موضوع پر کسی رسالے کا غالباً یہ پہلا نمبر ہے -

مشرقی پاکستان کے کتب خانوں کے متعلق یہ نمبر ضرور تشنۂ معلومات ہے اور اس کا اعتراف خود ایڈیٹر نے کیا ہے لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں البتہ بہاولپور میں بیٹھ کر یہ علمی کارنامہ انجام دینا ضرور حیرت انگیز ہے -

الزبیر کے ایڈیٹر جناب مسعود حسن شہاب کے ذوق تحقیق و تجسس اور ان کی مساعی مشکورہ کی داد نہ دینا بڑا ظلم ہوگا -

اس نمبر کی ترتیب و اشاعت اور اس علمی خدمت کے لیے وہ ہر طرح لائق تحسین و تبریک ہیں - (ابو سلمان شاہجہانپوری)

روح المطالب فی شرح دیوانِ غالب (از شاداں بلگرامی)

غالب اردو کے نکتہ آفریں اور سحر طراز شاعر تھے ان کے کلام کی متعدد شرحیں شائع ہو چکی ہیں پیش نظر شرح سید اولاد حسین شاداں بلگرامی کی یادگار ہے - شاداں مرحوم نے ایک ادیب اور استاد کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی - برصغیر پاک و ہند کے متعدد مشہور ادیب اور محقق ان کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہیں -

فاضل شارح کی یہ کتاب واقعی ایک بلند پایہ علمی یادگار ہے اور غالبیات میں ایک قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے - حضرت شاداں نے وفات سے دو برس پہلے ۱۹۴۶ء میں یہ شرح لکھی تھی - بوجوہ اس کی اشاعت عمل میں نہ آ سکی - زیر نظر نسخہ اس کی تالیف میں ان کے پیش نظر متعدد شرحیں رہی ہیں - خاص طور پر انھوں نے سید علی حیدر نظم طباطبائی، مولانا حسرت موہانی اور ریاض اور ان کے بعد کی غزلوں کی شرح میں آسی مرحوم کی شروح سے اور جا بجا مولانا حالی کی یادگار غالب سے استفادہ کیا

ان کی تحریر ایسے محققین کی تحریر کی ایک اعلیٰ مثال ہے جو پورے اعتماد سے اپنے استدلال پیش کرتے ہیں۔ سید نواب علی کا یہ کارنامہ بلاشبہ علمی و تحقیقی روایت کی ایک اہم کڑی ہے جسے گزشتہ نصف صدی کی طرح آیندہ بھی اہم سمجھا جائے گا۔ سید صاحب کی یہ کتاب برسوں تک اعلیٰ درس گاہوں کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ توقع ہے کہ پاکستان کی اعلیٰ درس گاہیں بھی اسے اپنے نصاب میں شامل کر کے مذہبی علوم کی تحصیل کرنے والے طلبہ کو بھرپور استفادے کا موقع دیں گی۔ (سحر انصاری)

مجاز ایک آہنگ

مرتبہ : منہبا لکھنوی

ناشر : مکتبۂ افکار رابسن روڈ۔کراچی

قیمت : پندرہ روپے

ضخامت : ۲۵۶ صفحات

شاعری خواہ شخصیت سے گریز کا نام ہو خواہ شخصیت کے اظہار کا، حقیقت یہ ہے کہ بعض شاعروں کا کلام پڑھتے وقت ان کی زندگی اور شخصیت کو ذہن سے محو کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ ان کا کلام ان کی ذہنی اور جذباتی سوانح عمری ہوتا ہے۔ مجاز بھی ایک ایسا ہی شاعر تھا جس نے اپنی زندگی اور اپنے سخن کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بنا دیا۔ اس نے وقت کی سچائیوں کے حوالے سے اپنے آدرش اور جذبے کو اس طرح یک جا کر دیا تھا جیسے خواب اور حقیقت کے تار و پود سے انسانی وجود کی کوئی نئی قبا تیار کر لی جائے۔ مجاز کی ذہانت، دیانت اور ایک شریفانہ محرومی نے اس کی شاعری اور زندگی کا مطالعہ کرنے والے ہر دردمند دل میں گھر کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کوئی بزم مجاز ہے اور نہ کوئی مجاز اکیڈیمی لیکن اس کے مداحوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے کلام کی خوشبو مشک سارا کی خوشبو کی طرح چہار سمت بکھر رہی ہے۔

مجاز کی زندگی میں اس کے احباب نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ اس کے دوستوں نے اسے کس قدر اعتماد دیا ہوگا کہ مجاز نے اپنے مجموعۂ کلام "آہنگ" کے انتساب میں فیض و جذبی کو اپنا دل و جگر، اور سردار و مخدوم کو اپنے دست و بازو سے تعبیر کیا ہے۔ مجاز کے مرنے کے بعد اس کے دوستوں نے اپنے اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ ترقی پسند تحریک کی توانائی سے اکتساب حیات کرنے والوں نے اس کی شخصیت اور فن پر اپنے اپنے انداز میں لکھا۔ اور خوب لکھا۔ حسن اتفاق سے یہ تحریریں ماہنامہ "افکار" کراچی کے مجاز نمبر میں شائع ہو گئیں اور پھر مدیر افکار جناب منہبا لکھنوی نے جن کے ذہن میں اشاعت ادب کے ہمیشہ نئے نئے زاویے ابھرتے ہیں، ان مضامین کو بعض اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین، مجاز کے قلمی خطوط و تصاویر، انتخاب کلام اور پاک و ہند کی برگزیدہ ہستیوں کے تعزیتی پیغامات کے ساتھ "مجاز - ایک آہنگ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، اور پھر – اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے۔

میرے پیش نظر اس وقت اسی "آہنگ" کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض،

" ایک دائرۃ المعارف النبوی یا پیغمبر اسلام سے متعلق انسائیکلوپیڈیا ہے۔" پروفیسر سید نواب علی (سابق وزیر تعلیمات ریاست جوناگڑھ) نے ۱۹۳۲ء میں اپنی کتاب " سیرت رسول اللہؐ " شائع کرائی تھی۔ اس سے قبل ۱۹۰۸ء میں " تذکرۃ المصطفٰی " کے نام سے وہ ایک اہم کتاب بھی لکھ چکے تھے۔ پروفیسر نواب علی ایک متبحر عالم۔ اسرائیلیات کے ماہر اور جدید علم کلام کے فاضل تھے۔ انھوں نے موازنۂ ادیان، تورات و اناجیل کے تقابلی مطالعے اور مستشرقین کی تصانیف سے براہ راست واقفیت کو بنیاد بناکر " سیرت رسول اللہؐ " لکھی۔ اس کتاب نے ایک زمانے میں بہت شہرت حاصل کی۔ یہ عرصے سے نایاب تھی۔ اب ان کے بھتیجے اور داماد صہبا لکھنوی صاحب نے اسے پاکستان میں دوبارہ شائع کیا ہے۔

" سیرت رسول اللہؐ " لکھتے وقت پروفیسر نواب علی نے نہ صرف مستشرقین کی غلط بیانیوں کا مدلل جواب دیا ہے بلکہ واقدی ایسے عالم دین پر بھی کڑی تنقید کی ہے۔ یہ وہی واقدی ہیں جنھیں امام حنبلؒ نے کذاب اور امام بخاریؒ نے متروک الحدیث کہا ہے۔ قدیم ماخذوں کے سلسلے میں پروفیسر نواب علی نے محمد بن مسلم زہری، محمد ابن اسحاق اور محمد ابن جریر الطبری ایسے ارباب سیر اور دیگر محدثین و مفسرین کی تصانیف کا غائر مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں مختصر اظہار خیال بھی کیا ہے۔

کتاب کا آغاز " خدائے ابراہیمؑ کے دو گھر " سے ہوتا ہے اس میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریت کے اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ پھر رسول اکرمؐ کی ولادت سے لے کر نبوت، ہجرت، غزوات اور تعلیمات کا بڑے جامع انداز میں تذکرہ ملتا ہے۔ اسی میں مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ پروفیسر نواب علی کو مذاہب عالم کے مطالعے اور تورات و اناجیل کے حوالوں سے اپنے موقف کو مضبوط اور موثر بنانے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ان کی تصنیف " صحف سماوی " ان کی اس بے پایاں صلاحیت کا اہم مظہر ہے۔

سیرت رسول اللہؐ کی تصنیف میں پروفیسر نواب علی نے جو موقف اور طریق کار اختیار کیا ہے اس کا اندازہ خود ان کی اس تحریر سے ہوجاتا ہے۔

> " ابتدائی تیسری صدی تک کے محدثین اور ارباب سیر کی تصانیف اور ان کے شارحین مابعد کی تالیفات کا مطالعہ کرکے اور مخالفین اسلام کی تصانیف بزبان انگریزی نیز مشہور بانیان مذاہب کی سوانح عمریاں پیش نظر رکھ کر واقعات اس طور سے قلم بند کیے گئے کہ مخالفین کے اعتراضات بھی رفع ہوں اور اصل حالات آئینہ ہو کر زبان اردو میں ایک معتبر اور مختصر متن موجود ہوجائے جس سے برادران ملت کے ایمان کو تقویت پہنچے اور اہل وطن کو ہدایت نصیب ہو۔"

پروفیسر نواب علی علم و ادب کی اسی روایت سے تعلق رکھتے ہیں جس کی بنیاد حالیؔ، شبلیؔ، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر محمد اقبال اور ظفر علی خاں نے رکھی تھی۔ ان کی تحریر میں علم کا جمال اور جلال دونوں موجود ہیں۔ چونکہ خود ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر تھے اس لیے تحقیق اور جرح و تعدیل جیسے مراحل سے گزرتے وقت بھی ان کی تحریر میں شگفتگی اور دل پذیری قائم رہتی ہے

اور اسے تباہ کرنے والے معاشرے کے خدوخال نظر کے سامنے ابھرتے ہیں ۔ بقول ڈاکٹر ملک راج آنند " مجاز کی جواں مرگی اس معاشرے اور ایک شکست خوردہ حساس اور ذہین انسان کے درمیان موجودہ اختلاف کی ایک واضح مثال ہے"۔

" مجاز ۔ ایک آہنگ " سے مجاز کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں اور اس کے جذبے کی تمام صداقتوں کی گواہی ملتی ہے کیونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ اس کے گواہوں میں وہ شخصیتیں بھی شامل ہیں جو اسے بہت عزیز رکھتی تھیں اور جنھوں نے اپنی روح کی گہرائیوں سے اس کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کیے ہیں ۔

" مجاز ۔ ایک آہنگ " کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ شروع میں مجاز کے حالاتِ زندگی ، اس کا آخری سفر، اس کی یادگار تصاویر، غیر مطبوعہ خطوط کا عکس، غیر مطبوعہ کلام اور جوش ملیح آبادی کا پندنامہ اور اس کا جواب شائع کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد شخصیت پر مضامین ہیں جو مجاز کے ان عزیزوں اور دوستوں نے لکھے ہیں ۔ حمیدہ سالم، جاں نثار اختر، سعید اختر نعمانی، سجاد ظہیر، سردار جعفری، عصمت چغتائی، سبط حسن، ڈاکٹر ملک راج آنند، قرۃ العین حیدر، عبادت بریلوی، ظ ۔ انصاری اور نصیر حیدر وغیرہ ۔ سبط حسن نے اپنے مضمون میں مجاز سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے اور سلام مچھلی شہری کے بعض غیر ذمہ دارانہ بیانات کا مدلل جواب دیا ہے ۔ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر نے اپنے اپنے انداز میں مجاز اور اس کے عہد کے بعض اہم واقعات کو پیش کیا ہے ۔ کوئی ایک سو صفحات میں مجاز کے کلام کا انتخاب شائع کرنے کے بعد تنقیدی مضامین کا ایک حصہ شامل کیا گیا ہے ۔ جسے ان ناقدین نے سنوارا ہے :۔ فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، اختر انصاری دہلوی، ممتاز حسین، سردار جعفری، محمد حسن عسکری، مجتبیٰ حسین، اسلوب احمد انصاری، انجم اعظمی اور خلیل الرحمان اعظمی وغیرہ ۔ شخصیت کی طرح فن سے متعلق مضامین میں بھی بڑا تنوع ہے ۔ تنقیدی مضامین میں مجاز کے کلام کا متوازن جائزہ ملتا ہے ۔ ایک آدھ مضمون اس قسم کا بھی ہے جس سے خاصا اختلاف کیا جا سکتا ہے مثلاً اسلوب احمد انصاری کا مضمون " مجاز "۔

" شامِ غریباں " کے عنوان سے اس جلسۂ تعزیت کی روداد شائع کی گئی ہے جو مجاز کی وفات کے بعد لکھنؤ میں منعقد کیا گیا تھا ۔ اس میں حیات اللہ انصاری، یشپال جی، عصمت چغتائی، سجاد ظہیر اور سردار جعفری نے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں ۔ مختلف شعراء کے گلہائے عقیدت کے بعد مجاز ایک آہنگ پر ناقدین و مبصرین کی آرا کا انتخاب شائع کیا گیا ہے ۔

اس کتاب کا ایک اہم حصہ تاثرات پر مبنی ہے ۔ مجاز اور اس کی شاعری کے بارے میں یہ تاثرات مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، وقار عظیم، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، کلیم الدین احمد وغیرہ کے ہیں ۔ آخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین، چودھری محمد علی ردولوی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ کے تعزیت نامے ہیں ۔

مجاز کی زندگی اور فن کے ان تمام گوشوں کو یکجا کر دینا کس قدر دشوار تھا اور اس سے صہبا لکھنوی کس خوش اسلو

آل احمد سرور، احتشام حسین، قرۃ العین حیدر، سردار جعفری، سید سبط حسن، عصمت چغتائی، ایسے مسلمہ ادیب و شاعر ہیں۔ اور اس کے سراہنے والوں میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، کرشن چندر، وقار عظیم، شاہد احمد دہلوی، ممتاز حسین اور ڈاکٹر عبادت بریلوی ایسے اکابر ادب شامل ہیں۔

شعرا کے فن اور شخصیت پر اس قسم کے مجموعے انگلستان، یورپ اور امریکہ میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتے ہیں۔ بڑے شاعروں اور ادیبوں کا تو ذکر ہی کیا، مغرب میں تو روپرٹ بروک، ہارٹ کرین اور ڈلن ٹامس ایسے جواں مرگ شاعروں پر بھی اس قسم کی متعدد کتابیں مل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "مجاز ۔ ایک آہنگ" ایسی کوششیں نئی روایت کے آغاز، ادب دوستی اور ادیبوں اور شاعروں سے ارادت کا عملی ثبوت ہیں۔

مجاز جدید اور قدیم دونوں قسم کے افراد کو یکساں طور پر پسند تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس نے شعر اور شاعر کے درمیان جسم و جان کے سچے تجربوں کا رشتہ قائم کرنے پر ساری توجہ دی تھی۔ مجاز کی سی سچائی اردو کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ بقول انجم اعظمی "شاعری کو کتابوں میں تلاش کرنے کے بجائے زندگی میں ڈھونڈا جائے تو شاید ہی ہمارے عہد میں کوئی ایسا شخص ملے جو مجاز سے بڑا شاعر ہوگا۔ مجاز نے اپنی شاعری اور شخصیت میں ان دو انتہاؤں کو یک جا کر دیا تھا جو رومان و انقلاب، مرگ و حیات اور حزن و طرب سے عبارت ہے۔ پاسکل نے کہا ہے کہ کسی ایک انتہا پر جم جانا بڑائی نہیں ہے بلکہ اپنے دونوں ہاتھوں سے دونوں انتہاؤں کو چھو لینا عظمت کی نشانی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اتنے جمال پرست، ذہین اور بذلہ سنج شاعر کو عین عالم شباب میں محرومی کی موت نصیب ہوئی تو دو انتہاؤں کی یک جائی سے پیدا ہونے والی عظمت کا مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے۔

ارسطو نے المیہ کو تزکیۂ نفس کا ذریعہ بتایا ہے۔ مجاز کی زندگی ایک زندہ المیہ تھی جو تزکیۂ نفس کا باعث ہو یا نہ ہو لیکن دردمند دلوں کے لیے ایک اجنبی ہوک اور صاحبان فکر و نظر کے لیے تازیانۂ عبرت سے کم نہیں۔ مجاز نے زندگی کے خلفشار، ناسازگاری اور بھیڑ بھڑکے میں اپنے جذبۂ معصوم اور گداز دل کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کب تک اپنی ذہانت اور بذلہ سنجی کے بل پر زندگی کا زہر پی سکتا تھا۔ مجاز ایک باشعور انسان تھا۔ شاید اسی لیے اس نے روایتی عاشقوں اور خود ساختہ سودائیوں کی طرح تھیٹریکل انداز میں خود کو تباہ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ شعور و شراب کی جنگ میں شراب اسے شکست تو نہ دے سکی البتہ اسے ہلاک کر دیا۔ آج یہ شہید بادۂ گلگوں ایک ایسا ادھورا خواب بن کر ذہنوں میں محفوظ رہ گیا ہے جس کے لیے آنکھ کھلنے پر بھی کہا جا سکتا ہے کہ "کاش یہ خواب کبھی ختم نہ ہوتا" کیونکہ شاید یہ خواب اس طرح ختم ہونے کے لیے نہیں تھا۔

بہ ایں سیلِ غم و سیلِ حوادث

مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

یہ ساری کیفیات مجاز کے کلام اور اس کی زندگی کے واقعات میں مل جاتی ہیں۔ اور انھی کی روشنی میں مجاز کی جواں مرگی

گرد و پیش

ایک نظیر، ایک مثال

کراچی کے ڈپٹی کمشنر جناب ایس ایم اولیس نے پاکستان کی تاریخ میں اردو میں پہلی بار عدالتی فیصلہ تحریر کر کے اُن دنوں کی یاد تازہ کر دی جب اردو کو برٹش گورنمنٹ نے سرکاری زبان کا درجہ دے دیا تھا - اور جب اسے اپنی مصلحت کے خلاف دیکھا تو یہ فیصلہ واپس لے لیا - پھر بھی عدالتی نظام میں اردو کو بڑی اہمیت حاصل رہی - بدقسمتی سے پاکستان میں قائداعظم کے فیصلہ کن اعلانات کے بعد بھی تحریک پاکستان کی سب سے موثر قوت اردو کو عملاً نظر انداز کیا جا رہا ہے - جناب ایس۔ ایم اولیس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا "کسی معاشرے کے عوام کے لیے عدالتوں کی کارروائیاں" اور حاکمان عدالت اور ان کی آراء کا کافی اثر پڑتا ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم عوام ہی کی زبان استعمال کریں"۔

سائنٹفک سوسائٹی کی سالانہ کانفرنس

سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کی نویں سالانہ چار روزہ کانفرنس ۲۳ نومبر ۱۹۶۷ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں منعقد ہوئی جس میں پاکستان بھر سے ڈھائی سو مندوبین نے شرکت کی - یہ مندوبین ملک کے ممتاز سائنسدان اور ماہرین تعلیم تھے - سائنس کانفرنس میں تمام ممتاز شخصیتوں کی طرف سے اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ سائنسی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کی تعلیم قومی زبانوں میں نہ دی جائے - سپریم کورٹ کے جسٹس ایس - اے رحمان نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ "ذریعہ تعلیم اور سائنسی ترقی کو لازم و ملزوم کی حیثیت حاصل ہے اگر پاکستان میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہی رہا تو قوم دو طبقوں میں بٹ جائے گی اور احساس یگانگت اور ملکی سالمیت کے جذبے پر ضرب لگے گی - محض انگریزی جاننے والا طبقہ عوام کے قرب سے محروم رہتا ہے" ڈاکٹر شفقت حسین صدیقی صدر مجلس تحقیقات سائنس و صنعت پاکستان نے سائنسی مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بیرونی ذرائع سے حاصل کی ہوئی فنی تعلیم کو اپنے حالات کے مطابق بنائے بغیر فروغ دینا ممکن نہیں ہے" جناب حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے فرمایا "یہ حیرت ہے کہ ... لوگ یہ کہتے ہیں کہ سائنس کے مضامین صرف انگریزی

سے عہدہ برآ ہوئے ہیں اس کا اندازہ "مجاز ایک آہنگ" کے ساڑھے نو سو صفحات کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ مجاز ایک آہنگ کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ جملہ رسمی توصیف نہیں بلکہ ایک گہری صداقت و معنویت کا حامل ہے کہ "یہ کتاب کیا ہے ۔ مجاز کی شخصیت اور فن کی اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا ہے" اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تو پوری دیانت داری سے یہاں تک لکھ دیا کہ " منہاج صاحب نے جس شوق اور محبت سے اس کتاب کی ترتیب میں محنت کی ہے وہ بہت قابل شکر گزاری ہے ۔ انھوں نے نہ صرف مجاز کا حق ادا کیا بلکہ مجاز کے مداحوں اور قدر دانوں نیز اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے"۔ "مجاز ۔ ایک آہنگ" کا دوسرا ایڈیشن بلاشبہ مجاز کی زندگی اور فن کا ایک جامع اور متنوع مرقع ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ (سحر انصاری)

ترکانِ عثمانی (جلد اول)

مولفہ ڈاکٹر محمد صابر ۔

اردو زبان میں ترکانِ عثمانی کی تاریخ پر ترکی مآخذ کی بنیاد پر شاید ہی کوئی کتاب لکھی گئی ہو ، اکثر و بیشتر تاریخیں یا تو انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں یا انگریزی کتابوں کو بنیادی مآخذ سمجھ کر لکھی گئی ہیں ، ڈاکٹر محمد صابر نے ترکانِ عثمانی جیسے اہم موضوع پر کئی برس کی محنت شاقہ کے بعد ایک مستند کتاب لکھی ہے اور اردو کے سرمایے میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے ، جیسا کہ فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ ترکیوں کی قوم ایک ایسی مسلم قوم ہے جسے ایشیا کے علاوہ یورپ کے بھی ایک اہم خطہ پر اقتدار حاصل ہے ۔

یہ خطہ زمین خواہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو مگر اپنی قدیم تاریخ اور اپنے محل وقوع کے اعتبار سے عدیم المثال اور مسلمانوں کے انتہائی عروج کی یادگار ہے ، ترکی عوام یورپ کے ساتھ اتنے عرصہ سے رہنے سہنے اور ان کے تہذیب و تمدن سے بڑی حد تک متاثر ہونے کے باوجود بھی آج تک جذباتی اور ثقافتی اعتبار سے بڑے پکے مسلمان ہیں اور جدید انقلابی تحریکات بھی انکی روح مذہبی کو مضمحل نہ کر سکیں اور ان کے بنیادی معتقدات و اعمال اسلام کے مطابق ہیں اور ان کے دلوں میں ملت اسلامیہ کا درد موجود ہے بالخصوص پاکستانی مسلمانوں سے انہیں انتہائی محبت و خلوص ہے اسلئے انکی تاریخ کا مطالعہ ہمارے لئے نہ صرف اس بنا پر ضروری ہے کہ ہم ان سے خونی ، تاریخی اور ثقافتی روایات کے ذریعہ وابستہ ہیں بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم نے اپنی آزادی کے بعد ان کے تاریخی کارناموں اور ان کے جوش و ولولہ کی داستانوں سے بہت کچھ سیکھا ہے ، نیز موجودہ دور میں ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ربط و ضبط پیدا کرنیکیلئے بھی ان سے قریبی واقفیت ضروری ہے زیر نظر جلد میں ۱۲۹۹ء سے ۱۴۰۳ء یعنی امیر عثمان غازی سے سلطان یلدرم بایزید خان تک کا ذکر ہے مصنف نے جابجا شجروں اور نقشوں کی مدد سے کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے ، ہر چند یہ بات کھٹکتی ہے کہ کاتب نے مصنف کا ساتھ نہیں دیا لیکن اس سے کتاب کی افادیت میں کوئی کمی نہیں آئی ، آخر میں کتابیات کی فہرست بھی دے دی ہے ، یوں یہ کتاب تحقیق کے علاوہ عام قاری کیلئے بھی دلچسپی رکھتی ہے قیمت دس روپے ہے جو بہت زیادہ ہے (منیر فاروقی)

انعامات کی تعداد سات ہوگئی ہے۔ اس طرح ان انعامات کے ذریعے ملک کے بہترین ادیبوں کو ان کی تخلیقات پر ایک لاکھ، ہزار روپے سالانہ تقسیم کیے جائیں گے۔

ادب کی اہمیت

جناب جسٹس سجاد احمد جان نے پنجاب یونیورسٹی کی ادبی سوسائٹی کی مجلس مذاکرہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "ادب معاشرے کی ترقی میں بیش بہا کردار ادا کرتا ہے کیونکہ یہ اس کا مقصد متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ آپ نے کہا کہ وہ سوسائٹی بے کار ہے جو زندگی کی صحیح اقدار سے آگاہ نہیں ہے۔ اور ان صحیح اقدار دریافت کرنے کا بہترین ذریعہ اعلا ادب ہے" انھوں نے طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ ادب میں گہری دلچسپی لیا کریں۔ ادب کے مطالعے سے انھیں بہترین اقدار سے آگاہی حاصل ہوگی۔ انھوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ بعض معاشروں کی مادی ترقی نے لوگوں کو زندگی کی اچھی اقدار سے بیگانہ کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ ذہنی سکون کا خاتمہ ہے۔ آپ نے طلبہ پر زور دیا کہ وہ اردو زبان کی سرپرستی کریں اور اسے ہر دل عزیز بنائیں کیونکہ یہ قومیت کا نشان ہے

بہترین کتابوں پر انعامات

اباسین آرٹس کونسل پشاور نے اس سال کی پانچ بہترین کتابوں پر پانچ انعامات دینے کا اعلان کیا ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اردو نظم پہلا انعام:- "پشتو شاعری" از رضا ہمدانی و فارغ بخاری۔ اردو نثر پہلا انعام:- "آگ اور سائے" از مہر یوسف زئی۔ پشتو نثر پہلا انعام: "پښتانه د تاریخ په رڼا کښې" از سید بہادر شاہ ظفر و "روحانی رابطہ" اور روحانی لیکچرون از قاضی عبدالحلیم اثر افغانی۔ پشتو نظم پہلا انعام:- "سوری" از محمد ہاشم بابر۔ واضح رہے "پشتو شاعری" انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔

عالمی ادارۂ خوراک میں عربی

اقوام متحدہ کے عالمی ادارۂ خوراک و زراعت کی ایک سرکاری زبان عربی بھی تسلیم کرلی گئی ہے۔ عربی کو اس ادارے کی سرکاری زبان بنانے پر کئی حلقوں نے مخالفت کی۔ مگر پاکستان نے اس تجویز کی اس شدت سے حمایت کی کہ بعض دوسرے غیر جانبدار ملک بھی اس سے متاثر ہوئے اور بالآخر اسے سرکاری زبان تسلیم کرلیا گیا۔ عرب ممالک میں پاکستان کا یہ کردار بہت سراہا جارہا ہے۔

قرآن حکیم کا سب سے قیمتی نسخہ

لاہور میں قرآن پاک کے طلائی نسخے کی کتابت مکمل ہوگئی ہے۔ اور اب یہ کتابت دبیز ریشمی کپڑے پر سونے کے تاروں سے کاڑھی جارہی ہے۔ کلام پاک کے متن کی کتابت پاکستان کے بزرگ خطاط حافظ محمد اعظم نے کی ہے۔ میاں محمد شفیع ایم۔ پی۔ اے نے حافظ محمد اعظم کو اس کارنامے پر خراج تحسین پیش کیا۔ مولانا کوثر نیازی نے بھی اس موقع پر تقریر کی۔ قرآن پاک کی سنہری کتابت اتفاق سے اس وقت مکمل ہوئی ہے جب عالم اسلام نزول قرآن کا چودہ سو سالہ جشن منانے والا ہے۔

ب ادا ہو سکتے ہیں اور صرف انگریزی میں ادا ہونے چاہئیں - میرے نزدیک پاکستان میں سائنس سے دشمنی کا حق اس سے بہتر دریپرا ادا نہیں ہو سکتا۔"

یک اہم قرارداد

جماعت اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کی ایک قرارداد میں کہا گیا ہے کہ جماعت اسلامی قومی زبان کے مسئلے میں حکومت کی ناقابلِ فہم پالیسی کو غلط اور ملک کے لیے نقصان دہ سمجھتی ہے۔ ردو اور بنگلا کو قومی زبانوں کی حیثیت سے درس گاہوں اور دفاتر میں رائج کرنے سے پیہم گریز کیا جا رہا ہے - اور نگریزی کی عمر درازی کی جا رہی ہے - جہاں تک اردو کا تعلق ہے اس ملک کے عظیم المرتبت ماہرینِ تعلیم اور ممتاز اہلِ علم حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ یہ زبان ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم اور دفتری ضروریات کے لیے پوری طرح کافی ہے اردداد میں کہا گیا ہے کہ یہ بات بھی ناقابلِ انکار ہے کہ تعلیم کے لیے غیر ملکی زبان کا استعمال ملک کی علمی ترقی اور طلبہ ، ذہنی نشوونما میں سخت رکاوٹ ڈال رہا ہے - اگر قومی زبانوں ہی کو دفتری کام کے لیے استعمال کیا جائے تو سرکاری ماروں اور عوام میں افہام و تفہیم بہت آسان ہو جائے گی - زبان کا مسئلہ بنیادی طور پر ایک اہم تہذیبی مسئلہ ہے ر ہمیں اغیار کی تہذیبی غلامی سے نکل کر اپنا ملی وجود آزادی سے برقرار رکھنا ہے تو غیر ملکی زبان کا تسلط ختم کیا جائے۔

ظہار افسوس

عوامی لیگ کے رہنما اور بار کونسل کے رکن جناب ذکی الدین پال نے کہا ہے " یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ آزادی کے بیس برس گزر جانے کے بعد بھی یہاں اردو کو سرکاری اور عدالتی زبان کے طور پر رائج کرنے کی کوئی ٹھوس کوشش نہیں کی گئی - اس کے برعکس ابھی تک بعض حلقے ایک غیر ملکی بان سینے سے لگائے ہوئے ہیں" آپ نے کہا کہ " سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تک بارہا کہہ چکے ہیں کہ اردو میں عدالتی زبان بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے - اس کے باوجود اربابِ اختیار اردو سے تغافل برتنے کی پالیسی رگامزن ہیں "

تہذیبی، ادبی، تعلیمی اور علمی خبریں

سائنسی مضامین پر اردو کتابیں

پنجاب یونی ورسٹی ہال میں سائنس کے مضامین پر اردو کتابوں اور رسالوں کی نمائش میں ریاضی، کیمسٹری، فزکس، ادویہ، نجینئرنگ، زراعت، حیاتیات اور نباتات پر اردو کی دو ہزار سے زیادہ کتابیں رکھی گئی تھیں - ان کے علاوہ رصغیر اور برطانیہ کی ۱۷۹۶ء میں نسخ اور نستعلیق میں چھپی ہوئی اردو کتابوں کی نمائش بھی کی گئی -

یک لاکھ ۷ ہزار روپے کے انعامات

پاکستان رائٹرز گلڈ اور یونائیٹڈ بینک کی جانب سے دو نئے ادبی انعامات کی وجہ سے اب ملک میں ادبی

یادوں کے چراغ

وارث شاہ

پنجابی زبان کے مشہور صوفی شاعر حضرت وارث شاہ کی یاد میں دو روزہ تقریبات منعقد ہوئیں اس تقریب میں مختلف شہروں کے شاعروں ادیبوں اور دانشوروں کا اجتماع ہوا وزیر بلدیات محمد یاسین خان وٹو کی قیادت میں مجلس شاہ وارث گوجرانوالہ ۔ مجلس شاہ حسین لاہور مجلس شاہ مراد چکوال اور باہو اکادمی جھنگ کی جانب سے شاہ وارث کے مزار پر پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں ۔ بعد میں وٹو صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ بھی ہوا ۔

مولانا ظفر علی خاں کی یاد

۲۰ نومبر کو لاہور میں اردو کے مشہور شاعر بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں کی یاد میں اخبار فروش یونین کی طرف سے ایک عام جلسہ ہوا ۔ جس کی صدارت مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات خواجہ شہاب الدین نے کی ۔ اس موقع پر ادیبوں، صحافیوں اور سیاسی رہنماؤں کے علاوہ اخبار فروش یونین کے صدر نے بھی بابائے صحافت کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ۔ خواجہ شہاب الدین نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں نے برصغیر کے مسلمانوں کے جذبۂ آزادی کو ایک نئی تڑپ سے آشنا کیا اور ظلم و استبداد اور تشدد کی پروا کیے بغیر آخر وقت تک اپنے موقف پر ڈٹے رہے ۔

کیانی مرحوم کی یاد میں

مجلس یادگار کیانی کی جانب سے ۱۵ نومبر کو لاہور میں جناب ایم آر کیانی کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب اے کے بروہی نے کی ۔ جلسے میں اس امر پر تشویش کا اظہار کیا گیا کہ ایسے لوگوں کی تعداد سال بہ سال کم ہوتی جا رہی ہے جو ملک کے دونوں حصوں میں مقبول اور محترم ہوں ۔ جناب اے کے بروہی نے ان کی زندگی کی آخری یادوں اور واقعات پر روشنی ڈالی ۔ جلسے سے خطاب کرنے والوں میں ایڈووکیٹ جنرل راجا سید اکبر ڈاکٹر نسیم حسن شاہ ۔ مرزا منور اور رفیق احمد نکش شامل تھے ۔

بابائے اردو یادگاری تمغے

کراچی میں اسٹوڈینٹس رائٹرز گلڈ کے زیر اہتمام بابائے اردو یادگاری تمغوں کی تقسیم کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے سید ہاشم رضا نے کہا کہ اردو کوئی علاقائی زبان نہیں بلکہ پورے پاکستان کی زبان ہے اور بنگالی، سندھی، پنجابی، بلوچی اور دیگر علاقائی زبانیں بھی ملک کی اپنی زبانیں ہیں ۔ انھوں نے بابائے اردو کو شاندار خراج تحسین پیش کیا اور طالب علم فنکاروں کو تمغے تقسیم کیے ۔

آئینۂ ہند

اترپردیش میں انگریزی کے خلاف مظاہرے

ہندوستان کے مختلف شہروں میں انگریزی کے خلاف

ایک اپیل

اردو کے نوجوان ادیب جناب نعیم راہی "قوس قزح" کے نام سے ہندوستان کے تمام افسانہ نگاروں کا تعارف اور ان کے شاہکار افسانوں کا ایک ضخیم اور عظیم الشان مجموعہ ترتیب دے رہے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے تمام نئے اور پرانے افسانہ نگاروں سے درخواست کی ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنا ایک شاہکار افسانہ اس پتے پر ارسال فرمادیں۔ نعیم راہی ۳۳۳ کھرہمو اسٹریٹ بریلی۔ یوپی

اس آئینہ خانے میں

بنیادی انتظامات

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس وحید الدین احمد نے ملک کی تمام یونی ورسٹیوں پر زور دیا ہے کہ وہ اپنے ہاں انگریزی کے بجائے اردو اور بنگالی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے موثر اقدامات عمل میں لائیں انھوں نے کہا کہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنے سے قوم کے نوجوانوں کو طرح طرح کی مشکلات درپیش ہیں کیونکہ پاکستان کے عوام اور نوجوان کسی غیر ملکی زبان میں نہ صحیح طور پر اظہار خیال کر سکتے ہیں اور نہ ہی صحیح طور پر تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ دستور میں اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ ۱۹۷۲ء تک انگریزی کی جگہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے گا۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس سلسلے میں ابھی بنیادی انتظامات بھی نہیں کیے گئے۔ انھوں نے کراچی یونی ورسٹی کو مبارک باد دی کہ اس نے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں پہل کی۔ اور امید ظاہر کی ہے کہ دوسری یونی ورسٹیاں بھی ایسے ہی اقدامات کریں گی۔

چیف جسٹس کا ارشاد

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب اے آر کارنیلیس نے ایک بار پھر اس بات پر زور دیا ہے کہ ملک کی ترقی کے لیے قومی زبانوں کا نفاذ نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ مشرقی پاکستان میں بنگالی اور مغربی پاکستان میں اردو کو عدالتی زبان قرار دے دینا چاہیے۔ جناب اے آر کارنیلیس ادارۂ مصنفین پاکستان کی تقسیم انعامات کی تقریب کی صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستانی معاشرہ ایسا ہونا چاہیے جس کی بنیاد حق و انصاف پر ہو۔ انھوں نے کہا ملک کی ترقی اور عدلیہ کے صحیح ارتقا کے لیے ہمیں اجتماعی جد و جہد کرنی چاہیے۔

انگریزی تعلیم اور قومی شعور

ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی شیخ الجامعہ اسلامیہ بہاولپور نے ایک تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ انگریزوں نے ہمارے بچوں کو اسلاف کے کارناموں سے بے خبر رکھنے کے لیے نصاب تعلیم سے وہ حصے حذف کر دیئے تھے جو ہمارے شاندار ماضی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

صادقین کا ایک اور کارنامہ

بین الاقوامی شہرت کے حامل ملک کے مایہ ناز مصور جناب صادقین نے منگلا ڈیم کی تاریخی تعمیر میں" مزدوروں کا کارنامہ" کے عنوان سے منگلا کے بجلی گھر میں اپنی نوعیت کی عجیب پینٹنگ کی ہے۔ جس میں محنت کے تاریخی ارتقا کو موضوع بنا کر شاندار قسم کی تصویریں تیار کی گئی ہیں۔ صدر پاکستان نے بھی یہ تصویریں دیکھ کر بے حد مسرت کا اظہار کیا اور مصور کی محنت و مہارت کو سراہا۔

ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا مگر اس میں کامیابی صرف آئینی طریقوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے کنونشن کی تجویز پر صاد کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی محاذ پر اردو کی حیثیت تسلیم کرانے کا یہی وقت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ایوان نمائندگان کے اندر اور باہر اپنے ہمدرد پیدا کرنے ہوں گے اور قانونی طریقوں اور سیاسی پارٹیوں سے سمجھوتے کر کے اپنا حق منوانا ہوگا

اردو کا تحفظ

ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی ایگزیکٹیو کمیٹی نے اپنی آٹھ نکاتی تجاویز میں مطالبہ کیا ہے کہ بہار اور اتر پردیش میں جہاں اردو بولنے والے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ اس تجویز میں کہا گیا ہے کہ ایسے بچوں کے لیے جن کی مادری زبان اردو ہے پرائمری سے ذریعہ تعلیم اردو ہونا چاہیئے ایسے تمام علاقوں میں جہاں اردو بولنے والے قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں اردو ذریعۂ تعلیم کے سکنڈری اسکول کھولے جانے چاہیئے۔ اور یونیورسٹی کی سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم ہونا چاہیئے اور اعلانات، اشتہارات وغیرہ بھی اردو میں شائع کرنے چاہئیں اور اردو کے اداروں کو حکومت کی مدد ملنی چاہیئے۔

صدسالہ جشنِ غالب

اتر پردیش کے گورنر ڈاکٹر گوپال ریڈی نے راج بھون میں غالب کی صدسالہ تقریبات کمیٹی کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ غالب ایک بین الاقوامی شخصیت تھے اور یہ تقریبات ان کے شایان شان ہونی چاہئیں۔ اس موقع پر مختلف یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں نے بھی صدسالہ جشنِ غالب کی تقریبات کی تجویزوں سے اتفاق کیا۔ اس موقع پر متعدد تجاویز پیش ہوئیں۔ اور متعدد قابل ذکر آدمیوں نے تقریریں کیں۔

اردو آرٹس کالج

انجمن اتحاد طلبہ اردو آرٹس ایوننگ کالج کی طرف سے منعقد ہونے والے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ظ انصاری نے کہا کہ آزادی کے بعد کا دور اردو کی زبوں حالی کا دور ہے۔ انھوں نے کہا موجودہ دور میں گزشتہ دور کے وہ ذہین نوجوان نظر نہیں آتے جو ملک کی تمام تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آج کا نوجوان کریرسٹ ہو گیا ہے اور اب اردو کے حق میں صرف ایک دلیل باقی رہ گئی ہے کہ یہ ہماری زبان ہے اور ہم اسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر نارنگ کی واپسی

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ڈاکٹر امیر حسن عابدی کی صدارت میں ۲۰ نومبر ۱۹۶۷ء کو ایک خیر مقدمی جلسہ ہوا جس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو ان کی امریکہ اور یورپ سے واپسی پر استقبالیہ دیا گیا۔ جناب ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اور ڈاکٹر قمر رئیس نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ نارنگ صاحب دعوت خاص پر مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس میں حصہ لینے کے لیے مشی گن گئے تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے مزید کہا کہ نارنگ صاحب تقریباً تین چوتھائی دنیا کا سفر کر چکے ہیں اور جہاں جہاں گئے ان کی یہ کوشش رہی کہ وہاں کے لوگوں کو اردو سے روشناس کرائیں۔ طلبہ کی جانب سے محمد صادق صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر نارنگ کی شخصیت ہمہ گیر اور گہری علمیت کی حامل ہے اور یہ کہ وہ کسی بھی بین الاقوامی محفل میں۔ اردو کی نمائندگی کرنے کے اہل ہیں۔ جب آپ اعزازی پروفیسر کی حیثیت

بڑے ہنگامے ہوئے ۔ جگہ جگہ پولیس اور مظاہرین میں تصادم ہوا ۔ سرکاری املاک اور دفاتر تباہ کر دیئے گئے ۔ لاٹھی چارج کیا گیا اور گولی چلائی گئی ۔ اور انگریزی کے تمام بورڈ جلا کر راکھ کر دیئے گئے ۔ اتر پردیش کے دو وزیروں پربھو نارائن سنگھ اور رام سروپ ورما کو قید تا برخاست عدالت سزا سنائی گئی ۔ گرفتار ہونے والوں میں اسمبلی کے ارکان بھی شامل ہیں صوبے کی حکومت نے وزیر اعظم تک کے لیے صوبے میں داخلے پر پابندی عائد کر دی ۔ ریل گاڑیاں بھی روک لی گئی ہیں ۔ دریں اثنا لوک سبھا میں سرکاری زبانوں کے متنازعہ ترمیمی بل کی پہلی خواندگی مکمل ہوگئی اور ایوان نے ۵۰ کے مقابلے پر ۲۲۴ ووٹوں سے بل منظور کرلیا ۔

صدر جمہوریہ ہند کا اظہار خیال

ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند نے صدارت کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد پہلی بار ایک جلسے کے افتتاح کے موقعے پر لسانی مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے ۔ انھوں نے کہا ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کو برابر کا درجہ ملنا ضروری ہے ۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انگریزی کی جگہ علاقائی زبانیں رائج ہونی چاہئیں ۔ اور ہندی کی ترقی کچھ اس انداز سے ہونی چاہیئے کہ وہ دوسری زبانوں کے راستے میں حائل نہ ہو ۔۔۔

حکومت کا وسیلہ نہیں، اپنا وسیلہ

اردو کے صاحب طرز ادیب اور مزاح نگار جناب رشید احمد صدیقی نے کہا ہے کہ اقلیتیں کبھی مغلوب نہیں ہوتیں ۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ حق پر ہوتی ہیں ۔ اکثریت مغلوب رہتی ہے اس لیے کہ وہ اقلیت کے حقوق تلف کرتی ہے ۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو بچانے کے لیے حکومت کا وسیلہ نہیں ملتا تو ہمیں خود اپنا وسیلہ ڈھونڈنا اور آزمانا چاہیئے ۔ ہمیں چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ بچوں اور ان پڑھ بالغوں کو کم سے کم وقت میں اردو پڑھانے کی خدمت انجام دیں ۔ انھوں نے کہا بادقار جلسوں، شعر و ادب کے مذاکروں، اخبارات اردو رسائل، شاعروں، سینماؤں، تھیٹروں اور قوالی کے مقبول مشاغل میں اردو برابر جاری ساری ہے ۔ اور یہ وہ عوامل ہیں جن پر حکومت کی نہیں معاشرے اور عوام کی حکومت ہوتی ہے اور عوام یقیناً حکومت سے زیادہ معتبر اور مستحکم ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ یو پی کی حکومت بڑے اہتمام سے اردو کی بیخ کنی میں لگی ہوئی ہے ۔

زبان اور سماج

انڈین انسٹی ٹیوٹ شملہ کے زیر اہتمام ایک مجلس مذاکرہ میں جو زبان اور سماج کے موضوع پر منعقد ہوئی تھی اس بات کا اظہار کیا گیا کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ۔ اس مجلس مذاکرہ میں تقریباً ۵۰ ممتاز ماہرین تعلیم، ماہرین لسانیات اور علما نے شرکت کی ۔ پروفیسر مینا کشی سندرم نے اپنے خطبۂ صدارت میں مطالبہ کہ آٹھویں شیڈولڈ میں متذکرہ زبانوں کو مکمل سہولتیں ملنی چاہئیں ۔

بمبئی میں اردو کنونشن کی تجویز

بمبئی میں اردو کنونشن بلانے والوں کے ایک وفد سے بات چیت کرتے ہوئے مشہور اردو شاعر آنند نرائن ملا نے کہا کہ ہمیں جن سنگھ سے

نئے خزانے

(جنوری تا جون سنہ ۱۹۶۱ء

آخری قسط

ابو سلمان شاہجہانپوری

سے وہاں گئے تھے تو آپ نے بے حد کامیابی اور حسن و خوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے تھے۔

اس کے بعد ڈاکٹر نارنگ نے کانگریس کے ستائیسویں اجلاس سے متعلق اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اس میں ۸۰ ملکوں کے تقریباً ڈھائی ہزار نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کے دس شعبے تھے جن میں سب سے زیادہ مقالے اسلامی دنیا اور قدیم جدید ہندوستان کے شعبوں پر پڑھے گئے۔ خود ڈاکٹر نارنگ نے افسانے کے بنیادی رجحانات پر مقالہ پڑھا۔ جدید افسانے پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ نئے لکھنے والوں کے ہاں سماج سے ایک طرح کی بے تعلقی اور غیریت کا جو احساس ملتا ہے وہ صرف مغربی رجحانات کی تقلید میں نہیں ہے۔ اس کا گہرا تعلق بے دلی اور مایوسی کی اس فضا سے بھی ہے جو ملک میں سیاسی پراگندگی اور حکمراں پارٹی کے قول و فعل کے تضاد سے پیدا ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اپنی رپورٹ میں جدید ہندوستان اور اسلامی دنیا سے متعلق پڑھے جانے والے تمام اہم مقالوں کی تفصیل پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ مشی گن کے بعد وہ وسکانسن اور نیو یارک گئے۔ امریکہ میں "غالب صدی" کے لیے پروگرام طے ہوا ہے اس کے مطابق غالب کی منتخب غزلوں کا امریکی شعرا کی مدد سے انگریزی میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ نیز غالب پر تنقیدی مقالوں کی ایک کتاب مرتب کی جا رہی ہے اور خطوط غالب بھی انگریزی میں شائع کئے جائیں گے۔

یونسکو کی طرف سے اس موقع پر غالب کی حیات اور مکاتیب پر ایک کتاب شائع کی جائے گی جسے رالف رسل صاحب اور ڈاکٹر خورشید الاسلام مل کر تیار کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ نے مزید کہا کہ واپسی پر وہ پیرس۔ برسلز۔ لندن۔ قاہرہ اور تہران میں رکے۔ انھیں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں کچھ کام کرنے کا بھی موقع میسر آیا۔

عباس ندوی، مولانا عبداللہ	قرآن کریم کے تراجم[1]	صدق جدید، ص ۶ تا ۷، ۹ رجون
عبداللطیف سجاد لپوری	حالات حاضرہ کی روشنی میں سورہ یٰسین پر ایک نظر	مجلہ الجامعہ، ص ۷ تا ۳۰، جولائی تا دسمبر
عبداللہ بن عمر البیضاوی، ناصر الدین ابی الخیر		
سید عبدالحی شاہد (مترجم)	تفسیر بیضاوی (سورہ آل عمران)	" " ۱ تا ۴۲، اپریل تا جون
عبدالماجد دریا بادی، مولانا	سورہ الفیل[2]	صدق جدید، ص ۵، ۳ رفروری
" " "	سورہ القلم (۶)	" " ۵، ۳ رمارچ
" " "	" (۷)	" " ۵، ۱۷ ر "
" " "	" (۸)	" " ۵، ۲۴ ر "
" " "	سورہ فاتحہ	" " ۵، ۱۹ رمئی
" " "	تین آیتیں (اولی الامر سے کیا مراد ہے؟)	" " ۴ تا ۵، ۱۴ راپریل
عثمان غنی، محمد	درس قرآن مولانا زاہد الحسینی	خدام الدین، ص ۹ تا ۱۲، ۱۷ رفروری
قطب، سید		
مولانا عبدالعزیز (مترجم)	قرآن اور دعوت انقلاب	چراغ راہ، ص ۱۷ تا ۳۲، جون
محبوب رضوی، سید	قرآن مجید کا ایک قدیم اردو ترجمہ	برہان، ص ۳۲۵ تا ۳۴۴، جون
مصطفی، مولانا محمد	تفسیر۔ یا ایھا النبی انا ارسلناک ...... الی .... وسراجاً منیراً	فاران، ص ۱۰ تا ۱۴، نومبر
مصطفی خاں، مولانا محمد	تفسیر (سورہ بقرہ)	" " ۱۳ تا ۱۶، جون
معروف شاہ، سید	قرآن مجید کی خصوصیات	" " ۱۴ تا ۱۹، نومبر
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	تفہیم القرآن	ترجمان القرآن، ص ۱۷ تا ۳۵، جنوری
" " "	" "	" " ۱۷ تا ۳۷، فروری
" " "	تفہیم القرآن (سورہ النجم)	تجلی، ص ۸ تا ۱۰، مئی

---

[1] اس مضمون کا ضمیمہ ۱۷ رجون ۱۹۶۶ء کے صدق جدید میں ملاحظہ فرمائیں۔

[2] صدق جدید، فروری کے دیگر شماروں میں بھی یہ سلسلۂ تفسیر ملاحظہ ہو۔

لسانیات ولغات

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	صوتی تغیرات	فنون / ص ۶۰ تا ۶۶ / جولائی اگست
وحید قریشی، ڈاکٹر	فرہنگ شیرانی (۲)	" " ۲۰۲ تا ۲۱۱ / اکتوبر

مذہبیات

قرآن وتفسیر

اسلم جیراجپوری	فہم قرآن	طلوع اسلام / ص ۷۳ تا ۷۸ / جنوری
اشرف، حکیم عبدالرحیم	قرآن مجید اور عالم اسلام	المنبر / ص ۳ / ۱۰ / فروری
اصلاحی، مولانا امین احسن	تفسیر سورہ آل عمران (۱۰)	میثاق / ص ۲۲ تا ۳۹ / جنوری
" " "	" " " (آخری قسط)	" " ۱۹ تا ۳۰ / فروری
" " "	تفسیر سورہ نسار	" " ۱۷ تا ۳۶ / مارچ
" " "	" " (۲)	" " ۹ تا ۲۴ / اپریل
" " "	" " (۳)	" " ۹ تا ۲۵ / مئی
" " "	" " (۴)	" " ۲۷ تا ۳۱ / جون
" " "	مقدمہ تفسیر قرآن (۴)	" " ۱۷ تا ۲۵ / جنوری
" " "	" " (آخری قسط)	" " ۸ تا ۱۸ / فروری
چشتی، یوسف سلیم	قرآن حکیم کی رو سے حکمت کا مفہوم	ہمدرد صحت / ص ۹ تا ۱۰ / مارچ
خالد مسعود	اسالیب قرآن — افادات فراہی	میثاق / ص ۲۲ تا ۳۱ / مئی
" "	" "	" " ۳۲ تا ۴۰ / جون
سلیم اختر	نادر قرآنی نسخے	ماہ نو / ص ۱۱ تا ۱۴ / مارچ
شجاع، حکیم احمد	ہیبت کلام اللہ	ہمدرد صحت / ص ۱۳ تا ۱۹ / فروری
شمس تبریز خاں	قرآن اور انسانی نفسیات	فاران / ص ۱۳ تا ۲۰ / مارچ
صدیق، صالح محمد	قرآن مجید	کتاب لاہور / ص ۴۹ تا ۵۳ / فروری
طاہر، لیئق احمد	ساتویں صدی کے مفسرین کا تعارف	مجلۃ الجامعہ / ص ۹ تا ۲۶ / اپریل تا جون

خورشید احمد، حکیم شیخ	علم الحدیث [۱]	مجلۃ الجامعہ، ص ۱۵ تا ۵۹، جنوری تا
زاہد الحسینی، قاضی محمد	منکرین حدیث کے اعتراضات اور ان کے جوابات	خدام الدین، ص ۷ تا ۸، ۱۲، ۱۷ فروری
شورش کاشمیری	سیرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم	چٹان، ص ۶، ۲۰، ۵ جون
شہابی، انتظام اللہ	اسوۃ الرسول من القرآن	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۱ تا ۱۰، فروری
"	" "	" " ۵ ۳ تا ۸۴، اپریل
" "	تاریخ تدوین سیرت	" " " ۹ تا ۱۳، فروری
ضیا، محمد شفیع حیدر	حدیث منزلت کے اسرار و غوامض	پیام عمل، ص ۱۱ تا ۱۳، فروری
ضیاء الدین اصلاحی، مولانا	رسول اللہ کا منصب	میثاق، ص ۸ ۴ تا ۵۳، جنوری
" " "	" " " (۲)	" " ۵ ۳ تا ۴۴، فروری
طاسین، مولانا محمد	جواہر حدیث	بینات، ص ۹ تا ۱۵، اپریل
عبد الحلیم چشتی، مولانا محمد	چہل حدیث شاہ ولی اللہ	الرحیم، ص ۱۷۸ تا ۱۸۲، مئی
عبد الرحمان چغتائی	معمار حرم	اوراق، ص ۹ ۳ تا ۸۴، ۱۷ جنوری
فارانی، ابو طاہر	ہمارا آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) (۳۳) [۲]	لاہور، ص ۵، ۳۰ جنوری
فاروق خاں، محمد	ام الاحادیث	زندگی، ص ۹ تا ۱۸، فروری
قیصر، محمد شفیق	امام ابن ماجہ اور ان کی سنن	مجلۃ الجامعہ، ص ۵ تا ۵۰، جولائی تا ستمبر
مودودی، مولانا سید ابو الاعلیٰ	تفہیم الحدیث	تجلی، ص ۳۴ تا ۴۸، مئی
نواب علی، پروفیسر سید	سیرت رسول اللہ	فاران، ص ۵ تا ۵۹، مارچ
یحییٰ ندوی، پروفیسر سید	حدیث و سنت رسول کا بلند تاریخی سرمایہ	سندھ مسلم کالج میگزین، ص ۱ تا ۳۱، اپریل
ادارہ	اربعین جامی - احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [۳]	ہمدرد صحت، ص ۱۷ تا ۲۷، جنوری

عبادات اور مسائل و مباحث

آفاق صدیقی، محمد	سیاست میں اسلام	معارف، اعظم گڑھ، ص ۲۶۴ تا ۲۷۴، جون

---

[۱] اگلی قسط جلد ۲ نمبر ۲ بابت ۱۵ اپریل تا جون ۱۹۶۸ء میں ص ۲۱ تا ۳۲ پر ملاحظہ ہو۔

[۲] دیگر اقساط کے لیے ۲۷ فروری، ۲۳ مارچ، ۱۳ اپریل اور ۱۸ مئی دیکھیے۔ [۳] چالیس احادیث نبوی کا فارسی اردو اور انگریزی ترجمہ

مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	تفہیم القرآن (سورۃ القمر)	ترجمان القرآن، ص ۲۱ تا ۳۳، مئی
" " "	تفہیم القرآن (سورۃ الرحمٰن)	" " " ۱۷ تا ۳۴، جون
ناصر، سید میر محمود احمد	قرآن مجید اور بائبل کا اختلاف	مجلۃ الجامعہ، ص ۵ تا ۵۹، اپریل تا جون
نقوی، علامہ سید علی نقی	تفسیر قرآن	پیام عمل، ص ۹ تا ۱۰، جنوری
" " "	"	" " ۹ تا ۱۰، فروری
نورالحق، ابوالمنیر	اصول تفسیر	مجلۃ الجامعہ، ص ۹ تا ۲۰، اپریل تا جون
ــــــــ	قرآن حکیم کے ہندی تراجم	جہاں نما، ص ۲۲، ۲۵ جنوری

احادیث و سیرت نبوی صلعم

ابوالشیخ الاصفہانی، حافظ		
مولوی محمد احمد (مترجم)	اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم [1]	بینات، ص ۹ تا ۱۲، جنوری
احمد سعید کاظمی، مولانا سید	حجیت حدیث	مجلہ جامعہ اسلامیہ، ص ۲۰۲ تا ۲۱۶،
ارشد، مولانا عبدالحمید خاں	رجال الحدیث	الجامعہ، ص ۱۲ تا ۴۲، مارچ
اطہر مبارک پوری	امام محمد کی کتاب الآثار	البلاغ، ص ۵ تا ۸، جنوری
انور شاہ، محمد	تاریخ و علم اصول حدیث	بینات، ص ۲۰ تا ۴۳، "
انور نبوی، مولوی محمد	علوم حدیث	" " ۲۰ تا ۳۴، اپریل
" "	" "	" " ۵ تا ۶۳، محرم
" "	" "	" " ۴۰ تا ۴۹، صفر
بخاری، امام		
مولانا عبدالستار (مترجم)	بخاری شریف مترجم و محشی	صحیفہ اہل حدیث، ص ۱۷۷ تا ۱۸۳، مارچ
	نصرۃ البخاری شرح صحیح البخاری	" " " ۱۶۱ تا ۱۷۶، فروری
بلیغ الدین شاہ	شب و روز نبوی	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۷ تا ۵۰، جون
راشد، عطاء المجیب	حجیت حدیث	مجلۃ الجامعہ، ص ۳۱ تا ۴۵، جولائی تا دسمبر

---

[1] جون کے نمبر تک مسلسل

امینی، مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت (۲۱)	برہان، ص ۱۳۳ تا ۱۴۲، مارچ
انعام الرحمان خاں	حاکمیت الٰہ اور حاکمیت جمہور	زندگی، ص ۳۱ تا ۴۶، مئی
ایوب قادری، محمد	میوات میں تبلیغ اسلام	الزبیر، ص ۵ تا ۱۷،
برق، ڈاکٹر غلام جیلانی	پرویز اور علمائے دین	چٹان، ص ۹ تا ۱۰ + ۲۲، ۲۳ جون
بشارت علی، ڈاکٹر سید	قرآنی عمرانیات کے مطالعہ اور اس پر تحقیقات کی ضرورت	سندھ مسلم کالج میگزین، ص ۲۳ تا ۲۷، اپریل
بقا، پروفیسر محمد شریف	اسلام میں فلسفہ الہیات کی تشکیل	تہذیب الاخلاق، ص ۳۶ تا ۴۷، جنوری تا مارچ
بلخی، مولانا افتخار احمد	جرح و تعدیل	الرحیم، ص ۷۲۱ تا ۷۵۸، اپریل
بلیغ الدین، شاہ	مسجد نبوی	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۵ تا ۲۲، فروری
بیگم صوفی	اسلام میں شادی کا مفہوم	عصمت، ص ۱۷ تا ۱۸، جنوری
تھانوی، مولانا احتشام الحق	اسلام اور الحاد کی کشمکش	بینات، ص ۴۵ تا ۵۷، ربیع الاول [illegible]
ٹاؤنس، چارلس۔ ایچ	مذہب اور سائنس کا مستقبل	چراغ راہ، ص ۱۱ تا ۲۰، اپریل
ثاقب، محمد احمد	اصول فقہ — ایک تعارف	مجلہ الجامعہ، ص ۲۴ تا ۵۵، جولائی تا ستمبر
〃	زکوٰۃ کی شرعی حیثیت	〃 〃 ۴۳ تا ۵۶، 〃 〃
جاراللہ، الٰہی بخش	مذہب — ابتدا و ارتقا	مجلہ جامعہ اسلامیہ، ص ۷۱ تا ۷۵،
جاراللہ، علامہ موسیٰ		
مولانا مطیع اللہ افغانی (مترجم)	اسلام اور بیمہ	الرحیم، ص ۶۸۷ تا ۷۰۲، مارچ
جعفر پھلواروی، مولانا محمد	حضانت کے مسائل	ثقافت، ص ۳۹ تا ۴۴، 〃
〃	رویت ہلال کا مسئلہ	〃 〃 ۳۳ تا ۵۸، اپریل
جعفر طاہر	زمین اور اہل زمین کی اہمیت قرآن میں	اوراق، ص ۱۰۹ تا ۱۲۲، جنوری
جعفری، فضل الرحمان	اسلام کا عادلانہ نظام	ہمدرد صحت، ص ۱۴ تا ۴۳، فروری
جلال الدین عمری، مولانا	دعوت دین کے اصول و آداب	زندگی، ص ۵ تا ۱۴، مارچ
جلال الدین		
وارث سرہندی (مرتب)	قربانی کی شرعی حیثیت	فاران، ص ۱۴ تا ۱۷، اپریل
حبیب ریحان ندوی	حضرت مسیح کی خارق عادت پیدائش	صدق جدید، ص ۷، ۱۶ جون
حماد رضوی	رویت ہلال — سائنسی توضیح	〃 〃 ۸، ۸، ۸ اپریل و ۵ مئی

ابوسلمان شاہجہان پوری	زکوٰۃ کا نظام شرعی	الرحیم، ص ۵۱۱ تا ۵۲۰، دسمبر ۶۶ء، جنوری ۶۷ء
احمد، محی الدین	زکوٰۃ و حقیقت زکوٰۃ	امام، ص ۳۵ تا ۴۰، فروری
احمد حسن، مولانا	صدر اسلام میں اجتہاد، رائے، قیاس اور استحسان	فکر و نظر، ص ۱۷۷ تا ۱۹۰، اکتوبر
" "	" " " " " "	" " ۲۳۱ تا ۲۴۳، دسمبر
احمد کمال، ڈاکٹر	اسلام کا معاشی نظام	جہاں نما، ص ۳۵، یکم فروری
ارشد، رشید احمد	اسلام میں خواتین کے حقوق و فرائض	شہاب، ص ۸ تا ۱۰، ۲ر اپریل
اشرف، حکیم عبدالرحیم	دعوت اور اس کا طریق کار	المنبر، ص ۵ تا ۶، ۳ر جون
"	رویت ہلال کا المیہ[1]	" " ۳ تا ۷، ۲ جنوری
افتخار حسین آغا	نیپلز میں مشرقی علوم کا ادارہ	افکار، ص ۳۵ تا ۳۶، مارچ
امام الدین رام نگری	حکمائے یونان اور تناسخ	تجلی، ص ۴۳ تا ۵۰، جنوری
" "	خود فراموش انسان	انوار اسلام، ص ۱ تا ۳۲، جون
" "	دلائل القرآن بجواب دیانندی افترا و بہتان (حصہ چہارم۔ قسط نمبر ۱ و ۲)	" " ۱ تا ۲۷، فروری و مارچ
امام الدین، ابو محمد	دلائل القرآن بجواب دیانندی افترا و بہتان (۳)	" " ۷۳ تا ۱۰۴، اپریل
" "	" " " " " (۴)	" " ۱۰۵ تا ۱۳۰، مئی
امتن گیسو دراز پاکستانی		
محمد مرزا مسعود علی بیگ	جانوروں کی قربانی کے اثرات۔ ۱	صحیفہ اہل حدیث، ص ۳۱ر مارچ
" "	" " " ۲	" " " ۹ تا ۱۹، ۲۰ر مارچ
" "		
	حق اجتہاد اور نئی نسل	" " " ۹ تا ۱۲، ۱۱ر جون
امینی، مولانا محمد تقی	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت	برہان، ص ۴۳ تا ۷۴، جنوری

---

[1] المنبر کا یہ پورا نمبر رویت ہلال کے مسئلے کے متعلق علمائے پاکستان کے بیانات اور مسئلے کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کے لئے مخصوص ہے۔

سیف، غلام باری	علم کلام اور اس کا تعارف	مجلۃ الجامعہ، ص ۸۱ تا ۵۲، اپریل تا جون
سیف الرحمان، ملک	نظام ربوٰ اسلامی ہدایات کی روشنی میں	〃 〃 ۳۳ تا ۵۸، 〃 〃
سیفی ندوی، مولانا سید	امر بالمعروف و نہی عن المنکر	امام، ص ۳۱ تا ۴۴، فروری
صابونی، محمد علی	حج بیت اللہ اور اس کے اسرار و رموز	المنبر، ص ۷ تا ۱۰، ۱۰ار 〃
صدیقی، نجات اللہ	شرکت اور مضاربت کے شرعی اصول	زندگی، ص [illegible] جنوری
صغیر الدین، مولانا ابو الفتح محمد	تقسیم علوم دین صاحب ینابیع کی نظر میں	الرحیم، ص [illegible]
ضیا احمد بدایونی، پروفیسر	تکفیر اور اس کی حدود	فاران، ص [illegible] مارچ
طارق، رحمت اللہ	تصویر اور اسلام	نگار، ص [illegible] تا ۲۹، اگست
〃	〃	〃 〃 [illegible] تا ۴۳، نومبر
〃	عورت اور منصب امامت	〃 〃 [illegible] تا ۷۳، اپریل
طفیل محمد، میاں	ہمارے قومی مسائل اور اسلام	آئین، ص [illegible] مئی
عبدالحمید سواتی، مولانا	مسئلہ وحدۃ الوجود میں راہ اعتدال	الرحیم، ص [illegible] جون
عبدالخبیر	روسی مسلمان اور فریضہ حج	تحریک، دہلی، ص [illegible] مئی
عبدالرزاق حیغتائی	معمار حرم	اوراق، ص [illegible] جنوری
عبدالرحیم، مولانا محمد	علما کا اتحاد	آئین، ص [illegible]
عبدالقیوم، پروفیسر	اسلامی علوم کی ترویج میں شاہ ولی اللہ کی خدمات	ثقافت، ص [illegible]
عبدالواحد ہالیپوتہ، ڈاکٹر	اسلام اور مرکزیت	الرحیم، ص [illegible] تا ۶۷، مارچ
عرفانی، مولانا محمد قیوم الہی	رویت ہلال اور حکومت کا موقف	شہاب، ص [illegible] تا [illegible]، ۱۰ار فروری
عزیز اللہ خاں	دین و سیاست	سندھ مسلم کالج میگزین، ص [illegible] تا ۵۵، اپریل
علی ندوی، مولانا سید ابو الحسن	علمائے ربانی کا منصب اور نوعیت کار	امام، ص ۵۹ تا ۶۶، فروری
عمر فاروق، مولانا محمد	حضرت امام ابوحنیفہؒ کی قانون ساز کمیٹی کی حقیقت	صحیفہ اہل حدیث، ص ۷ تا ۱۰، ۱۳ار جنوری
〃 〃	〃 〃 〃 〃 〃	〃 〃 ۴ تا ۲۲، فروری
〃 〃	〃 〃 〃 〃 〃	〃 ۷ تا ۱۶، ۱۷ار اپریل
غازی، عبدالحمید	اسپین میں مذہبی آزادی	لاہور، ص [illegible] مارچ
غلام علی، ملک	نکاح فاسد اور نکاح باطل پر ایک اصولی بحث	ترجمان القرآن، ص ۴۵ تا ۵۳، اپریل

حنیف ندوی، مولانا محمد	احیاء اسلام اور اس کے تقاضے	ثقافت، ص ۳۲ تا ۴۱، مئی
"	توحید اور اقدار حیات	" " ۹ تا ۳۵، جنوری
" "	" " "	" " ۵۸ تا ۶۷، فروری
خالد مسعود	رویت ہلال کا مسئلہ	میثاق، ص ۳۰ تا ۳۹، اپریل
"	حکومت الٰہی پر شہادت (افادات مولانا حمید الدین فراہی)	" " ۳۷ تا ۴۳، مارچ
"	حکومت اور سنت اللہ	" " ۲۵ تا ۲۹، اپریل
خدا بخش بچہ، ملک	سائنس اسلام اور دور حاضر	سیارہ، ص ۴۱ تا ۵۲، فروری
خلیل حامدی	افریقہ میں مسلمانوں کا حال	ترجمان القرآن، ص ۱۷ تا ۳۳، مارچ
"	تجدد سوشلزم اور تحریک اسلامی	چراغ راہ، ص ۳۹ تا ۴۹، اپریل
خورشید احمد		
مختار احمد (مترجم)	اسلام ان ماڈرن ہسٹری	" " ۴۷ تا ۵۴، جنوری
خورشید احمد	" " " (تصنیف پروفیسر اسمتھ)	" " ۵۳ تا ۵۹، فروری
"	" " " " (" ")	" " ۵۱، جون
خیری دہلوی، مولانا عبدالغفار	مذہب اور سائنس	صحیفہ اہل حدیث، ص ۱۷ تا ۲۰، جون
دنکر، رام دہاری سنگھ	ہندوستان میں اسلام کے فروغ کا سبب	انوار اسلام، ص ۱۹ تا ۲۳، جون
راک ویل، کرنل ڈونلڈ ایس	میں نے اسلام کیوں قبول کیا	شہاب، ص ۱۱، ۱۲، فروری
رفیع اللہ، پروفیسر ابو شہاب	تعدد ازدواج — ائمہ مجتہدین کی نظر میں	فکر ونظر، ص ۱۹۹ تا ۲۰۸، اکتوبر
زبیری، حکیم نعیم الدین	روزہ — طبی نقطۂ نگاہ	ہمدرد صحت، ص ۵۹ تا ۶۴، جنوری
ساجد، محمد سلیم	خدا کا تصور اور رسم	زندگی، ص ۳۸ تا ۴۴، مارچ
سعید احمد اکبر آبادی، مولانا	قاہرہ میں مجمع البحوث الاسلامیہ کی تیسری کانفرنس	برہان، ص ۱۲ تا ۲۵، جنوری
سلطان مبین	تناسخ کی افادیت و ثمرات	زندگی، ص ۴۴ تا ۴۸، فروری
" "	" " "	" " ۴۵ تا ۵۲، مارچ
" "	" " "	" " ۴۷ تا ۵۴، مئی
سلیم، عبدالقدیر	مجدد الف ثانی — تحریک احیائے دین کا پس منظر	چراغ راہ، ص ۱۹ تا ۲۸، مارچ
سلیم، مولانا وحید الدین	مذہب اور سیاست	زندگی، ص ۴۳ تا ۴۸، جنوری

معین الدین، مولانا	احکام شریعت میں تغیر کے اصول	چراغ راہ، ص ۲۷ تا ۳۶، فروری
" "	" " "	" " ۲۹ تا ۳۸، مارچ
منتخب الحق، مولانا	اسلامی شریعت کے مقاصد	" " ۳۳ تا ۴۰، جون
مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ	اسلام عصر حاضر میں	تجلی، ص ۳۵ تا ۵۲، فروری مارچ
" "	خطبہ عید الفطر	ترجمان القرآن، ص ۸۳ تا ۹۹، فروری
نجات اللہ صدیقی	غیر سودی نظام بنک کاری	زندگی، ص ۱۹ تا ۳۰، فروری
" "	" "	" " ۹ تا ۳۰، مئی
" "	" "	" " ۹ تا ۱۷، جون
نعیم صدیقی	تحریم ربوا	" " ۲۵ تا ۳۵، جنوری
"	دور حاضر کا انسان اور اسلام	چراغ راہ، ص ۷ تا ۲۲، "
وحید الدین خاں	تبلیغی جماعت اور خدمت اسلام[1]	شہاب، ص ۸ تا ۹، ۲۶ فروری
وقار انبالوی	رویت ہلال اور تقویم قمری	چٹان، ص ۱۳۶، ۱۳۷، "
ولی حسن ٹونکی، مولانا مفتی	پوتے کی میراث اجماع امت کی روشنی میں	بینات، ص ۲۶ تا ۳۹، صفر
" "	عید الفطر	" ۷ تا ۸، فروری
ہما، سیدہ	شاہ ولی اللہؒ کی ایک نمایاں خصوصیت تطبیق	الرحیم، ص ۵۷۰ تا ۵۷۷، اپریل
ہالے پوتہ، ڈاکٹر	شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ	" " ۵۷۳ تا ۵۸۲، فروری
———	تاریخ یا قرآن — کس پر ایمان ہونا چاہیے	طلوع اسلام، ص ۴۱ تا ۵۸، اپریل
——— ———	دار الاسلام اور دار الحرب	البلاغ، ص ۳۱ تا ۴۰، جنوری
———	" "	" " ۲۰ تا ۲۴، فروری
———	" "	" " ۱۵ تا ۲۲، مارچ
———	" "	" " ۱۲ تا ۲۱، مئی
———	" "	" " ۱۴ تا ۲۴، جون
ادارہ	سائنس اور اسلام	ہمدرد صحت، ص ۴۱ تا ۴۴، فروری

---

[1] دوسری قسط کے لیے دیکھیے شہاب ۵ رو ۱۲ مارچ ۸ تا ۱۰

غوری، بشیر احمد خان	وحدت ادیان	معارف، ص ۲۸۲ تا ۲۹۴، اپریل
فاتح قائد آبادی	اسلام اور تسخیر کائنات	قندیل، ص ۹، ۵ و ۱۲ مارچ
قطبی، سید قدرت اللہ	اسلامی مملکت میں ٹیکس کا مسئلہ	فکر و نظر، ص ۲۵۹ تا ۲۸۴، اکتوبر
"	" " "	" " ، ص ۳۵۵ تا ۳۸۳، دسمبر
فضل حمید	اسلام کا فلسفۂ اخلاق	الرحیم، ص ۴۹۸ تا ۵۱۰، دسمبر ۶۶ء، جنوری ۶۷ء
قریشی، طفیل احمد	علامہ ابن قیم کے فقہی مطالع	" ، ص ۴۵۵ تا ۴۷۹، " "
قطب شہید، سید		
عبدالحمید صدیقی (مترجم)	دین کا جامع تصور	ترجمان القرآن، ص ۱۹ تا ۲۶، اپریل
کارنیمیس، اے آر		
ممتاز احمد (مترجم)	مذہب اور بنیادی انسانی حقوق	چراغ راہ، ص ۲۲ تا ۲۷، جنوری
ا. ل. ڈاکٹر احمد حسین	اسلام کا معاشی نظام	جہاں نما، ص ۵، ۲، یکم فروری
کوثر نیازی	دو نشری تقریریں — تحیۃ الوداع و لیلۃ القدر	شہاب، ص ۱۰ تا ۱۲، ۱۵، ۱۸ جنوری
کوپ مینل	اسلام کے تئیں روس کا [illegible] رویہ	تجلی دیوبند، ص ۴۱ تا ۴۴، جنوری
ماہر فن	رویت ہلال علم ہیئت کے نقطۂ نظر سے	ترجمان القرآن، ص ۴۴ تا ۵۳، مئی
محمد اسلم قاضی	زمانہ حال کے فکری رجحانات اور اسلام	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۱، ۲۰ فروری
محمد عثمان، پروفیسر	اسلامی سوشلزم	فکر و نظر، ص ۳۲۵ تا ۳۴۶، دسمبر
محمد یوسف کوکن عمری	مسئلہ امامت اور عورت	برہان، ص ۶۹ تا ۱۰۰، فروری
"	خواتین اور مساجد[1]	ثقافت، ص ۵۱ تا ۶۰، مئی
محمد یوسف مامون کالجن، مولانا	الاجتہاد فی الاسلام	بینات، ص ۲۶ تا ۴۳، ربیع الاول
مظہر الدین صدیقی، محمد	اسلام کی معاشی تعلیمات اور ہمارا جدید معاشرہ	فکر و نظر، ص ۲۸۵ تا ۲۹۷، نومبر
معروف شاہ، سید	وحی الٰہی	فاران، ص ۸ تا ۱۲، مارچ
معصومی، صغیر حسن	بیسویں صدی میں اسلام	بینات، ص ۴۳ تا ۷۳، اپریل
"	"	" " ص ۶۰ تا ۶۴، محرم

[1] [illegible] سے منقول [illegible] کے عنوان سے چھپا ہے۔

مہر جالسی	برصغیر ہند پاکستان کے قدیم سریانی عیسائی اور ان کی انجیل	البصائر، ص ۶۰ تا ۹۳، جنوری
نقی عثمانی، مولانا محمد	انجیل برنا باس	فاران، ص ۳۸ تا ۵۲، "

مکاتیب

اصغر عباس	سرسید کے چند نایاب مراسلات	ہماری زبان، ص ۴، ۶، ۷، ۲۲ر مئی
افتخار حسین، آغا	مانتسیکو کے فارسی خطوط — فرانسیسی ادب پر مشرقی اثرات	افکار، ص ۴۰ تا ۴۴، مئی
اکبر الہ آبادی	اکبر الہ آبادی کے خطوط نیاز فتح پوری کے نام	نگار پاکستان، ص ۵، مئی جون
امتیاز الدین	مہدی افادی کا ایک غیر مطبوعہ خط — مولوی بشیر الدین کے نام	فروغ اردو، ص ۱۲ تا ۲۳، جنوری
برکاتی، حکیم محمود احمد	مکتوبات مولانا مناظر احسن گیلانی بنام حکیم محمود احمد برکاتی	البصائر، ص ۱۵۹ تا ۱۷۳، "
نیر کھوروی	بابائے اردو کے نام سر تیج بہادر سپرو اور ڈاکٹر سید ضیاء الدین کے خطوط	فروغ اردو، ص ۴۲ تا ۶۰، جون
سید احمد خاں، سر	سرسید کے چند غیر مطبوعہ خطوط[1]	اردو، ص ۷۷ تا ۸۴، اپریل
سینی الاعظمی	بنی امی کے تین خطوط	تجلی، ص ۳۷ تا ۴۲، "
سکسینہ، دیریندر پرشاد	مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط[2]	اردو ادب، ص ۱۹۵،
غلام السیدین، خواجہ	خواجہ غلام السیدین کا ایک خط — شورش کاشمیری کے نام	چٹان، ص ۱۳، ۲۴ر اپریل
فراق گورکھپوری	مکتوب فراق (بنام علی سردار جعفری)	گفتگو، ص ۶۹ تا ۷۲،
فضا جالندھری، سید دل محمد	مکتوبات دل شاہجہانپوری	قومی زبان، ص ۳۱ تا ۳۸، مئی
کیانی جسٹس	خط کیانی مرحوم کے	اردو ڈائجسٹ، ص ۲۶۹ تا ۲۷۰، جنوری

---

[1] پانچ خط اکبر الہ آبادی کے نام اور ایک خط مولوی سید ممتاز علی کے نام

[2] شاہ محمد سلیمان، رام بابو سکسینہ، نیاز فتح پوری، تلوک چند محروم، منوہن لال اور وحشت کانپوری کے خطوط

	مولانا محمد رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر کا مناظرہ اکبر آباد	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۶ تا ۳۲، جنوری

دیگر مذاہب

ابوالحسن علی ندوی، مولانا		
ظفر اسحاق (مترجم)	قادیانزم — اے کریٹیکل اسٹڈی	فاران، ص ۸۴ تا ۸۵، نومبر
احسان ظہیر، علامہ حافظ	بائبل کا ایک سرسری مطالعہ	شہاب، ص ۶ تا ۸، ۲ جنوری
اشرف، عبدالرحیم	تفہیم و تذکیر[1]	المنبر، ص ۳ تا ۵، ۲۰، ۲۷ فروری
برکت اللہ، پادری	مسیح کی خارق عادت پیدائش — مسیحی نقطہ نظر سے[2]	صدق جدید، ص ۷، ۲۰ ″
حبیب ریحان خاں، حبیب	الوہیت مسیح کی حقیقت — بجواب مضمون مسیحی نقطہ نظر سے	″ ″ ۶، ۲۴ ″
″ ″	الوہیت مسیح کی حقیقت — بجواب مضمون مسیحی نقطہ نظر سے	″ ″ ۶، ۲۴ مارچ
″ ″	حضرت مسیح کی خارق عادت پیدائش	″ ″ ۶ تا ۷، ۱۴ اپریل
″ ″	″	″ ۶ تا ۷، ۱۲، ۲۶ مئی
ظہور احمد	یہود اور یہودیت	مجلۃ الجامعہ، ص ۵۹ تا ۱۰۲، جولائی تا دسمبر
عبدالماجد دریابادی، مولانا	دین مسیح پر تازہ روشنی	تجلی، ص ۸۰ تا ۸۲، فروری مارچ
عبدالواحد دیارتھی، چودھری	ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتب	مجلۃ الجامعہ، ص ۵۶ تا ۷۴، جولائی تا دسمبر
غلام احمد پرویز	مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں	نگار پاکستان، ص ۸۰، مارچ
فرخ، امۃ المالک	اوستا	مجلۃ الجامعہ، ص ۵۷ تا ۶۷، جنوری تا مارچ
گیانی، عباد اللہ	سکھ مذہب اور اسلام کا پہلا رکن	″ ″ ۱۰۳ تا ۱۱۴، جولائی تا دسمبر
نعیم صدیقی	عربی فارسی کی باتیں اور بہائیت	سیارہ، ص ۷۷ تا ۸۷، مارچ

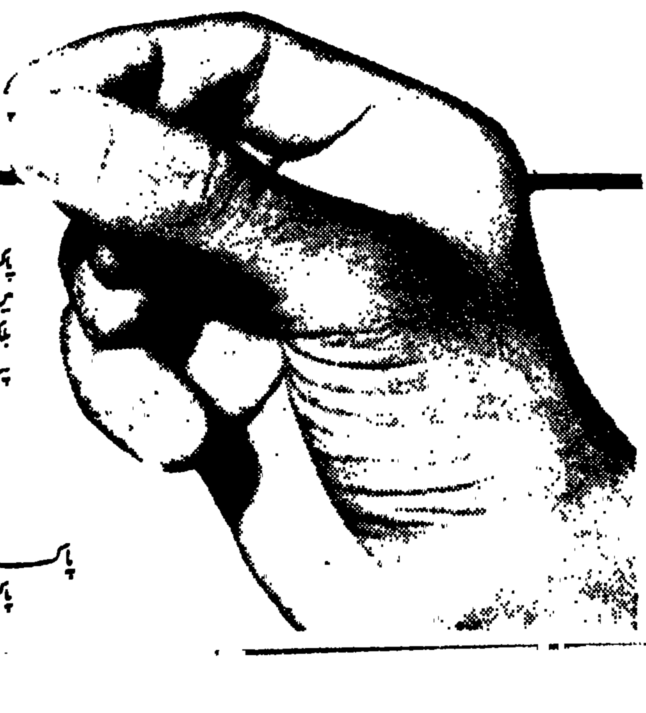
---

[1] المنبر کی ماہانہ اشاعت رد قادیانیت کے لیے وقف ہے

[2] صدق جدید کے فروری کے دیگر شماروں میں بھی یہ سلسلہ مضمون ملاحظہ ہو۔

آگ ہی سے دُھواں اُٹھتا ہے ......

..... لیکن جب آپ ہمارے سگریٹ سُلگاتے ہیں تو جو دھواں اُٹھتا ہے اُس سے کئی گھر روشن ہوتے ہیں ۔ لوگوں کو روٹی نصیب ہوتی ہے ۔ جسم ڈھکتے ہیں اور بہت سے خاندانوں کو گھر میسر آتا ہے ۔ ہمارے کاروبار سے ہزاروں آدمی کسی نہ کسی طرح فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ کسان ہمارے اعلےٰ سگریٹوں کے لئے تمباکو پیدا کرتا ہے ۔ اُس کو اچھے دام ملتے ہیں ۔ جب ہمارے سگریٹ پیک ہو کر تجارتی تقسیم کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تو وسیع پیمانہ پر تجارت اور معاشی ردِعمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ۔ اور اس طرح سارے ملک میں کئی ہزار لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں ۔ مزید یہ کہ جب ہم ٹرکوں، کشتیوں یا ریل کے ذریعہ اپنے سگریٹ بازاروں تک پہنچاتے ہیں یا جب ہم سگریٹ کے پیکٹ کے لئے گتہ، چھپے ہوئے پیکٹ یا لکڑی کے پیکنگ کیس خریدتے ہیں تو تجارت اور معاشی سرگرمی کو اور فروغ حاصل ہوتا ہے ۔ جب سگریٹوں کے لئے پیکنگ کا تمام تر سامان پاکستان ہی میں بننے لگے گا تو ملکی صنعت اور زیادہ ترقی کرے گی ۔



پاکستان ٹوبیکو کمپنی کو فخر ہے کہ وہ عوام کو خوشحال بنانے میں مدد کرتی ہے اور یہ نہ صرف اپنے ہی دفتروں اور کارخانوں میں بلکہ متعلقہ صنعتوں میں اور زراعت میں بھی روزگار کے مواقع پیدا کرتی ہے ۔

PAKISTAN TOBACCO
PTC
COMPANY LIMITED

پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
پاکستان کی سگریٹ کی صنعت کے رہبر

JWT-67

محمود شام	خطوط جو تاریخ کے نازک ترین لمحات میں لکھے گئے	اخبار جہاں، ص ۱۷، ۱۴ جون
مہدی علی خاں، راجہ	خطوط راجہ ظرافت کے	اردو زبان، ص ۳۱تا۴۱، فروری
" "	" "	" " ۴۴، جون
" "	راجہ مہدی علی کا آخری خط	اوراق، ص ۲۳، جنوری
نیاز فتح پوری	ایک نایاب مکتوب مولانا ابوالکلام آزاد کے نام	نگار پاکستان، ص ۷، مئی جون
" "	مکتوبات نیاز بنام نظیر صدیقی	" ۲۵تا ۲۹، مارچ
" "	مکتوبات نیاز بنام آغا پرویز گل	" ۵۹ تا ۶۴، اپریل
" "	مکتوبات نیاز بنام چودھری برہم ناتھ دت	" ۵۱ تا ۵۸، مئی جون
یونس حسن	اختر شیرانی کے چند غیر مطبوعہ خطوط	ماہ نو، ص ۳۰ تا ۳۲، مارچ
	ادبی نوادر — مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط[1]	اردو، ص ۱۷ تا ۷۶، اپریل

[1] ۱۔ مرزا دبیر کے دو خط بنام صغیر بلگرامی
۲۔ مولانا حالی کا ایک خط بنام اکبر الہ آبادی
۳۔ اکبر الہ آبادی کے دو خط سید عشرت حسین اور بیگم سید عشرت حسین کے نام
۴۔ خواجہ حسن نظامی کا ایک خط سید عشرت حسین کے نام



پی آئی اے
کی پروازیں
بنکاک
پیرس
استنبول
فرینکفرٹ
نیروبی
بغداد
روم
جاتی ہیں
ان کے علاوہ پی آئی اے کی پروازیں :- لندن - جنیوا - قاہرہ - بیروت - ماسکو - تہران -
کویت - جدّہ - دہران - دوحا - دوبئی - بحرین - کابل - کراچی - ڈھاکہ - کھٹمنڈو -
رنگون - کینٹن - شنگھائی - کو بھی جاتی ہے۔
مزید تفصیلات کیلئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا کسی پی آئی اے آفس سے رجوع فرمائیں۔
PIA
پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز



united

H.S.U. 10/53

قومی زبان

کراچی

انجمن ترقی اردو

Monthly QAOMI ZABAN Karachi



مدیر : مشفق خواجہ

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

قومی زبان

جلد ۳۲ شمارہ ۲

فروری سنہ ۱۹۶۸ء

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

فی پرچہ ایک روپیہ
قیمت: سالانہ دس روپے

مدير : [illegible]

[illegible] اهتمام [illegible]

بیگم ہرمزی جلیل قدوائی

نذر سجّاد حیدر

ممتاز ادیبہ نذر سجاد حیدر کے انتقال سے اردو کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، وہ اردو کی معمر ترین ادیبہ تھیں اور خواتین میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔ مرحومہ کی یاد میں اس شمارے میں خصوصی مضامین شائع کئے جارہے ہیں۔ اس کے لئے ہم محترمہ ہرمزی جلیل قدوائی کے ممنون ہیں۔ موصوفہ نے نہ صرف یہ کہ خود ایک مضمون لکھا ہے بلکہ نذر سجاد کا ایک غیر مطبوعہ مضمون اور متعدد خطوط بھی عنایت کئے ہیں۔ بیگم قدوائی کے مرحومہ نذر سجاد سے خصوصی تعلقات تھے اور اسی بنا پر ان سے یہ مضمون لکھوایا گیا ہے۔ نذر سجاد کے خطوط آئندہ شمارے میں شامل کئے جائیں گے۔ (ادارہ)

محترمہ بیگم نذر سجاد حیدر کے انتقال کی خبر ہم سب کے لئے انتہائی افسوسناک اور دلشکن ہے۔ اسلئے نہیں کہ مرحومہ ہم سے جدا ہوگئیں، انہوں نے طولانی عمر پائی، موت تو آنی ہی تھی اور نظامِ قدرت کے تحت ایک اٹل واقعہ تھا جو پیش آیا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ○ اس آیت کے پڑھنے کے بعد زندگی کی حقیقت سامنے آجاتی ہے اور سوائے صبر کے کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

افسوس اس بات کا ہے کہ اردو کی ایک ایسی مشاق اور پختہ کار مصنفہ اور افسانہ نگار کا انتقال ہوگیا جس کا نعم البدل ملنا مشکل ہے اور جو ہر حالت میں یعنی بیماری میں بھی اور مرتے دم تک اردو ادب کی خدمت کرتی رہیں۔ ان کی دماغی قوت لازوال ق۔ اگرچہ عرصہ سے ان کی جسمانی قوت برائے نام رہ گئی تھی مگر اس زمانے میں بھی انہوں نے لکھا اور اس طرح کہ کسی بھی آئے گئے وہ پکڑ لیا، خیالات اکٹھا کئے، لیٹے لیٹے بولتی گئیں اور آنے والا مہمان لکھتا گیا۔

ذاتی طور پر مجھے ایک محترم اور شفیق شخصیت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو جانے کا حد درجہ افسوس ہے ان کی ت میں بعض ایسی خصوصیات تھیں جو ہر خاتون میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی یاد مجھے عرصے تک ستائے گی

مرحومہ سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۴۷ء میں ہوئی جو اپنی قسم کی عجیب تھی۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ اسی سال تان آئی تھی۔ اس وقت تک جلیل صاحب کو دہلی میں پاکستان ہائی کمشنر کے پریس اٹیچی کے فرائض انجام دینے پڑ رہے تھے۔ کراچی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ سرکاری مکان فی الحال نہیں مل سکتا۔ چنانچہ ہوٹلوں میں قیام کا سلسلہ شروع ہوا، ایک ہوٹل سے دوسرے میں اور

فہرست

ادارہ تحریر

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

ہے۔ انہوں نے میرے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی، سوائے اس کے کہ میں پرلے درجے کی گنوار اور بے وقوف ہوں۔ ان کے ایک سوال کا جواب بھی فوراً نہ دے سکی۔"

میرے میاں نے مجھے بتایا "بھئی ان کی گفتگو کا انداز ہی یہی ہے۔ تمہیں ذلیل کرنا تھوڑا ہی مقصود تھا، خیر میں انہیں سمجھا دوں گا۔ بس تم اٹھو، منہ ہاتھ دھوؤ اور پھر چلو ٹہلنے"۔

دوسرے دن پھر وہی گھڑی آئی، نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن۔ میاں کی خاطر دوبارہ جانا پڑا۔ لیکن اس دفعہ میں انہیں سلام کرکے ان سے دور ہی بیٹھی اور عینی سے باتیں کرتی رہی۔ اتنے عرصہ میں جلیل صاحب اور مرحومہ میں کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ شاید اسی کے نتیجے میں اب کے مجھ سے انہوں نے بڑے نرم لہجے میں مخاطب کیا اور اپنے پاس بلا کے بٹھایا۔ "دلہن آرام سے بیٹھو۔ ارے عینی بیرے کو بلواؤ۔" جتنی دیر میں عینی بیرے کو بلاتیں انہوں نے خود ہی اپنی پاٹ دار آواز میں بیرے کو پکارا۔ "بیرا۔ بیرا۔" بیرا آیا تو کچھ سموسے، نمک پارے اور بسکٹ وغیرہ جو وہ ہر وقت اپنے سرہانے کی ڈولی گنجینہ میں مہمانوں کو کھلانے کی غرض سے رکھا کرتی تھیں نکال نکال کر پلیٹوں میں رکھوا دیں، پھر خود چائے پیالیوں میں ڈالی۔ پہلے مجھ کو دی، اب میں جلیل صاحب کو۔ اس بار مجھ سے بہت سنبھل سنبھل کر باتیں کیں۔ پھر بھی میں نے غور کیا حسب عادت کہیں نہ کہیں تیزی سے موضوع بدل ہی جاتا تھا۔

اس ملاقات کے بعد سے پھر میں ان سے نہ گھبرائی اور نہ مل کر پچھتائی بلکہ ان کی ترش تیز مگر میٹھی میٹھی اور لچھے دار باتوں کی کچھ چاٹ سی پڑ گئی۔ اور جب تک ہم گرانڈ ہوٹل میں رہے، روز یا ہر دوسرے تیسرے دن میں اور جلیل صاحب ان سے مل آتے۔ موضوع گفتگو زیادہ تر اپنے نامور شوہر کا ہوتا جسے میں بھی دلچسپی سے سنتی تھی کیونکہ اب تک میں ایسے ناموں سے صرف کتابوں کے ذریعہ یا غائبانہ طور پر ہی شناسا تھی۔

بعد میں تو یہ ہوگیا کہ جہاں جہاں ہم ہوٹل اور ہوٹل کے بعد مکان بدلتے رہے مرحومہ ہماری درخواست پر بار بار دو دو تین تین دن ہمارے گھر آکر رہ جاتیں۔ میں بڑے شوق سے ان کے لئے علیحدہ کمرے کا انتظام کر دیتی۔ میرے ہر انتظام سے بہت مطمئن ہوتیں لیکن وضو کا لوٹا اور آبدست کا لوٹا اپنی آنکھوں کے سامنے میرے نوکر سے منجھواتیں۔ پاک کراتیں تب سب کو دیکھتی جاتیں اور کہتی جاتیں۔ "تمہارے خیال میں یہ صاف ہے مگر میرے خیال میں چھینٹ ضرور پڑی ہوگی۔" اس پر میں بھی ان کے خیال کو رد نہ کرتی۔

کراچی میں مکانات کی سخت قلت تھی۔ ہماری طرح مرحومہ کو بھی گرانڈ ہوٹل والی بلڈنگ چھوڑ کر مختلف ہوٹلوں اور مکانوں میں منتقل ہوتے رہنا پڑا، کبھی کبھی ان کے نئے پتے کی اطلاع ہو جاتی، کبھی نہ ہوتی۔ اس صورت میں ہم دونوں عرصے ان سے بے خبر رہتے۔ یکایک بذریعہ ڈاک ان کے پتے کی اطلاع ملتی اور خط میں ہمارے نہ ملنے جلنے کا گلا شکوہ بھی ہوتا۔ اب ہم دونوں ان سے ملنے جاتے۔ اس وقت ہماری حالت چوروں کی سی ہوتی کہ اتنے دنوں بعد پہنچیں گے تو

دوسرے سے تیسرے میں ۔ گرانڈ ہوٹل دوسرا ہوٹل تھا جس میں ہم نے شالیمار ہوٹل کے بعد رہنا پسند کیا ، پھر اسے بھی بدل دیا ۔

گرانڈ ہوٹل سے ملی ہوئی ایک بلڈنگ کی پہلی منزل کے دو کمروں کے ایک فلیٹ میں مرحومہ مع اپنے بیٹے ، بہو ، اور بیٹی کے مقیم تھیں ۔ جلیل صاحب کو معلوم نہ تھا کہ وہ اسی بلڈنگ میں تھیں ۔ کبھائی سید حمید علی صاحب مرحوم لاہور سے آئے ہوئے تھے ۔ ان سے پتہ چلا کہ ان کی پھوپھی نذر نچلی منزل میں ہیں ، انھیں بھی ان کو دیکھنا ہے ، کہنے لگے " آپ لوگ بھی چلئے " ۔

جلیل صاحب کی تو وہ ماں کی جگہ تھیں میرے لئے البتہ صرف ایک مصنفہ کی حیثیت رکھتی تھیں ، مصنفہ بھی مالوم کی بیٹی جیسے مسلسل افسانے کی جو مجھے اور میری بہنوں کو بے حد پسند تھا ، چنانچہ جس طرح اس افسانے کو پڑھنے کے لئے " عصمت " کی جس میں وہ چھپ رہا تھا مشتاق رہتی تھی اسی طرح اس کی مصنفہ کو دیکھنے کی بھی آرزومند تھی ۔

ہم لوگوں کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں ، مگر مجھ سے تو وہ گویا باقاعدہ انٹرویو لینے پر تل گئیں " کیا نام ہے آپ کا ؟ " جب تک میں اپنا نام بتاؤں وہ دوسرا سوال کر بیٹھیں " کس کی بیٹی ہو ؟ " ابھی پہلا جواب نہ دے پائی تھی دوسرے سوال کا جواب کیسے دیتی ۔ اتنے میں تیسرا سوال کر ڈالا ۔ اب تو میں نے اپنے کو سنبھالا ، جسم کو جنبش دی اور دماغ کو حاضر کر کے سلسلہ وار ان کے جواب دینے کے لئے آمادہ ہو گئی ، مگر کہاں میری سست رفتار اور کہاں وہ برق رفتار ، میرا ان کا کیا مقابلہ ؟ میں نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا اور ان کے دوسرے سوال کا جواب " جی میرے وا . . . . " کہنے نہ پائی تھی کہ ایک اور سوال ، اس کے بعد ایک اور پھر ایک اور . . . . . میرا جی گھبرانے سا لگا ۔ مجھے چکر سے آنے لگے ۔ میرے خاوند یعنی جلیل صاحب اور سید صاحب سے باتیں کرنے اور چائے پینے میں مصروف تھے اور میں نہ چائے پی رہی تھی نہ باتوں کے مزے لے رہی تھی بلکہ وہاں سے کھسکنے کا پلان کرنے کی سوچ رہی تھی ۔

مجھے خاموش دیکھ کر جلیل صاحب نے میری طرف رخ کیا اور بچوں کی طرح بہلانے کی غرض سے مجھ سے کچھ کھانے کو کہا ۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کہا " بس اب چلئے بھی ۔ نئے آپا کو پریشان کر رہے ہوں گے بہت دیر ہو گئی ہے " شاید انہوں نے میرے تیور پہچان لئے اور فوراً اٹھ کھڑے ہوئے " اچھا اب اجازت دیجئے ، دوبارہ حاضر ہوں گا " یہ کہہ کر وہاں سے میرے ساتھ واپس آ گئے ۔

اس واقعہ سے پہلے مجھے اس قسم کے انٹرویو دینے کا تجربہ نہیں ہوا تھا ۔ میں بالکل ایک ناکام امیدوار کی طرح جھجک قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور بستر پر اوندھے منہ گر گئی ۔ جلیل صاحب تاڑ گئے کہ کچھ دال میں کالا ہے " میری خاموشی اور نڈھال پنے کی وجہ پوچھنے لگے ۔ پھر کیا تھا ، ان پر بری طرح برس پڑی کہ " جب آپ کو معلوم تھا کہ وہ اس قدر تیزی سے پوچھنے والی ہیں کہ باتیں کریں گے تو مجھے بے وقت کو وہاں لے کیوں گئے " وہ اتنی پڑھی لکھی ، دنیادار ، جہاں دیدہ ، جنتہ کار میں ، ان کے سلسلے میں کی چھوکری جسے بات کرنے کا ڈھنگ نہ آتا ہو جواب دیا اور اسی اعتماد اور تیزی کے دنیا تو بڑی بات

اس دلہن کو بتاتی ہوں کہ یہ کون سے قرآن میں لکھا ہے کہ بچوں کا لباس ایسا ہو اور ایسا نہ ہو۔" خالہ وحی فوراً مسکرا دیں اور
کہنے لگیں "آپ تو جا اور بے جا مجھ ہی سے الجھ پڑتی ہیں۔ اب میں چھوٹوں کے سامنے کیا بحث کروں۔ آپ سے (میری طرف اشارہ
کرکے) کہتی ہیں، یہ میرے سامنے کی بچی ہیں اور (میری بچی کی طرف اشارہ کرکے) اور وہ تو بالکل ہی معصوم ہے۔ چھوڑئیے
ان قصوں کو۔ یہ بھی دونوں بزرگوں کی پیار بھری جھڑپ۔

میں نے دونوں کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ ہم جیسے برخورداروں پر ہی نہیں بلکہ اپنے برابر والوں پر بھی حاوی رہتی
تھیں۔ بعد میں مجھے یاد آگیا کہ محترمہ امتہ الوحی میری والدہ کی بھی دوست تھیں اور میں نے خالہ وحی کے اعتراض کا برا نہیں مانا
ٹوکنا، ڈانٹنا، پیار کرنا یہ مشفق بزرگوں کی شان میں داخل ہے۔

چائے پی کر جلیل صاحب کے کمرے میں تشریف لے گئیں اور طرح طرح کی باتیں کرتی رہیں۔ میں خالہ وحی سے اپنے مرحوم
بھائی کے تذکرے سنتی رہی اور مجھے خالہ وحی سے بھی ایک خاص قسم کی انسیت ہوگئی۔ وہ بھی مجھ سے گاہے گاہے ملنے آجاتی ہیں۔

ایک بار ڈاک سے اطلاع ملی کہ سول اسپتال میں پڑی ہیں۔ کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ بے گوشت کی تو وہ پہلے ہی
تھیں۔ اس پر یہ غضب۔ اسی شام ہم دونوں اسپتال پہنچے، اوپر کی نئی منزل کے ایک اسپیشل وارڈ میں بہت ساری چرخیوں
اور رسیوں سے سنبھلی ہوئی پلاسٹر کی ہوئی ٹانگ لئے بستر میں پڑی تھیں۔ درد شدت کا تھا، کراہ رہی تھیں۔ عینی ان کے
سرہانے ایک آرام کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔

اتنے عرصہ کی بار بار ملاقات کی وجہ سے میں بھی ان کی عادت سے بخوبی واقف ہوگئی تھی۔ اس لئے ان کی محبت بھری
ڈانٹ سے بچنے کی غرض سے ان کے لئے گاجر کا حلوہ جو میں نے گھر میں بنایا تھا لیتی گئی تھی کیونکہ جب وہ ہمارے یہاں آکر ٹھہرتی
تھیں، اکثر میں نے انہیں ناشتہ پر سویوں کا شیر خورمہ اور شام کی چائے پر گاجر کا حلوہ دیا تھا۔ اور دونوں چیزیں وہ بڑی
رغبت سے کھاتی تھیں۔ کھاتی جاتیں اور مزے لے کر بنانے کی ترکیب پوچھتی جاتیں، ساتھ ہی بلڈ پریشر بڑھنے کے ڈر سے یہ بھی کہتی
جاتیں "یہ سب چیزیں معدے کے لئے ثقیل ہوتی ہیں، لیکن تم نے محبت سے بنایا ہے، مزے دار بھی ہے، کوئی ہاضمے کی دوا دے دینا،
کھا لیتی ہوں۔"

اسی درد کی حالت میں سلام کے جواب میں سوال کیا "کمرہ ڈھونڈنے میں دقت تو نہیں ہوئی؟" پھر ہاتھ میں کھانے کا
ڈبہ دیکھ کر کہنے لگیں "یہ کیا ہے؟" میں نے کہا "گاجر کا حلوا آپ کے لئے چلتے چلتے بنا لیا تھا، جب جی چاہے کھا لیجئے گا۔ منع تو
نہ ہوگا۔" عینی سے ڈبہ لے لینے کو کہا اور ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا، کراہتی بھی جاتی تھیں مگر ہڈی ٹوٹنے کی پوری داستان دہرائی۔
"کرنل شاہ یہاں لاکر ڈال گئے ہیں۔ بلڈ پریشر دکھانے کے لئے ان کے کلینک گئی تھی۔ ان کی میز پر سے اترتے میں چکنے فرش کی وجہ
سے جو پاؤں پھسلا تو بس زمین پر ڈھیر ہوگئی۔ کرنل اسی طرح ہاتھوں میں اٹھا کر موٹر میں ڈال کر سیدھے آپریشن روم میں لائے۔
معلوم پھر کیا ہوا، آنکھ کھلی تو خود کو اس کمرے میں رسیوں اور چرخیوں سے جکڑا ہوا پایا۔"

فرو روڈا نٹیں گی، میرے میاں مجھ سے کہتے "تم کچھ بہانہ کر دیتا۔" میں کہتی "نہیں بھئی، مجھ سے تو وہ فوراً کہہ دیں گی، بہو ہو" اس لئے میاں کو بھی ملنے سے روکتی، ہو، خود بھی کتراتی ہو، آپ ہی جو اصل باعث پتہ نہ معلوم ہونے کا شبہ، وہی کہہ بیٹھے گا۔

کمرے میں داخل ہونے پر معلوم ہوتا کہ بہت بیمار ہیں، پریشر بڑھ گیا تھا، اٹھنا بیٹھنا، بات چیت کرنا تک ڈاکٹروں نے منع کر دیا ہے۔ عینی سے آہستہ آہستہ ہم لوگ ان کا احوال پوچھتے ہوتے، اتنے میں آنکھ کھول کر دیکھتیں اور پوچھتیں "عینی کون آیا ہے۔ کیا جلیل ہیں، ارے انہیں بٹھاؤ، ان سے کہو، اب بھی کیوں آئے۔ مر جاتی تب آتے"

جلیل صاحب اور میں شرمندگی ظاہر کرنا چاہتے مگر وہ موقع ہی نہ دیتیں اور جلیل صاحب سے مخاطب ہوتیں تو یوں "کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں عاق کر کے مروں؟" اتنی سخت بات کہہ کر فوراً بات کا موضوع بدل دیتیں۔ مجھ سے پوچھتیں "بچوں کو کس پر چھوڑ کر آئی ہو؟ نوکر ہے یا آیا ہے؟ بیٹھو۔ یہ جاڑوں کی رات اور تم اس طرح لفافہ بنی ہوئی ہو۔ سردی نہیں لگتی؟ ہاں ابھی کم سن ہو۔ فیشن نیا پیارا ہے، صحت کا خیال کرو۔ کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ یہ دیکھو میری طرف، سر، منہ، سینہ سب گرم کپڑوں سے لپیٹے پڑی ہوں پھر بھی سردی لگ گئی۔ اب کچھ بہتر ہوں۔" باتیں کرتے کرتے برقی گھنٹی جو ان کے بستر ہی میں لگی ہوتی دبا تیں، نوکر آتا، اس سے بجلی کے چولہے پر چائے بنانے کو کہتیں اور حسب معمول سرہانے کی ڈولی میں سے کچھ کھانے کی چیزیں نکلواتیں اور اس طرح مریض جسکی ہم مزاج پرسی کرنے جاتے الٹی ہماری مزاج پرسی کرتا۔ وہ چائے پلواتیں، بچوں کی، میرے بہن بھائیوں کی اور نوکروں تک کی خیریت پوچھتی تھیں۔

ہم لوگ جیکب لائن کے سرکاری مکان میں آچکے تھے، ایک دن اچانک معلوم ہوا، تشریف لائی ہیں اور ساتھ میں ایک اور خاتون ہیں جنھیں میں نے نہیں پہچانا مگر وہ مجھے جانتی تھیں۔ میں نے دونوں کو ادب سے سلام کر کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور دوسری خاتون کی تعریف پوچھی تو ہنس کر کہنے لگیں: یہ امتہ الوحی ہیں، تمہارا بھائی اور ان کا لڑکا سعید دہلی میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے: میں نے پھر بھی اجنبیت ظاہر کی تو امتہ الوحی صاحبہ نے میرے مرحوم بھائی ادریس عرف دوطا کا نام لیا تو میں نے پہچانا۔ آیا چائے وغیرہ لے کر آئی۔ اتنے میں جلیل صاحب دفتر سے واپس آگئے اور میں نے انہیں مرحومہ کی آمد کی خبر دی، وہ جوش سے ملنے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ مرحومہ نے زور سے کہا "ارے مت آنا پردہ ہے"۔ وہ سمجھے مذاق کر رہی ہیں، وہ پھر بھی چلے ہی آئے۔ تب تو وہ اپنی عزیز دوست کی طرف اپنی ساڑھی کے آنچل کی آڑ لے کر کھڑی ہو گئیں اور آنکھیں دکھا کر جلیل صاحب کو ڈانٹنے لگیں: "کہہ رہی ہوں پردہ ہے، پھر بھی گھسے چلے آ رہے ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ چلو اپنے کمرے میں، میں وہیں آ رہی ہوں۔" جلیل صاحب الٹے پاؤں وہاں سے واپس آئے اور پھر کمرے سے نکلے ہی نہیں۔

میں ان دونوں محترمات کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی کہ میری بڑی بچی جو اس وقت صرف چھ سات برس کی تھی اور گھٹنوں سے اونچی فراک پہنے ہوئے تھی کھیلتی کھیلتی میرے پاس آن کھڑی ہوئی۔ خالہ وحی نے جو بہت مذہبی خاتون ہیں فوراً اس کی ننگی ٹانگوں پر اعتراض کیا۔ جتنی دیر میں انہیں ان کے اعتراض کا معقول جواب دیتی، تیزی سے مجھے بولنے سے روک کر کہنے لگیں: تم ٹھہرو۔ میں

دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اگرچہ آج وہ جسمانی طور پر ہمارے ساتھ نہیں ہیں لیکن ادب کی دنیا میں وہ ہمیشہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ انہوں نے جس طرح اردو ادب کی خدمت کی ہے کوئی نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ بیماری کے بستر سے بھی مضمون لکھوا کر بھجواتی رہیں۔ جمیل صاحب کے اصرار پر انہوں نے اپنے نامور شوہر سجاد حیدر یلدرم مرحوم کے ساتھ اپنی زندگی کی ایک طولانی داستان بھی کچھ خود لکھی کچھ لکھوائی۔ افسوس یہ بھی نامکمل رہی۔[1]

اللہ سے دعا ہے کہ عزیزہ بیٹی کو جو بے سہارا ہو گئی ہیں صبر جمیل عطا فرمائے اور حوصلہ دے کہ وہ اپنے قابل ترین والدین مغفور کی یادوں کو اپنی ادبی خدمت سے تازہ کرتی رہیں۔ مرحومہ کے عزیز از جان بیٹے مصطفیٰ حیدر (حیدو جی) اور ان کے متعلقین کو بھی خداوند کریم صبر کامل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

---

[1] مرحومہ کی یہ تحریر اس اشاعت میں شامل ہے۔

پھر خود ہی ہنسیں اور کہنے لگیں " وہی کرنل شاہ جو تمہیں گرانڈ ہوٹل سے فرشتۂ حیات بن کر موٹر میں ڈال کر رات کو دو بجے جناح ہسپتال لے گئے تھے جب تم کو کسی سودی ڈاکٹر نے بلا وجہ دل کا مریض مشہور کر دیا تھا اور جواب دے دیا تھا، یہ میرے لئے موت کا فرشتہ بننے والے تھے، ابھی نہ جانے زندگی کتنی اور باقی ہے جو ٹانگ پر ہی خیر گذری، ورنہ میں برسوں کی دل کی مریض رہنے کے سے دل ہل جاتا اور ختم ہو جاتی۔"

ہم دونوں نے ان کے لئے کے لئے دعائیہ الفاظ دہرائے اور زندہ دلی کے ساتھ ان سے باتیں کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ درد کو بھولی رہیں۔

کچھ عرصے بعد ہڈی جڑ گئی، اپنے گھر واپس آگئیں، پھر مہمان بطور روگ انہیں اپنے گھر لے جانے لگے، کچھ دن بعد معلوم ہوا ابھر گئی تھیں اور پھر ہڈی ٹوٹ گئی تھی، غرض یہ کہ نہ جانے کتنی تکلیفیں اٹھائیں دھان پان سی میری اس پیاری ضعیفہ نے۔ آخری عمر میں یہاں سے جاکر بمبئی میں بھی ہڈی ٹوٹی۔ آخر موت نے ان کی مشکل آسان کی لیکن میں ان کے صبر و استقلال اور قوت برداشت کی داد دیتی ہوں۔ میں ایسے معاملوں میں بڑی بودی ہوں۔ نہ خود چین سے سوتی ہوں، نہ ڈاکٹر اور تیماردار کو چین سے بیٹھنے دیتی ہوں۔

آخری بار ہم لوگ ان سے گارڈن روڈ کوارٹرز میں جاکر ملے۔ عینی انڈیا جا چکی تھیں۔ بھیجی (ان کے صاحبزادے مصطفیٰ حیدر کی دلہن اور بچے آئے ہوئے تھے۔ ہم نے ان کا حال پوچھنے کے بعد عینی کی خیریت پوچھی تو کچھ خاموش سی ہو گئیں، جس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ آخر ماں ہیں۔ عینی کی یاد ستا رہی ہوگی۔ پھر ہم نے عینی کے بارے میں بات نہیں کی، دوسری باتیں کرنے لگے، پھر وہ حسب عادت کچھ کھلانے کو دینے لگیں۔ میں نے کھانے سے انکار کیا تو زور سے ڈانٹا: "آخر تم اتنی شہزادی کیوں واقع ہوئی ہو؟" اس پر میں نے انہیں خوش کرنے کو تھوڑا سا کھا ہی لیا۔

میرے لباس کی، چوڑیوں کی ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی تعریف کی۔ کوئی مشاعرہ ہونے والا تھا، جلیل صاحب سے پوچھا جاؤ گے مشاعرے میں اور اس بچے کو بھی لے جاؤ گے؟" مجھے بچہ اس لئے کہتی تھیں کہ ایک بار میں ان کے اصرار پر مشاعرے میں گئی تھی، میری کمزوری ہے کہ رات کو کھانا کھا کے تھوڑی دیر بعد ہی نیند آجاتی ہے، چنانچہ مشاعرہ میں بھی وہی ہوا، جمائیاں آئیں اور میں نے اپنی آنکھیں رگڑنا شروع کیں۔ پھر میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اس کے بعد صوفے پر سر ٹکا کر سو گئی۔ ذرا دیر بعد میں نے دیکھا مجھے جگا رہی تھیں "اے دلہن! تم سو گئیں۔ لے ہے بالکل بچہ ہو۔ سنو سنو۔ دیکھو، وہ جمیل بخاری اپنی وہی غزل سنا رہے ہیں ڈھلتے ڈھلتے، چلتے چلتے، وہ دیکھو، اسے دیکھو تو، کرتہ پائجامہ اور اس پر سنہری واسکٹ بھی پہن رکھی ہے۔" میں نے بھی بخاری صاحب کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، مجھے بھی وہ اچھے لگے، ویسے ہی جیسے مرحومہ کو لگتے تھے۔

ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ مرحومہ سے آخری ملاقات ہوگی، ان کی موت کی خبر ڈان میں پڑھ کر گرانڈ ہوٹل کی پہلی ملاقات سے لے کر گارڈن روڈ کوارٹرز کی آخری ملاقات تک کی مدت کے تمام واقعات آنکھوں کے سامنے اس طرح آنے لگے جیسے ہم ان میں گھوم رہے ہوں اور کل کی بات ہو۔ اور دل پر جس طرح غم نے ہجوم کیا ہے اللہ ہی جانتا ہے۔

نذر شباہی

واسوخت راحت

آغا محمود بیگ نام اور راحت تخلص تھا۔ والد کا نام احمد بیگ[1] اور آباد اجداد کا وطن روم تھا[2]۔ دہلی کے محلے فراش خانے میں رہتے تھے[3]۔ سپاہی پیشہ اور جوان مرد تھے[4]۔ شعر و ادب کا ذوق ابتدا سے تھا اور شاعری میں حکیم مومن خاں مومن دہلوی (متوفی ۱۸۵۲ء) سے اصلاح لیتے تھے[5]۔

بھرت پور کی لڑائی (۱۸۲۶ء) سے کچھ عرصہ قبل لفٹیننٹ کرنل جیمز سکنر کے رسالے میں شامل ہوئے[6]۔ اس وقت ان کی عمر سترہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ کیونکہ فریزر نے انھیں دیکھ کر ان پر دودھ پیتے بچے کی پھبتی کسی تھی۔ اسی جنگ میں فریزر نے چھوٹی سی بات پر خوش ہو کر انھیں دفعداری دے دی تھی[7]۔

۱۸۳۷ء سے بہت پہلے راحت نے سکنر کی ملازمت ترک کر دی تھی۔ کیونکہ یہ سال اکبر شاہ ثانی، بادشاہ دہلی کی وفات کا ہے اور ایک حکایت میں راحت نے خود کو بادشاہ کی طرف سے مکند پور علاقہ ریوان کا عامل لکھا ہے[8]۔ راحت، اکبر شاہ ثانی کے پوتے مرزا شاہرخ (متوفی ۱۸۴۷ء) کے مصاحب تھے[9]۔ اکبر شاہ ثانی کی وفات (۲۹ ستمبر ۱۸۳۷ء) سے چند ماہ قبل وہ دہلی چھوڑ کر بھوپال آ گئے۔ جہاں نواب جہانگیر محمد خاں دولہ شمشیر جنگ (متوفی ۱۹ نومبر ۱۸۴۴ء) نے انھیں اپنی مصاحبت میں لے لیا۔ راحت نے خود اقرار کیا ہے کہ آشتہ کی لڑائی میں جو ۱۳ جولائی ۱۸۳۷ء کو نواب قدسیہ بیگم اور نواب جہانگیر محمد خاں کے درمیان ہوئی، راحت، نواب موصوف کی طرف سے شامل تھے[10]۔ دسمبر ۱۸۳۷ء میں نواب دولہ، بھوپال کے خود مختار

---

[1] گلستان سخن از قادر بخش صابر صفحہ ۱۲۰۔ سخن شعرا از نساخ صفحہ ۱۶۷۔ طور کلیم از سید نور الحسن صفحہ ۴۳۔ بزم سخن از سید علی حسن صفحہ ۵۳۔ [2] گلستان سخن صفحہ ۲۴۳۔ [3] حیات مومن از عرش گیاوی صفحہ ۸۷۔ [4] گلستان سخن صفحہ ۲۴۳۔ [5] گلستان سخن صفحہ ۲۴۳۔ سخن شعرا، طور کلیم صفحہ ۴۳۔ بزم سخن صفحہ ۵۳۔ [6] نتائج المعانی از محمود بیگ راحت حکایت نمبر ۱۲، ۳۵۔ سکنر کی وفات ۱۸۴۱ء میں ہوئی۔ [7] نتائج المعانی حکایت نمبر ۲۵۔ [8] نتائج المعانی حکایت نمبر ۳۹۔ [9] نتائج المعانی حکایت نمبر ۱۱۲۔ [10] نتائج المعانی حکایت نمبر ۸۹۔

ماہنامہ

قومی زبان

کا

بابائے اردو نمبر

سنہ ۱۹۶۷ء

چند لکھنے والے

پروفیسر ہارون خاں شروانی	سہیل عظیم آبادی
سید ہاشم رضا	ڈاکٹر باجیدر شہریار
حکیم محمد سعید	محمد معین الدین دردائی
سید قدرت نقوی	کوثر چاندپوری
فضل احمد صدیقی۔	ڈاکٹر ابوسعید نور الدین
پروفیسر شبیر علی کاظمی۔	محمد حبیب اللہ رشدی
پروفیسر عبد القوی دسنوی	جمیل نقوی

اور بہت سے دوسرے

- سوا دو سو صفحات　• آفسٹ کی طباعت　• متعدد تصاویر
- بابائے اردو کے دوستوں اور نیازمندوں کے انٹرویو　• متعدد غیر مطبوعہ خطوط۔ قیمت: دو روپے

انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ، کراچی۔

سر ولیم میور کی خدمت میں پیش کی گئی جس پر انھیں کچھ صلہ ملا[۱]۔ یہ رقم کس قدر تھی، اس کی تفصیل دستیاب نہیں ہو سکی۔

راحت کی پریشان حالی کا اندازہ مثنوی بہشت عدل کے مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی کیا جا سکتا۔ یہ اشعار انھوں نے مہاراجہ مہندر سنگھ کی نذر کیے تھے جو اس زمانے میں ریاست پٹیالہ کے حکمراں تھے[۲]۔ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:
("یہ" کا اشارہ مہندر سنگھ کی طرف ہے)

تو ہے مریض اور یہ ہے مسیحا — مشکل کیا ہے؟ تیرے مداوا
مانا ہم نے تو ہے پریشاں — رنج ہے تیرے گھر میں مہماں
ہے یہ اشارہ تیرا کافی — ہو جاوے گی اس کی تلافی

مہاراجہ مہندر سنگھ کو راحت نے اپنا ولی نعمت لکھا ہے[۳]۔ پٹیالے میں مہاراجہ کے علاوہ ان کے مربیوں میں مہاراجہ کے وزیر اعظم سید محمد حسن خاں بھی تھے۔ بہشت عدل انھوں نے سید صاحب ہی کی وساطت سے ہی مہاراجہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اور صلے کی خواستگاری بھی انھی کے وسیلے سے تھی[۴]۔

راحت کی وفات کے بارے میں صحیح تاریخ کا تعین مشکل ہے۔ محترم کلب علی خاں فائق صاحب کا خیال ہے کہ "۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) تالیف تذکرہ طور کلیم سے پہلے انتقال کر گئے تھے[۵]" راحت کی وفات سے متعلق اس کے علاوہ کسی جگہ کوئی اشارہ نہیں ملتا[۶]۔

---

[۱] خاتمۃ الطبع میں مہتمم مطبع کے الفاظ ہیں " از انجا کہ یہ کتاب نتائج المعانی منظور نظر نکتہ سنجان مرکز دائرہ سخن پروری اور مطبوع طبع دقیقہ سنجان منازل بروج آسمان قدر دانی ہو کر پس حصول اجازت مطبع میں واسطے طبع کے آئی "

[۲] مہندر سنگھ، نریندر سنگھ کے اکلوتے بیٹے، ۱۶ ستمبر ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ باپ کی وفات پر حکمراں نامزد ہوئے لیکن کلی اختیارات ۱۸۷۰ء میں حاصل کئے۔ اسی سال رئیس اعظم طبقہ اعلیٰ ستارۂ ہند کا خطاب ملا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے راجگانِ پنجاب از گرفن)

[۳] خاتمہ کلام مثنوی بہشت عدل۔

[۴] سید محمد حسن مہاراجہ نریندر سنگھ کے زمانے میں حاکم عدالت تھے۔ نریندر سنگھ کی وفات پر گورنمنٹ نے ایک حکمراں کونسل بنائی جو شہزادے کے بلوغ تک ریاست کی نگراں تھی۔ اس میں تین افراد رکن تھے۔ ۱۸۶۲ء تک ان میں سے دو آدمی فوت ہو چکے تھے چنانچہ اسی سال سید محمد حسن اور سردار فتح سنگھ کو اہل کاران متوفی کی جگہ کونسل کا رکن بنا دیا گیا۔ اس زمانے میں سید صاحب صدر عدالت عالیہ تھے۔ مہندر سنگھ نے انھیں وزیر اعظم مقرر کیا۔ (راجگان پنجاب از گرفن)

[۵] "مومن، حیات اور کلام" از کلب علی خاں فائق رامپوری ص ۱۴۸

[۶] مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے میری مرتب کردہ کتاب نتائج المعانی کا مقدمہ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء

والی ہوئے[۱] - راحتؔ، سال جلوس سے لے کر وفات تک، نواب کے ساتھ وابستہ رہے - نتائج المعانی میں تیرہ حکایتیں نواب دولہ کی زندگی کے مختلف واقعات سے متعلق ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ راحتؔ کو نواب سے حد درجہ عقیدت اور نواب کو راحتؔ پر بے پناہ اعتماد تھا -

بھوپال کی ریاست سے ان کا سلسلۂ ملازمت کس زمانے میں منقطع ہوا - اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا - لیکن گمان کہتا ہے کہ نواب جہانگیر محمد خاں کی وفات کے بعد راحتؔ واپس دہلی آ گئے تھے - اور بعض تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق علائق دنیوی سے دستبردار ہو کر انھوں نے خلوت نشینی اختیار کر لی تھی - یہ زمانہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۵۵ء کے درمیان شمار کیا جا سکتا ہے - صابر نے اپنے تذکرے میں جو ۱۸۵۵ء میں تصنیف ہوا، ان کے بارے میں لکھا ہے :

" مدت سے گوشۂ انزوا اختیار اور قطع علائق کو غنیمت قدرا تجویز کیا ؛ آشنا و بیگانہ سے ترک ملاقات کر کے امید و بیم سے فارغ اوقات بسر کرتا ہے - سرمایہ علمی بہ قدر ضرورت فراہم ہے "[۲] ص۲۴۲

سری رام : (صاحب خمخانۂ جاوید) نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے :

" مدت سے بیشتر فوجی ملازمت ترک کر کے خانہ نشین اور علائق سے دستبردار ہو گئے تھے " ص۳۳۲ جلد سوم

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب نادر شاہی غارت گری کی طرح ایک بار پھر اہل دہلی پر عرصۂ حیات تنگ ہوا تو دوسرے بے روزگار لوگوں کی طرح راحتؔ بھی تلاش معاش میں ترک وطن پر مجبور ہوئے - اس دفعہ وہ دہلی سے ہجرت کر کے پٹیالے میں آ گئے - اس دور کی زندگی پر ان کی تصنیف مثنوی ہشت عدل، روشنی ڈالتی ہے - اس سے پتا چلتا ہے کہ راحتؔ، مہاراجہ نریندر سنگھ والی پٹیالہ (متوفی ۱۳ نومبر ۱۸۶۲ء) کے عہد میں پٹیالے میں آ گئے تھے - کیونکہ ہشت عدل میں ایک حکایت مہاراجہ نریندر سنگھ کے عدل پر بھی ہے - قیاساً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ راحتؔ کو مہاراجہ موصوف سے قرب حاصل تھا - یہی وجہ ہے کہ ۱۸۶۲ء میں جب مہاراجہ نریندر سنگھ فوت ہوئے اور ان کی جگہ ان کے بیٹے مہاراجہ مہندر سنگھ مسند نشین ہوئے تو راحتؔ نے قصیدہ کہا - یہ قصیدہ مثنوی ہشت عدل کے ہمراہ چھپ چکا ہے[۲] -

پٹیالے میں قیام کا زمانہ راحتؔ کے لیے بے حد عسرت اور تنگ دستی کا دور تھا - اس زمانے میں انھوں نے تصنیف و تالیف شروع کی - پہلے تذکرہ خزینۂ راحت، پھر مثنوی ہشت عدل اور اس کے بعد نتائج المعانی لکھی - ہشت عدل مہاراجہ مہندر سنگھ کی خدمت میں پیش کی، اور انعام کے خواستگار ہوئے لیکن دلی مراد پوری نہ ہوئی[۳] - نتائج المعانی

---

[۱] تاج الاقبال تصنیف شاہجہاں بیگم دفتر اول ص۸ تا ص۲۲ - عبرت والا جاہی از سید محمد علی حسن ص۱ تا ص۱۳ - بھوپال اسٹیٹ گزیٹیر

[۲] مطبوعہ مطبع نول کشور پٹیالہ ص۳۴

[۳] دیکھیے نتائج المعانی، خاتمۂ کلام -

دتاسی نے راحت کا نام محمود بیگ کی بجائے محمد بیگ لکھا ہے، جو غلط ہے[۱]۔ اسی طرح واسوخت کو جو مسدس کی ہیئت میں ہے مخمس لکھا ہے۔ کیونکہ زیر تبصرہ واسوخت کے علاوہ راحت کی کوئی نظم مخمس کی صورت میں سوائے دتاسی کے کسی دوسری شہادت سے ہم تک نہیں پہنچی۔

تذکرہ شعلۂ جوالہ جس میں اس واسوخت کو پہلی مرتبہ مکمل متن کے ساتھ شائع کیا گیا ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء مطبع نول کشور سے شائع ہوا۔ (مرزا علی عیش لکھتے ہیں):

"راحت تخلص ہے مرزا محمود بیگ صاحب دہلوی کا۔ معلوم نہیں کہ شاگرد کس کے ہیں۔ نہ اور حالات ان کے معلوم ہوئے۔ مگر اس واسوخت سے جو اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے، دریافت ہوتا ہے کہ کلام بہت با تمکین ہے اور شاعر خوش گو اور سخن دران خوش فکر سے ہیں۔"[۲]

ان دو حوالوں کی بنا پر گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ واسوخت ۱۸۶۸ء کے قریب تصنیف ہوا۔

مری رام نے ان کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

"ایک مثنوی موسوم بہ بہشت عدل اور ایک واسوخت علاوہ غزلیات کے ان سے یادگار ہیں۔"[۳]

راحت کا زیر مطالعہ واسوخت کل ۶۰ بندوں پر مشتمل ہے۔ مسدس کی شکل میں ہے۔ ہر دو اشعار کے بعد ایک تیسرا شعر ٹیپ کا ہے۔ جو پہلے چار مصرعوں میں بیان کیے گئے مضمون کو تکمیلی صورت دیتا ہے۔ راحت کے ہاں استعاروں کی کثرت ہے، بالخصوص سیدھا سادا اور براہ راست طریق اظہار ہے۔ مضامین سلسلہ بسلسلہ آپس میں مربوط بھی ہو رہے ہیں اور خط مستقیم میں برابر آگے بھی بڑھ رہے ہیں۔ وہ اگر ٹھہرے ہیں تو اس مقام پر جہاں محبوب کا سراپا بیان کرنا مقصود ہے۔ اس جگہ تشبیہیں اس قدر رنگا رنگ انداز سے استعمال ہوئی ہیں کہ سراپا کے تمام متعلقات میں ایک فطری ربط نظر آتا ہے۔ واسوخت کے چودھویں بند سے جو سراپا شروع ہوتا ہے۔ اس کے تمام متعلقات کو یکجا کیجئے۔ محبوب نقاشی کا نمونہ یا PAINTED DOLL معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ... تمام تشبیہوں کی بیرونی شہادتیں موجود ہیں جو ہمارے حواس خمسہ مہیا کرتے ہیں۔

بتالیسویں بند کے بعد ایک دوسرا سراپا ہے۔ اس سراپا کی تمام تشبیہیں خیالی اور غیر محسوس ہیں۔ گیسو ابر ہیں، ماتھا مہتاب ہے، چشم افسوں ساز ہے، مژگاں خوں ریز ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس سراپا سے شخصیت کی بجائے کیفیت وجود میں آتی ہے۔ یہ

• دتاسی نے اردو کی ایک مثنوی "نل دمن" کو محمود بیگ راحت کی تصنیف بتایا ہے۔ حالانکہ یہ مثنوی بھگونت رائے راحت کی ہے جنہوں نے غنیمت کی مثنوی نیرنگ عشق کا بھی اردو ترجمہ نگارستان راحت کے نام سے کیا تھا۔

[۱] بحوالہ (مجموعہ واسوخت) ص ۴۸

[۲] ...

[۳] خمخانۂ جاوید جلد سوم ۔ ص ۳۰۵

راحت نے اپنی تصانیف میں تین کتابوں کا ذکر انھوں نے خود کیا ہے۔

۱۔ تذکرہ خزینۂ راحت ۔ سالِ تصنیف اور تاریخ اشاعت وغیرہ معلوم نہ ہو سکی ۔ اس کا حوالہ نتائج المعانی کے مقدمہ تالیف میں موجود ہے ۔

۲۔ مثنوی ہشت عدل ۔ اس میں آٹھ مثنویاں مختلف بحروں میں اور ایک قصیدہ تہنیت مہاراجہ نہندر سنگھ والی ہے ۔ قصیدہ فارسی زبان میں ہے اور مثنویاں آٹھوں اردو میں ہیں ۔ مثنویوں میں آٹھ مختلف عدالتوں کا ایک ایک واقعہ ہے ۔ ان میں عدل ذوالجلال اور عدل رسالت کے بعد اکبر، جہانگیر، شاہ جہان، اکبر شاہ ثانی، مہاراجہ نہندر سنگھ اور مہاراجہ مہندر سنگھ کے عدل شامل ہیں ۔ کتاب [illegible] میں مطبع [illegible] دہلی اور [illegible] مطبع نول کشور پٹیالہ میں طبع ہوئی ۔

۳۔ نتائج المعانی ۔ یہ کتاب مختلف واقعات، حکایتوں اور لطیفوں کا مجموعہ ہے ۔ یہ تمام واقعات راحت کی اپنی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ راحت کے سوانح اور شخصیت پر یہ کتاب اہم ترین ماخذ ہے ۔ [illegible] میں پہلی مرتبہ مطبع میڈیکل پریس آگرہ سے شائع ہوئی ۔ اب اسے راقم الحروف نے مقدمے اور تعلیقات کے ساتھ مرتب کیا ہے اور مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے اس کی اشاعت ہونی ہے ۔

ان کے علاوہ راحت نے خود کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا ۔ لیکن میرے سامنے ان کی صرف دو کتابیں ہیں، ممکن ہے تذکرہ خزینۂ راحت میں زیرِ نظر واسوخت کا بھی ذکر ہو ۔

واسوخت راحت کا حوالہ فدا علی عیش کے تذکرے گلشن چو آلہ، سری رام کے تذکرے خمخانۂ جاوید اور گارسین دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی میں موجود ہے ۔ اس کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں قطعی فیصلہ مشکل ہے البتہ اتنی بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جس زمانے میں یہ واسوخت تصنیف ہوا وہ راحت کے لئے سخت بے اطمینانی اور جذباتی انقباض کا دور تھا ۔ اور ظاہر ہے یہ ۱۸۵۷ء کے بعد یعنی قیام پٹیالہ کا زمانہ ہی ہو سکتا ہے ۔ گارسین دتاسی نے لکھا ہے:

"(راحت) کی ایک مخمس ۱۸ بندوں کی، اودھ اخبار کے ۳۰ جون ۱۸۶۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔"[1]

---

[1] تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی (فرانسیسی زبان میں) ص [illegible]

واقفِ لذتِ تیرِ نگہِ یار نہ تھے　　تشنۂ آبِ دمِ خنجرِ خوں خوار نہ تھے
آہ اس دردِ جدائی میں گرفتار نہ تھے　　وہی کچھ دن تھے کہ الفت سے خبردار نہ تھے

ہنستے رہتے تھے سدا ہم گلِ خنداں کی طرح
رونی صورت نہ تھی یوں بلبلِ نالاں کی طرح

کچھ عجب جوش پہ تھی فصلِ جوانی کی بہار　　چہچہے یاروں میں رہتے تھے سدا لیل و نہار
یاد دریا پہ ہیں یا کرتے ہیں سیرِ گلزار　　میرے کوچے کا صبا نے بھی نہ دیکھا تھا غبار

نکہتِ خندۂ گلہائے دہانِ احباب
گلشنِ عیش میں رکھتے تھے ہمیشہ شاداب

جانتے بھی نہ تھے کہتے ہیں کسے غمزہ و ناز　　یہ سمجھتے بھی نہ تھے کیا ہے ادا اور انداز
نالۂ نے کی بھی سنتے نہ تھے دل سے آواز　　پوچھتے پھرتے تھے ہم معنیِ لفظِ دم ساز

قدِ موزوں کا تصور تو کہاں آتا تھا
مصرعِ موزوں بھی زباں سے نہ پڑھا جاتا تھا

سادہ رویوں سے یہ نفرت تھی کہ اللہ اللہ　　نیچی آنکھیں کیے بازار میں رہتے سرِ راہ
اپنی بھی وضع سے ہم آپ نہ تھے کچھ آگاہ　　آئینہ بھی نہ کبھی دیکھتے تھے بھر کے نگاہ

وضعِ دل کش کسے کہتے ہیں خبردار نہ تھے
تھے طرح دار یہ گویا کہ طرح دار نہ تھے

اب یہ حالت ہے پڑے رہتے ہیں دن رات اداس　　اڑ گئے طائرِ وحشی کی طرح ہوش و حواس
جز غم و رنج نہیں آ کے پھٹکتا کوئی پاس　　مونس و محرم و غم خوار ہے اک عالمِ یاس

جائے سینے میں نہیں ہے کہ جہاں ہوئے نہ داغ
دل کی جا پہلو میں جلتا ہے مری ایک چراغ

وہی ہم ہیں کہ اٹھاتے تھے سدا لطفِ شباب　　نشۂ بادہ میں سونگھی نہ کبھی بوئے کباب
جلتے تھے کہ ہیں چاہت میں بڑے رنج و عذاب　　یہ نہ واقف تھے کہ اس طرح سے ہو دیں گے خراب

اپنی مل جائے گی سب خاک میں یہ رعنائی
سارے غم خوار بتائیں گے ہمیں سودائی

وہ کہاں صحبتِ احباب کہاں سیرِ چمن　　دامنِ گل کی طرح ٹکڑے ہے سب پیراہن

سراپا داسوخت کے نفس مضمون کے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ ایک گوشت پوست کے محبوب پر رعب ڈالنے کے لیے مافوق الفطرت محبوب کا ایسا زیادہ کامیاب ثابت ہو سکتا ہے ۔

داسوخت کی صنف کو جس تہذیب نے جنم دیا تھا اسی نے حرم سرا سے داشتہ کے مکان کو الگ کیا تھا۔ اور ادب کا مقدر دیکھئے کہ اس کے حصے میں حرم سرا کی بجائے داشتہ کا مکان آیا ۔ پس داسوخت میں شاعر اپنی محبوبہ کو اسی طرح بے حجابانہ رونق بزم بنانا چاہتا ہے جس طرح لکھنؤ کا کوئی وضع دار نواب اپنی لاتعداد بیگمات کے باوجود خوبصورت داشتاؤں کا ایک جمگھٹا اپنے گرد رکھنا پسند کرتا ہے ۔ داسوخت کی محبوبہ رنگا رنگ پھولوں کا ایک ایسا گلدستہ ہے جو آپ کی محفل کو سجا سکتا ہے، آپ کے لیے ضیافت طبع کا سبب بن سکتا ہے لیکن آپ اس سے روحانی تعلق قائم نہیں کر سکتے ۔ گویا وہ ایک ایسی گڑیا ہے جسے چوما جا سکتا ہے لیکن اس سے عشق نہیں کیا جا سکتا ۔ راحت کے زیر نظر واسوخت میں اس محبوبہ کا بھرپور تصور بھی ملتا ہے ۔

راحت کے اسلوب میں قوت اور بلند آہنگی کا احساس ہوتا ہے ۔ پہلے چار مصرعے بتدریج کی طرح اٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں، ایک مصرعے میں کئی کئی اضافتیں اسے اوپر کی طرف لے جانے اور تاثر کو شدید کرنے میں مدد دیتی ہیں اور آخری دو یعنی ٹیپ کے مصرعے کاٹ کی طرح نیچے آتے ہیں اور تاثر کو بڑی سرعت کے ساتھ تکمیل تک پہنچاتے ہیں ۔

واقف لذت تیر نگہ یار نہ تھے   تشنۂ آب دم خنجر خوں خوار نہ تھے
آہ اس درد جدائی میں گرفتار نہ تھے   وہی کچھ دن تھے کہ الفت سے خبردار نہ تھے

ہنستے رہتے تھے سدا ہم گل خنداں کی طرح
رونی صورت نہ تھی یوں بلبل نالاں کی طرح

راحت کو حسن اور متعلقات حسن کا بڑا شعور ہے ۔ عشق اور تلازمات عشق کا علم بھی وسیع ہے اور یہ تمام صلاحیتیں واسوخت میں نمایاں ہیں ۔

ان تمہیدی کلمات کے ساتھ میں آپ کی خدمت میں راحت کا واسوخت پیش کرتا ہوں ۔ اسے خود ملاحظہ فرمایئے، میری مزارشات سے آپ کو اکثر مقامات پر اتفاق ہوگا ۔

واسوخت راحت

ایک دن وہ تھا کہ الفت سے ہم آگاہ نہ تھے   عشق کی نام کو چلتے بھی کبھی راہ نہ تھے
ان ستم گاروں کو ہم جانتے بھی آہ نہ تھے   واقف رنج و الم بھی کبھی واللہ نہ تھے

غنچے کی طرح دل اس ذکر سے تنگ آتا تھا
پاس ناموس تھا کچھ عشق سے ننگ آتا تھا

دے کے کابل کا [illegible] کبھی [illegible]

آہ اب ایسا تو آفت کا [illegible]

[illegible]　　　　[illegible] ہماری [illegible]

[illegible] آپ کی [illegible]　　　　[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]　　　　[illegible]

[illegible]　　　　[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]　　　　جانے پردے سے کہاں تم [illegible]

[illegible]　　　　[illegible]

[illegible] تو پردے سے [illegible] گویا [illegible]

[illegible] اب تو [illegible]

آپ کی باتوں میں کب ایسی دل آزاری تھی　　　　کون سے دن تری چتون میں یہ غمازی تھی

[illegible] آپ [illegible]　　　　یا دلب آپ کو اس طرح کی دم بازی تھی

خیریت کیا کہ دری چال تمھاری کب تھی

آئینہ دیکھو یہی شکل تمھاری جب تھی

آنکھ مجلس میں اٹھاتے ہوئے شرماتے تھے　　　　میرے بن میر بھی کرنے نہ کہیں جاتے تھے

آنکھ جب اٹھ جاتی تھی گو بات بھی فرماتے تھے　　　　غمزہ و ناز و ادا کچھ بھی نہ صاحب آتے تھے

اب ہمیں چٹکیوں میں آپ اڑا دیتے ہیں

کہ رلا دیتے ہیں اور گاہ ہنسا دیتے ہیں

بیٹھنا کب پس چلمن تھا یوں آ [illegible]　　　　جھانکنا تاکنا اس طرح سے کب آتا تھا

[illegible] دل تیرا دھڑکا جاتا تھا　　　　پھر دل بندہ کبھی تجھے باتوں میں بہلاتا تھا

بانکے دلی کے کب اس طرح اکڑے رہتے تھے

دیکھے جلوہ [illegible]

پاؤں میں چاک گریباں ہے گلے میں دامن   بار ہر بھی مجھے گویا ہے وبال گردن
پھر باعث ہے فزوں چہرے کی رنگت میری
تنکے چنتا ہوں ہے وحشت سے یہ صورت میری

یہ نہ سمجھا تھا کہ اس طرح سے ہوں گا بے تاب   دل لگی کرتے ہی چھٹ جائے گی سارے اسباب
عمر بھر نہ تڑپیں نہ اس طرح سے ہم تجھ بن خراب   طاقت و صبر و تحمل ہمیں دے دیں گے جواب
کئی دن نہیں کٹنے کے نہ تیغ ستم
موت بھی پاس مرے آنے کی کھاوے گی قسم

یہ خبر کب تھی کہ دل آپ پہ مائل ہوگا   خنجر ناز کا قائل ترے بسمل ہوگا
تو ہی یوں کر کے نگاوٹ مرا قاتل ہوگا   ایسا خوں خوار تو اس نور شمائل ہوگا
نام لینے سے مرے یہ تجھے نفرت ہوگی
اس محبت پہ میاں ایسی عداوت ہوگی

یہ بھی تقدیر کی خوبی کہ مجھے الفت ہو   اس محبت پہ مری آپ کی یہ صورت ہو
گرمی صحبت اغیار کی یہ شہرت ہو   نیلے کھٹیلے ہوں سدا اور سدا خلوت ہو
محرم راز بنا غیر تمھارے ایسے
دشمن جان بنے آپ ہمارے ایسے

دل میں انصاف ذرا کیجئے اور کیجئے غور   ناز و انداز کا یہ کس نے بتایا تمھیں طور
اب سجیلے جو ہوئے چاہنے والے ہوئے اور   ہاں میاں جو یہ سکھاوے (ہو) وہی لائق جور
آہ ظالم تجھے اس طرح بنانا ہی نہ تھا
غمزہ و ناز و ادا تجھ کو سکھانا ہی نہ تھا

میری چاہت ہی کی خوبی سے ہوئی یہ شہرت   سینکڑوں دیکھنے آنے لگے تیری صورت
پھر تو ہر ایک کو تم سے لگی ہونے الفت   اور ہی ہو گئے تم مجھ کو تو یہ ہے حیرت
نہ محبت نہ مروت نہ ملاقات رہی
نہ وہ صحبت نہ وہ اقرار نہ وہ بات رہی

تیغ تھے ابروِ خمدار مگر تھے بے آب   جھوٹے موتی در دندان تھے ہی پر نایاب
ہونٹ پتلے تھے مقرر نہ کہ جوں برگ گلاب   طبع چالاک تری ایسی تھی کب جوں سیماب

آپ بھی اور نہ چھوڑیں گے رقیبوں سے یہ راہ — خوب یہ دل میں سمجھ رکھے ہے اللہ گواہ
شعلہ رو ڈھونڈ کے ایسا میں کوئی یار کروں
پھر تصور بھی نہ تیرا کبھی زنہار کروں

جانتے ہو کہ مرض یہ کبھی جانے کا نہیں — دل لگی بن کبھی آرام یہ پانے کا نہیں
دیکھ لینا کہ غم ہجر میں کھانے کا نہیں — آنکھ میں بھی کبھی آنسو مری آنے کا نہیں
ضد سے تیری کوئی وہ ماہ لقا لاؤں گا
ذکر بھولے سے بھی ہرگز نہ ترا لاؤں گا

ہوئے وہ رشک پری ماہ لقا غیرت حور — شعلہ طور کہے کوئی اُسے عالم نور
آنکھ اٹھا تیری طرف دیکھے اگر وہ مغرور — رنگ اُڑ جائے ترے چہرے کا جیسے کافور
ہوش اڑ جائیں ترے غش کی سی حالت ہووے
نفرت آنے لگے ہر اک کو یہ صورت ہووے

لٹ ناصیہ ہو گیسوؤں سے ایسا عیاں — نصف مہتاب نہ ابر ہو جس طرح نہاں
اور بھویں ایسی ہوں کافر کی کہ جیسے کہ کماں — اصفہانی ہو کبھی یا کہیں تیغ براں
دیکھ کر اس کی بھویں بھوں یہ چڑھانی بھولو
ایسی چھپکلیاں سی کاجل کی بنانی بھولو

ہوں فسوں ساز وہ کافر کی بلا چشم سیاہ — ایک چشمک سے ہوں سب ساحر بنگالہ تباہ
ہووے وہ عابد صد سالہ فریب اس کی نگاہ — دیکھ کر ملنگے فرشتہ بھی جسے دل میں پناہ
خود بخود اشک ندامت میں یہ ڈھیلے گھل جائیں
ہووے وہ آنکھ کہ جس سے تری آنکھیں کھل جائیں

ہو وہ خوگردۂ خونریزی عاشق مژگاں — جان عشاق ہو اس تیر مژہ کے قرباں
پنجۂ دست قضا اس کو کہیں اہل زباں — فتنۂ حشر ہو ہر جنبش پنہاں سے عیاں
تو گر اس جنبش مژگاں پہ کرے ایک نگاہ
بیٹھ ہی جائے کلیجے کو پکڑ کر سر راہ

اللہ ہو بینی موزوں کا یہ اس کے نقشا — لوح قدرت پہ الف جیسے ہو قدرت سے کھچا
دیکھ اس کو نہ رہیں آپ کے پھر ہوش بجا — بےخودی میں یہی جی چاہے کہ کیجے سجدا

دیکھنے اور دکھانے کے ہوئے جب قابل اور ہی اور تمھارے سے لگے ہونے مائل
میں اگر ایسا سمجھتا تو نہ ہوتا بسمل تا بمقدور نہ دیتا کبھی ہرگز تمھیں دل
کبھی ایمان نہ لاتا نہ مسلماں ہوتا
آپ کا چہرہ اگر صورتِ قرآں ہوتا

ہم یہ سمجھے تھے یوں ہی رابطہ رہے گا باہم ہوں گے فریقینوں کے رسل رسائل پیہم
خاندان آدمی ہووے گا تمھارا ہر دم کنٹھے اور ٹوپیاں بھجواؤ گے دے دے کے قسم
اپنے ہاتھوں میں نشانی مری تم رکھو گے
گنجفہ میں بھی مرے نام کا خم رکھو گے

میرے زانو ہی کا تکیہ رہے گا آٹھ پہر لیٹتے بیٹھتے زانو کے تلے یا تہِ سر
منہ مرا دیکھے بن اٹھو گے نہ منہ کام سحر آئینہ جب کبھی دیکھیں گے تو باہم مل کر
خاصہ جب کھائیں گے صاحب کہ جب ہم کھائیں گے
ہم نہ کھائیں گے تو کھانے کی قسم کھائیں گے

سیر کو جاؤ گے جب دست بدست ہو کے سوار بن مرے پاؤں کبھی رکھنے کے نہیں تم زنہار
ساتھ ہی لے کے جاؤ گے مجھے با صد تکرار تم سے تھی کب یہ توقع کہ مجھے سو سو بار
حکم ہو وے گا کہ مت آ مرے گھر چل یاں سے
آئے مت دیکھ کے فرماؤ گے یہ زباں سے

ہم نشیں آپ کے اس طرح سے ہوئیں گے رقیب پھول کر بیٹھیں گے بلبل کی طرح گل کے قریب
ہم کو برسوں کبھی زیارت نہیں ہونے کی نصیب جوشِ وحشت سے مری ہوئے گی شورش یہ عجیب
گھر سے نکلے گا برا کر کے تپتر باہر
تم بھی گھبرا کے نکل آؤ گے اکثر باہر

آہ اس طرح سے نقرہ تجھے دیں گے دمباز جو نہ چل جائیں گے اس طرح سے مجھ پر غماز
یوں بگڑ جائیں گے دو دن میں تمھارے انداز خیر گر غیر رہے یوں ہی ترے محرمِ راز
یہ سمجھ رکھیو کہ در پر ترے تلوار چلے
کل چلے، آج چلے، جب ہوئی تکرار چلے

سامنا گر نہ کرے گا مرا کوئی بدخواہ اور نظر بھی نہیں آنے کا کوئی شام و پگاہ

وہ شکم آئینۂ قدرت یزدانی ہو — سیم گوں چھوٹی سے اک تختیٔ نورانی ہو
جو بر ناف بھی وہ عرض درخشانی ہو — چشم انجم کو جسے دیکھ کے حیرانی ہو

خواہ میں دیکھ کر اس آئینۂ حیرت کو
پیٹ کر [illegible] میں چھپا دو جو اگر غیرت ہو

پشت وہ چشمۂ حیواں سے دوبالا ہو جائے — صدقے مہتاب کا اس پشت پہ ہالا ہو جائے
چوٹی اس پر ہو پڑے حسن نرالا ہو جائے — منہ میں من جیسے لیے کھیلتا کالا ہو جائے

آپ گر دیکھیں وہ پشت اور وہ کھچڑی چوٹی
عمر بھر پھر نہ گندھے سر کی یہ پوری چوٹی

وہ نزاکت ہو کمر میں کہ رگ گل ہو خجل — کھائے لچکے جو ذرا دوش پہ سر سے آنچل
دونوں جانب ہوں پڑے زلف گرہ گیر کے بل — [illegible] کی خوبی سے دل [illegible] نہ ہو [illegible]

اس نزاکت پہ اگر اس کی اکڑ دیکھیے تو
دونوں ہاتھوں سے کمر ہی پکڑ لیجیے تو

گول گول [illegible] — [illegible]
پنڈلیاں دیکھ [illegible] — شمع حسن [illegible] پروانہ [illegible]

پاؤں اس گل کے [illegible]
[illegible]

نرم نرم [illegible] پاؤں [illegible] — [illegible]
ناخن پا [illegible] دیکھ کے ہو [illegible] نقاب — پاؤں [illegible]

دیکھ کر وہ کف پا آپ کو گر غیرت ہو
لے کے دیکھو نہ کبھی آئینہ پھر صورت کو

ہوئے اس قامت دل کش پہ قیامت صدقے — سرو جنت بھی اسے دیکھ کے غش کھا کے گرے
پا [illegible] کے [illegible] میں وہ جس وقت چلے — ہو کے بیہوش [illegible]

یہ ہو اس زہرہ جبیں ماہ لقا پر جوبن
صدقے جوتے کے ستاروں پہ ہو سورج کی کرن

جاں فزا ہو دم رفتار صدائے خلخال — وضع مستانہ ہو اور اس پہ ہو ناز کی چال

رکھ کے سر پاؤں پر اس شوخ کے ترسا ہو جائے
ناصیہ سائی سے پیشانی میں گھٹا ہو جائے

غنچۂ باغ عدم اس کی ہو تنگیٔ دہاں
لعل ہوں ہونٹ تو ہیرے کی کنی ہوں دنداں

ہو وے اس نکتۂ موہوم سے قدرت یہ عیاں
ایک بجلی سی چمک جائے اگر ہو خنداں

اس کے اوصاف دہن سن لے اگر کان سے تو
ہاتھ دھو بیٹھے اسی وقت مگر جان سے تو

رشکِ عارض خورشید ہو عارض کی ضیا
خال کا ... سے لے تا بہ حبش ہو شہرا

چاہ غبغب کبھی گر دیکھ لے یوسف اس کا
عمر بھر چاہ محبت میں رہے اس کے پھنسا

سیب جنت سے فزوں سیب زقن ہو اس کا
شعلۂ طور جسے کہیئے بدن ہو اس کا

اس کی گردن کی صراحی اگر آ جائے نظر
ہچکیاں لے لے کے رویا کرے تو شام و سحر

قبہ نور کہیں شانوں کو سب اہل بصر
دیکھتے ہی انہیں تو تھام لے ہاتھوں سے جگر

سینہ بھرا ہوا وہ دیکھ کے حسرت ہو وے
آپ ہی اپنے سے دل میں تجھے نفرت ہو وے

کان ہوں اس مہ انور کے کہ جیسے گل تر
اور بناگوش کے ہو نور پہ قربان سحر

بجلیاں پہنے ہوئے کانوں میں ہو وہ دلبر
اور جھمکے بھی ہوں پڑے موڈھوں پیچھے (؟)

ہووے وہ زلف کہ دیکھے سے پریشاں ہو تو
اپنی ان باتوں سے کہا کیا نہ پشیمان ہو تو

ساعد دست نگاریں کا ہو ایسا جوبن
ڈھالے بلور کی جیسے کہ کوئی شاخ سمن

پہنچیاں پہنچے پہ ہوں بازووں پر ہوں جوشن
پنجۂ مہر جلے دیکھ کے پنجے کی پھبن

دیکھ اس دست حنائی کو پسے دل تیرا
پنجشاخہ بنے پنجہ سر محفل تیرا

چھاتیاں ابھری ہوئی اور وہ جوانی کی بہار
جس پہ بن دیکھے ہو نا محرموں کی جان نثار

ایسے پستاں ہوں ترنج شجر قامت یار
کھٹے ہو جائیں جسے دیکھ کے جنت کے انار

کچھ جھلکتے جو دوپٹے کی تو تہ سے دیکھے
چھاتی بھر آئے یہ حسرت کی نگہ سے دیکھے

روٹھ جاویں جو لگے دیر مجھے محفل میں
منتیں کرکے مناؤں انھیں اک مشکل میں

جی میں آتا ہے کہ ملنے سے قسم کھاؤں ترے　　ہوئے بت خانہ میں تو بھی نہ گھر آؤں ترے
سوتے میں بھی نہ کروں گھر کی طرف پاؤں ترے　　ہے یہی شرط [illegible] ابھی لاؤں ترے
دم پھڑک جائے گا واللہ جو وہ آئیں گے
منہ چھپا لیویں گے جو شکل اپنی وہ دکھلائیں گے

تم نے پھر [illegible] کیا اس سے کیا　　مجھ سا عاشق نہیں ملنے کا نہیں ملنے کا
سنتے ہی وقت [illegible]　　دی دغا تو نے [illegible]
ابھی سے [illegible] اس ماہ لقا کو جا کر
[illegible] تو یاں لاکر

کچھ نہیں [illegible] آ گیا ان [illegible]　　[illegible] کا گھر میں آنا
وہ بھی [illegible]　　[illegible]
[illegible]
[illegible] انجام کرو

چاہیے آدمی ہر روز تمھارے آویں　　[illegible] پیغام زبانی لاویں
[illegible] گھڑی [illegible]　　میری جان [illegible] پاویں
[illegible]
[illegible] تم آپ سے [illegible]

[illegible] محبت [illegible]　　آپ مشہور [illegible] ستم پرور ہوں
دوست [illegible]　　آپ سے [illegible]
نہ تو ہم [illegible] اغیار [illegible]
[illegible] جلوہ [illegible]

حسن [illegible] پہ اتنا نہ کرو دل میں غرور　　اک [illegible] دنیا میں نہیں غیرت حور
[illegible] عشق [illegible]　　[illegible] ہو چکا [illegible] اب [illegible]
آپ کے سر کی قسم خوب ہی پچھتاؤ گے تم
دیکھ لینا کہ یہ ساعت نہیں پھر پاؤ گے تم

پاؤں وہ ناز سے جس جا پہ رکھے بدر کمال خاک اس جا کی لے جائے پری آنکھ میں ڈال

اتفاقاً کہیں وہ نقش قدم دیکھو تم
آئینہ پھر نہ کبھی تا بہ عدم دیکھو تم

ہو وہ تقریر کہ دیکھا کرو چہرہ اس کا سامنے اس کے نہ جائے کبھی تم سے بولا
سینکڑوں پھبتیاں تم پر کہے وہ نام خدا دیکھ کھسیانا تمھیں کیا ہی ہمیں آئے مزا

چھیڑے ایسا تمھیں ہنس ہنس کے کہ رونے لگ جاؤ
آؤ غیرت پہ تو پھر جان کو کھونے لگ جاؤ

غمزہ و ناز و کرشمہ و ادا میں انداز موقع موقع سے ہو ہر عضو بدن کے انداز
چشم ہو نرگس جادو لب میگوں اعجاز ہووے دلچسپ مزا میرے سے افزوں آواز

اس کی آواز خوش آہنگ سناؤں تجھ کو
ہو کے سرگرم سخن اس سے جلاؤں تجھ کو

میلے ٹھیلے ہوں سدا اور سدا ہووے بہار رکھ میں وہ بیٹھے ہوں اور گھونگٹ سے ہم [illegible]
اک پردے سے ہمیں جھانکتے جاویں ہر بار ہوں اشاروں میں وہ باتیں نہ سمجھیں اغیار

دیکھ یہ رابطہ باہم سینہ ترا چھن جاوے
جی یہ چاہے ہے کہ کسی طرح سے یہ بن جاوے

مجھ میں اور اس میں یہ کچھ رابطہ وفا ہو باہم دوسرے نام کا عاشق ہو [illegible] ہم دم
رنجش تفرقہ پرداز نہ اغیار کا غم دونوں بر بنائے ناب محبت میں بہم

اس کو لپٹا کے گلے لطف اٹھاؤں کیا کیا
کوفت جو دل نے اٹھائی ہے مٹاؤں کیا کیا

باغ میں ساتھ کبھی اپنے اسے لے جاؤں نغمۂ بلبل و طوطی میں اسے سنواؤں
فرش گل کو بچھا کے خیاباں میں اسے بٹھلاؤں لب جو بادۂ گلرنگ اسے پلواؤں

باہم ایسا ہی دو آتشہ کا دور چلے
گھر میں تو آتش اندوہ میں گھٹ گھٹ کے جلے

بزم احباب میں جاؤں جو بتقریب کہیں آدمی سا نظر [illegible] حیوان کا یہ [illegible] نہیں
خاندان پانوں کا پھر دوسرا بیٹھے وہیں دو گھڑی میں یہ پیام آئے کہ رہو شب کو وہیں

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

نیاز احمد ہوش اور ان کا کلام

آپ نواب حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے شجرۂ نسب یہ ہے - نیاز احمد خاں ابن نیاز محمد خاں ابن یار محمد خاں ابن محمد یار خاں ابن نواب حافظ رحمت خاں - آپ ایک جامع العلوم انسان تھے - کلیات ہوش کے مقدمہ نگار نے لکھا ہے۔

"فن شاعری میں طاق ، علم حکمت میں شہرۂ آفاق ، علم ہیئت و ہندسہ میں مشہور - ہر ذی شعور ان کی ذہانت اور طباعی کا قائل ، ہر اہل کمال ان کے کمال بے زوال پر نازاں - غرض کہ کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں جناب کو دست قدرت نہ تھی - کوئی ایسا علم نہ تھا جس میں تمام و کمال واقفیت نہ تھی - بہت سے شاگرد ان کے صاحب دیوان ہیں "

آپ نے فارسی زبان و ادب کی تحصیل امیرالدین آزاد بریلوی سے کی - دیگر کتب درسیہ مختلف علما سے پڑھیں - فن طب حکیم مولوی محمد ابراہیم لکھنوی سے حاصل کیا - شاعری سے دلچسپی کم عمری سے تھی - اس وقت مقامی اساتذہ میں امیرالدین آزاد اور محسن علی خاں جوش کا شہرہ تھا - لہذا ابتداً آپ نے ان اساتذہ سے اکتساب فیض کیا - آپ جب لکھنؤ تشریف لے گئے تو مظفر علی خاں اسیر کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامی ایام میں بریلی پر بھی مصائب کے پہاڑ ٹوٹے تھے - مسلسل تین دن لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا - نیاز احمد خاں ہوش بھی ان حالات سے متاثر ہوئے اور بریلی کے باہر قدم نکالا - ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں گھومتے رہے حیدرآباد بھی پہنچے - وہاں انھوں نے چار یادگار قصائد لکھے جو نواب آصف جاہ میر محبوب علی خاں والی حیدرآباد دکن ، نواب میر لائق علی خاں بہادر مدارالمہام سرکار حیدرآباد ، نواب محمد مظہرالدین خاں رفعت جنگ ، وزیر و مدارالمہام سرکار دکن اور جناب میر علی صاحب شوستری اخوند حضور در دربار آصفی حیدرآباد کی مدح میں تھے - یہ اپنی ادبی تاریخی حیثیت سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں -

نیاز احمد خاں ہوش کی ان تصنیفات کا پتہ چلتا ہے ۔

(۱) تاریخ روہیلکھنڈ - یہ کتاب روہیلوں کی ہندوستان میں آمد اور ان کے مختصر دور حکومت پر مستند دستاویز ہے طبع ہو چکی

بسکہ ہوں اہل وفا اور اٹھائے ہیں ستم — دل لگی کرنے سے آیا ہے مرا ناک میں دم
تجھ سوا اور سے چاہت کی بھی کھاتا ہوں قسم — تجھ سا شاعر بھی ملے گا کوئی اس وقت میں کم
کوئی مضمون نیا ڈھونڈ کے ایسا لاؤں
جو بلائے تجھے گھر بیٹھے بلائے جاؤں
ہے یہی تم کو مناسب کہ ابھی مل جاؤ — کھینچ دوں تم کو سواری جو اگر فرماؤ
رنج بے جا کی شکایت نہ زباں پر لاؤ — جس طرح آتے تھے گھر اپنا سمجھ کر آؤ
پھر ہو شہر دوبارہ مری چاہت ہووے
وہی تم ہو وہی گھر ہو وہی راحت ہووے

سلسلہ تیری زلف کا ہو جائے دراز کاکل حور کی آنے کو اگر ہو شامت
جبہ صاف نہیں نصف مہ چاردہ ہے جس سے اک نکتہ کی روشن ہوئی کل ہیئت
یعنی جو سات کواکب ہیں فلک پر ممتاز زیر حکم اس کے رہا کرتے ہیں وہ ہر ساعت
قاب قوسین کی تفسیر ہیں دونوں ابرو خط قوسی مہ نو کو کریں ادنیٰ ہے صفت
رو برو ان کے جھکتے کیوں نہ ہلال گردوں اوج پر جو رہیں معراج نبی کی صورت
کان وہ کان جواہر ہیں کہ دیکھے نہ سنے جن کی امکان بشر سے کہیں خارج ہے صفت
ان کی آنکھیں ہیں کہ دو ساغر صہبائے نشاط دیکھ لے ہم تو اٹھے تن میں کیا کیفیت
پردۂ چشم کے ہونے میں یہی پردہ ہے کہ یہ مردم نظر بد سے بچیں ہو شہرت
خال سے آنکھ کا کس طرح نہ ہو حسن ہزار عین نقطے سے کہے غین کی پیدا صورت
ڈال دے عین عنایت کی نظر وہ جس پر گردش چشم فلک سے ہو اسے کیا وحشت
رخ پہ اس وجہ سے بینی ہے الف کی تمثال تا ہر قرآں سے یکتائی کی پیدا حجت
سامنے اس کے گل تر نکالے کیا رنگ نسر طائر بھی فدا جس پہ ہو بلبل کی صفت
سبزۂ خط کا کب آغاز ہے رخساروں پر چاندنی کا یہ ہرا کھیت ہوا بے محنت
متصل رخ کے نہ کس طرح ذقن ہو اس کا چاہ کو ہوتی ہے گلزار سے اکثر قربت
لب جاں بخش کی جنبش سے یہ پیدا ہے صدا اے مسیحائے فلک یہ ہیں شفا کی آیت
آب و تاب در دنداں سے ہوا یہ روشن کہ یہ خورشید صباحت کا ہے نجم قسمت
دیکھ لے چشمۂ حیواں جو دہن کو اس کے وہیں گڑ جائے زمیں میں ہو یہ حاصل خجلت
باہم جب ایک جگہ جمع حیات اور عدم منطقی کیوں نہ ہوں پھر قائل تیر قدرت
سامنے اس کے بنے مصر لبوں سے ایک نبات کہیں گھبرا کے خجالت کے عرق کو شربت
کہتی ہے اہل تماشا سے زبان شیریں ہے مرے دم سے کلام نمکیں کی لذت
گو نئی بات ہے شکر سے نمک ہے پیدا پستہ ہی میں ہو کس طرح کلام و صحبت
شال کشمیر کے دو پھول ہیں نعلیں اس کی خلد کا نور ہوا دیکھ کے جن کی نزہت
سیم خالص سے بھرے جب رہیں بازو اس کے کیوں نہ ہو قوت بازو سے فزوں دولت
دم میں تاروں کے خزانے کو لٹا دیں وہ ہاتھ طے کریں صورت حاتم وہ سخا کی ساحت
انگلیاں پنجہ خور ہی کو نہیں پھیرتی ہیں ہاتھ آتا انساں سے یہ پنجۂ مرجاں بھی دیت

ہے ۔ اب کمیاب ہے ۔

(۲) مثنوی ترانۂ ہوش ۔ یہ کتاب بھی طبع ہو چکی ہے مگر نایاب ہے ۔

(۳) حدیقۂ نعت ۔ ایضاً

(۴) کلیات ہوش ۔ یہ ہوش کا مجموعہ کلام ہے ۔ یہ کتاب ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں مطبع گلشن فیض لکھنؤ میں طبع ہو کر اشاعت پذیر ہوئی ۔ مرتب نواب نثار احمد خاں ہیں جو روہیلہ خاندان کے ادب نواز بزرگ تھے اور ہوش کے خلف اکبر ۔

(۵) شہادت نامہ بے نظیر
(۶) فسانۂ غرائب
(۷) واسوخت ہوش

} یہ کتب زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں ۔ اب نایاب ہیں ۔

نیاز احمد خاں ہوش کے اہتمام سے ایک رسالہ "گلدستہ ہوش افزا" بھی نکلتا تھا ۔ اس کی طباعت مطبع نظامی کانپور میں ہوتی تھی ۔ اس کا بھی کوئی نسخہ فراہم نہیں ہو سکا ۔

کلیات ہوش فارسی و اردو غزلیات، اردو قصائد، مسبعات اور نعت و منقبت پر مشتمل ہے ۔ قطعات تاریخ اور چند صفحات نثر کے بھی ملتے ہیں ۔

نیاز احمد خاں ہوش کئی خصوصیات کے حامل شاعر ہیں جن کی وجہ سے بریلی کی ادبی تاریخ میں انھیں ممتاز جگہ ملتی رہے ۔ وہ قصیدہ نگار ہیں ۔ بریلی میں قصیدہ نگاری نمایاں نظر آتی ہے ۔ ۔ ۔ جب تک بریلی میں نوابی قائم رہی، بیرونی ۔ ۔ ۔ شعرا کا مجمع رہا اور وہ درباروں میں قصیدے پڑھتے رہے ۔ ۔ ۔ نوابی ختم ہوئی اور ۔ ۔ ۔ امرا اور شعرائے بیرونجات نے وطن عزیز کو خیرباد کہا تو شاعری کو کچھ وقت کے لیے دھکا لگا اور قصیدہ نگاری ۔ ۔ ۔ ہی ختم ہو گیا ۔ قصیدہ تو نوابوں اور امرا کے درباروں اور ڈیوڑھیوں سے وابستہ ہے ۔ اس کا مقصد تو دربار ۔ ۔ ۔ کا رد ۔ ۔ ۔ قائم تھا ۔ ۔ ۔ بریلی میں نہ دربار رہا اور نہ دربار داری ۔ قصیدہ نویسی معدوم سی ہو گئی ۔ ہوش خود صاحب دربار تھے ۔ مگر زمانہ کی گردش ۔ ۔ ۔ درمیان کی مدح سرائی پر مجبور کیا ۔ انھوں نے چار قصائد حیدرآباد میں لکھے ہیں کا ۔ ۔ ۔ ذکر کر آیا ہوں ۔ تین قصائد مزید ملتے ہیں ۔ ایک نعت رسول ۔ ۔ ۔ میں ۔ دوم منقبت علی کرم اللہ وجہہ میں ۔ سوم مدحت سبط رسول حضرت امام حسین شہید کربلا میں ۔

ہوش کے قصائد میں ۔ ۔ ۔ اور خوش ۔ ۔ ۔ کا ماحول ۔ ۔ ۔ ہے ۔ ان کے قصائد رفعت تخیل اور پرشکوہ مضامین و الفاظ ۔ ۔ ۔ اور گرانباری سے محفوظ ہیں ۔ زبان میں لطف اور ادائیگی میں روانی ہے ۔ مندرجہ ذیل اشعار ۔ ۔ ۔ علی ۔ ۔ ۔ کا ۔ ۔ ۔ ہیں ۔

اس کے گیسو ۔ ۔ ۔ نایاب ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے ابرو ہیں کہ محراب حریم طاعت

قصرِ مقصود کو ڈھا دیتی ہے اکثر عجلت
قولِ یوسف تھا کہ میں زیرِ محل جاؤں گا

دل ہے لبریزِ مئے عشق سے پیشِ داور
یہی شیشہ لیے میں زیرِ بغل جاؤں گا

پیکرِ سنگِ جفا سے جو وہ سمجھیں گے خدا
پھر تو میں رنگ کے مانند بدل جاؤں گا

ناتوانی نے بنایا ہے ہوا اسے درباں
میں تو دیوار کے روزن سے نکل جاؤں گا

ہے سلامت جو مرا داغِ جگر کیا غم ہے
ساتھ مرقد میں لیے میں یہ کنول جاؤں گا

ہے خطا زلفِ سیہ فام کی مدحت کرنا
کہاں سودا ہے کہ ہمرہ کے غزل جاؤں گا

باغ کیوں سبز دکھاتے ہو مرا ہوشؔ ہے نام
کچھ میں نادان نہیں ہوں جو بہل جاؤں گا

مندرجہ ذیل غزلوں میں خارجیت کی اتفاقی اسیری بھی ملتی ہے جو بالیقین عصری حالات، دادخواہی یا زورِ بیان کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

وصفِ کمر کیا تو یہ بول اٹھے موشگاف
ہم مانتے ہیں اس سخن لاجواب کو

لے ناتواں کی جان پیازی دوپٹہ جب
کافی نہ کیوں کفن کو ہو چھلکا پیاز کا

ہنسے گا باغ میں گل یوں جو بلبل
گرہ کھل جائے گی بندِ قبا کی

بزرگ شاعروں کی حیات میں ایک ایسا دورِ شاعری ضرور آتا ہے جب کہ ان کی شاعری کھنچ کر تلوار بن جاتی ہے۔ اس وقت وہ تقلیدِ غیر اور تشخصِ خویش کے خول سے نکل کر ایک نئے وجود کو جنم دیتے ہیں جو دراصل ان کا اپنا ہی وجود ہوتا ہے اس وجود کا نور ان کے فن کا حاصل ہوتا ہے۔ اس نور سے ہی آنے والی نسلیں ان کے فن کو پہچانتی ہیں۔ یہ فن ادب کی تاریخ میں ایک مستقل علامت بن جاتا ہے۔ نیاز احمد خاں ہوشؔ نے بھی ایک وجود کو جنم دیا تھا جس کے نور سے ان کی غزل بامعنی حاصلِ خوش انجام نتیجہ اور حلاوت آمیز انعام بنی۔ یہ وہ کلام ہے جو بریلی کی تاریخِ غزل گوئی میں ایک علامت بنا اور جس کے وہ خاتم ٹھہرے۔

ہم چاہتے ہیں اے خمِ گردوں شراب کو
لیں داغ دے کے بھی نہ ترے آفتاب کو

یہ لطف ہے عجیب کہ رکھتا ہے وہ عزیز
شوخی سمجھ کے اپنے مرے اضطراب کو

ثابت ہوا عروج کی ہستی ہے آپ پر
دیکھا جو سربلند جہاں میں حباب کو

پھونکا ہے سوزِ ہجر نے اس ترکِ مست کے
اب صید کیوں کروں نہ میں مرغِ کباب کو

لیتا ہوں میں جو بوسے تو کرتے ہو کیوں شمار
جو دوست ہو تو دل میں رکھو تم حساب کو

آتی نظر ہے جلوۂ بت میں خدا کی شان
پاتے ہیں ہم عذاب میں پنہاں ثواب کو

ناخن تیغ ہلال اس کا ہر اک ناخن ہے
دیکھ لے جو اسے ہو عید کی حاصل فرحت

سینۂ صاف ہے گنجینۂ اسرار خدا
اس کے بندے ہوں نہ کیوں صوفی صافی طینت

پشت وہ تختہ سیمیں ہے ازل تا ابد تک
صاف ہے دہر میں جو پشت پناہ خلقت

موج دریائے بہار اس کا شکم حبب بھرے
ناف پھر غنچۂ گرداب نہ ہو کس صورت

ساق گردوں پہ رکھے فوق جو رہتے ہیں وہ ساق
پھر جو ہو مہر فلک نقش قدم کیا حیرت

خلد تک اس قد موزوں کی اگر بو پہنچے
تو ادب سایۂ طوبیٰ سے کہے قد قامت

تہوش کے قصائد اردو ادب میں اضافہ ہیں ۔

نیاز احمد خاں ہوش کی غزل بھی بریلی کی ادبی تاریخ میں منفرد حیثیت کی مالک ہے ۔ اردو غزل گوئی کا وہ طرز جس کے سودا بانی تھے اور جو ان کے سلسلے کے شعرا کے ذریعے بریلی میں مروج نہیں ہو سکا تھا ، ان کے سلسلۂ تلامذہ کی بریلی میں آخری کڑی نیاز احمد خاں ہوش کے ذریعے اشاعت پذیر ہوا اور ان ہی پر ختم ہو گیا ۔ ہوش کی زبان بھی منجھی ہوئی رواں دواں ہے ورنہ یہ باور کرنا مشکل ہوتا کہ یہ کلام ہوش ہے یا کلام سودا ۔ انھوں نے سودا کی طرح ایک قصیدہ نگار کے دماغ سے پرشکوہ اور پرامید اور شگفتہ غزلیں لکھی ہیں جو بریلی کی تاریخ غزل گوئی میں کسی بھی شاعر نے نہیں لکھیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سودا کی غزل گوئی کا آخری سرا ہوش کے ہاتھ میں ہے ۔

ہر گیسوئے سیاہ صنم تاب دادہ تھا
بالائے سر نہ مانگ تھی پر لوز جادہ تھا

کیا گرم عیش غیر سے وہ شعلہ خو رہا
کیوں آج سوز اپنے جگر میں زیادہ تھا

دیکھا تو خانقاہ سے کم تھا نہ میکدہ
صرف سجود پیشہ سر جام بادہ تھا

گل سارے آب آب تھے اس رخ کے سامنے
رنگ چمن حباب سے ہم رنگ بادہ تھا

مرنے کے بعد ہوش یہ رتبہ مرا بڑھا
میں تھا سوار ساتھ زمانہ پیادہ تھا

دل ناداں نہیں رخ پر جو مچل جاؤں گا
نقش پا ہوں کبھی کوچے سے نہ ٹل جاؤں گا

وہ بلائیں گے تو کیوں سر کے بل جاؤں گا
دیکھے دم تیغ کو مقتل سے نکل جاؤں گا

تیرے دامن کو میں کیوں چھوڑ کے ٹل جاؤں گا
کیا ہوں پیراہن کہنہ کہ نکل جاؤں گا

قطرۂ اشک ہوں دکھلایئے مجھ کو جلوہ
شجر طور نہیں ہوں جو میں جل جاؤں گا

ابھی اٹھ بیٹھوں گا آؤ تو عیادت کے لیے
مرض الموت بھی ہو گا تو سنبھل جاؤں گا

گرم کیوں ہوتے ہو محفل میں مجھے دیکھ کے تم
شمع ساں خود ہی سحر تک میں پگھل جاؤں گا

قصرِ مقصود کو ڈھا دیتی ہے اکثر عجلت
قول یوسف تھا نہ میں زیرِ محل جاؤں گا

دل ہے لبریز مئے عشق سے پیش داور
یہی شیشہ لیے میں زیرِ بغل جاؤں گا

پیکرِ سنگِ جفا سے جو وہ سمجھیں گے خدا
پھر تو میں رنگ کے مانند بدل جاؤں گا

ناتوانی نے بنایا ہے ہوا اسے درباں
میں تو دیوار کے روزن سے نکل جاؤں گا

ہے سلامت جو مرا داغِ جگر کیا غم ہے
ساتھ مرقد میں لیے میں یہ کنول جاؤں گا

ہے خطا زلفِ سیہ فام کی مدحت کرنا
کہاں سودا ہیں کہ بھر کے غزل جاؤں گا

باغ کیوں سبز دکھاتے ہو مرا ہوش ہے نام
کچھ میں نادان نہیں ہوں جو بہل جاؤں گا

مندرجہ ذیل غزلوں میں خارجیت کی اتفاقی اسیری بھی ملتی ہے جو بالیقین عصری حالات، دادخواہی یا زودبیان کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

وصف کمر کیا تو یہ بول اٹھے موشگاف
ہم مانتے ہیں اس سخن لاجواب کو

لے ناتواں کی جان پیازی دوپٹہ جب
کافی نکیوں کفن کو ہو چھلکا پیاز کا

ہنسنے گا باغ میں گل یوں جو بلبل
گرہ کھل جائے گی بند قبا کی

بزرگ شاعروں کی حیات میں ایک ایسا دور شاعری ضرور آتا ہے جب کہ ان کی شاعری کھنچ کر تلوار بن جاتی ہے۔ اس وقت وہ تقلیدِ غیر اور تشخص خولیش کے خول سے نکل کر ایک نئے وجود کو جنم دیتے ہیں جو در اصل ان کا اپنا ہی وجود ہوتا ہے اس وجود کا نور ان کے فن کا حاصل ہوتا ہے۔ اس نور سے ہی آنے والی نسلیں ان کے فن کو پہچانتی ہیں۔ یہ فن ادب کی تاریخ میں ایک مستقل علامت بن جاتا ہے۔ نیاز احمد خاں ہوش نے بھی ایک وجود کو جنم دیا تھا جس کے نور سے ان کی غزل با معنی حاصل، خوش انجام نتیجہ اور حلاوت آمیز انعام بنی۔ یہ وہ کلام ہے جو بریلی کی تاریخ غزل گوئی میں ایک علامت بنا اور جس کے وہ خاتم ٹھہرے۔

ہم چاہتے ہیں اسے خم گردوں تراب کو
لیں داغ دے کے بھی نہ ترے آفتاب کو

یہ لطف ہے عجیب کہ رکھتا ہے وہ عزیز
شوخی سمجھ کے اپنے مرے اضطراب کو

ثابت ہوا عروج کی ہستی ہے آپ پر
دیکھا جو سربلند جہاں میں حباب کو

پھونکا ہے سوزِ ہجر نے اس ترکِ مست کے
اب صید کیوں کروں نہ میں مرغِ کباب کو

لیتا ہوں میں جو بوسے تو کرتے ہو کیوں شمار
جو دوست ہو تو دل میں رکھو تم حساب کو

آتی نظر ہے جلوۂ بت میں خدا کی شان
پاتے ہیں ہم عذاب میں پنہاں ثواب کو

ناخن تیغ ہلال اس کا ہر اک ناخن ہے　　دیکھ لے جو اسے ہو عید کی حاصل فرحت
سینۂ صاف ہے گنجینۂ اسرار خدا　　اس کے بندے ہوں نہ کیوں صوفی صاف طینت
پشت وہ تختہ سیمیں ہے ازل سے اب تک　　صاف ہے دہر میں جو پشت پناہ خلقت
موج دریائے بہار اس کا شکم حبب ٹھہرے　　ناف پھر غنچہ گرداب نہ ہو کس صورت
ساق گردوں پہ رکھے فوق جو رکھتے ہیں وہ ساق　　پھر جو ہو مہر فلک نقش قدم کیا حیرت
خلد تک اس قد موزوں کی اگر بو پہنچے　　تو ادب سایۂ طوبیٰ سے کہے قد قامت

ہوش کے قصائد اردو ادب میں اضافہ ہیں ۔

نیاز احمد خاں ہوش کی غزل بھی بریلی کی ادبی تاریخ میں منفرد حیثیت کی مالک ہے ۔ اردو غزل گوئی کا وہ طرز جس کے سودا بانی تھے اور جو ان کے سلسلے کے شعرا کے ذریعے بریلی میں مروج نہیں ہو سکا تھا ، ان کے سلسلۂ تلامذہ کی بریلی میں آخری کڑی نیاز احمد خاں ہوش کے ذریعے اشاعت پذیر ہوا اور ان پر ہی ختم ہو گیا ۔ ہوش کی زبان منجھی منجھائی رواں دواں ہے ورنہ یہ باور کرنا مشکل ہوتا کہ یہ کلام ہوش ہے یا کلام سودا ۔ انھوں نے سودا کی طرح ، ایک قصیدہ نگار کے دماغ سے ، پُر شکوہ اور پُر امید اور شگفتہ غزلیں لکھی ہیں جو بریلی کی تاریخ غزل گوئی میں کسی بھی شاعر نے نہیں لکھیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سودا کی غزل گوئی کا آخری سرا ہوش کے ہاتھ میں ہے ۔

بر گیسوئے سیاہ صنم تاب دادہ تھا　　بالائے سر نہ مانگ تھی پر لوز جادہ تھا
کیا گرم عیش غیر سے وہ شعلہ خو رہا　　کیوں آج سوز اپنے جگر میں زیادہ تھا
دیکھا تو خانقاہ سے کم تھا نہ میکدہ　　مرغ سجود پیشہ سر جام بادہ تھا
گل سارے آب آب تھے اس رخ کے سامنے　　رنگ چمن حباب سے ہم رنگ بادہ تھا

مرنے کے بعد ہوش یہ رتبہ مرا بھرا
میں تھا سوار ساتھ زمانہ پیادہ تھا

دل ناداں نہیں رخ پر جو مچل جاؤں گا　　نقش پا ہوں کبھی کوچے سے نہ ٹل جاؤں گا
وہ بلائیں گے تو کیوں سر کے نہ بل جاؤں گا　　دیکھیے دم تیغ کو مقتل سے نکل جاؤں گا
تیرے دامن کو میں کیوں چھوڑ کے ٹل جاؤں گا　　کیا ہوں پیراہن کہنہ کہ نکل جاؤں گا
قطرۂ اشک ہوں دکھلائیے مجھ کو جلوہ　　شجر طور نہیں ہوں جو میں جل جاؤں گا
ابھی اٹھ بیٹھوں گا آؤ تو عیادت کے لیے　　مرض الموت بھی ہوگا تو سنبھل جاؤں گا
گرم کیوں ہوتے ہو محفل میں مجھے دیکھ کے تم　　شمع ساں خود ہی سحر تک میں پگھل جاؤں گا

ابوسلمان شاہجہانپوری

سرسید احمد خاں

مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں

(۱)

قدیم خیال کے علماء میں سرسید احمد خاں اور ان کے افکار و عقائد کو پسند نہیں کیا گیا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ علماء کا ایک گروہ انھیں دائرۂ اسلام سے خارج ہی سمجھتا رہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ایسے ہی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد خوش عقیدہ اور روایت پسند بزرگ تھے اور قدیم خیالی کے علماء کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس ماحول میں سرسید سے عقیدت تو دور کی بات ہے، ان کے بارے میں کسی اچھی رائے کا گمان بھی نہیں کیا جانا چاہیئے تھا۔ ان حالات میں سرسید کی کتابوں کے مطالعے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اردو زبان و ادب کے کسی شیدائی کے لیے سرسید کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ان کے بعض مذہبی خیالات سے متاثر نہ ہو لیکن اردو زبان و ادب کے بارے میں ان کی خدمات کا اعتراف کیے بغیر ہرگز چارہ نہیں۔

ٹھیک یہی صورت مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ پیش آئی۔ مولانا کو اردو زبان و ادب کا شوق ہوا اور اردو مصنفین کی کتب کے مطالعے کی طرف توجہ ہوئی تو سرسید کی بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی نظر سے گزریں۔ ان سے ان کی دیگر تصنیفات کا شوق ہوا اور بقول مولانا آزاد :-

"اس طرح میری زندگی کے ایک بہت بڑے فکری تغیر کی بنیاد پڑی"

مولانا نے رفتہ رفتہ سرسید کی تمام تصنیفات، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار اور تہذیب الاخلاق

نوٹ :— اس مضمون کے ابتدائی حصے کے تمام مطالب و اقتباسات "مولانا آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" بہ روایت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے ماخوذ ہیں اور مضمون کے حصہ ثانی کی تیاری میں مولانا آزاد کے خطبہ تقسیم اسناد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲۰ فروری ۱۹۴۹ء) سے مدد لی گئی ہے۔ اس لیے دونوں ماخذ کا بار بار تذکرہ اور حوالے دہرانا مناسب معلوم نہیں ہوا۔ (ابوسلمان)

نفرت ہمیں ہوا در وہ بت چاہیے اے فلک　　　اللہ ہے جو دیکھ لیں اس انقلاب کو
چلنے میں جب وہ دوہرے ہوئے آئی یہ صدا　　　نخوت نے لو ہلال کیا آفتاب کو
دیکھو سرِ زمیں نہ عیاں مہر حشر ہو　　　چہرے سے اپنے تم نہ اٹھاؤ نقاب کو
وصفِ کمر کیا تو یہ بول اٹھے موشگاف　　　ہم مانتے ہیں اس سخن لاجواب کو

سرمہ بناؤں دیدۂ دل کے لیے نہ کیوں
پاؤں جو ہوشؔ خاکِ درِ بوتراب کو

پہنچیں گے حشر کے دن دولت دیدار کو ہم　　　کہتے ہیں مہرِ قیامت ترے رخسار کو ہم
زار ہیں تارِ نظر بن کے نکل جائیں گے　　　در سمجھتے ہیں ترے روزنِ دیوار کو ہم
خواب میں دیکھ لیا رات اسے اب اے چشم　　　عمر بھر دیں گے دعا طالعِ بیدار کو ہم
دشت میں آبلۂ پا سے نہیں خون رواں　　　خلعتِ سرخ پنھاتے ہیں ہر اک خار کو ہم
اے فلک رکھتے تھے یا سر پہ ہمیشہ دستار　　　یا جنوں میں ہوئے محتاج اب اک تار کو ہم
ہے تصور جو ترے چاند سے رخساروں کا　　　کہتے ہیں اس سے شب ماہ شب تار کو ہم

دیکھنا ایک دن اے ہوشؔ کہ اس رونے سے
کرۂ آب کریں گے کرۂ نار کو ہم

نیاز احمد خاں ہوشؔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰ جون ۱۹۰۲ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ خاندان روہیلہ کے وہ آخری سربرآوردہ شاعر تھے۔ ان پر خاندان روہیلہ کی تقریباً ڈیڑھ صدی کی ادبی خدمت کا خاتمہ ہوتا ہے۔

منسوب ہو میرے قلب و ذہن کے لیے بمنزلہ معبود تھی ۔" اور ایک مقام پر سرسید سے تاثر اور انقلاب افکار و عقائد کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

"سرسید کی تصنیفات جب نظر سے گزریں تو بالکل ایک نئی دنیا نظر کے سامنے آگئی ....نئے عالم کی دل فریبیوں نے مسحور کر لیا اور جوں جوں آگے بڑھا یہ سحر بھی بڑھتا گیا ۔ حتیٰ کہ اب ایک مسمریزم کے معمول کی طرح میری دماغی فعالیت کا بالکل عامل کے قبضے میں تھی ۔ تقریباً چھ مہینے کے اندر میں نے سرسید کی تمام کتابیں دیکھ ڈالیں اور اچانک ایسا معلوم ہوا کہ ایک بے حد عجیب و مدہش اور بلند تر پُرعظمت عالم میں آگئے ہیں ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بالکل ایک مخمور دماغ کی سی حالت رہنے لگی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک عجیب و غریب خزانہ قبضے میں آگیا ہے ۔ اس پر فخر تھا، غرور تھا اور اس کے سامنے فکر و عقائد کی پچھلی تمام باتیں ہیچ نظر آتی تھیں ۔ میں نے "ہیچ" کہا لیکن یہ بھی ابتدائی احساس تھا ۔ بعد کو یوں ہوا کہ حقارت کی جگہ ان کی ذلت کا احساس ہونے لگا ۔ اس خیال سے شرم محسوس ہوتی تھی کہ کچھ مہینے پہلے میرے ایسے عقائد تھے اور تعجب ہوتا تھا کہ کیوں ایسے دقائق سے اب تک محروم رہا ۔ اب معاملہ "تقلید و عدم تقلید، وہابیت و حنفیت سے گزر چکا تھا اور ایک ایسی بلندی پر اپنی جگہ محسوس ہوتی تھی، جہاں سے یہ تمام جماعتیں، یہ تمام عقائد و افکار اور یہ تمام جھگڑے بالکل حقیر دکھائی دیتے تھے ۔ خواہ حنفی ہوں، خواہ غیر مقلد، شیعہ ہوں یا سنی، ماتریدی ہوں یا اشعری" ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ کہ کوئی بھی اسلام کی اصلی حقیقت یا سرسید کی اصطلاح میں "ٹھیٹ اسلام" سے آشنا نہیں ۔ قرآن کے اصل حقائق و معارف اور مذہب کی اصل تعلیمات تو وہ ہیں جن کے چہرے پر سے تیرہ سو برس بعد اس مجدد اعظم (جیسا کہ میری اس وقت کی بول چال تھی یعنی سرسید) نے پردہ ہٹایا ہے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں : ۔

"میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ اس زمانے کی دماغی سرشاری اور قلبی مخموری کی پوری تصویر کھینچ سکوں ۔ میں ایک بت کی طرح سرسید کی پوجا کرتا تھا ۔ ان کی عظمت میرے دل کے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی ۔ ان کا وجود میرے ذہن میں فضائل انسانی کا ایک مکمل نمونہ تھا، جس کی طرف ایک شائبہ نقص بھی منسوب نہیں کیا جاسکتا تھا ۔ بارہا حسرت ہوتی تھی کہ "یا لیتنی کنت معہ" ! میں سوچا کرتا تھا کہ اگر اس وقت وہ موجود ہوتے تو میں کس طرح تمام علائق ترک کرکے ان کے پاس چلا جاتا اور کس طرح ان کی پرستش کرتا ۔"

سرسید کی تفسیر القرآن، تہذیب الاخلاق اور دیگر کتب و رسائل کی عبارتیں اور مباحث مولانا کو تقریباً حفظ ہو گئے تھے اور بحث و مباحثہ میں انھیں پیش کرتے تھے ۔ سرسید سے سب سے بڑی چیز جو مولانا کو ملی وہ "ترک تقلید" تھی ۔ مفسرین کی، فقہا کی، محدثین کی، متکلمین کی، علما کی غرض کہ تیرہ سو برس کے تمام اجماعی عقائد و مسلمات کی اب ان کی نظروں میں کوئی حیثیت نہ

کی تمام جلدیں منگوائیں — اور پھر اس شوق نے ارادت وعقیدت کی شکل اختیار کرلی۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"سرسید کی تصنیفات کا شوق بتدریج اس طرح دل و دماغ پر چھا گیا کہ اب کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے سامنے آنکھوں میں نہیں جچتی تھی۔ شوق نے ارادت وعقیدت کی شکل اختیار کرلی اور یہ ہوا کہ ایک عقیدت مند کی طرح جو اپنے شیخ و مرشد کے ملفوظات کے ایک ایک لفظ کو دل و جان دے کر خرید لینا چاہے،۔ ان کی تصنیفات کا ہر صفحہ، ہر ورق میں نے نہایت جدوجہد کرکے حاصل کیا۔ سرسید کی تصنیفات کا شوق نہیں بلکہ ان سے عشق ہوگیا تھا اور طبیعت کو اس تصور سے بھی صدمہ ہوتا تھا کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ ہے اور وہ میرے پاس نہیں ہے۔"

اس زمانے میں سرسید کی کتابوں کے شوق اور مطالعے کی محویت کا یہ عالم تھا کہ رات کے دو دو تین تین بجے تک مولانا مطالعہ کرتے تھے۔ دن میں چونکہ درسیات کی مشغولیت اور کچھ والد صاحب کے خوف کی وجہ سے اس بات کا موقع نہ ملتا تھا کہ کسی غیر درسی کتاب کا مطالعہ کریں۔ ان کے والد مولانا خیرالدین اس بات کے سخت خلاف تھے کہ دوران تعلیم میں درسیات کے علاوہ تصنیف و تالیف کی مشغولیت اختیار کی جائے یا کسی اور کتاب کے مطالعے میں وقت صرف کیا جائے۔ خوف کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا کو سرسید کی کتابوں کے مطالعے کی اجازت ملنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے رات کو جب سب گھر والے سونے کے لیے لیٹ جاتے تو مولانا آزاد تکیے کے نیچے سے سرسید کی کوئی کتاب نکالتے اور موم بتی جلا کر مطالعے میں مستغرق ہو جاتے۔ رمضان کا مہینہ تھا، عشا کے بعد مطالعہ شروع کرتے اور ڈھائی بجے جب ماما سحری کے لیے اٹھانے آتی تو ختم کرتے۔ اس زمانے کا ایک واقعہ مولانا نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ رات کا ایک بجا ہوگا، موم بتی ٹمٹما رہی تھی اور مولانا تکیے پر دونوں کہنیاں رکھے مطالعے میں غرق تھے کہ ان کے والد سامنے صحن سے گزرے اور انھیں مطالعے میں منہمک دیکھ کر وہیں سے پکارا کہ رات کے وقت کیا دیکھ رہے ہو؟ کون سی کتاب ہے؟ مولانا فرماتے ہیں کہ "مجھے اپنی یہ چالاکی اور حیلہ جوئی اب تک یاد ہے کہ میرے سرہانے مختصر المعانی بھی تھی، فوراً کہہ دیا کہ مختصر المعانی۔"

انھی دنوں مولانا نے رحمت اللہ رعد کی جنتری میں "حیات جاوید" کی طباعت کے قریب الاختتام ہونے کا ذکر چھپا ہوا دیکھا تھا اور اس کے حصول کے لیے بے تاب ہو گئے تھے۔ مولانا نے تفصیل کے ساتھ اپنی بے تابی اور اس کے حصول کی خوشی کا تذکرہ کیا ہے۔ ہزار ایک صفحے کی کتاب تھی صرف دو راتوں میں پوری کتاب پڑھ ڈالی اور جب تک کتاب ختم نہیں ہوگئی چین نہیں پڑا۔ شوقِ مطالعہ کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مولانا نے اس روز شام کا کھانا بھی اس خوف سے نہیں کھایا کہ اتنی دیر اس کے مطالعے سے محروم رہ جائیں گے۔

سرسید کی کتابوں کے مطالعے سے مولانا کے افکار وعقائد میں بھی ایک طوفان اٹھ چکا تھا۔ مولانا کے الفاظ ہیں کہ "میری زندگی اب چل نہیں رہی تھی، بہہ رہی تھی، تمام قدیم چیزیں حقیر و ذلیل ہو چکی تھیں .... اور ہر وہ چیز جو ان کی طرف

"اس وقت مجھ پر یہ دونوں ریویو بہت شاق گزرے اور ایسا محسوس ہوا کہ گویا ایک بہت بڑی جناب میں گستاخی کی گئی ہے۔"

چنانچہ جب مولانا نے لسان الصدق جاری کیا تو اس میں حیات جاوید پر ریویو کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اور اس میں مذکورہ دونوں تنقیدوں کا بڑے جوش و خروش سے جواب لکھا۔ لسان الصدق مولانا حالی مرحوم کے پاس بھی جاتا تھا انھوں نے یہ ریویو پسند کیا اور مولانا کی ہمت افزائی کی۔ حیات جاوید پر اعتراضات و جوابات کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:-

"اعتراضات جو اس وقت کیے گئے تھے وہ زیادہ تر دو قسم کے تھے۔ کتاب کی ادبی حیثیت پر اور مذہبی مباحث پر۔ ادبی حیثیت سے انگریزی الفاظ کی کثرت استعمال پر مخزن نے نکتہ چینی کی تھی اور کتاب کے بعض حصوں کی عبارت ادبی درجے سے گھٹی ہوئی بتلائی تھی۔ جس کی ایک ایسے مصنف سے توقع ہونی چاہیئے تھی۔ مذہبی اعتراض یہ تھا کہ سرسید کے مذہبی اجتہادات کی مدح سرائی میں محض طرف داری اور مقلدانہ جذبے سے کام کیا گیا ہے۔ حق نقد ادا نہیں کیا گیا۔ یہ دونوں اعتراض صحیح تھے۔ لیکن میں نے اپنے جوش عقیدت میں ان دونوں کا رد کیا اور چند مقامات، جہاں بعض شرعی تاویلات سے مصنف نے دبا ہوا سا اختلاف کیا ہے یا اختلاف سرسید و محسن الملک میں محسن الملک کی تائید کی ہے مثلاً بحث "تعین ذوالقرنین"، استجابت دعا وغیرہ اور جنھیں قطعاً سرسید کے اصول و معتقدات اساسیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے بطور شواہد نقد کے پیش کیا ہے اور ثابت کرنا چاہا کہ مولانا حالی نے بے طرفانہ اور نقادانہ بحث کی ہے۔"

"حیات جاوید" کے بارے میں اس وقت مولانا کی یہ رائے تھی حالانکہ بعد میں وہ خود بھی انہیں نکتہ چینیوں کی صف میں آ شامل ہوئے جن کے رد میں اس وقت انھوں نے پورے جوش و خروش سے کام لیا تھا اور انھیں بھی کہنا پڑا کہ حالی نے سرسید کی محبت اور تقلید کے استغراق میں واقعات و مباحث دونوں میں جو مداحانہ طریقہ اختیار کیا، وہ بالکل کھلا ہوا اور حد درجہ معذرت سے متجاوز ہے۔ اس وقت سرسید کی تقلید اور ان کے مسلک کا استغراق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ عقیدہ بن گیا تھا کہ تمام فرائض اور واجبات شرعیہ کچھ مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی ہیں اور ان کی پابندی سے مقصود ان مصالح و حکم اور فوائد کا حصول ہے اور مذہب کے تشدد و تاکید کی حیثیت صرف عدالتی تنبیہ جیسی ہے۔ جس طرح ایک قانون کو قائم رکھنے کے لیے اور عامۃ الناس میں اس کا رعب داب قائم رکھنے کے لیے تاکید و تشدد کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح اہل مذہب کے تشدد اور تاکیدات ہیں۔ ورنہ فی نفسہ وہ کوئی شے نہیں۔ یہ تمام وسائل ہیں۔ مقصود بہر حال کچھ اور ہی ہے۔

تھی۔ بعد میں مولانا کو خود اس بات پر حیرت تھی، تعجب تھا کہ وہ خود سرسید کی نہ صرف تقلید بلکہ پرستش میں مبتلا تھے۔ اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ سرسید اس سے کیوں مستثنیٰ کیے جائیں۔ سرسید سے انھیں علوم و معارف کا جو خزانہ ملا تھا اس پر نازاں تھے۔ توحید فی الذات، توحید فی الصفات، شرک فی صفت النبوۃ، شرک فی صفت القرآن وغیرہ سرسید کی اصطلاحیں اور ترکیبیں زبان پر چڑھی ہوئی تھیں اور مولانا کا خیال تھا کہ یہ نہایت قیمتی تعلیم ہے جو انھیں سرسید سے ملی ہے۔ مولانا کو سرسید کے مجتہدات کی تعلیم و اذعان میں اس درجہ استغراق اور اس کے نقص و ضعف سے مبرا ہونے پر اس درجہ کامل یقین تھا کہ اس کے شرک فی صفت القرآن ہونے کا شبہ کبھی دل میں نہ پیدا ہوتا تھا۔ سرسید سے مولانا کے کمال عقیدت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ شیخ غلام محمد مالک اخبار وکیل امرتسر سے تعلقات اس بنیاد پر قائم ہو گئے تھے کہ وہ بھی سرسید کے ایک غالی معتقد تھے اور ان کی جس بات نے مولانا کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور اپنا اہل الرائے ہونا ثابت کر دیا، اسے مولانا ہی کی زبانی سنیے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

"... ایک بات یہ بھی تھی کہ ان کا مشرب میں، میں بھی سرسید کی تقلید میں مخمور اور وہ بھی اس وادی میں اور کسی سے کم نہ تھے۔ پہلی مرتبہ جب وہ مجھ سے ملے تو مجھ سے کہا کہ سچ یہ ہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو ان کا (سرسید کا) دماغ تو نبوت کا دماغ تھا۔ میں یہ بات سن کر بہت خوش ہوا۔ گویا یہ رائے دے کر انھوں نے اپنا اہل الرائے ہونا مجھ پر ثابت کر دیا۔"

سرسید سے عقیدت و ارادت کے دور میں مولانا نے سرسید کے اجتہادات، ان کی خدمات، ان کے علم کلام پر ایک کتاب بھی لکھنی شروع کی تھی اور ایک حصہ مکمل بھی کر لیا تھا۔ اس کے ناتمام اوراق، ۱۹۲۱ء تک اس عہد کی یادگار مولانا کے پاس موجود تھے۔ ایک رسالہ حقیقت معجزات کے موضوع پر سرسید کے مسلک اور افکار کے مطابق لکھا تھا اور بمبئی سے حکیم محمد حسن شاہجہاں پوری نے شائع بھی کروا دیا تھا۔

ارادت کا یہ عالم ہو اور عقیدت نے پرستش کی صورت اختیار کر لی ہو تو تنقیص تو درکنار کوئی سنجیدہ اختلاف اور تنقید بھی کیوں کر گوارا کی جا سکتی ہے۔ بقول مولانا "طبیعت میں سرسید کی عقیدت پرستش کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ کوئی آواز جس میں ایک شائبہ اختلاف یا تنقیص ہو طبیعت کو گوارا نہ تھی۔ سرسید مرحوم کے ساتھ ان کا حلقہ، یا اس وقت کی میری اصطلاح کے بموجب "نورتن" بھی اسی درجہ محترم تھا، جس قدر سرسید۔" اسی زمانے میں شیخ عبدالقادر نے "حیات جاوید" پر مخزن میں ایک نقد شائع کیا اور ایک ریویو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے لکھا تھا جو پہلے شاید علی گڑھ گزٹ میں اور پھر ایک رسالے کی شکل میں بھی چھپ گیا تھا۔ شیخ صاحب نے کتاب کی عبارت اور اس کے مطالب دونوں پر چند اعتراض کیے تھے اور مولانا شروانی مرحوم نے کتاب کی ترتیب کی تعریف کی تھی لیکن یہ لکھا تھا کہ سرسید کے مذہبی کاموں کی نسبت بے لاگ رائے نہیں دی گئی ہے۔ خود مولانا کے بیان کے مطابق اعتراضات بہت ہلکے اور دھیمے لہجے میں تھے اور اس کے مقابلے میں گویا کچھ نہ تھے جتنے ہونا چاہیے تھے۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ:-

مذہبی عقائد و ارکان کی بحث ونظر اور اختلافات مشارب کے مطالعہ وتدبر کا نتیجہ یہ نکلا کہ طبیعت میں از سر نو ایک نئے اضطراب کی ابتدا ہو گئی گویا یہ درمیان کا سکون جو سرسید کی تقلید سے پیدا ہو گیا تھا، محض ایک فریب ذہن تھا اور اس کے نیچے دل کا کوئی اطمینان موجود نہ تھا۔"

" جوں ہی مسلک سرسید کی جدت و غرابت کا اثر دھیما پڑا اور جو کیفیت ایک نئے نئے جوش کی سی پیدا ہو گئی تھی، جوں ہی وہ طبعی سکون کی حالت میں آ گئی۔ دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا اور اپنی صحیح حالت محسوس کرنے لگا۔ سرسید کے مسلک نے پوری طرح تمام پچھلی خوش اعتقادیاں اور تقلیدی عقائد بیخ وبن سے اکھاڑ دیئے تھے۔ اور ذہن کو وادی مذہب میں ہر طرح کی آزادی و جولانی کا خوگر بنا دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شکوک وکاوش نے مزید وسعت اختیار کی اور سرسید کی انتہائی بلند پروازیاں بھی وہاں ساتھ دینے سے درماندہ رہ گئیں۔"

" سرسید کی رہنمائی نے اس منزل تک پہنچا دیا تھا کہ ہم سمجھتے تھے کہ اہل مذاہب کے تمام دعاوی و عقائد اس رنگ اور شکل میں جو عام طور پر تسلیم کئے جاتے تھے، محض وہم وخیال ہیں اور اصلیت کچھ دوسری ہے۔ لیکن اب یہ منزل سامنے آئی کہ عقائد کے جتنے حصے کو سرسید بھی منوانا چاہتے ہیں، وہ بھی وہم وخیال کیوں نہ ہو، وجود باری، ذات و صفات، بقائے روح، وحی و الہام، نبوت، شرائع و ادیان کیوں نہ یہ سب بھی ناقابل تسلیم و اعتراف ہوں۔"

" سرسید کے مسلک نے ان تمام عقائد کی حقیقت اتنی باریک اور نازک کر دی تھی کہ طبیعت کے لیے اسے بھی نکال باہر کرنا کچھ گراں نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً قدیم خیالات کے مطابق وحی کی بابت جو تصور تھا، وہ اتنا وزنی اور مافوق عقل تھا کہ دماغ اعتقاد و اعتراف کے بعد پھر اس سے انکار کرنا سہل نہیں سمجھ سکتا تھا۔"

" لیکن اب روشن خیالی تو یہ کہتی تھی کہ یہ سب جہل و اوہام کی اختراع ہے۔ اصلیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ انبیاء کرام، جو بالفطرۃ نوع انسانی کے سب سے زیادہ ذکی، مدرک، صحیح الحواس و القویٰ اور اشرف و افضل افراد ہوتے ہیں، ان کا نفس مزکی ایسے حقائق کا ادراک کرتا ہے، جو عام انسان نہیں کرتے، یہی القا و الہام ہے اسی کو وحی کہتے ہیں اور اسی کو چاہیں تو اور زیادہ شاندار تعبیرات میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔"

" نبوت و وحی کی یہ حقیقت اتنی نازک اور اخف ہو گئی ہے کہ بجز خواہ مخواہ کی خوش اعتقادی کے اور کوئی چیز اسے قائم نہیں رکھ سکتی۔ کیا یہ چیز ایک دانشمند کو اس سے باز رکھ سکتی ہے کہ وہ

یہاں پر ہم مولانا کے فرمودات میں سے ایک اقتباس پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں :۔

"جب نئی روشن خیالی کی ہوا لگی اور سرسید مرحوم کا رنگ چڑھا تو ..... اب صوم و صلوٰۃ کی حقیقت ہم وہ نہیں سمجھتے تھے جو عام لوگ سمجھتے ہیں۔ ہمارا معیار اعمال و احکام اب فلسفیانہ و حکیمانہ تھا۔ تاہم عمل پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا، جس سے اعمال کی پابندی و مزاولت متاثر ہوتی۔ سرسید کا ایک مضمون اوقات نماز پر بھی ہے۔ اس میں انھوں نے زور دیا ہے کہ نماز کے اصل اوقات تین ہی ہیں جو قرآن میں آتے ہیں۔" قرآۃ الفجر، دلوک الشمس اور غسق اللیل۔ انھی تینوں وقتوں میں آنحضرت صلعم پانچوں نمازیں پڑھتے تھے اور یہ بہتر ہے لیکن ضروری نہیں۔ قیام و حضر میں بھی بلا عذر اگر ظہرین و مغربین پڑھ لی جائیں یعنی تین وقت میں پانچ نمازیں پڑھی جائیں، تو مضائقہ نہیں۔ سفر و حضر کی بنا پر جمع بین الصلاتین کی رخصت تو پہلے ہی سمجھ میں آچکی تھی اور منع و فسخ توجیہ بالکل دل کو نہیں لگتی تھی۔ ترمذی والی روایت شاذ بھی معلوم ہوتی تھی لیکن یہ عام و مطلق حکم، بالکل اجتہاد تھا، مگر ہم سرسید کے اتباع کے جوش میں اس کے اتباع پر بھی مجبور تھے۔"

اتباع سے یہاں مولانا کا مقصود اتباع فکری ہے نہ کہ اتباع عملی۔ اسی لیے کہ اسی سلسلۂ بحث میں مولانا فرماتے ہیں :۔

"چنانچہ ایک شارح کی طرح میں نے بارہا اس پر تقریریں کی اور نئی نئی دلیلیں تراشیں، مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن کی عادت کے رسوخ کی وجہ سے خود عمل کبھی نہیں کیا۔ طبیعت اس طرف راغب ہی نہیں ہوتی تھی کہ ظہر و عصر ملا کر پڑھیں۔ مسجد میں جاتے، ظہر ظہر کے وقت، عصر عصر کے وقت پڑھتے تھے۔ سرسید کے مسلک میں آکر اب سنن و نوافل کی بھی وہ تاکید نہ رہی تھی بلکہ ان کے اصول کے بموجب تو بس فرائض کا پڑھ لینا کافی تھا۔ جہاں تک بحث مباحثے کا تعلق ہے ہم اس کے بھی پورے مؤید تھے۔ خوب خوب بحثیں کرتے تھے۔ اعتقاد بھی یہی تھا لیکن مجھے یاد نہیں کہ عملاً کبھی سنن و نوافل میں کمی کی ہو۔"

جہاں تک سرسید کی تعلیمی اور زبان و ادب کی خدمات کا تعلق ہے، مولانا آزاد ہمیشہ اس کے معترف رہے لیکن سرسید کے مذہبی افکار و عقائد میں انہماک اور ان کے علوم و معارف میں استغراق کچھ مدت تک رہا اور اس کے بعد خمار شروع ہوگیا۔ یہ حصہ بیان اپنے الفاظ میں پیش کرنے کی بجائے، مولانا ہی کے بیان کا ایک اقتباس پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :۔

"کچھ مدت تک یہ نشہ خوب زوروں پر رہا لیکن اس کے بعد ہی خمار شروع ہوگیا۔ اچانک وہ منزل نمودار ہوگئی جو منزل کے بعد قدرتی طور پر پیش آنے والی تھی۔ عقائد و کلام کے انہماک

بہر حال اس دور میں سرسید سے مولانا نے اختلاف بھی کیا اور ایراد بھی لیکن اس اختلاف کی کچھ حدود تھیں۔ وہ صرف سیاسی اور مذہبی میدان تھے جن میں مولانا ان سے متفق نہ تھے۔ مولانا کے علاوہ خود سرسید کے مدرسہ فکر اور علی گڑھ کے کئی ہونہار فرزندوں نے سرسید کی نہ صرف سیاسی اور مذہبی پالیسی سے اختلاف کیا بلکہ تعلیمی پالیسی سے بھی اختلاف کیا اور سرسید کی متعین کردہ سیاسی و تعلیمی راہ کے خلاف مختلف تحریکات کی رہنمائی کی۔ لیکن اس بحث کا یہ کوئی موقع نہیں۔ میں یہاں سرسید کے متعلق مولانا مرحوم کے آخری دور کے خیالات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا فروری ۱۹۴۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے موقع پر مولانا نے اپنے خطبے میں سرسید کی علمی، ادبی، تعلیمی، معاشرتی خدمات کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ "میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اسے اس مصلح کی بارگاہ تعلیم و اصلاح میں خراج عقیدت سمجھنا چاہیئے وہ شخصیت اس خراج عقیدت کی سزاوار کیوں نہ ہو جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کے لیے تعلیم جدید کی طرح نو ڈالی"۔ عوام کے ذہنی رجحانات پر سرسید کے "تہذیب الاخلاق" کے ہمہ گیر اثرات کا مولانا نے اعتراف کیا ہے اس میدان میں برصغیر پاک و ہند کا کوئی دوسرا رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات "تہذیب الاخلاق" نے چھوڑے ہیں برصغیر کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے ..... اس رسالے کے اجراء سے موجودہ اردو ادب کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو نے اس رسالے کی بدولت اتنا فروغ پایا کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا اس دور کا کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جو تہذیب الاخلاق کے حلقہ ادب سے متاثر نہ ہوا ہو۔ دور جدید کے تمام بلند معیار مصنفین نے اس خوان نعمت سے لقمے چنے اسی حلقے کے اثر و نفوذ سے نقد و نظر کی قدریں اور فکر و خیال کے لیے زاویے متعین ہوئے"۔

علی گڑھ کی حیثیت صرف ایک تعلیمی مرکز ہی کی نہ تھی بلکہ سرسید کی مختلف النوع سرگرمیوں کے مرکز کی وجہ سے اس کی حیثیت ایک ذہنی اور ثقافتی مرکز کی ہو گئی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"سرسید مرحوم نے علی گڑھ میں نہ صرف کالج کی بلکہ ایک ایسے ذہنی اور ثقافتی مرکز کی بنیاد ڈالی تھی جو وقت کی ترقی پذیر رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔ ان سرگرمیوں کا مرکز خود سرسید مرحوم کی شخصیت تھی۔ اس شخصیت نے اپنے گرد اور بھی بہت سے دماغ جمع کر لیے تھے۔ جنہوں نے ان کا ساتھ دیا"۔

مولانا کے اس خطبے کا موضوع چونکہ "سرسید کی تعلیمی خدمات" تھا اس لیے اس پہلو پر مولانا نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے میں یہاں صرف ایک اقتباس پیش کرکے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا:۔

"آج مغربی تعلیم ہماری قومی زندگی کا جزو بن چکی ہے ..... لیکن ایک صدی پیشتر برصغیر کے جن

حقیقت نبوت کی اس حد تک پہنچ کر پھر اس قریبی اور سامنے کی سرحد پر نہ پہنچنے کہ نبی زیادہ فطین و ذہین اور زیادہ فضائل اخلاقی رکھنے والوں کا نام ہے - اور دماغ کی زیادہ صحیح ترکیب، ادراک کے زیادہ بلند عمل، اور طبیعت ذہنیہ کی نہایت اعلیٰ تقویم و تعادل کا نام ہے اور اس کے بعد نبوت جس قدر باقی رہ جاتی ہے، وہ معلوم ہے "

" فی الحقیقت خواہ حکمائے اسلام ہوں مثلاً شیخ اور فارابی وغیرہ یا موجودہ زمانے کے متکلمین ہوں جیسے سرسید، اس بات میں وہ اسی سرحد پر ہیں لیکن پیرایۂ بیان ایسا اختیار کرتے ہیں، جو معاملے کو زیادہ پریشان اور زیادہ غیر عامۃ الورود بنا دیتا ہے - اسی طرح تمام عقائد و اصول کا حال ہے - اور روشن خیالی و مذہبی تفلسف اپنی واقعی کوئی درمیانی ہستی نہیں رکھتا - فکری وجود صرف دو ہی ہیں انکار یا اقرار، یہ تیسری راہ چاہتے ہیں اور وہ محال ہے "

" میرے سامنے اب سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا، مگر جواب کے لیے کوئی صدا نہ تھی جو اصول، جو مقدمات، جو دلائل، جو شبہات، پرانے افکار و عقائد کے رد میں ہم استعمال کرتے ہیں، کیوں ان کا شمار ان چیزوں پر کبھی نہ پڑے - جن کو مذہب کی اولیات قرار دے کر الگ رکھ دیا ہے اور اس طرح رکھ دیا ہے گویا چھونا منع ہے - اگر منع ہے تو قدیم عقائد نے کیا قصور کیا تھا ؟"

" اب اچانک میری زندگی منقلب ہو گئی - میرے اضطراب و التہاب کی کوئی حد نہ تھی ایک گتھی سامنے آتی تھی، اسے سلجھانے لگتا تھا لیکن سلجھنے کی جگہ دس گرہیں اور پڑ جاتی تھیں - پھر ہر گرہ کے کھولنے میں دس اور نئی گرہوں کا مقابلہ پیش آتا تھا - ہر جواب بجائے خود ایک نیا سوال تھا - اور ہر جستجو کے یقین سے ایک نئے شک کی ہلاکت پیدا ہوتی تھی "

(۲)

سرسید سے مولانا کے تاثر کا یہ پہلا دور تھا جو میرے خیال میں ۱۹۰۰ء سے ۵ - ۱۹۰۴ء تک رہا - اس کے بعد ایک دوسری منزل نمودار ہوئی جسے مولانا نے انکار و الحاد سے تعبیر کیا ہے لیکن میں یہاں اس دور کے تفصیل و اظہار کا تذکرہ نہیں کروں گا - بلکہ سرسید کے تعلق سے دوسرے دور کا تذکرہ کروں گا - یہ دوسرا دور اگرچہ ۸ - ۱۹۰۷ء سے شروع ہو چکا تھا لیکن نمایاں طور پر یہ تبدیلی ۱۹۱۲ء سے نظر آتی ہے جب کہ مولانا نے الہلال جاری کیا - الہلال کے زمانے میں نہ صرف یہ کہ سرسید سے تاثر و عقیدت نہ تھی بلکہ اس کی پالیسی سرسید کی سیاسی و مذہبی مسلک کے قطعاً خلاف تھی - خود مولانا کا بیان ہے کہ :-

" الہلال نکلا تو اس کے مباحث مذہبی و سیاسی، دونوں اس خیال سے بالکل مختلف تھے جو سرسید مرحوم کا تھا حتیٰ کہ سختی کے ساتھ ان پر اپرادا اعتراض کیا گیا " (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی)

نیر اقبال

لسانیات کی تاریخ پر ایک نظر

(زیرِ نظر مقالہ Ferdinand De Saussure
کی کتاب Course in General Linguistics
کے تعارفی باب کا ترجمہ ہے۔)

وہ سائنس جس کا ارتقا زبان کے واقعات سے ہوا ہے اپنے اصلی اور صحیح مقصود کو حاصل کرنے سے پہلے تین دوروں میں سے گزری ہے۔

سب سے پہلے ایک چیز کا جو قواعد کہلاتی تھی۔ مطالعہ کیا جاتا تھا۔ یہ علم منطق پر مبنی تھا۔ اس کو یونانیوں نے شروع کیا تھا اور خاص طور پر فرانسیسیوں نے جاری رکھا تھا۔ یہ مطالعہ سائنسی اندازِ فکر سے عاری تھا اور بذاتِ خود زبان سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس کا واحد مقصود صرف صحیح اور غلط شکلوں کو تمیز کرنے کے لیے قواعد منضبط کرنا تھا۔ یہ نمونہ جاتی تنظیم تھی۔ حقیقی مشاہدے سے بہت دور تھی اور اس کا دائرہ محدود تھا۔

اس کے بعد زبان دانی Philology سامنے آئی۔ اس کا ایک اسکول اسکندریہ میں بہت پہلے سے تھا۔ لیکن یہ نام اس سائنسی تحریک کو دیا جاتا ہے جس کو فریڈرک اگسٹ ولف نے ۱۷۷۷ء میں شروع کیا تھا اور جو آج تک جاری ہے۔ اس تحریک کا واحد اور اصلی مقصود صرف زبان نہیں ہے۔ ابتدائی ماہرین زبان خاص طور سے کتابوں کے متن کی اصلاح تاویل اور تنقید کیا کرتے تھے۔ ان کے مطالعہ کا نہج ان کو ادبی تاریخ رواج اور اداروں وغیرہ میں دلچسپی لینے کی طرف مائل کرتا تھا۔ وہ لوگ تنقید کے طریقوں کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لسانی مسائل کی وضاحت وہ بے حد واضح مقصد کے تحت کرتے تھے۔ اور وہ مقصد مختلف زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں کے متن کا موازنہ ہر مصنف کی مخصوص زبان کا تعین یا کسی مبہم یا متروک الاستعمال زبان میں بنائے ہوئے نقوش کی تشریح اور حل تھا۔ بلاشبہ ان جستجوؤں نے تاریخی لسانیات کے لیے زمین ہموار کر دی۔ رسچل کے ذریعہ کیے ہوئے Plautus کے مطالعات حقیقتاً لسانی ہیں۔ لیکن تنقید پھر بھی ایک لحاظ سے

مصلحین نے جدید تعلیم کا بیڑا اٹھایا تھا۔ انھیں سخت ترین مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ ایک طرف شدید مخالفتیں تھیں اور دوسری طرف وہ مہم تھی جسے سر کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہر قدم پر نت نئی مشکلات کا سامنا تھا۔ آغاز کار میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان پر قابو پانے کے لیے بھی ایڑی چوٹی تک کا زور لگانا پڑ رہا تھا چنانچہ ان مصلحین نے ان تمام شدائد کا بڑی حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا جو کسی تحریک اصلاح کے علم برداروں کو ہمیشہ پیش آتے رہے ہیں۔ عوام کے دل و دماغ پر صدہا سال کے تعصبات کے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ مسلمہ عقائد اور قدامت پسندانہ جذبات کے حاملین نے جدید تعلیم پر ناک بھوں چڑھائی اور اس کی مخالفت پر تل گئے۔ جدید تعلیم کے مخالفین نے سب سے بڑا حربہ جو استعمال کیا، وہ تھا مذہب! مذاہب کے اصول عقل و خرد اور علم و دانش کے ضوابط کی نفی نہیں کرتے لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے مذہب کی تصویر کچھ ایسے ہی انداز میں پیش کی گئی ہے کہ ہم اسے عقلیت کے منافی سمجھتے ہیں۔ علم برداران مذہب کا عام نعرہ یہی تھا کہ "عربی تعلیم مذہبی تعلیمات کی نقیض ہے۔ لہذا وہ لوگ جنھیں مذہب سے لگاؤ ہے، وہ اس شجر ممنوعہ کے قریب تک نہ بھٹکیں اور اس قدیم تعلیم سے ان کا دامن مضبوطی کے ساتھ بندھا رہے جس پر قدمائے تصدیق و توثیق کی مہریں ثبت کی ہیں"۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ایک طویل مدت تک اس سے دامن کش رہے لیکن آخر کار جدت نے قدامت پر فتح پائی۔ عوام نے قدیم تعلیم کے پرانے چولے اتار پھینکے۔ جہاں تک برصغیر کے مسلمانوں کا تعلق ہے یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس جدوجہد میں جس شخصیت نے کارہائے نمایاں انجام دیے وہ علی گڑھ یونی ورسٹی کے موسس کی شخصیت تھی۔

تعلیمی جنگ کا پہلا محاذ علی گڑھ تھا لہذا اس مقام کو ترقی پذیر قوتوں کی فتح و نصرت کا مظہر کہا جا سکتا ہے .....

سرسید کی پر عظمت شخصیت کی چھاپ ذہنی سرگرمیوں کے تمام شعبوں پر پڑی۔ مذہب، تعلیم، معاشرت، زبان، ادب اور صحافت ان کی اصلاحی اور تخلیقی صلاحیتوں کی کھلی شہادتیں ہیں۔

سرسید کی عظمت اور ان کی خدمات کا یہ اعتراف مولانا ابوالکلام کی زبان سے ہے جو ان کے سیاسی اور مذہبی مسلک کے مخالف تھے۔ لیکن اگر سرسید کا کوئی معتقد بھی ان کی شخصیت و خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہے تو اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے۔ مولانا کا یہ قول اسی خطبے سے مقتبس ہے:

"میرا خیال پہلے بھی یہی تھا اور اب بھی یہی ہے کہ سرسید مرحوم کی شخصیت انیسویں صدی کی ایک عظیم ترین شخصیت تھی"۔

آسان کر دیتا ہے ۔ تب ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ یونانی شکلوں میں جہاں s بھی دو مصوتوں کے درمیان واقع ہوگا وہ لازمی طور پر گر جائے گا اور بعض حالات میں لاطینی s تبدیل ہو کر "آر" بن جائے گا ۔ ایسی صورت میں سنسکرت گردان قواعدی طور پر ابتدائی شکل کے تصور کے لیے نظیر مہیا کر دیتی ہے اور وہ ابتدائی شکل ایک اکائی ganaso ثابت ہوتی ہے جو کہ بالکل معین اور مستقل ہے ۔ لاطینی اور یونانی صرف اپنے ابتدائی دور میں ہی اس طرح کی شکلیں رکھتی تھیں جیسی بعد کی سنسکرت میں موجود ہیں ۔ ہاں سنسکرت رہبری کرتی ہے ۔ کیوں کہ اس میں تمام ہند یورپی s محفوظ ہیں ۔ بے شک سنسکرت ابتدائی شکل سے اور دوسرے خال و خط محفوظ کرنے میں ناکام ہوئی ہے ۔ مثال کے طور پر اس نے مصوتی نظام کو بالکل منقلب کر دیا ہے ۔ لیکن عمومی طور سے بنیادی عناصر جو سنسکرت میں محفوظ ہیں ۔ تحقیق میں قابل لحاظ حد تک امدادگار ثابت ہوتے ہیں اور یہ اتفاق ہی کی بات ہے کہ دوسری زبانوں کے مطالعے میں بہت سے نقطے واضح کرنے کے لیے ایسا ہو گیا ہے ۔

دوسرے ممتاز ماہرین لسان جلدی ہی بوپ کے عطیے میں اضافے کرنے لگے جیکب گرم جرمانی مطالعہ جات کا بانی (اس کی Deutsche Grammatik ۱۸۲۲ء سے ۱۸۳۶ء تک چھپتی رہی) پوٹ جس کے اشتقاقی مطالعے نے ماہرین لسان کو مواد کا ایک قابل لحاظ ذخیرہ فراہم کیا ۔ کوہن جس کی تصانیف لسانیات اور ساتھ ہی ساتھ تقابلی اساطیری علوم سے تعلق رکھتی ہیں ۔ انڈک عالم بینفے اور آفرے وغیرہ ۔

آخر میں اسکول کے آخری نمائندوں میں سکس ملر ۔ جی کرٹیس اور اگسٹ شلیشر خاص توجہ کے متقاضی ہیں ۔ مختلف طریقوں سے ان ... نے ہی اعلیٰ تقابلی مطالعہ جات کو بہت کچھ دیا ہے ۔ سکس ملر نے فراست آمیز مباحثوں (زبان کی سائنس کے اسباق ۱۸۶۱ء) کے ذریعے اُن علوم کو عام کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن اس کی ناکامی کی وجہ الیہ ... دیانت داری کی کمی تھی ۔ کرٹیس خاص طور پر اپنے Grundzüge der griechen Etymologie (۱۸۷۹ء) کی وجہ سے ایک ممتاز زبان داں سمجھا جاتا ہے ۔ وہ پہلا آدمی تھا جس نے تقابلی زبان دانی اور کلاسیکی زبان دانی کے دبستانوں میں صلح و صفائی کی کوشش کی ۔ ان میں موخر الذکر دبستان نئی سائنس کی ترقی کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا ۔ اور دونوں ایک دوسرے کی طرف سے بدگمان تھے ۔ شلیشر پہلا شخص تھا جس نے منتشر جستجوؤں کے نتائج کو منضبط کرنے کی کوشش کی اس کی Compendium der vergleichenden Grammatik der indogermanischen Sprachen ۱۸۶۱ - ۱۸۶۲ کم و بیش بوپ کی قائم کی ہوئی سائنس کی تدوین ہے ۔ اس نے ایک طرف اپنی خدمتوں کا ایک طویل ریکارڈ قائم کیا ہے دوسری طرف آج بھی تقابلی دبستان کے اہم نقطوں کی کسی بھی دوسری تصنیف سے زیادہ یاد تازہ کرتی ہے اور یہ اسکول ہند یورپی لسانیات کا پہلا باب ہے ۔

بے حد ناقص ہے ۔ وہ لکھی ہوئی زبان کے پیچھے بالکل غلامانہ انداز میں چلتی ہے اور زندہ زبان کو بالکل بھول جاتی ہے اس کے علاوہ وہ لاطینی اور یونانی زمانہ عتیق کے سوا بہت ہی کم چیزوں سے کوئی تعلق رکھتی ہے ۔

تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جب عالموں کو پتہ چلا کہ زبانوں کا ایک دوسرے سے تقابل کیا جا سکتا ہے ۔ یہ دریافت "تقابلی لسانیات" کی بنیاد بن گئی ۔ ۱۸۱۶ء میں فرانز بوپ نے ایک تصنیف کے ذریعے سنسکرت کا جرمن، یونانی، لاطینی وغیرہ سے تقابل کیا ۔ اس تصنیف کا نام "سنسکرت زبان میں گردانوں کے نظام کے بارے میں" تھا Über das conjugations system der Sanskrit sprache

بوپ ان زبانوں کی یکسانیتوں کی نشان دہی کرنے والا اور اس بات کا تعین کرنے والا پہلا شخص نہیں تھا کہ یہ تمام زبانیں ایک خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ۔ یہ کام اس سے پہلے بھی کیا جا چکا تھا ۔ خاص طور پر انگریز مستشرق ولیم جونز (متوفی ۱۷۹۴ء) کے ذریعہ ۔ لیکن ولیم جونز کے کچھ منتشر بیانات، یہ ثابت نہیں کرتے کہ تقابل کی اہمیت اور قدر کو عام طور پر ۱۸۱۶ء سے پہلے سمجھ لیا گیا تھا ۔ چاہے بوپ کو اس دریافت کے سلسلے میں تفوق حاصل نہ ہو کہ سنسکرت یورپ اور ایشیا کی بعض زبانوں سے رشتہ رکھتی ہے پھر بھی یہ اس نے ہی سمجھا تھا کہ رشتے دار زبانوں کا تقابل آزاد سائنس کا موضوع بن سکتا ہے ۔ ایک زبان کے ذریعے دوسری زبان پر روشنی ڈالنا اور ایک زبان کی شکلوں کی مدد سے دوسری زبان کی شکلوں کی تشریح یہ وہ کام ہے جس کو اس سے پہلے کسی دوسرے نے نہیں کیا ۔

آیا بوپ سنسکرت کی ماقبل دریافت کے بغیر اپنی سائنس کی تخلیق کر سکتا تھا یا کم سے کم اتنی جلدی کر سکتا تھا یہ مشکوک ہے ۔ یونانی اور لاطینی کے علاوہ سنسکرت کو تیسری شہادت کے طور پر استعمال کر کے بوپ اپنے مطالعے کے لیے عظیم تر اور مضبوط تر بنیاد حاصل کر سکا ۔ خوش قسمتی سے سنسکرت تقابل کے عمل کو منور کرنے کے کام کے لیے نادر طور پر مناسب تھی ۔

مثال کے طور پر لاطینی genus (genus, generis, genere, genera, generum etc) اور یونانی (ginetai, genos, geneos, genei, genea) تو ان کسی بات کو ظاہر نہیں کرتیں لیکن جیسے سنسکرت کے مطابقہ سلسلہ (ganasam, ganas, ganasas, ganasi, ganasu) کو شامل کرتے ہیں تصویر بدل جاتی ہے ۔ پہلی نگاہ یونانی اور لاطینی شکلوں کی یکسانیت کو ظاہر کر دیتی ہے ۔ اگر آزمائشی طور پر ہم اس مفروضہ کو قبول کر لیں کہ ganas ابتدائی شکل کی نمائندگی کرتا ہے ۔ اور یہ قدم تشریح کو

اور واقعات کو مرتب کرنے کا صرف ایک ذریعہ یا طریقہ ہے۔

لسانیاتِ خاص جو تقابلی مطالعہ جات کو ان کی صحیح جگہ عطا کرتی ہے اپنی ابتدا کے لیے رومانی اور جرمانی زبانوں کی احسان مند ہے۔ رومانی مطالعہ جات جو Diez نے شروع کیے لسانیات کو اس کے صحیح موضوع کے قریب لانے کا آلہ بنے۔ اس کی "رومانی زبانوں کی قواعد" کے تالیف ہونے کی تاریخ ۱۸۳۶ ۔ ۳۸ ہے

Grammatik der romanischen Sprachen

کیونکہ رومانس زبانوں کے عالموں کو وہ سہولتیں مہیا تھیں جن سے ہند یورپی زبانوں کے عالم بے بہرہ تھے۔ ان کی لاطینی تک جو کہ رومانی زبانوں کی اصل ہے سیدھی پہنچ اور تصانیف کی بہتات نے بھی مختلف بولیوں کے عہد بعہد ارتقا کو تفصیل سے سمجھنے میں مدد کی۔ ان دو حالات نے تفکر کے میدان کو تنگ کر دیا۔ اور تحقیقات کے لیے نادر طور سے پختہ حدود فراہم کر دیئے۔ جرمانی زبانوں کے عالموں کو بھی ایسے ہی حالات مہیا تھے۔ حالانکہ وہ "اصل" کا بلا واسطہ مطالعہ نہیں کر سکتے تھے پھر بھی بے شمار تصانیف نے ان کو ان زبانوں کی تاریخ کا پتہ لگانے کے قابل کر دیا جنھوں نے اصل جرمانی سے کئی صدیوں کی مدت میں ارتقا پایا تھا۔ ہند یورپی عالم حقیقت کے قریب جتنے آ سکتے تھے جرمانی عالم اس سے کہیں زیادہ قریب آتے ہوئے مختلف نتیجوں پر پہنچے۔

اس سلسلے میں پہلی سرگرمی امریکی عالم وٹنی نے پیدا کی وہ "زبان کی نشوونما اور زندگی (۱۸۷۵)" کا مصنف تھا۔ کچھ زمانے بعد ایک نیا دبستان جدید قواعد نویسوں کے ذریعے قائم کیا گیا۔ ان کے تمام رہنما جرمن تھے۔ مثلاً کے۔ برگمن اور ایچ۔ اشتف۔ جرمانی زبانوں کے عالم ڈبلیو براونے۔ ای۔ سیورس۔ ایچ۔ پال اور اسلاوی زبانوں کے عالم لیسکن وغیرہ۔ انھوں نے تقابلی مطالعے کے نتائج کو ان کے تاریخی پس منظر میں رکھا اور اس طرح سے واقعات کو ان کے اپنے فطری سلسلے سے ملحق کرنے پر [illegible] تھا۔ ان کا تشکر گزار ہونا چاہیے۔ کیونکہ اب زبان ایسا organism نہیں سمجھی جاتی تھی جو آزادانہ طور سے ارتقا کرتی ہے بلکہ لسانی گروہوں کے اجتماعی ذہن کی پیداوار سمجھی جانے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ ان عالموں نے پہچان لیا کہ زبان دانی اور تقابلی زبان دانی کے تصورات غلطیوں سے مملو اور ناکافی تھے۔ پھر بھی جدید قواعد نویس باوجود ان تمام خدمتوں کے جو انھوں نے سر انجام دیں مکمل سلسلے کو واضح نہیں کر سکے اور عمومی لسانیات کے بنیادی مسائل اب بھی حل کے منتظر ہیں۔

اصطلاحات

Rule	قاعدہ	System	نظام
Principle	اصول	Form	شکل
Constitution	آئین	Vowel	مصوتہ
Order	ترتیب	Consonant	مصمتہ
Construction	ترکیب	Source	مبدا

لیکن تقابلی دبستان جو کہ صریحی طور پر ایک نئے اور ثمر بار میدان علم کے دروازے کھولنے کے وصف کا حامل ہے۔ لسانیات کی سائنس کو قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ اپنے مطالعے کے موضوع کے صحیح مزاج کو پہچان لینے سے قاصر رہا۔ ظاہر ہے پہلے قدم کے بغیر کوئی بھی سائنس اپنے طریقے کی نشو و نما نہیں کر سکتی۔

تقابلی زبان دانوں کی پہلی غلطی ان کی تمام دوسری غلطیوں کی مبدا بن گئی اپنی جستجوؤں میں (جو صرف ہند یورپی زبانوں کا احاطہ کرتی تھیں) انھوں نے اپنے تقابل کے مفہوم یا ان رشتوں کی اہمیت کے بارے میں جو انھوں نے دریافت کیے تھے اپنے آپ سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ ان کا طریقہ بلا استثنا تقابلی تھا۔ تاریخی نہیں تھا۔ بے شک تقابل کسی بھی تاریخی تعمیر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ لیکن خود مختتم نہیں ہو سکتا۔ اور نتیجہ خیزی اس وقت اور بھی مغالطہ آمیز ہو جاتی ہے۔ جب تقابلی ماہرین دو زبانوں کے نشو و نما کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے طبیعیات کا ماہر دو پودوں کی بالیدگی کو دیکھ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر شلیشر جو کہ ہمیشہ ہم کو قدیم ہند یورپی سے ابتدا کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس طرح ایک مصدقہ تاریخ داں معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات کہنے میں کہ یونانی e اور o صوتی نظام کے دو مرحلے ([illegible]) ہیں۔ کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتا۔ اس کے یہ بات کہہ دینے کی وجہ بھی ہے۔ سنسکرت صوتی تبدیلیوں کا ایک ایسا نظام رکھتی ہے۔ جو مرحلوں کے تصور کی طرف اشارہ کرتا ہے شلیشر نے خیال کیا کہ ہر زبان کو ان مرحلوں میں سے الگ الگ اور بے شک ایک ہی طریقے سے گزرنا ہوتا ہے۔ جس طرح کہ ایک قسم کے پودے الگ الگ طور پر یکساں نشو و نمائی منزلوں میں سے گزرا کرتے ہیں اور اسے ایک مفروضہ $\bar{e}$ یونانی $\bar{o}$ میں دیکھا اور ایک مفروضہ $\breve{a}$ کا مرحلہ سنسکرت $\bar{a}$ میں دیکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک قدیم ہند یورپی تبدیلی نے علیحدہ علیحدہ یونانی اور سنسکرت میں انعکاس کیا تھا اور دونوں زبانوں میں جو قواعدی اثرات مرتب ہوئے تھے ان میں مسلسل برابری نہیں تھی۔

بلا استثنا تقابلی طریقے نے غلط تصورات کے ایک قبیل کی طرف رہنمائی کی کیونکہ یہ تصورات حقیقت پر مبنی نہیں تھے۔ اس لیے سادگی سے زبان کے واقعات کی عکاسی نہیں کر سکے۔ زبان ایک مخصوص دائرہ سمجھی گئی۔ ایک چوتھی فطری بادشاہت اس انداز فکر نے دلائل پیش کرنے کے ایسے طریقوں کی طرف رہنمائی کی جنھوں نے دوسری سائنسوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ آج کوئی شخص اس زمانے میں لکھی ہوئی ایک درجن سطریں بھی دلائل کی نامعقولیتوں پر اور ان اصطلاحوں پر جو ان نامعقولیتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے استعمال کی گئی تھیں۔ چونکے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔

لیکن methodology کے نقطہ نظر سے تقابلی زبان دانوں کی غلطیاں بالکل ہی بے قیمت نہیں ہیں۔ ایک طفل سائنس کی غلطیاں ان غلطیوں کی بڑی بڑی تصویریں پیش کرتی ہیں جو سائنسی تحقیق کی ابتدائی منزلوں میں سرزد ہوا کرتی ہیں۔ اور اس وضاحت کے دوران میں مجھے ان میں سے اکثر کی طرف اشارہ کرنے کا موقع ملے گا۔

۱۸۷۰ء کے قریب تک ماہرین لسان ان اصولوں کو دریافت نہیں کر سکے تھے۔ جو زبانوں کی زندگی کو معمول کرتے ہیں۔ اس کے بعد سے انھوں نے زبانوں کے درمیان یکسانیت کو پہچاننا شروع کیا۔ تقابل لسانی مظاہر کا صرف ایک پہلو ہے

ڈاکٹر سید سلیمان حسین

لکھنؤ کا تاریخی، سماجی اور معاشرتی پس منظر

ہمارے موضوع کے اعتبار سے اودھ[1] کی تاریخ کا آغاز ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء سے ہوتا ہے۔ جبکہ سعادت خاں کو بادشاہ دہلی نے اودھ میں رعایا کی سرکشی اور بدنظمی دور کرنے کے لئے صوبے دار مقرر کر کے بھیجا تھا اور جنہوں نے اودھ میں اس سلطنت کی بنیاد ڈالی جو برصغیر ہند و پاکستان میں "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" قرار پائی

---

[1] لکھنؤ کی تاریخ کا مفصل بیان خارج از بحث ہے۔ صرف ابتدا کا مختصر سا حال درج کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ اور اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں اختلاف ہے، بعض مورخین اس کا اصل نام لکشمن وتی یا لکھنا وتی قرار دیتے ہیں کچھ کہتے ہیں کہ یہ پہلے نیم شارن تھا اور یہاں سوت جی اپنے ساٹھ ہزار مریدوں اور عقیدت مندوں کو جمع کر کے گرو گرنتھ پران کا درس دیا کرتے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ رام چندر جی نے بن باس کی مدت پوری کی اور دوبارہ اجودھیا کے تخت پر متمکن ہوئے تو انہوں نے یہ علاقہ بطور جاگیر اپنے رفیق سفر اور بھائی لچھمن جی کو عطا کیا اور انہوں نے ہی اسے بسایا تھا غرض یہ طے ہے کہ لکھنؤ پہلے اجودھیا کے زیر نگیں تھا۔ سورج ونشی خاندان کے زوال کے بعد اس پر راجا وکرمادت نے بھی حکومت کی تھی نویں اور دسویں صدی عیسوی میں منگول کے تہا قبائل کی حکومت کا بھی یہاں پتا چلتا ہے جب راجا جے چند نے اودھ میں قدم جمائے اس وقت یہاں کے بعض حصے بھار قبائل کے ہاتھ میں آ گئے تھے۔ انھی طاقتوں سے حضرت سالار مسعود غازی (۴۲۴ھ) نے مقابلہ کیا تھا۔ اسی زمانے میں مسلمان یہاں آ کر آباد ہوئے حضرت شاہ مینا علیہ رحمۃ (۸۸۰ھ) کا خاندان بھی اسی کے بعد یہاں آیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اودھ میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوا۔

شہنشاہ اکبر نے ۱۵۹۰ء میں اپنی حکومت کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا تو اودھ کا علاقہ ایک مستقل صوبہ اور لکھنؤ اس کا دارالسلطنت قرار پایا۔ شیخ عبدالرحیم بجنوری صوبے دار مقرر کئے گئے

قدیم زمانے میں آنے والوں میں حضرت شاہ پیر محمدؒ بھی ہیں۔ جنہوں نے لچھمن ٹیلے پر اپنی سکونت اختیار کی تھی جو انہی کے نام سے آج مشہور ہے، اورنگ زیب نے اس بلند ٹیلے پر ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی تھی جو ٹیلے والی مسجد کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

زباں داں	Philologist	مرحلہ	Grade
ماہر لسانیات	Linguist	منزل	Stage
متن	Text	درجہ	Degree
تسبیل	Set	حد بندی	Frame

شیخ زادوں کی طاقت ختم کر دی اور لکھنؤ پر قبضہ جما لیا۔ یہاں کا انتظام کرنے کے بعد وہ اجودھیا گئے اور آبادی سے کچھ فاصلے پر دریائے گھاگھرا کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ چند روز بعد انہیں برسات میں جو تکلیف ہوئی تو تھوڑی دور ہٹ کر ایک مناسب مقام پر اپنے لئے چھپّر بنوایا۔ پھر اس کے بعد گرد کچی دیوار کا ایک بہت وسیع مربع حصار کھنچوالیا جس کے چاروں کونوں پر قلعہ بندی کی شان سے چار کچے برج بنوا دیئے۔ یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا کہ اس کے اندر متعدد رسالے پلٹنیں، توپ خانے، اصطبل اور دیگر ضروری کارخانے آسانی سے رہ سکتے تھے[1] بیگمات کے قیام کے لئے بھی یہی کچے مکانات تھے، غرض کہ اس بنگلے میں جب برہان الملک کو اضلاع کے دورے اور سفرہائے حکمرانی سے فراغت ہوتی تو قیام کرتے۔ اسی مناسبت سے اس بستی کا نام بنگلا پڑ گیا جو بعد کو فیض آباد کے نام سے مشہور ہوا۔

برہان الملک نے اپنا سارا وقت صوبے کے انتظام اور استحکام میں صرف کیا۔ مگر شاہانہ زندگی گزارنے کے بجائے سپاہیانہ ٹھاٹ میں عمر بسر کی، یہ ان کے حسنِ انتظام ہی کا نتیجہ تھا کہ صوبۂ اودھ کی آمدنی جو ستر لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ پہلے ہی سال ایک کروڑ ستر لاکھ تک پہنچ گئی[2] اور جس میں ہر سال مزید اضافے ہوتے رہے۔ موت کے وقت انہوں نے خزانے میں نو کروڑ روپیہ چھوڑا تھا[3]۔ برہان الملک کے انتقال کے بعد ان کے داماد اور بھانجے مرزا محمد مقیم صفدر جنگ صوبےدار بنائے گئے۔ ان کے زمانے میں احمد خاں بنگش اور حافظ رحمت خاں نے اودھ کے کچھ حصوں پر قبضہ جما لیا اور پٹھانوں نے ملیح آباد میں اپنا تھانہ قائم کر لیا۔ اس لئے صفدر جنگ کو اودھ پر پوری توجہ صرف کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس زمانے میں سماجی اور تمدنی تبدیلیوں کی رفتار بھی سست رہی اور شعر و ادب کے میدان میں طوفانی لمحے نہیں آئے۔

صفدر جنگ کی موت کے بعد ان کے بیٹے جلال الدین محمد مرزا شجاع الدولہ ۱۷۵۲ء/۱۱۶۷ھ میں مسند نشین وزارت ہوئے انھی کے زمانے میں اودھ میں تہذیبی مرکزیت اور سیاسی اہمیت کی بنیاد رکھی گئی۔ دلی کے مہاجرین شعرا کے قافلے آنا شروع ہو گئے اور فارغ البالی و خوش حالی کا دور دورہ شروع ہوا۔ صاحب تاریخ فرح بخش نے اس زمانے میں اودھ کے مشاغل اور زندگی کے ہمہموں کا ذکر جس جوش و خروش کے ساتھ کیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ فیض آباد کو تمام ہندوستان کے مقابلے میں ایک مرکزیت حاصل ہو گئی تھی۔ شجاع الدولہ کی دولت و ثروت، داد و دہش، حکمتِ عملی اور احساسِ قوت نے کچھ مدت کے لئے زوالِ سلطنت اور نکبت و افلاس کا تصور مٹا دیا تھا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ سیاسی طور پر اودھ روز بروز کمزور ہوتا جا رہا تھا اور انگریز دن بدن اودھ میں اپنے پاؤں جماتے جا رہے تھے۔ اگرچہ ۱۷۶۵ء کے صلح نامے کی رو سے انہوں نے اودھ

---

[1] گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۲۲

[2] تاریخ اودھ صفحہ ۴۷

[3] عماد السعادت صفحہ ۲۹

سعادت خاں کا اصل نام میر محمد امین تھا۔ وہ نیشاپور کے سید زادے تھے۔ ترکِ وطن کر کے ۰۹-۱۷۰۸ء میں سلسلۂ تلاشِ معاش ہندوستان آئے اور یہاں اپنے بھائی میر محمد باقر کے ساتھ کچھ مدت عظیم آباد (پٹنہ) میں رہ کر جولائی ۱۷۱۲ء میں گجرات چلے گئے اور وہاں نواب سربلند خاں صوبیدار کی مصاحبت میں رہے۔ موصوف نے انہیں ستر روپیہ ماہوار پر اپنے خیمے نصب کرنے پر میر منزل کا عہدہ سپرد کر دیا۔ ایک دن نواب صاحب شکار کو گئے خیمہ ایک نشیبی مقام پر ایستادہ کیا گیا۔ اتفاق سے اسی روز موسلا دھار بارش ہوئی اور نواب صاحب کے خیمے میں پانی چلا آیا۔ انہوں نے ایک رتھ میں بیٹھ کر تمام شب جاگ کر کاٹی۔ صبح کو میر محمد امین کو بلا کر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا "تمہارا دماغ تو ہفت ہزاریوں کا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے کام میں دل ہی نہیں لگاتے"۔ میر صاحب کو یہ کلمات بہت ناگوار گزرے۔ چنانچہ ملازمت سے استعفا دے دیا اور دلی چلے آئے۔ یہاں آکر انہوں نے شاہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ لے لیا اور اپنے حسنِ انتظام کی بدولت منصب ہزاری پر فائز و ممتاز ہوئے ان دنوں دہلی میں سادات بارہہ کا بڑا زور تھا جن سے رعیت تو رعیت بادشاہ سلامت تک ڈرتے تھے۔

برہان الملک نے سب کو بزورِ شمشیر مطیع و خراج گزار بنایا اور اس صوبے میں وہ حکومت بنائی کہ کسی عہد میں یہ بات حاصل نہ ہوئی تھی[۵] انھی زمینداروں میں شیخ عبدالرحیم بجنوری کی اولاد تھی جو شیخ زادے کہلاتے تھے۔ انہوں نے لکھنؤ میں ایک محل بنا رکھا تھا جس کے دروازے پر ایک برہنہ شمشیر لٹکتی رہتی تھی اور صوبے دار دہلی سے وارد ہوتا تھا وہ اس محل کے پھاٹک سے جھک کر نکلتا تھا۔ اس طرح شیخ زادوں کی طاقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا تھا۔ جس وقت برہان الملک لکھنؤ میں وارد ہوئے اس وقت ان متمرد شیخ زادوں سے سخت مقابلے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی حکمت عملی سے

(گزشتہ صفحے سے آگے)

پرانے زمانے میں لکھنؤ نے بڑی ترقی کی تھی یورپین سیاح "لیکٹ" نے اپنے ایک رسالے میں جو ۱۶۳۱ء میں لکھا گیا۔ لکھنؤ کو ایک عظیم الشان بستی قرار دیا ہے۔ عہدِ اکبری میں یہاں ایک فرانسیسی تاجر نے گھوڑوں کی تجارت میں بڑا منافع اٹھایا تھا اور چوک کے قریب عالی شان عمارتیں تعمیر کرائی تھیں جو بعد میں نزولِ سرکاری قرار پائیں اور جب ملا نظام الدین سہالوی مرحوم لکھنؤ میں تشریف لائے تو یہ علاقہ عطیہ شاہی کے طور پر انہیں دے دیا گیا جو اپنے گرد و پیش کے تمام مکانات کے ساتھ "فرنگی محل" کہلاتے ہیں۔

محمد شاہ بادشاہ (۶۱-۱۱۳۱ھ) کے عہد میں اودھ کا صوبیدار چھبیلے رام تھا جب مرا تو اس کا بھتیجا گردھر ناگر صوبیدار بنا۔ اس کے بعد اودھ کی صوبے داری برہان الملک سعادت خاں کو تفویض ہوئی، جنہوں نے یہاں کے سرکش شیخ زادوں، زمینداروں، راجاؤں کی ذات اور شورہ پشتی کا خاتمہ کر کے ایک نئی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کا آغاز کیا۔

[۵] تاریخ اودھ جلد اوّل صفحہ ۳۸

ساتھ ساتھ ان طوائفوں کے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھکڑوں پر لد لد کر روانہ ہوتے اور ان کے گرد دس دس بانکے تلنگوں کا پہرہ رہتا، جب حکمراں کی یہ وضع تھی تو تمام امرا اور سرداروں نے بھی بے تکلف یہی وضع قطع اختیار کرلی اور سفر میں سب کے ساتھ رنڈیاں رہنے لگیں۔[1]

شجاع الدولہ نے بکسر کی شکست کے بعد یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اب دہلی کی مرکزی قوت ختم ہوچکی ہے اور انگریز نیا نیا اقتدار بڑھا رہے ہیں۔ اس لئے دہلی پر تکیہ کرنے کی بجائے اودھ کو مضبوط بنانا چاہیئے، چنانچہ انہوں نے تمام سیاسی قوتوں سے عارضی صلح کر لی اور اپنی تمام تر توجہ ریاست کو مضبوط بنانے میں لگادی۔ پھر اپنی خوش انتظامی اور علم وکمال دوستی سے صاحبان ہنر کے رجحان کو اودھ کی طرف منعطف کرادیا۔ جس کے نتیجے میں صدہا ارباب علم وفضل ڈھاکہ، بنگالہ، گجرات، مالوہ، حیدرآباد، شاہجہان آباد، لاہور، پشاور، کابل ملتان اور کشمیر سے کشاں کشاں فیض آباد میں داخل ہو رہے تھے۔ شاہی گھرانے سے اس وقت جن شعرا کا تعلق تھا۔ ان میں سودا، ابونی باتف، مرزا فاخر مکین، اشرف علی خاں فغاں، میر ضاحک اور میر حسن خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا کے کلام کو دیکھیے تو آپ کو یہاں کی زندگی کا رجائی پہلو نمایاں نظر آئے گا۔ ان کے کلام سے سوسائٹی کی خوش طبعی اور شگفتگی کا سراغ ملتا ہے۔

ابھی اودھ کی مکمل ترقی نہ ہو پائی تھی کہ دفعۃً شجاع الدولہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے مرنے کے بعد موصوف کے بڑے بیٹے نواب آصف الدولہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۵ء) میں تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے ایک سال بعد لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیض آباد پر خزاں آنا شروع ہوگئی اور پھر لکھنؤ کا دورِ ترقی شروع ہوا۔

نواب آصف الدولہ اپنے والد کے مقابلے میں نہ تو سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے تھے اور نہ ان میں حکومت چلانے کی پوری صلاحیت تھی لہٰذا اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انگریز کمپنی نے اودھ کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی شروع کردی جس سے مجبور ہوکر نواب نے کروڑوں روپیہ انگریزوں کی نذر کردیا۔ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کا نواب موصوف کی والدہ اور دادی سے جبراً روپیہ وصول کرنا ریاست کی کمزوری اور نواب کی بے بسی کا آئینہ دار ہے۔ اپنی انھی مجبوریوں اور احساس کمتری کی وجہ سے وہ جب تک زندہ رہے انتظام ملکی سے بے تعلق اور مذہبی معاملات وخیر وخیرات کے سلسلے میں مستعد رہے۔ عمر کے آخری حصے میں حکیم شفائی سے لاعلاج مرض پیدا کرنے کی تدبیریں پوچھتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے۔ آخر کار مرض استسقا میں مبتلا ہوکر راہی ملک عدم ہوئے۔[2]

نواب آصف الدولہ کو اپنے والد کا جمع کیا ہوا خزانہ ہاتھ لگا لہٰذا انہوں نے داد ودہش اور رعایا پروری کا وہ بازار گرم کیا کہ لکھنؤ میں مثل مشہور ہوگئی کہ "جس کو نہ دے مولا اُسے دے آصف الدولہ"[3] لوگ اٹھتے بیٹھتے عزت ومحبت کے ساتھ ان کا نام لیتے تھے اور ذاتی عیوب فیاضی کے دامن میں چھپ کر نظروں سے غائب ہوگئے۔

---

[1] گزشتہ لکھنؤ ص۱

[2] گل رعنا از مولوی عبدالحئی مرحوم ص۱۵۲

[3] خم خانہ جاوید از لالہ سری رام جلد اوّل ص۸۵

کے کچھ علاقے شجاع الدولہ کو واپس کر دیئے تو یہ محض ان کی مہربانی تھی، ورنہ بکسر کی جنگ نے چوبیس گھنٹے کے اندر اس بات کا فیصلہ کر دیا تھا کہ ہندوستان اب مسلمانوں کا نہیں انگریزوں کا ہے[1] پھر بھی شجاع الدولہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر علاقوں پر علاقے بڑھاتے چلے جا رہے تھے اور اپنی بلند ہمتی سے نہ کبھی خود کو کمپنی کا فرماں بردار سمجھتے تھے اور نہ بادشاہ دہلی کا۔ انگریزوں سے انہوں نے اگرچہ تخفیفِ فوج کا وعدہ کر کے صرف پینتیس ہزار سوار رکھنے کا اقرار کر لیا تھا مگر وہ برابر اپنی فوج بڑھاتے رہے۔
اس حوصلہ افزا عروج کے ساتھ دربار اور شہر میں بھی بڑی چہل پہل پیدا ہو گئی تھی۔ گلی گلی حسن اور علم و فن کا چرچا تھا۔ خوشحالی کی وجہ سے لوگوں کی زندگی میں اطمینان و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ فیض بخش اس زمانے کے فیض آباد کے چشم دید حالات یوں بیان کرتا ہے۔

"اپنے گھر سے پہلی مرتبہ نکلا تو ممتاز نگر پہنچا یہ مقام شہر کے مغربی دروازے سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں دیکھا تو ایک بازار لگا ہوا تھا اور خرید و فروخت کی گرم بازاری تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے، مٹھائیاں، شربت، فالودہ، کباب، پراٹھے، نان خطائیاں نظر آتی تھیں۔ راہگیر خریدنے میں عجلت کرتے تھے اور ایک دوسرے پر کثرتِ انبوہ میں گرے پڑتے۔ یہ ہنگامہ اور رونق دیکھ کر خیال گزرا کہ میں شہر میں داخل ہو گیا ہوں اور خاص چوک میں ہوں لیکن کسی نے مجھے بتایا کہ ابھی تو میں شہر پناہ کے دروازے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ آخر کار میں شہر میں پہنچا۔ ہر جگہ ناچنے اور گانے والے طائفے دیکھے۔ انہیں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک فوجوں کے ڈھولوں اور باجوں کی آوازیں برابر چلی آتی تھیں۔ گھڑیالوں کی صداؤں سے کان بہرے ہوئے جاتے تھے۔ گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، خچر، شکاری کتے، بیل گاڑیاں اور توپ لے جانے والی گاڑیاں قطار اندر قطار چلی جاتی تھیں، لباس فاخرہ پہنے شرفائے دہلی کے اعزا اور رشتے دار، اعلیٰ ہر شہر کے گانے بجانے والے قوال، بھانڈ اور طوائفیں گلی کوچوں میں نظر آتی تھیں۔ چھوٹے اور بڑے سب کی جیبیں زر و جواہر سے بھری تھیں کسی کے وہم و گمان میں بھی مفلسی اور فلاکت کا گزر نہ تھا۔ نواب وزیر شہر کی آبادی اور رونق کے ایسے خواہاں تھے کہ معلوم ہوتا کہ فیض آباد شاہجہان آباد کی ہمسری کا دعویٰ کرے گا"[2]

اودھ میں تعیش پسندی کا رجحان شجاع الدولہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ موصوف کا طبعی میلان مہ جبیں عورتوں اور رقص و سرود کی طرف تھا جس کی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والے طائفوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہو گئی کہ کوئی گلی کوچہ اس سے خالی نہ تھا اور نواب کے انعام و اکرام سے وہ اس قدر خوش حال اور دولت مند ہو گئی تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرے دار تھیں، جن کے ساتھ دو دو تین تین عالی شان خیمے رہا کرتے تھے اور نواب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے اور سفر میں ہوتے تو نوابی خیموں کے

---

[1] گزشتہ لکھنؤ از صفحہ ۲۶

[2] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۲۱-۲۲

لاکھ روپے سالانہ ماہوار قسطوں میں دیا کریں گے ۔ اس معاہدے کی وجہ سے نواب نے حساب کی جانچ کی ، ادنیٰ ادنیٰ چیزوں پر نظر ڈالی ۔ معافیوں اور جاگیروں کی سختی کے ساتھ چھان بین کی ۔ دربار کے مصارف میں جہاں تک ہو سکا کمی کی اور سلطنت کی آمدنی بڑھائی ، اس طرح بیرہ کروڑ روپیہ جمع کر لیا۔[1]

نواب موصوف کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے غازی الدین حیدر رجب ۱۲۲۹ھ میں تخت نشین ہوئے ۔ ان میں نہ تو والد کی سی بیدار مغزی تھی اور نہ سیاسی سوجھ بوجھ ، بلکہ کچھ نقص دماغی تھا ، کثرت منشیات سے مست رہتے تھے ۔ انہوں نے سعادت علی خاں کی گاڑھی کمائی کا روپیہ ارباب نشاط کے لئے وقف کر دیا ۔ باپ کے بھرے پُرے خزانے کو لٹانے کا موقع مل گیا اور لکھنؤ کے گلی کوچوں میں مینا بازار لگ گیا ان کے عہد میں انگریزوں نے اپنا سیاسی شکنجہ اور مضبوط کر لیا تھا ۔ اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ انگریز کمپنی نے نواب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ خود مختاری کا اعلان کر کے بادشاہ کا لقب اختیار کر لیں ۔ غرض کہ غازی الدین حیدر نے اپنے نام کا سکہ جس پر یہ شعر کندہ تھا شاہ دہلی کی خدمت میں روانہ کیا ۔

سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذو المنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

چونکہ دلی کی مرکزی طاقت احمد شاہ درانی اور مرہٹوں کی قوت کے آگے سپر ڈال چکی تھی ۔ اس لئے غازی الدین حیدر کی اس سرکشی کا جواب نہ دے سکی ۔ اکبر شاہ ثانی نے بس اتنا کیا کہ دلی سے ایک سکہ بھیجا جس پر یہ شعر کندہ تھا ۔

سکہ زد در جہاں از جور فلک
غازی الدین شہ حرام نمک[2]

بادشاہت کے اس اعلان کے بعد لکھنؤ والوں کا احساس تفوق اور تیز ہو گیا اور انہوں نے ادبی خود مختاری کا بھی اعلان کر دیا ۔ اگرچہ علم و فضل کی نمائش یہاں سعادت علی خاں کے زمانے سے شروع ہو چکی تھی ۔ لیکن جدید اصول کی ترویج کا باقاعدہ غلغلہ اسی دور سے بلند ہوا ۔ ناسخ نے اپنی زبان کو ٹکسالی زبان قرار دیا جس کے بعد ایک نئے دبستان شاعری کی بنیاد رکھی گئی ۔ اس کے علاوہ اگر زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی نظر ڈالی جائے تو انقلاب و تجدید کی اس تحریک کے نقوش صاف طور پر نظر آئیں گے ۔

غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد شاہ نصیر الدین حیدر ۲۸ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ کو تخت نشین ہوئے ۔ یہ بادشاہ ہوتے ہی عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے رجب علی بیگ سرور نے اپنی مشہور تصنیف "فسانۂ عبرت" میں ان کی عیش پسندی کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے ۔ دس سال کی بے اعتدالیوں کے بعد ۳ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ کو ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ ان کے بوڑھے چچا ،

---

[1] مرقع اودھ ص ۳۴
[2] گنجینۂ گنج ستائیگاں جلد دوم ص ۲۵۴

آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست و عشرت طلب بنا دیا تھا اور کسی کو موجودہ راحت و آرام کے انجام پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی۔ اس عیش پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظاہری صورت میں ان دنوں لکھنؤ کے دربار میں ایسی شان پیدا ہو گئی تو نہیں اور کسی دربار میں نہ تھی۔ اور ایسا سامانِ عیش پیدا ہو گیا تھا جو کسی جگہ نظر نہ آتا تھا۔[1]

آصف الدولہ خود شعر کہتے تھے میر سوز کے شاگرد تھے۔ انہوں نے شاعروں کی سرپرستی اور قدردانی خوب کی، موصوف کے دربار نیز دوسرے روسا امرا سے جو شعرا وابستہ تھے ان میں میر سوز، میر تقی میر، میر حسن، مصحفی، انشا، جرات، مرزا جان طپش، جعفر علی حسرت، سعادت یار خاں رنگین وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس دور کے شعرا میں بھی رومانی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کی سب سے اچھی مثال میر تقی میر ہیں۔ ان کے کلام میں بھی ماحول کی وجہ سے شدت تاثر کے بجائے دھیما پن پیدا ہو گیا تھا اور ان کو احساسِ حسن میں محبوب کی دلربایانہ ادائیں یاد نظر آنے لگی تھیں۔

اس عہد کا ایک اور کارنامہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ نواب آصف الدولہ نے مذہب تشیع کی اشاعت میں انتہائی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے نائب حسن رضا خاں کے مشورے سے اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے جمعہ و جماعت کا سلسلہ قائم کیا اور پہلی بار ۱۳ رجب سنہ ۱۲۰۰ھ کو غفراں مآب مولانا سید دلدار علی مجتہد کی اقتدا میں نماز پڑھی گئی۔ بقول مولوی عبدالحی مرحوم

"وہ پہلا دن ہے کہ وسط ہندوستان میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علیحدہ کر لئے۔ نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے ہاتھ میں زمامِ مذہب دے دی گئی"[2] جناب غفراں مآب مرحوم نے اپنے تمام شاگردوں کو ہندوستان میں پھیلا کر عقاید کی تبلیغ و جمعہ و جماعت کے قیام کے ساتھ بہت سے مذہبی مراسم قائم کئے تعزیہ داری کا طریقہ بھی عام مسلمانوں سے علیحدہ قائم کیا۔ تعزیوں کی شکلیں بدلیں۔ براق کی جگہ ذوالجناح، ماہی مراتب کے عوض علم اور پنجے، بانک پٹے کا فن دکھانے کے بدلے نوحہ خوانی اور سینہ زنی کو رواج دیا۔ اور شیعوں کو ایک مخصوص تہذیب و تمدن کے ساتھ ایک مستقل قوم بنا دیا۔[3]

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد چھ ماہ کے لئے ان کے لے پالک بیٹے وزیر علی مسندِ وزارت پر متمکن ہوئے ان کی معزولی کے بعد ۱۰ شعبان سنہ ۱۲۱۲ھ کو شجاع الدولہ کے بیٹے نواب سعادت علی خاں تخت نشین ہوئے وہ اودھ کے تمام فرماں رواؤں سے زیادہ بیدار مغز مدبر سیاست اور اس کے ساتھ نہایت کفایت شعار حریص فرمانروا تھے۔ ملک کا انتظام انہوں نے غیر معمولی ہوشیاری، خوبی اور شائستگی سے کیا اگر انہیں اپنے زمانے میں پورا اطمینان نصیب ہو جاتا تو یقین ہے کہ گزشتہ تمام بدنظمیوں اور خرابیوں کو اودھ سے دور کر کے مکمل اصلاح کر جاتے۔[4] انہوں نے مسند نشینی سے قبل ہی انگریزوں سے یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ کمپنی کو چھپن لاکھ کے عوض چھتہ

---

[1] گزشتہ لکھنؤ ص ۲۷

[2] گل رعنا ص ۱۵۳ بار سوم

[3] لکھنؤ کی زبان از شمس لکھنوی ص ۱۹-۱۸

[4] گزشتہ لکھنؤ ص ۳۷

دولت کی فراوانی تھی اس لئے عوام عیش پسند ہو گئے تھے، انہیں آرائش ونفاست، رکھ رکھاؤ کا شدید تر احساس تھا۔ تکلف اور تصنع فطرت کا جزو اعظم بن چکے تھے۔ وہ شرافت اور رواداری کا ایک بلند تصور رکھتے تھے حکومت شیعہ تھی اس لئے ایرانی تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ عوام کے کردار کی تعمیر ائمہ معصومین کی سیرتوں کے آئینے میں ہوئی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ کا باشندہ اپنی مخصوص وضع قطع، لب ولہجہ، اندازِ گفتگو، ادب اور سلیقے، نشست وبرخاست سے ہندوستان کے تمام دوسرے باشندوں کی نسبت بہت بلند وممتاز ہو گیا تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑا اتحاد تھا اور وہ آپس میں میل جول، محبت واخوت کی وجہ سے ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ خصوصیت کے ساتھ یہاں کے مسلمانوں نے ہندو کلچر کے اثرات کو بہت قبول کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کی بہت سی رسمیں مسلم معاشرت کا جزو بن گئیں۔ مثلاً اسلام نے بیوہ کی شادی اور طلاق پر کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ مگر یہ ہندو تہذیب سے دلی لگاؤ کا ہی اثر تھا کہ مسلمانوں میں بھی بیوہ کی شادی اور طلاق کو بہت معیوب سمجھا جانے لگا، شادی بیاہ کی بہت سی رسمیں تو بالکل ہندوانہ ہیں لیکن یہ اثرات تقسیم میراث اور سلام مسنون تک میں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ "گارڈن آف انڈیا" کا مصنف اروں لکھتا ہے۔

SPEAKING GENERALLY IT MAY BE SAID ALL OUDH MUSALMANS ARE MORE OR LESS HINDUS.

شیعہ حکومت ہونے کی وجہ سے لکھنؤ میں شیعیت اور عزاداری کو فروغ حاصل تھا۔ شیعہ عزاداری کو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر پورے خلوص واحترام کے ساتھ پورا کرتے تھے۔ بقول نائٹن:

"شیعہ لوگ صرف امام باڑوں میں جانے یا مجالس عزا میں شریک ہونے ہی سے امام سید الشہدا کا سوگ نہیں مناتے بلکہ زمانۂ عزاداری میں اپنے نفس پر بھی جبر کرتے ہیں اور تکلیفیں سہتے ہیں۔ وہ بہت متبذل، معمولی کھری چارپائیوں پر یا صرف چٹائی بچھا کر زمین پر لیٹتے ہیں۔ موٹا جھوٹا کھاتے پیتے ہیں۔ گرم سالن اور مزے دار پلاؤ پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ عورتیں اپنے زیور بڑھا ڈالتی ہیں اور بناؤ سنگار کی تمام چیزیں بالائے طاق رکھ دیتی ہیں"[1]

بول چال کی زبان اردو تھی۔ مگر سرکاری کام کاج فارسی میں ہوتا تھا۔ اس لئے لوگوں میں فارسی زبان وادب کا بڑا چرچا پیدا ہو گیا تھا اور وہ اسی میں اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ تعلیم کی طرف حکومت اور عوام کی خاص توجہ تھی۔ پورے اودھ میں مدرسوں اور مکتبوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا جس میں بچے تعلیم پاتے تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم مدرسوں کے علاوہ مسجدوں اور خانقاہوں میں بھی ہوتی تھی۔ وہاں قرآن مجید کی تعلیم کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔ ہندوؤں کی تعلیم برہمنوں اور کائستھوں کے ذمے

---

[1] شباب لکھنؤ ص ۲۹

محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ موصوف کی طبیعت ناچ گانے اور کھیل تماشے کی طرف مائل نہ تھی۔ وہ تخت پر بیٹھتے ہی انتظام سلطنت اور امور خیر کے سرانجام دینے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے کفایت شعاری کے اصول جاری کئے اور انتظام کو سنبھالنے کی ہرممکن کوشش کی اپنے مختصر سے دورِ حکومت میں انہوں نے شہر کو بڑا پررونق اور خوبصورت بنا دیا۔ ان کے زمانے میں شہر کی آبادی میں بھی بڑا اضافہ ہوا۔ انہوں نے بارہ لاکھ روپے سے ایک وقف قائم کیا اور غربا و مساکین کی پنشنوں اور وظائف کا سلسلہ جاری کیا جس سے آج تک صدہا افراد مستفید ہو رہے ہیں۔

محمد علی شاہ پانچ برس حکومت کر کے رحلت کر گئے اور ان کی جگہ ان کے بیٹے امجد علی شاہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ کو تخت نشین ہوئے۔ وہ اپنے والد سے بھی زیادہ محتاط اور پابند شریعت تھے۔ شرر نے انہیں "نماز گزار شب زندہ دار" کہا ہے ان کے عہد میں علمائے مذہب کو بڑا عروج حاصل ہوا اور سلطنت کا کام زیادہ تر علما کے ہاتھ میں آگیا۔ دربار شعر و شباب کی رنگینیوں سے زیادہ مذہبی معاملات کی طرف متوجہ رہا اور ایک خشک اور پھیکی علمی فضا کا دور دورہ رہا جس کی بدولت مرثیہ خوب چمکا اور اس نے غزل پر تفوق حاصل کر لیا۔

۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ کو واجد علی شاہ تخت حکومت پر متمکن ہوئے۔ انہوں نے اس کمی کو پورا کیا۔ اول وہ نظام سلطنت کی درستی کی طرف متوجہ ہوئے، دربار، فوج اور انتظامی امور کی سختی سے نگرانی کی۔ لیکن کمپنی اور اس کے ہواخواہوں کی مداخلت سے تنگ آکر تصنیف و تالیف، شعر و ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ سے دل بہلانے لگے۔

واجد علی شاہ کے عہد میں تہذیب کے ہر شعبے میں انتہائی ترقی ہوئی اور لکھنوی خصوصیات زیادہ واضح اور شاندار نظر آنے لگیں۔ یہاں کا کلچر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ابھر کر ایک حسین و جمیل پیکر میں تبدیل ہو گیا، لیکن ۱۸۵۶ء میں یکایک اس عظیم اور روشن تہذیبی دور کا خاتمہ ہو گیا اور ملک انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ جنہوں نے ہندوستانی تہذیب کی صدیوں پرانی کمائی کو ہڑپ کر لیا جو اب ہمیں کبھی بھی میسر نہ ہو سکے گی۔

شرر مرحوم نے شاہانِ اودھ کے لکھنؤ کو ہندوستان میں مشرقی تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ قرار دیا ہے۔ یہ بیان یقیناً بالکل درست ہے کیونکہ اس دور کے لکھنؤ میں عوام کو ہر طرح کا سکون و اطمینان میسر تھا۔ اس لئے ان کی زندگی بھی بڑی متنوع ہو کر رنگا رنگ دلچسپیوں میں گھر کر رہ گئی تھی اور تہذیب کی نفاست اور پاکیزگی نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کر کے نوک پلک سے درست کر دیا تھا جس کے بعد ہر طرف تکلف و شائستگی کا دور دورہ ہوا۔

اودھ کی آبادی عہد غازی الدین حیدر میں ایک کروڑ بارہ لاکھ تھی اور لکھنؤ کی آبادی ڈھائی لاکھ سے کچھ زیادہ جس میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا۔

آبادی کے دو خاص جز تھے، ہندو اور مسلمان جن میں بڑے گہرے اور برادرانہ مراسم تھے اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے شادی و غم میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ عوام کی اخلاقی حالت بہت اچھی تھی۔ لوگوں کے کردار بہت بلند تھے، جو

سلاطین کی تعیش پسندی اور لپیٹ مذاقی کی بدولت لکھنؤ کی معاشرت میں طوائف اور بازاری اور ادنی طبقے کی عورتوں کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ ان میں سے بہت سی شاہوں کی منظورِ نظر ہو کر بیگمات اور محلات کے درجے تک پہنچیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیروں کی وضع میں ہی داخل ہو گیا کہ اپنا شوق پورا کرنے یا اپنی شان دکھانے کے لئے کسی نہ کسی بازاری حسن فروش سے ضرور تعلق رکھتے تھے[1] اور اسی لئے کہا جاتا تھا کہ جب تک انسان کو رنڈی کی صحبت نصیب نہ ہو آدمی نہیں بنتا۔ لکھنؤ میں طوائفوں کے مکان شرفا کے کلب تھے[2]۔ ان ارباب نشاط کی محفلوں سے یہ ضرور ہوا کہ عوام میں نفاست پسندی و تکلف اور تصنع پیدا ہو گیا۔ وضع قطع طرزِ کلام وغیرہ میں بڑی حد تک نرمی آگئی۔

اس کے علاوہ ہر خاص و عام کی تفریح کا خاص مرکز میلے ٹھیلے اور مقدس مقامات بھی تھے۔ درگاہ حضرت عباس علمبردار مقبرۂ شاہ نصراللہ خلوتی (گئو گھاٹ)، کالی جی کا مندر (سعادت گنج) بھیروں جی کا مندر (پل جھاؤ لال) میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے تھے ہر نوچندی کو حضرت شاہ مینا کے مزار پر محفل ہوتی تھی جہاں ہفتے کے لوگوں کا مجمع ہوتا اور قوالی و رقص کی محفلوں میں عقیدت مند اپنے فن کا بہترین نمونہ پیش کرتے تھے۔ مفتی عظمت علی کاکوروی مرقع خسروی (سال اتمام ۱۲۸۶ھ) میں تحریر فرماتے ہیں:

"درگاہ شاہ حضرت مینا دلی زیارت گاہ ہر خاص و عام ہے۔ ہر نوچندی جمعرات کو وہاں جلسے ہوتے ہیں۔ رنڈیاں وغیرہ کل اہل کسب ابتدائی نمود میں حصول مراد و شہرت کے معتقدانہ . . . . آتے ہیں۔ سب ہندو و شیعہ سنی بخلوص مانتے ہیں"۔

بوڑھے مصحفی (متوفی ۱۲۴۰ھ) درگاہوں، کربلاؤں سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرماتے ہوئے وہاں جانے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں

نوچندی آئی دھوم سے چل تو بھی مصحفی
جاتی ہیں کربلا کو حسینوں کی ڈولیاں

انشا فرماتے ہیں ؎

کچھ نہیں معلوم پوچھو کون سا میلہ ہے آج
جاتیاں ہیں جو کھچا کھچ ڈولیوں پر ڈولیاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کی امداد ملتی تھی اور دوسرا لا مارٹینر کالج جو ۱۸۵۰ء میں قائم ہوا تھا اور اب تک موجود ہے۔ اس اسکول میں انگریزی کے علاوہ اردو فارسی اور عربی کی تعلیم کا انتظام تھا۔ یہاں کے فارغ طلبہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی میں بڑی آسانی سے ملازمت مل جاتی تھی۔ جس میں ۳۷ انگریز، ۶۶ ہندو اور ۷۴ مسلمان تھے۔

(ملاحظہ ہو پولیٹیکل پروسیڈنگس بابت ستمبر ۱۸۵۰ء ۔ ۸ اگست ۱۸۵۱ء)

[1] و [2] گزشتہ لکھنؤ ص ۲۱/۲۴۲

تھی۔ ان کے بھی بڑی تعداد میں اسکول تھے جس میں سنسکرت کے علاوہ اردو اور فارسی کی بھی پڑھائی ہوتی تھی۔ پنڈت اعلیٰ تعلیم کے لئے بنارس جاتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ان کی ہر طرح سے اعانت ہوتی تھی اور انہیں بڑی بڑی اراضیاں معافی دی گئی تھیں۔ اگرچہ ہندو عورتیں اور لڑکیاں تعلیم سے غافل تھیں، مگر مسلمان لڑکیاں باقاعدہ تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے اودھ کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے۔

"اگرچہ ہندوستان کے سارے صوبوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہاں علماء موجود ہیں۔ لیکن صوبۂ اودھ اور صوبۂ الہ آباد کو وہ خصوصیت حاصل ہے جو کسی اور صوبے کے حصے میں نہیں آئی ہے کیونکہ اودھ اور الہ آباد دونوں ہی صوبوں میں پانچ پانچ یا زیادہ سے زیادہ دس دس کوس کے فاصلے پر شرفاء اور نجیبوں کی بستیاں آباد ہیں۔ ان کو بادشاہوں اور حاکموں سے وظیفے، زمین اور مدد معاش ملتی ہے اور انھوں نے مدرسے، مسجدیں اور خانقاہیں بنائی ہیں اور یہاں کے مدرسوں نے ہر جگہ علم حاصل کرنے والوں پر علم کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ طالبانِ علم گروہ در گروہ آتے ہیں اور جہاں بھی حالات موافق ہوتے ہیں، تحصیلِ علم میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ پھر بستی کے صاحبِ توفیق طالب علموں کی دست گیری کرتے ہیں اور اس جماعت کی خدمت کو سعادتِ عظمیٰ جانتے ہیں[1]۔"

لیکن علم و ادب کی سب سے بڑی درس گاہ لکھنؤ تھا۔ مولانا سید دلدار علی صاحب مرحوم مجتہد (غفرانمآب) کی تحریک سے حکومت نے شیعہ بچوں کی مذہبی تعلیم پر خصوصی توجہ صرف کی تھی۔ اور آصفی امام باڑے میں تعلیم کا انتظام کیا گیا، جہاں وہ اور ان کے صاحبزادگان نے علم کے چراغ روشن کئے اور شیعوں کے بڑے بڑے علماء پیدا کئے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں ایک دوسرا سرکاری مدرسہ کھولا گیا جس کا ماہانہ خرچ دو ہزار چھ سو روپے تھا۔ یہ واجد علی شاہ کے عہد تک قائم رہا اور انگریزی عمل داری قائم ہوتے ہی تمام اسٹاف کو پنشن دے کر اس مدرسے کو بند کر دیا گیا۔ حضرات اہل سنت کی مذہبی اور دینی تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ فرنگی محل میں قائم تھا جس کے بانی ملا نظام الدین سہالوی مرحوم (۱۷۴۸ء) تھے جن کے نام پر درس نظامی آج تک موجود ہے۔ اسی طریقۂ تعلیم کو شیعوں نے بھی اختیار کیا اور آج تک شیعوں کی جملہ دینی درس گاہوں میں یہی درسِ نظامی رائج ہے۔ ہندوؤں کی تعلیم کا ایک مدرسہ بنیاد گنج میں قائم تھا[2]۔

---

[1] مآثر الکرام۔ دفتر اول۔ ص ۲۲۲

[2] شاہ نصیر الدین حیدر کو انگریزی سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ خود انگریزی پڑھتے تھے اور انہوں نے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کو بیس ہزار روپیہ اودھ میں انگریزی تعلیم کی ترویج کے لئے دیا تھا۔ ایشیاٹک جرنل، دسمبر ۱۸۲۹ء کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہ مذکور کے حکم سے لکھنؤ میں ایک کالج قائم کرنے کا منصوبہ بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ مسٹر سیڈن کا تقرر بحیثیت پرنسپل کے ہو بھی گیا تھا۔ لیکن بادشاہ کے اچانک انتقال کی وجہ سے اس کام کی تکمیل نہ ہو سکی۔

کرسچین مشنریوں نے یہاں دو اسکول قائم کئے تھے۔ ایک گرلس اسکول جسے حکومت کی طرف سے دو سو روپے ماہوار

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

مرغ، تیتر، کلدم اور کبوتر لڑائے جاتے تھے۔ لیکن عوام کا مرغوب ذوق کبوتر، مرغ اور بٹیر لڑانا تھا۔ میر نے اپنی مثنوی مرغ بازاں میں مرغوں کی پالیوں کا ذکر کیا ہے۔ انشا نے اس فن کے تمام اصول مثنوی مرغ نامہ میں قلم بند کئے ہیں، نواب سعادت علی خاں ایسا بیدار مغز بھی مرغبازی کا بہت دلدادہ تھا۔[1]

ان تمام واقعات سے لکھنؤ والوں کی بے فکری، حسن پرستی، فارغ البالی اور رومانی زندگی کا پتا چلتا ہے۔ جس میں عوام سے لے کر خواص تک سب ایک رنگ، ایک حال میں مست تھے اور وقت نے انہیں اس احساس سے بے گانہ کر دیا تھا کہ وہ زندگی کے زوال آمادہ دور سے گزر رہے ہیں۔ تاہم وقت کے تقاضوں اور ماحول کے نئے نئے رجحانات شعر و ادب پر کافی اثر انداز ہوئے جن کو سمجھے بغیر لکھنوی طرز کی تصنیفات کو نہیں پرکھا جا سکتا۔

موسیقی کے فن نے بھی یہاں بڑی ترقی کی۔ شجاع الدولہ کی قدر دانی سے سارے ہندوستان کے موسیقی داں اودھ میں جمع ہو گئے تھے۔ آصف الدولہ کے عہد میں موسیقی پر ایک نایاب کتاب[2] اصول النغمات الآصفیہ لکھی گئی۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں ایک بہت بڑا کامل فن حیدری خاں یہاں موجود تھا۔[3]

رقص کے فن نے بھی لکھنؤ میں ترقی کی۔ یہاں کی طوائفیں سارے ہندوستان میں مشہور تھیں۔ روسا کے لئے ناچ دیکھنا منضبط اوقات میں شامل تھا۔ ارباب نشاط کے علاوہ ناچنے گانے والوں کا ایک گروہ اور پیدا ہو گیا تھا جو کشمیری بھانڈ کہلاتے تھے۔ یہ نقل کرنے میں استاد ہوتے تھے۔ عورتوں کی تفریح کے لئے ڈومنیاں ہوتی تھیں جو ناچ اور گانوں کے علاوہ بھانڈوں کی طرح نقل کرتی تھیں۔ ہر محل اور ڈیوڑھی پر ڈومنیوں کا طائفہ ضرور نوکر ہوتا تھا۔[4]

اس کے علاوہ لکڑی، پٹہ، بانک، بنوٹ، کشتی، برچھا، تیر اندازی وغیرہ بہادری کے فنون تھے۔ جنہیں یہاں کے عوام ضرور سیکھتے تھے۔ نائیٹن نے یہاں کے قدآور اور مسلح نوجوانوں کی تعریف کی ہے وہ لکھتا ہے:

"لکھنؤ کے باشندے بالعموم اونچے بنے نظر آئیں گے۔ ان کے پاس ڈھال، تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہو گی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار کرتے ہیں وہ بھی تلوار ضرور باندھتے ہیں گو حضرات جب سیر گشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک کیوں نہ پہنے ہوں مگر طمنچہ کی جوڑی اور ڈھال دونوں لگائے ہوں گے۔ گینڈے کی کھال سے منڈھی ہوئی ڈھال جس میں پیتل کے پھول لگے ہوتے ہیں اکثر بائیں جانب کاندھے پر پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے مہیب صورت راجپوت اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان ڈھال

۱؎ گزشتہ لکھنؤ ص۱۱۱

۲؎ و ۳؎ آخری تاجدار اودھ از نقی احمد ص۱۱۲

۴؎ گزشتہ لکھنؤ ص۳۲۶

سند کہتے ہیں ؎

میلہ ہے چاند گنج میں سورج گہن سا آج
تم کس لئے نہ غیرتِ شمس و قمر گئے"

مرزا رجب علی بیگ سرور فسانۂ عجائب (۱۲۴۰ھ) میں عیش باغ کے میلے کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"عیش باغ میں تماشے کا میلہ، سرو قد چمن کا جلسہ، موتی جھیل کا پانی چشمۂ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا، پیاسوں کا دل لہراتا۔ ٹانہ سنگار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا، زنگار نگ کی پوشاک آپس کی جھانک تاک"

ایک دوسرے مقام پر فرنگی محل کے میلے کا ذکر یوں کیا ہے۔

"وہاں سے بڑھا کان میں آواز آئی میلے کے یار پڑے ہیں شوقین البیلے بہن لے چلا جا فرنگی محل کے میلے کو"

محمد رضا برق بعید غدر ان میلوں، ٹھیلوں، سیر تماشے کو یاد کر کے فرماتے ہیں ؎

سقّے کیوڑے سے چھڑکتے تھے ہماری سڑکیں
پلکوں سے جھاڑتی تھی باد بہاری سڑکیں
غیرتِ گلشن فردوس تھیں ساری سڑکیں
رہتی ہیں پیشِ نظر ہائے وہ پیاری سڑکیں

پڑی ہم چھوڑتے تھے گومتی پر بھادوں میں
جلسے رہتے تھے شب و روز پریزادوں میں
شہرے تھے اپنے فنِ عشق کے استادوں میں
لوگ کہتے تھے ہمیں زلف کے آزادوں میں

بے فرنگی محل ان روزوں میں آرام نہ تھا
رات دن سیر سپاٹے کے سوا کام نہ تھا

لکھنؤ کی معاشرت میں تفریح کے اور بھی کئی شعبے تھے مثلاً چوسر، شطرنج اور چکپی، مگر سب سے زیادہ پتنگ بازی اور جانوروں کی لڑائی کا تماشا لکھنؤ والوں کو پسند تھا۔ یہاں پتنگ بازی کے شوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آصف الدولہ کی تکل میں پانچ روپے کی مقیش کی جھلجھلی ہوتی تھی جو لوٹ کر لاتا اسے پانچ روپے دے کر لے لی جاتی تھی [۱] جانوروں میں یہاں شیر، چیتے، ہاتھی، گینڈے

[۱] گزشتہ لکھنؤ ص ۱۱۱

کلکتے کے عجائب گھر میں موجود ہے[1] مٹی کے کھلونے بنانا، کپڑے پر جالی کاڑھنا، چکن اور زردوزی کا کام، ہاتھی دانت کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بنانے، تعزیے بنانے اور فرد و رضائی کی چھپائی وغیرہ میں لکھنؤ بہت مشہور تھا۔

اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی میں اودھ کی معاشی حالت کا ہمیں بہت کم علم ہے۔ اس کے برخلاف سماجی حالات سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ذیل میں معاشی حالت کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

شجاع الدولہ کے عہد میں ایک مزدور ایک روپے مہینے میں اپنا پیٹ پال سکتا تھا[2] سید محمد بلگرامی نے تبصرۃ الناظرین میں الہ آباد کے نرخ قلم بند کئے ہیں۔ جو ۱۷۶۴ء کے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

وہ یہ سال نہایت گرانی کا ہے اور اس وقت گیہوں ایک من دس سیر، ارد ایک من دس سیر، سرخ چاول ایک من فی روپے کے حساب سے سفید چاول ایک روپیہ میں، ۳۰ سیر، گھی ۲ سیر، کودوی ۳ من۔ ۲۰ سیر سرخ شکر، ۳۰ سیر اور سفید شکر، روپے فی سیر کے حساب سے فروخت ہوتی ہے۔ (سیر میں ۹۶ تولے ہوتے تھے)

سعادت علی خاں کے وقت میں تین سال تک گیہوں روپے کا تیس ۳۰ سیر فروخت ہوا تھا[3] نجابت حسین خاں جو ۲۲ محرم ۱۲۵۹ھ کو چہلم دیکھنے کی غرض سے عظیم آباد سے لکھنؤ آئے تھے۔ انہوں نے یہاں کی دلفریبیوں کا تذکرہ ایک روزنامچے کی صورت میں قلم بند کیا ہے جس کا نام سوانح لکھنؤ ہے۔ اس میں موصوف نے اجناس کے بازار کا بھاؤ اس طرح تحریر کیا ہے۔

گیہوں کا آٹا ۲۴ سیر فی روپیہ، باسمتی چاول ۱۵ سیر فی روپیہ، معمولی چاول ۲۰ سیر فی روپیہ، چنا ۳۰ سیر فی روپیہ، خصی کا گوشت ۴ سیر فی روپیہ، گھی روپے میں پونے دو سیر، دال ارہر تیس سیر فی روپیہ، دال مونگ بیس سیر فی روپیہ، بازار کا گھی جس میں کھنڈی کا روغن ملا ہوتا تھا۔ روپے میں دو سیر بکتا تھا۔ شہر میں عام طور سے اسی گھی کا رواج تھا۔ عوام الناس اور بعض خواص بھی یہی گھی استعمال کرتے تھے۔ ملائی فی سیر بارہ ٹکے کے حساب سے بکتی تھی۔ جلاون کی لکڑی روپے میں ساڑھے تین من ملتی تھی۔ لکھنؤ کا روپیہ گورکھپوری پیسے کے حساب سے بائیس گنڈے کا ہوتا تھا۔

دکانوں کے بارے میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ یہاں ہر جنس و قماش کی چیزیں موجود ہیں۔ لکھنؤ کے کاریگر موجدانہ طبیعت رکھتے ہیں ان کی صنعت گری دیکھ کر صناعان چین کی عقل بھی دنگ ہے۔ بازار میں اہل حرفہ، بزازوں، صرافوں، جوہریوں اور زردوزوں کی دکانیں ہیں۔ بزازوں کی دکانوں میں دیسی اور ولایتی کپڑے بھرے ہیں۔ یہاں ململ، جامدانی، ڈوریا، چارخانہ، کامدانی، انواع و اقسام کے پارچہ جات موجود ہیں۔ جالی لوٹ، کامدار، بن سکہ، کشمتی اور سمتی، انگریزی اور فرانسیسی۔ کپڑوں میں سوتی، ریشمی، چھینٹ، مشروع، دانہ دار، گلبدن اور ساٹن بھی ہیں۔ خاص لکھنؤ کے بنے ہوئے کپڑے بیلدار، گلکار، زرتار، زرنگار اور زری کمخواب بھی فروخت ہوتے ہیں[4]

---

[1] انگریزوں کے عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، از عبداللہ یوسف علی ص ۹

[2] شجاع الدولہ از سری واستو: ص ۳۴۲ جلد دوم۔

[3] تاریخ اودھ: جلد چہارم ص ۳۵

[4] لکھنؤ سوا سو برس پہلے۔ نیا دور مئی ۱۹۶۰ء ص ۱۴

سے لیس تنے براتے نظر آتے ہیں اور اہلِ لکھنؤ کی پندارِ خودی و خود پسندی اور جوشِ نبرد آزمائی کو بخوبی عیاں کرتے ہیں۔ باشندگانِ لکھنؤ میں اسلحہ کا مذاق بچپنے ہی سے پیدا کرایا جاتا ہے۔ تیر اور برچھے یہاں لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں۔ اور جس طرح انگریز دائیاں بالعموم بچوں کے ہاتھوں میں جھنجھنے دے دیتی ہیں اسی طرح یہاں چھوٹے چھوٹے طمنچے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو پکڑا دی جاتی ہیں[1] غرضیکہ اس طرح کے سپاہیانہ علوم کا شوق لکھنؤ میں واجد علی کے دور تک ملتا ہے۔

سلیمن نے اپنی رپورٹ میں جو ٹھگی کے استیصال پر لکھی گئی تھی اس میں اودھ کے عوام کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس میں سلیمن نے ٹھگوں کی بہادری کی بڑی تعریف کی ہے، ان حقائق کی روشنی میں لکھنوی شاعری پر نسائیت کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ صحیح نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ معترضین اپنے مطلب کے چند اشعار چن لیتے ہیں اور وہ ضخیم سرمایہ نظر انداز کر دیتے ہیں جو لکھنؤ کے مردانہ صفات و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، داستانیں، مرثیے اور مثنویوں میں ایسے اشعار کثیر تعداد میں ملتے ہیں جن میں بہادری کے تذکرے ہیں۔

لکھنؤ کی زندگی یکسر امن و امان سکون و اطمینان آرام و آسائش کی تھی، شجاع الدولہ کے عہد سے غدر تک یہاں کے عوام کو کبھی کسی طرح کی ہلاکت سے دوچار ہونا نہیں پڑا تھا اس لئے لکھنؤ اور اس کے اطراف و جوانب میں صنعتوں کو پروان چڑھنے اور ہنرمندوں کو بہت طویل عرصے تک اپنے کام میں مشغول رہنے اور آرام و سکون کے ساتھ زندگی گزارنے کا اچھا موقع ملا تھا۔ لہٰذا یہاں کے فنون روزافزوں ترقی کرتے رہے اور یہاں کی زندگی میں رعنائی اور رنگا رنگی پیدا ہوتی اور ابھرتی رہی۔ لارڈ ہسٹنگز نے اپنے ایک رسالے میں یہاں کے کاریگروں کی تعریف کی ہے، وہ لکھتا ہے۔

AT LUCKNOW ARE TO BE FOUND THE BEST ARTISANS AND MECHANICS OF EVERY KIND MEN LITTLE INFERIOR IN SKILL TO OUR BEST WORK MEN AT HOME (IN ENGLAND

لکھنؤ میں علمی فنون مثلاً خطاطی اور مصوری کو خصوصاً بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہاں خطاطی کے بہت سے ماہرین جمع ہو گئے تھے عہدِ آصفی میں حافظ نور اللہ اور ان کے بیٹے ابراہیم خطاطی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ یہ حضرات خربوزے کے بیج پر سورۃ فاتحہ و قل ہو اللہ اور دانے کی دال پر نادِ علیؓ و پنجتن کے نام لکھتے تھے۔ امام باڑہ حسین آباد پر طغرے خوش نویسی کے مظہر ہیں[2]

مصوری میں بھی یہاں کاملین جمع تھے جن میں لالہ ٹھاکر داس کا جواب نہ تھا۔ ان کے علاوہ شاہانِ اودھ نے اچھے اچھے پینٹرز کمپنی کی وساطت سے کلکتے سے بلوائے تھے جن میں مسٹر ہیوم، مسٹر مرائے، مسٹر زوفنی، مسٹر مونٹز وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

آرائشی اور کار آمد فنون میں بھی لکھنؤ اس زمانے میں ایک نمایاں مقام رکھتا تھا۔ لکھنؤ کی میناکاری کا ایک خوبصورت نمونہ

---

[1] شبابِ لکھنؤ ص۳

[2] ہنرورانِ اودھ ص۱۸

گرد و پیش

تصویر کا ایک رُخ

آزاد وطن کا ایک باغیرت افسر

خبر آئی ہے کہ ہمارے محکمۂ ڈاک و تار کے افسر نے کسی مراسلے کا جواب اس لئے نہیں دیا کہ وہ اردو میں لکھا ہوا تھا۔ افسر نے مطالبہ کیا کہ مراسلہ انگریزی زبان میں ہونا چاہیئے۔

ذہنیت کا فرق

رومانیہ کے ایک فن کار آج کل پاکستان آئے ہوئے ہیں اور پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں اپنے فن، اپنی روایات اور اپنی قومی خصوصیات اور صفات کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ گو کہ پاکستانی اب خود کو ایک آزاد قوم سمجھتے ہیں، مگر اکثر آزاد غلام رومانیہ کے فنکاروں کی گوری صورتیں دیکھ کر انگریزی میں گل افشانیٔ گفتار کرنے لگتے ہیں اور بیچارے رومانیہ کے فنکار حیرت سے انہیں دیکھ کر کندھے ہلا دیتے ہیں۔ اب بیچارے پاکستانیوں کو کون سمجھائے کہ ساری دنیا انگریزوں کو صاحب نہیں مانتی۔

صدر یا پریسیڈنٹ

ریڈیو پاکستان نے اپنی لسانی پالیسی کے تحت صدر کے لفظ کو اچھوت قرار دے کر "پریسیڈنٹ" کا "عام فہم" لفظ اختیار کر لیا تھا، مگر قوم کو بہت حیرانی ہوئی جب خبروں میں صدر ٹیٹو اور پریسیڈنٹ ایوب کے لفظ بار بار نشر کئے گئے۔

اردو کے ٹیلی پرنٹر

۱۳ جنوری ۱۹۶۸ء کو اردو ٹیلی پرنٹر سروس کا آغاز ہوا، اس موقع پر ایک تقریب میں ملک بھر کے صحافی، وزارت اطلاعات و نشریات کے معتمد اور دوسرے معزز مہمان موجود تھے۔ اردو کے یہ ٹیلی پرنٹر ایسوسی ایٹیڈ پریس آف پاکستان نے حال ہی میں خریدے ہیں، معتمد وزارت اطلاعات و نشریات نے کہا کہ اس اقدام سے اردو صحافت کی رفتار ترقی بڑھ جائے گی۔ ۱۸ جنوری سے پہلی بار اردو ٹیلی پرنٹروں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ لاہور اور راولپنڈی میں اے پی پی کے دفاتر میں نصب شدہ اردو ٹیلی پرنٹروں

لیکن اتنی ارزانی، خوش حالی، بازاروں میں چہل پہل اور رونق کے باوجود یہیں کی قدیم باشندہ مسز میر حسن علی کے خیال میں غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں شہر زیادہ رونق دار تھا اور اس زمانے میں یعنی عہد امجد علی شاہ میں بادشاہ کی دنائت وخست طبع کے باعث شہر میں ویرانی کا عالم ہے [1]

اس دور میں غریب بھی نہال تھے۔ اس لئے کہ امراء کے شعار میں یہ چیز داخل تھی کہ وہ فیاضی سے داد و دہش کریں جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں کی پرورش ہوتی تھی۔ ہر امیر کا دسترخوان بہت وسیع تھا اور یہ لوگ اکثر جاڑوں میں اپنے نوکر چاکر اور متوسلین کو جڑاولیں بانٹتے تھے محتاج اور غریب کو خیرات اور صدقہ دینا مذہبی فرض سے بھی بڑھ گیا تھا اور شانِ امارت میں یہ چیز داخل تھی کہ امرا اور روساء کی سواریوں کے نکلنے کے وقت محتاج جمع ہوتے تھے اور ان کو نچھاور کے طور پر خیرات ملتی تھی۔ جس میں حیثیت کے مطابق پیسے، روپے اور اشرفیاں تک ہوتی تھیں۔ محرم کے دس دن اس قدر خیرات ہوتی تھی کہ غریبوں کے گھروں میں کھانا نہیں پکتا تھا۔ اس کے علاوہ غریبوں کی لڑکیوں کی شادی کا خرچ برداشت کرنا اور جہیز دینا بڑا ثواب سمجھا جاتا تھا۔ کنوئیں کھدوانا، پل بنانا اور سرائے یا دھرم شالوں کی مرمت کرانا امراء اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ اس طرح بہت سی دولت امراء کی خودبخود غریبوں کے کام آتی تھی اور غربا کی مفلسی رفع ہوتی تھی [2]

الغرض یہ ہے اس مشرقی تمدن کے آخری نمونے کی مختصر سی داستان جس کا مطالعہ کئے بغیر لکھنوی ادب کو نہیں پرکھا جا سکتا کیونکہ یہاں کے مخصوص ماحول اور پرتکلف طرزِ معاشرت نے جس آراستہ پیراستہ تہذیب و تمدن کی تعمیر کی اس کی بہت واضح نشانیاں یہاں کے تمام اصنافِ سخن میں ملتی ہیں۔ لکھنؤ کی ادبی تخلیقات نے اپنے عصری رجحانات کی ترجمانی جس خوبی سے کی اس کی مثال دوسری زبانوں کے ادب میں مشکل سے ملے گی۔

یہاں کے ادب میں ہر شخص کے ذوق و شوق کی تسکین کا مکمل سامان موجود ہے، اگر آپ کو شعر و ادب میں روحانیت، اخلاق، تصوف، فلسفہ، وارداتِ قلب، علوئے تخیل، جذبات اور زبان و بیان کی صفائی کے نمونے دیکھنا ہوں تو لکھنوی ادب کا بغور مطالعہ کیجئے۔ یہاں کے ادب میں گہرائی، گیرائی، قافیہ پیمائی، تمثیل نگاری، اصناف میں تنوع غرض کہ جملہ خوبیاں موجود ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ معترضین لکھنؤ کے شہ پاروں کا مکمل جائزہ لیئے بغیر، اور ان تمام عوامل کو نظر انداز کرتے ہوئے جن سے یہاں کے ادب کی تعمیر ہوئی، اپنے فیصلے صادر فرما دیتے ہیں۔

---

[1] لکھنؤ، سوا سو برس پہلے، نیا دور مئی ۱۹۶۰ء ص ۱۴

[2] آخری تاجدار اودھ از نقی احمد ص ۹ - ۱۱۰

ماسکو میں پاکستانی فنون لطیفہ

پاکستان کے فنون لطیفہ اور مصوری کی نمائش ماسکو میں مشرقی فنون کے عجائب گھر میں ہو رہی ہے۔ یہ نمائش سوویت یونین اور پاکستان کے ثقافتی تعلقات اور بڑھتے ہوئے تعاون کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس نمائش کا افتتاح مشہور مستشرق پروفیسر گافگوروسکی نے کیا ہے اور اس موقع پر روس میں پاکستانی سفیر جناب سلطان احمد علی نے شرکت کی۔

مغربی پاکستان اساتذہ کنونشن

کراچی میں ۲۸ دسمبر کو مغربی پاکستان کالج ٹیچرز کنونشن کے موقع پر جامعۂ کراچی کے شیخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کہا کہ قوموں کی زندگی کے لئے کسی نہ کسی مقصد کا وجود ضروری ہے، منزل کا تعین کئے بغیر ہم بھٹکتے رہیں گے۔ شیخ الجامعہ نے مغربی ملکوں کے تہذیبی انحطاط کا حوالہ دیکر کردار کی تعمیر پر زور دیا۔ اجلاس کی صدارت کمشنر کراچی سید دربار علی شاہ کر رہے تھے۔

یونیسکو کے ادبی انعامات

ڈھاکا سے پاکستان کے قومی کتاب مرکز کے ایک پریس ریلیز میں ۱۰ جنوری کو بتایا گیا ہے کہ عام دلچسپی کے موضوعات' بالخصوص بچوں کے لوک گیتوں اور کہانیوں پر مبنی تخلیقات پر ۱۹۶۵ء کا یونیسکو ادبی انعام فرخ احمد اور اشرف صدیقی کی کتابوں پر دیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے نام" پاگلر ہاتشا" اور کشور رکیز لوک کہانی" ہیں جن کو دو دو ہزار روپے دیئے گئے ہیں، یہ کتابیں بنگالی اکادمی نے شائع کی ہیں

ارضیات کا نصاب

پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس کے ایک کلب کے افتتاحی جلسے میں شعبۂ ارضیات کی تقریب منعقد ہوئی جسکی صدارت صوبائی وزیر زراعت ملک خدا بخش کر رہے تھے اور جس میں شیخ الجامعہ حمید احمد خاں نے بھی شرکت کی۔ صدر شعبۂ ارضیات نے خطبۂ استقبالیہ میں ارضیات کے مضمون کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ اس کا گہرا تعلق معدنیات و حجریات، معدومیات اور طبقات الارض کی چٹانی ساخت و پٹرولیم اور ارضی طبیعیات سے ہے، انہوں نے بتایا کہ ارضیات کا نیا نصاب تیار کیا جا رہا ہے جو اردو میں ہوگا۔

بے مقصدیت، زبردست خطرہ

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کے سالنامے کی ایک تقریب میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جسٹس عطاء اللہ سجاد نے اپنی تقریر میں کہا کہ" اس دور میں آسانی رزق کی خواہش اور بے مقصدیت ہمارے معاشرے کے لئے عظیم خطرہ ہیں، بے مقصدیت جب کسی فرد یا قوم پر غالب آجاتی ہے تو پھر وہ تمام اقدار اوجھل ہو جاتی ہیں جن کے تحفظ کے لئے بڑے بڑے پیغمبروں اور مصلحین نے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔

انجمن مصنفین پاکستان کی سالگرہ

انجمن مصنفین پاکستان کے معتمد عمومی جمیل الدین عالی نے اعلان کیا ہے کہ انجمن کی نویں سالگرہ کی تقریب ۳۱ جنوری کو کراچی میں منعقد ہوگی، جناب جسٹس ایس اے رحمان اس تقریب میں مہمان خصوصی ہوں گے۔ انجمن مصنفین پاکستان کی نویں سالگرہ پر مشرقی

پر دونوں طرف سے خبریں بھیجی گئیں۔ اب اردو اخبارات کے دفاتر میں ٹیلی پرنٹر لگنے کا کام رہ گیا ہے۔

نوشش آمند رویّہ

پبلک سروس کمیشن کو سرکاری ملازمتوں کے اعلیٰ ترین ادارے کی حیثیت حاصل ہے اور اس کے لئے انگریزی کی چھاپ لازمی سمجھی جاتی تھی۔ اگر ایک امیدوار نے کمیشن کو آزمانے کے لئے اردو میں خط لکھ کر فارم اور ضروری معلومات طلب کیں اور امیدوار کو بے حد مسرت ہوئی کہ مطلوبہ فارم اور معلومات اسے بے تاخیر بھیج دی گئیں۔ یہ رویّہ ایک ایسے ادارے کے شایان شان ہے جو ایک آزاد قوم کا اعلیٰ ترین ادارہ ہے۔

ریڈیو پاکستان کی لسانی پالیسی

ڈاکٹر سید عبداللہ نے گزشتہ دنوں ریڈیو پاکستان کا ایک کنٹریکٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اسکی وجہ یہ بتائی کہ جب تک مجھے ریڈیو پاکستان سے کوئی اختلاف نہ تھا، میں اس کے پروگرام قبول کر لیا کرتا تھا مگر اب جب کہ ریڈیو کی لسانی پالیسی کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو گیا ہے تو مجھے اس سے تعاون کرنے میں قباحت محسوس ہوتی ہے۔"

عمرکوٹ کے باشندوں کا مطالبہ

عمرکوٹ کے عوام نے اعلیٰ حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ عمرکوٹ میں اردو پرائمری اسکول قائم کئے جائیں۔ مطالبے میں کہا ہے کہ یہاں سینکڑوں ایسے خاندان موجود ہیں جن کی زبان اردو ہے مگر اردو کی پرائمری تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ سندھی پرائمری اسکولوں میں بھی اردو کے تربیت یافتہ اساتذہ مقرر کئے جائیں۔

ایک مطالبہ

ڈاکٹر سید عبداللہ اور اسمبلی کے ایک ممبر نے اپنے اپنے بیانات میں مطالبہ کیا ہے کہ ٹیلی مواصلات کے اس افسر کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے جس نے اردو کا مراسلہ قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ آئین کی رو سے یہ قومی زبان کی توہین اور محب وطن افراد کی دل آزاری ہے جس پر افسر متعلقہ سے جواب طلبی ہونی چاہیئے۔

علمی، ادبی، تعلیمی اور تہذیبی خبریں

غیر ملکی کتابوں کی اشاعت

صوبائی کابینہ نے ایک فیصلے کی رو سے بیرون ملک شائع ہونے والی کتابوں اور مضامین و مقالات کو صوبائی حکومت کی اجازت کے بغیر مغربی پاکستان میں شائع کرنے والے شخص کو دو سال قید بامشقت یا دو ہزار روپے جرمانے کی سزا کا مستوجب قرار دیا ہے۔ یہ دونوں سزائیں بیک وقت بھی دی جا سکتی ہیں۔ کابینہ نے یہ فیصلہ گورنر مغربی پاکستان کی صدارت میں کیا۔ ترجمان نے اسکی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ فیصلہ ادب اور قانون کی کتابوں کا سرقہ روکنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اب اس قسم کی کتاب یا مضمون شائع کرنے والے کو صوبائی حکومت یا حکومت کی طرف سے افسر مجاز سے اجازت حاصل کرنی ہوگی۔

جناب میکائیل لوکونین نے کراچی میں اپنی مصروفیات کے بعد تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں انجمن ترقی اردو کے کام سے متاثر ہوا ہوں ۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے شاعر اور ادیب اپنی کاوشوں کے ذریعے ایک شاندار مستقبل کی تعمیر میں مصروف ہیں ، انہوں نے بتایا کہ پاکستان کے نامور فن کاروں ۔ اقبال ، فیض ، احمد ندیم قاسمی ، مرزا ادیب اور ابراہیم جلیس کی کتابوں کا ترجمہ روسی زبانوں میں کیا جا رہا ہے ۔ جناب رومانیطو نے بتایا کہ جن کتابوں کا ترجمہ روسی زبانوں میں ہو چکا ہے وہ روس میں بہت مقبول ہیں ، انہوں نے کہا کہ افریشیائی ادیبوں کی کتابوں کے ترجموں کی تعداد اشاعت روس میں دس کروڑ سے بھی زیادہ پہنچ چکی ہے ۔ ملتان میں اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے جناب میکائیل لوکونین نے کہا کہ روس اور پاکستان کے ادیب ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں اور رفاہی جذباتی وابستگی رکھتے ہیں

مجنوں گورکھپوری کی آمد

برصغیر کے ممتاز نقاد اور صاحب طرز ادیب جناب مجنوں گورکھپوری صاحب گزشتہ دنوں پاکستان آئے ہوئے تھے ۔ انہوں نے اپنا زیادہ وقت کراچی میں گزارا ، اور ان کی آمد کی وجہ سے کراچی کے ادبی حلقوں میں خاصی گہما گہمی اور مصروفیت رہی ۔ انہوں نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا ، اگر ادب میں افادیت ، مقصدیت ، رومانیت یا اور کسی چیز کا پلّہ ادبیت سے بھاری ہو جائے تو وہ ادب نہیں رہتا ۔

ڈاکٹر شہید اللہ روبصحت ہیں

ممتاز عالم اور منفرد ادیب ڈاکٹر شہید اللہ اب روبصحت ہیں ۔ ڈاکٹر شہید اللہ کے آدھے جسم پر پچھلے دنوں فالج گر گیا تھا ۔

گجراتی شعری مجموعہ اردو میں

کراچی میں گجراتی کے ممتاز شاعر جناب صابر تھاریانی کے مجموعۂ کلام کے منظوم اردو ترجمے کی اشاعت کے سلسلے میں اردو ، گجراتی اور انگریزی کے شاعروں ، ادیبوں اور صحافیوں کا ایک اجتماع ہوا ، جس میں جوش ملیح آبادی نے صابر تھاریانی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کے تمام خوش فکر شاعروں کے مانند صابر کے نورانی سینے میں انفس و آفاق کا دل دھڑک رہا ہے ۔ صابر تھاریانی کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ جو جوش ملیح آبادی نے کیا ہے "صابر کے موتی" کے نام سے شائع ہوا ہے ۔ اس ادبی تقریب کے منتظموں کی جانب سے صابر تھاریانی اور جوش صاحب کو تحفے بھی پیش کیے گئے

یادوں کے چراغ

غالب کی صد سالہ برسی

آئندہ سال فروری میں برصغیر کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ساری دنیا میں خاص تقریبات منائی جا رہی ہیں ۔ پاکستان میں یہ صد سالہ برسی غالب کے شایان شان منانے کے لئے ابھی سے تیاری اور منصوبہ بندی شروع کر دی گئی ہے ، لاہو

اور مغربی پاکستان کے ادیب شرکت کریں گے اور اس موقع پر انجمن کے تمام ادبی انعامات کے نتائج کا اعلان کیا جائیگا

قائداعظم پر انگریزی کتاب کا ترجمہ

قائداعظم پر جی۔ الانا کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ بہت جلد شائع کردیا جائے گا، کتاب کا ترجمہ مشہور شاعر جناب رئیس امروہوی نے کیا ہے کتاب طباعت کی منزلوں میں ہے۔ خیال ہے کہ اس سال کے وسط تک منظرعام پر آجائے گی۔

شاخ شاخ مہکے گی

ادارہ مصنفین پاکستان حیدرآباد کے ارکان کے ایک اجتماع میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ عنقریب وادی مہران کے نمائندہ افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا ایک مجموعہ "شاخ شاخ مہکے گی" شائع کیا جائے گا، جس کی تیاریاں شروع کردی گئی ہیں۔ اس مجموعے کے مرتبین محسن بھوپالی اور قدیر غوثی صاحبان ہونگے

امریکی شاعر کی تقریب تعارف

مکتبہ میری لائبریری کی جانب سے مشہور عالم شاعر والٹ وہٹمین کی کتاب کا ترجمہ شائع کیا گیا۔ اور اسی سلسلے میں ایک تقریب جامعہ پنجاب کے وائس چانسلر کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ رچرڈ جیمز کی اس کتاب کا ترجمہ پروفیسر سجاد عارث نے کیا ہے۔ اس تقریب میں لاہور کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک نمائندہ اجتماع ہوا تھا۔ مقررین نے وہٹمین کی شاعری اور اس کے ترجموں کی خوبیوں پر روشنی ڈالی اور اس کتاب کا خیر مقدم کیا۔

ادیبوں کی کانگریس

ایران کے تمام ادیبوں کی ایک کانگریس مارچ میں منعقد ہورہی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کانگریس ہوگی جو ایران میں طلب کی گئی ہے۔ اس اہم اور نمائندہ کانگریس کا افتتاح ایران کی ملکہ فرح پہلوی کریں گی۔ کانگریس کی تیاریاں شروع کی جاچکی ہیں۔

انجمن ترقی اردو لاڑکانہ

انجمن ترقی اردو لاڑکانہ کے زیراہتمام ایک مشاعرہ انجمن مذکور کی عمارت کے منصوبے کو عوام سے روشناس کرنے کے سلسلے میں منعقد ہوا، مشاعرے کی صدارت ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ نے کی میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ کاؤنسل نے سات ہزار روپے کا عطیہ دیا مرکزی انجمن ترقی اردو کے معتمد جمیل الدین عالی نے اس عطیے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ملک کے گوشے گوشے میں اردو کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ مشاعرے میں مقامی شعرا کے علاوہ کراچی سے جمیل عالی اور سراج الدین ظفر نے بھی شرکت کی۔

اس آئینہ خانے میں

روسی ادیب پاکستان میں

حال میں پاکستان میں روسی ادیب خیرسگالی کے جذبات لئے شہر شہر گئے۔ اور انہوں نے تمام ادبی مراکز کی سیر کی، وفد میں لینن امن انعام یافتہ میکھائل لوکونین اور ماسکو میں افریشیائی مصنفوں کی رابطہ کمیٹی کے معتمد عمومی جناب لودی رومانیطو شامل ہیں

سابق ڈین ڈاکٹر ظہیر الدین کا ۷ر جنوری کو ۷۰ سال کی عمر میں کراچی میں انتقال ہوگیا، مرحوم اقبال اکادمی کے سرگرم رکن اور اقبال کے فلسفیانہ نظریات کے ایک اہم مفسر تھے، ان کی ایک کتاب "اقبال کی کہانی کچھ اپنی کچھ ان کی زبانی" بہت مقبول ہوئی تھی۔ ادارہ "قومی زبان" اس سانحے پر دلی افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

ایک مشہور ناشر کا انتقال

دہلی سے عبداللطیف اعظمی صاحب نے ایک نہایت افسوسناک اطلاع دی ہے کہ اردو کے مشہور اور مخلص ناشر جناب محمد یوسف جامعی کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے ۱۳ر دسمبر کی صبح کو دہلی میں ۷۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ جناب یوسف جامعی برصغیر کے مشہور ادبی پرچے "شاہراہ" اور مکتبہ شاہراہ کے مالک تھے۔

آئینۂ ہند

کی مرے قتل کے بعد

جن سنگھ کے صدر دین ایادھیر نے کالی کٹ میں کہا ہے کہ اردو بھارت کا قیمتی ورثہ ہے اور اس کی حفاظت کی جانی چاہیئے۔ انھوں نے اخباری نمائندوں سے کہا کہ اردو کو اس کا صحیح مقام دیا جانا چاہیئے اور اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ جن سنگھ کے صدر نے کہا کہ ہم اس بات کے مخالف ہیں کہ اس زبان کے ساتھ کسی مذہب کا نام وابستہ کیا جائے۔

گوپالا ریڈی کی تقریر

ایک استقبالیئے میں تقریر کرتے ہوئے جناب گوپالا ریڈی نے کہا کہ ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب، تمدن اور زبانوں میں اردو کا ایک خاص مقام ہے، اس کے استعارے، تشبیہ دوسری زبانوں سے زیادہ حسین ہیں، اردو جیسے قیمتی سرمائے کے تحفظ کے لئے ہمیں ہر ممکن جدوجہد کرنی چاہیئے لیکن اسے سیاسی سوال بنا کر کبھی الجھاوے میں نہیں ڈالنا چاہیئے، انھوں نے کہا کہ جو لوگ اردو کو کسی ایک طبقے اور کسی ایک مذہب سے وابستہ کرنے کی بات کہتے ہیں وہ غلط گو اور تنگ نظر ہیں۔

انگریزی کا جادو

ایک ایڈیٹر اور ممتاز وکیل جناب تیج بہادر سنہا نے ہندی کے حامیوں کو مشورہ دیا کہ انگریزی سے چھٹکارا پانے کے لئے اردو کی مدد کی ضرورت ہے، انھوں نے کہا کہ ہندی اردو سے خواہ مخواہ دشمنی مول لے لے تو اچھا نہیں ہوگا کیونکہ اکیلی ہندی انگریزی کا طلسم نہیں توڑ سکتی۔ انھوں نے اردو کو سراہتے ہوئے ہندی والوں سے کہا کہ اردو بھی ہماری اپنی زبان ہے، ہمیں چاہیئے کہ ہندی اور اردو دونوں مدد سے انگریزی کا طوق اتار پھینکنے کی جدوجہد کریں۔

کل پنجاب اردو کانفرنس

انجمن اردو پنجاب کے زیر اہتمام منعقدہ کل پنجاب اردو کانفرنس میں سردار گیانی کی سرکردگی میں ممبران اسمبلی اور دیگر معززین مالیر کوٹلا نے مطالبہ کیا ہے کہ پنجاب

اور کراچی میں ان تقریبات کے لئے جامع منصوبے تیار کئے جا رہے ہیں۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان۔ روس، امریکہ اور برطانیہ میں بھی غالب کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ابھی سے دوڑ دھوپ شروع کر دی گئی ہے۔

یوم جوہر

ادیب، بے باک صحافی، شاعر اور آتش بیاں مقرر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں لاہور اور کراچی میں متعدد جلسے ہوئے، لاہور میں دو بڑے جلسے ہوئے جن میں محمد علی جوہر کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا، صوبائی وزیر داخلہ نے کہا کہ مولانا تمام عمر انصاف کی سربلندی اور حق کی بالادستی کی خاطر جدوجہد کرتے رہے، نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ ان کی زندگی کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں

مولانا حالی کی یاد

بزم حالی کے زیر اہتمام جامعہ پنجاب سینٹ ہال میں مولانا الطاف حسین حالی کی ۵۳ ویں برسی منائی گئی۔ اس موقع پر شیخ الجامعہ جناب حمید احمد خاں نے مولانا حالی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ حالی اس اعتبار سے ایک انقلابی شاعر تھے کہ انھوں نے زندگی سے بھرپور نظموں کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں میں جوش اور جذبہ پیدا کیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی سے جو مایوسی پیدا ہوئی تھی اسے ختم کر کے ان میں بیداری کی لہر پیدا کی، جلسے سے ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، خواجہ محمد شفیع دہلوی اور متعدد صاحب نظر افراد نے خطاب کیا

علامہ اقبال کو صدر کا خراج تحسین

صدر مملکت نے شاعر مشرق علامہ اقبال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انھیں بیسویں صدی کے شعرا میں ایک شہزادہ قرار دیا ہے انھوں نے دنیا کے عظیم شاعروں گوئٹے اور ملٹن کی مثال پیش کرتے ہوئے اقبال کو قوم کے کردار اور سیاسی شعور اور اخلاق پر اثر انداز ہونے والا شاعر کہا۔ صدر مملکت نے یہ خراج تحسین انجمن حمایت الاسلام کے صدر میاں امیر الدین کے نام ایک خط میں پیش کیا ہے۔

علی شیر نوائی کا یوم پیدائش

روس میں ازبکستان کے عظیم شاعر علی شیر نوائی کا ۵۲۵ واں یوم پیدائش منایا جا رہا ہے اسے خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ماسکو، تاشقند اور سمرقند میں تقریبیں منعقد ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ماسکو اور تاشقند میں خاص کمیشن مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ ۷ مئی ۱۹۶۶ء کو ہونے والی ان تقریبات میں علی شیر نوائی کی تخلیقات کا ایڈیشن دس جلدوں میں شائع ہو رہا ہے اور ان کے منتخب کلام کا مجموعہ الگ شائع ہو رہا ہے۔ ان کے نام پر تاشقند میں ایک عجائب گھر بھی قائم کیا جا رہا ہے جس میں ۷۰ ہال ہوں گے۔

ماتم میں ہم شریک

ڈاکٹر ظہیر الدین الجامعی کی رحلت

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مشہور ادیب، اقبالیات کے اہم اور عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ ثقافت اور مذہب کے

کے مشہور مترجم نور پرکار نے ترتیب دیا ہے۔ ماہنامہ "کتاب" اس سے پہلے بھی کئی اہم نمبر پیش کر چکا ہے، خصوصیت سے ہندی کہانی نمبر بہت مقبول ہوا تھا۔ مراٹھی کہانی نمبر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر

مشہور ادیب اور مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ عربی و اسلامی کے صدر جناب ڈاکٹر عبدالعلیم کو حکومت ہند نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا ہے۔ موجودہ وائس چانسلر علی یاور جنگ امریکہ میں ہندوستان کے سفیر مقرر کئے گئے ہیں، ڈاکٹر عبدالعلیم سے اردو دنیا بخوبی واقف ہے اور ان کی تقرری پر اظہار مسرت کیا جا رہا ہے۔

ادب اور جدید ذہن

مشہور اردو ادیب دیویندر اِسّر کی ایک کتاب مکتبہ شاہراہ دہلی نے "ادب اور جدید ذہن" کے نام سے شائع کی ہے جس میں موجودہ بحرانی تہذیب، ہمعصر ادبی رجحانات، انسان کے بدلتے ہوئے تصور، فرد اور تنظیم کی کشمکش وغیرہ کے موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

نریش کمار شاد کی ۴۰ ویں سالگرہ

دہلی۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۶۷ء کا دن راجدھانی کے ادبی حلقوں میں ناقابل فراموش تھا، اس دن اردو کے مقبول و ممتاز اور صاحب طرز شاعر نریش کمار شاد کی چالیسویں سالگرہ "جشن شاد" کے نام سے منائی گئی۔ اس موقع پر مجلس اشاعت ادب کی طرف سے ایک شاندار ادبی جشن کا انعقاد ہوا جس میں برگزیدہ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور ادب دوستوں نے شرکت فرمائی۔ سب سے پہلے پورن کمار ہوش نے جنھوں نے مودود صدیقی کے تعاون سے کتاب "شاد اور اس کی شاعری" مرتب کی ہے یہ اعلان کیا کہ آج شاد صاحب اگرچہ چالیس سال کے ہو گئے ہیں، لیکن فنی بلوغ کے اعتبار سے ان کی عمر اسّی سال سے کم معلوم نہیں ہوتی، بہرحال آج کی یہ تقریب ان کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے جس کی صدارت حضرت عرش ملسیانی کریں گے اور رسم افتتاح کنور مہندر سنگھ بیدی ادا فرمائیں گے، چنانچہ اس تقریب کا افتتاح کنور صاحب نے نریش کمار شاد کو مجلس اشاعت ادب کی طرف سے ایک مطبوعہ کتاب "شاد اور اس کی شاعری" کی ایک جلد پیش کرتے ہوئے کیا، اس کے بعد کنور صاحب نے لالہ یودھراج کی طرف سے شاد صاحب کو پانچ سو روپے کا ایک ڈرافٹ دیتے ہوئے فرمایا کہ شاد صاحب کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ میرا ان کا غائبانہ تعارف اس وقت سے ہے جب وہ کانپور میں ماہنامہ "چندن" کی ادارت کرتے تھے۔ میں اسی وقت بھانپ گیا تھا کہ یہ نوعمر شاعر غیر معمولی ذہانت اور شدت احساس کا مالک ہے۔ اس کے کلام میں تڑپ ہے اور وہ واقعی دل سے محسوس کر کے شعر کہتا ہے، ذاتی طور پر ملاقات ہونے پر میرے تاثرات صحیح ثابت ہوئے۔ شاد صاحب کا شعور بالغ ہے اور جہاں دوسروں کی انتہا ہوتی ہے وہ وہاں سے اپنی ابتدا کرتے ہیں۔ اس کے بعد اکثر نور الحسن نقوی نے مجلس اشاعت ادب کا سرپرست ہونے کی حیثیت سے اپنی اشاعتی کارگزاری پر کچھ روشنی ڈالی اور نریش کمار شاد کو ان کی شخصیت اور شاعری سے متعلق کتاب چھپنے پر مبارکباد دی، بعد ازاں محترمہ ماجدہ شکور نے شاد کی شاعری میں تلخی اور اس کی سمت کا تعین" کے عنوان سے ایک فکرانگیز مقالہ پڑھا، پھر خوشتر گرامی نے اپنی تقریر میں کہا کہ جناب شاد میرے

اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔ انھوں نے چار قراردادیں بھی منظور کیں، جن میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ لسانی فارمولے کی جگہ چار لسانی فارمولا نافذ کرکے اردو تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے۔ ریڈیو کے اردو پروگراموں میں صرف فلمی گانوں کی جگہ ادبی پروگرام شامل کئے جائیں۔ محکمۂ لسانیات میں اردو کا شعبہ بھی قائم کیا جائے اور اردو سے متعلق خصوصی تقریبات منعقد کرنے اور معیاری جریدے شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اردو اخبارات سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اردو کے خلاف خبریں شائع کرنے سے احتراز کریں۔

انگریزی کا وکالت نامہ مسترد

ضلع بلیا کے ایک مجسٹریٹ نے ایک وکالت نامہ اس بنا پر نامنظور کر دیا کہ وکیل نے اس پر انگریزی میں دستخط کئے تھے۔ مقدمے کی سماعت سے پہلے جب وکیل نے اپنا وکالت نامہ پیش کیا تو مجسٹریٹ نے کہا کہ اس پر ہندی میں دستخط ہونے چاہئیں۔ وکیل کے انکار پر مجسٹریٹ نے وکالت نامہ مسترد کر دیا۔

اردو کی مخالفت

جن سنگھ کے ایک لیڈر اٹل بہاری باجپئی نے بمبئی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میری پارٹی اردو کو بہار اور یو۔پی کی دوسری سرکاری زبان بنانے کی مخالفت جاری رکھے گی۔ اس سلسلے میں انھوں نے خود کو کانگریس کا صحیح مقلد کہا۔ جن سنگھ کی سیاست کس کروٹ بیٹھتی ہے اس کا تو پتا نہیں مگر اردو کے سلسلے میں جن سنگھ کے صدر اور لیڈر مذکور کے متضاد بیان محل نظر ہیں۔

اردو کا مطالبہ

ہندوستان کی سات ریاستوں اتر پردیش، بہار، دہلی، ہریانا، پنجاب، ہماچل پردیش اور راجستھان میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے جنوری ۱۹۶۹ء میں چودہ زبانوں کے ادیبوں اور دانش وروں کا ایک کنونشن بمبئی میں منعقد ہوگا جو اردو کمیٹی کی طرف سے طلب کیا گیا ہے۔ کمیٹی نے اردو تحریک اور اس کے مطالبات کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ایک تجویز "اردو مطالبہ" مرتب کی ہے جو پارلیمنٹ کے اراکین اور چودہ زبانوں کے دانش وروں کے دستخطوں سے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو پیش کی جا رہی ہے۔

بنگلا ساہتیا سمیلن کا اردو اجلاس

حیدرآباد دکن کے جوبلی ہال میں نکھل بھارتیا بنگلا ساہتیا سمیلن کا اردو اجلاس پروفیسر حبیب الرحمان کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں بنگلا کے دانش وروں اور ادیبوں نے اردو کو خراج تحسین پیش کیا، شری جوتش چندر گھوش نے کہا "یہی وہ زبان ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ یہ زبان عوام کے ایک بڑے طبقے میں رائج ہے اور اس زبان نے ہمارے ادب کو متاثر کیا ہے، یہ ایک شیریں اور وسیع زبان ہے جس کے شیدائیوں میں راجا رام موہن رائے سے کر رویندر ناتھ ٹیگور تک ہزاروں نام لئے جا سکتے ہیں"۔ شری انل برن گنگو اپادھیائے نے بھی اردو کو خراج تحسین پیش کیا۔

ماہنامہ کتاب کا مراٹھی نمبر

لکھنؤ سے جاری ہونے والے اردو ادبی ماہنامے "کتاب" نے جنوری ۱۹۶۹ء میں مراٹھی کہانی نمبر پیش کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ خصوصی نمبر مراٹھی

انجمن کی نئی مطبوعات

جو عنقریب شائع ہو رہی ہیں

۱۔ مقاماتِ ناصری۔ میر ناصر علی کے انشائیوں کا مجموعہ — مرتبہ انصار ناصری
۲۔ تذکرۂ عروس الاذکار۔ مصنفہ نصیر الدین نقش۔ — مرتبہ افسر امروہوی
۳۔ کندمالا (ڈراما) مصنفہ ون نگا اچاریہ — مترجم صمدانی نقوی
۴۔ شمالی ہند کی نثری داستانیں (نظر ثانی شدہ ایڈیشن) ڈاکٹر گیان چند
۵۔ شمالی ہند کی منظوم داستانیں — ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۶۔ اشاریہ اردو۔ رسالہ "اردو" کے چالیس سالہ شماروں کا اشاریہ۔
۷۔ لغت کبیر اردو (جلد اول) بابائے اردو مرحوم
۸۔ انگریزی ادب کی تاریخ — ڈاکٹر احسن فاروقی
۹۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد دوم) اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست
۱۰۔ ابیاتِ سلطان باہو۔ مترجم عبدالمجید بھٹی
۱۱۔ تاریخ سلطنت مسلمانان روس۔ مزمل یسین
۱۲۔ اردو تھیٹر۔ جلد چہارم۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی
۱۳۔ تذکرۂ ہمیشہ بہار۔ مصنفہ کشن چند اخلاص۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ کراچی نمبر ۱

عزیز ہیں۔ میں نے ان کا بچپن، لڑکپن اور جوانی دیوانی سب کچھ دیکھا ہے۔ ان کے شان نزول اور تسریخ حاشیے بیسوی صدی میں مستقل طور پر چھپتے رہتے ہیں۔ ان کے انٹرویو خاص طور پر مرحوم شخصیتوں کے ساتھ بڑے چونکا دینے والے ہوتے ہیں۔ ع۔ منور لکھنوی نے فرمایا کہ کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہر شخص اپنا عزیز ترین اور قریب ترین سمجھتا ہے، شاد صاحب بھی انھی میں سے ایک ہیں، تقسیم وطن کے بعد سے پنجاب کے بہت سے شعرا وادبا دلی میں آگئے ہیں، اس سے دلی کی ادبی فضا میں کافی رونق آگئی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ پنجاب والے دلی والوں پر چھاگئے ہیں۔ مجھے شاد صاحب کی غزلوں اور نظموں کی بہ نسبت ان کے قطعات زیادہ پسند ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ شاد اور قطعہ لازم وملزوم ہیں۔

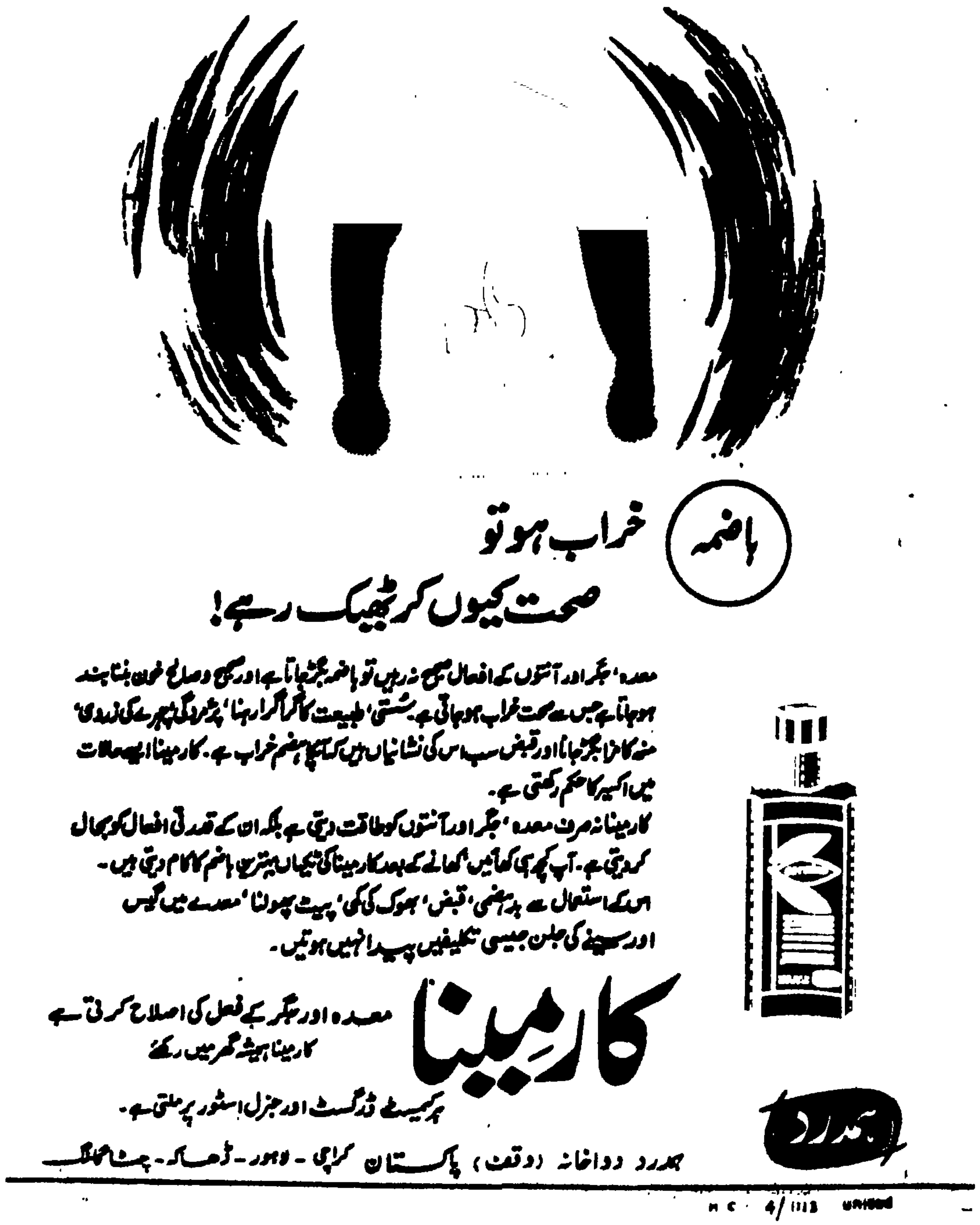
جناب گوپی ناتھ امن نے شاد کی مماثلت انگریزی کے مشہور شعرا شیلے اور کیٹس سے کی، انھوں نے فرمایا کہ ان تینوں نے کم عمری ہی میں ادب پر انمٹ چھاپ لگائی ہے۔ شاد صاحب کا ادبی ماحول بہت اچھا رہا۔ انھیں حضرت جوش ملسیانی سے تلمذ رہا ہے۔ مجھے ان کی غزلیں بڑی پسند ہیں، ان کا بھولا پن، دوست نوازی، سادگی اور دیگر ذاتی خوبیاں ان کے اچھے کردار کی ضامن ہیں۔

آخر میں صاحب صدر حضرت عرش ملسیانی نے شاد کی شعری صلاحیتوں اور ان کی انتھک ادبی کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں بھرپور خراج تحسین پیش کیا، اور اس کے بعد رشیش کمار شاد نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور مجلس اشاعت ادب کے کارکنوں نے تمام حضرات کو "شاد اور اس کی شاعری" کی ایک ایک جلد پیش کی اور چائے کی پر تکلف دعوت کے بعد یہ جشن اختتام پذیر ہوا

سلسلۂ اصطلاحات

انجمن ترقی اردو نے مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات کثیر تعداد میں وضع کی ہیں اور ہر علم کی اصطلاحات علیحدہ طور پر کتابی شکل میں شائع کی جارہی ہیں۔ ان فرہنگوں میں انگریزی اصطلاحات کے مقابل اردو مترادفات دیئے گئے ہیں۔ اصطلاحات کے جمع کرنے اور وضع کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ اصطلاحات وضع کرنے کے لئے متعلقہ علوم اور زبان کے ماہرین پر مشتمل کمیٹیاں بنائی گئیں جنہوں نے بابائے اردو مرحوم کی نگرانی ورہنمائی میں اس کام کو مکمل کیا۔ اب تک حسب ذیل فرہنگیں شائع کی جاچکی ہیں۔

فرہنگ اصطلاحات بنکاری	قیمت :-	چار روپے پچاس پیسے
فرہنگ اصطلاحات فلکیات	قیمت :-	ایک روپیہ پچاس پیسے
فرہنگ اصطلاحات کیمیا	قیمت :-	تین روپے
فرہنگ اصطلاحات جغرافیہ	قیمت :-	ایک روپیہ



ہاضمہ خراب ہو تو
صحت کیوں کر ٹھیک رہے!
معدہ، جگر اور آنتوں کے افعال صحیح نہ رہیں تو ہاضمہ بگڑ جاتا ہے اور صحیح و صالح خون بننا بند ہو جاتا ہے جس سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔ سستی، طبیعت کا گرا گرا رہنا، پژمردگی، چہرے کی زردی، منہ کا مزا بگڑ جانا اور قبض سب اس کی نشانیاں ہیں کہ آپکا ہضم خراب ہے۔ کارمینا ایسے حالات میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔
کارمینا نہ صرف معدہ، جگر اور آنتوں کو طاقت دیتی ہے بلکہ ان کے قدرتی افعال کو بحال کر دیتی ہے۔ آپ کچھ بھی کھائیں کھانے کے بعد کارمینا کی ٹکیاں بہترین ہاضم کا کام دیتی ہیں۔ اس کے استعمال سے بدہضمی، قبض، بھوک کی کمی، پیٹ پھولنا، معدے میں گیس اور سینے کی جلن جیسی تکلیفیں پیدا نہیں ہوتیں۔
کارمینا
معدہ اور جگر کے فعل کی اصلاح کرتی ہے
کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھئے
ہر کیمسٹ ڈرگسٹ اور جنرل اسٹور پر ملتی ہے۔
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ

H C 4/1113

قومی زبان

کراچی

انجمن ترقی اردو

Monthly QAOMI ZABAN Karachi

مدیر : مشفق خواجه
محمد مصلح الدین سعدی کے زیر اہتمام انجمن پریس سے شائع هوا ۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

قومی زبان

جلد ۳۲ شمارہ ۳

مارچ ۱۹۶۸ء

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

مت: فی پرچہ ایک روپیہ

قیمت سالانہ دس روپے

زیر تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات

اب تک زیر تعمیر اردو کالج کے لئے مبلغ تین لاکھ ستر ہزار چار سو پچپن روپے اٹھاسی پیسے (۳،۷۰،۴۵۵ روپے ۸۸ پیسے) جمع ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ماہ جو رقوم موصول ہوئیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

عطیات

حکومت مغربی پاکستان — مبلغ ایک لاکھ روپیہ

بذریعہ فروخت رسائل

۱۔ جناب عزیز حسن صاحب۔ جنرل منیجر

جی سنز شوگر ملز۔ خان پور — مبلغ ایک ہزار روپیہ

۲۔ جناب محمد محتشم صاحب بجیر پور — مبلغ ایک ہزار روپیہ

فہرست

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

ڈاکٹر سید سلیمان حسین

شوق لکھنوی

شوق[1] کی شہرت ان کی تین مثنویوں، فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق کی بدولت ہے۔ لیکن دو اور مثنویاں لذتِ عشق اور خنجرِ عشق بھی ان سے منسوب ہوگئی ہیں جو صریحاً غلط ہے۔

مثنوی لذتِ عشق دراصل آغا حسن نظم لکھنوی کی تصنیف ہے، جو شوق کے ہمشیر زادے تھے۔ یہ مثنوی مطبع فیضی سے مولوی محمد مراد اللہ کی فرمائش پر خواجہ رحیم الدین نے چھپوائی تھی۔ اس کے ایک شعر میں مصنف کا تخلص یوں آیا ہے۔ ؎

کرے نظم اب یہ کہاں تک بیاں — ہے کوتاہ عمر اور بڑی داستاں

دوسری مثنوی جو شوق کی کہی جاتی ہے وہ خنجرِ عشق ہے۔ یہ مثنوی مولوی ابوالحسن کی تصنیف ہے، جن کا وطن کاندھلہ ضلع مظفر نگر تھا۔ مثنوی "خنجرِ عشق" پہلی بار رنگین کی مثنوی چار باغ کے حاشیہ پر ۱۲۶۹ھ میں دلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں کل ،،، اشعار ہیں۔ جن میں سے اکثر غیر موزوں ہیں۔ اس لئے انھیں شوق کے سر تھوپنا شوق کی توہین ہے۔

مثنوی فریبِ عشق

یہ شوق کی پہلی تصنیف ہے، ابتدا حسبِ معمول حمد سے ہوئی ہے، اس کے بعد نعت اور منقبت۔ یہ مثنوی اپنے عہد کی تہذیب کی سچی آئینہ دار ہے۔ قصے کے ہیرو خود شوق ہیں اور اسے اتنی خوبی سے بیان کیا ہے کہ داستان میں اصلیت کا رنگ نمایاں ہوگیا ہے۔ شاعر اپنی جوانی کی داستان یوں بیان کرتا ہے ؎

---

[1] حکیم تصدق حسین خاں معروف بہ نواب مرزا تخلص شوق۔ حکیم آغا علی خاں کے بیٹے تھے۔ طبابت ان کا پیشہ تھا، کبھی کبھی غزل بھی کہہ لیتے تھے۔ آتش کے شاگرد تھے۔ غزلیں بہت کم تعداد میں ملتی ہیں۔ اصل شہرت مثنویوں کی وجہ سے ہے۔ ۱۲۸۸ھ میں وفات بتائی جاتی ہے جس کی تصدیق یا تردید سے میں فی الحال قاصر ہوں۔

سہ ماہی

اُردو

جنوری ۱۹۶۸ء کے شمارے کے مضامین

کتاب الاعتبار اور اہل فرنگ	شریف الحسن
میر کا ایک قصیدہ	کلب علی خاں فائق رام پوری
ادبی تحقیق اور حقائق	ڈاکٹر خلیق انجم
اُردو، ہندوستانی، ہندی یا ہیٹہ ہیندوئی	ڈاکٹر محمد باقر
اُردو کے مرکب افعال	ڈاکٹر شوکت سبزواری
بادۂ کہن	فراقی بیجاپوری
جزائر انڈمان و نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات	محمد ایوب قادری
جان محمد محری	محمد اکبر الدین صدیقی
مے خانۂ آرزو سرانجام (فارسی کلیات) غالب کا قدیم ترین مخطوطہ —	مسلم ضیائی
بادۂ کہن	شاہ مبارک آبرو
ٹھٹھو، راجستھان کی ایک تاریخی بستی	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی
مولانا محمد شفیع مرحوم	سید حسام الدین راشدی

مسلسل مضامین

تذکرۂ ہمیشہ بہار	مصنف: کشن چند اخلاص مرتب: ڈاکٹر وحید قریشی۔
لغت کبیر اُردو (آٹھویں قسط)	بابائے اُردو

- صفحات ۲۶۶
- ٹائپ کی طباعت
- سفید کاغذ
- متعدد تصویریں
- قیمت فی شمارہ تین روپے پچاس پیسے
- قیمت سالانہ بارہ روپے

انجمن ترقی اُردو بابائے اُردو روڈ، کراچی ۱

نہ مزاجی نے ان سے جب پایا — اور معشوق سے دل اُلجھایا
دی کسی نے جو اس کی ان کو خبر — آپے جامے سے ہو گئی باہر
رشک سے پیچ و تاب کھانے لگی — دل ہی دل میں الم اٹھانے لگی
جی سے اپنے گذر گئی آخر — بعد چندے کے مر گئی آخر

بیگمات کے محاوروں کو یوں نظم کیا ہے ؎

اک ذرا ہٹ کے بیٹھو منہ نہ بناؤ — کہے چوٹی بھی مجھ کو کنگھی سے کھاؤ
جعل سازی یہ تجھ کو کیونکر آئی — ایک کو سائی دوسرے کو بدھائی
سانٹھے دسے کے اپنے یاروں کو — ہینڈکی بھی چلی مداروں کو
ہوش کی اپنے کچھ دوا کیجیے — مجھ سے ناحق نہ چوچلا کیجیے
بولی چپ رہیے منہ کی کھائیے گا — اک ذرا سینک کر بجائیے گا

اس مثنوی کے بارے میں ڈاکٹر ابواللیث صاحب کی رائے بڑی صائب ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "جو قصہ اس مثنوی میں نظم ہوا وہ عشق و عاشقی کی جگہ ہوسناکی کا ایک قصہ ہے۔ لیکن بیان میں رکاکت اور ابتذال کہیں نہیں۔ بلکہ بیگماتی زبان خاص کر عورتوں کے محاورے اور فقرے نہایت صحت اور صفائی کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔ اس میں زہرِ عشق کی طرح کوئی غیر معمولی واقعہ نظم نہیں ہوا ہے، نہ مافوق الفطرت عناصر سے مدد لی گئی ہے۔ بلکہ اس عہد کی زندگی کی تصویر شاعرانہ صناعی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ قصہ کی طرح انداز بیان بھی فطری اور سلیس ہے۔ اس حیثیت سے یہ بھی اردو زبان کی اول درجہ کی مثنویوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔"

بہارِ عشق بہارِ عشق شوق کی بہترین اور اردو کی بدنام ترین مثنوی ہے۔ بقول خواجہ احمد فاروقی "جتنی یہ داستان عریاں اور غیر مہذب ہے اتنی ہی اس کی زبان شستہ و رفتہ سادہ اور بے تکلف ہے۔ روانی اور صفائی کا یہ عالم ہے جیسے شفاف پانی کا چشمہ پہاڑ کے دامن سے ابل رہا ہو۔ جو بندش ہے وہ چست، جو محاورہ ہے وہ درست، جو لفظ ہے وہ برمحل۔"

یہ مثنوی پہلی بار مطبع سلطانی لکھنؤ سے شوال ۱۲۹۶ھ میں ۴۲ صفحوں پر چھپی تھی اور اس کے نظم کرنے کی فرمائش نواب ابوتراب خاں نے شوق سے کی تھی۔ مصنف کا لکھا ہوا دیباچہ بھی اس کے ساتھ ہے جس سے مصنف کی غرضِ تصنیف پر روشنی پڑتی ہے، ملاحظہ ہو :-

"اس ذرۂ بے مقدار کو منظور یہ تھا کہ محاورات صاحبات محل اور نوچندی کے لوگوں کے کچھ بیان کرے۔ لہٰذا یہ مثنوی مخصوص اسی واسطے کہی اور الفاظ غلط کہ ان لوگوں کے محاورات میں جاری تھے، موزوں کئے اور موافق قول اساتذہ

خوش گزرتے تھے اس طرح ایام   عیش رہتا تھا صبح سے تا شام
دوست جتنے تھے رہتے تھے ہمراہ   کربلا میں کبھی، کبھی درگاہ
رہتا تھا تیرھویں کا جلسہ یاد   شام سے جاتے تھے حسین آباد
لوگ پہلے سے واں پہ جاتے تھے   فرش تالاب پر بچھاتے تھے
دو پہر رات جب گزرتی تھی   ڈولی پر ڈولی پھر اترتی تھی
صحبتِ عیش گرم رہتی تھی   کچھ نہ آپس میں شرم رہتی تھی

اس دو سالی زندگی میں عشق کا واقعہ پیش آتا ہے۔ ایک بار شوق نوچندی میں درگاہ پہنچے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پری جمال خیمہ سے درگاہ کی دلچسپیوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ قریب ہی ایک کہاری بھی کھڑی ہے۔ شوق نے پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک رئیس زادی ہے اور کہاری اس کی خادمہ ہی نہیں بلکہ رازدار بھی ہے۔ چنانچہ اسی وقت یہ تدبیر سوچی ؎

مشورہ کرکے ٹھہری یہ تدبیر   اب جو نوچندی ہے رجب کے اخیر
راضی اس پر کرو کہاری کو   کہ اتروادے یاں سواری کو
کہا اس سے یہ کام ہے ہم کو   لاکے ملوادو اپنی بیگم کو

کہاری نے پہلے تو بیگم کے ناز نخروں کا ذکر کیا پھر اس نے یہ تدبیر سوچی کہ آئندہ بیگم کی ڈولی کو کسی باغ میں اتروادے گی۔ چنانچہ دوسری نوچندی کو ڈولی باغ میں پہنچ جاتی ہے۔ بیگم باغ کا سماں دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں۔ کبھی کہاری پر خفا ہوتی ہیں اور کبھی کہاروں پر۔ اسی دوران ہیرو صاحب ایک درخت کی آڑ سے نکل کر سامنے آکر فینس کا پردہ الٹ دیتے ہیں۔ دونوں میں فقرے بازیاں ہوتی ہیں اور جب معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت شوق ہیں تو وہ فرماتی ہیں ؎

اے لو، میں بھی کہوں سبب کیا ہے   ارے تو ہی نواب مرزا ہے
اک ہی مرشد ہو تم قصور معاف   سن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف

اس کے بعد شوق اپنا مطلب بیان کرتے ہیں۔ پہلے تو بیگم گرما گرم تقریر کرتی ہیں پھر ذرا نرم پڑتی ہیں۔ شوق اسی نرمی کا مطلب تاڑ جاتے ہیں اور اس یقین کے ساتھ کہ ؎

آتی نوچندی میں نہ یہ زنہار   گر حقیقت میں ہوتی عصمت دار

اس وقت شوق کو ایک تدبیر سوجھتی ہے کہ وہ دم سادھ لیتے ہیں اور مردہ بن جاتے ہیں۔ بیگم گھبرا جاتی ہیں۔ میں آتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔ بہت قول و قرار کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ ملاحظہ ہو۔

نہ رہی درمیاں میں جب تکرار   ہو گیا وصل بعد قول و قرار
کچھ دنوں تک مزے اڑائے خوب   لطف اس شوخ سے اٹھائے خوب

موی رباں سر پا

اب شوق کے اشعار کا مطالعہ کیجئے ؎

ناک میں نیم کا فقط تنکا
شوخی چالاکی مقتضا سن کا

قد میں آثار سب قیامت کے
گوری گردن میں طوق منت کے

رخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم
جس طرح گل پہ قطرۂ شبنم

عکس رخ موتیوں کے دانوں میں
بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں

رگِ گل سی کمر لچکتی ہوئی
چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

سرو سا قد تو گل سے رخسارے
شانے بازو بھرے بھرے سارے

اسی طرح شوق نے ماما کی تصویر بھی اپنے باریک موقلم سے ایسی دل آویز کھینچی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ گوشت و پوست کی انسانی صورت چہلیں کرتی ہمارے سامنے موجود ہے۔ بقول امیر احمد علوی "جس طرح سحر البیان کی عیش بائی نقاشی کا بہترین نمونہ ہے ویسے ہی بہارِ عشق کی خادمہ مصوری کا کمال ہے" ؎

اتنے میں گھر سے نکلی اک عورت
سانولا رنگ چلبلی صورت

لال نیفہ ازار بند پڑا
گچھا اک کنجیوں کا اس میں پڑا

کھیلتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی
آنکھ ایک ایک سے ملاتی ہوئی

چاق و چوبند سینہ زوری میں
پھول لڑکیے ہوئے کٹوری میں

حسن کے دن جوانی زوروں پر
رات کی باسی مہندی پوروں پر

دھیان اک اک سے بدگمانی کا
ستیا ناس ہو جوانی کا

یہاں ٹھہری کبھی وہاں ٹھہری
دو منھ ہنس بول لی جہاں ٹھہری

جذبات نگاری

مثنوی میں جذبات نگاری کے کئی موقعے آئے ہیں اور حق یہ ہے کہ شوق ان سے بڑی خوبی سے عہدہ برا ہوئے ہیں۔ "مہ لقا" اپنے وعدہ کے مطابق ہیرو کے مکان پر پہنچی ہر اس وقت کچھ تو خوف خدا اور کچھ اپنی عزت و ناموس کا خیال پھر غیر جگہ ـــــ ان تمام چیزوں نے مہ لقا کی کچھ عجیب حالت بنادی تھی، اس موقع پر مہ لقا کی جذباتی کیفیت کی تصویر اتارنے میں شوق نے کمال کر دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

منھ دوپٹے سے ڈھانپتی اتری
خوف کے مارے کانپتی اتری

نیچی نظروں سے دیکھ بھال لیا
سر پہ آنچل الٹ کے ڈال لیا

سب حیا سے بدن چرائے ہوئے
پائنچے ناز سے اٹھائے ہوئے

کے ان کو صحیح سمجھ کر جاری رکھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ لفظ "مختصر" کو اگر ان کے محاورات میں لکھے تو "منتصر" لکھے۔ بلکہ اگر مختصر لکھے تو وہ غلط ہے۔ لہٰذا ارباب فہم و کمال پر پوشیدہ و مخفی نہ رہے کہ یہ حقیر بھی اس مثنوی میں جا بجا موافق اقوال اساتذہ کے عمل میں لایا۔ اور ان کے الفاظ غلط کو صحیح جان کر موزوں کیا۔ اور علاوہ اس کے جو غلطی ہوئی ہو تو معاف فرمائیں"

قصہ بہت مختصر سا یوں ہے کہ ہیرو لکھنؤ کا خوبرو جوان ایک دن سیر کو نکلتا ہے کہ لب بام ایک حسینہ "مہ لقا" نام دکھائی دیتی ہے۔ یہ سو جان سے اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پریشانی کے عالم میں گزرتا ہے، دوست مدد کے لئے تیار ہوتے ہیں اور مکان کا پتہ معلوم کر کے ہیرو کا پیغام لے کر پہونچ جاتے ہیں۔ گھر کی "ماما" کے ذریعہ بیگم کو دروازہ پر بلوا کر ہیرو کی خستہ حالی کی لمبی چوڑی داستان سنائی جاتی ہے جسے سن کر بیگم کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں تدبیر کارگر ہوتی ہے تو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ہیرو نے افیون کھائی ہے اس لئے وہ چل کے ایکبار ہیرو کو دیکھ آئے۔ اولاً مہ لقا کچھ خفا ہوتی ہے پھر یہ جواب دیتی ہے ؎

ہوگی فرصت تو واں بھی آئیں گے　　ہم بھی درگاہ آج جائیں گے

ہیروئن ماما کو لے کر ہیرو کے گھر پہنچ جاتی ہے "اسے باغ میں اتروا یا جاتا ہے لیکن اس پر جلد یہ راز کھل جاتا ہے کہ اسے دھوکہ دیا گیا ہے ؎

جو ترے جل میں آگئی افسوس　　میں بڑا چکمہ کھا گئی افسوس

اس کے بعد اختلاط اور وصل ہوتا ہے جس کے اختتام پر "مہ لقا" واپس ہوتی ہے اور ربط ضبط، پیام و سلام ہونے لگتے ہیں۔ ایک روز ہمسائے میں شادی ہوتی ہے، جس میں ہیرو بھی شریک ہوتا ہے۔ دونوں میں شکوے شکایتیں ہوتی ہیں جسے ہیروئن کے اعزا سن لیتے ہیں اور اس کے والدین بھی یہی طے کرتے ہیں کہ دونوں کی شادی کر دی جائے، اس طرح مثنوی کا خاتمہ وصل کی شادمانی پر ہوتا ہے۔

بہار عشق دنیائے شاعری میں اپنی لطیف زبان کے لئے مشہور ہے لیکن مثنوی میں زبان و بیان کے حسن کے ساتھ ساتھ مرقع نگاری، سراپا نگاری اور واقعہ نگاری کی بھی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ ذیل میں مثنوی کے مختلف پہلوؤں پر اجمالی نظر ڈالی جا رہی ہے

سراپا نگاری

شوق نے مہ لقا کے حسن و جمال کی تصویر انتہائی خوبی اور چابکدستی سے اتاری ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ مہ لقا ابھی کنواری ہے اس لئے آرائش اور تکلفات سے یکسر بے نیاز ہے۔ شوق کا کمال ہے کہ بغیر کسی مبالغہ کے پوری تصویر کھینچ دی ہے۔ اس سراپا کو دیکھ کر بے اختیار میر کا یہ شعر منہ سے نکل جاتا ہے ؎

وہیں عمر ساری بسر کیجئے　　سراپا میں اس کے جہاں دیکھئے

طرف عشق نے اپنا اثر محبوبہ پر بھی دکھایا جس کے بعد اس نے ایک نامۂ محبت میں اپنا حال عاشق کو لکھ بھیجا۔ کچھ مدت اسی طرح نامہ و پیام میں گذری اور پھر آمد و رفت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ درمیان میں دو مہینے کے لئے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا جب پھر یہ سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ عشق کا راز ماں باپ پر عیاں ہوچکا ہے اور وہ محبوبہ کو بنارس بھیجنے کا مشورہ کر رہے ہیں۔ یہ ملاقات دونوں کی آخری ملاقات تھی۔ اسی رات دونوں میں قول و قرار ہوئے اور بڑی حسرت ناک گفتگو میں یہ شب کٹی۔ صبح کو محبوبہ عاشق سے رخصت ہوئی اور گھر جاکر زہر کھالیا۔ اس کے گھر سے جب گریہ وزاری کا شور و غوغا بلند ہوا تو عاشق کو بھی پتہ چلا۔ لیکن محبوبہ کی وصیت کے مطابق اس نے اپنے دل کو بہت سنبھالا۔ لیکن پھر بھی زہر کھالیا۔ مگر اسے موت نہ آئی اور وہ سخت جانی کے ساتھ زندہ رہنے پر مجبور ہوگیا۔

یہ ہے ایک پرخلوص محبت کی سادی سی داستان جو بہت سادے اور دلنشین انداز میں نظم کردی گئی ہے اور جس میں سوز و اثر کی کیفیت اور جذبات کا اظہار پورے طور پر موجود ہے۔ ذیل میں اس مثنوی کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جاتا ہے۔

سراپانگاری

شوق کو سراپانگاری میں ید طولیٰ حاصل ہے، انہوں نے اپنی مثنویوں میں جس کردار کا بھی سراپا کھینچا ہے اس کی ہوبہو تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے کھینچ دی ہے۔ اس سے قبل بہار عشق" میں" مہ لقا" اور" ماما" کی تصویریں پیش کی جاچکی ہیں جو شوق کے کمال کی بہترین مثال ہے۔ اب زہر عشق میں سوداگر کی بیٹی" مہ جبین" کے حسن کی تصویر ملاحظہ ہو ؎

سبزۂ نخلِ گل جوانی تھا ، حسنِ یوسف غلط کہانی تھا ،
اس سن و سال میں کمال خلیق ، چال ڈھال انتہا کی نستعلیق ،
چشم بد دور وہ حسیں آنکھیں رشکِ چشمِ غزال تھیں آنکھیں ،
تھا جو ماں باپ کو نظر کا ڈر آنکھ بھر کر نہ دیکھتے تھے ادھر
تھی زمانہ میں بے عدیل و نظیر خوش گلو، خوش جمال خوش تقریر
رخ پہ گیسو کی لہر آفت تھی ،، جو ادا اس کی تھی قیامت تھی
تھا یہ اس گل کا جامہ زیب بدن سادی پوشاک میں تھے سو جوبن

جذبات نگاری

شوق نے جذبات نگاری کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ مہ جبین، اس کی والدہ اور ہیرو کے جذبات جس حسن و خوبی سے پیش کئے ہیں، وہ شوق کی عظمت و بلندی کے ضامن ہیں۔ ہیرو کی حالت فراق ملاحظہ ہو ؎

دن میں سو بار بام پر جانا دیکھنا بھالنا چلے آنا
جب نہ دیکھا وہاں پہ وہ گل رو فرطِ غم سے نکل پڑے آنسو
گزرے کچھ دن جو رنج کے مارے زرد رخسار ہو گئے سارے

تھا عجب پیچ و تاب کاکل کا | پھنا پڑتا تھا حسن اس گل کا
شہر سارا اُجاڑ تھا گویا | اتنا رستہ پہاڑ تھا گویا
نہ سنی اور کی، نہ اپنی کہی | دل کی حسرت تمام دل میں رہی
بد مزہ پھیکی شوخیاں نہ کرو | بس چلو ٹھنڈی گرمیاں نہ کرو
دیکھنا کیسی دھوم ڈالوں گی | روئی کی طرح تُوم ڈالوں گی
بس زیادہ نہ آپ اِترائیں | دیکھو کچھ شامتیں نہ آجائیں
منہدی چھٹتی نہ آپ گھس جاتیں | دو گھڑی کو اگر چلی آتیں
نوج ایسے کا اعتبار کروں | ایڑی چوٹی پہ میں نثار کروں

روزمرہ اور محاورہ

بہار عشق کی عظمت کا راز زبان کے لطف اور محاورے کی چاشنی میں پوشیدہ ہے۔ اس زمانہ میں جب لفظی صنعت گری کو حسن معنی سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ مرزا شوق نے سادگی و سلاست کے دریا بہا دیئے اور عشق و عاشقی اور حسن و جوانی کے راگ کو ایسی میٹھی بول چال میں چھیڑا ہے کہ دلی کے شیوا بیان اور شیریں زبان بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔[1]

مثنوی زہر عشق

زہر عشق ۱۲۷۷ھ میں تصنیف ہوئی۔ "غم دل ربا" سے سال تصنیف برآمد ہوتا ہے۔ یہ مثنوی کئی بار اسٹیج بھی کی گئی۔ پہلی بار مرزا نظیر بیگ نظیر اکبرآبادی نے ۱۸۹۲ء میں اس کے قصے سے ماخوذ ڈراما تیار کیا اور کافی اشعار اسی مثنوی کے ڈرامے میں شامل کئے۔ پھر دوبارہ ترمیم کے بعد ۱۸۹۵ء میں بھی اسے پیش کیا اور اس کا نام ستم عشق الفت عرف نتیجہ محبت رکھا۔ منشی احسن نے بھی اسے ڈرامے کی صورت دی تھی یہ ۱۸۹۰ء میں اسے لکھنؤ میں دوداب کمپنی نے پیش کیا۔ جس نے شہر میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

مثنویات شوق کے لئے یہ روایت مشہور ہے کہ وہ عریانی کی وجہ سے مذاق سلیم پر بار ہوتی ہیں اس لئے ان کی اشاعت عرصہ تک قانونی طور پر بند رہی، لیکن یہ روایت محض غلط ہے۔ کیونکہ "بہار عشق" اور "فریب عشق" زمانہ تصنیف سے آج تک کبھی بھی ممنوع الاشاعت نہ ہوئیں وہ متعدد بار شائع ہوئیں اور آج بھی ان کا سلسلہ جاری ہے۔ صرف مثنوی زہر عشق اپنے گہرے تاثر کی وجہ سے کچھ مدت تک قانونی طور پر نہ چھپ سکی۔ ہاں چوری چھپے اس کے بھی کئی اڈیشن نکلے۔

مثنوی زہر عشق کا قصہ بہت سادہ ہے۔ شوق ہی مثنوی کے ہیرو ہیں۔ ان کی نظریں ایک روز محلے کے ایک اشراف اور صاحب دولت سوداگر کی لڑکی سے چار ہوئیں اور عشق کی ابتدا ہوگئی۔ ہیرو نے تھوڑا زمانہ فراق کے مصائب میں گزارا۔ دوسری

---

[1] کلاسکی ادب ص ۱۸۸

جائے عبرت سرائے فانی ہے　　مورد مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے　　آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم　　آج اس جا ہے آشیانہ بوم
غیرت حور مہ جبین نہ رہے　　ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم　　ہوئے جا جا کے زیر خاک مقیم
کوئی لیتا بھی اب نہیں ہے نام　　کون سی گور میں گیا بہرام
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے　　یہی دنیا کا کارخانہ ہے
صبح کو طائران خوش الحان　　پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ
موت سے کس کو رستگاری ہے　　آج وہ کل ہماری باری ہے

زہر عشق میں دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کے اعلیٰ مرقعوں کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور روزمرہ کی صفائی کے بھی نادر نمونے ملتے ہیں۔ پھر بیگمات لکھنؤ کی زبان بھی انھیں کے انداز میں لکھی ہے اس لئے پوری مثنوی پڑھنے اور لطف لینے کے قابل ہے۔ چند نمونے حاضر ہیں ؎

گیسوئے رخ پر ہوا سے ہلتے ہیں　　چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں
میرے بچے کی جو کڑھائے جان　　سات بار اس کو میں کروں قربان
اللہ آمین سے ہم تو یوں پالیں　　آپ آفت میں جان کو ڈالیں
اس محبت پہ ہو خدا کی مار　　جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار
عمر بھر کون کس کو روتا ہے　　کون صاحب کسی کا ہوتا ہے
آزماتی تھی تجھ کو کستی تھی　　میں ترے چھیڑنے کو ہنستی تھی
ہوئیں کس بات پر خفا بولو　　اماں واری فدا جواب تو دو
تم پہ میں مرتی کیا قیامت تھی　　کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے　　تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

کردار نگاری مثنوی کا قصہ مختصر ہے۔ اس لئے اس میں بہت سے کردار چلتے پھرتے نظر نہیں آتے۔ اس میں صرف ہیرو، ہیروئن دونوں کی مائیں اور ایک کنیز کو پیش کیا گیا ہے، لیکن ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ تمام کردار خاموش ہیں۔ ہیرو انتہائی مجہول قسم کا انسان ہے اور اس سے کبھی کوئی عمل سرزد نہیں ہوتا، وہ پلنگ پر پڑا دن رات رویا کرتا ہے لیکن اتنی ہمت نہیں کہ خط تک لکھ سکے۔ اس لئے یقین کے بعد کہ مہ جبین" زہر

ہو گئی پھر تو ایسی حالتِ زار ، جیسے برسوں کا ہو کوئی بیمار
دل کو تھی غم سے خود فراموشی لگ گئی لب پہ مہرِ خاموشی
نہ رہا دل کو ضبط کا یارا ، سر جہاں پایا دھڑ سے دے مارا
رنج لاکھوں طرح کے سہتے تھے لب تھے خاموش اشک بہتے تھے

مہ جبین پر عشق کا بھرپور اثر ہوتا ہے۔ اس کی دنیا تاراج ہو جاتی ہے اور فراق میں یہ کیفیت ہوتی ہے ؎

چھلکے آنکھوں کے دونوں پیمانے دل لگا آپ ہی آپ گھبرانے
گوش فریادِ قلب سننے لگے ، خود بخود ہاتھ پاؤں دھننے لگے
دردِ دل غم کو آگیا جو پسند سونا راتوں کا ہو گیا سوگند
موجِ الفت اسے ڈبونے لگی ایک الجھن سی دل کو ہونے لگی
گھٹنے طاقت لگی جو روز بروز آتشِ ہجر ہو گئی دل سوز
داغ جوں جوں جگر کے جلتے تھے اشکِ گرم آنکھ سے نکلتے تھے ۔
گرم نالے تھے لب پہ آہ تھی سرد دل میں ہوتا تھا میٹھا میٹھا درد

مہ جبین زہر کھا لیتی ہے۔ اس کی موت پر ماں کے بین بڑے دل دوز ہیں۔ دیکھئے ایک چاہنے والی ماں اپنی جوان جہاں بیٹی کی ناوقت موت پر کس طرح ماتم کرتی ہے ؎

تیری میت پہ ہو گئی میں نثار کم سخن ہائے میری غیرت دار
دل پہ جو گذری کچھ بیان نہ کی کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی
کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو
دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں بیٹا اماں کو کس پہ چھوڑ گئیں
داغ تیرا جگر جلاتا ہے ، چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے
بیاہ تیرا رچانے پائی نہ میں کوئی منت بڑھانے پائی نہیں
ایسی اماں سے ہو گئیں بیزار لی نہ خدمت بھی پڑ کے کچھ بیمار
کس مصیبت میں پڑ گئی بیٹا کوکھ میری اجڑ گئی بیٹا ۔

اس مخزنِ اخلاق مثنوی کا سب سے جاندار حصہ وہ ہے جبکہ "مہ جبین" اپنے آہنی عزم و ارادے کے ساتھ عاشق کے پاس آخری بار ملنے جاتی ہے۔ یہ منظر انتہائی دل دوز اور اثر انگیز ہے جس کی مثال اردو لٹریچر میں مشکل سے ملے گی۔ محبوب سے مل کر "مہ جبین" وصیتیں کرتی ہے اور بے ثباتیٔ دنیا پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

محمد حسین زبیری

مشاہدات ایران

مدت سے تمنا تھی کہ ایران کی سیاحت کروں۔ گزشتہ اکتوبر ۱۹۷۱ء میں یہ آرزو پوری ہوئی اور میں جشن تاجپوشی سے قبل
[تہر]ان جا پہنچا۔ تہران پہنچکر یہ اندازہ ہوا کہ یورپ کے کسی شہر میں ہوں۔ جشن تاجپوشی کے دوران میں معلوم ہوا کہ عوام اپنے شہنشاہ
[پر ا]یسے ہی جان دیتے ہیں جیسے لندن کے لوگ اپنی ملکہ پر فدا ہیں۔ مرد کوٹ پتلون میں ملبوس ہیں۔ خواہ فیکٹری کا ملازم ہو خواہ
[کسی] دفتر میں کام کرتا ہو۔ خواہ افسر ہو خواہ مزدور۔ عورتیں بھی یورپی لباس زیب تن کئے ہوئے اسکرٹ بلکہ مینی اسکرٹ۔
[بوڑھی خوا]تین چادر اوڑھ کر نکلتی ہیں ان کی چادر کے اندر بھی اسکرٹ اور اسٹاکنگ ہی نظر آتے ہیں۔ نوجوان طبقہ تو اسٹاکنگ بھی نہیں
[پہنتا۔] شیخ سعدی و حافظ شیرازی کو تو ساق سیمیں و ساعد بلورین کے دید کی تمنا ہی رہتی ہوگی، لیکن اب تو ہر جگہ ان کے جلوے
[نظر آ]تے ہیں۔ بالوں کی تراش خراش بھی مغربی طرز پر اور حسن و جمال مغربیوں سے بڑھ کر۔ غرض یہ کہ رہن سہن تہذیب و تمدن
[لباس] و پیراہن سب کچھ یورپی ہے اور ایرانی قوم ہر طرح مغربی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ٹیکسیاں اور بسیں اور ریل گاڑیاں
یورپ کی طرح آرام دہ اور ہمہ وقت خدمت کے لئے حاضر۔ ہوٹل اور مسافر خانے یورپی طرز پر صاف ستھرے اور ہر قسم
[کی س]ہولت حاصل۔ اب ایران میں حاجی بابا اصفہانی کا دور دور پتہ نہیں۔ وہ گاتے بھی مغربی لے میں ہیں۔ آلات موسیقی بھی
[مغر]بی ہی استعمال کرتے ہیں۔ روتے بھی انگریزی طرز میں ہیں، یعنی نابینا فقیر جب بھیک مانگنے نکلتا ہے تو انگریزی فقیر
[کی ط]رح وائلن بجاتا ہوا بھیک کا پیالہ ہاتھ میں لے کر نکلتا ہے۔ شادی و طلاق بھی اسی طرح آسان ہے جیسا یورپ میں ہر سال
[طلاقو]ں کی تعداد خاصی ہوتی ہے۔

صرف ایک چیز ہے کہ جسے ایرانیوں نے نہیں چھوڑا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جسے وہ جدا نہیں
[کرتے]، وہ جناب والا ان کی زبان ہے۔ وہ ان کی شیریں زبانی اسی طرح قائم ہے اور اس میں روز بروز نئے نئے الفاظ
[کا اضا]فہ ہو رہا ہے۔ اسے اب وہ فارسی یا پہلوی زبان نہیں کہتے بلکہ ایرانی زبان کہتے ہیں۔ وہاں انگریزی بولنے والے
[بھی ہ]یں، وہاں فرانسیسی و روسی زبان میں بھی بات چیت کرنے والے موجود ہیں۔ لیکن ایران کے شاہنشاہ آریا مہر سے

کھائے گی اور پھر اس کی موت یقینی ہے وہ اس کی جان بچانے کی کوئی عملی کوشش نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ وہ جیب میں جاتی ہے اور وہ اس کے بعد بھی سوائے میت کے ساتھ خاموش چلنے کے کوئی کام نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ وہ رقعہ پر زہر بھی نہیں کھاتا۔

اس کے برخلاف ہیروئن کا کردار شروع ہی سے عملی ہے۔ وہی محبوب کو خط لکھ کر متوجہ کرتی ہے اور مستعد اس سے ملنے کے لئے جاتی ہے۔ آخری ملاقات میں بے ثباتی دنیا پر اس کی تقریر اور "ذلت کی زندگی سے موت بہتر سمجھنا" اس کے آہنی ارادوں اور عزم کی زندہ مثال ہیں۔

مثنوی زہر عشق کی تعریف دور جدید کے تقریباً تمام نقادوں نے کی ہے۔ آل احمد سرور زہر عشق کو لکھنؤ کی سب سے اچھی مثنوی قرار دیتے ہیں[1]۔ سید سجاد ظہیر فرماتے ہیں "مرزا شوق کی مثنوی (زہر عشق) تاثر، سلاست، شیریں بیانی، حقیقت نگاری اور گہری المناکی کی وجہ سے اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ایسی محبت کے المیہ کا بڑی سادگی اور ہمدردی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے جس کے بارآور ہونے کی جاگیری سماج اجازت نہیں دیتا۔ اس میں ایک تو سماج کے رسوم اور تصورات کا تذکرہ ہے، دوسری طرف اس میں دو معمولی انسانوں کی سچی محبت کو بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں ہمیں ان دونوں سے ہمدردی اور جاگیری سماج کے ظالمانہ قوانین اور رسوم سے نفرت ہوتی ہے۔ یہ ہرگز پست قسم کے فحش جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتی اسے پڑھ کر لوگ زیادہ پاک اور زیادہ گہری محبت کرنا چاہیں گے۔ ان کا نفس ہوگا، ان میں دردمندی اور انسانیت کے جذبات ابھریں گے۔ ان کی زندگی زیادہ مہذب ہوگی"[2]۔ مثنوی زہر عشق شاعری میں زبان و بیان، سیرت نگاری، نفسی واردات اور اپنے حسیاتی رنگ کے اعتبار سے بڑی مکمل چیز ہے۔ اس میں لکھنؤ کے زوال پذیر ماحول کی اچھی ترجمانی کی گئی ہے[3]۔

شوق میں شاعرانہ صلاحیتوں کی کمی نہ تھی لیکن انہوں نے فریب عشق اور بہار عشق میں وصل کے بیان کو محض لذت کشی بنایا ہے۔ جس نے انھیں بدنام کر دیا اور بقول حالی روشنی کے فرشتے سے تاریکی کے فرشتے کا کام لیا ہے[4]۔ اگر وہ اپنی صلاحیتوں کو اس طرح تسکین حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنا کر کسی مناسب جگہ صرف کرتے تو ان کی مثنویوں کا جواب اردو زبان میں نہ ہوتا۔ بقول حالی نواب مرزا شوق نے چار مثنویاں لکھی ہیں ان کو میں روزمرہ اور محاورہ کی صفائی قافیوں کی نشست ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے تمام اردو کی موجودہ مثنویوں سے بہتر سمجھتا ہوں۔ ان میں مردانے اور زنانے محاوروں کو اس طرح برتا ہے کہ نثر میں بھی ایسی بے تکلفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا ۔۔۔ جو کچھ اس نے بیان کیا ہے خواہ مورل ہو خواہ ام مورل، اس میں حسن بیان کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے"[5]

---

[1] نگار سالنامہ ۱۹۵۰ء [2] شاہراہ ۱۹۵۰ء [3] کلاسیکی ادب۔ [4] مقدمہ شعر و شاعری۔ [5] مقدمہ شعر و شاعری۔

عبدالصمد

نظامتِ کراچی کا ایک اردو فیصلہ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت ۱۸۳۷ء میں اردو سرکاری زبان قرار پائی۔ بنگال، بہار، اوڑیسہ اور ہندستان کے دیگر علاقوں میں بہ حیثیت عدالتی زبان کے مدتوں جاری رہی۔ عدالتی زبان کی حیثیت سے اس زبان کی موقوفی ۱۸۶۴ء میں عمل میں آئی۔ اور سارے برطانوی قلمرو کے تحت کی عدالتوں میں فیصلے انگریزی زبان میں ہونے لگے۔ البتہ تجاویز یادداشتیں، مراسلے، اطلاعات، دستاویزات وغیرہ اردو زبان ہی میں قلمبند ہوتے تھے۔ راقم الحروف کی نظر سے قدیم ترین فیصلہ ۱۸۳۹ء کا تحریر کردہ گزرا ہے۔ فیصلہ نگار ہنری مور صاحب کمشنر مرشد آباد بنگال ہیں۔

حال ہی میں ہندوستان سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کیدار ناتھ وانچو نے جسٹس محمود کے ایک اردو فیصلہ کا پتہ دیا ہے۔ یہ فیصلہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے پرانے کاغذات میں انھیں ملا تھا۔ اخباری اطلاع کے مطابق اب یہ فیصلہ حکومت ہند کے قومی عجائب گھر میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

تقسیم ہند سے قبل اردو زبان کو، عدالت ماتحت اور عدالت اعلیٰ کے تمام مدارج میں صرف حیدرآباد دکن ہی میں استعمال کیا گیا۔ ہائی کورٹ کے علاوہ جوڈیشل کمیٹی جو ملک کی اعلیٰ عدالت مرافعہ تھی اپنے فیصلے اسی زبان میں صادر کرتی تھی۔ حیدرآباد ہائی کورٹ اور جوڈیشل کمیٹی کے روبرو غیر منقسم ہندوستان کے نامی وکلا نے اردو اور انگریزی زبان میں مقدمات کی پیروی کی ہے۔ ان میں قابل ذکر، قائداعظم محمد علی جناح اور سر تیج بہادر سپرو ہیں۔ بحث کی سماعت چاہے کسی زبان میں ہو، لیکن فیصلے اردو ہی میں صادر ہوتے تھے۔ حیدرآباد کی عدالتی تاریخ گواہ ہے کہ اردو زبان عدالتی کارروائیوں کی ہر منزل میں مفید اور کارگر ثابت ہوئی ہے۔ آئین دکن، مقنن دکن، نظائر حیدرآباد، نظائر محبوبیہ، نظائر عثمانیہ اور دکن لا رپورٹ کی صدہا جلدیں اردو زبان کی اس صلاحیت کی کھلی مثال ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد جب پاکستان عالم وجود میں آیا تو اس جانب بارہا کوشش کی گئی کہ اردو زبان کو عدالت میں جاری کیا جائے۔ گو یہ روایت اس سرزمین کے لئے کوئی نئی نہیں ..... بہاولپور، خیرپور، پنجاب اور سرحد کی اکثر عدالتوں میں تقریباً نچلی سطح پر تمام کارروائیاں اردو ہی میں انجام پائی ہیں

لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ مزدور تک ہر شخص اپنی مادری زبان میں بات چیت کرنا، لکھنا پڑھنا فخر سمجھتا ہے۔ مکانوں پر ناموں کی تختیاں فارسی رسم الخط میں ہیں، دوکانوں کے بورڈ اپنی زبان میں ہیں، وہاں غیر ملکی پیٹنٹ دواؤں کی قبولیت اسی حاصل ہوتی ہے جب ان پر فارسی میں بھی نام لکھا ہو۔ وہاں مکانوں اور کارخانوں کے دونوں پر ۱۶ اور ۵۱۸۲ نہیں ہے بلکہ ورود و خروج لکھا ہے۔ وہاں کے ایم سی مارکٹ نہیں ہے بلکہ فروشگاہ فردوسی ہے۔ وہاں نیشنل بنک آف ایران نہیں ہے بلکہ بانک ملی ایران ہے۔ وہاں کراچی بیف یا مٹن ہاؤس نہیں ہے بلکہ گوشت گوسالہ یا گوشت گوسفند ہے۔ وہ احمد کراچی حلوہ مرچنٹ یا سویٹ میٹ مرچنٹ جیسی کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ قنادی سعیدی میں آپ کو مٹھائیاں مل جاتی ہیں۔ وہاں کباب ہاؤس بھی نہیں ملتا۔ ہاں "اعظم کبابی" کا بورڈ جگمگا رہا ہے۔ بس اسٹاپ کی تلاش ہوئی تو "ایستگاہ اتوبس" کا بورڈ نظر آیا۔ وہاں علامہ عثمانی سکنڈری اسکول جیسا ادارہ نہیں ملا۔ ہاں دبیرستان تما کی سیر کی۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب سے ملنا تھا تو "رئیس ایستگاہ" سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ازراہ کرم تلفن پر بات کرنے کی اجازت دیدی۔ تلفن پر ہندسے فارسی میں ہی لکھے ہوئے تھے۔ بازار میں کیش میمو فارسی ہندسوں میں سے چھپا ہوا ملا۔ حکومت ایران نے یورپ کی کاریں بنانے والی فرموں سے معاہدات کرکے تہران میں کار بنانے کا کارخانہ قایم کیا ہے۔ کار بن گئی ہے اس کا نام "پیکان" ہے۔

خیابان شاہ رضا اور خیابان فردوسی خوش منظر سڑکوں پر پہنچکر شاہ رضا کبیر اور شاعر بے بدل فردوسی کی طرف خیال گیا۔ اسی وقت اپنی میکلوڈ روڈ اور فریر روڈ ذہن میں آگئی۔ جو میکلوڈ اور فریر صاحب کی طرف ہمارے ذہن منتقل کرتی ہیں۔

ریل کی "واگن" پر بجائے فسٹ سیکنڈ تھرڈ کے ۱۔ ۲۔ ۳ لکھا دیکھکر بہت خوشی ہوئی۔ یہی نہیں کے اندر ہر صندلی (سیٹ) پر نمبر پڑا ہوا تھا۔ ٹکٹ پر واگن نمبر ا، اور صندلی نمبر بھی لکھ کر دیا گیا تھا۔

ابتدائی مدارس سے لے کر جامعہ تک ہر علم و فن کی کتابیں فارسی زبان میں موجود ہیں۔ فنی تعلیم کی کتابیں اپنی ہی زبان میں ہیں آپ انجنیئری کی تعلیم حاصل کریں یا ڈاکٹری کی سب کتابیں فارسی ہی زبان میں ملیں گی۔ دانشگاہ تہران و دانشگاہ مشہد کے پروفیسروں کی کتابیں فن طب و جراحت پر بھی نظر سے گزریں۔ کتابوں کی اوراق کا ظاہری حسن و جمال نہایت دل کش۔ ایسا دل کش کہ بچے اور بڑے سب پڑھنے کے لئے بیتاب ہوں۔ پھر کی فلمیں انگریزی کی ہوں یا یورپ کی کسی دوسری زبان کی ہوں فارسی زبان میں منتقل کرکے دکھائی جاتی ٹلویژیون پر تمام پروگرام فارسی میں ہوتے ہیں۔ غیر ملکی فلمیں بھی فارسی میں منتقل کرکے دکھائی جاتی ہیں۔ میں تعلیم عامہ اور تعلیم بالغاں کی مہم بہت تیز ہو رہی ہے اگر یہی حال ہے تو آرسی ڈی ممالک میں ہم ہی کہیں انگریزی کے پیچھے پڑے سے پھسڈی نہ رہ جائیں اور یہ فیصلہ ہی نہ کر پائیں کہ اردو میں تعلیم ہو یا انگریزی میں۔

سے اردو زبان کی وسعت اور پرمائگی کا اندازہ ہو سکے گا۔ فاضل کمشنر صاحب باوجود عملی دقتوں کے اور ساری عمر انگریزی زبان میں فیصلہ نویسی کے، جس خوبی، اختصار اور صحت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اردو زبان کی پرمائگی کا بین ثبوت ہے فریقین مقدمہ کے فاضل وکلا (شیخ حیدر صاحب و سید سراج الرحمٰن صاحب وکلائے سپریم کورٹ) کی بحث اردو اور انگریزی زبان میں سماعت کرنے کے بعد مقدمہ کی تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۔ فاضل وکلا صاحبان کے دلائل اور ان کے بیانات پیش عدالت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کمیٹی ۱۹۵۵ء میں تاج مسجد کمیٹی کے نام سے قائم اور رجسٹر ہوئی تھی۔ اس کے ممبران کی اکثریت فرقہ اہل سنت والجماعت کے اس گروہ سے تعلق رکھتی تھی جس کو عرف عام میں بریلوی گروہ کہا جاتا ہے۔ یعنی جس فرقہ کے لوگ مسجد میں بعد نماز جماعت خصوصاً بعد نماز جمعہ، سنت اور نوافل سے ادا کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر باآواز بلند درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اس کے برخلاف بعد میں بنائی گئی انجمن مسجد (جس سے درخواست گذار کا تعلق ہے) اکثریت دیوبندی عقائد کی حامل ہے اور چونکہ یہ صاحبان بعد نماز جماعت درود و سلام کو باآواز بلند پڑھنا جائز نہیں سمجھتے اور اپنی نمازوں میں خلل کا باعث سمجھتے ہیں اس لئے دونوں فریقین کے اختلافات بتدریج بڑھتے گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں معلوم ہوتا کہ ایک طرف بریلوی طبقہ میں حاجی نور محمد چھوٹانی کو سرکردگی حاصل ہے اور صاحب ثروت ہونے کی وجہ سے وہ مسجد کی تعمیر میں سرمایہ لگانے کے خواہاں ہیں (غالباً ان کی یہ خواہش نیک جذبات کے تحت ہے) لیکن درخواست دہندہ کے ساتھی جن کا تعلق دیوبندی گروہ سے معلوم ہوتا ہے وہ بھی مسجد پر اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کی اکثریت ہندوستان خصوصاً دلی سے آئے ہوئے تاجر طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور یہ لوگ مسجد کے گرد و نواح میں اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ اس طبقے کے متمول حضرات بھی مسجد کی تعمیر میں سرمایہ لگانے کے خواہشمند معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں فریقوں کے جذبات قابل قدر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک فریق کو ہی مسجد کے انتظام پر اقتدار حاصل ہونا سہولت اور باہمی امن کا باعث ہو سکتا ہے۔ صورت دیگر میں تصادم کی گنجائش رہے گی۔"

نزاع زیر تصفیہ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد جس طرح قانون کی روشنی میں، متعلقہ قانون اور اس کے اثرات کو پیش کیا وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

" میرے سامنے کوئی ایسی دلیل یا تجویز نہیں پیش کی گئی، جس کی رو سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ بانی یا بانیان مسجد یا ان کے جائز جانشینوں کے علاوہ نمازیوں کو بجائے خود مسجد کے انتظام یا انتظامات میں کسی قسم کے اختیارات کے مجاز ہیں۔ بنا بریں یہ ثابت رہی۔ ایل۔ ڈی۔ ۱۹۶۲ء لاہور صفحہ ۴۴۲

کراچی کی عدالتیں قدیم سے بمبئی پریذیڈنسی کے تابع رہی ہیں۔ اس لئے یہاں پر انگریزی کا زور رہا ہے۔ اور اردو کے رواج کی ہر ایک کوشش ناکام رہی۔ اس سلسلے میں سید ہاشم رضا صاحب پہلے شخص ہیں جو اس جانب متوجہ ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں ایک حکم جاری کیا کہ آئندہ سے عدالتی فیصلے اردو میں بھی جاری کئے جائیں۔ چنانچہ اس اقدام کو موثر بنانے کے لئے کچھ کوششیں بھی ہوئیں لیکن بعد کے آنے والوں نے اس روایت کو قائم نہیں رکھا۔

حال ہی میں کراچی میونسپل کارپوریشن نے اردو زبان کی ضرورت اور افادیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تمام کارروائیوں میں اردو زبان کے استعمال کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اور بلدیہ کی تمام روئدادیں، رپورٹ اور کارروائیاں اردو زبان ہی میں انجام پاتی ہیں۔

نظامت کراچی کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ جناب ایس۔ ایم ادریس صاحب ایڈیشنل کمشنر کراچی نے اردو زبان میں اہم اور مبسوط فیصلہ سپرد قلم کیا۔ اس فیصلہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان ان نامساعد حالات میں بھی کس قدر کارگر اور موثر ثابت ہوتی ہے اور خیالات کی ادائگی میں جو آسانی پیش آتی ہے اس کا ذکر خود جناب موصوف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

"اس فیصلہ کو کیوں اردو زبان میں تحریر کرنا مناسب سمجھا گیا۔ فاضل چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان مسٹر جسٹس اے آر کارنیلیس نے وقتاً فوقتاً اور حال میں اس امر کی اہمیت عوام کے سامنے پیش کی ہے کہ عدالتوں کی کارروائیاں قومی زبان میں ہونا ہر طرح مناسب ہوگا۔ لیکن اس مقدمہ کے دوران بحث، میں نے خاص طور پر یہ مشاہدہ کیا کہ فریقین معاملہ جو سیدھے سادھے مذہبی مسلمان اور طبقۂ عوام سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے زیادہ تر افراد انگریزی سے ناواقف تھے، اور فاضل وکلا صاحبان کی انگریزی بحث سے اپنے کو مطمئن نہ پاتے ہوئے بسا اوقات یہ خواہش ظاہر کرتے رہے ہیں کہ ان کو خود اپنے معاملہ کو سمجھانے کا موقع دیا جائے اور ان صاحبان نے جس جذباتی انداز میں اپنے معاملہ کو پیش کیا اس کے قطع نظر یہ ظاہر ہوا کہ فریقین کو اسی وقت عدالتی کارروائیوں میں اطمینان محسوس ہوتا ہے، جب کہ وہ اپنے معروضات اپنی زبان میں پیش کر سکیں اور حاکم مجاز ان کے معروضات سمجھتے ہوئے ان پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہے۔ مزید براں کسی سوسائٹی کے عوام پر، عدالتوں کی کارروائیوں، حاکمان عدالت اور ان کی رایوں اور ان کے اظہار خیال کا کافی اثر پڑتا ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ رائیں اور یہ خیالات اسی زبان کے الفاظ میں منظر عام پر آئیں جس زبان سے عوام واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام کے ذہنی شعور پر ان خیالات اور رایوں کا اثر مرتب ہوگا۔"

اقتباس بالا میں فاضل ایڈیشنل کمشنر نے فریقین مقدمہ کی دقتوں کا صحیح صحیح اندازہ لگایا ہے اور ان کی دقتوں کو رفع کرنے کا حل عملی طور پر پیش کیا ہے۔ یہ ان کی حوصلہ مندی اور جرأت عمل کی روشن مثال ہے۔

فاضل ڈپٹی کمشنر کے اس تاریخی فیصلے کے چند اقتباسات زبان اور بیان کے نقطۂ نظر سے درج کئے جاتے ہیں۔

نذر سجاد حیدر کے خطوط[۱]

(۱)

گرینڈ ہوٹل

۳ رمئی ۱۹۴۹ء

پیاری مسز جلیل ۔ دعائیں

بہت دن سے خبر نہیں تم لوگ کدھر اور کیسے ہیں ؟ جلیل تو آ گئے ہوں گے[۲] ؟ میں بیس دن سے علیل تھی ، برابر ۔ ورنہ آتی ۔ ند دن سے بہتر ہوں ، مگر آنے کے قابل نہیں ہوں ۔ میاں بیوی کسی شام آ کر مل جاؤ ۔ سنا ہے ۸ رمئی کو "یوم آغا شاعر" منایا جا رہا ہے ۔ بڑا مشاعرہ ہے ۔ دونوں چلو اور مجھ کو بھی لے چلو ۔ ضرور ضرور ۔ جلیل اور بچوں کو دعا ،

نذر سجاد حیدر

(۲)

گرینڈ ہوٹل ۔ کراچی

۲۱ ۔ ۲ ۔ ۵۰ء

پیاری ہرمزی ، دعائیں ۔

میں جمعہ یا ہفتہ کو آ رہی تھی بیگم عامر[۳] کو وہیں بلایا جاتا ۔ مگر ایک دم بلڈ پریشر بڑھ گیا ۔ اب آپ یہ کریں کہ اُس طرح سے لے کر کہیں کر شام کو آئیے ۔ اتوار کی شام کو آئیے ، ہفتہ کو جلیل گرینڈ ہوٹل کے ٹیلیفون سے خبر دیدیں ۔ اور نہ کریں ۔ انشاء اللہ میں اتوار کی شام کو آ جاؤں گی ، ۷ بجے تک ۔ امید ہے بلڈ پریشر اس دن کم ہو جائے گا دوا کھا رہی ہوں ۔

۱ے یہ خطوط بیگم و جناب جلیل قدوائی کے نام ہیں ۔ حواشی جلیل قدوائی صاحب نے لکھے ہیں ۔ بعض خطوط قرۃ العین حیدر کے بھی شائع کئے جا رہے ہیں کیونکہ ان کا تعلق نذر سجاد مرحومہ سے ہے ۔ مدیر

۲ے ان دنوں شاید دورہ پر گیا ہوا تھا ۔

۳ے علی گڑھ کے رئیس ، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر جناب عامر مصطفےٰ خاں مرحوم کی بیگم صاحبہ جو کراچی میں تشریف رکھتی ہیں ۔ اس خط میں ان کی صاحبزادی کے رشتہ کی بات چیت ہے ۔

میاں عبدالحق بنام انجمن اسلامیہ کاموکی منڈی۔ اے۔ آئی۔ آر ۱۹۵۵ء الٰہ آباد صفحہ ۰۰ حاجی محمد سعید وغیرہ)
ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی مسجد میں ہر فرقہ کے مسلمانوں کو نماز کی اجازت ہے لیکن نماز باجماعت اسی فرقہ کے طریق
پرادا کی جاسکتی ہے جس سے بانی مسجد تعلق رکھتا ہو۔ یا جس کی نسبت بانی مسجد نے کوئی صاف اور واضح پابندی کا
اظہار کر دیا ہو۔ انفرادی طور پر کبھی واحد مسلمان کو اپنے مسلک کے مطابق نماز ادا کرنے کی اجازت ہے۔ عدالتوں نے
یہ تسلیم کرلیا ہے کہ انفرادی طور پر اہل سنت والجماعت (حنفی عقائد) کی مسجد میں اہل حدیث یا شیعہ طبقہ سے تعلق
رکھنے والے صاحبان بھی نمازیں ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی الگ جماعتیں اسی مسجد میں نہیں قائم کر سکتے۔"

فاضل ایڈیشنل کمشنر نے قانون کے تعبیر و اطلاق ہی کو اپنا منصب نہیں سمجھا ہے بلکہ نزاعی مسئلہ کی اصل کُنہ تک پہونچنے اور بشری کمزوریوں اور خواہشات کو بھی اپنے احاطۂ فکر میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ امر قابل ستایش ہے۔ اس سے نہ صرف انصاف کا تقاضا پورا ہوتا ہے بلکہ انصاف کا مبین فرض بھی انجام پاتا ہے۔

"یہاں اس بات کا امتیاز کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آزادیٔ عبادت ایک چیز ہے اور آزادیٔ تبلیغ یا آزادیٔ ترویج عقاید ایک دوسری چیز ہے یہ ظاہر ہے کہ دیوبندی فرقہ سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی فرداً فرداً یا جماعت میں شریک ہوکر نماز کی ادائگی کر سکتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے وہ اپنی الگ جماعت خلاف خواہشات بانیان مسجد نہیں قائم کر سکتے۔ وہ گویا آزادیٔ تبلیغ یا ترویج عقائد کا مسئلہ ہے اور چونکہ یہ چیز عبادت میں شامل نہیں ہے اس لئے تبلیغ یا ترویج عقائد کا سلسلہ قائم کرنا اسی صورت میں مناسب ہوگا جبکہ اصل بانیان مسجد کی خواہشات سے کوئی تصادم نہ ہوتا ہو یا کم از کم ان کی مرضی حاصل ہو۔"

جناب سید محمد ادریس صاحب ایڈیشنل کمشنر کراچی نے آئندہ آنے والے حضرات کے لئے ایک عمدہ روایت کا آغاز کیا ہے اور قومی شاہراہ پر چلنے میں سبقت لے جاکر جو عملی اقدام کیا ہے اس سے انہوں نے کراچی نظامت کی تاریخ میں اپنی نمایاں جگہ محفوظ کرلی ہے اور مستقبل کا مورخ اردو کے اس خدمتگذار کی خدمات کو ہمیشہ احسان اور امتنان سے یاد کرے گا

خدا کے واسطے آپ اک مریض پر رحم کرکے، آج سترہ (۱۷) ہے۔ آپ خط ملتے ہی دفتر جائیے اور عینی کو لے کر اسٹیٹ آفس جاکر فوراً تینوں میں سے ایک جگہ کمرہ لے دیجئے۔ میں نے خود اسٹیٹ آفس والوں سے دریافت کیا۔ بذریعہ ٹیلی فون؛ تو انہوں نے جو جواب دیا وہ یہ الفاظ تھے "آپ اپنی صاحبزادی سے کہئے وہ اپلائی کریں تو ہم ایک دو دن میں کمرہ دے سکتے ہیں۔" اب اسمبلی والے جاچکے، کمرے خالی ہیں۔ آپ جلدی کیجئے گرمی آگئی ہے۔ سخت تکلیف ہے۔

دعاگو

نذر سجاد

مکرر[1] جلیل صاحب، ہوٹل میں نہیں، جہنم میں سانس لے رہی ہوں۔ بس جلدی انتظام کرادیں۔ میری زندگی بہت کم ہے۔ امت الوحی کے ہاں جانے کو تھی، مگر نہ گئی۔ آپ کو لکھا۔ وہاں بھی بھونچے ہیں۔ تنگی ہے۔ تاج حجاب آئے ہوئے ہیں، نہیں بلا سکتی۔ وہ بھی بیمار ہیں۔

یہ خط عینی کو پہنچادیں، آخری کوشش ہے۔ میں ہندوستان جانے کو تیار ہوگئی تھی، لکھنؤ جاپڑتی مگر ہجیش شدت سے ہوگئی۔ عینی کو کہئے وہ ماری پوری ہی رہیں۔ صرف اپنے نام پر کمرہ لے دیں کہ میں جاپڑوں۔ وہ کسی کسی دن کسی کسی رات آجایا کریں کہ لوگ دیکھ لیں کہ ان کا کمرہ ہے۔ قسم دیتی ہوں جلیل صاحب ابھی جائیے خط لے کر عینی کے پاس۔ میں عاجز ہوں۔

دعاگو

(۴)

گرینڈ ہوٹل، کراچی

۱۳ اگست ۱۹۵۰ء

جلیل صاحب، دعائیں

جس دن سے آئی ہوں پڑی ہوں۔ سردی لگ گئی۔ بارش تھی۔ سینے میں درد ہوا۔ ڈاکٹر، دوا سبھی کچھ ہو لیا۔ آٹھ دن ہوئے۔ کل سے آرام ہے۔

جی چاہتا ہے کہ میں بھی پریڈ دیکھ لوں۔ آپ اگر لے جاسکتے ہیں تو مجھ کو آکر لے جائیں۔ مسز جلیل جائیں گی یا زچگی کا عذر کریں گی۔ بہرحال اگر لے جاسکتے ہیں تو ٹیلی فون سے جواب دیں کہ میں صبح اٹھ جاؤں۔ ورنہ نو بجے اٹھتی ہوں۔

---

[1] یہاں سے عبارت ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

[2] مجھ سے انھیں اس لئے اور بھی زیادہ امید تھی کہ میں بحیثیت انفارمیشن آفیسر وزارت تعمیرات سے متعلق تھا جس کے تحت اسٹیٹ آفس تھا۔ مگر میں کمرہ حاصل کرنے میں [illegible] ہوا، اس لئے کہ چند دن بعد ہی پھر اسمبلی کے اجلاس شروع ہونے والے تھے۔ یہ اسمبلی کے ممبران کے قیام کے لئے مخصوص تھا

لاہور سے تین دن کو حمید علی[1] آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ پھری۔ اب برداشت نہ کر سکی۔ ایک دن گئی تھی، دو بار وہ آئے تھے۔ آج صبح گئے۔

اب سنو، ضروری کام ہے۔ کسی کا کام ہو جائے تو اچھا ہے۔ گو میں نے آپ کی اور جلیل کی شادی نہیں کرائی، تاہم آپ اس باب میں مدد دیں، بدلہ نہ سہی۔۔۔

پریشر سے عاجز ہوں، کہیں مشاعرہ ہو تو خبر دے دینا۔ آپ کو وہیں سُلا دیا جائے گا۔ گھبرانا نہیں کہ جاگنا پڑے گا۔[2]
اچھا اس لڑکے کو پتا سمجھا کر بلاؤ۔ جلیل کو دعا، بچوں کو پیار

خاکسار

نذر سجاد حیدر

(۳)

۱۶ر اپریل ۱۹۵۰ء
کراچی، گرینڈ ہوٹل

عزیزالقدر جلیل صاحب، دعائیں۔

آپ اس دن مجھ سے کیا وعدہ کر گئے تھے، بھول گئے؟ آپ اگر عینی[3] سے ملے تو مجھے خط کیوں نہ لکھا؟ خیر اب آپ خود ہی اسٹیٹ آفس والوں سے مل کر عینی کے نام پر بلوچ میس وغیرہ میں ایک کمرہ کروا دیجیے۔ عمر بھر کو احسان ہوگا۔
عینی نے مجھ سے کہا ہے اپلائی کر چکی ہے۔ جگہ خالی نہیں تھی۔ خدا آپ کوشش کر دیجیے۔
آخر میں اس شخص کی بیوی ہوں جو آپ کو اس قدر چاہتے تھے۔ میرا آپ کو خیال چاہیے۔ ذرا تکلیف کر کے اسٹیٹ آفس اور عینی کے پاس جائیے۔ ان کو میرا یہ خط دے دیجیے اور آفس والوں سے جس قدر زور لگا سکیں لگا کر عینی کے نام ایک کمرہ لے دیجیے۔
میں، دلہن اور بچے سخت تکلیف میں ہیں۔ اور پھر اس ہوٹل کے ہاتھوں میں بھوکی مر رہی ہوں۔ یہاں مریض کی غذا نہیں مل سکتی مجبور ہو کر میرا ارادہ نشکار پور جانے کا تھا۔ مگر خط آ گیا کہ پروفیسر چچا کو نٹہ میرے بھائی حسنین کے یہاں گئے۔ آج پانچواں دن ہے مجھ پہ پھر گیس کا ایک حملہ ہوا، چار دن سے کچھ نہیں کھایا۔ سوائے چائے کے۔ بالکل پڑی ہوں، یہ خط بھی مشکل سے (لکھوا کے) رہی ہوں

---

[1] سید حمید علی مرحوم مالک دار الاشاعت پنجاب لاہور، سید امتیاز علی تاج کے برادر معظم۔ ان کے والد شمس العلما مولوی سید ممتاز علی نے پہلی مرتبہ ان سجاد کی شادی کرائی تھی۔

[2] ہر مزی کو سر شام نیند آ جاتی ہے۔ ان کی اس کمزوری کی طرف اشارہ ہے۔

[3] ان دنوں عینی ناری پور میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ رہتی تھیں۔ ہوٹل میں نذر سجاد کے پاس جگہ نہ تھی۔ صبح کام پر آتی تھیں شام کو چلی جاتی تھیں۔

سکھر، کئی دن سے لئے بیٹھی ہوں کہ کوئی ملے تو پڑھوا کر بھیجدوں مگر کوئی نہ ملا۔ آخر ویسا ہی بھیجنا پڑا۔ اول تو میرا جناتی خط، پھر ٹائیفائڈ میں مبتلا تھی، تب لکھا تھا۔ بخار تھا، خود لکھنے لگی تو غش آگیا۔ دو ماہ پڑی رہی۔ آج مل آیا ماغذات میں سے تو بھیجدیا۔ اتنا ہی دے دیں، فقط زبان درست کر کے۔ آئندہ مختصر سے حالات موت تک کے لکھوا دوں گی۔

دیکھئے خط پورا نہ ہوا اور چل دیئے لکھنے والے۔ آخر خود ہی گھسیٹا۔ سر میں درد ہے۔ بے چین ہوں۔

نذر سجاد حیدر

(۷)

شالیمار ہوٹل، کراچی

۱-۴- ۵۳ء

جلیل صاحب، دعا،

میں چار دن بعد پیر کالونی سے آئی۔ نزلہ تھا۔ چلی گئی تھی۔ اگر آپ کا کارڈ تین دن قبل مل گیا ہوتا تو وہاں سے لکھوا لاتی۔[۱] اچھی نہیں ہوں تاہم کوشش کروں گی کہ لکھوا کر ڈاک سے بھیج دوں۔ آپ بے کار تکلیف نہ کریں آنے کی، صرف مضمون کے لئے۔ وہ مضمون بہت خراب ہے۔ بیماری میں لکھوایا ہے مجھے پسند نہیں۔

امید ہے ہو سکا تو اس ہفتے میں بھیجدوں گی، مگر وہ ہے کچھ نہیں۔

سب کو سلام دعا، دعا گو

نذر سجاد

(۸)

قدوائی صاحب !

(آپ بھی ؟) خوب ہیں۔ یا جلدی تھی یا اب تک تصویر نہ مانگی۔ سنئے! امجد کو ان کے لئے لڑکی نہ مل سکی[۳]۔

---

[۱] یہ نامکمل مضمون میں نے "ماہ نو" کراچی میں چھپوایا تھا۔ پھر "قومی زبان" کے پچھلے شمارے میں دوبارہ شامل ہوا۔ بقیہ مضمون کے لئے میرا اصرار جاری رہا۔ بہت عرصہ یعنی پاکستان چھوڑنے کے بعد بمبئی سے اس مضمون کی ایک اور قسط انہوں نے مجھے بھیجدی تھی جو اب تک غیر مطبوعہ تھی۔ یہ بھی "قومی زبان" کے پچھلے شمارے میں شامل کر دی گئی۔ مگر مضمون مکمل پھر بھی نہ ہو سکا۔ افسوس۔

[۲] یعنی بقیہ حصہ اس مضمون کا جس کی قسط اول مرحمت فرما چکی تھیں۔

[۳] ایک اور مناکحت کا معاملہ ہے۔ شادی بیاہ کے معاملہ میں انھیں آخر وقت تک دلچسپی رہی۔

کمزوری، ضعیفی، مگر دل بیگانہ ہو رہا ہے۔ تین سال پر بڈ نہیں دیکھی۔ اس سال دل چلا ہے۔ خدا جانے کیوں؟
بہرحال ابھی فون کر دیں کہ صبح لے جائیں گے یا نہیں؟ پاس کوئی ہے؟

دعاگو

نذر سجاد

(۵)

گرینڈ ہوٹل
۱۱۔۴۔۵۱ء

جلیل صاحب!

مبارکباد خوشیوں کی، مگر میں بدنصیب کہاں آ سکتی ہوں۔ آج بائیس دن سے پڑی ہوں، نئی تکلیف ہیں۔ اس "ماہ نو" کے مضمون کی وجہ سے غش[1] آ گیا۔ مضمون نہ پیدا ہوا تھا۔ چپراسی لینے آیا۔ میں خود لکھنے لگی۔ چکر آیا غسل خانہ گئی۔ بے ہوش ہوگئی، وہیں گر گئی سجاد صاحب کی طرح۔ مگر مری نہیں۔ خود ہی ہوش آیا تو اٹھ کر آئی۔ اس دن سے آج تک پڑی ہوں۔ غش کے بعد سے بہت خراب حالت ہوگئی تھی۔ شام کو ہو جاؤ۔ میں بھلا کہاں ہل سکتی ہوں

دعاگو

نذر سجاد

(۶)

شالیمار ہوٹل، کمرہ نمبر ۵، آرام باغ کراچی
مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۵۳ء

عزیز القدر، دعا،

یہ خط اس مقام سے لکھوا رہی ہوں، جہاں آپ پانچ سال قبل کچھ دن رہ چکے ہیں۔ میرا بلڈ پریشر ابھی تک کم نہیں ہوا۔ شاید آپ کو دلہن نے بتایا ہوگا۔ لیٹی رہتی ہوں اور سر اور آنکھوں میں درد رہتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ دو سال قبل آپ نے "یلدرم" پر ایک مضمون کی فرمائش کی تھی، وہ آج تک مکمل نہ ہو سکا۔ ویسا ہی پنسل کا لکھا ہوا مسودہ پڑا ہے، جو شاید آپ پڑھ بھی نہ سکیں۔ تھوڑا سا حصہ . . . . صاحب نے لکھا تھا وہ بھی ہاتھ نہیں لگا۔
جب کبھی فرصت ہو تو آپ دونوں مجھ سے کسی شام کو مل لیں۔

دعاگو

نذر سجاد حیدر

---

[1] اس مضمون کے بارے میں زیادہ وضاحت اگلے خط میں ملے گی۔ علالت کے باعث میں نے عرض کر دیا تھا کہ مضمون اطمینان سے بعد میں مکمل کریں۔

تاریک بس لگا ہوں میں دنیائے عید ہے
میری نظر سے دور وہ رشکِ قمر ہے آج
ہوش و حواس و تاب و تواں کھو چکے ہیں ہم
یہ انبساطِ عید کا دل پر اثر ہے آج
وابستگی ہے جس کی ہمیں روزِ عید تھی
اب عید سے ہماری وہی بے خبر ہے آج

گذشتہ عیدوں کی یاد

عید کے دن مرا گھر رشکِ چمن ہوتا تھا
شاد و فرحاں وہ مرا غنچہ دہن ہوتا تھا[1]
ہفتہ عشرہ مرے گھر عید رہا کرتی تھی
اپنے احباب کے مجمع سے، وطن ہوتا تھا
کم سخن جس[1] کو جہاں کہتا تھا، کیا عید کے دن
ہو کے مسرور وہ سرگرمِ سخن ہوتا تھا[2]
جس کے ہر مصرعہ میں تھا قند مکرر کا مزا
کیسا پُر کیف وہ رنگین سخن ہوتا تھا
سب سے مل مل کے گلے تہنیتِ عید میں آہ
گلستاں کیا گلِ خنداں وہ دلہن[1] ہوتا تھا[2]
گو زمانہ ہے وہی، ہم ہیں وہی، عید وہی
وہ نشیمن نہیں جو رشکِ چمن ہوتا تھا
نہ وہ ساقی ہے، نہ پیمانہ، نہ وہ مے خانہ
میکدہ آج مرا صحنِ چمن ہوتا تھا

---

[1] دورِ متوسطین کے کسی استاد کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ!

[2] سید سجاد حیدر یلدرم، اگرچہ پوری نظم ہی مرحوم کی یاد میں ہے!

ڈاکٹر اور انجینئر ناپسند ہیں۔ اس لڑکی کو جس کا آپ کو خیال تھا۔

ٹیلیفون کر کے مضمون منگا لیجئے۔ میں بھی بھیجوں گی۔ درمیان میں دوبارہ پھر طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ بہر حال بھیجوں گی

تصویر واپس ہے

دعاگو

نذر سجاد

(۹)

شالیمار ہوٹل، کراچی

۷ ۔اپریل ۱۹۵۳ء

عزیز جلیل دعا،

شاید آپ منتظر ہوں گے۔ میں برابر اچھی نہیں رہی۔ لکھوانا بھی مشکل ہے۔ نہ وہ مضمون اس قابل ہے کہ مر کر بھی لکھوا دوں وہ بہت بڑا ہے۔ حالت میں ۱۰۰ بخار میں لکھا اور لکھوایا تھا۔

میں آج ایک رشتہ دار کے گھر جا رہی ہوں۔ چند دن رہوں گی۔ یہاں گھبرا گئی۔ تنہائی ہے۔

دعاگو

نذر سجاد

(۱۰)

پیاری ہرمزی، عید مبارک!

پریشر زیادہ ہے، رات بھر نہ سو سکی تو یہ تک بندی کی ہے۔ دیکھو، جلیل سے اصلاح دلوا دو۔

عید الفطر

عید الفطر کا دل پہ یہ کیسا اثر ہے آج
حالت کسی مریض کی نوعِ دگر ہے آج
خوشیاں منا رہا ہے جہاں، روزِ عید ہے
طوفانِ غم ہے اور دلِ نوحہ گر ہے آج
شمعِ حیات و نورِ نظر[1] دونوں ہیں جدا
بے چین قلب ہے مرا مضطر جگر ہے آج

---

[1] مرحومہ کی اپنی تشریحات کے مطابق۔ سید مصطفیٰ حیدر عرف چھبو جی (معروف اخبار نویس) و کو قرۃ العین حیدر عرف عینی (نامور مصنفہ) یہ دونوں اولادیں اس زمانہ میں کراچی سے باہر تھیں۔

رنگین و پُر بہار یہ دنیائے عید ہے،
تنہائیاں ہیں اور دلِ خونیں نوا ہے آج
کس طرح عیش[1] باغ میں ہے اس کے چین ہے؟
بے چین و بے قرار جو تم سے جدا ہے آج

(۱۲)

۵، شالیمار ہوٹل، آرام باغ کراچی
۱۴ر اکتوبر۔ ۱۹۵۳ع

عزیزہ ہرمزی بیگم قدوائی صاحبہ۔ دعائیں۔

مدت سے میاں بیوی نے بھلا رکھا ہے۔ میں بھی دیکھتی رہی کہ آخر کب تک؟ میرے عید والے خط کا جواب نظم میں تو کیا نثر میں بھی میاں بیوی نے نہ دیا[2]۔ نہ آ کر ملے۔ میں برابر اچھی نہیں رہتی۔ اُس روز پرشیر ہی میں بخاری صاحب[3] کی مجلس میں دیورانی کھینچکر اٹھا کر لے گئی تھیں۔

مینی کی طرف سے سخت پریشان تھی، آخر ستمبر میں اس کو آنا تھا۔ نہ آئی نہ خط آیا۔ سنا۔ کہ میری بھانجی مسز عباسی صاحبہ کے ہاں ایک دعوت میں کوئی صاحب آ رہے ہیں لندن سے آئے ہوئے جنھیں میں جانتی ہوں۔ بس خود بن بلائے اس ڈنر میں پہونچ گئی۔ اس کی خیریت دریافت کرنے[4]۔ بس دوبار نکلی ہوں اور خوب ہی بڑی ہوں۔ اب پھر پندرہ دن سے پرشیر ہائی ہے۔ پانچ دن سے بہت تکلیف ہے۔ ورنہ جیکب لائن بھی پہونچ جاتی[5]۔ خیر لکھو کہ سب کیسے ہو؟ اور ہو سکے تو کسی شام آ کر مل جاؤ۔

لینی بھی اب انشاء اللہ آنے والی ہے۔

دعاگو دونوں کی
نذر سجاد حیدر

مشکل سے گھسیٹا ہے، دوبارہ نہیں پڑھ سکتی۔ کمی ہو وہ خود پوری کر لینا۔

---

[1] عیش باغ لکھنو کے اس قبرستان کا نام ہے جس میں وہ (سجاد حیدر) محو خواب ہیں۔ یہ نوٹ خود مرحومہ نے لکھا تھا ویسے عیش باغ لکھنو کا ایک محلہ ہے۔ وہاں قبرستان بھی ہے۔

[2] جواب دیا گیا تھا، مگر افسوس کہ پہونچا نہیں ـــ [3] سید ذوالفقار علی بخاری، ماہ محرم میں انیس کے مرثیے پڑھتے ہیں۔ اس مجلس میں محترمہ سے اچانک ملاقات ہو گئی تھی۔

[4] ان دنوں مینی لندن میں تھیں ـــ [5] یعنی میرے گھر۔

دائیں بائیں مرے گلشن کی وہ نورس کلیاں[1]
بیچ میں خسرو[2] گل جلوہ فگن ہوتا تھا

دعاگو

نذر سجاد۔

۱۱-۶-۵۳ء

(۱۱)

۵، شالیمار ہوٹل۔ آرام باغ کراچی

۱۹؍ اگست۔ ۱۹۵۳ء

عزیز جلیل و مسز جلیل، خدا بیسیوں عیدیں دکھائے۔

غالباً کل عید[3] ہوگی۔ میرا ارادہ تھا کہ آؤں مگر ایک ماہ سے اچھی نہیں۔ کبھی حرارت ہو جاتی ہے، پندرہ دن گذرے پسلی میں چوٹ لگ گئی، ایسی ہی ذہنی و جسمانی تکالیف میں مبتلا رہتی ہوں۔ جی چاہتا تھا عید کے دن آتی۔ مگر ہمت نہیں اور یہ خیال بھی ہے کہ آپ دونوں سلنے ملانے گئے ہوں گے، نہ ملیں گے۔ آپ نے مدتوں سے یاد نہیں کیا، کیا وجہ؟ خدا کرے سب تندرست ہوں۔ ٹیلی فون نہ کر اسکی کہ آپ کا نوکر چلا گیا۔

ہاں، ابھی ابھی ایک گھنٹہ قبل تنہا پڑی تھی، عید کا خیال آتے ہی یہ بے تکے شعر لکھ لیے۔ رازق صاحب[4] آ گئے۔ ان سے باتیں کیں۔ اب شعر آپ کو لکھ دیتی ہوں۔ امید ہے بچے تندرست ہوں گے۔ اچھا دیکھئے اور اصلاح کیجئے۔

دعاگو

نذر سجاد

عید الاضحیٰ

عید الضحیٰ نہیں ہے یہ روزِ سزا ہے آج
رنج و الم کی دل پہ جو چھائی گھٹا ہے آج
ویران ہو چکا ہے مِرا گلشنِ حیات
اس خارزارِ زیست کی غمگیں فضا ہے آج

---

[1] یعنی دونوں بچے سلطانہ حیدر اور مینی [2] یلدرم
[3] عید قربان۔
[4] رازق الخیری (ایڈیٹر عصمت)

صحیح ہے؛ میں کہیں نہ کہ منتظر ہو جاؤں آپ کی۔ پریشر بڑھ گیا ہے، تاہم ارادہ ہے۔
اگر ڈھنگ کا مشاعرہ نہیں ہے تو نہ آپ چلئے نہ میں جاؤں۔ ہر مزی شکر ہے خدا کا ادا کر کے خوب خوب سوئیں۔ جانے
ہیں گی[1]۔ جلدی، ابھی جواب دیجئے کہ کیا ہوا مشاعرہ کا۔ ہفتہ کی صبح مجھ کو مل جائے جواب۔ اسی دن سعد الخیری[2] کی شادی کا
سے بلاوا ہے۔ کیا کروں؟ بیوی بچوں کو دعا۔

منتظر

نذر سجاد

(۱۵)

جناب جلیل صاحب قدوائی

نمبر ۱۳۔ بلاک ۲، کراچی ۲۹۔ معرفت بیگم قدوائی صاحبہ۔

یہ باورچی کا کام جانتا ہے۔ پسند ہو تو ۳۰/= پر رکھ لو۔

(۱۶)

۲۰ راگست، کراچی

عزیز جلیل صاحب۔ دعائیں۔

آپ جب سے گئے ہیں میں برابر بیمار ہوں، کہیں جانا تو کہاں، باتیں کرنا بھی مشکل ہے۔ آپ کو اسی لئے اطلاع نہ دے سکی
رکوے جائیں۔ کہ مجھ سے تو اٹھا بیٹھا بھی نہیں جاتا۔ اور ایک مہینے سے طرح طرح کی تکالیف ہو رہی ہیں۔ پریشر کم نہیں ہوتا۔ سر
ہر وقت چکر رہتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تک بھی آپ کے بچہ کو بھی نہ دیکھ سکی۔ خدا جانے کب آنے کے قابل ہوں گی آپ
ی وقت ہو جائیں۔ بیوی بچوں کو دعا، پیار۔

دعا گو

نذر سجاد حیدر

(۱۷)

کراچی

۲۲ - ۹ - ۵۹ عزیز جلیل صاحب، دعا،

میں آنے کے قابل نہ تھی، اب سنو، شاید جمعہ تک ٹھیک ہو جاؤں۔۔ بہر حال جمعہ ۲۵ر کو آپ اگر مل جائیں۔ اگر

---

[1] وہی ان کو سر شام نیند آ جانے کی بات ہے۔

[2] سعد الخیری سلمہٗ رازق الخیری کے صاحبزادے۔ پاکستان فارن سروس میں ہیں آجکل ماشاء اللہ غالباً سوڈان میں ہمارے سفیر ہیں۔

(۱۳)

۵، شالیمار ہوٹل، آرام باغ کراچی

۲ر فروری ۱۹۵۴ع

عزیز القدر جلیل صاحب، دعائیں۔

شام آپ کا کارڈ ملا، جس سے معلوم کر کے افسوس ہوا کہ آپ بھی اس درمیان میں پریشان رہے، علالت کا سلسلہ تو ہمارے گھروں سے نہیں ختم ہوتا۔ میں آپ میاں بیوی کی منتظر تھی اور حیران تھی کہ اب تک کیوں نہیں آئے؟

مختصراً میرا حال سنیئے۔ "ساون ہری نہ بھادوں سوکھی"۔ میں تو ہوں ہی بار بستر۔ پندرہ دن تو اچھی نہ رہی، مختلف تھا پھر ذرا آرام دینے کے خیال سے ایک بھاوج (دوست) اپنے گھر لے گئیں، اسی ہفتہ۔ پندرہ دن میں واپس آئی ہوں۔ آ کے ہاں آکر مسز جلیل کو اور تکلیف دوں۔ بچوں کا کام، آپ کی فکر، خود بھی وہ بہت کچھ تندرست نہیں ہیں۔

اگر ہو سکا تو اس مارچ تک شاید اپریل نمبر "ماہ نو" کے لئے وہ مضمون پورا کرا سکوں۔ لکھنے والا تو مل بھی سکتا ہے، مواد کہاں سے آئے؟ دماغ تو ان چیزوں سے بالکل خالی ہو گیا ہے اور ان کی جگہ رنج و غم، تفکرات نے لے لی ہے۔ مصطفےٰ[5] بھی اچھا نہیں۔ اس کا بچہ برے حال ہو کر بچا ہے۔ خود یہاں تنہا پڑی ہوں۔ سوچیئے یہ افسانہ نویسی کے لئے موزوں اسباب ہیں۔ جب چار بار آکر واپس جا چکے ہیں، تو چند سطر، ۱۰ منٹ۔ "ایام گذشتہ"[6] کی لکھ دیتی ہوں۔

کوٹھی میں جانا مبارک ہو۔ جاکر رہنا تو مشکل ہے۔ کسی دن مجھکو ہمراہ لے کر دکھا لائیے۔ آپ کے ساتھ میں اور مسز جلیل چل کر دیکھ آئیں۔ میں نے ابھی سنا ہی سنا ہے۔ ایک کارڈ لکھ دیجئے کہ کس دن لے چلنے کو آئیں گے۔ اور یہ بھی کہ کوٹھی ہے کہاں۔ ڈرگ روڈ پر؟ نہیں؟ وہ بہت دور ہے۔ سب کو سلام دعا، پیار۔

خاکسار

نذر سجاد حیدر

(۱۴)

میزبان ہوٹل نمبر ۵، صدر کراچی

۳ر فروری ۱۹۵۴ع

عزیز جلیل صاحب، دعا،

خدا جانے مشاعرہ ہو رہا ہے یا نہیں؟ سنا ہے کہ نہیں ہو رہا ہے۔ اگر ہوا بھی تو جگر جوش وغیرہ نہیں آئیں گے۔ بتایئے

---

۵ رازق الخیری (ایڈیٹر عصمت)

۶ مرحومہ کا یہ سلسلہ مضمون کم و بیش ایک روز نامچہ کی شکل میں "عصمت" میں عرصہ تک نکلا اور خوب مقبول ہوا

(۲۰)

۱۰/ڈی۔ گارڈن روڈ۔ کراچی

۸ — ۲ — ۶۱ء

عزیز القدر قدوائی صاحب، دعائیں

میں شادی ہی میں بیمار ہوگئی اور پانچویں دن پرسوں واپس آئی۔ کل کرنل شاہ کو دکھایا۔ پریشر بہت ہائی نکلا۔ جو اس بائیس ۲۲ سالہ مرض میں کبھی نہ نکلا۔ اب میں بالکل لٹادی گئی ہوں۔ پوری غذا اور چائے بھی بند ہے۔ میں جیسی خوش نصیب ہوں آپ کو معلوم ہے۔ مشاعرہ کیسا نماز تک پڑھنا دشوار ہے۔ ابھی پہلا غم ہی نہیں بھولا تھا یہ تازہ زخم لگا۔ اب آپ دس جون کو مجھے لینے نہ آئیں۔ اس کے بعد کبھی آ کے دیکھ لینا۔

دعاگو

نذر سجاد

۲۱

۲۱- ۷- ۶۱ء

کراچی

عزیز قدوائی۔ دعائیں

مہینہ بھر سے پھر آپ غائب ہیں۔ میں دو ہفتے سے بہت تکلیف میں رہی۔ برانکائیٹس کی۔ پریشر اب بھی زیادہ ہے تاہم اچھی ہوں۔ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا کہ پیانو لیں گے یا نہیں۔ اگر آپ نہ لیں تو کسی اور کو دیا جائے۔ ایک کارڈ لکھ دیں۔ سب کو دعا۔

دعاگو

نذر سجاد

(۲۲)

کراچی

۱۰- ۸- ۶۱ء

عزیز قدوائی۔ دعائے صحت۔ میں بھی اس درمیان میں تندرست نہیں رہی۔
اب بھی پریشر ہائی ہے۔ آنکھوں کی عجیب حالت ہے۔ آپ کا کارڈ دولہن نے پڑھ کر سنایا۔ میں یاد کرنے کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔
ضرور ضرور مجھے بلا لیں۔ خدا کرے آپ خود آ سکیں ورنہ کسی کو بھیج دیں۔ اسی نمبر ۱۰ گارڈن روڈ میں ہوں (یعنی عینی والا

چل سکی تو چلوں گی۔ ایک اقرار پر اگر آپ میرا کہنا مانیں گے۔ شکل سے یہ گم بیٹھا ہے

نذر سجاد

(۱۸)

۳ / مارچ ۶۱ء، پورٹ سعید

چلے جاتے ہیں اٹھتے بیٹھتے ہم دشتِ غربت میں
وطن اپنا ہمیں منزل بہ منزل یاد آتا ہے

پیاری ہرمزی! آخر وقت تک آپ مجھ سے ملنے نہ آئیں رخصت یابی کے بعد۔

شکوہ کرتے ہیں "قلم" سے نہ گلہ کرتے ہیں
تم سلامت رہو اب تو یہ دعا کرتے ہیں

بچوں کو دعا، پیار۔

دعاگو

نذر سجاد

(۱۹)

۶۱ / ڈی ای گارڈن روڈ۔ کراچی

۲۷-۵-۶۱ء

قدوائی صاحب، دعائیں

خدا جانے آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ مہینوں میرے پاس نہیں آتے۔ میرے لندن جانے کی خبر پر بھی تکلیف نہ کی۔ جہاز سے میں نے کارڈ بھیجا تب بھی آپ کا خط لندن میں نہ ملا۔ مختصر یہ کہ میں وہاں برابر دو مہینے بیمار رہی۔ اور آخراسی حالت میں تین ہفتے کا سفر کاٹ کر واپس آگئی۔ اب بھی اگر آپ کا جی نہ چاہے تو نہ آیئے۔ کوئی شکایت نہیں۔[2]

دعاگو

نذر سجاد

---

[1] یہ مصور پوسٹ کارڈ عدن سے لکھا کر لندن جاتے ہوئے بھیجا تھا۔

[2] نہ لندن جانے کی پہلے سے خبر تھی نہ وہاں سے واپسی کی وقت پر اطلاع ملی۔ سیلانیوں کی طرح ماں بیٹی یکدم چل دیں یکدم واپس آگئیں نہ لندن کا پتہ بتایا کہ خط و کتابت ہوتی۔

پ کو جواب نہیں دیتی۔ سال گذشتہ ایک لڑکا لکھنو سے یہاں آکر ٹھہرا تھا تو اس سے لکھوا کر کراچی بھیجد یا تھا۔ جو ہماہ مہینے گیا۔ اب بس وہاں بھی ختم ہے۔ شاید ایک نمبر کے قابل اور ہو۔ کراچی تک سفر کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ آپ نے عا ہو گا۔ میری زندگی معجزہ[۱] ہے۔ یہ اپنی تک بندی کے تین شعر ہے (ہیں!) جو عید پر لکھے تھے۔ تم بھی پڑھ لو — سنیے:—

ہم اسی طرح سے گر گر کے جیا کرتے ہیں
چاک دامانِ حیات اپنا سیا کرتے ہیں

⁂

اب زندگی گذرتی ہے یوں اس چمن سے دور
میں دست و پا شکستہ ہوں اپنے وطن سے دور

⁂

خوشیاں منا رہے ہیں وہاں آج عید ہے
بیمار نا توان ہے اُس انجمن سے دور

دونوں کی دعا گو

نذر سجاد

(۲۶)

سجاد حیدر

۲، گراؤنڈ فلور۔ آشا محل
نوروجی گماڈیا روڈ۔ بمبئی ۲۶

۱۰ — ۷ — ۶۲ ع

عزیز القدر جلیل۔ دعائیں[۲]

میرا دل تو آپ میاں بیوی کی طرف سے بہت ہی جلا ہوا تھا۔ مگر اب جب خط آ گیا تو جواب نہ دینا میری بیعت کے خلاف ہے۔ آپ کا یکم جولائی کا لکھا ہوا عنایت نامہ دس[۳] کو ملا۔ کراچی کا خط ہوائی ڈاک سے بھی پانچ دن بعد

۱۔ بمبئی جا کر گر گئی تھیں۔ کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ پھر ایکبار اور توڑی جس کا حال ان کے خطوں میں درج ہے۔ اس سے پہلے کراچی میں ایک بار ی توڑ چکی تھیں۔ کل تین بار ہڈیاں توڑیں اور جڑوائیں۔
۲۔ کسی اور کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

مکان)۔ سب کو دعا و پیار۔

دعاگو

نذر سجاد حیدر

(۲۳)

کراچی

۲۹-۹-۱۹۶۱ء

گذشتی ہے اب تو زندگی مرنے کے انتظار میں
اب نہ خزاں کا کوئی غم اور نہ خوشی بہار میں

کوئی پرسانِ حالِ بے نوا اب تک نہیں آیا

دُعاگو

نذر سجاد حیدر

تین ہفتہ سے سخت بیمار ہوں۔

(۲۴)

۱۶/ڈی۔ گارڈن روڈ

۱۷-۱۲-۱۹۶۱ء

؏ کوئی پرسانِ حالِ بے نوا اب تک نہیں آیا

نذر سجاد

(۲۵)

۲۔ گراؤنڈ فلور۔ "آشا محل"

این گیاڈیا روڈ۔ بمبئی ۲۶

۵/جولائی

ہر مزی و جلیل۔ دعائیں۔

مدت بعد آپ کا خط ملا۔ میں بالکل جواب نہیں لکھوا سکتی۔ پہلے تو کوئی لکھنے والا نہ تھا/ اور اب میں لکھوا بھی نہیں سکتی۔ بس آپ صبر کرلیں۔ عصمت میں میرے مضامین دیکھکر آپ سمجھتے ہیں کہ میں ہر ماہ لکھکر روانہ کرتی ہوں، اور

(۲۷)

محترمی فدا دائی صاحب، آداب

بے حد افسوس ہے کہ تصویر اب تک آپ کو نہیں ملی۔ میں تصویر کراچی سے روانہ ہوتے وقت بھائی کو دے آئی تھی کہ لو واپس کر دیں۔ اس کی نقل جو میں نے کراچی ہی میں بنوالی تھی اور وہی نقل گیگڈنڈی کو بھیجی تھی۔ وہ ارسال کر رہی ہوں ی ندامت ہے کہ آپ نے اتنے خیال سے فوراً تصویر مجھے دی مگر وہ میری غیر موجودگی میں آپ کو نہیں ملی۔ امید ہے آپ معاف یں گے۔ ہرمزی باجی کو تسلیم۔ بچوں کو دعا۔

خاکسار

عینی

(۲۸)

بمبئی ۲۲

۱۳ ستمبر

عزیز القدر، دعائیں

میرا خط آپ کو بہت دن سے نہیں گیا۔ میں اب سخت بیمار ہوں۔ یہ ہفتہ بہت ہی برا گذرا۔ خدا جانے اسے کیا منظور ہے۔ اگر پڑھتے ہوں تو دعا کیجئے۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کا علاج ہے مگر فائدہ نہیں۔ عصمت میں ابھی کئی نمبروں میں آپ میرا مضمون یں گے۔ وہ میں نے جون میں لکھنو کے پرانے ملازم کے لڑکے جو دو ماہ کے لئے یہاں آگیا تھا، اس کے ذریعے چھ ماہ کے لئے اکر بھجوا دیا تھا۔

بچوں کی شاندار کامیابی پر دلی مبارکباد کتم دونوں کو پہونچے۔

دلی دعائیں

نذر سجاد

(۲۹)

گراؤنڈ فلور آشا محل، این. گبا ڈیا روڈ بمبئی ۲۶

۵ دسمبر ۱۹۶۲ء　　　عزیز القدر جلیل، دعائیں

آپ کو مدت سے خط نہیں لکھوا سکی کیونکہ دو ماہ سے بے حد بیمار تھی۔ ۲۷ر نومبر کو کمرے میں پھسل کر گر پڑی بائیں بازو کو ملے

پگڈنڈی امرتسر کے "سجاد حیدر یلدرم" نمبر کے لئے مجھ سے ایک گروپ فوٹوگراف مانگا گیا تھا۔

عینی کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

ہے۔ آپ نے ویسے ہی بھیج دیا[۵] اور وہ دس دن میں ملا۔ مہینے دو مہینے میں آپ ایک ہی خط لکھیں مگر ہوائی ڈاک بھیجا کریں۔

میری طبیعت اس ہفتے بہت ہی خراب ہے۔ ہاتھ کا ایک انگوٹھا پکا ہوا ہے۔ کئی دن بخار آیا۔ اور تھوڑی سی غذا بھی ہو جانے سے بہت کمزور ہو گئی ہوں۔ آپ کو اس وقت مفصل خط نہیں لکھ سکتی۔ بولا ہی نہیں جا رہا ہے۔ کئی دن ہوئے مضمون لکھوا لیا تھا۔ جو آپ کئی سال سے مانگ رہے ہیں۔ لکھوایا کیا ہے بھس سا بھرا ہے۔ مگر آپ کا کہنا پورا کر دیا۔ خط ے والا کوئی نہیں، مضامین کون لکھے۔ اور میری بھی اب حالت ہی نہیں رہی لکھوانے کی۔ آنکھوں کی حالت کراچی سے ہے۔ عام صحت بہت خراب ہے۔

فلیٹ بھی ابھی دو کمروں کا ملا ہے۔ جگہ اچھی ہے، سامنے ہی سمندر ہے، پارک ہے۔ آبادی ستھرے لوگوں کی ہے۔ رکین، پارسی اور اونچے درجے کے ہندو۔ مگر جب صحت ہی نہ ہو تو کچھ نہیں چھ ماہ گذر گئے۔ میں بالکل سمندر رنگ ہو گئی۔ ہمارے کمروں کے اوپر ایک پارسی ڈاکٹر رہتا ہے۔ اسے ہر وقت بلاتی رہتی ہوں اور دکھاتی رہتی ہوں۔ پریشر اور چھوٹی موٹی تکلیفوں کی دوا اسے لیتی ہوں۔ اور ہر مہینے میں ایک بار کرنل شاہ کی طرح دل کے خاص ڈاکٹر کے پاس جاتی ہوں۔ کل اس نے پھر بلایا ہے۔ بارش کی جھڑیاں لگی ہیں۔ سنا ہے یہاں چار ماہ سخت برسات ہے گی۔ اللہ مالک ہے۔ مجھے مرطوب ہوا بھی نقصان دیتی ہے۔

آپ نے یہ کیا کیا؟ میرا خط وہاں کیوں بھیجا![۶] میں نے انھیں یا کراچی میں کسی کو بھی خط بھیجا نہیں، اور یہ خط دیکھ کر انھیں قدر غصہ آئے گا۔ آپ صرف پتے کی نقل بھیج دیتے۔ اب میرے سارے کنبے میں اعلان کرا دیں کہ میرا خط آیا ہے۔

ہاں، چھبتو جی کو آپ نے بہت کمزور دیکھا۔ ان سے پوچھا تو ہوتا کہ کچھ بیمار تو نہیں ہو؟ ان کی فکر میری جان کھا رہی ہے۔ یہاں عینی کو بالکل تنہا کس پر چھوڑ دوں[۷] جو ادھر آؤں۔ خدا ہی میری مشکلات کو حل کرے۔ آپ خواہ کارڈ ہی لکھیں مگر ہوائی ڈاک سے بھیجیں۔ صبح سے رات کے آٹھ بجے تک فرصت نہیں۔ دفتر کا کام کرتی ہیں۔ اور پھر جو کتابیں لکھنے یا ترجمہ کرنے کو آتی ہیں وہ کرتی ہیں۔ یہ خط تو ایک مہمان لکھوایا ہے۔ جو لکھنؤ سے آئے ہوئے ہیں۔ عینی ٹائپ کر رہی ہیں۔ اگر وہ آپ کا گروپ نکال کر دیں گی تو اسی مضمون کے رجسٹری کرتی ہوں۔ بلا رجسٹری پاکستان کی کوئی چیز یہاں نہیں پہنچ سکتی۔ بیوی بچوں سب کو سلام دعا پیار

دعاگو

نذر سجاد حیدر

---

۵ ملازم کی غفلت کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔

۶ رازق صاحب کو دیکھنے کو بھیجا تھا، ان کا اصرار تھا۔

۷ افسوس۔ اب کس پر چھوڑ گئیں؟ دونوں کے لیے بے تاب رہتی تھیں۔ ع دو گونہ رنج و عذاب است جان مجنوں را۔ !

لطف اللہ بدوی

گلدستہ حدیقۂ حامدی

گلدستۂ حدیقۂ حامدی رامپور کا ان گلدستوں میں شمار ہوتا ہے، جو شمالی ہند میں، سابقین و اولین کا شرف رکھتے ہیں۔ چونکہ یہ گلدستہ ریاست رامپور کے والی محمد حامد علی خاں کے زمانے میں وجود میں آیا تھا، اس لئے ان ہی کے نام سے منسوب کیا گیا، اور "حدیقۂ حامدی" نام رکھا گیا۔ یہ گلدستہ ماہ جون ۱۹۰۷ء میں جاری ہوا، اور تقریباً دو سال بڑے اہتمام سے شائع ہوتا رہا۔ گلدستہ کے سرورق پر ہر ماہ یہ شعر موجود نظر آتا ہے:

گر مرے پاس نہیں غیر متاع کاسہ
میں تماشائی انداز خریدار تو ہوں

غالباً یہ شعر مدیر گلدستہ کا ہی ہے، جس کا نام محمد اعزاز الدین احمد تھا۔ مدیر گلدستہ کے متعلق ہماری واقفیت بہت محدود ہے۔ البتہ ہم گلدستہ سے یہ حالات میسر کر سکے ہیں کہ وہ رامپور کا رہنے والا تھا، اچھا شعر کہنے والا تھا، اور اس وقت کے ایک استاد شاعر امیر اللہ تسلیم کے شاگردوں میں سے تھا۔ رامپور میں آپ کا ایک کتب خانہ تھا، جس سے ایک پریس بھی ملحق تھا، جس میں کتب خانے کے لئے پر کتابیں شائع ہوتی تھیں، اور یہی ذریعۂ معاش تھا۔ گلدستۂ حدیقۂ حامدی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو نظم کے علاوہ نثر پر بھی اچھی دستگاہ حاصل تھی، اور آپ صاحب تصانیف تھے، گلدستہ کی مختلف اشاعتوں میں، آپ کا ایک "اشتہار عام" موجود ہے، جس کے پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کو تصنیف اور تالیف کا بڑا شوق تھا، یہاں اس عبارت کو نقل کیا جاتا ہے۔

التجائے بخدمت شعرا

میں بڑی کوشش سے سہروں کا ایک ضخیم مجموعہ تیار کر رہا ہوں، تین سو سہرے، اور مبارک بادیں جمع ہو گئی ہیں۔ عنقریب یہ باغ و بہار گلدستہ، جس میں ہزاروں اچھوتے پھول، رنگین خیال کے نازک ہاتھوں سے گوندھے گئے ہیں، نظر کے سامنے آجائیں گے۔ آپ صاحبوں سے درخواست ہے کہ اپنے لکھے ہوئے سہرے اور مبارک بادیں کسی

میں شدید چوٹ آئی۔ پلنگ سے ہل جل نہیں سکتی۔ ہسپتال جاکر ایکسرے کروانا اس حالت میں ناممکن تھا، مگر پورٹ ایبل ایکسرے منگواکر تصویر لی گئی ہے۔ آج شام کو نتیجہ معلوم ہوگا کہ فریکچر ہے یا نہیں۔ شدید تکلیف ہے۔ غذا بند ہے۔ کچھ ہضم نہیں ہوتا۔ سخت کمزوری ہے۔

میرے لئے دعا کرو۔

دونوں کو دعائیں۔ بچوں کو پیار

نذر سجاد

(۳۰)

بمبئی – ۲۶

۱۱ر مارچ

محترمی قدوائی صاحب۔ تسلیم

آپ کا ۴ر مارچ کا گرامی نامہ ملا۔ افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خطوں کا جواب نہ دیا جاسکا۔ اماں کی حالت بدستور ہے۔ بہت کمزور ہوگئی ہیں، ایسی حالت میں خطوں کا جواب لکھنا یا لکھوانا ان کے لئے بہت مشکل ہے۔ مجھ کو بھی بالکل فرصت نہیں ملتی۔ اس لئے نادم ہوں کہ آپ کو اس سے قبل نہ لکھ سکی۔ سب عزیزوں اور دوستوں کو یہی شکایت ہے مگر مجبوری ہے اماں کی آنکھوں کی حالت بھی ابتر ہے۔ مگر اس کمزوری میں آپریشن کروانا ناممکن۔ بمبئی کے تین چار بہترین ڈاکٹر ان کے مختلف امراض کا علاج کر رہے ہیں۔ عصمت میں جو ان کا روزنامچہ چھپ رہا ہے وہ کئی مہینے ہوئے سال بھر کا اکٹھا لکھواکر بھجوادیا تھا۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ آپ ان کی صحت کے لئے دعا کرتے رہیں۔

دراصل وہ بہت زیادہ جذباتی ہوکر عصمت میں اپنی صحت کے متعلق لکھتی رہتی ہیں اس لئے سب کو ان کے متعلق اور زیادہ تشویش ہوتی ہے۔

امید ہے آپ سب بخیر ہوں گے۔

خاکسار

عینی

عدم میں فراقِ احبا کا غم کیا — یہیں آئیں گے سب کی منزل یہی ہے
تماشا مرے دل کے داغوں کا دیکھو — چمن سیر کرنے کے قابل یہی ہے

اُمیر اُس سے تیور مرے کہہ رہے ہیں
تری بانکی چتون کا بسمل یہی ہے

اسی زمانے میں اُمیر کی دوسری غزل مطلع دیگر کے عنوان سے، اس طرح درج ہے

جو تم ہو مرے دل میں تو دل یہی ہے — یہی گھر ہے لیلیٰ کا محمل یہی ہے
ترا دوست میرا عدو دل یہی ہے — ترا بسمل اور میرا قاتل یہی ہے
ستم ہے نکیلی چھری اس نگہ کی — کلیجے میں رکھنے کے قابل یہی ہے
رہِ عشق میں جس جگہ گر پڑا میں — کہا ضعف نے تیری منزل یہی ہے
وہ صورت تصور سے ہٹنے نہ پائے — ترا فرض اے عشق کامل یہی ہے
اجل گور تک مجھ کو پہنچا کے بولی — مسافر ٹھہر تیری منزل یہی ہے

اُمیر اس کرم پر میں صدقے کہ اُس نے
کہا میری رحمت کے قابل یہی ہے

اساتذہ میں جناب داغ کا نام بھی آتا ہے۔ اُن کے نام کے ساتھ گلدستہ میں القاب اس طرح آتے ہیں:

(۲) داغؔ بلبل ہندوستان، مقرب الخاقان عالی جناب نواب فصیح الملک بہادر دہلوی۔
استاد حضور نظام دکن دام اقبالہ

کلیجا کرے خون وہ دل یہی ہے — تمہارے برابر کا قاتل یہی ہے
جو بے آگ جل جائے وہ دل یہی ہے — جو بے زخم تڑپے وہ بسمل یہی ہے
نہیں یک دلی سخت مشکل یہی ہے — کہ وہ دل وہی اور یہ دل یہی ہے
نہ ٹھہرا وہ ناوک تو دل یوں پکارا — ٹھہر اے مسافر کہ منزل یہی ہے
طبیعت کا آنا ہے آفت کا آنا — کرے صبر انسان مشکل یہی ہے
نہ آئے گا کوئی نہ بیٹھے گا کوئی — مجھے خوف منزل بمنزل یہی ہے
ہماری شبِ غم گزر جائے یارب — کہ آسان کرنے کی مشکل یہی ہے
مری بزم کا عیش سن کر وہ بولے — اگر موت سے ہے تو غافل یہی ہے

وفا وہ کریں داغؔ یہ کس نے مانا
مگر آپ کا زعم باطل یہی ہے

تقریب کی ہوں، بقید تخلص وتلمذ، نام ومقام، خادم کے نام بہ روانہ فرمائیں کہ شکر گزاری کے ساتھ ان کو مجموعہ میں داخل کر دیا جائے گا۔"

میرے سامنے گلدستہ 'حدیقۂ حامدی' کی دسویں اشاعت' اپریل ۱۸۹۸ء موجود ہے، اس کی ابتدا میں والی رامپور کی مدح میں ایک قطعہ مدحیہ نظر آتا ہے۔

قطعہ مدحیہ

ہمایوں مرتبت، عالی منزلت، کیوان مکان، جمشید نشان حضور پُر نور نواب محمد حامد علی خاں صاحب' والی ریاست رامپور دام اقبالہم، من تصنیف لطیف جناب حافظ عبدالحق صاحب خوش نویس تلمیذ جناب نیر پنجہ کش صاحب دہلوی۔

جناب حامد علی خاں شہِ فریدوں		رئیس ابن رئیس، امیر ابن امیر
بذات او ہمہ اوصاف نازی سازد		سخاو معدلت وجود و دانش وتدبیر

اس قطعہ مدحیہ کے بعد گلدستہ کے لئے مصرع طرح، اس طرح درج کیا گیا ہے:

" قضا بول اٹھی کہ قاتل یہی ہے"

اس تحریری مشاعرہ میں ہمیں اس زمانے کے جلیل القدر شعرا بھی نظر آتے ہیں، جن پر اردو شاعری بجا فخر کر سکتی ہے۔ ان اساتذہ کے علاوہ دوسری صف کے شعرا موجود ہیں، جو اپنے کلام کی پختگی اور شیرینی سے کافی مشہور تھے۔ رامپور کے اکثر شعرا کا کلام بھی اس میں موجود ہے۔ اس گلدستے کی روشنی میں ان کا جائزہ آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ مرور ایام نے ان شعرائے کرام کے نام اور کلام کو بڑی حد تک بھلا دیا ہے، لیکن ہم اس گلدستے کے ذریعے، ان کے نام اور کلام کو پھر زندہ کر رہے ہیں۔ گلدستہ کی ابتدا، اردو کے مایۂ ناز شاعر امیر سے ہوتی ہے۔ ہم گلدستے کی ترتیب کے مطابق ہر شاعر کا نام اور کلام اختصار کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

(۱) امیر۔ استاد الاساتذہ، ملک الشعرائی استاد جناب نواب کلب علی خاں صاحب بہادر خلد آشیاں، عالی جناب منشی محمد امیر احمد صاحب مینائی لکھنوی مدظلہ العالی۔

شفا جس سے عیسیٰ ہے وہ دل یہی ہے		جو زندہ ہے مُردوں میں شامل یہی ہے
تڑپ کر ہمیں دل نے مارا تو سمجھے		کہ بسمل کے پردے میں قاتل یہی ہے
نہ گھبرا تہِ خنجرِ عشق دم لے		مزے کا تو وقت اس میں اے دل یہی ہے
کھلا تختہ لاشے کا تو میں یہ سمجھا		کہ اس کے شہیدوں کی محفل یہی ہے
خدا دادِ دے امتحاں میں سنبھالے		کڑی راہِ الفت میں منزل یہی ہے

لب گور پہنچے جو اک عمر چل کر — صدا آئی کانوں میں منزل یہی ہے
حسینوں کو مجمع میں دیکھا تو سمجھے — پتنگے ہیں سب شمع محفل یہی ہے
وفاداریاں دیکھ کر میری بولے — ہماری جفاؤں کے قابل یہی ہے
جو آتی ہے آفت وہ دل ہی کے ہاتھوں — ہر اک اچھی صورت پہ مائل یہی ہے

غریب حزیں پر کبھی چشم ترحم
ترے در کا محروم سائل یہی ہے

نواب داغ کے تلامذہ میں سے مندرجہ ذیل شعرا کا کلام درج ہے

(۶) فیروز - عالی جناب محمد فیروز شاہ خاں صاحب تلمیذ نواب فصیح الملک داغ دہلوی

پشیمانی و یاس و ارمان و حسرت — مری زندگی بھر کا حاصل یہی ہے
شب غم میں آتی نہیں نیند مجھ کو — نکلتی نہیں جان مشکل یہی ہے
کریں قید اس کو کسی زلف میں ہم — سرائے پریشانی دل یہی ہے
پڑے دست گلچیں نہ یارب گلوں پر — گلستاں میں شور عنادل یہی ہے
کسی طرح قبضے میں لائیں بتوں کو — خدا کی قسم فکر باطل یہی ہے

غم عشق کو ہم یہ فیروز سمجھے
ہٹے جو نہ چھاتی سے وہ سل یہی ہے

(۷) بسمل - جناب منشی بانکے پرشاد صاحب تلمیذ نواب فصیح الملک داغ دہلوی

جسے ڈھونڈتے ہو وہ بسمل یہی ہے — یہی دل ہے اے تیغ قاتل یہی ہے
پھلے پھولے اس گل کا نخل جوانی — ازل سے صفیر عنادل یہی ہے
پھرے زندہ یارب کبوتر وہاں سے — غریبوں کی عرضی کا حامل یہی ہے
کہاں جاتے ہو شیخ گردن اٹھائے — یہاں آؤ رندوں کی محفل یہی ہے
نگہ مار ڈالے تو ٹھوکر جلا دے — نہیں مرتے مرکر بھی مشکل یہی ہے

نہ جا کوئی زلف مسلسل میں ہرگز
سمجھ کالے کوسوں کی منزل یہی ہے

(۸) ڈاکٹر - عالی جناب ڈاکٹر بھولا ناتھ صاحب اسسٹنٹ سرجن رام پور تلمیذ نواب فصیح الملک داغ دہلوی

جسے کہتے ہیں رقص بسمل یہی ہے — تماشا تہ تیغ قاتل یہی ہے

(۳) داغ کے بعد منشی محمد امیر اللہ صاحب تسلیم کا کلام آتا ہے۔ تسلیم اپنے دور کے مشہور شعراء میں سے تھے۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ رام پور میں گزارا، اور نواب کلب علی خاں سے کئی سال وظیفہ ملتا رہا۔

جو مرتا ہے جیتا ہے وہ دل یہی ہے   مٹانے بنانے کے قابل یہی ہے
تڑپتے جو دیکھا مجھے سب سے پوچھا   مرے تیغ ابرو کا بسمل یہی ہے
رہِ عشق سے کون گزرا سلامت   کٹے جس میں صدہا وہ منزل یہی ہے
کہاں جسم سے روح جائے نکل کر   وہ لیلیٰ ہے جس کا کہ محمل یہی ہے
کہے گا خدا دیکھ کر اس کی صورت   مرے بے گناہوں کا قاتل یہی ہے
امیرِ جنوں کو ہے موجِ ہوا بس   یہی ہتھکڑی ہے سلاسل یہی ہے
خدا یاد آتا ہے عشقِ بتاں سے   کرے حق کو ثابت وہ باطل یہی ہے

گلہ کیا جو بے دین و ایماں ہیں تسلیم
بتوں کی محبت کا حاصل یہی ہے

ان اساتذہ کے بعد امیر، داغ اور تسلیم کے شاگردوں کا کلام آتا ہے، یہاں سب سے اول امیر کے تلامذہ کا کلام درج کیا جاتا ہے:

(۴) جلیل - عالی جناب حافظ محمد جلیل حسن صاحب شاگرد رشید حضرت امیر مینائی لکھنوی

مٹاتا ہے کس کو ارے دل یہی ہے   مری جاں تری عیش منزل یہی ہے
ادھر لاؤ رولیں گلے سے لگا کر   ہمارا قدیم آشنا دل یہی ہے
لہو ہوکے دل عاشقوں کے بہیں گے   اگر جانِ من رنگِ محفل یہی ہے
جب اس تیغ کے گھاٹ اترے تو سمجھے   کہ دریائے الفت کا ساحل یہی ہے
وہی بے قراری ہے دل کی لحد میں   جو مرکر بھی تڑپے وہ بسمل یہی ہے
مرے خون کا رنگ دیکھے تو بولے   کہ ہاں میری مہندی کے قابل یہی ہے

حسین کتنے ہی جا نکلتے ہیں جب ہم
جلیل آکے پریوں کی محفل یہی ہے

(۵) جناب مولوی الٰہی بخش صاحب مرجان رقم تلمیذ امیر متخلص بہ غریب

جو صدمے اٹھاتا ہے وہ دل یہی ہے   غم و درد و حسرت کی منزل یہی ہے
دوا درد دل کی سمجھتے ہو جس کو   مسیحا کے پردے میں قاتل یہی ہے

لبِ گور پہنچے جو اک عمر چل کر — صدا آئی کانوں میں منزل یہی ہے
حسینوں کو مجمع میں دیکھا تو سمجھے — پتنگے ہیں سب شمعِ محفل یہی ہے
وفاداریاں دیکھ کر میری بولے — ہماری جفاؤں کے قابل یہی ہے
جو آتی ہے آفت وہ دل ہی کے ہاتھوں — ہر اک اچھی صورت پہ مائل یہی ہے

غریبِ حزیں پر کبھی چشمِ ترحم
ترے در کا محروم سائل یہی ہے

نواب داغ کے تلامذہ میں سے مندرجہ ذیل شعرا کا کلام درج ہے

(۶) فیروز۔ عالی جناب محمد فیروز شاہ خاں صاحب تلمیذ نواب فصیح الملک داغ دہلوی

پشیمانی و یاس و ارمان و حسرت — مری زندگی بھر کا حاصل یہی ہے
شبِ غم میں آتی نہیں نیند مجھ کو — نکلتی نہیں جان مشکل یہی ہے
کریں قید اس کو کسی زلف میں ہم — سراسر پریشانئ دل یہی ہے
پڑے دستِ گلچیں نہ یارب گلوں پر — گلستاں میں شورِ عنادل یہی ہے
کسی طرح قبضے میں لائیں بتوں کو — خدا کی قسم فکرِ باطل یہی ہے

غمِ عشق کو ہم یہ فیروز سمجھے
ہٹے جو نہ چھاتی سے وہ سل یہی ہے

(۷) بسمل۔ جناب منشی بانکے پرشاد صاحب تلمیذ نواب فصیح الملک داغ دہلوی

جسے ڈھونڈتے ہو وہ بسمل یہی ہے — یہی دل ہے اے تیغِ قاتل یہی ہے
پھلے پھولے اس گل کا نخلِ جوانی — ازل سے صفیرِ عنادل یہی ہے
پھرے زندہ یارب کبوتر وہاں سے — غریبوں کی عرضی کا حامل یہی ہے
کہاں جاتے ہو شیخ گردن اٹھائے — یہاں آؤ رندوں کی محفل یہی ہے
نگہ مار ڈالے تو ٹھوکر جلا دے — نہیں مرتے مر کر بھی مشکل یہی ہے

نہ جا کوئی زلفِ مسلسل میں ہرگز
سمجھ کالے کوسوں کی منزل یہی ہے

(۸) ڈاکٹر۔ عالی جناب ڈاکٹر بھولا ناتھ صاحب اسسٹنٹ سرجن رام پور تلمیذ نواب فصیح الملک داغ دہلوی

جسے کہتے ہیں رقصِ بسمل یہی ہے — تماشا تہِ تیغِ قاتل یہی ہے

(۳) داغ کے بعد منشی محمد امیر اللہ صاحب تسلیم کا کلام آتا ہے۔ تسلیم اپنے دور کے مشہور شعرا میں سے تھے۔ اپنی زندگی کا حصہ رام پور میں گزارا، اور نواب کلب علی خاں سے کئی سال وظیفہ ملتا رہا۔

جو مرتا ہے جیتا ہے وہ دل یہی ہے — مٹانے بنانے کے قابل یہی ہے
تڑپتے جو دیکھا مجھے سب سے پوچھا — مرے تیغ ابرو کا بسمل یہی ہے
رہِ عشق سے کون گزرا سلامت — لٹے جس میں صدہا وہ منزل یہی ہے
کہاں جسم سے روح جائے نکل کر — وہ لیلیٰ ہے جس کا محمل یہی ہے
کہے گا خدا دیکھ کر اُس کی صورت — مرے بے گناہوں کا قاتل یہی ہے
امیرِ جنوں کو ہے موجِ ہوا بس — یہی ہتھکڑی ہے سلاسل یہی ہے
خدا یاد آتا ہے عشقِ بتاں سے — کرے حق کو ثابت وہ باطل یہی ہے

گلہ کیا جو بے دین و ایماں ہیں تسلیم
بتوں کی محبت کا حاصل یہی ہے

ان اساتذہ کے بعد امیر، داغ اور تسلیم کے شاگردوں کا کلام آتا ہے، یہاں سب سے اول امیر کے تلامذہ کا کلام درج کیا جاتا ہے:-

(۴) جلیل - عالی جناب حافظ محمد جلیل حسن صاحب شاگرد رشید حضرت امیر مینائی لکھنوی

مٹاتا ہے کس کو ارے دل یہی ہے — مری جاں تری عیش منزل یہی ہے
ادھر لاؤ رو لیں گلے سے لگا کر — ہمارا قدیم آشنا دل یہی ہے
لہو ہو کے دل عاشقوں کے بہیں گے — اگر جانِ من رنگِ محفل یہی ہے
جب اس تیغ کے گھاٹ اترے تو سمجھے — کہ دریائے الفت کا ساحل یہی ہے
وہی بے قراری ہے دل کی لحد میں — جو مر کر بھی تڑپے وہ بسمل یہی ہے
مرے خون کا رنگ دیکھے تو بولے — کہ ہاں میری مہندی کے قابل یہی ہے

حسیں کہتے ہیں جا نکلتے ہیں جب ہم
جلیل آؤ پریوں کی محفل یہی ہے

(۵) جناب مولوی الٰہی بخش صاحب مرجان رقم تلمیذ امیر متخلص بہ غریب

جو صدمے اٹھاتا ہے وہ دل یہی ہے — غم و درد و حسرت کی منزل یہی ہے
دوا درد دل کی سمجھتے ہو جس کو — مسیحا کے پردے میں قاتل یہی ہے

تصور ہے اس دل میں مدت سے تیرا اگر ہے پرستش کے قابل یہی ہے

دم آیا ہے اعزاز کا اب لبوں پر
خبر لیجیے وقت مشکل یہی ہے

گلدستے میں حصہ نظم کے بعد ضمیمہ کے طور پر "طبقات ناصری" کے چند مضمون کا ترجمہ بھی موجود ہے۔ ان صفحات میں سلطان محمود بن سبکتگین کا احوال موجود ہے۔ متن کے ترجمے کے علاوہ معتبر حواشی بھی دی گئی۔ غالباً یہ ترجمہ گلدستہ کے مالک اور مدیر اعزاز الدین ہی کا کارنامہ نظر آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے نہ فقط نظم اور نثر پر دسترس حاصل تھی، بلکہ مورخانہ انداز بھی موجود تھا۔

یہی داغ ہیں دل کو خوش کرنے والے — مرے غمگساروں کی محفل یہی ہے
نہ ٹھکراؤ کشتوں کو تم راہ چلتے — کوئی کہہ نہ اٹھے کہ قاتل یہی ہے
درِ یار پر جھک کے کہتا ہے گردوں — زمیں جبّہ سائی کے قابل یہی ہے
حسینوں سے روشن ہیں آنکھوں کے پردے — صنم خانۂ ہفت منزل یہی ہے
بہارِ خطِ سبزہ دکھلا رہا ہے — ترے حسن کا زعم باطل یہی ہے
تہِ خنجرِ ناز گھبرا نہ اے دل — کہ عشاق کی پہلی منزل یہی ہے
کہا ڈاکٹر نے بری یا بھلی ہے — مگر پیش کرنے کے قابل یہی ہے

امیرِ فصیح زباں اس کو دیکھے
کہ اس فن کا استاد کامل یہی ہے

(۹) فیاض - جناب محمد فیاض الدین صاحب رام پوری تلمیذ جناب فصیح الملک داغ دہلوی

نہ ٹھہرے جو سینے میں وہ دل یہی ہے — جو مر کر بھی تڑپے وہ بسمل یہی ہے
نہ جانا کہیں دل سے اے دردِ فرقت — جگہ تیرے رہنے کے قابل یہی ہے
عوض غیر کے تم جو مجھ سے خفا ہو — محبت کا سوچو تو حاصل یہی ہے

تمھیں میں نے دل بھی دیا، جان بھی دی
یہ فیاض بے جان و بے دل یہی ہے

طرح مصرع کے علاوہ اس شمارے میں، ایک قطعہ تاریخ وفات بھی موجود ہے، جو دہلی کے مشہور شاعر آغا مرزا صاحب شاغل دہلوی کی وفات پر، مولوی الٰہی بخش صاحب دہلوی 'مرجان قلم' کی تصنیف ہے -

عجب تھے شاعرِ نامی، عجب تھے رمزداں شاغل — سخن داں فقر میں اک صاحبِ ادراک تھے شاغل
جہاں میں جس طرح وہ آشنائے بحرِ عرفاں تھے — ضبطِ شعر میں بھی ایسے ہی تیراک تھے شاغل
غریب اس دارِ فانی سے گئے جب سوئے عقبیٰ وہ — کہی تاریخ یہ میں نے 'بدی سے پاک تھے شاغل'

۱۳۱۵ھ

نظم کے حصے کے آخر میں، مالک گلدستہ حدیقہ حامدی، اعزاز الدین کی ایک مختصر غزل موجود ہے - اعزاز الدین منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے تلامذہ میں سے تھے جن کا ذکر آ چکا ہے -

نہیں آستاں کعبۂ دل یہی ہے — جھکے عرش جس جا وہ منزل یہی ہے
تمھارے قدم پر کروں دل تصدق — کہ قربان کرنے کے قابل یہی ہے

طیب انصاری

مہدی افادی

"افادات مہدی" جادو کی چھڑی تو نہیں ہے کہ مہدی کا نام روشن رکھنے کے لئے کافی ہو۔ چند ایک مضامین لکھ کر آدمی کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ ایسا معلوم پڑتا ہے کہ مہدی حسن کوئی بڑا جادوگر تھا جو اپنی ساحری کے ذریعہ بقائے دوام کا مالک بن گیا۔ یہ جادو الفاظ کا جادو ہے۔ وہ فنکار نہیں سحر کار ہے۔ جو الفاظ کا رقص کچھ اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ لوگوں کی نظر نفس مضمون پر کم اور صرف ناچتے تھرکتے الفاظ پر جم کر رہ جاتی ہے۔ مہدی افادی نے عناصر خمسہ پر جو تبصرہ کیا ہے وہ اردو ادب میں خوب خوب چلا۔ کہتا ہے سرسید سے معقولات الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں" یہ تو مہدی کا نذرانۂ عقیدت تھا۔ جو اس نے آزاد کی خدمت میں پیش کیا۔ ورنہ حقیقت حال اس سے مختلف ہے۔ آزاد "آب حیات" کی وجہ سے زندہ ہیں اور تاریخ میں ان کا نام اس لئے لیا جاتا ہے کہ ان کی "انجمن پنجاب" نے اردو شاعری پر گرانقدر احسانات کئے ہیں۔ ورنہ آزاد کی انشا پردازی تنہا اس قابل نہیں کہ وہ آزاد کی زندگی کا بوجھ سنبھال سکے۔ ہاں یہ بات خود مہدی ہی پر صادق آتی ہے۔ مہدی کے یہاں آب حیات ہے نہ ہی ایسی کوئی انجمن ہے کہ جس نے ادب میں نیا انقلاب پیدا کیا ہو مہدی صرف اپنی انشا پردازی کی وجہ سے زندہ ہے۔ اس طرز نگارش کو مہدی کے مضامین اور مکتوبات سے نکال لیجئے۔ کیا رہ جاتا ہے؟ ۔ چند منتشر خیالات کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مہدی، فن کا کافر ہے یہ جو کہا جاتا ہے کہ مہدی نے تنقید کو نیا شعور عطا کیا ہے سفید جھوٹ ہے۔ اس نے کبھی ٹھیک کی تنقید کی ہی نہیں بلکہ جگہ جگہ تضاد بیانی سے کام لیا ہے۔ لیکن تنقید کی یہ تضاد بیانی مہدی کے یہاں عیب نہیں۔ ہنر بن جاتی ہے۔ وہ بڑا کاذب ہے صاف جھکہ دیتا ہے، جو بات اس نے ابھی کہی تھی وہ تھوڑی ہی دیر میں بدل جاتی ہے اور لوگ پہلی بات کو بھول جاتے ہیں۔ دوسری بات پر ایسے ہی ایمان لے آتے ہیں جیسے وہ پہلی بات کی صداقت پر ایمان لائے تھے۔ یہ سب اس کے انداز بیان کا جادو ہے۔ تنقید میں اس کے جملے زباں زد عام ہیں۔ حالانکہ وہ فکر کے لحاظ سے متضاد ہیں اور مختلف بھی۔ لیکن پڑھنے والوں کا دھیان ادھر جاتا ہی نہیں۔ مثلاً انھیں جملوں کو سامنے

تھے۔ وہیں وہ مذہب اسلام کی حقیقی عظمت سے بھی واقف تھے۔ وہ کوتاہ نظر آدمی نہیں تھے۔ اور نہ ہی اندھے مقلد۔ ان کا شعور پختہ اور
ات رندانہ رکھتے تھے۔ اس وجہ سے مغرب پرستی کے فیشن کو وہ اختیار نہیں کر لیتے۔ وہ ذہنی طور پر شبلی سے قریب تر ہیں۔ اس وجہ سے
ہوں نے شبلی کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے۔ جو کوتاہی رہ گئی وہ اس قدر کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ شاید وہ کوئی اور دن زندہ رہتے ہوتے تو
یقیناً شبلی کی حیات کو قلمبند کرنے کا خیال انھیں پیدا ہو جاتا۔ مہدی انشا پردازی کے سہارے زندہ تو ہیں لیکن وہ حیات جاوید سے کہیں
یادہ بہتر نقش سوانح نگاری کے فن میں چھوڑ جاتے۔ طرز نگارش کے لحاظ سے اور خود فن کے اعتبار سے بھی۔ کیونکہ۔ جو دوسری چیز مہدی کو
لی سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی جرات رندانہ اور ہمت مردانہ ہے۔ حالی کی طرح وہ مصلحت پسند آدمی نہیں تھے۔ کہ کمزوریوں اور کوتاہیوں کی
ردہ پوشی کرتے۔ مہدی شبلی کی بزرگی کو تسلیم تو کرتے تھے لیکن وہ کمزوریوں سے بھی واقف تھے۔ اس وجہ سے اگر شبلی کی حیات لکھتے تو ان
ی زندگی کی صبح و شام کو جوں توں پیش کر جاتے۔ میرا یہ خیال محض خیال نہیں واقعہ بھی ہے کہ ہم مہدی کے متوازن مزاج اور حقیقت پسندی
ے پیش نظر ان سے ایسا حسن ظن رکھ سکتے ہیں۔ مہدی افادی کے یہاں نظریہ تنقید نہ سہی لیکن شعور تنقید ضرور موجود تھا۔ وہ مغربی علوم سے واقف
تھے، اور حالی، شبلی اور آزاد کی وجہ سے جو فضا ادب میں پیدا ہوئی تھی، اس فضا اور ماحول میں ان کے ذہن کی پرورش ہوئی۔ ان کے
نقیدی مضامین کو پڑھئے تو بلا شبہ نظریہ تنقید کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن کوئی بات ایسی ہے جو ماورائے سخن کہلاتی ہے۔ شبہ ہوتا ہے ان
ے یہاں تنقید کا کوئی معیار تھا لیکن کیا تھا؟ کوئی نہیں بتا سکتا۔ افادات مہدی کے قاری کو کچھ ایسی ہی الجھن ہوتی ہے وہ جو غالب نے
لہا ہے نا۔ کہ "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!"

مہدی افادی کے نظریہ کے تعلق سے صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ مہدی کی وہ ظرافت اور خام خیالی ہے جو وہ
نقید میں اختیار کر لیتے ہیں۔ تنقید کے بارے میں کہتے ہیں "میرا خیال ہے ملک میں ایسے نفوس قدسی صدیوں میں پیدا ہوں گے جو
و منصفانہ تنقید اور تنقیص بے جا یعنی عیب گری کی حد فاصل کا احساس کر سکیں۔ اس لئے بے محل جنبش لب سے خاموشی اچھی۔ آپ
میرے گونگے ہوں تو اعتراض کی بات نہیں۔ لیکن بولئے اور آدمی کی طرح نہ بولئے تو مجھے ضرور شکایت ہے"

انصاف پسندی کے لئے کوئی معیار ضروری ہے۔ اصولوں اور معیاروں کے بغیر تنقید بے معنی ہے۔ مہدی نے چونکہ آدمی کی
رح بولنے کی کوشش کی ہے اس وجہ سے جی چاہتا ہے کہ وہ بولتا ہی رہے۔ اور ہم سنتے ہی رہیں۔ ورنہ مہدی کی تنقید میں جان کہاں
ہے۔ یہ کاغذ کے پھول جو حسین اور خوشنما ہیں ڈرائینگ روم کی زینت تو بن سکتے ہیں لیکن سہرے کی زینت نہیں۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں مہدی
کے مسلک کے بارے میں کہ وہ رومانیت کا علمبردار ہے۔ یہ رومانیت کیا ہوتی ہے؟ رومانویت کا تعلق نظریہ سے نہیں۔ طرز
نگارش اور اسلوب بیان سے ہے۔ رومانوی تحریک نظریاتی نہیں۔ اسٹائیل کی تحریک ہے۔ یہ اور بات ہے۔ رومانویت کے علمبرداروں
نے نئے انداز میں کہتے کہتے کوئی نئی بات کہہ گئے ہوں لیکن اس فنی تحریک کو نظریات کی بحثوں کا موضوع بنانا حماقت ہے۔ نری حماقت
مہدی افادی رومانوی تھے، ان معنوں میں کہ ان کا اسلوب بیان جذباتی اور رومانوی تھا۔ لیکن ان کے ہاں وہ نظریہ یا ادبی عقیدہ کہاں
ہے۔ جو ان کی تنقید کا اصل اصول بنتا۔ اس وجہ سے ایسا نقاد کسی بھی شاعر و ادیب کے تعلق سے کوئی بات کہے تو بات کا اندازہ بلا شبہ

رکھئے جنھیں میں نے ابھی ابھی اوپر نقل کئے ہیں۔ اس اقتباس میں مہدی سرسید کو معقولات، نذیر احمد کو مذہب، شبلی کو تاریخ اور حالی کو سوانح نگاری کی وجہ سے ادب میں زندہ سمجھتا ہے۔ اور حدود کا یہ تعین محض اسی وجہ سے کہ آزاد کی انشاء پردازی کو منوالیا جائے۔ لیکن دوسری جگہ حالی کی سوانح نگاری عنقا ہوجاتی ہے۔ اور حالی کی عظمت کا دارومدار "مقدمہ" پر قائم رہ جاتا ہے۔ حالی کریں ان لوگوں کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا جوان کو ایک اچھا شاعر سمجھتے ہیں۔ مگر اس استثناء کے ساتھ غزل داغ کا حصہ ہے بے شک ان کی نیچرل شاعری مفروضہ نقائص کے ساتھ بھی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ خاص کر مسدس کی بنیاد جن امور پر رکھی گئی ہے اور جو میٹریل استعمال کیا گیا ہے صرف حالی کا حصہ ہے لیکن اپنا اپنا خیال ہے۔

میرے ذہن میں حالی کی عظمت دیوان حالی کے اس حصہ سے ہے جو مقدمہ شاعری کی حیثیت سے لکھا گیا۔ یہ ۲۸۸ صفحے قطعاً غیر فانی ہیں۔ دیکھئے آخر میں مقدمہ کی ضخامت کا کس سادہ لیکن پرکارانہ انداز میں ذکر کر گیا کہ ہم اس انداز بیان کے چسکے لیتے رہ گئے۔ اور اصل بات کہیں گم ہوگئی۔ نذیر احمد کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے: "یہ شخص جہاں تک مادہ کا تعلق ہے اس بلا کا انشاپرداز ہے کہ اس کو کارلائیل اور میکالے نہیں بلکہ جانسن کے پہلو میں جگہ ملنی چاہیے۔ لیکن تصنیفات کی حیثیت سے نسبتاً گھٹے ہیں ہیں۔ ان میں جہاں اور کمالات ہیں قوت فیصلہ کی کمی ہے۔ حالانکہ یہی نذیر احمد جو انشا پردازی کی وجہ سے جانسن کے پہلو میں جگہ پاتا ہے کچھ ہی دیر پہلے بغیر اپنے مذہب کے لقمہ توڑ نہیں سکتا تھا۔ رہ گئے سرسید اور شبلی تو انہوں نے سرسید کے کمالات ادبی کے عدم اعتراف کو صرف ناشکری نہیں بلکہ تاریخی غلطی ٹھہرایا ہے۔ اور مہدی افادی کو وارفتہ شبلی کی تعریف و توصیف کے لئے جگہ نکال ہی لیتے ہیں اس میں مہدی کی عقیدت مندی کا دخل کم ہے اور خود شبلی کی ادبی تاریخی اور مذہبی برتری اور بزرگی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ بیشتر نقادان کے ہمعصروں میں انھیں ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ "افادات مہدی" اٹھا کر دیکھئے۔ موضوعات غیر اہم۔ سوائے ایک دو مضامین کے اور ان میں بھی جو باتیں کہی گئی ہیں ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔ تنقید میں تردید و تنقیص کا یہ عیب مہدی کے ہاں فن بن جاتا ہے اس معاملہ میں مہدی یکتا اور تنہا نقاد ہے انداز و بیان کا یہ جادو کچھ ایسا چل گیا ہے کہ لوگ اس کی تحریروں میں غزل کا مزہ لیتے ہیں۔ بعضوں نے کہا کہ "ان کے الفاظ جمالیات کے حسین کرنے میں خیال کی پرواز ہیں۔ اس پرواز میں والہانہ جذباتیت زیادہ ہے اور فکری عنصر کم۔ وہ خوش مذاق پہلے ہیں اور کچھ بعد کو"۔ ان کا اسلوب "جو حسن ہے بتوں میں جو مستی ہے شراب میں" کا ترجمان قرار پاتا اور اس شوخیٔ تحریر کے پیش نظر مولانا ماجد نے انھیں ادب میں جذباتیت اور رومانیت کا نمائندہ قرار دیا۔

مہدی کی تنقید میں نظریہ کی تلاش بے معنی ہے۔ ان کی تنقید میں خود ان کی اپنی شخصیت غیر محسوس طور پر موجود ہے۔ مہدی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مشرقی افتادِ طبع کے مالک تھے۔ لیکن وہ مغربی تہذیب و تمدن پر بھی جان چھڑکتے رہے ہیں۔ وہ جدید تہذیب سے مرعوب نہیں تھے۔ اس کے عاشق تھے اور جس حد تک ایک عاشق اپنے معشوق سے متاثر اور مرعوب رہتا ہے اتنی ہی مرعوبیت مہدی کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ بعض اوقات سرسید کے جھانسے میں آجاتے ہیں۔ ورنہ وہ تو شبلی کے معتقد بھی ہیں اور مرید بھی۔ اس سے مہدی افادی کے دل میں مذہب کا جو احترام تھا اس کا پتہ چلتا ہے اور اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں وہ مغربی تہذیب کی کوتاہیوں کو سمجھتے

سی خوبیوں کو گنوایا ہے لیکن نفاست خوش طبعی کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ مہدی کی تحریریں بھی یہی وہ ایسی خوبیاں ہیں جو ان کی تحریر کو زندۂ جاوید بنا گئیں۔ رومانوی ادیبوں کا کہنا ہے کہ ادب اظہارِ خیال اور حصولِ مسرت کا ذریعہ ہے۔ مہدی کے یہاں اظہارِ خیال میں نفاست ہے۔ اور وہ اپنی خوش طبعی کی وجہ سے قاری کو مسرت کے سامان پیدا کرتے ہیں۔ ان ہی معنوں میں مہدی رومانوی ادیب ہیں وہ اپنی طرزِ نگارش کے موجد آزاد بھی ہیں اور خلیل بھی۔ انہوں نے ہر لحاظ سے بت تراشے ہیں اور اس سے بہتر بت کی آرزو میں پہلے بتوں کو توڑا ہے۔ آخری زمانہ کی تحریر ہمارے سرمایہ ادب میں تاج محل کی طرح مرمریں اور حسین ہے۔ مکتوبات مہدی ادب میں تاج محل ہی تو ہیں جہاں مہدی اپنی بیگم کے آسودہ حال ہے۔ لیکن یہ تاج محل مہدی کا نہیں بیگم مہدی کا تعمیر کردہ ہے۔ اگر بیگم مہدی مکتوبات اور افادات کو یکجا نہ کرتیں تو ہمارا ادب گرانقدر سرمایہ سے محروم رہتا۔

نظر فریب ہوتا ہے۔ لیکن وہ کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ وہ انصاف بھی نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں مہدی نے اردو لٹریچر کے جن عناصر خمسہ پر قلم اٹھایا ہے ان کے بارے میں شستہ اور دلکش انداز میں اظہار رائے تو کیا ہے لیکن ان کے منصب کے تعین میں وہ سراسر ناکام رہے ہیں۔ مہدی افادی جن حالات میں زندہ تھے وہ ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی زندگی کے نازک ترین حالات تھے۔ سرسید کی تحریک اپنی راہ چل پڑی تھی۔ لیکن شبلی نے تحریک سے پیدا ہونے والی دشواریوں کو محسوس کر لیا تھا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ علیگڑھ تحریک کی وجہ سے بلاشبہ مسلمان ڈپٹی اور بابو تو بن جائیں گے لیکن اسلام کی روح ان کے قلوب میں باقی نہیں رہے گی۔ شبلی روح اسلام پر مرتے تھے اور انھیں مسلمانوں کی خوشحالی بھی مقصود تھی۔ لیکن ان کے ساتھ ٹریجڈی یہ تھی کہ وہ بے سہارا تھے۔ اس وقت انھیں سہارے کی ضرورت تھی اور مہدی افادی سے بہتر شخص کون تھا کہ جو شبلی کا دست راست بن جاتا۔ مہدی خود اپنے طور پر فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ کون صحیح ہے؟ گو ان کا زیادہ تر رجحان شبلی ہی کی طرف مائل تھا۔ لیکن اس سے نہ تو وہ خود کوئی فائدہ اٹھا سکے اور نہ ہی شبلی کو فائدہ پہونچا سکے۔ مہدی میں قوت فیصلہ کی کمی نے انھیں سماجی اور تعلیمی زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دینے سے روکا۔ اور تنقید میں وہ کسی نظریہ کو اپنا نہ سکے۔ اس وجہ سے ان کی تنقید بے روح ہوتے ہوئے بھی زندہ ہے تو محض اس کے رنگ و روغن کی وجہ سے۔ ان کی تحریر ادب میں "برہنہ رقص" ہے جو پڑھنے والوں کی توجہ کو اپنی طرف سے ہٹنے یا سوچنے کا موقع نہیں دیتی۔ اور قاری غیر شعوری طور پر مراد آئے کا فرانہ بر ہزار جان سے فریفتہ نظر آتا ہے۔ اس وجہ سے میں مہدی افادی کی فنکاری کو سحر کاری کہتا ہوں وہ ہمارے ادب کا بہت بڑا جادوگر ہے۔

مہدی افادی کی شخصیت بے نقاب ہوتی ہے اس کے مکتوبات میں وہ اتنا سنجیدہ آدمی نہیں ہے جتنا افادات میں نظر آتا ہے۔ وہ تو در اصل عاشق مزاج انسان ہے جسے صرف اپنی جنسی آسودگی کی فکر رہتی ہے۔ وہ مکتوبات میں ان ہی جذبات کا اظہار کرتا ہے وہ مکتوبات میں اپنی شخصیت کو خواہ مخواہ بھی منوانے کی کوشش نہیں کرتا۔ جیسے ابوالکلام آزاد کرتے ہیں یا پھر عبدالماجد کی طرح نقاب پوش نہیں ہے وہ تو پوپ کی طرح حق گو ہے۔ اپنے خطوط میں مہدی افادی کی یہی رومانویت پسندی جنسی طور پر تسکین نہیں پاتی تو وہ تحریر میں اپنی آسودگی کی راہ نکال لیتا ہے۔ تحریر کی شوخی اور رنگینی اس کے مزاج کا حاصل ہیں۔ وہ حسن مطلق کے جلووں کے شیدائی ہیں اور عورت ان کے خیال میں حسن مطلق کی بہترین مظہر ہے۔ اس وجہ سے مہدی کے ذہن پر چوبیس گھنٹے سوار نظر آتی ہے۔ اور اس "عشق" نے انھیں نکما بھی بنا دیا۔ ورنہ مہدی تو بڑے کام کے آدمی تھے۔ !

مکتوبات مہدی کسی عاشق نامراد کے دل کی تفسیر نہیں، ایک بامراد پروانہ کی دلسوزی اور وارفتگی کا شاہکار ہیں۔ کیٹس کے خطوط نامرادی اور محرومیوں کا دفتر ہیں۔ مہدی کے مکتوبات میں روح کو گرمانے اور قلب کو تڑپانے والی حرارت موجود ہے۔ اس کے پیچھے رچی ہوئی تشنگی اور برجستگی ہے۔ تحریر سے مزاج کی نفاست کا پتہ چلتا ہے۔ مہدی کی محبت میں وارفتگی ہے اور خود آگاہی کی چھا جانے والی کیفیت بھی۔ وہ بیوی کو ہر وقت ایک بت طناز کے روپ میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ مہدی بیگم کے نام خطوط پڑھنے تو پتہ چلے گا۔ یوں تو بیگم مہدی نے مہدی کی

مرزا ظفر الحسن

برطرفی

حیدرآباد دکن کے وزیراعظم، سر مرزا اسماعیل بھی رہے ہیں، ان کی وزارتِ عظمیٰ کا دور مجھے صرف ایک واقعہ کی وجہ سے یاد رہے گا۔ دکن ریڈیو حیدرآباد کے سرکاری کام سے مجھے دلی بھیجا گیا تھا۔ دلی ریڈیو میں میری جان پہچان کے بہت سے آدمی تھے۔ انصار ناصری، تابش دہلوی، شکیل احمد اور دوسرے احباب۔ ایک دن تابش نے کہا۔ آج شام عربک کالج میں ایک ادبی اجتماع ہے، چلو بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات ہو جائے گی۔ چرس، بھنگ، افیون اور شراب کی طرح ادیبوں کی صحبت بھی ایک نشہ ہے۔ خدا اس سے نہ بچائے۔

پانچ بجے میں اور تابش عربک کالج پہونچے۔ ہال حاضرین سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہمیں آخری صف میں نشست ملی۔ چند منٹ گذرے ہوں گے کہ تابش اچانک اپنی جگہ سے اٹھے، اسٹیج پر پہنچے، منتظمین سے کھسر پھسر کی اور مسکراتے ہوئے لوٹ آئے، میں نے پوچھا کیا بات تھی؟ کہنے لگے ابھی معلوم ہوتا ہے۔

جلسے کی کارروائی شروع ہوئی اور ایک صاحب نے جن سے میں واقف نہ تھا، صدارت کے لئے میرا نام تجویز کرتے ہوئے کہا حیدرآباد دکن سے ایک نوجوان ادیب دہلی آئے ہوئے ہیں، اردو کے گہوارے جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ہیں، جامعہ عثمانیہ کی انجمنِ طلبہ کے صدر رہ چکے ہیں، دکن ریڈیو حیدرآباد سے وابستہ ہیں، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مقرّب ہیں، اردو کے شیدائی ہیں، اس لئے آج کے جلسے کی صدارت کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ نہ جانے کیوں؟

تالیوں نے رکنے کا نام نہ لیا تو میں حیران رہ گیا۔ خرد اور جنون کی کشمکش شروع ہوگئی۔ میری عقل کہتی تھی کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے اور جنون مجھے یقین دلا رہا تھا کہ تجویز بہت معقول ہے۔ تم سے بہتر صدر نہیں مل سکتا تھا۔ فیصلہ تالیوں نے کیا، خرد کو شکست ہوئی اور جنون نے مجھے کرسئ صدارت پر بٹھا دیا۔

جلسہ شروع ہوا، مولوی عبدالحق کی خدمات کو سراہا گیا، انجمن ترقی اردو کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی، جامعہ عثمانیہ کی توصیف کی گئی اور حیدرآباد دکن کی اردو نوازی کا تذکرہ کیا گیا۔ بابائے اردو، انجمن، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد غرض ہر ایک کی تعریف سے

کو میرے لوٹنے سے پہلے معلوم ہو جائیں۔ اس لئے میرا خط شعبہ کو بھجوا دیا۔ ماہر صاحب یا تو بھول گئے یا نزاکت وقت کا اس وقت اندازہ نہ کر سکے کہ اسی خط میں حکومت اور وزیر اعظم حیدرآباد کی مذمت کا بھی ذکر ہے۔ اس لئے ایسا خط چاک کر دینا زیادہ بہتر ہے اس وقت کوئی اور ہوتا تو اسے بھی یہ خیال نہ گزرتا کہ اس قسم کے خط کو سرکاری مسل میں شامل نہیں کرانا چاہیے۔

شعبۂ موسیقی میں میرے ایک پرانے شناسا بھی کام کرتے تھے۔ اپنی ترقی کے لئے دوسروں کا تنزل چاہنا ان کا ہمیشہ ضابطۂ حیات رہا ہے۔ میں ان کا نام یہاں لکھ سکتا ہوں مگر مجھ ہی کو شرمسار ہونا پڑے گا کیونکہ میرے لڑکپن کا یہ ساتھی ان معاملات میں بڑا ڈھیٹ ہے۔ میرا یہ خط دفتر سے اڑایا گیا اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بنوا کر سر مرزا اسماعیل کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کی گئی کہ میں نے دلی کا یہ سفر سرکاری کام کو محض ایک بہانہ بنا کر اختیار کیا۔ اور اصل مقصد وہاں ایک فتنہ کھڑا کرنا تھا۔

لال فیتے نے دنیا میں ہزاروں کام خراب کئے ہوں گے۔ ضرور کئے ہوں گے، مگر میرا کام بنا تو اسی لال فیتے کی وجہ سے۔ واہ رے لال فیتے۔ ایسے موقعوں پر تو ہمیشہ لال لال رہے بلکہ لعل بن جائے۔ میری برطرفی کے انتظامات مکمل ہوا ہی چاہتے تھے کہ بیچ میں لال فیتہ آ گیا اور اس وقت تک بیچ سے نہ ہٹا جب تک کہ خود سر مرزا اسماعیل وزارت عظمیٰ کی کرسی سے نہ ہٹا دیئے گئے۔

جلسوں کی صدارت کے سلسلہ میں احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ نہ خرد کی بات مانی جائے نہ جنوں کی اور نہ خود اپنی۔

بالواسطہ یا بلا واسطہ اپنی تعریف کا کوئی نہ کوئی پہلو میرا جنون نکال کر یقین خام کو یقین واثق میں تبدیل کر رہا تھا کہ مجھ سے ملنا ممکن نہ تھا۔ اور خرد آنسو بہا رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔ اور کیوں ہو گیا۔ میں بہت خوش تھا کہ مفت میں اتنے بڑے اور ا کی صدارت مل گئی۔

جلسے کے اختتام پر ایک بم گرا۔ بہت بڑا بم۔ آنکھوں میں اندھیرا، ہاتھوں میں رعشہ، ذہن ماؤف، بولنا چا زبان پر کانٹے، بھاگنا چاہوں تو پاؤں من من بھر کے۔ وہ بم ایک قرارداد تھی۔ قرارداد مذمت جو کرسئی صدارت سے پیش جس میں حکومت حیدرآباد کی بڑی فراخ دلی کے ساتھ مذمت کی گئی تھی۔ اردو زبان میں مضامین ملامت کے لئے بھی بڑ ہے۔ اور جب کسی دلی والے نے اردو کے تعلق سے لعنت کے مضامین مرتب کئے ہوں گے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں ہوں گے۔

سر مرزا اسماعیل اور ان کی حکومت نے انجمن ترقی اردو کی مالی امداد بغیر کسی سبب کے بند کر دی اور یہ سارا اسی اقدام کی وجہ سے اٹھا تھا۔ اب تک جو کشمکش میرے جنون اور خرد کے درمیان تھی وہ اب زر اور ضمیر کی کشمکش میں ہو گئی۔ بہ حیثیت ملازم سرکار میں ایک حد تک زر خرید تھا، مگر بحیثیت فرزند جامعہ عثمانیہ، میں کس طرح اپنا اردو دست فروخت کر سکتا تھا۔ اب صدر جلسہ ایک سانپ بن گیا اور قرارداد مذمت اس کے منہ کی چھچھوندر۔ نہ اندھا بن سکے نہ ک روزگار کے خوف نے صدارت کی ساری خوشی خاک میں ملا دی اور شدید غم تھا کہ صبح ہونے سے پہلے حیدرآباد سے برطر آ جائے گا۔ اور اس سے پہلے بے حد مسرت تھی کہ شام ڈھلنے تک پورے ہندوستان میں یہ خبر پھیل جائے گی کہ ظفر الحسن نے کل اہمیت کے جلسے کی صدارت کی اور اپنی مادر علمیہ کا نام روشن کیا۔ یہ بھی خیال گزرا تھا کہ دلی سے واپسی کے وقت شاید سار جلسہ ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو کر دوبارہ میرا شکریہ ادا کریں۔ بلکہ ممکن ہے کہ پھول پہنائیں اور امام ضامن باندھیں۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد مولوی صاحب سے ملا اور انھیں صورت حال سنائی تو فرمانے لگے: "نوکری ہی جائے گی تو نہیں جائے گی، اردو کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے"؟ میری کیا مجال تھی جو مولوی صاحب سے کہتا بابا آپ بھی ہیں اور فرق صرف اتنا ہے کہ آپ بابائے اردو ہیں اور مجھے صرف میرے بچے بابا کہتے ہیں۔ گفتگو میں مولوی صاحب نے ہمت دلائی تو ہو گیا۔ مگر کھال کے اندر کیا ہو گا آپ ہی سوچئے۔

ہوٹل پہنچ کر ناظم نشریات محبوب علی طاہر صاحب کو ایک نجی خط لکھا جس میں اپنے انجام دیئے ہوئے سرکاری کا کی رپورٹ دی اور تفصیل کے ساتھ بتایا کہ دلی کے کن فنکاروں نے حیدرآباد آنے پر رضامندی ظاہر کی ہے اور شرائط کیا وغیرہ وغیرہ۔ اس خط میں ضمناً جلسہ کی روداد اور قرارداد مذمت کا بھی تذکرہ کر دیا کہ افسروں کو پہلے سے معلوم ہو جائے تیر مارا ہے۔

طاہر صاحب کا خیال تھا کہ میں نے دلی میں جن فن کاروں کو پروگراموں کے لئے آمادہ کر لیا ہے، ان کے نام

شمیم احمد

مجنوں گورکھپوری

ادب اور تنقید کی دنیا میں دو قسم کے نام ہمیشہ ادب کی تاریخ میں زندہ رہتے ہیں۔ ایک وہ نام جو اپنے عہد کے تخلیقی شعور کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اپنے عہد کے مخصوص نظریات، خیالات، تجربات اور بدلے ہوئے شعور کو تخلیقی پیکر عطا کرکے، ادب کی زنجیر میں ایک نئی کڑی اور ادبی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ ان کا تخلیقی اور ذہنی عمل ان کی تحریر کو ایک زندہ اور جیتا جاگتا تجربہ بنا دیتا ہے۔ جس سے یہ عہد ایک الگ فضا، الگ ذائقہ اور لب ولہجہ کا احساس دلانے لگتا ہے۔ یہی ادب کی نئی تحریریں قرار پاتی ہیں۔ لیکن ان سے بھی زیادہ اہم اور جداگانہ وہ نام ہوتے ہیں جو ادب کا نیا تخلیقی شعور اور مزاج پیدا کرتے ہیں۔ اور اپنے عہد کے تخلیقی عناصر اور صفات کو قدیم ادب اور اس کی روایات سے اس طرح ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ کہ ادب کی صحت مند روایات ایک نئی تشکیل میں نظر آنے لگتی ہیں جو ادب کو عصری سطح سے اٹھا کر ابدی بنا دیتی ہیں۔ یہی وہ تحریریں ہیں جن پہ اقبال کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید وقدیم

ادب کی یہ سطح صرف تحریر کی زندگی اور تازگی کا سبب ہی نہیں بنتی بلکہ یہ اپنے عہد کی ذہنی تربیت کرتی ہے۔ اسے تخلیقی عمل سے آشنا اور اچھے برے ادب کی تمیز سکھاتی ہے۔ اور جدید اذہان اور تصورات کی تہذیب کرتی ہے۔ گویا یہ تحریریں غیر شعوری طور پر اپنے عہد کے معلم ہوتی ہیں۔ ایسی معلم جو ان کو اندر سے تبدیل کرکے ادب کی روح سے آشنا کرتی ہیں۔ یہی وہ سطح ہے جس سے ادب ایک درس نمو لیتا ہے۔ اور اس کے اوپر صرف دیوزاد ادبی شخصیتوں کی جگہ باقی رہ جاتی ہے۔ جو کبھی کبھار کی چیز ہے۔

اردو ادب کا وہ زمانہ جو دوسری جنگ عظیم کے بعد شروع ہوتا ہے کئی اعتبارات سے بعض بنیادی تبدیلیوں کا باعث ہوا ہے۔ صحیح معنوں میں جدید شعور اسی زمانہ سے پیدا ہوتا ہے اور اردو ادب اپنی قدیم اور جانی پہچانی صورتوں اور فضا سے نکل کر اپنے زمانے کے سب سے ترقی یافتہ محرک "مغربی افکار و شعور" کی زد میں آجاتا ہے اور اردو کی قدیم ادبی روایات اس جدید ذہنی اور فکری قوت کے سامنے برتری کے ساتھ نہیں بلکہ کمتری کے شعوری عمل سے مغلوب ہوتی نظر آتی ہیں، جس کا منطقی نتیجہ ۱۹۳۶ء میں برآمد ہوا۔

انجمن کی نئی مطبوعات

جو عنقریب شائع ہو رہی ہیں

۱۔ مقاماتِ ناصری۔ میر ناصر علی کے انشائیوں کا مجموعہ — مرتبہ: انصار ناصری
۲۔ تذکرۂ عروس الاذکار۔ مصنفہ نصیر الدین نقش۔ — مرتبہ: افسر امروہوی
۳۔ شمالی ہند کی نثری داستانیں (نظرثانی شدہ ایڈیشن)، ڈاکٹر گیان چند
۴۔ شمالی ہند کی منظوم داستانیں — ڈاکٹر فرمان فتحپوری
۵۔ اشاریہ اردو۔ رسالہ "اردو" کے چالیس سالہ شماروں کا اشاریہ
۶۔ لغت کبیر اردو (جلد اول) — بابائے اردو مرحوم
۷۔ انگریزی ادب کی تاریخ — ڈاکٹر احسن فاروقی
۸۔ تاریخ سلطنت مسلمانان روس۔ مزمل یٰسین
۹۔ اردو تھیٹر۔ جلد چہارم — ڈاکٹر عبدالعلیم نامی
۱۰۔ تذکرۂ ہمیشہ بہار۔ مصنفہ کشن چند اخلاص۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

انجمن ترقی اردو،

بابائے اردو روڈ، کراچی

نمبر۱

سکے ان تمام عناصر کی مدد سے سمجھنے کی اردو میں پہلی بار کاوش کی جن سے تخلیقی شعور کی تعمیر ہوا کرتی ہے۔ مجنوں ہی وہ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے اس وقت اردو ادب کی بہترین آوازوں، شاعری اور معیاری ادب کو نہایت زور و شور سے پیش کیا۔ جس وقت پورا اردو ادب سنڈاس اور نہایت پست درجہ کا ادب سمجھا جاتا تھا ـــ مجنوں نے ان غزل گویوں کو پھر زندہ اور تابندہ کیا جن کی دریافت شاید ابھی پچاس سال اور نہ ہو سکتی تھی۔ غرض کہ مجنوں گورکھپوری نے اردو شاعری کی بہترین اور صحت مند روایات کو جدید شعور سے ہم آہنگ کرکے اردو ادب کو احساس کمتری سے نجات دلانے کے لئے اتنا بڑا اچھا و کیا کہ جس کے بغیر نہ فراق گورکھپوری کی تنقید وجود میں آتی نہ محمد حسن عسکری کو اردو کے جدید شعور کو اور نکھارنے کا حوصلہ ہوتا۔

قومی زبان کے اس سلسلہ میں راقم الحروف نے جن عہد ساز شخصیتوں سے تعارف حاصل کیا ہے ان میں مجنوں گورکھپوری سے نیاز حاصل کرنے پر مجھے ہمیشہ ناز رہے گا۔ کیونکہ اردو ادب کے ہر معیار سے مجنوں گورکھپوری ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے احسان سے ادب کا کوئی طالب علم انکار نہیں کر سکتا۔ اور اردو سے محبت رکھنے والا کوئی متنفس ان سے محبت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور مجھے فخر ہے کہ میں نے ساری عمر جس شخص کو اپنے لئے مشعل نور بنائے رکھا اس کو میں نے شخصی طور پر اتنے قریب سے دیکھا۔ اور ان میں وہی نور پایا جس سے ان کی تحریریں آب حیات بن کر اردو ادب کو زندہ جاوید کر گئی ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میری پہلی ملاقات ان سے اس حالت میں ہوئی جن سے انسانی تعلقات کے سب سے خوب صورت رنگ جنم لیتے ہیں۔ وہ مجھ سے بہت برہم تھے، اور میرے نیا دور کے سلسلہ کے ایک خط کی گستاخی کی حد تک پہونچی ہوئی شوخی سے بہت ناراض ـــ اسی لئے انہوں نے کراچی پہونچتے ہی سب سے پہلی تلاش میری کی۔ اور مجھے اپنے اس خط پر بجائے شرمندگی کے فخر ہے کہ جس نے مجھے ان سے اتنی قربت دلائی۔ اور

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح

اب کون ایسا آدمی ہے جو یوں ڈانٹ سکے اور کون ایسا ہے جس کی ڈانٹ مجھ جیسا آدمی سن لے۔ قصہ مختصر مجنوں صاحب سے یہ میرا پہلا شخصی تعارف تھا۔ میں اس سرور کے عالم میں اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک تماشائیوں کی بھیڑ نہ چھٹ گئی ـــ تب موصوف نے قریب کی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہاں بیٹھئے صاحبزادے" اور بولے۔ "آپ کے خط کا جواب میرے پاس صرف ایک ہے" "آپ کے لئے مضمون لے آیا ہوں آ کر لے جائیے" اب مجھے اپنی گستاخی کا واقعی احساس ہوا۔ اور اپنی تہذیبی روایت کی کاٹ کا اندازہ ـــ پھر انہوں نے اپنے داماد کو بلایا اور خصوصیت سے تعارف کرا کے کہا "کیوں بھئی ہمارا اندازہ صحیح تھا یا نہیں کہ یہ ایک نوجوان آدمی ہیں اور ان کا خون ذرا زیادہ گرم ہے" پھر بولے کہ "اگر بُرا مانے ہو تو ہم مانگ لیں معافی" مگر میں اپنے اس نصیب پر نازاں اور اس خصوصی نوازش پر حیران، اس کا موقع کہاں دیتا کہ معذرت کرکے اس نایاب ربط خاص کو عمومی بنا دیتا۔ سوائے گردن جھکائے۔ بارگاہ ادب میں حضوری کے ساتھ مزید ایک گھنٹہ بیٹھا رہا۔ اور موصوف اپنے خاندان اور ننھے سے نواسے سے مجھے ملاتے رہے۔ یہ تھی پہلی ملاقات اور پھر متعدد ملاقاتیں رہیں اور ہر بار مجنوں صاحب ایک مزید ذاتی ربط پیدا کر دیتے۔ جیسے میری تربیت کی ذمہ داری انہوں نے لے لی ہو ـــ اور مجھے ایسے وقت بلاتے رہے جب خالص ادبی گھیراؤ کے قریب نہ ہو۔ میں نے بھی اس وقت تک صرف شخصی سطح تک ہی ساری توجہ رکھی جب تک کہ ان کی واپسی کے دن نہ آگئے ـــ کیونکہ ان کی تحریریں پڑھنے کے بعد بس ان کے دیکھنے ہی کی تمنا رہ جاتی ہے۔ مختصر سے قد اور بہت منحنی سے بدن کے یہ تھوڑے سے مجنوں گورکھپوری اپنی گفتگو کی شفقت، چہرے کے تیور اور ذہنی چوکس پن کے

جب اردو کی ادبی روایات اور قدیم تخلیقی شعور کو رد کرنے کی ایک مذموم اور نابالغ ذہنیت کی منظم تحریک شعوری ہوئی — جو ادب اور تخلیقی عمل کے لیے سخت مضر، نقصان رساں اور ایک گہرے خلا کا باعث ہوا چاہتی تھی، کہ اسی عہد کے وہ نام نمایاں ہوئے جن کا ذکر دوسری قسم کے ناموں کے ذیل میں اوپر کیا جا چکا ہے۔ فطری طور پر یہ نام تنقید کے شعبہ میں ظاہر ہوئے۔ اور انہوں نے جدید خیالات کے اس ریلے کو اردو ادب سے ہم آہنگ کرنے کی وہ سعی عظیم شروع کی جس سے آج جدید تخلیقی شعور عبارت ہے۔ اگر ہم ایسے ناموں کی تلاش آج بھی اردو ادب میں کریں جن کا اثر صرف تخلیقی سطح پر نہیں ہے بلکہ جنہوں نے تخلیقی شعور کی تربیت اور ادبی روح کو پہچاننا سکھایا تو وہ گنتی کے نام ہیں۔ اور ان میں بھی اگر ایسے ناموں کا انتخاب کیا جائے جو آج بھی اردو کے جدید ادبی شعور میں گھل مل کر سفر کر رہے ہیں تو یہ تعداد صرف تین ناموں تک سمٹ جائے گی۔ مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری اور محمد حسن عسکری جن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نظریات، رجحانات اور خیالات سے بھی زیادہ تخلیقی عمل اور ادبی شعور کو متعین کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اردو شاعری کے اعلیٰ تخلیقی اثرات اور مزاج کا جدید ادب میں تجزیہ کیا جائے تو اس میں ان تینوں حضرات کے اثرات کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی مل جائیں گے۔

ایک تنقید نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ تخلیق کا اعلیٰ ترین شعور رکھتا ہو۔ اور تخلیقات کا تنوع، وسیع اور رنگا رنگ جوہر پرکھ سکتا ہو۔ اس اعتبار سے مندرجہ بالا تین ناموں میں سے صرف دو نام باقی رہ جائیں گے۔ کیونکہ محمد حسن عسکری ایک محدود اور مخصوص تخلیقی عمل سے آشنا ہیں اور اپنے مخصوص مزاج اور تربیت ذہنی کی وجہ سے تنوع اور ہمہ رنگی سے محروم ہیں۔ فراق گورکھپوری اس عہد کی وہ عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے ہمہ جہت اثرات مرتب کئے ہیں۔ اور ادب کو تاریخ اور معاشرت کے زیر اثر دکھلانے سے زیادہ اس کو خالص ذہنی اور تخلیقی عوامل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لیکن یہی وہ فراق گورکھپوری ہیں جن کے تعارف کا سہرا مجنوں گورکھپوری کے سر ہے۔ مجنوں صاحب نے پہلی بار جس انداز سے اس غزل گو کو پیش کیا تھا وہ اپنے انداز نظر کی وجہ سے ایک بہت ہی انوکھی اور پر اثر روایت کا سبب بنی۔ اور فراق کے مرتبے کو جس طرح جدید اردو شاعری میں سمجھا گیا اس کا سارا کریڈٹ مجنوں صاحب کو جاتا ہے۔ مجنوں صاحب فراق سے آٹھ سال اور نیاز فتحپوری سے بیس سال چھوٹے ہیں۔ مگر ابتدا میں مجنوں ہی اس عہد کی تنقید پر سب سے زیادہ تخلیق سے آشنا نقاد کی حیثیت میں چھائے رہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فراق صاحب کی اردو شاعری کے سلسلہ میں ذہنی تربیت انہوں نے کی ہے۔ اگر مجنوں صاحب کا فیض نہ شامل ہوتا تو ہم "انداز ے" کے تنقید نگار سے شاید اس طرح آشنا نہیں ہو سکتے تھے۔ غرضکہ یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ اردو کی جدید تنقید میں مجنوں گورکھپوری ابتدا سے ایک ایسی اہم اور تخلیقی قوت کی صورت میں اثر انداز ہوئے کہ ادب اور شعر کی آبرو قائم رہی ورنہ اردو ادب ایک ایسی ہی مایہ کمتری کی شکار ذہنیت کی ادبی آمریت اور تحقیقی خشکی کی نذر ہو جاتا۔

مجنوں گورکھپوری کی اہمیت اور صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو سب سے پہلے وہ موضوعات دئیے جن کے بغیر ادب اور شعر کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے جمالیات کو اپنا موضوع بنا کر اردو شاعری کے تخلیقی اور وجدانی عوامل کی پہچان کا ایک ایسا معیار قائم کیا جس پر بعد میں آنے والوں نے اپنے اپنے نظریہ شعر کی بنیاد رکھی اور شاعری کے بنیادی عوامل کو دریافت کرنے میں آسانی محسوس کی۔ ورنہ تنقید کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی گئی تھی وہ ادب کو ابھی گھٹنیوں چلانا سکھا رہے ہوتے۔ مجنوں نے ادب کو فنون لطیفہ کے

انہوں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کو اردو کا پائنیر قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ جدید ادبی معیار پر ان کی ادبی حیثیت کو پرکھنا غیر رویہ ہے۔ کیونکہ ان کی اہمیت تنقید میں اولیت کی وجہ سے ہمیشہ قائم رہے گی اس لئے کہ ان کی حیثیت تنقیدی نہیں بلکہ تاریخی ہے — ں نے کہا کہ ان کے مقدموں کو جدید تنقید کی پہلی اینٹ قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ان کے نایاب نسخوں کی دریافت اور خصوصیت سے ادب کی چھان بین کو ایک عظیم ادبی کارنامہ قرار دیا۔ اور ادب کی افادیت اور اس کی وسعت کے لئے اس عمل کو ناقابل شکست جدوجہد ہیر کیا۔ ان کے خیال میں مولوی صاحب کے یہ کارنامے ادبی تنقید کے محدود دائرے میں دیکھے جانے کے قابل نہیں بلکہ وہ ایک زبان رے وجود کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا مولوی صاحب نے اردو کی عمر بھی اس جدوجہد سے اس سے کہیں زیادہ ادی جواب تک بہت مختصر خیال کی جاتی تھی۔

مجنوں صاحب ایک ماہ رہنے کے بعد کراچی سے رخصت ہوئے تو یہاں ادب کے ہنگامے سرد پڑ گئے۔ مجھے بہت خواہش تھی کہ میں اسٹیشن رخصت کرنے جاؤں گا۔ مگر میں انہیں رخصت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسلئے وہ آج بھی میرے قلب کے حجرے میں موجود ہیں ہیں اور میں نے انھیں رخصت نہیں کیا ہے۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

لحاظ سے خود ایک لطیف خیال کی صورت میں اپنے مخاطب پر چھا جاتے ہیں۔ اگر کسی کو ان کے صحیح مرتبے، ان کے ادبی احسانات، ان کے اعلیٰ ترین ذوق تمام علوم پر ان کی گہری نظر، شاعری سے ان کے والہانہ مگر سوچی سمجھی وابستگی اور ان کی تحریر کے حسن سے ذرا سا مس بھی رہا ہو تو وہ مجنوں صاحب کی شخصیت اور ذات سے بھی ویسا ہی گہرا ربط اور محبت محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس کی وجہ سے خود آگاہی کا حسن بیدار ہوتا ہے۔ مجنوں صاحب بات کرتے وقت اپنے پتلے پتلے اور لطیف ہونٹوں کو گول بنا لیتے ہیں اور جب وہ کوئی بانکی بات یا مخاطب پر کوئی جملہ کستے ہیں تو ان گول ہونٹوں کو اس طرح پچکا لیتے ہیں کہ بے اختیار دیکھنے والے کو ان کے جملے کی کاٹ سے اہتزاز پیدا ہوتا ہے۔

مجنوں صاحب شاعری کو افضل ترین فن لطیف سمجھتے ہیں اور نثر کو افہام و تفہیم کا سب سے موثر ذریعہ اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں شاعری میں خیال اور مضمون سے کہیں زیادہ کچھ اور عناصر اہم ہو جاتے ہیں جو کسی خیال یا موضوع کو صرف مضمون نہیں رہنے دیتے بلکہ اسے جادو بنا دیتے ہیں۔ وہ شاعری کو فطرت کی خلقت کا جزو خیال کرتے ہیں جس کی رو سے کائنات میں جس طرح ایک آہنگ اور موزونیت پائی جاتی ہے وہی شاعری کا جزو اعظم قرار پاتی ہے۔ شاعری میں وہ غزل کو بلاغت اور ایمائیت کی انتہا سمجھتے ہیں، اور غزل پر ان کو اس لئے بھی تمام حقوق حاصل ہیں کہ اس صنف کی عزت اور حرمت ان ہی کے ہاتھوں ایک زمانے تک محفوظ رہی ہے۔ وہ موجودہ دور کو نثر کا دور سمجھتے ہیں، یعنی نثر کی نظم پر فوقیت کا دور سمجھتے ہیں یہ خیال رہے کہ شاعری پر فوقیت کا نہیں۔ کیونکہ وہ اس کو اس سطح سے ماورا سمجھتے ہیں۔ وہ نظریہ کو فن کا تابع نہیں مگر نظریہ کی صداقت کے لئے اس کا فن ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ مارکس سے زیادہ اینگلز کے قائل ہیں اور اس کے منضبط فکری استدلال کو مارکس کی "تاریخی جبریت" سے زیادہ وقیع خیال کرتے ہیں۔ وہ جدلیاتی نظریہ کو اس لئے من و عن تسلیم نہیں کرتے کہ اسی عمل سے مارکس کے نظریہ کی نفی ہو جاتی ہے۔ وہ کسی تحریک کو ایک خاص زمانہ کا تقاضہ سمجھتے ہیں اور جب وہ تقاضے پورے ہو جاتے ہیں تو اس تحریک کے بیکار ہو جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی خاص تحریک کو بدلے ہوئے زمانہ میں بھی رہنما بنانا ایک غلطی ہے۔ وہ ادب کے لئے معاشیات، سائنس، فلسفہ، نفسیات، تاریخ اور مذہبیات کا مطالعہ ناگزیر سمجھتے ہیں اور موسیقی، رقص، مصوری اور فن تعمیر سے شغف کو لازمی خیال کرتے ہیں۔ مگر ان سب سے زیادہ اہم وہ لکھنے والے کو آہنگ، جمالی اقدار اور موزونیت کے فطری سرمایہ سے مالا مال ہونا سب سے زیادہ اہم خیال کرتے ہیں اور اس کو اہلیت کی پہلی شرط قرار دیتے ہیں۔ مشرق کے عظیم دانشوروں میں وہ محی الدین ابن عربی کو ایک ایسا عظیم ذہن سمجھتے ہیں جس کو مشرق اور مغرب دونوں نے اب تک غلط ہی سمجھا ہے۔ وہ طبعاً ڈرامہ سے خود کو شاعری اور ناول کے مقابلہ پر دور سمجھتے ہیں۔ مگر اس کی اہمیت سے منکر نہیں۔

مجھے اپنی ملازمت کے سبب ان سے انٹرویو تو کیا چند سوالات کرنے پڑے۔ ان کی ساری گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ اردو میں جب تک عوام کے تمام تقاضوں کو بدرجہ اتم پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہے اسے ہندوستان سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ اور پاکستان میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہوں نے ہندی کے مصنوعی بکھراؤ اور سادگی سے دوری کو پوری قوم کے لئے ایک مفروضہ اور ذہنی بیماری قرار دیا ہے۔ اردو وہ ہندوستان میں اپنے ن خیالات کا اظہار مکمل کر کرتے رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اردو میں ۹۰ فی صد ہندی ہے۔ اس لئے ہندی کے متشدد حامیوں کا سارا جوش رت کے خلاف ہے۔ وہ اسے کبھی ہندوستانی ہونے سے خارج نہیں قرار دے سکتے۔ مجنوں صاحب کہتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان میں اس ہری اور خاص انفرادیت کو تسلیم نہ کرنے یا برقرار نہ رکھنے سے اردو کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔

رفتارِ ادب

سندھ میں اردو شاعری

مصنف : ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

صفحات : ۲۸۴

قیمت : پانچ روپے

ناشر : مہران آرٹس کونسل - حیدرآباد (مغربی پاکستان)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، جانے پہچانے محقق ہیں اور متعدد کتابیں شائع کر چکے ہیں - انھیں کام کرنے اور کام لینے کا بڑا سلیقہ ہے - انھوں نے مہران آرٹس کونسل، حیدرآباد کے تحت ایک جلسہ منعقد کیا اور اس میں مختلف حضرات سے سندھ کے شعرا پر مقالے پڑھوائے - پھر مزید شعرا اور ان کے حالات جمع کر کے تمام مقالات کو یک جا کر دیا اور زیادہ سے زیادہ کلام جو میسر ہو سکا، مرتب کر کے اس مجموعے میں شامل کر لیا - یہ کام یقیناً قابل تحسین و آفریں ہے کیونکہ اس کی بدولت سندھ کے ۷۰ شعرا پہلی بار متعارف ہو رہے ہیں، گویا تاریخ ادبِ اردو کا ایک نیا باب کھل گیا ہے - ان شعرا میں سرفہرست ملا عبدالحکیم عطا ہیں جن کے متعلق خیال ہے کہ شاید وہ ۱۰۴۰ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے اور ایک سو سال کی عمر میں فوت ہوئے - صرف اس خیال کی وجہ سے اس کتاب کے نام کے نیچے محترم ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ (عہدِ شاہ جہاں تا ۱۹۳۶ء)۔ گویا شاہجہانی عہد سے لے کر ۱۹۳۶ء تک قریب تین سو سال کے ۷۰ شعرا کا جائزہ لیا گیا ہے -

بعض شعرا پر وہ مزید تحقیق فرمانے والے ہیں - مثلاً صابر کے دیوان میں صرف صابر تخلص کی وجہ سے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ میر محمود صابر ہی کا دیوان ہوگا - روحل فقیر، مراد فقیر، شاہو خاں، فقیر غلام علی، دریا خاں، قطب شاہ جیسے بعض شعرا ایسے ہیں جنھوں نے دوہے اور چوپائیاں وغیرہ لکھی تھیں - یعنی یہ ایسا کلام ضرور ہے جس کا رشتہ اردو سے ہو سکتا ہے لیکن تیقّن کے ساتھ نہیں - چند ایسے لوگوں کو بھی شعرا کی فہرست میں شامل کر لیا ہے جن سے صرف ایک یا دو شعر منسوب

تلخیص الاُردو

یہ انجمن کے مشہور علمی جریدے سہ ماہی "اُردو" کے تیس سالہ پرچوں کے بہترین مضامین کا انتخاب ہے۔ اس میں مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے مندرجہ ذیل علمی و ادبی مقالات شامل ہیں اسے سید ہاشمی فرید آبادی نے مرتب کیا ہے۔

اصول وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم
ہجو سلطان محمود	حافظ محمود شیرانی
کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ	مولوی عبدالحق
بنگالی زبان و ادب کی نشو و نما	دنیش چندر سین
ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی	مرزا فرحت اللہ بیگ
عماد الملک بلگرامی	عبدالحلیم شرر
بنگالی اور اُردو	محمد اجمل خاں
رومی، نطشے اور اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
اُردو میں دخیل الفاظ	مولوی عبدالحق
ولی کے سن وفات کی تحقیق	مولوی عبدالحق
پرانی اُردو میں کتبے	مولوی عبدالحق

قیمت: پانچ روپے پچاس پیسے

روایت کی اہمیت

ڈاکٹر عبادت بریلوی

یہ کتاب اُردو ادب کی عظیم روایات کی آئینہ دار ہے۔ اس میں ایسے پُرمغز اور خیال افروز مقالات شامل ہیں جن سے اُردو ادب کے تاریخی مد و جزر کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل اہم موضوعات پر مقالات شامل ہیں

روایت کی اہمیت	اُردو شاعری میں گُل و بُلبل کے اشارے
دلی کا دبستان شاعری	آب حیات اور آزاد
غالب کی عشقیہ شاعری	منظومات حالی
داغ کا تغزل اور اُس کے سماجی محرکات	حسرت
اُردو شاعری میں حب وطن کی روایت	اُردو تنقید میں روایت اور تجربے

قیمت: سات روپے

انجمن ترقی اُردو [illegible] کراچی نمبر ۱

ایک بڑی دل چسپ بات یہ ہے کہ کھیل میں جس شہر کا انتخاب کیا گیا ہے وہ کراچی ہے جو اپنی صنعتی خصوصیات کی وجہ سے شاید مترجم کی توجہ کا مرکز بنا ورنہ جو سوسائٹی اس کھیل کی روح رواں ہے اسے آفاق کے کسی گوشے میں لے جایئے وہ ایسا ہی کھیل کھیلے گی جیسا کہ اس ڈرامے "مجرم کون" میں کھیلا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کراچی کے صنعتی علاقے تک ڈرامے کا کینوس اگرچہ محدود ہے لیکن اس کی عمومیت میں کہیں فرق نہیں آیا ہے۔

یہ ڈراما خوبصورت ٹائپ اور بہترین گیٹ اپ کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ جلد مضبوط اور گرد پوش دیدہ زیب ہے مجلس ترقی ادب نے جدید ڈراموں کی اشاعت کا جو سلسلہ قائم کیا ہے یہ اس کی پہلی پیش کش ہے اور ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔

(صمدانی نقوی)

کاروان سائنس

صفحات : ۱۱۸

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ پچاس پیسے - زر سالانہ : چھ روپے

ملنے کا پتہ : مجلس تحقیقات سائنس و صنعت پاکستان - ۳۹ گارڈن روڈ صدر۔ کراچی

موجودہ دور کا انسان ترقی کی فضاؤں میں اس تیزی سے پرواز کر رہا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا آخر اس کی منزل کہاں ہے اور کس جگہ پہنچ کر اس کے پر سمٹیں گے مرزا غالب نے تو بڑی حسرت سے کہا تھا۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

مگر موجودہ انسان عرش سے اُدھر تو مکان نہیں بنا سکے گا لیکن یہ ضرور ہے کہ خلا کی حدِ آخر بھی اس کی حدِ نگاہ میں ہے اور وہ اس بلندی کو یقیناً چھوئے گا جہاں ماضی کے شاعروں کا صرف تخیل ہی جا سکتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انسان کا عزم بلند ہے یا علامہ اقبال کے نظریئے کے مطابق اس کی خودی ہے جو وہ ستاروں سے آگے نکل کر اپنی تگ و دو کے لیے نئے جہان تلاش کر رہا ہے لیکن جس قوت نے اسے ذوق پرواز یا پر پرواز بخشا ہے اس میں سائنس کا بہت اہم حصہ ہے۔

ہمارے یہاں ابھی ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو سائنس کو انسانیت کا دشمن سمجھتا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سائنس ہی ہے جس نے ایسے مہلک آلات حرب ایجاد کئے ہیں جو نسل انسانی کو دیکھتے ہی دیکھتے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے۔ دنیا کی دو بڑی جنگوں نے انسانوں کی وسیع آبادی اور شہروں کے تہذیبی آثار کو جس بیدردی سے ختم کیا ہے اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ مگر جب اس مفروضے کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ سائنس بذات خود کوئی ہلاکت آفریں ذریعہ نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسے ہلاکت آفریں بنانے میں خود انسان کا اپنا ارادہ اور اپنا عمل ذمہ دار ہے۔ سائنس تو اپنی فطرت کے اعتبار سے

ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دراصل "نقشِ اول" پیش کیا ہے اور وہ خود ان شعرا پر مزید تحقیق فرمانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کا مفصل لسانی جائزہ بھی لینا چاہتے ہیں۔ بہرحال، یہ کتاب اپنی جگہ بہت اہم ہے اور اردو ادب کی تاریخ کے لیے ایک بیش بہا خزینہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہم سب بہت ممنون ہیں۔

(ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں)

مجرم کون

تہذیب و ترجمہ: اظہار کاظمی

مرتب: نعیم طاہر

صفحات: ۱۸۴

ناشر: مجلس ترقی ادب - ۲ کلب روڈ - لاہور

قیمت: تین روپے

مجلس ترقی ادب لائق ستائش ہے کہ اس نے جدید ڈراموں کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر رکھا ہے جو مغربی ادب سے ماخوذ ہیں اور جنھیں پاکستانی اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے۔ اردو ادب میں اسٹیج ڈراموں کی بہت کمی ہے اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں اسٹیج ڈراموں کا اچھا خاصا ذخیرہ اکٹھا ہو جائے گا اور ڈرامے کے شائقین کی شکایت بڑی حد تک کم ہو جائے گی۔

"مجرم کون" جے۔ بی۔ پرسٹلے کے کھیل (AN INSPECTOR'S CALL) سے ماخوذ ہے اور اس کے ترجمے اور تہذیب کا فریضہ جناب اظہار کاظمی نے نہایت عمدگی سے انجام دیا ہے۔ کردار اپنی بدیسی اصلیت رکھتے ہوئے بھی نہایت گھریلو معلوم ہوتے ہیں۔ آج جب ہم اپنی نہایت ترقی یافتہ، مہذب و متمول سوسائٹی پر غور کرتے ہیں۔ تو ایسی جھلکیاں ہماری نگاہوں کے لیے اجنبی نہیں رہتیں۔ یہ کھیل، سماج کے سرمایہ دار طبقے کی ذہنیت اور اس کے طرز و بود و باش پر ہلکا سا طنز ہے ایک غریب، ہجرت زدہ، بے خانماں اور بے روزگار حسین لڑکی کا خودکشی کر لینا، سماج کے اس معزز اور اعلیٰ طبقے کو ایسے حالات میں جکڑ لیتا ہے کہ نہ صرف وہ بلکہ ان کی زندگی کا تماشا کرنے والے بھی یہ غور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آخر اس کی موت کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ جرم کس نے کیا ہے؟ ڈرامے میں واقعات کی الٹ پھیر نے ایک دلچسپ SUSPENCE قائم کر رکھا ہے جو آخری لمحے تک جاری رہتا ہے اور اس طرح کھیل سے قاری کی دلچسپی کہیں بھی کم ہونے نہیں پاتی۔

یہ کھیل جملہ تین ایکٹوں پر مشتمل ہے۔ اسے پہلی بار پاکستان آرٹ کونسل لاہور نے اکتوبر ۱۹۵۷ء میں الحمرا ہال میں پیش کیا تھا۔ اس کھیل کے ہدایت کار جناب نعیم طاہر تھے۔ لطف یہ ہے کہ یہ کھیل تقریباً ایک ہی کمرے میں کھیلا جاتا ہے جس کی وجہ سے اسٹیج پر سٹ کے بار بار بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کھیل کرنے والے ہی اس سہولت کی اہمیت سے واقف ہو سکتے ہیں۔

کے مضامین بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور انھیں بڑی دل چسپی سے پڑھ سکتا ہے اور پھر اس کی یہ خوبی بھی ہے کہ اس کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے ہر شخص اس کا مطالعہ کر سکتا ہے ۔ شرط صرف ذوق مطالعہ ہے یہ تو ایسا پرچہ ہے جسے پاکستان کی ہر لائبریری میں رہنا چاہیے۔ اپنی قیمت کے لحاظ بہت سستا ہے ایک شمارے کی قیمت ڈیڑھ روپیہ کچھ بھی نہیں۔

(میرزا ادیب)

وفاقی جمہوریہ جرمنی

زیر تبصرہ کتاب کا ابتدائی حصہ شریف فاروقی صاحب کے سفر جرمنی کی روداد پر مشتمل ہے اور نصف آخر میں صاحب موصوف نے جرمنی کی سیاسی، تعلیمی، معاشرتی، تہذیبی وغیرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تعارف کرایا ہے اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کے ثبوت کے لیے ٹھوس دلائل اور اعداد و شمار پیش کیے ہیں ۔

اب کسی شخص کا کسی ملک کی سیر کر آنا اور پھر سفرنامہ شائع کرا دینا نہ مشکل ہے نہ حیرت انگیز۔ پچھلے چند برسوں میں اتنے سفرنامے شائع ہوئے کہ ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا ۔ لیکن تین سفرنامے اس عمومیت سے مستثنیٰ ہیں ایک جمیل الدین عالی صاحب کا سفرنامہ "دنیا میرے آگے" یہ ایک دل چسپ ترین سفرنامہ تھا جو روزنامہ جنگ، کراچی میں تقریباً دو سال تک شائع ہوتا رہا اور مسلسل دل چسپی کے ساتھ پڑھا جاتا رہا ۔ دوسرا سفرنامہ ابن انشا کا ہے جو "چلتے ہو تو چین کو چلیے" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے[1] تیسرا سفرنامہ ہمارے سامنے ہے ۔

دوسری عالمی جنگ میں جرمن قوم کو ایک ہلاکت آفریں دور سے گزرنا پڑا تھا ۔ اقتصادی و سیاسی ہر اعتبار سے جرمنی تباہ ہو گیا تھا لیکن صرف بیس سال کے اندر اندر یہ تباہ شدہ ملک دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں دوبارہ شمار کیا جانے لگا ۔

کتاب کا ابتدائی حصہ جو سفرنامے پر مشتمل ہے اس میں اس عظیم جرمن قوم کی سیاسی و سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مشاہدہ پیش کیا ہے ۔ یہ ایک سیاح کا سرسری مشاہدہ ہے جو اس نے جرمن قوم کے نہ صرف قریب ہو کے بلکہ ان سے مل کر ان کے ساتھ بیٹھ کے ان کے ساتھ باتیں کر کے اور انھیں زندگی کے مختلف میدانوں میں مصروف کار دیکھ کے مرتب کیا ہے ۔ شریف فاروقی صاحب جرمن قوم کے جذبے، جوش اور علمی و عملی سرگرمیوں سے بہت متاثر ہوئے لیکن وہ جرمنی کے حسن فطرت اور زندگی کی رنگینیوں سے مبہوت ہو کر نہیں رہ گئے انھیں برابر ان کی عظمت کے راز کی تلاش رہی ہے ۔

کتاب کا دوسرا حصہ حقیقتاً جرمنوں کی عظمت کے اس راز کی تلاش کی کہانی ہے اس راز کی تلاش کے لیے انھوں نے جرمنی کی سیاسی سماجی، تعلیمی، صحافتی، اقتصادی، مذہبی، غرضکہ ہر گوشۂ زندگی کا بہت وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے ان کے نزدیک، جرمن قوم کی عظمت

[1] اس سفرنامے پر تبصرہ آیندہ شمارے میں شائع ہوگا۔

انسان دوست ہے۔ تسخیر کائنات میں انسان کی مددگار ہے۔ ترقی کے ہر میدان میں اس کی رفیق سفر ہے۔ زندگی کی ہر جدوجہد اور تگ ودو میں اس کی مدد اور معاون ہے۔

سائنس چاہتی ہے کہ انسان خلاؤں میں پرواز کرکے بلندیوں کے اسرار سے واقفیت بہم پہنچائیں۔ سمندروں کی عظمت پوشیدہ گہرائیوں میں اتر کر ان ارضی خزانوں کو اپنی گرفت میں لائے جو ہمارے آباؤ اجداد کی دسترس سے یکسر باہر ہیں۔ ان عناصر فطرت کو اپنے قبضے میں لاکر فائدہ اٹھائیں جنھیں ہزاروں برس پیشتر حاکم اور دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اب اگر انسان اس سائنس کو تخریبی کاروائی کے لیے استعمال کرنے لگے تو اس میں سائنس کا کیا قصور ہے۔ سائنس کو کیسے مجرم گردانا جا سکتا ہے۔

سائنس ہماری ملی ضرورت ہے۔ سائنس کی طرف پوری توجہ کئے بغیر ہم ترقی کی دوڑ میں شریک نہیں رہ سکتے۔ آج ترقی یافتہ ملک سائنسی ایجادات سے بھرپور فائدہ اٹھا کر اپنی زراعت اور صنعت و حرفت میں مستقلاً ترقی کر رہے ہیں۔ ہمارا ملک ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ ہم ان تمام پیچیدہ مسائل میں گھرے ہوئے ہیں جو قدم قدم پر ترقی پذیر معاشرے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ خوراک ہی کے مسئلے کو لیجئے۔ کیا کوئی باشعور آدمی یہ تصور بھی کر سکتا ہے کہ آج ہم سائنس سے الگ ہو کر اپنی زمین سے اتنا اناج حاصل کر سکتے ہیں جو ہماری آبادی کے لیے کافی ہو۔ صرف خوراک ہی کیوں، زندگی کا کون سا شعبہ ہے جس میں ہم سائنس سے بے نیازی برت سکتے ہیں یا سائنس کو نظر انداز کر کے بھی کام چلا سکتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے سائنس ہماری ملی ضرورت ہے۔ اس ملی ضرورت کے پیش نظر مجلس تحقیقات سائنس و صنعت کی زیر نگرانی "کاروانِ سائنس" کے نام سے ایک سہ ماہی عوامی مجلہ شائع ہوتا ہے جس کے سرپرست ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی ہیں اور مدیر عظمت علی خاں۔

"کاروان سائنس" کے بارے میں پہلی بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا مجلہ ہے جسے ہم اس کے ظاہری محاسن، عوامی افادیت اور مضامین کے تنوع کے لحاظ سے کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے ممتاز سے ممتاز سائنسی مجلے کے مقابلے میں بھی پیش کر سکتے ہیں۔ یہ مجلہ مجلس تحقیقات سائنس و صنعت کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔ بڑا خوبصورت بڑا وقیع جامع اور مفید۔ مدیر مجلہ جناب عظمت علی خاں نے انتخاب مضامین میں بڑی دقت نظر کا ثبوت دیا ہے۔ ایسے مضامین جمع کر دیئے ہیں جو معلومات افزا ہی نہیں، دلچسپ بھی ہیں اور ان سے ہم اپنی عملی زندگی میں بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس وقت میرے پیش نگاہ کاروان سائنس کی جلد دوم کا شمارہ چہارم ہے اس میں جو مضامین شامل ہیں ان میں سے چند عنوانات ملاحظہ فرمائیے۔
ٹڈیوں پر موسم کے اثرات، اعضائے رئیسہ کی پیوند کاری، اقلیمی نظریات کا تجزیہ، کیا جنگلی جانور خطرناک ہوتے ہیں، کیمیا گری سے کچھ آگے، جڑواں بچے، آپ بھی سوچیے۔ (سائنسی موضوعات پر استفسارات اور جوابات) آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت، شطرنج کی بساط، ایجاد کی کہانی موجد کی زبانی، پاکستان کی سائنسی دنیا، عالم سائنس۔

سائنس کو ایک بڑا خشک علم سمجھا جاتا ہے مگر کاروان سائنس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام کے تمام مضامین میں دلچسپی کا سامان وافر مقدار میں ملتا ہے۔ ہر مضمون میں ادبی چاشنی ہے۔ چنانچہ جس شخص نے اسکول یا کالج میں سائنس نہیں پڑھی وہ بھی کاروان سائنس

ری نے گیارہ صفحات میں مقدمہ لکھا ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ نہیں ہوتا ۔ ماتا پرشاد زیب نے گزارش احوال واقعی اپنی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالی ہے جس سے ان کی ذات اور شاعری پر ضروری معلومات فراہم ہو جاتی ہیں ۔ تاہم یہ بھی طویل مختصر ہوتا تو بہتر تھا ۔

ماتا پرشاد زیب نے پہلی غزل ۱۹۲۶ء میں لکھی تھی ۔ اس طرح ان کی عمر شاعری چالیس سال کو محیط ہے ۔ اس طویل مدت میں وں نے ہزاروں غزلیات لکھیں لیکن نگارخانے میں صرف ایک سو نو غزلیات پر مشتمل انتخاب پیش کیا جو ان کی ہوش مندی کا ثبوت ہے ۔ رخانے کی دل کشی کا باعث حسن انتخاب ہے جس سے مجموعے میں فضا اور کیفیت کی یکسانیت پیدا ہو گئی ہے ۔ حسن انتخاب سے غزل کے ج کو بھی درستگی کا موقع ملا ۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ مجموعے میں ایک غزل پڑھنے کے بعد دوسری غزل پڑھنے کے لیے تحریک پیدا ہوتی ی ہے ۔

نگارخانے قدیم و جدید غزلیات کا مجموعہ ہے ۔ پرانے طرز کی غزلیں کمتر ہیں ۔ ان میں بھی شاعر کی بلند خیالی اور تصویر آفرینی جوہر نمایاں ہے ۔ پختہ کاری جو اساتذہ قدیم کی خوبی ہے ان غزلوں میں واضح اور نمایاں ہے ۔ نئے طرز کی غزلوں میں نئے اشارے نئے اشاروں میں ترقی پذیر سماج کے مطالب پوشیدہ ہیں ۔ ان غزلوں میں زلف و گیسو کا تذکرہ برائے نام ہے ۔ ان میں محبوب کے کے بغیر محبوبیت اور فلسفیانہ و متصوفانہ خیالات و اصطلاحات کے استعمال کے بغیر حیات یا بعد حیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ غزلوں پر خود فریبی کا سایہ نہیں پڑتا ہے ۔ ان کا تخلیق کار ایک حساس، مشاہدہ بین فن پرست شاعر ہے جس کو زندگی کے حسن ر اس کے مآل سے بڑی محبت ہے اور وہ عظمت حیات کی سرحدوں کو چھو لینے کے باوصف بےقرار و متجسس رہتا ہے ۔ اس کی بے قراری ن طلب اور مآل بین ہے ۔ اس کی جستجو صنم بہ صنم ہے ۔ اس کو ہر صنم سے پیار ہے کیونکہ وہ نگارخانے کا شاعر ہے ۔

انقلاب سحر و شام کا منشا کیا ہے — زندگی مرکز ادبار ہوئی جاتی ہے
منظر عام پہ آنے کو ہے راز ہستی — سانس بھی محرم اسرار ہوئی جاتی ہے
عشق احساس جنوں ہے کسی حد تک لیکن — میری فطرت ترا کردار ہوئی جاتی ہے

ہم نے مر مر کے زندگانی پر — زندگی کا خیال کر تو لیا
احترام فراق ہو نہ سکا — احترام وصال کر تو لیا

جس میں ترا خیال ہم سفر نہیں — ہم نے سمجھ لیا وہ تری رہگذر نہیں

حسرت اس آنسو کی ناکامی پہ ہے اے ہم نشیں — آنکھ سے ڈھلتے ہی جو گوہر بنے اور ٹوٹ جائے

ہائے ہونٹوں تک نہ آنے پائی تھی روداد غم — کر لیا جذب تبسم دکھ بھری آواز کو

جادۂ شوق کے ہر موڑ سے جان منزل — تجھ سے ملنے کے لیے راہ نکل سکتی ہے

نگارخانے کی کتابت طباعت بہتر ہے البتہ قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے ۔ اردو کے فروغ کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت

کی اساس جرمنی کا بنیادی قانون ہے۔ جرمنی کے نظام تعلیم سے وہ بہت زیادہ متاثر ہیں اور ان کے نزدیک جرمن قوم کی کامرانی اس کے نظام تعلیم میں مضمر ہے۔

یہ کتاب ایک دلچسپ سفرنامہ بھی ہے اور جرمنی کی تاریخ اور سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حالات کے بارے میں ایک علمی تصنیف بھی ہے۔

اخباری زندگی اختیار کرنے کے بعد علمی و تحقیقی مشاغل کا جاری رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن شریف فاروق "مشق سخن ساتھ چکی کی مشقت" کے بھی عادی معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں اگر ایک طرف نہایت ہلکی پھلکی اور رواں دواں زبان لکھنے پر قدرت تو دوسری طرف تاریخی اور علمی موضوع کی مناسبت سے پیرایۂ بیان اختیار کرنے میں بھی ملکہ حاصل ہے۔

اس دور میں کہ ہر علمی کتاب کے آخر میں کئی کئی طرح کے اشاریے شامل ہوتے ہیں، اس کتاب میں یہ بڑی خامی نظر آتی کہ اس کے شروع میں بھی مضامین کی کوئی فہرست نہیں۔

کتاب میں چالیس سے زیادہ تصاویر شامل ہیں ان میں سے کچھ تصاویر جرمن مشاہیر کی ہیں اور باقی تصاویر جرمنی کی تعلیمی، ثقافتی، صنعتی، سیاسی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تصاویر نے کتاب کی دلکشی اور اس کی افادی حیثیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

مضبوط جلد مع گرد پوش، عمدہ کتابت، سفید کاغذ، آفسٹ کی چھپائی، قیمت ساڑھے دس روپے۔ ملنے کا پتہ: ۷۰ مکتبۂ جہاں نما ٹمپل روڈ لاہور۔

(ابو سلمان شاہجہاں پوری)

نگار خانے

مصنف : ماتا پرشاد زیب

صفحات : ۱۲۰

قیمت : تین روپے پچاس پیسے

ناشر : عبدالباری آسی اکیڈمی، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

عبدالباری آسی اکادمی لکھنؤ ہر چند ایک نیا ادارہ ہے مگر اس نے تھوڑی مدت میں اردو پبلک کو اردو تحقیق و تنقید کے موضوعات پر بیسیوں کتابیں پیش کی ہیں۔ اس رفتار کے پیش نظر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ ادارہ مستقبل قریب میں اردو کی گراں قدر خدمت انجام دے گا۔

نگار خانے ماتا پرشاد زیب کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ آخری صفحات میں رباعیات و قطعات بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو سبھی معلوم ہوتے ہیں۔ کتاب کے ابتدائی چونتیس صفحات حرف آغاز، منظور ہے گزارش احوال واقعی، تعارف اور مقدمے پر مشتمل ہیں جن میں

درد مٹ جائے، تری یاد کا کانٹا نکلے　　　لیکن، اس شومیٔ تقدیر کا کیا ہو شکوہ

سر ہی جب نازگہِ دار سے اونچا نکلے

"پاؤں میں پتھر لے کر نکلو" میں بڑا گہرا طنز ہے۔ راہ میں ایک دیوانہ بیٹھا ہے۔ تم سے سوالات کرتا ہے۔ تم خاموش بنے ہو۔ دیوانہ تمھیں فرزانہ سمجھتا ہے، بہت سی باتیں کرتے کرتے یہ کہتا ہے۔

عالم سب ویرانہ پڑا ہے
آؤ اسے گلزار کریں
آؤ جہیں آزاد فضا میں
صحراؤں کے راگ سنیں
آؤ ایسا باغ سجائیں
جس میں سکھ کے پھول کھلیں　　　(دشت)

تم اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو۔ لیکن وہ نہیں چھوڑتا۔ ہاں اس سے بچ نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ:

تم اس پر پتھراؤ کرو۔
پتھر کھا کر ہنس دے گا وہ
سمجھے گا دیوانہ ہے
درد سے یہ بے حال ہے، اس کا دل غم کا پیمانہ ہے
اور وہ تم سے کچھ نہ کہے گا
راہ سے ہٹ کر بیٹھ رہے گا۔

یہ دیوانہ وہی ہے جو انسان کے دکھ کو محسوس کر کے دنیا میں سکھ کے پھول کھلانا چاہتا ہے۔

اس کائنات میں ایک عقدۂ لاینحل عرفانِ ذات ہے۔ عرش صدیقی نے اس کا اظہار اپنی نظم "پابہ زنجیر" میں کیا ہے، میں انسان کو زمانے کا اسیر بتایا ہے۔ حال کو ایک نیم روشن پہاڑی سے تعبیر کیا ہے۔ ماضی کو فلک بوس پہاڑوں سے اور مستقبل کو ایک دشت ناپیدا کنار سے تشبیہ دی ہے۔ انسان جو قیدِ زمانہ میں جکڑا ہوا ہے۔ یہی قید، عرفانِ ذات کی مانع ہے۔ جتنی حال کی روشنی ہے انسان کو بس اتنا ہی عرفانِ ذات حاصل ہوتا ہے۔ گویا ذات کا عرفان مکمل طور پر ہونا مشکل ہے۔ نیم آگہی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں، اگرچہ اپنے ذہن میں انسانی ہستی کا بڑا خوش آئند تصور رکھتے ہیں۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ عرش صدیقی کے کلام میں انسانی دکھ کا احساس شدت سے ملتا ہے "مرے وحشی جہانِ نو" میں یہ دکھ ایک کرب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ شاعر موجودہ جہاں جس کا دوسرا نام تہذیبِ حاضر ہے کی تسخیر کا عزم کرتا ہے۔

ضروری ہے۔ میرے خیال میں اصول تجارت کے پیش نظر خود ناشرین کے حق میں بھی یہی بہتر ہے کہ وہ کتابوں کی قیمت کم رکھیں تا کہ زیادہ تعداد میں فروخت ہوں اور اوسط منافع بڑھ جائے۔

(ڈاکٹر لطیف حسین ادیب)

دیدۂ یعقوب

مصنف : عرش صدیقی

صفحات : ۱۹۰

قیمت : چار روپے

ناشر : جدید ناشرین چوک اردو بازار لاہور

میں نے عرش صدیقی کی تخلیقات کا جستہ جستہ مطالعہ کیا تھا۔ ان کے تنقیدی مضامین، افسانے، نظمیں اور غزلیں نظر سے گزری تھیں ان تخلیقات کا مجھ پر اچھا اثر ہوا تھا۔ اب ان کی نظموں، گیتوں اور غزلوں کا مجموعہ دیدۂ یعقوب پیش نظر ہے۔ ان کے کلام میں انسانی دردوکرب کا احساس پایا جاتا ہے۔ وہ غیر کے درد کو بھی اپنا درد بنا کر پیش کرتے ہیں، کیونکہ پیش کش میں اپنی ہی ذات کو وسیلہ بناتے ہیں۔

کتاب کا پہلا حصہ آزاد نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔ آزاد نظم ایک طبقے میں جتنی مقبول ہے۔ اتنی ہی ایک طبقے میں بدنام بھی ہے اس کی وجہ ابلاغ و ادراک کا مسئلہ ہے، جس کی تمام تر ذمے داری ان شعرا پر عاید ہوتی ہے جنھوں نے آزاد نظم کو چیستاں بنا رکھا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان شعرا کے سامنے کوئی تصور حیات، جامع شکل میں نہیں، یا یہ کہیے کہ انھوں نے زندگی کے متعلق کسی نظریئے کو نہیں اپنایا، شعور و لاشعور کے عوامل اور جنسی الجھنوں کی آڑ لے کر اپنی شاعری کا سکہ بٹھانے کی سعی لاحاصل میں مگن ہیں، یا پھر خود فریبی اور ذاتی تسلی کے لیے یہ کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ ابلاغ شاعر کا کام نہیں ادراک قاری کی ذمے داری ہے۔ لیکن عرش صدیقی کے کلام میں یہ بات نہیں ہے۔ ان کی نظمیں چیستاں نہیں کہ بیٹھے پہیلیاں بوجھتے رہیے اور مصرعوں کے ایک دوسرے سے ڈانڈے ملاتے رہیئے۔ ابلاغ مکمل ہے، ادراک میں الجھن نہیں۔ نفسیاتی مباحث بھی ہیں لیکن شعوری سطح پر۔ جنسی الجھنیں بھی مل سکتی ہیں، لیکن وہ ہیجان انگیز نہیں۔ زندگی کے متعلق ایک صاف اور سیدھا نظریہ ہے کہ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ انسان دکھوں سے نجات پا جائے۔ یہ دھرتی امن و امان سے معمور ہو۔ یہاں انسان کے خون کی ہولی نہ کھیلی جائے۔ غرض ہر نظم میں یہی جذبہ کسی نہ کسی انداز میں کارفرما نظر آئے گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس نجات میں بھی انسانی وقار پر آنچ نہ آنے پائے۔ اس طرح وہ انائے انسانی کو بلند تر رکھنے کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔

ہوش سے آج تو محروم سے ہو جائیں گے تا کہ جاں، حسنِ تمنا کے فسوں سے چھوٹے
مصلحت کوش بنے قید جنوں سے چھوٹے سر سے دل داریٔ آزار کا سودا نکلے

ہم خزاں ہوکے بھی ہیں رونق بزمِ عالم — ہم نہ ہوں گے تو کہاں جشن بہاراں ہوں گے؟

اٹھا جو دستِ ستم قتل بے نوا کے لیے — نگاہ شوق نے بوسے ہر اک ادا کے لیے

پیچ در پیچ ہے یوں سلسلۂ زلفِ دراز — ہاتھ لگتے ہی جو کچھ اور بھی پیچاں ہو جائے

عرش صدیقی کی زبان بڑی متین و دلآویز ہے۔ مجھے صرف ایک مصرع کھٹکا ہے۔

مرے پہنچنے سے روشندان کی راہ — غبار گھرنے روکی ہوئی ہے

اس میں "نے" استعمال درست نہیں۔ خلاف روزمرہ ہے اصول قواعد کے مطابق نہیں، اگرچہ یہ خلاف ورزی اور شاہ ظفر اور محمد حسین آزاد کے ہاں بھی ملتی ہے مگر اجتناب بہتر ہے۔ اس کو بآسانی بدلا جا سکتا ہے۔ مثلاً غبار گھرنے پہ ہے رد کی۔

عرش صدیقی کی نظم ہو یا گیت یا غزل، ہر ایک میں فکر اور جذبے کی ایک دلآویز آمیزش ملتی ہے، جو دلوں میں گھر کرتی ہے۔ پورے کلام کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ عرش صدیقی کی شاعری میں خلوص ہے وہ انسان دوست ہے اور بنی نوع انسان کا غمگسار۔ اپنے موضوع اور فن میں صداقت سے کام لیتا ہے آج کل کی اصطلاح میں اسے "سچا شاعر" کہا جا سکتا ہے۔

(سید قدرت نقوی)

پہلے اس کی وحشت و بربریت کی تصویر دکھاتا ہے اور مثال میں وادی کشمیر کو پیش کرتا ہے۔ پھر اس کی تسخیر کے لیے آگے بڑھتا ہے، اور کہتا ہے۔

مرے وحشی جہانِ نو
مجھے تسخیر کرنا ہے
تری تہذیب حاضر کے
دل بے حس کو۔ وحشی کو
صلیبِ ابن مریم رکھ کے کاندھے پر
شعاع علم گوتم لے کے آنکھوں میں
محمدؐ کی وفا کا ہاتھ میں اونچا علم لے کر
ہوئی تحریر جس سے لوحِ آدم، وہ قلم لے کر
متاعِ فن، متاع زندگی ہر دو بہم لے کر ص۱۱۱

شاعر کی للکار اور عزم قابل داد ہے۔

گیتوں کا رنگ ہماری شاعری میں بڑا رسیلا ہے اس میں نہ درتہ درد کی کسک ملتی ہے۔ گیت عورت کے عشق کی نمائندگی کرتے ہیں، عورت کا عشق خود تہ درتہ بات ہے۔ بات کھلتی بھی ہے تو نہیں کھلتی، پی کے ہوتے ہوئے بھی لاج کے مارے کچھ نہیں کہتی

مجھ سے کرتے رہے ٹھٹھولی
لاج کی ماری جب کچھ نہ بولی
سن ری ہم جولی، منوا کی بولی
کھیلی ہردے میں آشائے ہولی
بات میں جیا کی نہ کھولی

اردو میں غزل وہ ہر دلعزیز صنعت سخن ہے جو ہر دور میں ہمارا ساتھ دیتی رہے گی۔ اس میں اتنی لچک ہے کہ زمانے کے ہر انداز کو اپنا لیتی ہے اس لیے زمانے کے نشیب و فراز دیکھیے، مخالفتوں کے ظلم و جور سہے، لیکن ہمارے جذبات کی آئینہ داری کے لیے اس نے خود کو نئے انداز میں پیش کر کے اپنی ہستی اور اپنی زندگی کا ثبوت دے دیا۔ عرش صدیقی کی غزلوں میں اسی کا عکس ملتا ہے۔

کیسے بنتا ہے لہو سرخیٔ افسانۂ دل   کیسے بنتا ہے قلم نوک سناں، دیکھتے ہیں
درد بن کر نفس نے میں سما جائیں گے   سوز بن کر حرم دل میں فروزاں ہوں گے

مراسلات

میری شاعرانہ معرکہ آرائیاں

کل قومی زبان کراچی کا تازہ شمارہ آیا ۔ آپ نے اچھا کیا ۔ بابائے اردو کا ایک پرانا مضمون شائع کر دیا ۔ ایک تو اس کی حیثیت تبرک کی ہے ۔ اور سرسید کے کردار پر روشنی بھی پڑتی ہے ۔ اُن کی خوبی پر بھی اور کمزوری پر بھی ۔

اس سے پہلے کے شمارے میں تمنا عمادی پھلواروی صاحب کے مضمون کی ایک قسط آپ نے شائع کی اور میں نے اُسے پڑھا تھا لیکن اس میں ساری باتیں میری یاد سے پہلے کی تھیں اور اُن کے گھر تک محدود ۔ تعلی تو سمجھ میں آئی ۔ لیکن غلط بیانیوں کو پکڑنا میرے لیے ناممکن تھا اگرچہ اس کا یقین تھا اور ہے ۔ کہ اس میں ۔ ... کا حصہ زیادہ ہوگا ۔ اس لیے کہ جب سے میں انھیں جانتا ہوں اسی حیثیت سے جانتا ہوں ۔ تمنا صاحب جب تک بہار میں تھے ۔ اُن کی حیثیت مستقلاً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی تھی ۔ اب وہ کافی بوڑھے ہو چکے ہیں ۔ اور وطن کو خیرباد کہہ کر جا بھی چکے ۔ لیکن ان کی طبیعت میں کینہ اب بھی باقی ہے ۔ اور وہ بھی مرے ہوئے لوگوں کے خلاف ۔ اس سے ان کا کردار ظاہر ہے ۔

تمنا صاحب کی حیثیت بہار میں مسٹر عزیز مرحوم کے مصاحب سے زیادہ کچھ اور نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا ایک طبقہ تھا جس پر اپنے علم کا رعب جماتے تھے ۔ اور کچھ فضول گو شاعروں کے " استاد " تھے ۔ جب کانگرس کو عروج تھا تو کانگریسی تھے ۔ اور جب مسلم لیگ کو عروج ہوا تو مسلم لیگی ہو گئے تھے ۔ اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رح سے انھیں ہمیشہ کا بغض رہا ۔ ایک تو اس لیے کہ وہ پھلواری شریف میں رہ کر نائب امیر شریعت کیوں ہو گئے ۔ اور یہ کیوں نہ ہوئے ۔ حالانکہ حضرت امیر شریعت کے رشتہ دار بھی تھے ۔ اور اسی ایک وجہ سے امارت شرعیہ کے مخالف بنے رہے ۔ خود حضرت امیر شریعت اور امارت شرعیہ کے خلاف انھوں نے جو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عزیز صاحب کے دوسرے مصاحبوں کے اشارے پر کی تھیں ۔ وہ اب بھی لوگوں کو یاد ہیں ۔ مولانا سجادؒ دیوبندی تھے ۔ اور یہ خود کو اہل قرآن کہتے تھے ۔ واللہ اعلم اب کیا ہیں ۔ اس لیے کہ مسٹر عزیز مرحوم بھی خود کو اہل قرآن کہتے تھے ۔ مولانا محمد سجاد سے آپ واقف نہیں ۔ یہ بے چارے اُن کو سمجھنے کی بھی صلاحیت سے عاری ہیں ۔ مولانا محمد سجاد میں وہ صفات تھیں جو عہد نبوی میں مجاہدوں میں ہوتی تھیں ۔ فقر و فاقہ اور غریبی ۔ لیکن انگریزی

مخطوطات انجمن ترقی اردو

فارسی

عربی

انجمن میں فارسی اور عربی مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے ان مخطوطات کی اجمالی فہرست سیّد سرفراز رضوی مہتمم کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اُردو نے مرتب کی ہے جس میں ہر مخطوطے کے بارے میں ضروری اور بنیادی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ متعدد مخطوطات کے عکس بھی شائع کئے گئے ہیں۔ طباعت بذریعہ آفسٹ۔

قیمت: تین روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اُردو
بابائے اُردو روڈ
کراچی نمبرا

یہ کہ شاعر ہیں - اور خواہش یہ کہ انھیں بھی شاعر مانا جائے - اب کون سمجھ دار آدمی شاد کے مقابلے میں ان کو شاعر سمجھتا -

ایک نہایت دلچسپ واقعہ بابائے اردو کے ساتھ بھی ہوا۔ بابائے اردو پٹنہ آتے تھے تو مسٹر عزیز مرحوم کے ہاں قیام کرتے تھے - اور یہ حضرت ان کے گھر پر پڑاؤ ڈالے رہتے تھے - انھوں نے بابائے اردو سے کہا کہ ان کے پاس ایک نایاب اردو نسخہ ہے - اور حساب ایسا بتایا کہ اگر ثابت ہو جاتا تو اردو نثر کی پہلی کتاب کا شرف اسے حاصل ہوتا۔ اس پر ان حضرت نے ایک مقامی اخبار میں یہی دعویٰ بھی کیا - میں بھی اس نسخے کی زیارت کے لیے گیا تھا - اور چپ چاپ لوٹ آیا تھا۔ بابائے اردو اس نسخے کو دیکھنے گئے - اور دیکھتے ہی غصے میں لوٹ کر چلے آئے - اور اپنی عادت کے مطابق برا بھلا کہا - یہ حضرت سب کو بے وقوف سمجھتے تھے - دراصل انھیں کہیں سے پرانا کاغذ مل گیا تھا - اس پر انھوں نے ایک رسالہ اپنے قلم سے لکھ مارا۔ کوشش کی کہ زبان پرانی لکھی جائے - لیکن بس کی بات نہ تھی - پھر مخطوطات کا مطالعہ نہیں کیا تھا کہ موٹی موٹی باتوں کا بھی علم ہوتا۔ جب مجھے اس نسخے کے جعلی ہونے کا اندازہ ہوگیا - تو بابائے اردو کیا دھوکہ کھاتے - شاید وہ نسخہ اب بھی ان کے پاس ہو - دو باتیں تو مجھے نظر آگئیں - ایک تو یہ کہ ان حضرت نے .... میں سطریں سیدھی لکھنے کے لیے پنسل سے لکیر کھینچی تھی - اور پنسل اس زمانے میں تھی ہی نہیں - میں نے اس کے بعد کے بہت سے نسخے خدا بخش لائبریری میں دیکھے تھے - کہیں پنسل کا نام و نشان تک نہیں تھا - بلکہ سطریں سیدھی لکھنے کے لیے ڈوری سے دباؤ دے کر نشان بنایا جاتا تھا - دوسرے اس وقت کے رسم خط میں گ کی جگہ ک ہی لکھا جاتا تھا - اور ان کے نسخے میں "گ" تھے - اور یہ دو باتیں تو موٹی موٹی تھیں - اور زبان بالکل عجیب جو کسی طرح بھی اتنی پرانی نہیں ہو سکتی - اس رسالے کے بارے میں دریافت کیجئے - اور منگا کر دیکھئے - قاضی عبدالودود نے بھی اس نسخے کو جعلی کہا تھا - بابائے اردو نے انھیں .... اور ..... " کا معزز خطاب عنایت فرمایا تھا -

مجھے کوئی بحث نہیں - اب اس مضمون کو چھاپئے - لیکن یقین رکھئے اس کے جواب میں پٹنہ سے آپ کے پاس بہت سے مضامین آئیں گے - کل پروفیسر سید حسن صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونی ورسٹی سے میری ملاقات ہوئی تھی اور وہ اس مضمون کی شکایت کر رہے تھے - انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کو خط لکھیں گے - شاید وہ ضرور لکھیں گے -

اس قسم کے مضامین پٹنہ میں لکھنے اور شائع کرنے کی جرأت انھیں نہیں ہوئی - اب وہ پاکستان میں شاید خود کو واقعات کا تنہا جاننے والا سمجھتے ہیں - اور انھیں تردید یا جواب کا کوئی خطرہ نہیں - اسی لیے جو جی میں آیا لکھ مارا - یوں بھی شاد والا واقعہ برادر گرامی سید عطاء الرحمان سے دریافت کروں گا - وہ شاد عظیم آبادی کے شاگردوں میں ہیں - لیکن بے حد ایماندار ہیں - شاد کے کچھ اور شاگرد بھی ہیں - اور ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جو شاد کے شاگرد نہیں - لیکن اُن کا زمانہ دیکھا ہے -

(سہیل عظیم آبادی)

نومبر ۱۹۶۰ء کے قومی زبان میں مولوی تمنا عمادی کے مضمون " میری شاعرانہ معرکہ آرائیاں " کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے، میں نے مضمون کے دونوں حصوں کو پڑھا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سارا

حکومت کے خلاف جوشِ جہاد - اور یہ حضرت مسٹر عزیز کے حاشیہ بردار - اور مسٹر عزیز انگریزوں کے زمانے میں وزیر .....
اب آپ ان کے کردار کو سمجھ سکتے ہیں - ہم لوگ جو اس وقت نوجوان تھے - اور مسٹر عزیز اور انگریزوں کے مخالف تھے - ا
کو کھلونا سمجھتے تھے - جہاں ملے انھیں لے کر کسی ہوٹل میں بیٹھ گئے - چائے منگائی اور ایک سوال کر دیا - ان کو غلط فہ
کہ ہم ان سے روشنی حاصل کرنا چاہتے ہیں - اور یہ خوش فہمی کہ ہمیں اپنی بات ماننے پر مجبور کر دیں گے - دو تین بار ایسا ہوا
یہ حضرت جلسے میں تقریر کرنے جا رہے ہیں - اور ہم لوگوں نے پکڑ لیا - اور چائے منگا کر بحث چھیڑ دی - اور اسے اتنا بڑھ
کہ جلسہ ختم ہو گیا - اور یہ حضرت چائے اور بحث میں رہ گئے -

انھوں نے اپنے سلسلۂ مضامین کا عنوان رکھا ہے "میری شاعرانہ معرکہ آرائیاں" واقعہ یہ ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھ
کسی باذوق انسان نے انھیں اہمیت نہیں دی -" مغز قومی یہ ملا روغن با دام عمل" ایک مصرع کسی طرح یاد ہے - یہ ان کی
شاعری ہے - اندازہ کر لیجئے - لیکن علامہ اور بڑا شاعر بننے کا خبط ہمیشہ رہا - شاد عظیم آبادی اور مولانا محمد سجاد مرحوم ہی
سے نہیں - ہر اس آدمی سے جسے عزت حاصل تھی - انھیں چڑھ سی تھی - سوائے ان لوگوں کے، جن کے دسترخوان پر یہ مکھی بن کر
بیٹھتے تھے -

چونکہ ۱۹۲۰ء سے ہی جب میں میٹرکولیشن کا طالب علم تھا، مجھے سیاست سے دلچسپی تھی - اس لیے بہت سے
واقعات جانتا ہوں - تمنا صاحب نے حضرت مولانا شاہ بدرالدین صاحبؒ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا شاہ محی الدین صاحبؒ
کے انتخاب کی مخالفت کی تھی - بلکہ امارت شرعیہ کی ہی مخالفت شروع کر دی تھی - یہ انھوں نے غلط لکھا ہے کہ وہ مولانا سجادؒ
کی وجہ سے مخالفت کر رہے تھے - واقعہ یہ ہے کہ مولانا شاہ محی الدین صاحبؒ بھی مجاہد تھے - اور انھیں نے
حضرت مولانا بدرالدین صاحبؒ کو امیر شریعت بننے پر آمادہ کیا تھا - ورنہ وہ زاہد شب زندہ دار و خلوت نشین ان جھمیلے
میں نہیں پڑتے - دراصل ان حضرت نے مولانا شاہ محی الدین صاحب کی مخالفت کی تھی - اور بعض انگریز پرستوں کے اشارے
پر - اس لئے کہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کا صرف بہار ہی نہیں بلکہ اس سے باہر بھی بہت زیادہ اثر ہے - اور وہاں کے
حلقہ بگوشوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے - اور انگریز پرستوں کو یہ پسند نہ تھا کہ خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشین سیاست میں
ایسا رخ اختیار کریں - جس سے انگریزوں کو نقصان پہنچے - خانقاہ مجیبیہ اور امارت شرعیہ کا بہار کے مسلمانوں پر اتنا اثر
تھا - کہ ۱۹۳۷ء میں مسٹر عبدالعزیز کی یونائیٹڈ مسلم پارٹی کے مقابلے میں مولانا سجاد مرحوم نے انڈی پنڈنٹ مسلم پارٹیؒ بنائی -
جو کانگریس کی ہم نوا تھی - اور الکشن ہوا - تو مسٹر عزیز کی پارٹی کے چالیس امیدواروں میں سے صرف تین یا چار جیت سکے - باقی
سب ہار گئے - اور مولانا سجادؒ کی پارٹی کے چھبیس آدمی جیت گئے - مجھے اچھی طرح یاد ہے - اس زمانے میں تمنا صاحب
مسٹر عزیز کی پارٹی کا جھنڈا لیے بہار بھر میں مارتے پھرتے تھے - اور اس عہد کا اثر اب تک ان پر ہے -

شاد کے بارے میں بھی ان کا غصہ اسی قسم کا تھا - کہاں شاد اور کہاں یہ شاعری کا .... اور اس پر غرہ

غالبیہ کے بارے میں

میں کئی سال سے مرزا غالب کے بارے میں معاصرین کی تحریریں اور بیانات منظوم و منثور دونوں جمع کر رہا ہوں اور اس سارے مواد کو غالبیہ کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ پہلے تین ابواب نگار رام پور میں شائع کر چکا ہوں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ غالب کے بارے میں سارا خام مواد یکجا ہو جائے ۔ محققین اور ناقدین کو ادھر ادھر تلاش میں بھٹکنا نہ پڑے ۔ یہ سارا مواد میں نے کئی ابواب میں تقسیم کر دیا ہے جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے ۔ حتی الامکان میں نے اپنے موضوع سے متعلق معلومات جمع کرنے میں کوئی گوشہ چھوڑا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود امکان رہتا ہے کہ میری نظر سے بعض مفید مطلب تحریریں نہ گزر سکی ہوں ۔ اس لیے میں قومی زبان کے ذریعے غالبیات میں دلچسپی رکھنے والے حضرات سے درخواست کر رہا ہوں کہ وہ ایک نظر ابواب کی تقسیم پر ڈال لیں اور اگر ان سے متعلق ان کے پاس کچھ مواد ہے تو مجھے مرحمت فرمائیں وہ شکریے کے ساتھ درج کر لیا جائے گا ۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ میری نظر سے بعض ایسی چیزیں گزریں جنھیں اس کتاب میں شامل ہونا چاہیئے تھا اور میں نے انھیں اپنے پاس نوٹ بھی کر لیا مگر وہ یادداشت کہیں ضائع ہو گئی (میری یادداشتوں کا ایک مکمل فائل ضائع ہو گیا ہے) مثلاً ... نے غالب کا ایک قطعہ تاریخ وفات نوٹ کیا تھا جس کا ایک مصرع

غالب جو مر گیا ہے تو دلی اداس ہے

... اب وہ میرے کاغذات میں موجود نہیں اور ظاہرا گم شدہ فائل میں تھے ۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں آتا کہ یہ کس کا ہے اور میں کہاں پڑھا تھا ۔

بہر حال مندرجہ تحت ابواب سے متعلق جو کچھ بھی آپ مدد فرما سکتے ہوں اس سے دریغ نہ فرمائیں ۔

پہلا باب ۔ تذکرے

دوسرا باب ۔ ملاقاتیوں کے بیانات

تیسرا باب ۔ ہم عصر اخبارات میں غالب کی یا غالب پر تحریریں اور خبریں ۔

چوتھا باب ۔ غالب کی زندگی میں لکھے ہوئے ایسے اشعار جن میں غالب کا تذکرہ ہوا ہے ۔ ان میں قطعات تاریخ وغیرہ بھی ہیں ۔ جیسے غالب کے بہرے ہونے کی تاریخ جو ... عالم مارہروی نے کہی تھی یا غالب کے وفات کی غلط خبر اڑ جانے پر جو قطعات کہے گئے یا غالب کی مدح میں قصائد وغیرہ منفرق ایک ایک دو دو شعر بھی اس باب میں آئیں گے ۔ جیسے یہ دو شعر

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید (صہبائی)

ظل کرم ہے حضرت غالب کا بس مجھے
سر پر نہیں ہے سایۂ بال ہما نہ ہو (میاں داد خاں سیاح)

مضمون ایک ادنیٰ درجے کی بدمذاقی کا نمونہ ہے، اس میں مولوی صاحب موصوف نے شاد عظیم آبادی مرحوم اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم سابق نائب امیر شریعت بہار کے خلاف ذاتی بغض و عناد کی بنا پر حد درجہ رکیک باتیں لکھی ہیں۔ مولوی صاحب جب تک ہندوستان میں تھے ان کی شخصیت علم و ادب کی دنیا میں بالکل غیر اہم رہی۔ شاعری حیثیت سے بھی اُن کا معمولی رتبہ تھا۔ اُن کو شادؔ کی برابری کا دعویٰ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اُن کے پاسنگ بھی نہ تھے، شادؔ کا ذاتی کیرکٹر خواہ کچھ بھی ہو اور یہ واقعہ ہے کہ اُن کی طبیعت میں بعض عناصر ایسے تھے کہ لوگ اُن کو برا سمجھتے ہیں۔ اپنی مطلب برآری کے لیے وہ کذب بیانی اور خوشامد سے کام لینے میں دریغ نہیں کرتے، ہر صنف ادب کا ماہر ہونے کا خبط تھا۔ میں نے اُن کی ناول نویسی پر ایک مضمون میں یہ بات ثابت کر دی ہے کہ صورت الخیال کے اصلی مولف منشی حسن علی مرحوم تھے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شادؔ کی شاعری مولوی تمنّا کی شاعری سے پست تر تھی۔ غزل گوئی میں شادؔ متاخرین میں اعلیٰ پایہ رکھتے ہیں، جہاں مولوی تمنّا کسی وقت بھی نہیں پہنچ سکتے۔ خود مولوی تمنّا کا کیرکٹر بھی بہت ہی پاک و صاف نہیں رہا ہے، علمی معاملات میں ان کی ..... کا حال یہاں تمام لوگوں کو معلوم ہے، اسی طرح مولانا سجّاد مرحوم اپنے تقدس و علمیت و قوم پروری کی وجہ سے ایک اہم مقام کے مالک رہے جو مولوی تمنّا کو نصیب نہ ہو سکا۔ شادؔ اور سجّاد پر الزام لگانا اور بہتان باندھنا ایسی صورت میں جبکہ دونوں دنیا میں موجود نہیں ہیں ایک نازیبا حرکت ہے، جن واقعات سے انھوں نے ان دونوں مرحومین کو نیچا دکھانے اور خود کو بڑھانے کی کوشش کی ہے اُن کی صداقت میں شبہ ہے، وہ گواہ بھی جن کے نام تمنّا صاحب نے لیے ہیں فوت ہو چکے ہیں، البتہ قبلہ پروفیسر مسلم صاحب زندہ ہیں (خدا اُن کی حیات اور زیادہ بنائے) وہ ضرور تمنّا کے ہفوات کا جواب دیں گے۔ مولوی تمنّا نے شادؔ کے دو شعروں پر بزعم خود اصلاح دے کر اپنی فوقیت جتانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اہل نظر کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مولوی صاحب میں ذوق شعری کی کس قدر کمی ہے اور ان کی سخن فہمی کس درجہ پست ہے، اپنی بھونڈی اصلاح سے اُنھوں نے اُن شعروں کی مٹی پلید کر دی ہے۔ اس قسم کا مضمون جو ذاتی مخاصمت کی بنا پر لکھا گیا ہو اور جس میں بے باتیں زیادہ اور علمی و ادبی کم ہوں ہرگز اس قابل نہیں کہ قومی زبان، ایسے سنجیدہ و موقر جریدے میں شائع ہو۔ یہ رسالہ ایک قومی زبان کا ترجمان ہے، اس کو تمام اردو دوستوں کے جذبات و احساسات کا خیال رکھنا چاہیئے، اس قسم کا مضمون ایک گروہ کی آزردگی و رنجش کا باعث ہوگا اور مجادلہ و معارضہ کا ایک ایسا باب کھولے گا جو ادبی تنقید یا علمی تحقیق کے لیے اگر مضر نہیں تو غیر مفید تو ضرور ہی ہوگا، اگر اس قسم کی لغو و بے سر و پا باتیں مولوی تمنّا اپنی سوانح عمری میں بیان کرتے تو کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن قومی رسالے میں جس پر سب کا برابر حق ہے اور جو وصل کرنے کے لیے وجود میں آیا ہے، جامۂ ناپاک کے شست و شو کی کوشش صریح بدتمیزی ہے۔

(پروفیسر) سید حسن
صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

ان صاحب کو جواب بھی دیا تھا جو ہیں نہ معلوم کہاں دیکھ چکا ہوں یہ بھی عرصہ دراز کی بات ہے۔ میں نے اس کے متعلق خوش ترگرا ؟ یٹر رسالہ بیسویں صدی دہلی کو بھی خط لکھا تھا کہ شاید وہ جوش ملسیانی مقیم دہلی سے دریافت کرکے اس معاملے پر روشنی ڈال سکیں ں زمانہ دہلی میں داغ صاحب کے شاگردوں میں جوش ملسیانی صاحب ہی باقی ہیں مگر وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔

کیا آپ عظیم آباد کے قدیم باشندوں اور ضعیف العمر شعرا میں سے کسی صاحب سے امر مطلوبہ دریافت کرکے مجھ کو ممنون و شکور فرما سکتے ہیں۔ کہ داغ صاحب نے کیا جواب ارشاد فرمایا تھا۔

مجید الحسن، دہلوی (علیگ)

(حیدرآباد دکن)

مخطوطات انجمن ترقی اردو: انجمن ترقی اُردو کے کتب خانۂ خاص میں اُردو کے تقریباً بارہ سو مخطوطات ہیں۔ ان مخطوطات کی وضاحتی فہرست تیار کی جا رہی ہے، اب تک اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھیں افسر امروہوی نے مرتب کیا ہے۔

جلد اوّل: اس میں ۸۵ مخطوطات پر توضیحی حواشی لکھے گئے ہیں۔ آخر میں جملہ مخطوطات کی اجمالی فہرست ہے

قیمت: دس روپے

جلد دوم: اس میں تقریباً پونے دو سو مخطوطات پر توضیحی حواشی ہیں۔

قیمت: سات روپے

خیالات عزیز یہ مولوی عزیز مرزا (سابق معتمد آل انڈیا مسلم لیگ و انجمن ترقی اُردو ہند) کے علمی، ادبی، لسانی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے۔ بعض مضامین یہ ہیں:

ــــــ اکبر اعظم	ــــــ دربار بغداد کی ایک جھلک
ــــــ سکے کی ابتدا اسلام میں	ــــــ کاغذ کا رواج اسلام میں
ــــــ ایشیائی شاعری کا موضوع کیا ہے	ــــــ خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس بدایوں

اس مجموعے کو آنجہانی پنڈت دیا نرائن نگم (مدیر "زمانہ") نے مرتب کیا تھا۔ اور اس پر نواب وقار الملک مرحوم دیباچہ ہے ــــــ

قیمت:۔ چار روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اُردو۔ بابائے اُردو روڈ کراچی ۱

پانچواں باب - غالب کی کتابوں پر دیباچے، تقاریظ اور قطعات۔

چھٹا باب - غالب کی وفات پر قطعے۔

ساتواں باب - غالب کی وفات پر مضامین۔

آٹھواں باب - معاصرین کے خطوط جن میں غالب کا ذکر ہے یا جو غالب ہی کے نام لکھے گئے ہیں۔

نواں باب - متفرقات - ایسی تحریریں جن کا تعلق ان حضرات سے ہے جنھوں نے غالب کو دیکھا تھا ان کے دوست تھے شاگرد تھے۔ اس میں اشعار کے مطالب وغیرہ جو غالب کے حوالے سے درج کئے جائیں گے۔

یہ بھی عرض کردوں کہ اگر کسی شخص نے غالب کے بارے میں کوئی بیان دیا ہے لیکن اس شخص کی معلومات براہ راست نہیں ہیں بلکہ کسی دوسرے شخص کے ذریعے ہیں اور وہ دوسرا شخص غالب کے عہد کا ہے تو یہ بیان بھی کتاب میں شامل ہوگا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص یہ بیان کرتا ہے کہ غالب نے میرے والد کو اپنے فلاں شعر کا یہ مطلب بتایا تھا - اب یہ بیان غالبیہ کے دائرے میں آتا ہے - یا جیسے امیرمینائی کے حوالے سے جلیل مانک پوری نے غالب کے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ رام پور سے واپسی کے موقع پر ایک بہشتی نے اپنی لڑکی کے جہیز کے لیے امداد چاہی تھی اور غالب نے اس کی مدد کی۔ یہ بیان اگرچہ امیرمینائی کے قلم سے نہیں ہے مگر چونکہ انھوں نے خود اپنے شاگرد سے بیان کیا ہے اور امیرمینائی غالب کے ملاقاتیوں اور ہم عہد شخصیتوں میں سے ہیں اس لیے غالبیہ میں اسے شامل کردیا جائے گا۔

اکبرعلی خاں

(رضا لائبریری رام پور)

ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

ملاحظہ ہو رسالہ "قومی زبان" بابت ماہ اکتوبر ۱۹۷۶ء شمارہ (۱۰) جلد (۴۸) "میری شاعرانہ معرکہ آرائیاں" از مولانا تمنا عمادی۔

حضرت داغ مرحوم نے دوران قیام عظیم آباد پٹنہ یہ مشہور اور معرکہ آرا غزل لکھی تھی۔

بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

منشی محمد باقر صاحب عظیم آبادی کے دولت کدہ پر داغ صاحب مقیم تھے۔ اس غزل کا مشہور قطعہ ہے سہ

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

جب یہ مشاعرہ ختم ہوگیا تو ایک صاحب نہایت ادب سے داغ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ چھینٹا تو چیت بیساکھ کے مہینوں میں پڑتا ہے۔ ساون بھادوں تو برسات کا شدید زمانہ ہوتا ہے اور موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ چھینٹا پڑنے سے اس کا تعلق نہیں۔ مضمون تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ "ہم چیت بیساکھ کے منتظر ہیں" اس سوال کا داغ صاحب

گرد و پیش

ایک سائنسداں کا نظریہ

سرسید گرلز کالج کی سائنس سوسائٹی اور سائنسی نمائش کے افتتاح کے موقع پر جامعہ کراچی کے شعبۂ سائنس کے سربراہ جناب ڈاکٹر افضال حسین قادری نے کہا کہ پاکستان کی ترقی کا دارومدار سائنسی تعلیم پر ہے۔ اور طلبہ کو سائنس کی تعلیم مادری زبان میں دینا ضروری ہے۔ انھوں نے پاکستان کو قدرتی وسائل سے مالا مال بتاتے ہوئے سائنسدانوں کو اس سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا۔

بلدیہ حیدرآباد کا اقدام

۲۷ر جنوری وہ یادگار تاریخ ہے جب بلدیہ حیدرآباد نے اپنے اجلاس میں اردو کو اپنی دفتری زبان قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ جس پر عملدرآمد فوراً شروع کر دیا گیا ہے۔ بلدیہ کا یہ اجلاس چیرمین بلدیہ جناب مسعود احمد قریشی کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اور اس میں یہ اہم فیصلہ کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا گیا کہ اگلے ہی روز سے بلدیہ کی تمام کارروائی اور خط و کتابت اردو میں ہوگی۔

جسٹس کارنیلیس کی الوداعی تقریر

کراچی میں ۱۵ر فروری کو مقامی ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی طرف سے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب کارنیلیس کو الوداعی پارٹی دی گئی۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے مہمان خصوصی نے اس بات کا پھر اعادہ کیا کہ یہ خیال بڑا عجیب ہے کہ جب تک ہم غیر ملکی زبان استعمال نہ کریں اس وقت تک ہمارے قانون اور انصاف کے نظریات کی تشہیر نہ ہو سکے گی۔ انھوں نے کہا کہ جو راستہ آجکل ہم نے اختیار کر رکھا ہے اس کو چھوڑنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ جناب کارنیلیس نے اس بات پر زور دیا کہ انصاف کے تمام ذرائع عوام کی زبانوں میں منتقل کئے جائیں۔

نصابی کتب اور کراچی یونی ورسٹی

جامعہ کراچی کے ایک اعلامیے کے مطابق ۱۹۶۸ء کے اواخر تک شعبۂ تصنیف و تالیف کی جانب سے طبعیات، ریاضیات، فلکیات، کیمیا، حیاتیات، نفسیات، ارضیات، معاشیات اور شماریات کی فرہنگ و اصطلاحات شائع کر دی جائیں گی۔ کہا گیا ہے کہ ان مضامین

ہفت مقالہ

فارسی زبان وادب

یہ رسالہ "اُردو" کے ایسے مضامین کا انتخاب ہے جو فارسی زبان وادب سے متعلق ہیں۔ یہ انتخاب ممتاز ماہر ایرانیات سیّد حسام الدّین راشدی نے کیا ہے۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل مقالے شامل ہیں:

- تصنیفات شیخ فریدالدّین عطّار — حافظ محمود شیرانی
- شاہ نامے کا دیباچۂ قدیم — حکیم شمس اللہ قادری
- فردوسی کا مذہب — پروفیسر شیخ محمد اقبال
- رباعیاتِ عمرِ خیام — عبدالباری آسی لکھنوی
- فارسی زبان کے زیرِ سایہ اُردو کی تدریجی ترقی — ڈاکٹر سید عبداللہ
- نواب صمصام الدولہ شہنواز خاں (صاحب مآثر الامرا) — محمد حسین محوی صدیقی

قیمت: آٹھ روپے

انجمن ترقی اردو

بابائے اُردو روڈ

کراچی ۱

ممتاز حسن کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی ہے۔ ملک کے علمی حلقوں میں پنجاب یونی ورسٹی کے اس اقدام کو بے حد سراہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کراچی کے اہل علم کی طرف سے ۲۲ فروری کو ایک اجتماع ہوا جس میں جناب ممتاز حسن کو مبارک باد پیش کی گئی۔ اس اجتماع میں جناب سید حسام الدین راشدی، جناب جمیل الدین عالی، ابراہیم جلیس اور دیگر حضرات نے تقریریں کیں جن میں جناب ممتاز حسن کی خدمات پر موصوف کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ جناب ممتاز حسن نے جوابی تقریر میں شرکائے اجتماع کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا "اگر میں نے کچھ مفید کام کیے ہیں تو وہ میں نے اپنا فرض سمجھ کر انجام دیئے ہیں۔ مجھے اپنے عزیز ملک میں بعض تاریک گوشے نظر آئے جن میں میں نے چراغ جلانے کی کوشش کی ہے، خدا ان چراغوں کو باد مخالف سے محفوظ رکھے"۔

کتاب میلہ لاہور

قومی کتاب مرکز کے زیر اہتمام لاہور میں کتاب میلہ منایا گیا۔ جس میں پاکستان کے اہم ترین اداروں نے حصّہ لیا اور نمائش میں اپنی کارکردگی کو نمایاں کیا۔ اس موقع پر پاکستان کے چیف جسٹس جناب ایس۔ اے رحمان نے ایک پیغام میں فرمایا کہ مجھے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ قومی کتاب مرکز پاکستان لاہور میں کتاب میلے کا اہتمام کر رہا ہے۔ جس میں مقامی کتابوں کے علاوہ ایران اور ترکی کی کتابیں بھی باصرہ نواز ہوں گی۔ وزارتِ تعلیم کے معتمد جناب قدرت اللہ شہاب نے کتاب میلے کو سراہتے ہوئے یہ یقین دلایا کہ میں ناشران و تاجران کتب کو قومی کتاب مرکز اور وزارت تعلیم کی جانب سے اُن کی جدوجہد میں ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

لائبریریوں کے لیے دو کروڑ روپے

لاہور میں ۱۲ فروری کو بخاری آڈیٹوریم میں پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کا ساتواں سالانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے صوبائی وزیر تعلیم جناب محمد علی خاں نے کہا کہ حکومت تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے مکمل ہونے تک لائبریریوں پر دو کروڑ روپے خرچ کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ گزشتہ چند سالوں میں لائبریریوں پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اجلاس سے لائبریری ایسوسی ایشن کے نائب صدر جناب اے رحیم نے بھی خطاب کیا۔

قومی نظموں پر انعامات

لاہور میں ۲۷ جنوری کو محکمۂ تعمیر نو کے زیر اہتمام قومی موضوعات پر نظموں اور گیتوں کے انعامی مقابلے کی تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے مغربی پاکستان کے گورنر جناب محمد موسیٰ نے فرمایا کہ لکھنے والوں کو چاہیئے کہ وہ قوم کی روحانی، اخلاقی اور مادّی ترقی کے لیے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اسلامی خطوط پر معاشرہ تعمیر کرنے اور پاکستان کو حقیقی فلاحی حکومت بنانے میں مدد دیں۔ گورنر نے سرسید احمد خاں، مولانا حالیؔ، مولانا شبلیؔ، ڈاکٹر اقبالؔ اور نذر الاسلام کو اُن کی قومی خدمات پر زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

قومی مجلس مذاکرہ

ادارۂ تعمیر نو کے زیر اہتمام لاہور میں ۴ فروری کو ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی جس کا عنوان تھا "فن اور قومی موضوعات"۔ مذاکرے میں جناب الطاف گوہر معتمد وزارت اطلاعات و نشریات جناب مسعود الرؤف ادارۂ تعمیر نو

کی اکثر فرہنگیں تیار ہیں ۔ اور کچھ زیرِ طبع ہیں ۔

جامعہ کراچی کا شعبۂ تصنیف و تالیف ۱۹۵۸ء میں قائم ہوا تھا ۔ جس کا مقصد اردو کو متبادل ذریعۂ تعلیم بنانے کے وسائل پیدا کرنا تھا ۔ شعبے نے سب سے پہلے فرہنگ و اصطلاحات کو اپنا مقصود بنایا اور اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ۔ اس اطلاع نامے کے رو سے اس شعبے نے فرہنگ کی تیاری اور اشاعت کے ساتھ ساتھ درسی کتابوں کی فراہمی اور ضرورت کو بھی نظرانداز نہیں کیا ۔ چنانچہ ایک جانب تو نصابی کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا جا رہا ہے ۔ اور دوسری جانب مختلف مضامین کے ماہر اساتذہ سے سلسلۂ درسیہ کے تحت مضامین بھی لکھوائے گئے ہیں ۔ چنانچہ اس سلسلے میں شعبے نے شماریات کے ۲۸ ۔ سیاسیات کے ۶۶ ریاضیات کے ۱۱ کیمیا کے ۳ ۔ حیوانیات کے ۳ ۔ علوم فطری کے ۳ ۔ نفسیات کے ۱۳ ۔ ارضیات کا ۱ ۔ معاشیات کے ۷ ۔ تاریخ عام کے ۴ ۔ اسلامی تاریخ کے ۱۷ اور عمرانیات کے گیارہ معیاری مضامین لکھوا کر شائع کر دیئے ہیں ۔ ہر پارے کی قیمت ۵۰ پیسے رکھی گئی ہے ۔

ادبی ، تعلیمی ، علمی اور تہذیبی خبریں

ادارۂ مصنفین کی ۹ ویں سالگرہ کراچی میں ۱۳ جنوری کو ادارۂ مصنفین پاکستان کی نویں سالگرہ کی تقریب میں چیف جسٹس پاکستان جناب ایس ۔ اے رحمان نے ادیبوں کو مشورہ دیا کہ انھیں جدت پسندی کے جوش میں اپنی روایات سے جو ہماری ثقافتی زندگی کا اہم جزو ہیں ۔ رشتہ منقطع نہیں کرنا چاہیئے ۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان ایک نوزائدہ ملک ہے لیکن وہ نظریاتی طور پر عظیم تاریخی روایات سے وابستہ ہے جس کی بنیاد صدیوں پہلے رکھی جا چکی ہے ۔ اس سے قبل ادارے کے معتمد جناب جمیل الدین عالی نے مہمان خصوصی کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی علمی اور ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ۔ جناب عالی نے صدر ایوب کو ادیبوں کی برادری میں شامل ہونے پر زبردست مبارک باد دی ۔ اور نئے انعامات کے سلسلے کا تعارف کرایا ۔ جناب ممتاز حسن نے فرمایا کہ ادیبوں پر جہاں معاشرے کی ذمے داریاں عاید ہوتی ہیں وہاں معاشرے پر ادیبوں کی بھی ذمے داری عائد ہوتی ہے ۔ جناب احمد ندیم قاسمی اور محبوب جمال زاہدی نے بھی خطاب کیا ۔ اجتماع میں روسی ادیبوں کے وفد کے سربراہ ۔ افریشیائی رائٹرز بیورو کے معتمد اور عوامی جمہوریہ چین کی رائٹرز کمیٹی کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے ۔ نویں سالگرہ کے موقع پر جن اردو انعامات کا اعلان کیا گیا ہے ۔ وہ یہ ہیں ۔ آدم جی ادبی انعامات ۔ پس پردہ (ڈرامہ) از مرزا ادیب ۵ ہزار روپے ۔ "شہرِ درد" از ادا جعفری (شعری مجموعہ) ۵ ہزار روپے ۔ اے ۔ ڈی ادبی انعامات ۔ پاکستان ناگزیر تھا از حسن ریاض (تاریخ) ۵ ہزار روپے ۔ ۶ ستمبر ادبی انعامات عزیز بھٹی شہید از اصغر علی ۵ ہزار روپے ۔ نیشنل بنک انعامات ۔ حیاتیات از ڈاکٹر احمد علی انور (سائنس) ۵ ہزار روپے ۔

جناب ممتاز حسن کا اعزاز پنجاب یونی ورسٹی نے اپنے حالیہ جلسۂ تقسیم اسناد میں ملک کے ممتاز دانش ور جناب

صحت مند ادب کی ترویج و اشاعت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ۔ یہ رسالہ اب ایک ادبی تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے اسے صرف اعلیٰ درجے کے ادیبوں ہی کا نہیں ملک کے ذہین قارئین کا بھی تعاون حاصل ہے ۔ مجھے امید ہے کہ صہبا لکھنوی صاحب آیندہ بھی " افکار" کے ذریعے اردو زبان کی خدمت انجام دیتے رہیں گے ۔"

ایک مباحثہ

جامعہ ملیہ ملیر میں ۱۰ فروری کو ایک بین الکلیاتی مباحثے میں مہمان خصوصی محترمہ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے جو خود بھی ادیبہ ہیں کہا کہ ہم اگرچہ آزاد ہو چکے ہیں تاہم بعض عناصر ہماری نئی نسل کے ذہنوں کو غیر ملکی نظریات میں ملوث کر رہے ہیں جو کافی خطرناک ہے، کیونکہ ہم حقیقی طور پر اپنی آزادی کا وقار اس وقت تک قائم نہیں رکھ سکتے جب تک ہمارے معاشرے کی روح غیر ملکی نظریات کو پرکھنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو ۔ انھوں نے فرمایا کہ غیر ملکی نظریات نے نہ صرف پاکستان بلکہ تمام اسلامی ممالک پر نہایت مہلک اثرات ڈالے ہیں ۔ اور آج مشرق وسطیٰ اور افریقی ممالک جس کشمکش میں مبتلا ہیں ۔ وہ غیر ملکی اثرات ہی کا نتیجہ ہیں ۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے طالبات کو مشورہ دیا کہ وہ اسلامی نظریۂ حیات کو اپنائیں اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہوں تاکہ غیر ملکی نظریات معاشرے میں جگہ نہ پاسکیں ۔ اس سے قبل ڈاکٹر محمود حسین نے مہمان خصوصی کا استقبال کرتے ہوئے ان کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات سے طلبہ اور طالبات کو روشناس کرایا ۔

جریدہ " علیگ "

علی گڑھ یونی ورسٹی کے قدیم طلبہ کی جانب سے ایک نیا جریدہ " علیگ " جاری کیا گیا ہے جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے گا ۔

اس آئینہ خانے میں

ڈاکٹر بوسانی کے ارشادات

اٹلی کے ممتاز مستشرق اور روم یونی ورسٹی میں اسلامیات کے استاد جناب پروفیسر ڈاکٹر الیگزنڈر بوسانی نے لاہور میں ۹ فروری کو پاکستان اسٹوڈنٹس کلب کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسلم ممالک میں یورپ کی تہذیب کی نقالی کی جارہی ہے اور دنیا میں ایسے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے جو عملی زندگی میں اسلام پر عمل پیرا ہیں ۔ بوسانی صاحب نے جو اطالوی میں جاوید نامہ کا ترجمہ کر چکے ہیں ۔ اقبال کے بارے میں کہا کہ اقبال کو اسلام اور مسلمانوں کا شاعر سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن اس کی شاعری میں یورپ کی اقوام کے لیے بھی پیغام موجود ہے اقبال نے زمانے سے سمجھوتہ نہ کرنے اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا جو سبق دیا ہے ۔ یورپ نے اس پر صحیح معنوں میں عمل کیا ہے جب کہ خود مسلمانوں نے اس سے سمجھوتہ کر لیا ہے ۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا خطاب

جامعہ کراچی کے شیخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے فرمایا ہے کہ ہمارے ملک کے سائنس دانوں کو نہ صرف معاشرے میں ان کا جائز مقام ملنا چاہیے بلکہ

کے ڈائرکٹر جناب احمد ندیم قاسمی جناب صوفی تبسم جناب شاکر علی اور اسرار احمد صاحب نے حصہ لیا۔ اس موقع پر جناب نے فرمایا کہ ادب برائے ادب کا نعرہ بے معنی ہے کیونکہ کوئی ادب خلا میں پشو و نما نہیں پا سکتا۔ فن اور ادب کا جو آمیز اور حیات آموز نہ ہو وہ رائیگاں ہے۔

جدیدیت کیا ہے؟ کراچی میں ۱۷ر فروری کو شعبۂ اردو جامعہ کراچی کے زیر اہتمام ایک مذاکرہ منعقد ہوا۔ جس کا عنوا کیا ہے؟" جس میں کراچی کے ممتاز اہل قلم اور دانشوروں نے حصہ لیا۔ مذاکرے کے صدر کی حیثیت چیف جسٹس پاکستان جناب ایس۔ اے۔ رحمان نے فرمایا کہ ہمیں مغرب کی اندھی تقلید کرنے کے بجائے ملکی روایات اور اقدا میں آگے بڑھنا ہوگا۔ انھوں نے مذاکرے کے علمی معیار کو سراہتے ہوئے کہا کہ جو حضرات اس بات پر معترض ہیں کہ علمی مضامین ا ادا نہیں کئے جا سکتے۔ ان کے لیے یہ مذاکرہ ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذاکرے میں جناب پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر سلیم الز ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، عزیز حامد مدنی، مجتبیٰ حسین اور جمیل جالبی نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور مغربی اثرات ادب اور معاشرے میں رونما ہونے والے عوامل کا تفصیلی جائزہ لیا۔

چار روسی دانش وروں کو قید لینن گراڈ کی ایک عدالت نے چار روسی دانش وروں کو مملکتی اختیارات پر قبضہ کی کوشش کے الزام میں سزائے قید سنادی۔ ان پر چھوٹے ہتھیار، مشین گنیں دستی بم جمع کرنے کا الزام ہے۔ قید کی مدت ۱۵ سال بتائی گئی ہے جو روسی قانون میں انتہائی سزا ہے۔

بزم مفکرین کا افتتاح کراچی میں ۱۹ر فروری کو بزم مفکرین کے افتتاح کے موقع پر جناب حکیم محمد سعید نے جو اس ت کے مہمان خصوصی تھے فرمایا کہ تعمیر ملت میں مفکرین اور دانش ور نہ صرف ہراول دستے کا کا دیتے ہیں۔ بلکہ ملت کا فکری رخ متعین کرتے ہیں اور اس کا نصب العین طے کرتے ہیں۔ جامعہ کراچی کی بزم مفکرین کی چ محترمہ حمیدہ قیصر نے مہمان خصوصی کا خیر مقدم کیا۔ اجلاس میں ڈاکٹر عالیہ امام اور اساتذۂ جامعہ نے بھی مقالے پڑھے۔

ماہنامہ افکار کی ۲۳ ویں سالگرہ کراچی میں ۲۲ر فروری کو ادبی ماہنامے "افکار" کی ۲۳ ویں سالگرہ کے موقع پر تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت کرتے ہوئے حکیم محمد سعید نے فرمایا کہ ادب ز کے حسن کو نکھارتا اور سنوارتا ہے اور ادیب جو معاشرے کے رجحانات اور احساسات کا ترجمان ہوتا ہے معاشرے کو آ دکھاتا ہے۔ اس تقریب میں حضرت جوش ملیح آبادی۔ جناب سبط حسن۔ جناب مختار زمن اور جناب مجتبیٰ حسین نے افکار اور مد کو خراج تحسین پیش کیا۔ سب سے قبل جناب صہبا لکھنوی مدیر افکار نے مہمان خصوصی کو خوش آمدید کہا۔ اس موقع پر انجمن کے صدر جناب اختر حسین کا مندرجہ ذیل پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔

"گزشتہ پچیس برس میں جن ادبی پرچوں نے اردو زبان اور ادب کی خدمت انجام دی ہے، ان میں "افکار" کو ایک امتیا حاصل ہے۔ اتنے عرصے تک کسی ادبی پرچے کا زندہ رہنا ہی ایک معجزہ ہے اور پھر "افکار" نے محض زندگی کا ثبوت ہی نہیں دیا

نے اقبال کی نظم سنائی۔ لندن میں ایک غیر معمولی پاکستانی فلم "علامہ اقبال" میفیر تھیٹر میں دکھائی گئی۔ جس کو مشہور پاکستانی فلم ساز اور ہدایت کار اے جے کاردار نے تیار کیا ہے۔ یہ فلم شاعر مشرق کے عالمی نظریات اور خیالات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل یہ فلم برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر کو بھی دکھائی گئی تھی جنھوں نے اس فلم کو بہت سراہا تھا۔

مولانا شوکت علی کو خراج عقیدت

کراچی میں ۱۵ فروری کو شوکت علی میموریل سوسائٹی کا افتتاحی جلسہ ہوا جس میں مولانا شوکت علی مرحوم کی ان ملی خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا جو انھوں نے ملک اور قوم کے لیے انجام دی تھیں۔ اس موقع پر ایران کے قونصل جنرل جناب جواد کوثر نے کہا کہ مولانا شوکت علی نے مسلم ممالک سے تعلقات پیدا کرنے کی جو مساعی کی ہیں ان کی بنا پر انھیں "اتحاد ثلاثہ" کے بانیوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے حافظ کا یہ شعر پڑھتے ہوئے۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کہا کہ یہ شعر مولانا شوکت علی پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ جلسے سے جناب حسین امام اور جناب ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نے بھی خطاب کیا۔ جناب عبدالقیوم نائب صدر شوکت میموریل سوسائٹی نے اعلان کیا کہ سوسائٹی ان کی یاد میں ایک لائبریری قائم کر رہی ہے۔

علامہ راشد الخیری اکادمی

کراچی میں ۲۳ جنوری کو مصور غم علامہ راشد الخیری کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر جلسے میں ایک اکادمی "علامہ راشد الخیری اکیڈمی" قائم کرنے کا اعلان ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ نے فرمائی۔ اکیڈمی کے مینجنگ ڈائرکٹر جناب رازق الخیری ہیں۔ اور ڈائرکٹروں میں محترمہ آمنہ نازلی۔ ملا واحدی۔ نواب صدیق علی خاں، رئیس احمد جعفری۔ ڈاکٹر یوسف عباس ہاشمی اور مشرق پاکستان اسمبلی کی اختر جہاں شامل ہیں۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا کی برسی

کراچی میں ۲۳ دسمبر کو مشہور ادیب جناب مولوی محمد یحییٰ تنہا کی پہلی برسی کے موقع پر علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے دفتر میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں تنہا صاحب کی علمی اور ادبی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا گیا۔ جلسے میں تنہا صاحب پر جناب جلیل احمد قدوائی جناب مختار زمن اور عندلیب میرٹھی نے مقالے پڑھے اور ڈاکٹر بشارت علی نے اپنی تقریر میں مرحوم کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی۔ صدر جلسہ جناب سید ہاشم رضا نے تنہا مرحوم کی علمی ادبی خدمات پر ان کو خراج تحسین پیش کیا۔

حمید نظامی کو خراج عقیدت

لاہور میں ۲۵ فروری کو نوائے وقت کے سابق مدیر اور صاحب کردار صحافی جناب حمید نظامی مرحوم کی برسی پورے جوش و عقیدت سے منائی گئی۔ اور ایک جلسہ بزم حمید نظامی کی جانب سے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں جناب اے۔ کے بروہی ــ

ان کی مکمل گاہیں سائنسی ساز و سامان سے آراستہ ہونی چاہییں - اور ان کے لیے اتنا فنڈ مہیا ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے تحقیقاتی کام کو یکسوئی کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔ شیخ الجامعہ ۱۵ فروری کو کراچی میں نباتاتی سائنس دانوں کی دوسری علاقائی کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے -

پروفیسر طاہر فاروقی کو دعوت

پروفیسر محمد طاہر فاروقی پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو پشاور یونی ورسٹی کو جو کہ اردو کے ادیب اور اقبال کے بہت اہم ناقد خیال کئے جاتے ہیں انقرہ یونی ورسٹی نے ترکی آنے کی دعوت دی ہے - جہاں وہ انقرہ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو اور مطالعہ پاکستان کے شعبے کے صدر کی حیثیت میں کام کریں گے - خیال ہے کہ پروفیسر طاہر فاروقی ۲ مارچ کو اپنے نئے اعزاز کو سنبھال لیں گے -

یادوں کے چراغ

بیادِ غالب

جیسے جیسے غالب کی صد سالہ برسی کا زمانہ قریب آتا جا رہا ہے۔ غالب کے پرستاروں کی سرگرمیاں تیز ہوتی جا رہی ہیں - ادارہ یادگارِ غالب کے مشاورتی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے جناب فیض احمد فیض نے ادیبوں اور ادبی اداروں سے تعاون کی اپیل کی ہے - اور اعلان کیا ہے کہ پاکستان کے مشہور مصور صادقین ایک مصور دیوان پیش کر رہے ہیں - اور خواجہ معین الدین نے غالب پر ایک نئے ڈرامے کی طرح ڈالی ہے جناب فیض احمد فیض نے یہ بھی بتایا کہ وزارت مواصلات نے ادارے کی درخواست پر صد سالہ برسی کا یادگاری ٹکٹ جاری کرنے کا وعدہ کیا ہے گورنمنٹ کالج جھنگ کے ایک اطلاع نامے کے مطابق کالج کا جریدہ "کارواں" اردو کے اس عظیم شاعر کی یاد میں غالب نمبر پیش کر رہا ہے - اور ایک انعامی مقابلے کا بھی اعلان کر رہا ہے جس میں صرف کالج اور یونی ورسٹی کے طلبہ شامل ہو سکتے ہیں - مضمون: غالب میری نظر میں (۵ سو الفاظ) انعام ۵۰ روپے - غالب کے نام ایک خط (غالب کے انداز میں ۴ سو الفاظ) انعام ۲۵ روپے طرحی غزل: مصرع طرح "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے" انعام ۲۵ روپے -

شاعرِ مشرق کی یاد میں

کراچی میں ۴ فروری کو موتی لال نہرو روڈ پر اقبال لائبریری کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کمشنر کراچی دربار علی شاہ نے ملک کے نام مخیر حضرات سے اپیل کی ہے - کہ وہ ان تمام رہنماؤں کی جنھوں نے ملک اور قوم کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں شایانِ شان یادگار قائم کریں - انھوں نے شاعرِ مشرق کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے حبیب بنک اور بلدیہ کراچی کا شکریہ ادا کیا جن کے تعاون سے لائبریری کا قیام عمل میں آ رہا ہے جناب یعقوب نوری نے اعلان کیا کہ علامہ اقبال شایانِ شان یادگار تعمیر کرنے کے لیے میر نبی بخش نے ایک ہزار فٹ سنگِ مرمر دینے کی پیش کش کی ہے - لائبریری کی عمارت تین منزلوں پر مشتمل ہو گی - جس میں لائبریری حبیب بنک قائم ہو گا - اس موقع پر اولڈ راوین ایسوسی ایشن کے معتمد جناب صفدر علی شاہ نے بھی تقریر کی - بلدیہ کے افسر اطلاعات جناب فضل احمد صدیقی نے نظم پڑھی - اور استاد امراؤ بندو خاں

نے اقبال کی نظم سنائی ۔ لندن میں ایک غیر معمولی پاکستانی فلم " علامہ اقبال" میفیر تھیٹر میں دکھائی گئی ۔ جس کو مشہور پاکستانی فلم ساز اور ہدایت کار اے جے کاردار نے تیار کیا ہے ۔ یہ فلم شاعر مشرق کے عالمی نظریات اور خیالات کے تعارف پر مشتمل ہے ۔ اس سے قبل یہ فلم برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر کو بھی دکھائی گئی تھی جنھوں نے اس فلم کو بہت سراہا تھا ۔

مولانا شوکت علی کو خراج عقیدت

کراچی میں ۱۵ر فروری کو شوکت علی میموریل سوسائٹی کا افتتاحی جلسہ ہوا جس میں مولانا شوکت علی مرحوم کی اُن ملّی خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا جو انھوں نے ملک اور قوم کے لیے انجام دی تھیں ۔ اس موقعے پر ایران کے قونصل جنرل جناب جواد کوثر نے کہا کہ مولانا شوکت علی نے مسلم ممالک سے تعلقات پیدا کرنے کی جو مساعی کی ہیں اُن کی بنا پر انھیں " اتحاد ثلاثہ " کے بانیوں میں شمار کیا جانا چاہیئے ۔ انھوں نے حافظ کا یہ شعر پڑھتے ہوئے ۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کہا کہ یہ شعر مولانا شوکت علی پر پوری طرح صادق آتا ہے ۔ جلسے سے جناب حسین امام اور جناب ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نے بھی خطاب کیا ۔ جناب عبدالقیوم نائب صدر شوکت میموریل سوسائٹی نے اعلان کیا کہ سوسائٹی ان کی یاد میں ایک لائبریری قائم کر رہی ہے ۔

علامہ راشد الخیری اکادمی

کراچی میں ۲۳ر جنوری کو مصور غم علامہ راشد الخیری کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر جلسے میں ایک اکادمی " علامہ راشد الخیری اکیڈمی " قائم کرنے کا اعلان ہوا ۔ جس کی صدارت ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ نے فرمائی ۔ اکیڈمی کے مینجنگ ڈائرکٹر جناب رازق الخیری ہیں ۔ اور ڈائرکٹروں میں محترمہ آمنہ نازلی ۔ ملا واحدی ۔ نواب صدیق علی خاں، رئیس احمد جعفری ۔ ڈاکٹر یوسف عباس ہاشمی اور مشرقی پاکستان اسمبلی کی اختر جہاں شامل ہیں ۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا کی برسی

کراچی میں ۲۳ر دسمبر کو مشہور ادیب جناب مولوی محمد یحییٰ تنہا کی پہلی برسی کے موقع پر علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے دفتر میں ایک جلسہ منعقد ہوا ۔ جس میں تنہا صاحب کی علمی اور ادبی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا گیا ۔ جلسے میں تنہا صاحب پر جناب جلیل احمد قدوائی جناب مختار زمن اور عندلیب میرٹھی نے مقالے پڑھے اور ڈاکٹر بشارت علی نے اپنی تقریر میں مرحوم کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی ۔ صدر جلسہ جناب سید ہاشم رضا نے تنہا مرحوم کی علمی ادبی خدمات پر اُن کو خراج تحسین پیش کیا ۔

حمید نظامی کو خراج عقیدت

لاہور میں ۲۵ر فروری کو نوائے وقت کے سابق مدیر اور صاحب کردار صحافی جناب حمید نظامی مرحوم کی برسی پورے جوش و عقیدت سے منائی گئی ۔ اور ایک جلسہ بزم حمید نظامی کی جانب سے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ جس میں جناب اے ۔ کے بروہی نے

ان کی مکمل گاہیں سائنسی ساز و سامان سے آراستہ ہونی چاہئیں - اور ان کے لیے اتنا فنڈ مہیا ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے تحقیقی کام کو یکسوئی کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔ شیخ الجامعہ ۱۵ فروری کو کراچی میں نباتاتی سائنس دانوں کی دوسری علاقائی سے خطاب کر رہے تھے۔

پروفیسر طاہر فاروقی کو دعوت

پروفیسر محمد طاہر فاروقی پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو پشاور یونی ورسٹی کو جو کہ اردو کے ادیب اور اقبال کے بہت اہم ناقد خیال کئے جاتے ہیں انقرہ یونی ورسٹی نے آنے کی دعوت دی ہے - جہاں وہ انقرہ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو اور مطالعہ پاکستان کے شعبے کے صدر کی حیثیت میں کام کریں گے - خیال ہے کہ پروفیسر طاہر فاروقی ۲ مارچ کو اپنے نئے اعزاز کو سنبھال لیں گے۔

یادوں کے چراغ

بیادِ غالب

جیسے جیسے غالب کی صد سالہ برسی کا زمانہ قریب آتا جا رہا ہے۔ غالب کے پرستاروں کی سرگرمیاں تیز ہوتی جا رہی ہیں - ادارہ یادگار غالب کے مشاورتی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے جناب فیض احمد فیض نے ادیبوں اور ادبی اداروں سے تعاون کی اپیل کی ہے - اور اعلان کیا ہے کہ پاکستان کے مشہور مصور صادقین ایک مصور دیوان پیش کر رہے ہیں - اور خواجہ معین الدین نے غالب پر ایک نئے ڈرامے کی طرح ڈالی ہے جناب فیض احمد فیض نے یہ بھی بتایا کہ وزارت مواصلات نے ادارے کی درخواست پر صد سالہ برسی کا یادگاری ٹکٹ جاری کرنے کا وعدہ کیا ہے

گورنمنٹ کالج جھنگ سے ایک اطلاع نامے کے مطابق کالج کا جریدہ "کارواں" اردو کے اس عظیم شاعر کی یاد میں غالب نمبر پیش کر رہا ہے - اور ایک انعامی مقابلے کا بھی اعلان کر رہا ہے جس میں صرف کالج اور یونی ورسٹی کے طلبہ شامل ہو سکتے ہیں - مضمون: غالب میری نظر میں (۵ سو الفاظ) انعام ۵۰ روپے - غالب کے نام ایک خط (غالب کے انداز میں ۴ سو الفاظ) انعام ۲۵ روپے طرحی غزل: مصرع طرح " مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے" انعام ۲۵ روپے۔

شاعر مشرق کی یاد میں

کراچی میں ۲۱ فروری کو موتی لال نہرو روڈ پر اقبال لائبریری کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کمشنر کراچی دربار علی شاہ نے ملک کے نام مخیر حضرات سے اپیل کی ہے کہ وہ ان تمام رہنماؤں کی جنھوں نے ملک اور قوم کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں شایان شان یادگار قائم کریں - انھوں نے شاعر مشرق کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے حبیب بنک اور بلدیہ کراچی کا شکریہ ادا کیا جن کے تعاون سے لائبریری کا قیام عمل میں آرہا ہے جناب یعقوب توفیق نے اعلان کیا کہ علامہ اقبال شایان شان یادگار تعمیر کرنے کے لیے میر نبی بخش نے ایک ہزار فٹ سنگ مرمر دینے کی پیش کش کی ہے۔ لائبریری کی عمارت تین منزلوں پر مشتمل ہوگی - جس میں لائبریری حبیب بنک قائم ہوگا - اس موقع پر اولڈ راوین ایسوسی ایشن کے معتمد جناب صفدر علی شاہ نے بھی تقریر کی - بلدیہ کے افسر اطلاعات جناب فضل احمد صدیقی نے نظم پڑھی - اور استاد امراؤ بندو خاں

دیش کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے ۔ ڈاکٹر گوبند گڈکر نے ہندی کے حامیوں کو ہندو توسیع پسند قرار دیتے ہوئے کہا کہ میں ایسے دیش کا شہری رہنا نہیں چاہتا جہاں سیاسی پارٹیاں اس طرح زبان کے نام پر لڑتی رہیں ۔

ساہتیہ اکادمی کے انعامات

ساہتیہ اکادمی نے ۱۹۶۷ء کی بہترین تخلیقات پر انعامات کا اعلان کر دیا ہے ۔ ایک جلسے میں جو اکادمی کے صدر جناب ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارت میں ہوا منتخب کتابوں کا اعلان کیا گیا ۔ اردو کے لیے ممتاز اور منفرد ادیبہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے مجموعے پت جھڑ کو منتخب کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ ہندی ، انگریزی ، بنگالی ، کاشمیری ، پنجابی ، آسامی ، گجراتی ، کناڑی ، ملیالم ، مرہٹی ، سنسکرت اور تامل کی تصانیف پر بھی انعامات کا اعلان کیا گیا ۔

فراق گورکھپوری کا خیال

مجلس فکر و ادب لکھنؤ کے زیر اہتمام ایک مذاکرے میں تقریر کرتے ہوئے اردو کے بہترین غزل گو اور نقاد جناب فراق گورکھپوری نے کہا کہ ہندی اور اردو کے باہمی ارتباط اور اردو کی بقا کا مسئلہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آنے والا دور اردو کا دور ہوگا ۔ آپ نے کہا کہ ہندی پرست بہت جلد یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ وہ اردو گرامر کے آج بھی ویسے ہی محتاج ہیں ۔ جیسے کلکتے کے مدرسے کے عہد میں تھے ۔ انھوں نے ہندی اور اردو کا تقابل کرکے یہ ثابت کیا کہ اردو میں جو شہریت ہے وہی اس کی بقا کی ضامن ہے ۔ انھوں نے ہندی فرقہ پرست عناصر اور متعصب ہندی پرستوں کو متنبہ کیا کہ آئندہ مورخ ان کی تنگ نظری اور اس کے پیدا کردہ نقصانات کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا ۔

دہلی میں ایک مطالبہ

دہلی میٹرو پالیٹن کونسل کی کانگریس پارٹی کے لیڈر شیو چرن گپت نے مطالبہ کیا ہے کہ اردو اور پنجابی کو دہلی میں دوسری زبان کا درجہ دے دیا جائے ۔ انھوں نے کہا کہ پچھلی مردم شماری کے بموجب دہلی میں اردو اور پنجابی بولنے والوں کا تناسب تقریباً برابر ہے ۔ جب کہ دوسری زبانوں کے مقابلے میں پنجابی کو ترجیح حاصل ہے ۔ مگر پنجابی بھی اردو بولتے ہیں ۔

اردو محافظ دستہ بریلی

اردو محافظ دستہ بریلی کے اراکین نے محبان اردو سے اپیل کی ہے کہ وہ ان دوکانوں کا بائیکاٹ کریں جن کے بورڈوں پر اردو نہ لکھی ہوئی ہو ۔ انھوں نے اپنے جلسے میں کہا کہ کروڑوں اردو بولنے والوں کے جذبات کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

اردو اور محکمہ ڈاک

مشہور ادیب سری نواس لاہوٹی نے انکشاف کیا کہ حیدر آباد سے ایک خط اردو میں نظام آباد لکھا گیا جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ ایک ماہ بعد انھیں ملا ۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو پتے کو پڑھوانے کے لیے اسے پھر حیدر آباد بھیجا گیا ۔ انھوں نے اس بات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے محکمہ ڈاک کی کارکردگی پر سخت تنقید کی ۔

مولانا عبدالستار نیازی - جناب جاوید اقبال - ملک اسلم حیات اور شورش کاشمیری نے خطاب کیا - اور تحریک پاکستان کے سلسلے میں مرحوم کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا - ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا کہ مرحوم اردو کے زبردست حامی تھے اور ہمیشہ اس بات کے کوشاں رہے کہ اردو کو پاکستان میں صحیح مقام ملنا چاہیئے -

ماتم میں ہم شریک

مولانا ارشد تھانوی کا انتقال پاکستان کے ممتاز شاعر - انشاپرداز اور ریڈیو کے قلم کار جناب مولانا ارشد تھانوی نے ۸۰ سال کی عمر میں ۲ فروری کو کراچی میں بوقت سہ پہر داعی اجل کو لبیک کہا - اناللہ وانا الیہ راجعون - مرحوم کافی عرصے سے بیمار تھے - مگر ان کی وہ بذلہ سنجی اور ہوش مندی آخر تک قائم رہی - جس کی وجہ سے وہ ادب میں کافی مشہور تھے - مرحوم شوکت تھانوی کے چچا زاد بھائی اور سلمان الارشد مدیر ماہنامہ الشجاع کے والد بزرگوار تھے ہمیں سلمان الارشد اور دیگر پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے - اور خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو فردوس بریں میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے -

بزم لکھنؤ کا آخری چراغ بجھ گیا اطلاع ملی ہے کہ دبستان لکھنؤ کے ممتاز غزل گو اور اردو کے مشہور شاعر حضرت سراج لکھنوی نے ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء کو بعمر ۷۰ سال رحلت فرمائی - اناللہ وانا الیہ راجعون - سراج لکھنوی خاندان انیس کے ممتاز غزل گو اور پیارے صاحب رشید کے شاگرد تھے - سراج لکھنوی نے دبستان لکھنؤ کے آخری زمانے کے بہترین شاعروں کے جھرمٹ میں ناموری حاصل کی جن میں صفی، عزیز، ثاقب، محشر اور یگانہ جیسے مشاہیر شامل تھے اور اس زمانے میں عہد زریں کی یادگار تھے - ادارۂ قومی زبان اس سانحہ پر دلی افسوس کا اظہار کرتا ہے -

اردو کے نامور ادیب ایم اسلم کو صدمہ اردو کے مایہ ناز ادیب و انشاپرداز جناب ایم اسلم کی اہلیہ محترمہ نے ۵۸ سال کی عمر میں انتقال کیا - اناللہ وانا الیہ راجعون - مرحومہ تین سال سے علیل تھیں، بالآخر ۱۲ فروری ۱۹۶۸ء کو ان کا انتقال ہوگیا - اس حادثے پر ادارہ قومی زبان جناب ایم اسلم اور مرحومہ کے دیگر پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا ہے کہ مرحومہ کو اللہ تعالیٰ اپنی جوار رحمت میں جگہ دے -

آئینۂ ہند

ایک مشورہ ایک تنبیہ وائس چانسلر بمبئی یونی ورسٹی جناب ڈاکٹر گجیندر گڈکر نے زور دیا ہے کہ سیاسی پارٹیوں کو چاہیئے کہ وہ کم سے کم کچھ دنوں کے لیے زبان کے مسئلے کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیں ورنہ

نئے خزانے

موضوعات

مدراس اسمبلی کا فیصلہ مدراس اسمبلی نے ایک سرکاری قرارداد منظور کرکے اسکولوں کے لیے سہ لسانی فارمولے کو دولسانی سے بدل دیا ہے۔ اور فیصلہ کیا ہے کہ مدراس کے اسکولوں میں تامل اور انگریزی پڑھائی جائے اور ہندی نہ پڑھائی جائے۔

انجمن ترقی اردو کا چوتھا کنونشن انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے کارکنوں کا چوتھا کنونشن ۶، ۷ ؍ جنوری کو اردو ہال حیدرآباد میں منعقد ہوا جس میں ۱۵ اضلاع سے ۵۲ شاخوں کے اہم نمائندوں نے شرکت کی۔ جلسے سے پروفیسر حبیب الرحمان، نواب میر احمد علی خاں، ڈاکٹر حسینی شاہد اور دیگر کارکنان اردو نے خطاب کیا۔ اس کے علاوہ ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر عباس عارف نمائندہ اعلیٰ عرب لیگ اور مہاراجہ ہماچل پردیش نے بھی خطاب کیا۔ اور پروفیسر عبد القادر سروری۔ آل احمد سرور اور پنڈت آنند نرائن ملا نے اردو کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کنونشن میں یہ تجویز بھی زیر غور آئی کہ ایک کل ہند اردو کانفرنس جلد از جلد منعقد کی جائے اس موقع پر جو قراردادیں پیش کی گئیں اور با اتفاق منظور ہوئیں۔ ان میں قابل ذکر یہ ہیں۔ اردو کو آندھرا پردیش کی دوسری علاقائی زبان تسلیم کرلیا جائے۔ اردو کالج قائم کیے جائیں۔ میٹرکولیشن امتحانات میں اردو میڈیم بھی اختیار کیا جائے۔ شعبۂ تعلیم کو پنچایت راج سے فوراً علیحدہ کردیا جائے۔ اس کے علاوہ تعلیمی مسائل پر بہت سے مطالبات منظور کیے گئے۔ اور حکومت آندھرا پردیش سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ جلد از جلد ایک اعلامیہ میں اردو کے موقف اور دائرۂ عمل کی وضاحت کرے۔

ماہنامہ	صبا	حیدرآباد دکن	جنوری تا مارچ، اگست و اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۶ء
"	صبح	دہلی	جون تا دسمبر "
"	صبح امید	بمبئی	جولائی، اگست، اکتوبر تا دسمبر "
"	صبح نو	پٹنہ	جولائی "
"	صحیفہ	لاہور	" "
—	صریر خامہ (سندھ یونیورسٹی) حیدرآباد		"
ماہنامہ	طلوع اسلام	لاہور	جولائی تا دسمبر "
"	عالمی ڈائجسٹ	کراچی	جولائی، ستمبر و دسمبر "
"	فاران	"	جون، نومبر و دسمبر "
"	فروغ اردو		دسمبر "
"	فکر و خیال	"	جولائی تا نومبر "
"	فکر و نظر	راولپنڈی	نومبر "
—	فنون	لاہور	اکتوبر ۱۹۶۵ء و جولائی اگست ۱۹۶۶ء
ماہنامہ	قومی زبان	کراچی	جولائی تا دسمبر ۱۹۶۶ء
—	کاروان سائنس	"	جلد ۴ نمبر ۴
ماہنامہ	کتاب	لاہور	جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر ۱۹۶۶ء
"	"	لکھنؤ	اگست تا دسمبر "
"	کتابی دنیا	کراچی	جون تا ستمبر "
ماہنامہ	ماہ نو	"	جولائی تا اکتوبر "
—	مجلہ ادارہ تحقیقات پاکستان، لاہور		جولائی "
ماہنامہ	محفل	لاہور	جون، جولائی و دسمبر "
"	معارف	اعظم گڑھ	جولائی تا دسمبر "
—	معاصر	پٹنہ	نمبر ۱۲
ماہنامہ	میثاق	لاہور	جولائی و اگست ۱۹۶۶ء
"	نصرت (۱۷)	"	اگست و دسمبر "
"	نظام	کانپور	مارچ اپریل ۱۹۶۵ء و نومبر ۱۹۶۶ء
"	نقش	کراچی	افسانہ نمبر ۱۹۶۶ء، جون و ستمبر تا دسمبر "
—	نقوش	لاہور	نمبر ۱۰۸ ستمبر ۱۹۶۶ء
ماہنامہ	نگار پاکستان	کراچی	ستمبر تا دسمبر "
"	نئی قدریں	حیدرآباد	نمبر ۳، ۴ و ۸ "
"	نیرنگ خیال	لاہور	اگست و ستمبر "
"	وائس آف اسلام	کراچی	اگست "
"	ہمالیہ	دہلی	جون تا نومبر "
"	ہمدرد صحت	کراچی	جولائی تا ستمبر و نومبر دسمبر "
"	ہندوستانی ادب	حیدرآباد دکن	اپریل تا دسمبر "
—	یادگار اشاعت بتقریب یوم سرسید کراچی		"
ہفت روزہ	اخبار جہاں	کراچی	جولائی تا دسمبر "
"	المنبر	لائلپور	" " "
"	آئین	لاہور	
"	جہاں نما	"	
"	چٹان	"	جولائی تا دسمبر ۱۹۶۶ء
"	شہاب	"	" " "
"	صدق جدید	لکھنؤ	" " "
"	قندیل	لاہور	" " "
"	لاہور	"	" " "
"	ہماری زبان	علی گڑھ	" " "
پندرہ روزہ	ترقی اردو	حیدرآباد دکن	
"	ساغر	کراچی	
"	صحیفہ اہل حدیث	"	
روزنامہ	امروز	لاہور	جمعہ وار اتوار ایڈیشن
"	جنگ	کراچی	" "
"	کوہستان	لاہور	" "
"	مشرق	کراچی	" "

اس اشاریے کی ترتیب میں جولائی تا دسمبر ۱۹۶۱ء کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے
بعض رسائل اس سے پہلے کے ہیں جو بر وقت دستیاب نہ ہو سکے تھے

ماہنامہ	ادب لطیف	لاہور	نومبر ۶۱ء
دوماہی	ادبی تبصرے	دہلی	〃 〃
ماہنامہ	ادبی دنیا	لاہور	اگست و اکتوبر 〃
سہ ماہی	اردو	کراچی	جولائی، اکتوبر 〃
〃	اردو ادب	علی گڑھ	نمبر ا و ۲ 〃
ماہنامہ	اردو ڈائجسٹ	لاہور	جولائی، ستمبر، نومبر 〃
〃	اردو زبان	سرگودھا	جولائی تا ستمبر و نومبر دسمبر 〃
سہ ماہی	اردو نامہ	کراچی	جون و اکتوبر 〃
ماہنامہ	ارژنگ	پشاور	جولائی اگست اکتوبر نومبر
〃	ارشاد	حیدر آباد دکن	ستمبر اکتوبر ۶۱ء
—	ارمغان (پنجاب یونیورسٹی)	لاہور	۱۹۶۰ء
ماہنامہ	افکار	کراچی	جولائی تا دسمبر 〃
〃	البلاغ	بمبئی	اگست دسمبر 〃
〃	الجامعہ	محمدی شریف (جھنگ)	جولائی اگست و اکتوبر تا دسمبر
〃	الرحیم	حیدر آباد	جولائی اگست و اکتوبر تا دسمبر
—	الزبیر	بہاولپور (کتب خانہ نمبر)	شمارہ ۱۱ ۶۱ء
ماہنامہ	الشجاع	کراچی	جولائی تا ستمبر 〃
سہ ماہی	العلم	〃	اپریل، جولائی، اکتوبر 〃
ماہنامہ	انجمن اسلامیہ میگزین	〃	مئی تا اگست و اکتوبر تا دسمبر 〃
〃	انوار اسلام	رام نگر (بنارس)	جولائی، ستمبر، اکتوبر، دسمبر 〃
—	اوراق	لاہور	نمبر ۳ ۱۹۶۱ء
ماہنامہ	آجکل	دہلی	مئی جولائی تا نومبر ۶۱ء
〃	برہان	〃	جولائی اگست و اکتوبر تا دسمبر 〃

سہ ماہی	بصائر	کراچی	جولائی و اکتوبر ۶۱ء
ماہنامہ	بینات	〃	ربیع الثانی تا رمضان ۸۱ھ
〃	پیام حق	〃	نومبر دسمبر ۶۱ء
〃	تجلی	دیوبند	ستمبر تا دسمبر 〃
〃	تحریک	دہلی	جولائی، اگست و اکتوبر تا دسمبر
—	تخلیق	لاہور	نمبر ۳ 〃
ماہنامہ	ترجمان القرآن	〃	جولائی تا دسمبر 〃
—	تعلیم و تدریس	〃	اکتوبر 〃
—	ثانوی تعلیم	〃	جون و دسمبر 〃
ماہنامہ	ثقافت	〃	جولائی تا دسمبر 〃
〃	جامعہ	دہلی	جولائی، اگست و دسمبر 〃
〃	جام نو	کراچی	نومبر 〃
〃	چراغ راہ	〃	جولائی تا ستمبر و نومبر دسمبر 〃
〃	خاتون دکن	حیدر آباد دکن	جون تا دسمبر 〃
〃	رہنمائے تعلیم	دہلی	جولائی و نومبر 〃
〃	زندگی	رام پور	جولائی، اگست و اکتوبر تا دسمبر 〃
〃	ساقی	کراچی	اکتوبر نومبر 〃
〃	سب رس	حیدر آباد دکن	جولائی تا دسمبر 〃
〃	سویرا	لاہور	جولائی اگست 〃
〃	سیارہ	〃	جولائی تا دسمبر 〃
〃	سیارہ ڈائجسٹ	لاہور	اپریل جولائی اگست 〃
—	سیپ	کراچی	نمبر ۱۰ 〃
ماہنامہ	شان ہند	دہلی	جون تا اگست و اکتوبر تا دسمبر 〃

اندرجیت لعل	تذکرہ رنگیں (فسانۂ آزاد)	سب رس، ص ۵۰ تا ۶۵، ستمبر
اوصاف احمد	قومی زندگی اور ادب کے مسائل	کتاب لکھنؤ، ص ۵ تا ۱۲، ستمبر
بدیع حسینی	دکنی متن کی تدوین	ترقی اردو، ص ۷ تا ۱۸، ۱۶ اگست
برجیس سلطانہ صدیقی	فسانۂ عجائب میں سرور کا علمی اور ادبی مذاق	صریر خامہ، ص ۱۹۸ تا ۲۰۰
بیگم افضل کاظمی	ادب کی ابدیت کا گہوارہ — زماد	افکار، ص ۲۵ تا ۳۱، دسمبر
پروین عالم	ادب اور نفسیات	تحریک، ص ۱۷ تا ۱۸، اگست
تحسین سروری	اردو ادب کے غیر ادبی ماخذ	قومی زبان، ص ۷۰ تا ۹۰، جولائی
جاوید اختر	سب رس پر ایک نظر	ہندوستانی ادب، ص ۱۲ تا ۱۸، ستمبر
جاوید وششٹ، پروفیسر	ایک نظر دکنی رباعیاں (ڈاکٹر سید جعفر) پر	ہمایوں، ص ۶۶ تا ۷۰، نومبر
جلیل آغا، پروفیسر	فن اور شخصیت	صریر خامہ، ص ۴ تا ۱۶
جوش ملسیانی	پرانی یادیں	آجکل، ص ۴ تا ۱۲، نومبر
جوہر، مولانا محمد علی	تقریظ (مجموعہ کلام داؤد مرحوم)	مجلہ یادگار، ص ۴۵ تا ۵۷
حبیب الرحمان صدیقی	سردار جعفری کی غزل اور بحر متقارب کے متعلقہ اوزان	ہماری زبان، ص ۳، ۴، ۶+۷، ۱۲۶۷، ۸ اگست
حسرت کاس گنجوی	ترقی پسند تحریک اور اس کا پس منظر	سب رس، ص ۱۱ تا ۱۹، ستمبر
حسن (عطا) کاکوی، سید	تذکرہ ریاض الوفاق (ضمیمہ)	معاصر، ص ۱ تا ۹۴، جولائی
حسنین پاشا، سید	ادب کیا ہے؟	قندیل، ص ۱۴، ۲۷ ستمبر
خاطر غزنوی، پروفیسر	ہمارا قومی ثقافتی ورثہ ادب	صریر خامہ، ص ۲۵ تا ۲۹
دیویندر اسّر	ادب کی تخلیق میں خطرہ ایمان بھی ہے اور خطرہ جان بھی	صبح نو، ص ۷ تا ۱۰، دسمبر
	جدید ادب اور کرائسس	نیرنگ خیال، ص ۴ تا ۱۷، نومبر
ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین	طبقات شعرائے ہند اور مولوی کریم الدین	صحیفہ، ص ۹ تا ۳۰، جولائی
رخشاں ابدالی	مسدس اختر بہاری	قومی زبان، ص ۳۹ تا ۵۰، اگست
رشید احمد صدیقی، پروفیسر	علی گڑھ کے مشاعرے	مجلہ یادگار، ص ۳۹ تا ۴۰
رشید ملک	فکر و سخن کی باتیں	قندیل، ص ۱۴، ۱۳ ستمبر
رفعت	خواتین کا ادب	کتاب لکھنؤ، ص ۱۲ تا ۲۳، نومبر

اردو ادب

ادبی مسائل و مباحث اور عملی تحقیق

ابراہیم جلیس	دنیا کے صاحب ضمیر ادیبوں سے ایک سوال	افکار، ص ۷۲ تا ۷۴، جولائی
احمد ندیم	ادب میں پسند اور ناپسند کا مسئلہ	امروز، ص ۵، ۱۲ نومبر
"	۲۔ افریشیائی دانشوروں کے فرائض	" " ۵، ۱۶ جولائی
"	۳۔ پاکستان کی نئی نسل اور جدید ادب	اردو زبان، ص ۱۱ تا ۱۴، اگست ستمبر
"	۴۔ پاکستانی ادب میں قومی شعور کا مسئلہ	امروز، ص ۵، ۲۷ اگست
"	۵۔ پاکستانی ادب اور پاکستان	" " ۵، ۱۷ ستمبر
"	۶۔ جدید معاشرے میں انفرادیت پرستی کا المیہ	" " ۵، ۱۰ "
"	۷۔ حقیقت نگاری کی مخالفت کا فیشن	" " ۵، ۲۴ دسمبر
"	۸۔ کچھ شاعروں اور شاعری کے بارے میں	" " ۵، ۳ دسمبر
"	۹۔ کیا مادی ترقی کے لیے ہمیں اپنی ثقافت کو ترک کرنا ہوگا	" " ۵، ۱۵ اکتوبر
"	۱۰۔ مغرب کی شاعری کے چند نمونے	" " ۷، ۲۲ اکتوبر
اختر، شیر محمد	زہریلا ادب	قندیل، ص ۳، ۲۳ جولائی
اخلاص، کشن چند		
وحید قریشی (مرتب)	تذکرہ ہمیشہ بہار	اردو، ص ۱ تا ۱۱۲، اکتوبر
اسعد گیلانی	ادب میں اسلامی تحریک کا مسئلہ	سیارہ، ص ۳۳ تا ۴۰، اگست
افتخار جالب	فی بطن شاعر	سویرا، ص ۶ تا ۳۲، جولائی اگست
الطاف علی بریلوی، سید	انشائیے — ایک تعارف	العلم، ص ۹ تا ۸۲، جولائی تا ستمبر
الیاس عشقی	شاعری اور تلازمۂ خیالات	صریر خامہ، ص ۱ تا ۱۳
امجد افضال	مسدس حالی اور مقدمہ شعر و شاعری	شرق، ص ۳، یکم جنوری
امن، گوپی ناتھ	دلی کی ادبی نشستیں	آجکل، ص ۳ تا ۸، اکتوبر
امیر الدین خاں جے پوری، مولوی	۱۹۳۵ء کی ایک یادگار آل انڈیا مشاعرہ	العلم، ص ۹۷ تا ۱۰۶، اکتوبر تا دسمبر
امین فاروقی	ترقی پسند ادب اور ہمارا معاشرہ	صریر خامہ، ص ۱۸۹ تا ۱۹۶

عارف جمالی	ادب اور انقلاب	فکر و خیال، ص ۴۵ تا ۵۸، جولائی
عاطر ہاشمی	اردو میں جنگی ادب	لاہور، ص ۵ ۱۲۰، ۳۰ اکتوبر
عبدالستار، قاضی	ادب میں شعور کی رو	الشجاع، ص ۱۹ تا ۲۳، اگست ستمبر
عبداللہ، پروفیسر محمد	ادب اور آرٹ میں اخلاق	سیارہ، ص ۱۳ تا ۲۶، اکتوبر
عتیق صدیقی	ایک تذکرہ جو لکھا نہ جا سکا (کشکول۔ بہاء الدین بشیر)	صبح، ص ۷ تا ۱۵، جون تا ستمبر
عطا، محمد محسن	نذیر احمد کے بڑے کردار	صریر خامہ، ص ۵۵ تا ۶۰،
عطا کاکوی	طبقات الشعرائے ہند طبقہ سوم مع تعلیقات (ضمیمہ)	معاصر، ص ۱ تا ۹۶، جولائی
عظیم اقبال	"خدا کی بستی" فن کے آئینے میں	شاعر، ص ۲۰ تا ۲۳، اکتوبر نومبر
عظیم صدیقی	شعر کے وزن کے بارے میں	ہماری زبان، ص ۸ تا ۹، ۲۲ جنوری
عقل دانش	انشا کی رانی کیتکی	فکر و خیال، ص ۵۹ تا ۶۳، جولائی
علی عباس جلال پوری، سید	روحِ عصر (۲)	فنون، ص ۱۰۵ تا ۱۲۷، اکتوبر
" "	" (۴)	" ص ۴۴ تا ۵۹، جولائی و اگست
غلام السیدین، خواجہ	ادب کے زاویے[1]	ارشاد، ص ۴۳ تا ۴۶، ستمبر اکتوبر
غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر	ترک اور اردو شعرا	صریر خامہ، ص ۷۲ تا ۸۱،
غیور عالم	سب رس اور اسلوب بیان	قومی زبان، ص ۱۳ تا ۴۴، دسمبر
فرزانہ حمید	شمالی ہند کے ابتدائی نثری کارنامے	سب رس، ص ۲۵ تا ۲۷، جولائی
قدرت نقوی، سید	معادل کی تلاش	قومی زبان، ص ۸۵ تا ۹۲، اگست
کبیر احمد جائسی	ادب اور نفسیات	ادبی دنیا، ص ۹ تا ۱۶، اکتوبر
کریمی الاحسانی	مشاعرہ نمائش مظفر نگر	شان ہند، ص ۹ تا ۱۴، جون
گوپال متل	ترقی پسندی کیا ہے؟	تحریک دہلی، ص ۱۰ تا ۱۳، ستمبر
متعدد حضرات	جدیدیت	شاعر، ص ۷۶ تا ۸۰، اکتوبر نومبر
مجیب، پروفیسر محمد	ریڈیو تقریر	جامعہ، ص ۲۸۷ تا ۲۹۰، دسمبر
محفوظ الحسن، سید	قطب مشتری اور ابواللیث صدیقی	ہماری زبان، ص ۳، ۸ نومبر

---

[1] یہ مضمون صبح دکن، حیدر آباد کے نومبر کے شمارے میں بھی شائع ہوا ہے۔

رفیع اللہ، پروفیسر	تجدد پسندوں کا موقف	فکر و نظر/ص ۹۸۵ تا ۹۹۰/ نومبر
رئیس احمد جعفری	شہر نگاراں (سبط حسن)	سیارہ/ص ۲۷ تا ۳۴/ دسمبر
ریحانہ طلعت	باغ و بہار ایک جائزہ	صریر خامہ/ص ۱۹۰ تا ۱۹۷/
زاہدہ حنا	پاکستان میں اردو ادب کے بیس سال — خواتین کا ادب	ماہ نو/ص ۸۳ تا ۸۴/ اگست
سبط حسن	اردو ادب کا جدید دور	افکار/ص ۶۵ تا ۶۸/ اگست
ستنام محمود، ڈاکٹر	بچوں کا اچھا ادب	تخلیق/ص ۲۰ تا ۲۳/
سخاوت مرزا/	شاہ رفیع الدین قندھاری کا تذکرہ نو بہار (قسط دوم)	العلم/ص ۵۷ تا ۶۲/ اپریل تا جون
سرور تونسوی	انجمن عروج ادب دہلی کا مشاعرہ جشن آزادی	شان ہند/ص ۱۰ تا ۱۶/ ستمبر اکتوبر
سلام سندیلوی، ڈاکٹر	میر کے صہبا ناموں کی اہمیت	صریر خامہ/ص ۴۰ تا ۴۴/
سہیل بخاری، ڈاکٹر	"باغ و بہار" کی معاشرت	اردو زبان/ص ۴۳ تا ۵۰/ اگست ستمبر
سید، مظفر علی	آج کا ادب اور ہماری تہذیب	قندیل/ص ۱۴/ ۲۳ ستمبر
سیدہ جعفر، ڈاکٹر	اردو ادب میں خواتین کا حصہ	نقش گر/ص ۱۵ تا ۲۲/ افسانہ نمبر
شاہ علی، ڈاکٹر سید	سیر کہسار	صریر خامہ/ص ۵۰ تا ۵۲/
...ی نعمانی، مولانا	مولانا شبلی کی ایک تقریر — (انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ ۱۹۰۹ء میں)	معارف/ص ۸۳ تا ۹۴/ اگست
...نی بن شائق	شاعر اور حسن	محفل/ص ۱۲ تا ۳۲/ دسمبر
...یم احمد	بیس سال کے ادبی رجحانات اور ان کا پس منظر	قومی زبان/ص ۶۵ تا ۷۰/ اگست
	جدید شاعری کے	داستان/ص ۸ تا ۳۴/
...در خاں	ادب میں فیشن پرستی	فنون/ص ۱۹۱ تا ۱۹۳/
...باد حمید	ہمارا عصری ادب اور اس کے مسائل	الشجاع/ص ۱۹ تا ۲۲/ جولائی
...جعفری، سید	جنگ آمد — ایک تاثر	افکار/ص ۴۳ تا ۴۴/ دسمبر
...احمد قریشی	اردو کے ابتدائی اسلامی لٹریچر کا جائزہ	الرحیم/ص ۴۴۰ تا ۴۴۵/ نومبر
...انصاری	یادیں اور ادب	خاتون دکن/ص ۲۳ تا ۲۸/ اکتوبر تا دسمبر
...محمد صدیقی، ڈاکٹر	اردو میں تراجم کے مسائل	ہماری زبان/ص ۳ + ۱۴/ ۲۲ اکتوبر
...بدر عابد علی	غنچہ آرزو — دیوان میر وزیر علی صبا	تخلیق/ص ۹ تا ۱۲/

یوسف جمال انصاری	خودی اور فنی ذات	نئی قدریں، ص ۴۶ تا ۵۸،
یوسف سرمست	شاہد رعنا اور اسرار جہان ادا	صبا، حیدرآباد، ص ۹ تا ۱۹، جنوری تا مارچ

تحقیق

شاہدہ خاتون صدیقی	تحقیق و تنقید	صریر خامہ، ص ۱۲۲ تا ۱۲۵،
عبداللطیف لکھنوی / شفاء الملک حکیم سید	ریسرچ کی بیماری	العلم، ص ۵۳ تا ۵۷، جولائی تا ستمبر
عبدالودود، قاضی	اصول تحقیق	آجکل، ص ۴ تا ۱۰، اگست
گیان چند	ہندوستان میں اردو تحقیق کی رفتار	" " ۲۷ تا ۳۴، "
مالک رام	مخطوطات ۔ تلاش، قرأت، ترتیب	" " ۱۱ تا ۱۹، "
متعدد حضرات	اردو میں تحقیق کا معیار[1]	" " ۲۰ تا ۲۶، "
محمد حسن	ادبی تحقیق کے بعض مسائل	" " ۶۲ تا ۶۶، "

تنقید

احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر سید	ادبی تنقید میں نظریۂ اظہاریت	سب رس، ص ۶ تا ۸، نومبر
"	ناقد کے فرائض	" " ۸ تا ۱۰، ستمبر
احمد شمیم	نیاز کی تاثراتی تنقید	صریر خامہ، ص ۱۴۴ تا ۱۴۸،
احمد ندیم قاسمی	شعر و ادب کی تنقید میں دیانت	امروز، ص ۵، ۲۰ اگست
اختر، خان اسلام	جمالیاتی تنقید	صریر خامہ، ص ۱۱۵ تا ۱۱۹،
اشتیاق احمد	مثبتی تنقید اور ڈاکٹر خلیق انجم	ہمایوں، ص ۵۰ تا ۵۵، ستمبر
افضل، نور النہار	آزاد ۔ ایک نقاد	صریر خامہ، ص ۱۴۵ تا ۱۵۶،
اکبر حسین قریشی، ڈاکٹر	فن اور فنی اقدار	اردو نامہ، ص ۷ تا ۳۱، جون
امین فاروق	اردو تنقید کا جائزہ	صریر خامہ، ص ۱۲۶ تا ۱۳۷،

---

[1] ایک مذاکرہ جس میں مالک رام، احتشام حسین، اختر اورینوی، گیان چند، محمد حسن، گوپی چند نارنگ نے حصہ لیا ۔

محمد حسن، ڈاکٹر	قومی زندگی اور ادب کے مسائل	کتاب، لکھنؤ، ص ۷ تا ۹، نومبر
محمد سلیم	سندھ میں اردو کا دو سو سال پرانا مخطوطہ	قومی زبان، ص ۴۷ تا ۵۰، دسمبر
محمد کاظم	ایک جاہلی مرثیہ پڑھ کر	فنون، ص ۱۸۵ تا ۱۹۰، اکتوبر
محمود الرحمان	مغرب میں بچوں کا ادب	کتاب، لاہور، ص ۳۹ تا ۴۳، اگست
مظہر، محمد احمد	ریاست کپورتھلہ میں مشاعرے	لاہور، ص ۶ تا ۷، ۱۱ ستمبر
منور لکھنوی، علامہ	گل نو (راحد پرنمی کا مجموعہ کلام) پر کچھ تاثرات	محفل، ص ۳۳ تا ۴۴، دسمبر
منیر احمد شیخ	عورت، ادب اور دیومالا	فنون، ص ۱۸۱ تا ۱۸۴، اکتوبر
نادر، کلب حسین خاں		
محمد انصار اللہ (مرتب)	تلخیص معلّی (۲)	اردو ادب، ص ۳۵ تا ۱۰۰،
نجم الاسلام	بیاض مرزا جان طپش	نقوش، ص ۶۲ تا ۸۱، ستمبر
نذیر محمد خاں	حرف تمنا (فلسفہ شعر اور مذہب)	صبا، ص ۲۰ تا ۳۱، جنوری تا مارچ
نرسنگھ رام جوہر	فسانہ آزاد میں لکھنوی تہذیب و معاشرت	صریر خامہ، ص ۲۰۳ تا ۲۰۴،
نرگس زیدی	اردو ادب اور طنز و مزاح	" " ۱۹۲ تا ۱۹۸،
نظیر صدیقی، پروفیسر	"کچھ رنگ ساز" کے بارے میں (شاہین صدیقی کا مجموعہ کلام)	نئی قدریں، ص ۶۲۰ تا ۶۲۷،
نکولائی، ڈاکٹر		
آصف (مترجم)	آرٹ موضوع اور زندگی	ہمایوں، ص ۵۵۸ تا ۵۵۹،
نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر	محمد غوث زریں اور ان سے منسوب نوطرز مرصع	صریر خامہ، ص ۱۰۵ تا ۱۱۲،
نیر مسعود رضوی، ڈاکٹر	فسانہ عجائب کے منظوم ایڈیشن	اردو ادب، ص ۷ تا ۲۳،
وزیر آغا، ڈاکٹر	ادیب اور عقیدہ	ہندوستانی ادب، ص ۷ تا ۱۹، اپریل
" "	پاکستان میں اردو نظم کے بیس سال	اردو زبان، ص ۱۰ تا ۱۳، نومبر
ولی تنویر	اکرام جاوید — اور "روشنی کے پھول"	شاعر، ص ۳۱ تا ۳۴، اکتوبر، نومبر
ہاجرہ	ادب کی صرف ایک ہی قسم ہے	امروز، ص ۵، ۵ نومبر
ہما میر حق	آئینہ [1]	ہماری زبان، ص ۸، ۸ و ۱۵ مارچ

[1] اردو ادب میں مطبوعہ ایک مضمون کا جواب الجواب

ایلیٹ، ٹی۔ ایس		
جمیل جالبی (مترجم)	منظوم ڈراما اور اس کا فن	نگار پاکستان، ص ۵۳ تا ۲۳۳، نومبر دسمبر
رمضان علی، پروفیسر	کلی پر ایک نظر	شاعر، ص ۱۵ تا ۱۹، اکتوبر نومبر
مسیح الزماں	بریخت کا ایپک تھیٹر	نقش، ص ۱۵ تا ۱۵۵، نومبر دسمبر
محمد اجمل، ڈاکٹر	منظوم ڈرامے اور تشبیہات کا استعمال	امروز، ص ۱۱، ۱۵ اکتوبر
شرف الدین، ڈاکٹر	انارکلی پر ایک ناقدانہ نظر	حریم خامہ، ص ۵۳ تا ۶۰
علی احمد	پاکستان میں ڈرامے کی روایات	ساقی، ص ۵۳ تا ۷۷، اکتوبر نومبر
کیمپبل، جان		
سید قاسم محمود (مترجم)	نیا ہندوستانی تھیٹر	صحیفہ، ص ۱۶ تا ۷۷، جولائی
وحید قیصر	مشرقی پاکستان میں ڈراما	کوہستان، ص ۱۸ ستمبر

شاعری ۔ نظم، غزل وغیرہ

احتشام حسین، سید	ذکر اس پری وش کا — جدید اردو شاعری میں	کتاب لکھنؤ، ص ۷ تا ۱۰، اکتوبر
احمد ندیم قاسمی	جدید شاعری اور معاشرے کی ابتری کی نمائندگی	امروز، ص ۵، ۲۴ ستمبر
"	صنف غزل کی مخالفت کیوں؟	" ، ۵، ۹ اگست
"	کچھ جدید غزل کے بارے میں	" ، ۷، ۲۰ جولائی
اختر، عبد السلام	تخلیق شعر کا نفسیاتی پس منظر	لاہور، ص ۶ تا ۷، ۲۳ اکتوبر
انجم اعظمی	جدید نظم سے کیا مراد ہے؟	نگار پاکستان، ص ۱۱۷ تا ۱۲۱، نومبر دسمبر
"	نظم جدید کی ہیئت	افکار، ص ۱۳ تا ۳۷، اکتوبر
ایلیٹ، ٹی ایس		
جمیل جالبی (مترجم)	شاعری اور پروپیگنڈا	نیا دور، ص ۵۸ تا ۶۶
رؤف خلش	جدید شاعری	کتاب لکھنؤ، ص ۵۶ تا ۶۶، اگست
سرمد، آل احمد	نظم کی دنیا	نگار پاکستان، ص ۹۵ تا ۹۹، نومبر دسمبر
"	نئی شاعری — چند مسائل	ہندوستانی ادب، ص ۳ تا ۶، اگست
سروری، عبد القادر	شعر کیا ہے؟	نگار پاکستان، ص ۷ تا ۱۰، نومبر دسمبر

انور کمال حسینی	فن اور تنقید	ہندوستانی ادب، ص ۲تا ۶، ستمبر
ایلیٹ، ٹی ایس		
جمیل جالبی (مترجم)	تنقید کا منصب	نیا دور، ص ۴۴تا ۵۷،
تصدق حسین، سید	مولانا عبدالماجد دریابادی کے تنقیدی نظریات	صریر خامہ، ص ۱۲۹تا ۱۴۱،
جمیل جالبی	مفکر نقاد (ایلیٹ)	نقش، ص ۱۳۵تا ۱۵۰، نومبر دسمبر
جمیلہ حسن	حالی بحیثیت نقاد	صریر خامہ، ص ۱۵۷تا ۱۶۰،
خضر حیات، سید	سائنٹی فک تنقید — ایک نظر میں	" " ۱۱۹تا ۱۲۱،
رفیق احمد انصاری	آل احمد سرور کے تنقیدی خیالات اور انداز تنقید	" " ۱۶۲تا ۱۷۴،
عبدالجمیل	تذکروں میں تنقید	" " ۱۳۸تا ۱۴۹،
نسیم مرنا	تنقید کیا ہے؟	" " ۱۰۳تا ۱۱۴،
ظہیر، حافظ احسان الٰہی	تنقید	چٹان، ص ۱۵تا ۱۶، ۲۱ اکتوبر
عقیل دانش	آب حیات اور جدید تنقید	فکر و خیال، ص ۵۰تا ۵۳، اکتوبر نومبر
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	مغرب کے تنقیدی اصول پر ایک نظر	نگار پاکستان، ص ۶۵تا ۷۰، اکتوبر
متعدد حضرات	تبصرہ نگاری[1]	ادبی تبصرے، ص ۳تا ۹، نومبر
وقار احمد رضوی	ادبی تنقید کا مفہوم	نگار پاکستان، ص ۱۳تا ۱۹، اکتوبر
" "	تنقید کی تاریخی، لغوی اور اصطلاحی ماہیت	نقوش، ص ۱۸۲تا ۲۰۳، "

ڈراما

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	پاکستان میں اردو ادب کے بیس سال — ڈراما	ماہ نو، ص ۳۱تا ۴۳، اگست
انجم، انجمن آرا	جدید روسی تھیٹر	نقوش، ص ۱۵۰تا ۱۵۴، ستمبر
انوار احمد زئی	اردو ڈراما نگاری کا سرسری جائزہ	صریر خامہ، ص ۱۰۵تا ۱۴۸،
تاج، سید امتیاز علی	خسروان جی مہروان جی خاں صاحب آرام	صحیفہ، ص ۴۶تا ۷۰، جولائی

---

[1] اس مذاکرے میں پروفیسر آل احمد سرور، سید احتشام حسین، ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر اسلم پرویز، صدیق الرحمان قدوائی، شریف احمد، شہاب جعفری اور ڈاکٹر نعیم احمد نے حصہ لیا۔

قصیدہ

ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر	اردو قصیدہ و مثنوی کی تنقید پر ایک نظر	نگار پاکستان، ص ۱۷۱ تا ۱۸۸، نومبر دسمبر
سحر، ڈاکٹر ابو محمد	قصیدہ، صنف سخن کی حیثیت سے	″ ″ ۱۵۰ تا ۱۵۵، ″ ″
سلام سندیلوی، ڈاکٹر	سودا اور ذوق بحیثیت قصیدہ نگار	″ ″ ۱۷۹ تا ۱۸۴، ″ ″
ضیا احمد بدایونی، مولانا	ایوان قصیدہ کے ارکان اربعہ	″ ″ ۱۶۵ تا ۱۷۰، ″ ″

مثنویات

امیر احمد علوی	اردو کی مشہور مثنویاں	نگار پاکستان، ص ۱۲۳ تا ۱۳۱، نومبر دسمبر
تاجور سامری	تحفۂ میر (میر تقی کی ایک مثنوی دریافت ڈاکٹر گیان چند)	ہمایوں، ص ۴۷ تا ۴۸، اگست
سخاوت مرزا، محمد	مثنوی معراج نامہ	ماہ نو، ص ۱۷ تا ۲۳، ستمبر
″ ″	مثنوی من موہن	اردو نامہ، ص ۲۳ تا ۳۸، جون
سردار بہادر	سحر البیان	حریر خامہ، ص ۲۴۴ تا ۲۵۱،
علی محسن صدیقی	امیر خسروؒ کی تاریخی مثنویاں	ثقافت، ص ۲ تا ۳۰، نومبر
محمد زاہد خاں	گلزار نسیم پر ایک نظر	حریر خامہ، ص ۲۵۲ تا ۲۵۶،

مرثیہ

ابن سعید	میر انیس کی مرثیہ نگاری	خاتون دکن، ص ۷ تا ۱۰، اگست ستمبر
جعفر رضا، ڈاکٹر	مراثی تعشق میں کردار نگاری	سب رس، ص ۱۱ تا ۲۵، دسمبر
″ ″	مراثی عشق میں ڈرامائی عناصر	آجکل، ص ۲۲ تا ۲۴، اکتوبر
صفدر حسین، ڈاکٹر	اردو مرثیہ عہد بہ عہد	نگار پاکستان، ص ۱۹۹ تا ۲۱۸، نومبر
فرزانہ حمید	ذوق کی قصیدہ نگاری	سب رس، ص ۱۵ تا ۱۹، اکتوبر
محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر	اردو مرثیہ اور میر انیس	نگار پاکستان، ص ۱۸۷ تا ۱۹۸، نومبر

شمس الرحمان فاروقی	شعر کی داخلی ہیئت	اردو زبان، ص ۵۷ تا ۶۲، اگست ۶۳
شمیم احمد	غزل اور غزل کے معاملات	نگار پاکستان، ص ۷۱ تا ۸۷، نومبر دسمبر
شوکت سبزواری، ڈاکٹر	پاکستان میں اردو ادب کے بیس سال — شاعری	ماہ نو، ص ۹۲ تا ۱۳۱، اگست
صفدر علی بیگ، ڈاکٹر	دنیا کی بے ثباتی شعرائے اردو کی نظر میں	سب رس، ص ۹ تا ۱۳، نومبر
صلاح الدین احمد، مولانا	جدید شاعری	اردو زبان، ص ۱۶ تا ۱۹، دسمبر
طالب دہلوی	دلی کی اردو شاعری (۱۷)	رہنمائے تعلیم، ص ۱۷ تا ۱۸، جولائی
ظہیر کاشمیری	آزاد شاعری کے بارے میں	کوہستان، ص ۳، ۶ اگست
عباد اللہ فاروقی، حافظ	سرقہ و توارد	سیارہ، ص ۳۷ تا ۴۲، اکتوبر
غیرت ادیب، کنھیا لال بھٹناگر	مرقع عروض (۷)	رہنمائے تعلیم، ص ۱۰ تا ۱۵، جولائی
"	" (۱۱)	" " ۱۷ تا ۱۸، نومبر
فراق گورکھپوری	غزل کی ماہیئت	نگار پاکستان، ص ۱۱ تا ۲۳، نومبر دسمبر
کرم حیدری	ہماری شاعری میں تصور محبوب	نقوش، ص ۱۰۹ تا ۱۲۲، ستمبر
کمال احمد صدیقی	شاعری اور حقیقت	کتاب لاہور، ص ۱۱ تا ۱۸، اکتوبر
گیان چند، ڈاکٹر	اردو شاعری میں دیوالی	فروغ اردو، ص ۳ تا ۶، دسمبر
مجنوں گورکھپوری	شعر اور غزل	نگار پاکستان، ص ۴۴ تا ۴۸، نومبر دسمبر
محمد حسن، ڈاکٹر	مصری اور آزاد نظم کا ارتقا	" " ۱۰۰ تا ۱۱۱، " "
مسعود حسین خاں، ڈاکٹر	غزل کا فن	" " ۵۶ تا ۶۰، " "
مہر، مولانا غلام رسول	ہماری قومی شاعری	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۲ تا ۲۴، دسمبر
معین شاکر، پروفیسر	جدید شاعری	شاعر، ص ۴۲ تا ۴۶، اکتوبر نومبر
نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند	جدید غزل: روایت اور جدت	کتاب لکھنؤ، ص ۷ تا ۱۲، اگست
نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر	غزل کا نیا رنگ ترنم	نگار پاکستان، ص ۴۹ تا ۵۵، نومبر دسمبر
نیاز فتح پوری	اردو غزل — ولی سے عہد حاضر تک	" " ۷۹ تا ۹۳، " "
وزیر آغا، ڈاکٹر	غزل اور نظم کا بنیادی فرق	" " ۱۱۲ تا ۱۱۶، " "
وقار عظیم، سید	ستمبر ۶۵ء کی شاعری	فنون، ص ۶۹ تا ۷۰، جولائی و اگست

ولی زبان منزلہا

ولی/سید شاہ ولی الرحمان	اردو کا پہلا واسوخت	نگار پاکستان/ص ۲۳۳ تا ۲۴۴/نومبر دسمبر

دیگر اصناف ادب

احتشام حسین، پروفیسر سید	سانٹ کیا ہے؟	نگار پاکستان/ص ۲۵۸ تا ۲۵۹/نومبر دسمبر
ادیب، سید مسعود حسن رضوی	شہر آشوب کا فن اور موضوع	" " ۲۰۵ تا ۲۳۳/ " "
اظہر علی فاروقی	اردو گیت	" " ۲۹۴ تا ۳۰۳/ " "
تمکین کاظمی، سید	لکھنؤ اور دلی کے ریختی گو شعرا	" " ۲۶۶ تا ۲۷۵/ " "
سلیم اختر	۱- دوہا اور اس کی فنی خصوصیات	" " ۳۴۳ تا ۳۵۷/ " "
"	۲- ریختی کا سماجی و تہذیبی پس منظر	" " ۲۸۷ تا ۲۹۵/ " "
عزیز تمنائی	سانٹ اور اس کا فن	" " ۳۹۰ تا ۳۹۲/ " "
فرمان فتح پوری	۱- اردو رباعی کا فنی اور تاریخی ارتقا	" " ۲۱۹ تا ۲۳۱/ " "
" "	۲- اردو کے منظوم افسانوی ڈرامے	" " ۳۴۴ تا ۳۵۶/ " "
" "	۳- سحر البیان کے پس منظر پر ایک نظر	" " ۱۳۲ تا ۱۳۷/ " "
" "	۴- قطعہ اور اس کے مماثل اصناف	" " ۲۸۹ تا ۲۹۲/ " "
" "	۵- گلزار نسیم کی نمایاں خصوصیات	" " ۱۳۸ تا ۱۴۸/ " "
فضل جاوید	اردو میں پیروڈی	آجکل/ص ۳۴ تا ۴۰/جولائی
کوثر چاندپوری	ریختی اور اس کے فن کار	نگار پاکستان/ص ۲۷۰ تا ۲۸۷/نومبر دسمبر
گیان چند، ڈاکٹر	کرشن موہن کے دوہے	تحریک/ص ۱۳ تا ۱۴/ستمبر

عربی ادب

احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر	تحریک اپولو — جدید عربی ادب کی ایک عظیم تحریک	جامعہ/ص ۳۱۵ تا ۳۲۸/دسمبر
" "	عراق میں جدید عربی شاعری کا ارتقا	معارف/ص جولائی اگست
" "	عربی تنقید پر یونانی اثرات کا تحقیقی جائزہ	برہان/ص ۲۳۳ تا ۲۴۴/اکتوبر
" "	عصر عباسی سے قبل عربی تنقید کا ارتقا	معارف/ص ۴۳۰ تا ۴۴۰/دسمبر
حامد علی خان رام پوری	ہندوستان کا پہلا عربی گو شاعر	برہان/ص ۱۰۱ تا ۱۱۰/اگست

ناول، افسانہ وغیرہ

احسن فاروقی، ڈاکٹر محمد	ناولٹ	سیپ، ص ۲۰۴ تا ۲۴۳،
احمد ندیم قاسمی	شہر بے مثال[1]	کتاب لاہور، ص ۵ تا ۱۲، ستمبر/اکتوبر
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر	خط تقدیر ــ اردو کا پہلا ناول یا تمثیلی کہانی	نگار پاکستان، ص ۴۷ تا ۵۱، اکتوبر
افتخار حسین، آغا	صادق ــ والیٹر کا ایک ناول	افکار، ص ۲۲ تا ۳۰، ستمبر
انجم اعظمی	پاکستان میں اردو ناول	" " ۳۱ تا ۴۰، جولائی
ساجد حسین زیدی، سید	امراؤ جان ادا کی کردار نگاری	حریم خامہ، ص ۲۰۷ تا ۲۱۷،
سلیم اختر	زیوس سے امیر حمزہ تک	اوراق، ص ۲۴۱ تا ۲۵۹،
"	ناولٹ : ایک تکنیکی مطالعہ	سیپ، ص ۲۴۶ تا ۲۵۰،
طیب انصاری	اردو ناول نگاری پر ایک تنقیدی نظر	سب رس، ص ۳۲ تا ۳۴، جولائی
علی احمد زیدی، سید	اردو افسانے کا سرسری جائزہ	حریم خامہ، ص ۱۷۹ تا ۱۸۱،
قمر رئیس	اردو ناول کا تشکیلی دور	کتاب لکھنؤ، ص ۷ تا ۱۴، ستمبر
"	پریم چند کی کہانیوں کا مطالعہ	" " " ۷ تا ۱۴، دسمبر
متعدد حضرات	انتظار حسین کے افسانے[2]	اردو زبان، ص ۵۳ تا ۸۳، نومبر
مجتبیٰ حسین	پاکستان میں اردو ادب کے بیس سال ـ افسانہ	ماہ نو، ص ۲۲ تا ۲۹، اگست
محمد عظیم	بیدی کی ناولٹ نگاری	نیرنگ خیال، ص ۹ تا ۱۳، نومبر
محمود الرحمان (پرویز کاکوی)	اردو افسانہ ــ آزادی کے بعد	جام نو، ص ۷ تا ۱۱، اگست ستمبر

واسوخت

شعیب اعظمی	اردو واسوخت	آجکل، ص ۳۴ تا ۴۰، مئی
گیان چند، ڈاکٹر	واسوخت امانت	نگار پاکستان، ص ۲۴۹ تا ۲۵۵، نومبر دسمبر

---

[1] ناولٹ قدسیہ کے ناول پر بحث۔ اس بحث میں بانو قدسیہ (مصنفہ) اشفاق احمد، مرزا ادیب اور احمد ندیم قاسمی نے حصہ لیا۔

[2] اس مذاکرے میں انتظار حسین، مجتبیٰ حسین، سجاد نقوی، انور سجاد اور انور سدید نے حصہ لیا۔

حمید قریشی، ڈاکٹر	تذکرہ ہمیشہ بہار (از کشن چند اخلاص)	اردو، ص ۱ تا ۱۱۲، اکتوبر
، ،	پیر کلیر اور ان کا فارسی دیوان	، ، ۹۳ تا ۱۰۸، ،
ولی الحق انصاری، ڈاکٹر محمد	شعر العجم اور ذکر عرفی شیرازی	، ، ۹۹ تا ۱۰۲، ،
، ،	حیات عرفی شیرازی کا ایک تنقیدی جائزہ	برہان، ص ۵۴ تا ۵۹، جولائی
، ،	، ، ،	، ، ۱۱۱ تا ۱۲۳، اگست
، ،	عبدالباقی نہاوندی اور دیباچہ کلیات عرفی	معارف، ص ۲۹۳ تا ۳۰۰، اکتوبر
یمین، آغا	لاہور کا پہلا فارسی شاعر	فنون، ص ۱۲۳ تا ۱۳۲، جولائی اگست

دیگر زبانوں کا ادب

اسحٰق صدیقی، محمد	ملیالم ادب	صبح امید، ص ۷ تا ۱۹، اگست
تابش صدیقی	کشمیری شاعری کی ایک جھلک	ماہ نو، ص ۵۵ تا ۶۱، ستمبر
پھاٹک، رادھے شیام	ہندی ناول	جامعہ، ص ۱۴۳ تا ۱۵۸، ستمبر
کیشو میشرام	نئی مراٹھی نظم	کتاب لکھنؤ، ص ۹ تا ۱۰، ستمبر
	چینی ادب اور ڈرامے میں انقلابی دور کا آغاز	امروز، ص ۹، یکم اکتوبر

تعلیمی، تحقیقی، اشاعتی اور دیگر ادارے

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	بصائر، ص ۸ تا ۱۳، جولائی
اخلاق حسین زبیری	اسلام آباد یونیورسٹی	المعلم، ص ۱۰ تا ۱۳، اکتوبر تا دسمبر
اشفاق انور (مترجم)	انجمن پنجاب کے مقاصد اور قواعد (۱)	صحیفہ، ص ۸۰ تا ۹۶، جولائی
آفتاب حسن،	سائنٹیفک سوسائٹی — ایک جائزہ	ارمغان، ص ۱ تا ۶، نومبر
بدرالدین، ڈاکٹر	پنجاب یونیورسٹی میں سائنسی تحقیق	، ، ۱۵۶ تا ۱۶۸، ،
بدر منیر، محمد	آئینہ ادب (لاہور)	کتاب لاہور، ص ۱۱ تا ۲۶، نومبر
، ،	مکتبہ جدید لاہور کا تعارف	، ، ، ۱۹ تا ۲۲، ستمبر اکتوبر
تمثال عسکری	اردو ٹائپ رائٹر	جنگ، ص ۵، ۲۳ ستمبر
حبیب اللہ خاں	علی گڑھ یونیورسٹی کی عمارات	مجلہ یادگار سرسید، ص ۲۰ تا ۲۲،

سردار علی	عربی ادب انیسویں صدی میں	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۸ تا ۲۵، جولائی
ضیاء الحسن ملک	ابن الفارض — عربی کا سب سے بڑا صوفی شاعر	امروز، ص ۵، ۹ نومبر
ضیاء الدین اصلاحی، مولوی	ابوعبید قاسم بن سلام	معارف، ص ۸۵ تا ۱۰۳، اگست
عبدالحلیم ندوی	عربی ادب میں افسانہ نگاری — رومان پسند مکتب فکر	جامعہ، ص ۲۹۷ تا ۳۰۹، دسمبر
فاروق، خورشید احمد	عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان	برہان، ص ۵ تا ۱۰، جولائی
" "	" "	" " ۶۹ تا ۸۵، اگست
" "	" "	" " ۲۶۱ تا ۲۷۶، نومبر

فارسی ادب

احمد میاں جوناگڑھی، قاضی	سندھ میں فارسی ادب	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۶ تا ۸، دسمبر
اختر علی تلہری	میر کی فارسی غزل	آجکل، ص ۳۳ تا ۳۴، جولائی
امیر حسن عابدی	فارسی میں حدیث کشمیر	" " ۱۲ تا ۱۶، اکتوبر
ایوب قادری، پروفیسر محمد	مجمع المکتوبات (اٹھارھویں صدی عیسوی کا ایک فارسی مجموعۂ انشا)	بصائر، ص ۱۰۹ تا ۱۳۳، اپریل
جائسی، کبیر احمد	حافظ کی شاعری پر ماحول کے اثرات	اردو، ص ۱۰۳ تا ۱۲۸، اکتوبر
حامد، پروفیسر حامد خاں	غالب کی فارسی شاعری	ثقافت، ص ۳۳ تا ۵۱، ستمبر
شکیل احمد صدیقی، محمد	فارسی قصیدہ نگاری کے مفید پہلو	سب رس، ص ۸ تا ۱۶، دسمبر
" "	مومن فارسی غزل کے آئینے میں	کتابی دنیا، ص جون جولائی
شمیم احمد قریشی	فارسی میں کالی داس کے دو ڈرامے	آجکل، ص ۳۴ تا ۳۸، نومبر
عادل جعفری ایم اے	غالب اپنی فارسی شاعری کے آئینے میں	صبح نو، ص ۱۰ تا ۱۲، جولائی
غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر	مکتوبات قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی	اردو، ص ۹۶ تا ۱۴۴، اکتوبر
کبیر احمد جائسی	حافظ کی شاعری پر ماحول کے اثرات	" " ۱۳ تا ۱۴۱، "
حکیم الدین احمد	ضاحک کا فارسی کلام	معاصر، ص ۱ تا ۲۷، جولائی
نامی انصاری	فارسی اور اردو غزل کے ہم طرح مضامین	آجکل، ص ۲۶ تا ۲۹، نومبر
نذیر احمد، ڈاکٹر	قدیم فارسی فرہنگوں میں اردو عناصر (ادات الفضلا)	اردو، ص ۵ تا ۴۸، اکتوبر

ایلین، جی ایس	جدید فن طباعت	کاروان سائنس، ص
تاراچند، ڈاکٹر		
اصغر عباس (مترجم)	زبان کے مسئلے کا امکانی حل	ہماری زبان، ص ۶ تا ۸، ۱۵ جولائی
جان بے وڈ		
علاء الدین جینا فرے (مترجم)	اردو ہے جس کا نام	صبح امید، ص ۵ تا ۱۷، نومبر دسمبر
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	اردو کے حق میں عوام کا فیصلہ	مشرق، ص ۴، ۲۹ اکتوبر
دربار علی شاہ	قومی زندگی میں اپنی زبان کی اہمیت	اردو نامہ، ص ۱۲۸ تا ۱۳۲، اکتوبر
ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین	اردو — پنجاب یونیورسٹی میں	ارمغان، ص ۱۵۵ تا ۱۶۴، نومبر
راف رسل	برطانیہ میں اردو کے مطالعہ کو فروغ	امروز، ص ۳، ۲۰ اگست
رشید انور	جدوجہد آزادی میں اردو کا مقام	جنگ، ص ۳، ۳ اکتوبر
رشید محمود، راجا	اردو کا المیہ	آئین، ص ۱۴ تا ۱۵ + ۱۸، ۱۰ اکتوبر
شانتی رنجن بھٹاچاریہ، ڈاکٹر	آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو	قومی زبان، ص ۱۵ تا ۲۲، اکتوبر
" " "	" " "	" " ۵۳ تا ۵۶، نومبر
سجاد احمد جان، جسٹس	اردو زبان کی خدمت میں جمہور کا کردار	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۱، ۹ اکتوبر
سرور، آل احمد	سرکاری زبان یا علاقائی زبان	ہماری زبان، ص ۱ تا ۲، یکم ستمبر
" "	کیا ہم اپنا رسم خط بدل دیں؟	" " ۱ تا ۲، ۸ اکتوبر
سورج تنویر	اردو جن سنگھ اور پنجاب پریس	" " ۳ تا ۴ + ۱۲، ۸ ستمبر
سہیل بخاری	اردو اور علاقائی زبانوں کا تعارف	اردو زبان، ص ۳ تا ۱۲، نومبر
عثمان ساحل	اتر پردیش میں اردو	ترقی اردو، ص ۱۶ نومبر
" "	" "	" " ۱ + ۲، یکم دسمبر
" "	" "	" " ۴ تا ۸، ۱۶ دسمبر
محمد حسین ملک	اردو زبان کا مستقبل	الجامعہ، ص ۳۴ تا ۳۵، اگست
مرتضیٰ خان محمد	تجارت اور قومی زبان	ارمغان، ص ۱۰۱ تا ۱۰۸، نومبر
نادم سیتاپوری	گورکھشا اور اردو	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴ + ۶، ۸ اکتوبر
نیر اقبال	اردو کا مسئلہ	" " ۱۳ تا ۴ + ۶، ۲۲ اکتوبر
	بہار میں اردو کا مستقبل	" " ۹، ۸ اگست
		اخبار جہاں، ص ۶، ۳۰ اگست

حسن علی عبدالرحمان	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی تاریخی ڈائری	العلم، ص ۵۹ تا ۹۶، اکتوبر تا دسمبر
حمید اللہ، ڈاکٹر محمد	موتمر مستشرقین عالم امریکہ میں	معارف، ص ۳۲۵ تا ۳۳۸، نومبر
خالد، علاءالدین	قومی ترقی اور کتاب سازی	کتابی دنیا، ص جون جولائی
سعید احمد اکبرآبادی، مولانا	بنگلور میں ایک اہم سیمینار اور اس نواح کا میرا پہلا سفر	برہان، ص ۲۰۹ تا ۲۲۳، اکتوبر
صباح الدین عبدالرحمان، سید	ہندوستان میں اردو کے تحقیقی ادارے	آجکل، ص ۵۳ تا ۱۱، اگست
ضیاءالحسن فاروقی	ایک علمی اجتماع ۔ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا پانچواں اجتماع	جامعہ، ص ۲۹۱ تا ۲۹۶، دسمبر
ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر	یہ خط خط یونان ہے ۔ (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)	" " ۲۹، جولائی
عبدالقدیر دہلوی، منشی	اینگلو عربک کالج دہلی	العلم، ص ۱۰۳ تا ۱۱۵، جولائی تا ستمبر
عظیم محمد دانی	پاکستان میں سائنسی ترقی	ماہ نو، ص ۱۶ تا ۲۱، اکتوبر
قاسم محمود، سید	سائنس کے اشاعتی ادارے	ارمغان، ص ۷۱ تا ۸۲، نومبر
محمود الرحمان	کتابت و طباعت بچوں کے ادب میں	کتاب، ص ۲۹ تا ۳۲، جولائی
مستفیض احمد صدیقی	پاکستان میں فن طباعت کے بیس سال[1]	" " ۳۱ تا ۴۴، ستمبر اکتوبر
مہاجر، ڈاکٹر عبدالرشید	قومی ادارہ تدوین وثائق و دستاویزات سائنس و فنیات پاکستان	اردو سائنس، ص
وقار عظیم، سید	پنجاب یونی ورسٹی ادارہ تالیف و ترجمہ	ارمغان، ص ۹۹ تا ۱۰۸، نومبر
	ہندوستانی یونی ورسٹی میں اردو تحقیق کی رفتار	آجکل، ص ۴۸ تا ۵۱، اگست

اردو زبان اور اس کے مسائل

اعجاز نقوی، ڈاکٹر	اردو زبان کا مسئلہ	قومی زبان، ص ۱۳ تا ۲۲، نومبر
احمد ندیم قاسمی	اردو ایک روادار زبان ہے	امروز، ص ۵، ۱۰ دسمبر
اختر حسین	اردو مختصر نویسی کی تاریخ	اردو نامہ، ص ۵۰ تا ۵۲، جون
ارشاد صدیقی	بنگلہ زبان پر اردو کا اثر	ماہ نو، ص ۴۱ تا ۴۴، ستمبر
اسرار احمد، حکیم	جنگ آزادی میں اردو کا حصہ	قومی زبان، ص ۵ تا ۱۰، اگست
اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر	قومی زبان	کتابی دنیا، ص ۱ تا ۵، اگست ستمبر
اطہر جاوید، سلیمان	سری وینکٹیشورا یونی ورسٹی میں اردو	ترقی اردو، ص ۹، ۱۶ اگست
انجم اعظمی	ایک زبان ایک تہذیب	آہنگ، ص ۱۹ تا ۲۱، ستمبر

---

[1] یہ مضمون جنگ کراچی ۱۵ اگست ۷۰ء (صفحہ ۲۳) سے نقل کیا گیا ہے۔

کیا آپ اپنی بچت کے روپے سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں؟

اگر آپ نے اب تک آئی۔سی۔پی کے سرمایہ کاری
منصوبے کے تحت حساب نہیں کھولا تو
غالباً آپ پورا نفع حاصل نہیں کر رہے۔

اگر آپ ہمارے مشورے اور خدمات سے فائدہ
اٹھا کر مناسب کمپنیوں کے حصّوں میں روپیہ
لگائیں تو ڈویڈنڈ کے ذریعے اپنی آمدنی میں
معقول اضافہ کر سکتے ہیں اور ساتھ
ہی اپنے اصل سرمائے میں اضافے کی بھی توقع کر سکتے ہیں

انوسٹمنٹ کارپوریشن آپکو کسی اجرت یا معاوضے کے بغیر
حصّوں کے انتخاب میں ماہرانہ مشورہ دے گی۔
آپ کے مطلوب حصّے واجبی قیمتوں پر حاصل
کرنے کی کوشش کرے گی۔
آپکے شیئر سرٹیفکیٹ کی حفاظت کا ذمہ لے گی۔

حصّوں کی خریداری کے لئے آپ رعایتی شرطوں پر قرض بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان

پانچویں منزل، نیشنل بینک بلڈنگ
میکلوڈ روڈ، کراچی (فون: ۹۵- ۲۳۹۲۹۱)

دفاتر:
ڈھاکہ، چٹاگانگ، کلکتہ اور لاہور۔

آئی سی پی

سرمایہ کاری منصوبے کے ذریعے
ملکی صنعت میں اپنا حصہ حاصل کیجئے

ماہنامہ

قومی زبان

کا

بابائے اردو نمبر

سنہ ۱۹۶۷ء

چند لکھنے والے

- پروفیسر ہارون خاں شروانی — سہیل عظیم آبادی
- سید ہاشم رضا — ڈاکٹر باجید شہریار
- حکیم محمد سعید — محمد معین الدین دردائی
- سید قدرت نقوی — کوثر چاندپوری
- فضل احمد صدیقی — ڈاکٹر ابو سعید نورالدین
- پروفیسر شبیر علی کاظمی — محمد حبیب اللہ رشدی
- پروفیسر عبدالقوی دسنوی — جمیل نقوی۔

اور بہت سے دوسرے

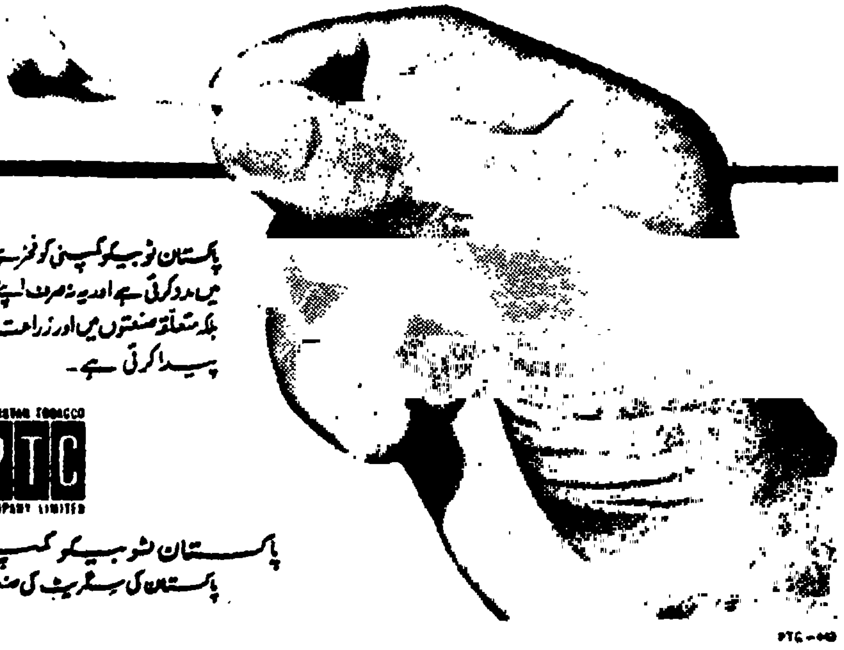
- سوا دو سو صفحات • آفسٹ کی طباعت • متعدد تصاویر
- بابائے اردو کے دوستوں اور نیازمندوں کے انٹرویو • متعدد غیر مطبوعہ خطوط

قیمت : دو روپے

انجمن ترقی اردو. بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

آگ ہی سے دھواں اٹھتا ہے ......

..... لیکن جب آپ ہمارے سگریٹ سُلگاتے ہیں تو جو دھواں اٹھتا ہے
اُس سے کئی گھر روشن ہوتے ہیں ، لوگوں کو روٹی نصیب ہوتی ہے ۔
جسم ڈھکتے ہیں اور بہت سے خاندانوں کو گھر میسر آتا ہے ۔
ہمارے کاروبار سے ہزاروں آدمی کسی نہ کسی طرح فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ کسان ہمارے
اعلیٰ سگریٹوں کے لئے تمباکو پیدا کرتا ہے ۔ اُس کو اچھے دام ملتے ہیں ۔
جب ہمارے سگریٹ پیک ہو کر تجارتی تقسیم کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تو
وسیع پیمانہ پر تجارت اور معاشی ردِ عمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ۔ اور اس طرح
ہمارے ملک میں کئی ہزار لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں ۔
مزید یہ کہ جب ہم ٹرکوں ، کشتیوں یا ریل کے ذریعہ اپنے سگریٹ بازاروں تک پہنچاتے ہیں
یا جب ہم سگریٹ کے پیکٹ کے لئے گتہ ، چھپے ہوئے پیکٹ یا لکڑی کے پیکنگ کیس
خریدتے ہیں تو تجارت اور معاشی سرگرمی کو اور فروغ حاصل ہوتا ہے ۔ جب
سگریٹوں کے لئے پیکنگ کا تمام تر سامان پاکستان ہی میں بننے لگے گا تو ملکی صنعت
اور زیادہ ترقی کرے گی ۔



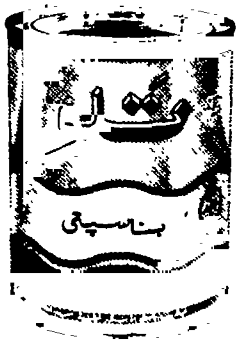
پاکستان ٹوبیکو کمپنی کو فخر ہے کہ وہ عوام کو خوشحال بنانے
میں مدد کرتی ہے اور یہ نہ صرف اپنے ہی دفتروں اور کارخانوں میں
بلکہ متعلقہ صنعتوں میں اور زراعت میں بھی روزگار کے مواقع
پیدا کرتی ہے ۔

PAKISTAN TOBACCO
PTC
COMPANY LIMITED

پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
پاکستان کی سگریٹ کی صنعت کے رہبر

PWT-62 PTC-040

تندرستی اور تلو گھر میں ساتھ ہیں



تلو بناسپتی خالص اور پاکیزہ - غذائیت سے بھرپور - مفید صحت اور ہمیشہ تازہ -

ماہرین غذا کہتے ہیں: تندرستی کو برقرار رکھنے کے لئے روزانہ غذا میں دو آؤنس روغن کافی ہے - اوسطاً دو آؤنس تلو میں توانائی کے ۵۰۰ کیلوریز ہوتے ہیں - ان میں ۸۸۰ انٹرنیشنل یونٹ وٹامن اے اور ۱۰۶ انٹرنیشنل یونٹ وٹامن ڈی شامل کئے جاتے ہیں - اسی سبب تلو صحت بخش ہے -

اسی لئے ہزاروں مائیں ہر روز تین بار بہت لگن سے تلو میں لذیذ اور غذائیت بخش کھانا پکاتی ہیں - جو بچوں بڑوں دونوں کو کھیل کود، کام کاج کے لئے فاضل توانائی بخشتا ہے -

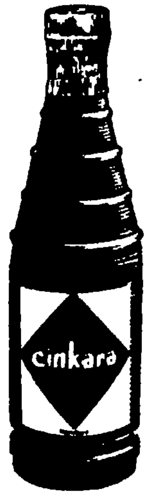
تلو صحت بخش ہے!

خوشبو بھی اچھی
ذائقہ بھی عمدہ



Your responsibilities need a full share of energy





اس زمانے میں انسان پر طرح طرح کی ذمّہ داریاں مُسلّط ہیں جو اس کی صحت کو اندر ہی اندر کھائے جاتی ہیں۔ اس کا مداوا عام خوراک سے نہیں ہو سکتا۔ اس کی صحت اور توانائی کو برقرار رکھنے کے لئے تو سنکارا جیسی بھرپور غذائیت کی ضرورت ہے جو اس کے جسم اور دماغ دونوں کو قوّت بخشے۔

سنکارا ایک جنرل ٹانک ہے جس میں بکثرت وٹامنز، معدنی اجزا اور جڑی بوٹیاں اس خوبی سے شامل کی گئی ہیں کہ یہ ہر موسم میں اور ہر عمر کے لوگوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

سنکارا

آپ کے اور آپ کے بچّوں کے لئے بے مثل ٹانک

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

کراچی ڈھاکہ لاہور

TRONACHS

قومی زبان

کراچی

انجمن ترقی اردو

l. No. 1136
Monthly **QAOMI ZABAN** Karachi

مدیر : مشفق خواجہ
محمد مصلح الدین سعدی کے زیر اہتمام انجمن پریس سے شائع ہوا ۔

انجمن ترقی اُردو پاکستان کا ترجمان

ماھنامہ

قومی زبان

جلد ۳۲ [illegible] شمارہ ۴

اپریل سنہ ۱۹۶۸ء

انجمن ترقی اُردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

قیمت: فی پرچہ ایک روپیہ ★ قیمت: سالانہ دس

زیر تعمیر اردو کالج کے لئے عطیّات

اب تک زیر تعمیر اردو کالج کے لئے مبلغ تین لاکھ اٹھارہ ہزار چارسو ستر روپے (۰۰-۴۷۰ ،۱۸ ،۳) جمع ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ماہ جو رقوم موصول ہوئیں اُن کی تفصیل یہ ہے:

عطیات:

پاکستان شپ اونرز ایسوسی ایشن
ریلی برادرز بلڈنگ۔ وڈ اسٹریٹ۔ کراچی — مبلغ ایک ہزار روپیہ

بذریعہ فروخت رسائل:

جناب ذوالقرنین عالی صاحب — مبلغ بائیس روپے صرف

Phone : 232784

فہرست

علامہ اقبال کی تیسویں برسی کے سلسلے میں خاص مضامین کی شمولیت کی وجہ سے زیرِ نظر شمارے میں "گرد و پیش" اور "نئی کتابیں" کے مستقل عنوانات پیش نہیں کئے جا سکے۔ اس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے ——

★

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

ڈاکٹر ممتاز حسن

تعلیم اور قومی تعمیر

جنابِ والا وائس چانسلر، خواتین و حضرات!

آپ نے اس جلسے میں مجھے دعوت دے کر میری عزت افزائی کی ہے، یہ میرے لئے مسرت اور فخر کا مقام ہے کہ وہ یونیورسٹی جس کے سایۂ عاطفت میں میرے ذہن اور روح نے پرورش پائی ہے، مجھے اس قابل سمجھے کہ میں ایسے اہم موقع پر مہمان کی حیثیت سے بلایا جاؤں اور آج سے اکتالیس سال پہلے جس پلیٹ فارم سے مجھے پہلی مرتبہ سند دی گئی تھی اسی پلیٹ فارم پر کھڑا ہو کر آپ سے خطاب کروں۔

مجھے اس اعزازی سند کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جو ابھی ابھی مجھے عطا کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں یونیورسٹی کی اس خصوصی عنایت اور نوازش کے متعلق اپنے جذبۂ تشکر و امتنان کا کما حقہٗ اظہار کر سکوں۔ یہ امر میرے لئے خاص طور پر موجب مسرت ہے کہ مجھے یہ اعزازی سند اپنے شفیق اور محترم استاد پروفیسر سینکلیئر کے ساتھ عطا ہوئی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مجھے یونیورسٹی نے اس غیر معمولی عزت کا مستحق سمجھا ہے تو اسے میرے اساتذہ کا ہی فیضان سمجھنا چاہئے۔ اگر ان کی توجہ شاملِ حال نہ ہوتی تو یقیناً آپ آج مجھے یہاں نہ دیکھتے۔

پنجاب یونیورسٹی پاکستان کی سب سے بڑی اور سب سے پرانی دانشگاہ ہے، یہ وہ یونیورسٹی ہے جس نے اقبال پیدا کیا لاہور ہمیشہ سے ایک عظیم الشان تعلیمی مرکز رہا ہے۔ اور آزادی کے بعد تو اس کی یہ حیثیت اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ یہاں آتے ہی انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک علمی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ خدا اس شہر کو اور اس کے علمی ماحول کو ہمیشہ قائم رکھے۔ اس سے ملک و ملت کی عزت ہے۔

آج کا جلسہ ان نوجوانوں کو سندیں عطا کرنے کے لئے منعقد کیا گیا ہے جو اپنی تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ اب تک ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تعلیم حاصل کرنا تھا۔ اب انھیں زندگی کی گوناگوں مصروفیتوں میں الجھنا ہوگا اور اس دورِ حیات میں وہی تعلیم جو وہ حاصل کر چکے ہیں ان کے لئے مشعلِ راہ ہوگی۔ اس سے ان کے ارادوں کو پختگی نصیب ہوگی

اقامتی اردو کالج

کی

تعمیر میں حصّہ لیجیے

اُردو آپ کی
اُردو کالج آپ کا

اس کالج کی زیرِ تعمیر عمارت میں ایک اینٹ آپ بھی رکھیے

اختر حسین

(اختر حسین)
ہلال پاکستان
صدر انجمن ترقی اردو

جب ہم عوام، عوام الناس یا عامۃ الناس کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس تعلیم و تربیت سے محروم رہی ہے جس سے ہم مستفید ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو عوام میں شامل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ یعنی اپنے خیال کے مطابق ہم خود تو خواص ہیں اور دوسرے لوگ عوام۔ العوام کالانعام والا فقرہ بھی ہم جیسے لوگوں ہی کی ایجاد ہے۔ جو اپنے آپ کو کوئی اعلیٰ مخلوق سمجھتے ہیں۔ اور دوسرے انسانوں کو نوع انسانی سے بھی خارج کئے دیتے ہیں۔ اس قول کے متعلق اور جو کچھ بھی کہا جائے یہ امر یقینی ہے کہ یہ اسلامی نقطہ نگاہ سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ آپ کو جناب رسالت مآبؐ کی زندگی کا وہ واقعہ یاد ہوگا جب حضور نے چند عمائد قریش کو ایک نابینا صحابی پر ترجیح دی اور ان کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ اس پر وحی کے ذریعہ تنبیہ ہوئی۔ اسلام میں بڑے اور چھوٹے عوام اور خواص کی تفریق کے ختم کر دینے کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

یہ ایک ناخوشگوار حقیقت ہے کہ وہ ذہنی اور روحانی انفرادیت جو ہر انسان کی سیرت میں مضمر ہے، اکثر از خود نہیں ابھرتی۔ ایسے انسان شاذونادر ہی پیدا ہوتے ہیں جو ماحول کی پابندیوں کو توڑ کر اپنی شخصیت کی تعمیر مکمل کر لیتے ہیں۔ اور کوئی چیز ان کی انفرادیت کے ارتقا اور اظہار میں مانع نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس بے شمار ایسی مثالیں عام طور پر مشاہدے میں آتی رہتی ہیں جہاں ناسازگار حالات نے ہونہار لوگوں کو تعلیم اور ترقی سے محروم رکھا۔ ایسے شاعر جو شعر نہ کہہ سکے، ایسے ادیب جو ادب سے بیگانہ رہے، ایسے سائنسدان جو سائنس اور سائنسی تحقیق کے لئے کچھ نہ کر پائے۔ ایسے منتظم جو ملک کے نظم و نسق میں کوئی حصہ نہ لے سکے،

معاشرے کا یہ خلا کیسے پُر کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب صرف ایک ہے اور وہ ہے تعلیم۔ تعلیم کے دو حصے ہیں:

(۱) خواندگی ــــ یعنی لکھائی۔ پڑھائی اور بنیادی حساب۔

(۲) تعلیم ــ یعنی حقایق اشیا کا علم، علم تاریخ، علم الاقتصاد اور دوسرے علوم اور ان سب سے بڑھ کر انسان کی سیرت کی تربیت۔

یوں کہنا چاہیئے کہ اگر خواندگی کا کام حیوان ناطق کو آدمی بنانا ہے تو تعلیم کا مقصد آدمی کو انسان کے درجے تک پہنچانا ہے۔

کیا یہ وسیع خلا جو صدیوں سے چلا آتا ہے ایک معقول مدت میں تعلیم کے ذریعہ پُر کیا جا سکتا ہے۔؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ہمارے زمانے میں انسانی کوشش اور اس کے نتائج کی رفتار پہلے سے بہت تیز ہو چکی ہے اور وہ کام جن کے لئے ایک عرصہ دراز درکار تھا اب دنوں گھنٹوں اور منٹوں میں کئے جا سکتے ہیں۔ دوسرے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کی تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ قومیں اس خلا کو ایک بڑی حد تک کم کرنے میں کامیاب ہو گئی

راس کے سہارے ان کی کوششیں اپنے نصب العین سے ہم کنار ہو سکیں گی۔ یہی تعلیم اور اس کی عطا کردہ ہنرمندی ان کی زندگی
ساتھ دے گی۔ اس موقع پر میں تعلیم گاہوں کو الوداع کہنے والے طالبان علم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ان کی کاوش حصول سند
ے محدود نہیں تھی تو ان کی تعلیم یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد بھی جاری رہے گی اور خود زندگی ان کی معلم ہوگی۔ حصول علم زندگی بھر
م ہے۔ اور تعلیم یافتہ انسان کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ جب تک جیے طلب علم میں منہمک رہے۔

تعلیم انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ کسی انسان کے بارے میں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اسے تعلیم دینے کی ضرورت
یں۔ یا وہ اتنا حقیر اور کم مایہ ہے کہ تعلیم سے اس کو کوئی فائدہ پہنچنے کی امید نہیں۔ ہم اکثر "عام انسانوں" کے بارے میں
وچتے اور گفتگو کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان بھی عام انسان نہیں۔ نوع انسانی کا ہر فرد ایک ایسی انفرادی
ملاحیت کا مالک ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ظاہری اعتبار سے اگرچہ انسانوں کی ساخت اور شکل و صورت
ں ایک بنیادی مماثلت پائی جاتی ہے، ہر ایک کے ہاتھ پاؤں، کان ناک ہوتے ہیں مگر کروڑوں اور اربوں کی آبادی
ں بھی کوئی دو آدمی ایک ہی شکل و صورت کے نہیں پائے جاتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک صانع
درت نے دو انسان ایک جیسے نہیں بنائے۔ یہ اس کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے کہ اگرچہ صورتیں ایک حد تک ایک دوسرے
ے ملتی ہیں، مگر بعینہٖ ایک سی نہیں ہوتیں۔

شکل و صورت کا اختلاف انسان کی انفرادیت کا ظاہری مظہر ہے مگر یہ انفرادیت ظواہر تک محدود نہیں ہے جس طرح
سی انسان کی شکل کسی دوسرے انسان سے نہیں ملتی۔ اسی طرح ہر انسانی شخصیت ذہنی اور روحانی اعتبار سے دوسروں سے
منفرد اور متمیز ہوتی ہے۔ خدا نے ہر انسان کو کوئی نہ کوئی ذہنی یا روحانی خصوصیت ایسی عطا کی ہے جو کسی اور کو نہیں دی گئی۔
س خصوصیت کی بنا پر ہر شخص کوئی نہ کوئی کام ایسا کر سکتا ہے جو کسی اور کے بس کا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ایک بھی شخص وہ
م نہ کرے جو صرف وہی کر سکتا ہے تو انسانی معاشرے کی مجموعی جد و جہد میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ جسے کوئی اور
شخص پر نہیں کر سکتا۔ یعنی معاشرے کے کسی ایک فرد کی کوتاہی سارے معاشرے کی کوشش کو ناکام اور اس کے
موعی کارنامے کو نامکمل رکھتی ہے۔

جوں جوں وقت گذرتا رہا ہے یہ خلا وسیع ہوتا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرے کی خرابیوں میں
ی اضافہ ہوتا رہا ہے۔ آج اگر ہم دنیا میں جہالت، افلاس، بیماری، تعصب، عناد اور جنگ کے مناظر دیکھ رہے ہیں اور خود
رۂ ارض کا مستقبل ہمیں مشکوک نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے کے افراد کی ایک بہت بڑی تعداد نسلاً
بعد نسل اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ ان افراد کو اپنی صلاحیتوں سے آگاہ ہونے اور اپنی
نفرادی خصوصیات کو بروئے کار لانے کا موقع نہیں ملا۔ اگر انھیں یہ موقع ملتا تو سارے معاشرے کی وہ کیفیت
نہ ہوتی جو آج ہے۔

اُطلبوا العِلمَ مِنَ المَہدِ اِلَی اللَّحد

علم حاصل کرنے کے لئے چین جیسے دور دراز ملک تک بھی جانا پڑے تو جاؤ

اُطلبوا العلمَ وَلو کانَ بِالصّین

ہر مسلمان مرد اور عورت کا فرض ہے کہ علم حاصل کرے۔

طلب العلم فریضة علیٰ کُلِّ مُسلِم ومسلمة

اور حضورؐ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص طلب علم کے دوران میں مرجائے تو وہ شہید ہے۔

من مات فی طلب العلم فھو شہید

حقیقت یہ ہے کہ حضور رسالتمآبؐ کی ذات گرامی سے علم کو جو فیض پہنچا وہ ہمیں دنیا کی تاریخ میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر ہم قرآن و حدیث پر نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک علمی تحریک ہے۔ کہا گیا ہے کہ قرآن میں لفظ علم اور اس کے مشتقات چار سو سے زیادہ دفعہ آئے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں علم و تعلیم کی جو خدمت کی ہے اس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ مغرب میں علم کی مشعل مسلمان ہی لے کر گئے تھے۔ آج یورپ اور امریکہ کو جس علم پر ناز ہے اور جس کے ذریعہ انھیں ساری دنیا پر غلبہ حاصل ہے۔ اس کا سرچشمہ اسلام ہی ہے۔ البتہ جہاں تک علم کی اہمیت کا تعلق ہے۔ آج کی مہذب دنیا اسلام سے بہت پیچھے ہے۔ ہمارے زمانے میں اقوام متحدہ نے تعلیم کو انسان کے بنیادی حقوق میں تو شمار کیا ہے مگر اسے انسان کے لئے فرض قرار نہیں دیا۔ اس کے برعکس جناب رسالت مآبؐ کا حکم ہے کہ طلب علم ایک فرض ہے۔ انسان اپنے حق سے تو دستبردار ہو سکتا ہے۔ مگر فرض سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔

اسلامی ثقافت کا علمی پہلو نمایاں اور واضح ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ شاہ سلیمان پھلواری مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے۔ کہ خود حضورؐ کے اپنے زمانے میں جو شخص اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، اسے ابوجہل کہا گیا۔ ابوالکفرنہ کہا گیا۔

جناب علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے ایک شعر منسوب ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ صرف اہل علم قابل فخر ہیں کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو سیدھے راستے پر ہیں، اور دوسروں کو بھی اس راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

لا فخر الا لاہل العلم انھم

علی الھدیٰ لمن استھدیٰ ادلاء

ایک اور شعر بھی جناب علیؓ سے منسوب ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ میں خدا کی اس تقسیم سے خوش ہوں کہ مجھے علم اور جاہلوں کو دولت۔

رضینا قسمة الجبار فینا	لنا علم وللجھال مال

ہیں۔ جو کام انہوں نے کیا ہے وہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔ اگر دنیا کی پسماندہ آبادی تعلیم یافتہ ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ انسانی معاشرے کا یہ خلا نہ صرف اور بھی کم بلکہ پورے طور سے پُر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو سکے تو یہ دنیا جو آج بہت سے بھوکے، جاہل اور بیمار انسانوں کے لئے دوزخ کا حکم رکھتی ہے ساری نوع انسانی کے لئے ایک جنت بن جائے گی۔

تعلیم جتنی پھیلے گی اتنا ہی معاشرے کے لئے یہ ممکن ہو گا کہ یہ اچھے سے اچھے اور قابل سے قابل انسان پیدا کرے۔ آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں عموماً اور پسماندہ ملکوں میں خصوصاً علمی اور عملی ذمہ داریوں کی اہلیت رکھنے والے لوگ کم ہیں اور جتنے کم ہیں اتنا ہی ان پر کام کا بوجھ زیادہ ہے تعلیم زیادہ ہو گی تو قابلیت کا دائرہ وسیع اور انتخاب کا معیار بلند ہو گا لوگوں میں نئی نئی صلاحیتیں ابھریں گی اور معاشرے کو اپنی خدمت کے لئے پہلے سے زیادہ اور بہتر کارکن مہیا ہو سکیں گے

اسلام کی نظر میں تعلیم کی کیا اہمیت ہے؟ ہمارے لئے یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اگر ہم مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے لازم ہے کہ اپنی زندگی کو اسلام کے اصولوں پر ڈھالیں۔

غور فرمائیے وحی کا پہلا کلمہ ہے اقراء یعنی پڑھو۔ اس کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ پہلے نہیں جانتا تھا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ـــــ آدم کی پیدائش کے فوراً بعد اسے اسمائے اشیاء کی تعلیم دی گئی ۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

یہ بھی واضح ہے کہ جاہل اور عالم کا درجہ یکساں نہیں۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

خود جناب رسالتمآبؐ کو اس دعا کا حکم دیا گیا۔ اے میرے رب میرے رب میرے علم میں اضافہ کر۔

قُلْ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا

حکمت جس کو قرآن میں خیر کثیر کہا گیا ہے

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

اس کا اہم ترین عنصر بعض علماء کی رائے میں حقایق موجودات کی معرفت ہے۔ خود جناب رسالتمآبؐ کی دعا ہے کہ اے میرے رب مجھے حقایق کا علم دے۔

رَبِّ اَرِنِيْ حَقَائِقَ الْاَشْيَاءِ

قرآن میں بار بار علم، عقل، شعور اور تفکر کا ذکر آیا ہے۔ اور یہ تنبیہ بھی ایک سے زیادہ بار کی گئی ہے کہ تم کیوں علم حاصل نہیں کرتے۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

جہاں تک حدیث کا تعلق ہے جناب رسالتمآبؐ کے ارشادات علم اور تعلیم کے ذکر سے پُر ہیں۔ مثلاً یہ کہ پیدائش سے موت تک علم حاصل کرنا چاہیئے۔

گجراتی جیسی کئی زبانیں مسلمانوں کے دور میں پلیں اور بڑھیں۔

خود پاکستان کا تصور ہماری تعلیمی تحریک سے وابستہ ہے۔ اگر سید احمد خاں مرحوم و مغفور مسلمانوں کو دوبارہ علمی ذوق اور جستجو سے آشنا نہ کرتے تو یہ ملک جس میں ہم آزادی کا سانس لے رہے ہیں، اس کا قیام ناممکن ہوتا۔ نہ ہمارے پاس اقبال ہوتے نہ جناح۔ نہ ہمیں اپنے ماحول کا فہم ہوتا نہ ہم بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کے تقاضوں کو سمجھ سکتے۔ چہ جائیکہ اپنے ملی مفاد کا تحفظ کر سکیں۔ بالاکوٹ اور دہلی کی شکستوں کے بعد اگر کسی چیز نے ہماری گرتی ہوئی قوم کو سنبھالا تو وہ علیگڑھ کی تعلیمی تحریک تھی۔ علی گڑھ نہ ہوتا تو پاکستان بھی نہ ہوتا۔ آج اگر ہم اپنے وطن کو دنیا میں قوی اور سربلند دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ ہم تعلیم کو پاکستان میں عام کریں۔ پاکستان کی بنیاد ایک تعلیمی تحریک پر ہے اور ایک تعلیمی تحریک ہی اسے قوت اور عظمت بخش سکتی ہے۔

پاکستان میں معاشی ترقی کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے اقتصادی پہلو پر قائد اعظم اور لیاقت علی خاں دونوں کی نگاہ تھی۔ قائد اعظم نے کیبنیٹ مشن پلان کو ابتدا میں اس لئے منظور کیا کہ اس میں گروپ بندی کی اسکیم کے تحت برصغیر کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصوں کے لئے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی معاشی منصوبہ بندی اور ترقی کا راستہ کھلا تھا۔ جب کانگریس نے گروپ بندی کی مخالفت کی تو قائد اعظم نے سارے پلان کو رد کر دیا۔ لیاقت علی خاں نے ۱۹۴۶ء والے بجٹ میں دریائے سندھ کے طاس، دریائے گنگا اور دریائے برہم پترا کے طاس کے سارے رقبے میں علاقائی منصوبہ بندی کو لازم قرار دیا تھا۔ ہماری جنگ آزادی کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنی اقتصادی پسماندگی سے نکل کر خوشحال ہوں اور اپنے معیار زندگی کو بلند کر سکیں۔ آج ہمارا ملک معاشی منصوبہ بندیوں کے ایک عظیم الشان تجربے میں مصروف ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ قدرت نے جو وسائل اور جو صلاحیتیں ہمیں ودیعت کی ہیں، ان کو کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری سے ترقی دیں۔ ہماری خواہش ہے کہ اپنے وطن عزیز کو افلاس، جہالت اور بیماری سے پاک کر کے دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی پہلی صف میں لا کھڑا کریں۔ ہم معاشی ترقی کی ضرورت اور اہمیت کے پورے طور سے معترف ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہم ابھی تک اس بنیادی چیز کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کر سکے ہیں، جو معاشی ترقی کی کلید ہے۔ یعنی تعلیم۔ جس ذوق و شوق سے ہم میں سے ہر شخص دولت پیدا کرنا چاہتا ہے علم حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ ایک زمانے تک تو دنیا کے ماہرین معاشیات بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ تعلیم کا معاشی ترقی سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے اب یہ غلط فہمی دور ہو چکی ہے۔ یہ بات نظری اور عملی ہر دو پہلو سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ معاشی ترقی کے فروغ میں تعلیم ایک غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ اس حقیقت کی نشاندہی آج سے بہت پہلے بیسویں صدی کے شروع میں مشرق میں اقبال اور مغرب میں الفرڈ مارشل نے کی۔ لیکن اس وقت ماہرین نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ آج معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آج ترقیاتی معاشیات کے بیشتر ماہرین اس بات کے قائل ہو چکے ہیں۔ کہ مغربی ممالک کی معاشی ترقی میں بڑا دخل ان کی تعلیمی ترقی کا ہے۔ موجودہ زمانے میں کوئی ملک تعلیم کو

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے حافظے میں کچھ کمزوری محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنے استاد وکیع سے اس کی شکایت کی۔ وکیع نے کہا کہ تم اپنی زندگی کو پاکیزہ بناؤ۔ کیونکہ علم خدا کا دیا ہوا ایک نور ہے اور یہ نور معصیت کاروں کو نہیں دیا جاتا۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی   فاوصانی الی ترک المعاصی
فان العلم نور من اللہ   و نور اللہ لا یعطی لعاصی

متنبی کہتا ہے کہ دنیا میں کتاب سے بہتر کوئی رفیق نہیں ہے۔

وخیر جلیس فی الزمان کتاب

مولانا روم کا قول ہے کہ علم دنیا کی جان ہے۔

خاتم ملک سلیمان است علم   جملہ عالم مردہ و جان است علم

حافظ جب اپنی فرصت کے لمحات کا پروگرام بناتا ہے تو کتاب کو ایک لازمی جزو قرار دیتا ہے۔

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

سعدی کہتا ہے کہ بنی آدم کے لئے کمال حاصل کرنے کا ذریعہ علم ہے نہ کہ دولت۔

بنی آدم از علم یابد کمال   نہ از حشمت و جاہ و مال و منال

علم کے لئے شمع کی مانند جلتے اور پگھلتے رہنا چاہئے۔ کیونکہ بے علم آدمی خدا کو نہیں پہچان سکتا۔

پے علم چوں شمع باید گداخت   کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

علم قوت ہے۔

توانا بود ہر کہ دانا بود

اسلام کے علمی پہلو سے متعلق یہ چند اشارے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ برصغیر ہند و پاک کی تاریخ میں ہمیں تین بڑی تعلیمی تحریکیں نظر آتی ہیں۔ جن کا تعلق بدھ مت، اسلام اور عیسائیت سے ہے۔ ان میں سب سے بڑی اسلام کی تحریک ہے۔ مسلمانوں نے اپنے دور میں تعلیم کو جس قدر عام کیا کسی اور نے نہیں کیا۔ نہ صرف یہ کہ ہر مسجد اور ہر خانقاہ ایک تعلیم گاہ تھی۔ بلکہ اس کے علاوہ بے شمار مکتب مدرسے اور کتب خانے قائم کئے گئے اور غیر مسلموں کو بھی ان کی اپنی درسگاہوں کے علاوہ سارے تعلیمی نظام سے کاملاً مستفید ہونے کا موقع دیا گیا۔ وہ ملک جہاں تعلیم ایک خاص طبقے تک محدود تھی۔ اور جہاں ڈاکٹر امبیدکر کے قول کے مطابق نیچ ذات کے لوگ اگر کسی مقدس کلام کو سننا چاہتے تھے تو ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جاتا تھا، وہاں ہر فرد واحد کے لئے تعلیم ممکن ہو گئی۔ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں مقامی اور ملک [illegible] اگر ما [illegible] مذہب کی یادگار ہے تو اردو، بنگالی اور

ہے ؛ وہی تعلیم۔ اگر ہم اس بات کے خواہاں ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر صلح و آشتی کی زندگی گذاریں تو ہمیں دنیا کے ہر ملک میں ایک نئی تعلیم اور ایک نئے نصاب تعلیم کے لیے ایک عالمگیر تحریک شروع کرنی ہوگی۔

خواتین و حضرات! شاید آپ مجھ سے پوچھیں کہ میں نے آپ جیسے تعلیم یافتہ لوگوں کی تعلیم جیسے پیش پا افتادہ موضوع پر اس قدر سمع خراشی کیوں کی ہے۔ اس جسارت کے لیے مجھے دو عذر پیش کرنے ہیں۔ اول تو مجھے یہ کہنا ہے کہ پاکستان نے جہاں اپنی اکیس سالہ زندگی میں بڑے بڑے عظیم الشان اور حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے ہیں وہاں تعلیم کے معاملہ میں بھی منصوبہ بندی اور اس پر عملدرآمد کی طرف اپنے ملکی وسائل کے مطابق توجہ دی ہے۔ چنانچہ اب تیسرے پنج سالہ منصوبے کا نصب العین چھ اور گیارہ سال کی عمر کے بچوں کے لیے ستر فیصد خواندگی کا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ اگلے بیس سال میں پاکستان کی ساری آبادی نوشت و خواند سے آشنا ہو جائے گی۔ ہمارے محترم صدر مملکت کو اس معاملہ کی اہمیت کا پورا احساس ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ اگلے دس سال میں سو فیصد خواندگی لازم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے اس حکم کے پیش نظر تعلیمی منصوبوں پر نظر ثانی کی جائے گی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آج ہماری ساری آبادی میں سے مغربی پاکستان میں خواندگی کی شرح ۱۳،۶ فیصد اور مشرقی پاکستان میں ۱۷،۶ فیصد ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ کام کس قدر اہم اور محنت طلب ہے۔

دوسری اور اصل وجہ میرے تعلیم کے متعلق گفتگو کرنے کی یہ ہے کہ سو فیصد خواندگی کا پروگرام اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم تعلیم یافتہ لوگ اس میں پورے طور سے شرکت کر کے حکومت کا ہاتھ نہ بٹائیں۔ ہم خوش قسمت لوگ ہیں جنھیں تعلیم جیسی دولت حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے معاشرے نے ہمارے لیے قربانیاں کر کے ہماری پرورش کی ہے، اس نے ہمیں تعلیم دی اور خود جاہل رہا، اس نے ہمیں روزی کمانے کے قابل بنایا لیکن خود بے کار اور افلاس میں مبتلا رہا۔ اس معاشرے کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔ ہم اس احسان کا بدلہ نہیں دے سکتے۔ البتہ ضرور کر سکتے ہیں کہ اس نعمت کے شکرانے کے طور پر جو تعلیم کے ذریعہ ہمیں حاصل ہوئی ہے ہم معاشرے میں تعلیم کو فروغ دیں اور قدمے، درمے، سخنے جیسے بھی ہو سکے تعلیم کی مدد کریں۔ کیا ہم یہ نہیں کر سکتے کہ جب ہم برسر روزگار ہوں تو اپنے حلقہ میں جہاں تک ہو سکے تعلیم پھیلائیں۔ وقت ملے تو خود اپنے ان پڑھ متعلقین کو پڑھائیں۔ اس کے لیے وقت نہ ہو تو تقریر و تحریر کے ذریعے تعلیم کی تبلیغ کریں اور اپنی آمدنی میں سے جو کچھ بچے اس کو تعلیمی مقاصد پر صرف کریں۔ مدد شخصی ہو یا مالی ہو، ہر حال میں قیمتی ہے۔ اگر ہم اپنی استطاعت کے مطابق تعلیم کی خدمت کریں گے تو وہ دن دور نہیں جب پاکستان دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں سب سے آگے ہوگا۔ ہم دوسروں کے لیے ایک مثال ہوں گے اور بجائے اس کے کہ دوسروں کے دست نگر ہوں، ساری نوع انسان ہم سے ذہنی، روحانی اور مالی استفادہ کرے گی۔ دنیا میں اسلام کا نام بلند ہوگا، اسلام کا غلبہ ہوگا۔ نوع انسان کے مسائل اور معاملات اسلام کے اصولوں کی روشنی میں طے ہوں گے۔ دنیا میں عدل و انصاف، صلح و آشتی، علم و تحقیق کا دور دورہ ہوگا اور نوع انسانی کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ اس زمین

بڑھائے بغیر معاشی میدان میں تیز رفتار ترقی نہیں کرسکتا جن حضرات کی نظر سے تھیوڈور شلٹز۔ ایورین۔ ہیگان۔ فریڈرک ہاربی سن، جان وائی زی، جان کینتھ گالبریتھ، اوڈاوکرسٹ اور دوسرے علمائے معاشیات کی تحقیقات گذری ہیں، وہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ ان سب کی نگاہ میں تعلیم معاشی ترقی کا اصل زینہ ہے اور اس پر جو کچھ صرف کیا جائے وہ معاشیات کی اصطلاح میں سرمایہ کاری کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج انہی علما اور مفکرین کے خیالات کا اثر ہے کہ عالمی بینک نے بھی تعلیم کے لئے امداد مہیا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگرچہ وسائل کے محدود ہونے کی وجہ سے یہ امداد فی الحال ثانوی تعلیم کے لئے فراہم کی جائے گی۔ معاشی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد معاشی مسائل کو سمجھیں، اور وسائل کا استعمال بہترین طریقے سے کرسکیں۔ تعلیم اس کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ معاشی ترقی کے لئے ایجاد و اختراع اور بہترین فنی مہارتوں کا حصول ناگزیر ہے اور اس کا انحصار تعلیم اور تعلیمی تحقیق پر ہے۔ معاشی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کی ذہنی سطح کو بلند کیا جائے اور انہیں علم اور ہمہ گیر ترقیاتی تجربے میں ہر قدم پر ان کو شریک کیا جائے۔ تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے یہ شرکت بروئے کار آسکتی ہے۔ خاص طور پر زراعت کے میدان میں جس کی معاشی حیثیت ہمارے لئے فیصلہ کن ہے۔ معاشی ترقی کے لئے ہمارے دیہات میں ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو فہم و فراست کے ساتھ ساتھ جرأت اور مہارت سے بھی آشنا ہو۔ یہ نئی قیادت ہماری تعلیم گاہوں میں ہی تیار ہوسکتی ہے پاکستان میں تعلیم جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی معاشی ترقی بھی آگے بڑھے گی۔ پڑھے لکھے شہری اور دیہاتی نہ صرف معاشی منصوبوں میں شرکت کرسکیں گے بلکہ ان کی شرکت کی وجہ سے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے کارکن بھی اپنے فرائض کی انجام دہی میں کاہلی اور بددیانتی سے اجتناب کریں گے۔

ہمارے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے معاشرے کی فلاح اور اصلاح کے لئے جو منصوبے وقتاً فوقتاً بناتے رہتے ہیں وہ خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق ہوں یا بچت کی اسکیموں سے یا کسی اور فلاح و بہبود کی اسکیم سے۔ ان کی تبلیغ و اشاعت کے لئے جو بورڈ اور اشتہارات لگائے جاتے ہیں ان کا فائدہ ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں، جو انہیں پڑھ سکیں۔

تعلیم کا جو تعلق ہماری سیاسی زندگی سے ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ سیاست کی بنیاد افراد کے حقوق اور فرائض پر ہے۔ اور تعلیم کے بغیر کسی فرد کو اپنی ذمہ داریوں کا پورے طور سے احساس نہیں ہوسکتا۔ تعلیم انسان کی طبیعت میں ایک اعتدال اور توازن پیدا کرسکتی ہے۔ جو دوسروں سے مل کر زندگی گزارنے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ ہم تعلیم کے ذریعہ جس قسم کا معاشرہ تعمیر کرنا چاہیں کرسکتے ہیں۔ تعلیم کی تبدیلی سے معاشرے کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

آج دنیا میں بڑے بڑے مفکرین امن عالم پر غور کررہے ہیں۔ کیونکہ اگر خدانخواستہ کسی وقت تیسری عالمگیر جنگ ہوجائے تو بہت ممکن ہے کہ کرۂ ارض کا وجود ہی خلا سے ناپید ہوجائے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو تو اس کا کیا علاج

سید مبارز الدین رفعت

علامہ اقبال کا "حرفِ شیریں"

بال جبریل کے ابتدائی حصے میں جو دوسری غزل ہے اس کا مطلع ہے ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اس غزل کا چوتھا شعر ہے ؎

محمد بھی ترا، جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں، ترجماں تیرا ہے یا میرا

بال جبریل کی اب تک دو شرحیں چھپی ہیں، ایک ہے "مطالب بال جبریل" مولانا غلام رسول مہر کی لکھی۔ اس کتاب میں مذکورہ بالا شعر کا مطلب بیان کیا گیا ہے ؎

"اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تیرے ہیں، تو نے انہیں خاتم المرسل بنایا، تو نے انہیں سب سے آخر میں کائنات کی ہدایت کے لئے بھیجا، جبریل بھی تیرے ہیں، وہ تمام انبیاء کے پاس تیرا پیغام پہنچاتے ہیں اور تیرے احکام لاتے ہیں، قرآن مجید بھی تیری نازل کی ہوئی کتاب ہے۔ مگر یہ میٹھی بات، جسے جذبۂ عشق کہتے ہیں، تیرا ہی ترجمان ہے، میرا نہیں۔"

(مطالب بال جبریل - کتاب منزل لاہور - ص - ۵)

بال جبریل کی دوسری شرح کے مصنف ہیں، پروفیسر سلیم چشتی۔ وہ اس شعر کی شرح یوں فرماتے ہیں۔

"اے خدا! اس میں شک نہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل اور قرآن حکیم یہ تینوں تیرے ترجمان ہیں، یعنی تیری ہی مرضی اہل دنیا پر ظاہر کرتے ہیں اور تیری مرضی وہ شریعت (دستور زندگی) ہے جو تو نے قرآن کی صورت میں سرکار دوعالم کے واسطہ (ذریعہ) سے بنی آدم کے لئے نازل فرمائی ہے، لیکن یہ حرفِ شیریں یعنی جذبۂ عشق و محبت جو انسان کے قلب میں موجزن ہے یہ بھی تیرا ہی ترجمان ہے، یعنی یہ تیرا ہی پیدا کردہ ہے

اپنے چھوٹے بڑے جھگڑے ختم کر کے ساری کائنات کی تسخیر میں مشغول ہو جائے۔

خواتین و حضرات! مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب مجھے ایک بار اور اس عزت افزائی کے لئے جناب والا کا شکریہ ادا کرنا ہے اور اپنے نوجوان سندیافتہ عزیزوں کے لئے یہ دعا کہ خدا ان کا حافظ و ناصر ہو۔ زندگی میں کامیابی عطا کرے اور یہ ہمت دے کہ علم اور تعلیم کو جو اسلام کا بنیادی تقاضا اور پاکستان کے مستقبل کا ضامن جہاں تک ہو سکے فروغ دیں۔

" جذبۂ پیکار " " جذبۂ بندگی " " کتاب " " آدمی " یا کچھ اور الفاظ ویسے ہی بے دلیل رکھ دیئے جاسکتے ہیں جیسے کہ جذبۂ عشق "۔

عہد قدیم کی فارسی یعنی پہلوی زبان کے دنیا سے مٹ جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ دین زردشت کے علما نے اس زبان میں لکھے ہوئے علم دین کو اپنا اجارہ بنا لیا تھا، اس اجارہ داری کو برقرار رکھنے اور اس زبان میں لکھے ہوئے علوم تک عوام کی رسائی کو روکنے کے لئے انہوں نے یہ انوکھی ترکیب ایجاد کی تھی کہ وہ اس زبان میں لکھتے کچھ تھے اور اس کے معنی کچھ اور لیتے تھے۔ مثلاً لکھتے "ملکاں ملکا" اور پڑھتے تھے "شاہنشاہ" لکھتے ٹوپی، پڑھتے جوتا، لکھتے گھوڑا، پڑھتے آدمی اس کو اصطلاح میں وہ " ہوزوارش" کہتے تھے۔ اس " ہوزوارش" کے ماہر بس دین زردشت کے علما ہی تھے، انہی کے پاس اس رمزیہ زبان کی کلید ہوتی تھی، عوام کے پاس یہ کلید نہ تھی، اس لئے پہلوی میں لکھی ہوئی تحریریں ان کے لئے چیستاں ہی رہیں۔ ان کے پلے کچھ بھی نہ پڑتا تھا۔

علامہ اقبال کے مذکورہ بالا شعر میں "حرف شیریں" یا "حرف شیریں ترجماں" کے معنی "جذبۂ عشق" بتانا دین زردشت کے علماء کے " ہوزوارش" سے کچھ کم نہیں ہے۔

خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم نے اپنے ایک مضمون "بال جبریل اور معترضین" میں مذکورہ بالا شعر کے "حرف شیریں" کی تشریح ایک اور انداز سے کی ہے، لکھتے ہیں۔

... : رسالہ شاعر آگرہ کے صرف ایک نمبر میں تین مضمون دیکھے جن میں بال جبریل کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مستحق (توجہ؟) حضرت سیماب اکبر آبادی کے اعتراضات ہیں، کیونکہ جناب موصوف خود بھی ایک نامور اور گراں پایہ شاعر ہیں، ماہر فن ہیں، محقق ہیں، موصوف کے اعتراضات کی نوعیت کا تجزیہ ہو جانے کے بعد باقی کا بھرم خود بخود کھل جائے گا۔

اس کے بعد بال جبریل کے مختلف اشعار پر سیماب اکبر آبادی کے اعتراضات نقل کئے ہیں اور ان کے جواب دیئے ہیں، یہ مذکورہ بالا شعر پر سیماب اکبر آبادی کا اعتراض نقل کیا ہے اور اس کا جواب دیا ہے :

" اعتراض "

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

" یہ حرف شیریں میں " یہ " کا مشار الیہ کون ہے؟ کونسا حرف شیریں؟ ۔ اس کے علاوہ شعر مفہوم سے قطعاً آزاد ہے۔

• جواب :۔

یہ شعر ایک مسلسل نظم کا جزو ہے۔ نظم کا خاکہ یہ ہے کہ شاعر زوال آدم کے مسئلے پر غور کرتا ہے اور اپنے شکوک خلاق

اور ہم اسی جذبہ کے تحت بعض اوقات تیرے قوانین کو توڑ دیتے ہیں۔ پس تو ہم پر نگاہ کرم فرما اور ہماری خطاؤں کو معاف کر دے!"

"دوسرا مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ اے خدا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت جبریل اور قرآن حکیم یہ تینوں تیرے ترجمان ہیں، یعنی دنیا والوں کے لئے تیری ہستی کا ثبوت ہیں، لیکن یہ "حرف شیریں" یعنی یہ جذبۂ عشق میری ہستی کا ثبوت ہے۔"

"واضح ہو کہ انسان اسی جذبۂ عشق کی بدولت اللہ اور اس کے رسول برحق کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی جان پر کھیل جاتا ہے، ورنہ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ انسان ان مقامات سے بالکل اجتناب کرے، جہاں جان کا خطرہ ہو، اسی حقیقت کو اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

(شرح بال جبریل - ص ۹۲ - ۹۳ - عشرت پبلشنگ ہاؤس - لاہور)

بال جبریل کے دونوں شارحوں نے اس شعر میں "حرف شیریں" کے معنی "جذبۂ عشق" بتائے ہیں۔ مولانا مہر نے تو جذبۂ عشق کی تشریح نہیں کی ہے لیکن پروفیسر چشتی نے جذبۂ عشق کے سلسلہ میں ایک بے محل وعظ بھی ارشاد فرما دیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "مطالب بال جبریل" ۱۹۵۲ء میں چھپی ہے، پروفیسر سلیم چشتی کی شرح بال جبریل پر کوئی سنہ اشاعت درج نہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بال جبریل کے ان دونوں شارحوں میں پہلے کس نے "حرف شیریں" کو جذبۂ عشق سے تعبیر کیا اور کس نے اپنے پیش رو کی تقلید میں اسی کو دہرا دیا، یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ آزادانہ یہی مفہوم سمجھا ہو۔

مذکورہ بالا شعر کے مصرعۂ ثانی کو دو طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ اول اس طرح ع

مگر یہ "حرف شیریں" ترجماں تیرا ہے یا میرا

یعنی یہ میٹھا بول کیا تیرا ترجمان ہے یا میرا؟

دوم اس طرح ع مگر یہ "حرف شیریں ترجماں" تیرا ہے یا میرا

یعنی یہ میٹھی ترجمانی کرنے والا حرف "میرا ہے یا تیرا"

سوال یہ ہے کہ "حرف شیریں" یا "حرف شیریں ترجماں" کو "جذبۂ عشق" کیوں سمجھا جائے؟ اس کے لغوی معنی ہوئے "میٹھا بول یا میٹھی ترجمانی کرنے والا کلام"۔ میٹھا بول یا میٹھی ترجمانی کرنے والا کلام جذبۂ عشق کیسے ہوا، شعر کے سیاق و سباق میں یا الفاظ کی ترکیب میں ایسا کوئی اشارہ، ایسا کوئی نکتہ یا ایسا کوئی لفظ بھی نہیں جس کی وجہ سے قاری کا ذہن "جذبۂ عشق" کی جگہ
... معنی ... مستعد ہو سکے ہیں۔ "جذبۂ عشق" کی جگہ کوئی اور بدل

اثر مرحوم نے "حرف شیریں ترجمان" رموز و احکام الٰہی کا ترجمان، فصاحت و بلاغت کا معجزہ "قرآن" مراد لیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ "حرف شیریں" یا "حرف شیریں ترجمان" کی یہ توجیہ "جذبۂ عشق" کے مقابلہ میں کہیں زیادہ قابل قبول ہے لیکن پہلے مصرعے میں "قرآن بھی تیرا" کی وجہ سے ایک الجھن سی پیدا ہو جاتی ہے "یہ حرف شیریں" سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "یہ" قرآن کے سوا کوئی اور چیز ہے

ڈاکٹر وزیر آغا نے پی ایچ ڈی کی سند کے لئے "اردو ادب میں طنز و مزاح" کے تحت ایک فاضلانہ مقالہ لکھا ہے۔ اس مقالہ میں ضمناً ایک جگہ اس شعر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی جو تشریح انہوں نے کی ہے وہ مذکورہ شارحوں کی بیان کی ہوئی شرح سے زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے، ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں ؎

"یہ "حرف شیریں ـــ" خالق کائنات سے مخاطب ہونے کا یہ البیلا انداز قطعاً اقبال کا اپنا انداز ہے لیکن شاید اس انداز کی کامیابی کی اصلی وجہ وہ ظرافت ہے جو ان اشعار میں ایک برقی رو کی طرح دوڑتی ہے اور ناظر کے لبوں پر بھی ایک شریر سا تبسم پیدا کر دیتی ہے"

(اردو ادب میں طنز و مزاح ص ۱۲۰ – ۱۲۱ – اکادمی پنجاب لاہور – ۱۹۵۸ء)

"حرف شیریں" یا "حرف شیریں ترجمان" سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی مراد اپنی شاعرانہ صلاحیت اور شعر کے پردے میں اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کی قدرت ہے جو خالق نبیؐ، خالق قرآن اور خالق جبریل پر بھی چوٹ کرنے سے نہیں چوکتی اسی لئے اقبال ڈٹ کر کہتے ہیں کہ حضور نبی کریمؐ بھی تیرے، قرآن بھی تیرا اور جبریل بھی تیرے، غرض ساری کائنات تیری اور تیری ہی تخلیق کردہ سہی، لیکن میری شاعری جو میرے دلی جذبات کی ترجمان ہے اور بڑے شیریں انداز میں تجھ پر وار کرنے سے نہیں چوکتی، کس کی چیز ہے اور کس کی تخلیق ہے؟ کیا یہ بھی تیری ہی تخلیق ہے اور تیری ہی چیز ہے؟ اور وہ مجھ ہی پر اعتراض کرے تو وہی بات ہوئی، ہماری بلی اور ہم ہی سے میاؤں، تیری تخلیق کی یہ نیرنگی میری سمجھ میں نہیں آئی۔

اگر اس شعر میں "حرف شیریں" یا "حرف شیریں ترجمان" کے معنی اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں تو خدا را کوئی رہنمائی کرے بہتوں کا بھلا ہوگا۔

کے حضور میں پیش کرتا ہے، سوچتا ہے کہ ستاروں کی گردش خلاف ہے ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

عرض کرتا ہے کہ سارا جہاں تیرا ہے۔ رکھ یا مٹا۔ مگر مجھے امین یا خلیفہ یا اپنا نائب بنا کر کیوں بھیجا اور بھیجا تھا تو ایسا مکمل و رونا چار کیوں بنایا؟

پھر دیکھتا ہے کہ وہ مردان عارف و باصفا نہیں ہے جن کے نعرہ ہائے شوق سے فضائے قدس دبساط لاہوت پر سناٹا چھا جاتا تھا، جس کے مقابلے میں کروبیوں کی تسبیح و تہلیل کمزور ہو جاتی تھی، لہٰذا عرض کرتا ہے ؎

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یا رب، لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

سخت ناانصافی ہوگی اگر دوسرے مصرعے کے استفہام سے یہ مطلب نکالا جائے کہ معاذ اللہ خدا کو خطاوار ٹھیرایا جا رہا ہے صرف یہ سمجھنا چاہیئے کہ قائل کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خطا کا تعین کس کے ساتھ کرے، شیطان یا عزازیل کی نافرمانی یاد آتی ہے خیال ہوتا ہے کہ خرابی کی ابتدا وہیں سے ہوئی، خیر و شر کی بنیاد پڑی، فلسفیانہ دماغ اس پر قانع نہیں ہوتا اور پوچھتا ہے کہ ابلیس کو سجدۂ آدم سے انکار کی جرأت ہی کیوں کر ہوئی، جب حکم خداوندی ہو چکا تھا ؎

اسے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا؟ وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

خیر جو کچھ ہونا تھا ہوا ــــ ختم المرسلین آیۂ رحمت بن کر مبعوث ہوئے، فساد کو مٹ جانا تھا، مگر قائم ہے، وہ نہیں ہے، مگر ان کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہوا، حرف شیریں یعنی رموز و احکام الٰہی کا ترجمان، فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرآن موجود ہے لیکن اس کی تفسیر میں کس قدر اختلاف رونما ہو گیا ہے اور انسان بدستور ظلوم و جہول ہے، اس کی فطرت نہیں بدلی، یہ کیا معمہ ہے ؎

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

آخر میں کہتے ہیں کہ اے خدا، انسان ہی سے جہاں کی رونق ہے، اگر اس حسن تقویم کو مٹا دینا چاہتا ہے تو مٹا دے مگر اس طرح کس کا زیاں ہوگا ؎

اسی کوکب کی تابانی سے ہے سارا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

بزمِ اقبال[1]

جب آفتاب اُبھرتا ہے تو ستارے باوجود اپنی تمام تابانیوں اور درخشانیوں کے ماند پڑ جاتے ہیں۔ آفتاب ستاروں کے وجود کو ختم نہیں کرتا بلکہ اپنے لامتناہی سلسلۂ نور کو روشنی کے دیگر ذرائع پر اس حد تک حاوی کر دیتا ہے کہ بظاہر صرف اسی کا وجود دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ اقبال کی عظمت نے اپنے بیشتر دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کیا۔ اقبال کے بعض دوست اگرچہ اپنی انفرادیت کے دیرپا نقوش چھوڑ گئے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جنہیں آج کوئی نہیں جانتا۔ حالانکہ ان میں سے ہر شخص اپنی ذات سے ایک انجمن تھا۔

انسان اپنے گرد و پیش کے ماحول اور اپنے قریبی احباب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اقبال نے بھی اپنے ان دوستوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ لیکن وقت کے ظالم ہاتھوں نے روشنی کے ان بہت سے منابع کو نظروں سے اوجھل کر دیا جن سے اقبال کے آفتابِ عظمت نے کسبِ ضیا کیا تھا۔ "بزمِ اقبال" علامہ کے ایسے ہی دوستوں اور رفیقوں کی داستان ہے۔ جو گمنام ہیں ان کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے گا اور اس بزم کے جو ارکین علمی و ادبی حلقوں میں اچھی طرح روشناس ہیں ان کی زندگی کا صرف وہی پہلو پیش کیا جائے گا جو علامہ کی ذات سے وابستگی کا شرف رکھتا ہے۔

مولوی احمد دین کی داستانِ حیات اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ مولوی صاحب اپنے عہد کی بلند پایہ شخصیات میں سے تھے اور ان کی کم از کم ایک کتاب "سرگزشتِ الفاظ" تو اردو کے ادبِ عالیہ میں شمار ہوتی ہے۔ اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کی نظر سے یہ کتاب نہ گزری ہو۔ لیکن اس کے مصنف کے بارے میں آج کوئی کچھ نہیں جانتا۔ مولوی صاحب کے مفصل حالاتِ زندگی عام طور پر معلوم نہیں ہیں۔ اردو ادب کی تاریخوں میں کہیں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ بعض مضامین اور دو ایک کتابوں میں اقبال کے دوست کی حیثیت سے ان کا تذکرہ ضرور آیا ہے۔ لیکن ان سے مولوی صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ محمد الدین فوق نے "تاریخ اقوام کشمیر" میں گنتی کی چند سطریں لکھی ہیں۔ "نقوش" کے لاہور نمبر میں مولوی محمد اسمٰعیل

۱؎ زیرِ ترتیب کتاب کا ایک باب۔ اس میں مولوی احمد الدین (مصنف سرگزشتِ الفاظ) اور علامہ اقبال کے تعلقات کی وضاحت کی گئی ہے۔

انجمن کی نئی مطبوعات

جو عنقریب شائع ہو رہی ہیں

۱ مقامات ناصری میر ناصر علی کے انشائیوں کا مجموعہ مرتبہ: انصار ناصری
۲ تذکرۂ عروس الاذکار مصنفہ نصیر الدین نقش مرتبہ: افسر امروہوی
۳ شمالی ہند کی نثری داستانیں (نظرثانی شدہ ایڈیشن) ڈاکٹر گیان چند
۴ شمالی ہند کی منظوم داستانیں ڈاکٹر فرمان فتحپوری
۵ اشاریہ اردو رسالہ "اردو" کے چالیس سالہ شماروں کا اشاریہ
۶ لغت کبیر اردو (جلد اول) بابائے اردو مرحوم
۷ انگریزی ادب کی تاریخ ڈاکٹر احسن فاروقی
۸ تاریخ سلطنت مسلمانان روس مزمل یاسین
۹ اردو تھیٹر جلد چہارم ڈاکٹر عبد العلیم نامی
۱۰ تذکرۂ ہمیشہ بہار مصنفہ کشن چند اخلاص مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ

کراچی ۱

مولوی احمد دین نے قانون داں کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔ دیوانی معاملات میں انھیں کمال حاصل تھا ان کی قانونی قابلیت کے علامہ اقبال بھی معترف تھے۔ اور جیسا کہ آگے چل کر ذکر آئے گا علامہ قانونی معاملات میں ان سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔

انجمن حمایت الاسلام :

مولوی احمد دین کی صلاحیتیں صرف اپنے پیشہ ورانہ فرائض تک ہی محدود نہ تھیں، وہ سماجی اور ادبی تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس صدی کے ربع اول میں لاہور کی جن چند شخصیات کو سماجی و ادبی اعتبار سے بلند مقام حاصل تھا ان میں مولوی صاحب کا بھی شمار تھا۔ انجمن حمایت الاسلام سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ وہ ایک عرصہ تک انجمن کی اسکولز سب کمیٹی اور تالیف و طبع کی سب کمیٹی کے سکریٹری رہے۔ نیز سالہا سال تک اسلامیہ کالج لاہور کے سکریٹری کی خدمات بھی انھیں کے ذمہ رہیں۔ جن کارکنوں کی بدولت انجمن کو ایک قومی ادارے کی حیثیت حاصل ہوئی ہے ان میں مولوی صاحب کا نام سرفہرست ہے۔

مولوی صاحب انجمن کے سالانہ اجلاسوں میں بھی تقریریں کرتے اور مقالے پڑھتے تھے۔ انجمن کے انیسویں سالانہ جلاس کی روداد میں جو ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی تھی مولوی صاحب کا ایک مضمون بعنوان " راز و نیاز " شامل ہے۔ اس مضمون پر مرتب روداد نے یہ نوٹ دیا ہے :

" دوسرا لکچر موسوم بہ " راز و نیاز " انجمن کے ایک معزز کارکن مولوی احمد دین صاحب بی اے پلیڈر کا تھا۔ گو مولوی صاحب نے ساتھ چلنے نے وہ سلوک نہیں کیا جو مولوی احمد دین صاحب کے ساتھ برتا۔ تاہم نہایت افسوس ہے کہ ان کا عمدہ اور بے مثال لکچر بھی ادھورا رہا اور پورا نہ ہونے پایا۔ یہ لیکچر بھی شامل روداد ہے "(۱)

انجمن حمایت الاسلام میں مولوی صاحب کو ممتاز حیثیت حاصل تھی ۱۹۰۸ء میں انجمن میں اندرونی خلفشار پیدا ہوا اور اس کے اراکین دو مخالف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ تو ۳ مئی ۱۹۰۸ء کو دونوں گروہوں کے پانچ پانچ وکلا نے مل کر آپس میں تمام اختلافات کو ختم کیا ان وکلا میں مولوی احمد دین بھی شامل تھے۔ اخبار "وطن" لاہور نے ۸ مئی ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں اس معاہدے کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب طالب اصلاح گروہ کے وکیل تھے۔ دوسرا گروہ مخالف اصلاح تھا۔

انجمن کے ایک ایسے ہی تنازعے کا ذکر مولانا عبدالمجید سالک نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

. . . . . " انجمن میں اختلافات و تنازعات بہت بڑھ گئے تھے، اور مقدمہ بازی تک نوبت پہونچ گئی تھی۔ پیسہ اخبار ۲۳ اپریل ۱۹۱۰ء میں ایک اطلاع درج ہے کہ ۲۲ اپریل کی شام کو نواب سر فتح علی خاں قزلباش کے دولت کدے پر آنریبل محمد شفیع، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، مولوی محبوب عالم، میاں فضل حسین، چوہدری نبی بخش، مولوی فضل الدین، میاں نظام دین اور مولوی کریم بخش جمع ہوئے (۲)

---

(۱) راقم الحروف نے اس مضمون کو انجمن ترقی اردو پاکستان کے ترجمان ماہنامہ قومی زبان کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۶۶ء میں شائع کرا دیا ہے

(۲) ذکر اقبال۔ شائع کردہ بزم اقبال لاہور ۱۹۵۵ء صفحات ۵۰ - ۴۹

پانی پتی نے بھی انھیں باتوں کو دہرا دیا ہے جو مولوی صاحب کے خاندان کے جو افراد بقید حیات ہیں، ان کی معلومات بھی بہت محدود ہیں۔ نیز مولوی صاحب کا کتب خانہ اور ذاتی کاغذات بھی دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہے۔ ایسی صورت میں مولوی صاحب کی داستانِ حیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں ہے مختلف بکھرے ہوئے اشارات اور بعض عینی شاہدوں کی بیان کردہ روایات کے سہارے مولوی صاحب کی روداد زندگی پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ مربوط و مسلسل داستان نہیں، صرف ایک ادھورا خاکہ ہے جسے مکمل کرنے کے لئے مزید تحقیق اور چھان بین کی ضرورت ہے۔

ابتدائی حالات :

مولوی احمد دین کشمیری الاصل تھے۔ ان کا تعلق کشمیر کی مشہور قوم "لون" سے تھا۔ اس قوم کے متعلق محمد الدین فوق نے "تاریخ اقوام کشمیر" میں تفصیل سے بحث کی ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "لون" ہندوؤں کا ایک قدیم جنگجو طبقہ ہے جو ملکی نظم و نسق میں ایک طویل عرصہ تک دخیل رہا ہے۔ اس قوم کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بارے میں فوق صاحب لکھتے ہیں :۔

"لون طبقہ کس زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہوا اس کے متعلق قیاساً یہی کہا جاسکتا ہے کہ کچھ لوگ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے کشمیر آنے سے پیشتر اور بہت زیادہ ان کے قیام کشمیر کے دوران میں دیگر اقوام کے ساتھ مسلمان ہوگئے ہوں" (۱)

اس قوم کے بہت سے خاندان کشمیر سے نقل مکانی کرکے پنجاب کے مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے تھے۔ مولوی احمد دین کا خاندان بھی انہیں میں سے ہے۔ مولوی صاحب کے دادا کشمیر سے پنجاب میں آئے اور لاہور کو انہوں نے اپنا مسکن بنایا۔ مولوی صاحب کے دادا کے متعلق کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔ ان کے نام، پیشے اور لاہور آنے کے زمانے کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مولوی صاحب کے والد کا نام اللہ دین تھا۔ انہوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی اور لاہور جیل میں تعینات تھے۔

مولوی احمد دین ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گجرانوالہ میں حاصل کی۔ ان کی تعلیم کا آغاز ایک مسجد کے مکتب میں ہوا۔ اس کے بعد وہ لاہور آگئے اور یہاں سنٹرل ماڈل اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوگئے اور یہیں سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں اسی کالج میں ایم۔ اے انگریزی میں داخلہ لیا۔ لیکن جلد ہی انہوں نے ایم۔ اے کرنے کا خیال ترک کردیا۔ اور قانون کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اس امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

مولوی صاحب ابتدا ہی سے نہایت ذہین تھے۔ بی۔ اے کے امتحان میں انہوں نے درجہ اول میں کامیابی حاصل کی جس کے صلے میں انھیں طلائی تمغہ ملا۔ گورنمنٹ کالج میں مولوی صاحب کو اردو کے عظیم انشاء پرداز مولوی محمد حسین آزاد کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی۔ آزاد سے مولوی صاحب بے انتہا متاثر ہوئے۔ اور اسی تعلق نے ان میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا۔ آزاد نے مولوی احمد دین کی ادبی شخصیت کو بنانے میں جو حصہ لیا ہے اس کا اظہار مولوی صاحب کی تصانیف سے بخوبی ہوتا ہے۔ خصوصاً انہوں نے آزاد کے اسلوب کو اپنانے کی جو کوشش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

---

(۱) تاریخ اقوام کشمیر ص ۲۸۴ دوسرا ایڈیشن۔ مطبوعہ لاہور ۳۴ ۱۹ء۔

.... "اس مکان کے سامنے جہاں مشاعرہ ہوتا تھا، ایک چھوٹا سا مکان ہے، اس کے مالک حکیم شہاب الدین مرحوم امین الملک صاحب کے چچازاد بھائی اس میں رہتے تھے۔ آپ نہایت ہی دبلے پتلے آدمی تھے۔ لیکن اللہ میاں نے اس ننھے جسم میں ایک ایسا دل رکھ دیا جو اسلامی اخوت اور محبت کے جوش سے ہر وقت لبریز رہتا تھا۔ خاطر داری اور مہمان نوازی ان کا شیوہ اور خدمت اور ہمدردی ان کی جبلت تھی۔ ان کے خلق حسنہ نے ان کے مکان کو ایک کلب گھر بنا دیا تھا۔ شہر کے باذوق اصحاب یہاں جمع ہوتے تھے۔ یہاں حقے کی ... اور چائے اور اہل محفل کی نکتہ سنجیاں قومی تحریکوں میں دلچسپی لینے والوں کو اس مکان پر کشاں کشاں لے آتی تھیں۔" (۱)

ان ادبی صحبتوں میں مولوی صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان محفلوں میں جو لوگ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے، ان میں مولوی احمد دین۔ شیخ گلاب دین۔ مفتی عبداللہ ٹونکی۔ مولانا محمد حسن جالندھری۔ مولوی اصغر علی روحی۔ سید محمد شاہ وکیل۔ سر عبدالقادر۔ سر شہاب الدین۔ سر محمد اقبال، خواجہ رحیم بخش۔ خواجہ کریم بخش۔ خواجہ امیر بخش (۲) خلیفہ نظام الدین اور ماسٹر مولا بخش کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ اس محفل میں احباب میں کبھی کبھی سر محمد شاہ دین۔ سر محمد شفیع۔ فقیر افتخار الدین اور مرزا سلطان احمد بھی آ بیٹھتے تھے۔ (۳) پیسہ اخبار والے مولوی محبوب عالم بھی ان محفلوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ انھیں محفلوں میں مولوی احمد دین کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جنھوں نے مولوی صاحب کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے لئے راستہ ہموار کیا۔

صحافت :

مولوی صاحب کی ادبی و علمی زندگی کا باقاعدہ آغاز پیسہ اخبار سے وابستگی کے بعد ہوا اگرچہ اس اخبار سے تعلق کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔ لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مولوی صاحب نے اسی اخبار سے وابستہ ہو کر صحافت کی تربیت حاصل کی۔ اس سلسلے میں چھول چند کا پنجاب کی صحافت سے متعلق مضمون ہماری معلومات کا ماخذ ہے۔ چھول چند کا بیان ہے کہ:

M. MAHBUB ALAM HAS GENERALLY BEE ... ED ایڈیٹر گر ایڈیٹر I.E. . . EDITOR-MAKING EDITOR . TH A HAPPY APPELLATION, SINCE THE PAISA AKHBAR WAS A VARITABLE TRAINING GROU FOR MANY OF THE FUTURE EDITORS OF THE PROVINCE THE NAMES OF LALA DINA N LATER THE EDITOR ... THE HINDUSTAN, HAKIM GHULAM NABI LATER THE EDITOR AL-HUKMA, MUNSHI AHMED DIN LATER THE EDITOR OF THE KASHMIRI, MAULVI SH -UD-DAUWLA LATER THE EDITOR OF THE MILLAT, STAND OUT PROMINENT AMON THOSE WHO HAD SERVED THEIR APPRENTICESHIP IN THIS TRAINING SCHOOL.

---

(۱) اقبال۔ از احمد دین۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۲۳ء ص ۲۔

(۲) یہ تینوں خواجہ صاحبان سگے بھائی تھے۔ اور مولوی احمد دین کے قریبی عزیز تھے۔

(۳) لاہور کی چلتی۔ حکیم احمد شجاع۔ "نقوش" لاہور۔ جنوری ۱۹۶۲ء ص ۳

' JOURNAL OF THE PANJAB UNIVERSITY AND HISTORICAL SOCIETY . VOL. II PART I APRIL, 1933 P 30

انجمن کشمیری مسلمانان :

انجمن کشمیری مسلمانان سے بھی مولوی صاحب کا گہرا تعلق تھا۔ وہ اس کے بانیوں میں سے تھے، یہ انجمن ان کشمیری مسلمانوں نے قایم کی تھی جو کشمیر سے نکل کر پنجاب میں مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے اور اس کا مقصد کشمیری مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھا۔ علامہ اقبال بھی اس انجمن کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہتے تھے محمد عبداللہ قریشی نے باقیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں کے عنوان سے سہ ماہی اقبال" لاہور بابت اپریل ۱۹۰۰ء میں اقبال اور انجمن کشمیری مسلمانان کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب ڈھاکہ کے نواب خواجہ سلیم اللہ امرتسر آئے تو ۲۷ دسمبر ۱۹۰۱ء کو ان سے انجمن کا ایک وفد ملا تھا۔ مولوی احمد دین بھی اس وفد میں شامل تھے۔

لاہور کی ادبی محفلیں :-

مولوی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز کالج کے زمانے ہی سے ہو چکا تھا۔ لیکن اس ذوق کی جلا حکیم امین الدین کے مکان پر منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں ہوئی۔ ان محفلوں کو ساٹھ ستر سال پہلے کے لاہور کی ادبی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز سمجھنا چاہیے ۱۸۹۵ء میں حکیم احمد شجاع کے والد حکیم شجاع الدین نے ایک ماہانہ مشاعرے کی داغ بیل ڈالی یہ مشاعرہ حکیم امین الدین کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور اس کی کارروائی ماہنامہ گلدستہ "شور محشر" میں شائع ہوتی تھی۔ شور محشر کے پہلے شمارے میں جو کارروائی شائع ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مشاعرہ ۳۰ نومبر ۱۸۹۵ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس میں لاہور کے تمام ممتاز اہل علم اور شعراء نے شرکت کی تھی۔ مولوی احمد دین بھی اس میں شریک ہوئے۔ مشاعروں اور ادبی ہنگاموں کا یہ سلسلہ ۱۹۲۲ء تک قایم رہا۔ (۲) مولوی احمد دین باقاعدگی سے ان محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ خود مولوی صاحب نے ایک جگہ ان ادبی محفلوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :

. . . . انیسویں صدی عیسوی کا آخری عشرہ نصف سے زیادہ گزر چکا تھا۔ شہر لاہور کے بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں ایک مشاعرے کی طرح ڈالی گئی۔ مجلس مشاعرہ حکیم امین الدین صاحب بیرسٹر مرحوم کے مکان پر جو اسی خاندان حکیماں کے ایک نامور رکن تھے، جن کے نام پر بازار مشہور ہے۔ منعقد ہوا کرتی تھی۔ یہ مجلس اسی خاندان کے بزرگ حکیم شجاع الدین صاحب مرحوم تھے۔ میرزا ارشد گورگانی دہلوی و میرزا ناظر حسین ناظم لکھنوی مشاعرے کی روح رواں تھے۔ دونوں حضرات خود بھی شعر کہہ کر لاتے تھے اور ان کے شاگردوں اور شناخوانوں کی ایک دوسرے کے مقابلے میں طبع آزمائیاں مشاعرے کی رونق کو دوبالا کرتی تھیں۔ دلی اور لکھنو کے اکھاڑے تھے۔ تماشائیوں کا ایک اچھا خاصہ جمگھٹا ہوتا تھا۔ کالجوں کے نوجوان طالب علم بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کے شوق میں چلے آتے تھے۔ اور سخن دانی کی داد لینے اور دینے میں کسی سے پیچھے نہ رہتے تھے۔ (۳)

حکیم امین الدین کے مکان کے مشاعرے کے علاوہ اس زمانے میں دوسرا بڑا ادبی مرکز حکیم صاحب کے چچا زاد بھائی حکیم شہاب الدین کا مکان تھا۔ اس کی کیفیت بھی مولوی احمد دین ہی کی زبانی سنئے :

---

(۱) لاہور کی چیلسی۔ حکیم احمد شجاع۔ "نقوش" لاہور۔ جنوری ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۳

(۲) لاہور کی چیلسی۔ حکیم احمد شجاع۔ نقوش" لاہور جنوری ۱۹۶۲ء ص ۱۹

(۳) [illegible]

ت ملتے ہیں۔ اخیر سال کو خریداروں میں کئی قسم کے نقدی انعام بھی تقسیم ہوتے ہیں۔ یہ اخبار بعض عورتوں میں مفت بھی مل سکتا ہے۔ مفصل حالات
رابطہ کے لئے نمونہ کا پرچہ مفت طلب فرما کر ملاحظہ فرمائیں۔

اس اخبار کے ادارے کی طرف سے کتابیں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ مولوی صاحب کی بیشتر تصانیف اسی ادارے نے شائع کی ہیں،
"غمخوار عالم" اور اردو اخبار کے سلسلے میں اردو صحافت سے متعلق کوئی کتاب ہماری رہنمائی نہیں کرتی۔ ایک آدھ جگہ
اخباروں کا نام ضرور آیا ہے۔ لیکن وہ بھی پھول چند کے بیان کی صدائے بازگشت ہے۔ پھول چند لکی دی ہوئی اطلاع پر کسی نے کوئی اضافہ
ں کیا۔

وفات :-

حکیم احمد شجاع کے بیان کے مطابق، مولوی صاحب زندگی کے آخری چند برسوں میں مسلسل بیمار رہے۔ اور پاؤں کے چنبل کی وجہ سے
گھر سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ اسی عالم میں آخر کار انہوں نے ایک کامیاب زندگی گزارنے کے بعد چونسٹھ سال کی عمر میں ۱۱ر اکتوبر ۱۹۲۹ء
مطابق ۷ر جمادی الاول ۱۳۴۸ھ کو وفات پائی۔[1] اور انھیں میاں صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

شخصیت : مولوی صاحب کی شخصیت بڑی پرکشش تھی۔ ان کی وضع داری ضرب المثل تھی۔ ان کی ذات قدیم تہذیب کا بہترین نمونہ
تھی۔ آج بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے مولوی صاحب کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اور جن کے ذہن میں ان کی بہت سی یادیں
محفوظ ہیں۔ راقم الحروف کے نام ایک خط میں حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں :- "مولوی احمد دین، مولوی تاج دین اور میرے عم زاد بھائی
حکیم امین الدین نے ایک دایہ کا دودھ پیا تھا۔ اور اس لئے ان تینوں بزرگوں کی آپس میں بھائیوں بھائیوں کی محبت تھی۔ . . . . .
میں ذاتی طور پر مولوی احمد دین صاحب کی اس محبت و شفقت کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ جو میرے والد مرحوم کی وفات کے بعد میرے ایام طفولیت
سے لے کر اس وقت تک جب تک وہ زندہ رہے میری زندگی کا بہت بڑا سہارا رہی۔ میری کامیابی پر خواہ وہ کسی امتحان میں ہو یا ملازمت
کے سلسلے میں انہوں نے ہمیشہ ایسی مسرت کا اظہار کیا کہ ان کا یہ خلوص میرے لئے باپ کے سایہ عاطفت کا نعم البدل بن گیا"[2]

مولانا غلام رسول مہر مولوی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"میں ۱۹۱۱ء میں بسلسلۂ تعلیم لاہور آیا تھا۔ اس زمانے میں مولوی احمد دین مرحوم اقبال کے خاص احباب میں شمار ہوتے تھے۔
۱۹۱۰ء میں دوبارہ یہاں آیا تو ان کے اور شیخ گلاب دین کے بارے میں سنا جاتا تھا کہ انھیں مولوی صاحب سے خصوصی تعلق ہے۔ مولوی
صاحب سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی البتہ انھیں دور سے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ بالکل کم گو تھے۔ عام روایت یہ تھی کہ سول مقدمات میں انھیں کمال
مہارت حاصل ہے۔ پوشش ہمیشہ سادہ رکھی۔ پاجامہ، سیدھے کالر کا چھوٹا کوٹ، سر پر ترکی ٹوپی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ . . . . . اقبال کی ٹوپی بھی

---

(۱) اخبار حمایت الاسلام لاہور بابت ۱۷ر اکتوبر ۱۹۲۹ء (بحوالہ مکتوب جناب عبداللہ قریشی بنام راقم الحروف مورخہ ۴ر نومبر ۱۹۶۶ء) اس اخبار نے جو اطلاع شائع
کی تھی اس میں لکھا ہے کہ مولوی صاحب نے ایک مدت کی علالت کے بعد انتقال کیا۔

(۲) مکتوب مورخہ ۸ر فروری ۱۹۶۶ء

مولوی صاحب کی سب سے پہلی کتاب ابوالمظفر محی الدین اورنگزیب، پیسہ اخبار ہی کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ اس ادارے کی طرف سے ان کی ایک دوسری کتاب افواج دنیا ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

خیال ہے کہ مولوی صاحب پیسہ اخبار سے ۱۹۰۳ء میں یا اس سے پہلے ہی علیحدہ ہو گئے تھے جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ مولوی صاحب کی تصانیف بھی پیسہ اخبار کی طرف سے شائع ہوئی تھیں لیکن ۱۹۰۳ء کی مطبوعہ ایک کتاب "اسرار حرم" ایسی بھی ہے جو ایک دوسرے ادارے (رام کشن جیرل بک مرچنٹس) کی طرف سے شائع ہوئی تھی، اس وجہ سے یہ خیال کرنا بے جا نہیں کہ انہوں نے پیسہ اخبار سے علیحدہ ہونے کے بعد ہی ایک دوسرے ناشر سے رجوع کیا۔

پھول چند کے مذکورہ اقتباس میں "غمخوار عالم" کا ذکر ہے۔ لیکن اگر اس نے اس اخبار کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں دی۔ مولوی احمد دین نے اپنی ایک کتاب جلال الدین محمد اکبر" کے دیباچے کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ سابق ایڈیٹر اخبار غمخوار عالم لکھا ہے۔ یہ کتاب اردو اخبار سے وابستگی کے زمانے میں شائع ہوئی تھی — اردو اخبار سے مولوی صاحب کا تعلق ۱۹۰۶ء[1] یا اس سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ اس لئے غمخوار عالم کے اجراء کا زمانہ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیانی عرصہ کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس اخبار کا کوئی پرچہ پاکستان کے کسی کتب خانے میں محفوظ نہیں ہے اس لئے اس کے بارے میں کسی قسم کی معلومات پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔

"اردو اخبار" سے مولوی صاحب کی وابستگی کی اطلاع ان کی دو تصانیف "حیات ٹوڈرمل" اور "جلال الدین محمد اکبر" سے ملتی ہے۔ ان دونوں کتابوں کے سرورق پر ان کے نام کے ساتھ ملازم دفتر "اردو اخبار" لکھا ہے۔ عبداللہ قریشی صاحب کا بیان ہے کہ منشی محمد الدین فوق اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔[2] یہ اخبار منشی رام لگر مال تاجر کتب لاہور جو کتب خانہ تعلیمی پنجاب کے مہتمم تھے شائع کرتے تھے۔ حیات ٹوڈرمل کے سرورق پر اس اخبار کا مندرجہ ذیل اشتہار درج ہے۔ اس سے اخبار کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"اس کتب خانہ سے اردو اخبار ہفتہ وار شائع ہوتا ہے جس میں دلچسپ اور مفید مضامین تازہ بتازہ خبروں کے علاوہ شعر و سخن دلخوش کن لطائف و ظرائف اور عقل کے کرشمے یعنی حل طلب معمے (بعض انعامی معمے) بھی ہوتے ہیں قیمت سالانہ معہ محصول ڈاک صرف ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔ نقد قیمت ادا کرنے سے ایک روپے کے انعامی ناول اصلی قیمت پر (صرف انعامی ناولوں مندرجہ حاشیہ اخبار میں سے)

---

(۱) اس سلسلے میں ایک امر اور بھی قابل لحاظ ہے۔ اخبار "وطن" کے ۱۹۰۸ء کے متعدد شماروں میں "ہماتما بدھ"، "ابوالفضل"، "رنجیت سنگھ" کی سوانح عمریوں کا اشتہار ملتا ہے۔ اس اشتہار میں مصنف کا نام درج نہیں، قیاس ہے کہ یہ مولوی احمد دین ہی کی تصانیف کا اشتہار ہے اس اعتبار سے مولوی صاحب کا اردو اخبار سے ۱۹۰۸ء سے قبل وابستہ ہونا تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر "غمخوار عالم" کے اجراء کا زمانہ ۱۹۰۳ء کا درمیانی عرصہ قرار دینا چاہئے۔ (۲) مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۶۶ء

بارہا ضرورت پیش آئی۔ اور اس تعلق نے بھی دوستی کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا۔ دونوں کا انجمن حمایت الاسلام سے گہرا تعلق تھا۔ اور یہ ادارہ بھی ان کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے کا ذریعہ بنا۔ الغرض مختلف عناصر نے مل کر اقبال اور احمد دین کو ایک دوسرے سے قریب کیا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ قربت خلوت و جلوت کے ہر مرحلہ میں بڑھتی چلی گئی۔

اس مقالہ کی ابتداء میں بازار حکیماں کی ادبی محفلوں کا ذکر آچکا ہے۔ انھیں محفلوں میں اقبال اور احمد دین ایک دوسرے سے روشناس ہوئے۔ یہ ۱۸۹۵ء کا واقعہ ہے۔ اقبال اس وقت اٹھارہ سال کے ایک طالب علم تھے۔ مولوی احمد دین کی عمر تیس سال کی تھی۔ اور وہ عملی زندگی میں نہ صرف داخل ہو چکے تھے بلکہ علمی و ادبی حلقوں میں خاص شہرت بھی حاصل کر چکے تھے۔ یہ دونوں ان ادبی محفلوں میں نیز انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے، اس وجہ سے تعلقات میں گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی۔ ان تعلقات کی مدت تقریباً ۴۰ برس ہے۔ اس عرصے میں اقبال نے ترقی اور شہرت کے بڑے بڑے مدارج طے کئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کو متعارف کرانے میں مولوی احمد دین کی کوششوں کو بھی دخل ہے تو یہ کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت پر سب سے پہلے تفصیل سے جس شخص نے لکھا وہ مولوی صاحب ہی تھے۔

علمی و ادبی معاملات سے قطع نظر دونوں ایک دوسرے کی زندگی میں بھی بڑی حد تک دخیل تھے۔ مولوی صاحب اقبال کی ابتدائی زندگی کے تمام غمی و خوشی پہلوؤں سے پوری طرح واقف تھے۔ اقبال کے ایک قدیم دوست مرزا جلال الدین بیرسٹر نے "ملفوظات اقبال" میں رقص و سرود کی محفلوں سے متاثر ہو کر اقبال کے شعر کہنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "میری ملاقات سے پیشتر مولوی احمد دین صاحب نے کئی ایسے مواقع کا ذکر کیا ہے[1] رقص و سرود سے اقبال کی دلچسپی کے سلسلے میں مرزا صاحب لکھتے ہیں "۔۔۔ میں نے بھی مولوی احمد دین مرحوم سے ان کی داستان سن رکھی تھی[2] ان بیانات سے مولوی احمد دین اور اقبال کی بے تکلفی نیز تعلقات کی گہرائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال کی دوسری (والدہ جاوید اقبال کے ساتھ) اور تیسری شادی میں جن چند احباب نے شرکت کی ان میں مولوی احمد دین بھی شامل تھے۔[3]

جیسا کہ کہا جا چکا ہے علامہ اقبال مولوی احمد دین کی قانونی مہارت کے بھی قائل تھے۔ وہ مقدمات کے سلسلے میں مولوی صاحب کی مدد لیتے رہتے تھے۔ اس قسم کے ایک مقدمہ کا ذکر عبداللہ قریشی صاحب نے کیا ہے۔ جون ۱۹۲۱ء میں منشی سراج الدین نے ایک معاملے میں قانونی مشورے کے لئے علامہ اقبال کو کشمیر بلایا۔ علامہ اپنے ساتھ مولوی احمد دین کو بھی لے گئے اور تقریباً دو ہفتے تک سرینگر میں رہے[4] مقدمے کے کام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اقبال اور مولوی صاحب نے بہت سا وقت سیر و تفریح میں گزارا۔

بعض لوگ علامہ اقبال کا کلام بلا اجازت چھاپ لیتے تھے۔ اقبال نے ایسے لوگوں پر مقدمہ چلانے کا کام مولوی صاحب کے سپرد

---

(۱) ملفوظات اقبال۔ مرتبہ محمود نظامی۔ دوسرا ایڈیشن۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۴۹ء صفحہ ۱۰۸

(۲) ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی۔ دوسرا ایڈیشن مطبوعہ لاہور ۱۹۴۹ء صفحہ ۱۳۳

(۳) ذکر اقبال۔ از سالک۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء صفحات ۶۵۔ ۶۸

(۴) اقبال اور کشمیر از عبداللہ قریشی۔ سہ ماہی اقبال۔ لاہور صفحہ ۹۰۔ بابت اکتوبر ۱۹۵۶ء

ترکی ہوتی مگر یارڈ۔ مولوی احمد دین کی ٹوپی ساخت اور رنگ سیاہی مائل رنگ کی ہوتی تھی۔ بہرحال مولوی صاحب بڑے متین، سنجیدہ، کم گو بزرگ تھے۔[1]

اولاد۔ مولوی صاحب نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی سے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں اور دوسری بیوی سے چار لڑکے اور ایک لڑکی۔ ان میں سے دو لڑکے خواجہ ریاض احمد اور خواجہ امتیاز احمد بقید حیات ہیں۔ ریاض احمد صاحب اسلامیہ کالج لاہور سے منسلک ہیں۔ مولوی احمد دین کے ذاتی حالات کے سلسلے میں بعض معلومات انھیں سے حاصل ہوئیں۔ مولوی صاحب کے بڑے صاحبزادے بشیر احمد تھے۔ ان کے بارے میں مولانا مہر لکھتے ہیں:

...: مولوی بشیر احمد شیخ مبارک علی کے پاس برسوں کام کرتے رہے۔ وہ بھی پیکر خلوص تھے، بے مثال لطیفہ باز۔ کھانا پکانے میں ایسے مشاق تھے کہ میں نے زندگی میں ویسا کوئی نہ دیکھا۔ تقسیم سے کئی برس پیشتر وفات پائی۔[2]

مولوی صاحب کو لاہور سے عشق تھا۔ وہ اس شہر سے اس حد تک محبت رکھتے تھے کہ وہ خود اس کا ایک لازمی جزو بن گئے تھے اور شاید اسی وجہ سے لاہور سے وہ بہت کم باہر نکلتے تھے۔ البتہ کشمیری الاصل ہونے کی وجہ سے ہر سال ستمبر کے مہینے میں جبکہ عدالتوں کی تعطیلات ہوتی تھیں وہ کشمیر ضرور جاتے تھے۔ لاہور میں پہلے پہل ان کا قیام سوتر منڈی میں تھا پھر لاہوری منڈی میں رہے اور آخر میں بازار حکیماں میں لال حویلی کے سامنے کے مکان میں رہے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ وکالت کے سلسلے میں انہوں نے اپنا دفتر نوہاری منڈی میں پھولوں والی گلی کے سامنے کے ایک مکان میں بنایا تھا۔

اقبال سے تعلقات

مولوی احمد دین اور اقبال کے تعلقات کی داستان دراصل دو ایسے دوستوں کے باہمی ارتباط کی روداد ہے جو آپس میں محبت بھی کرتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے تھے۔ ان کی دوستی ہر اعتبار سے مثالی تھی۔ آغاز تعلقات سے لیکر مولوی صاحب کی وفات تک ان دونوں کے تعلقات گہرے رہے۔ ایک آدھ مرتبہ شکر رنجی بھی پیدا ہوئی لیکن وہ بھی حد سے بڑھی ہوئی محبت کا نتیجہ تھی۔

اقبال مولوی صاحب سے تقریباً بارہ سال چھوٹے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے۔ لیکن دونوں کے مشترک علمی مذاق نے اس فرق کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ اور ویسے بھی دوستی سن و سال کی نہیں، ہم مذاقی و ہم مشربی کی پابند ہوتی ہے۔ ان دونوں میں جو گہرے تعلقات تھے ان کی اور بھی کئی وجوہ تھیں مثلاً دونوں کشمیری الاصل تھے، اور اس طرح قدرتی طور پر دونوں میں ایک دوسرے کے لئے کشش تھی۔ اسی بنا پر دونوں نے انجمن کشمیری مسلمانان کے ذریعہ اپنی برادری کی فلاح و بہبود کے لئے کام کیا۔ دونوں ہم پیشہ تھے اور قانون داں کی حیثیت سے اپنی اپنی جگہ ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اقبال کو اپنی ذاتی معاملات میں مولوی صاحب کی قانونی قابلیت سے فائدہ اٹھانے کی

(۱) مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۶۶ء

(۲) مکتوب ... بنام راقم الحروف مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۶ء

تھے اور جو شعر ان کی پسند کی کسوٹی پر پورے نہ اترے انھیں یا تو نظر انداز کر دیتے تھے اور یا اسپر دوبارہ غور کرتے تھے اس کے علاوہ اقبال ہمیشہ اپنے ذاتی معاملات میں مولوی احمد دین سے مشورہ کرتے تھے اور اکثر انھیں کے مشورے پر عمل کرتے تھے۔ کئی معاملات میں یہ مشورے اقبال کے بڑے کام آتے تھے۔ جب مولوی احمد دین بہت زیادہ علیل ہوئے اور پاؤں کے ضعف کی وجہ سے چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے ا تو اقبال بلاناغہ ان کی مزاج پرسی کے لئے میکلوڈ روڈ کی کوٹھی سے بازار حکیماں میں آیا کرتے تھے۔[illegible]

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں :

"...... مولوی احمد دین مرحوم اقبال کے بڑے ہی مخلص دوست تھے۔ ایسے دوست جیسے آجکل دیکھنے میں نہیں آتے "[illegible]

اس محبت اور خلوص کے باوصف ایک مرتبہ ان دونوں دوستوں میں شکر رنجی بھی پیدا ہو گئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۲۳ء میں اقبال کے نام سے مولوی احمد دین نے ایک کتاب لکھی جس میں علامہ کی شاعرانہ حیثیت سے بحث کی گئی تھی۔ عام روایت یہ ہے کہ علامہ اقبال کو اس کتاب کی اشاعت پسند نہ آئی۔ کیونکہ اس وقت تک ان کا پہلا مجموعہ کلام "بانگ درا" شائع نہ ہوا تھا۔ ان کا یہ خیال تھا چونکہ اس کتاب میں بہت سا کلام بھی شامل کیا گیا ہے اس لئے یہ مجموعہ کلام کی اشاعت و فروخت پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ مولوی احمد دین کو جب اقبال کی ناپسندیدگی کا علم ہوا تو انہوں نے یہ کتاب جلادی۔ ۱۹۲۶ء میں یہ کتاب دوبارہ شائع ہوئی۔ اس سلسلے میں مختلف واقف حال حضرات کے بیانات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

"اقبال کے متعلق کتاب مولوی صاحب نے مرتب فرمائی تھی، اس میں ایسی نظمیں بھی شامل تھیں جنھیں اقبال اپنے کلام سے خارج کر چکے تھے۔ ایک کاپی دیکھ کر غالباً اقبال نے اسی خیال سے ہلکے انداز میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ بلاواسطہ نہیں بالواسطہ۔ مولوی صاحب نہایت مخلص دوست تھے۔ ان کے خلوص کا تقاضہ یہ ہوا کہ سرسری بیان سنتے ہی مزید استفسار یا رد و کد گفتگو کا بھی انتظار نہ کیا اور پوری کتاب جلوا دی۔ صرف چند کاپیاں اس وقت تک تقسیم ہوئی تھیں، پھر "بانگ درا" چھپ گئی تو از سر نو کتاب چھاپی۔ جس میں سے وہ کلام بیشتر خارج کر دیا تھا جسے اقبال خود خارج کر چکے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ اصل کاپی بھی دیکھی تھی۔ میرا احساس یہی تھا کہ انہوں نے محض جذبہ خلوص میں یہ قربانی کر دی۔ ورنہ اس میں خارج کردہ کلام کی زیادہ مقدار شامل نہ تھی۔ اس سے زیادہ کلام انجمن حمایت الاسلام کی سالانہ کارروائیوں میں نیز اخباروں اور رسالوں خصوصاً مخزن میں چھپ چکا تھا۔"[illegible]

حکیم احمد شجاع کی رائے میں اصل واقعہ یہ ہے :

"مولوی احمد دین نے سب سے پہلے اقبال کو ان کے اصلی روپ میں دیکھا، وہ ان کی شاعری کو اس کے اصلی رنگ میں سمجھا اور "اقبال" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ اور اس میں اقبال کے وہ تمام اشعار جمع کئے جو بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح ابھی کسی لڑی میں نہ پروئے گئے ہوں۔ اور پھر ان اشعار کی اس طرز پر تشریح کی جس پر "مائینڈ اینڈ آرٹ آف شکسپیئر" لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب لاہور کے ایک نامور

[illegible] مکتوب بنام راقم الحروف۔ مورخہ ۷ فروری ۱۹۶۶ء　[illegible] مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۶ء

[illegible] مکتوب بنام راقم الحروف۔ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۶ء

کر رکھا تھا۔ بلا اجازت کلام چھاپنے والوں میں ایک صاحب منشی قمر الدین تھے۔ ان صاحب کے بارے میں اقبال منشی محمد الدین فوق کے نام ۹ر مارچ ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

اس سے پیشتر میں اس شخص (منشی قمر الدین) پر مقدمہ دائر کرنے کو تھا۔ مگر مولوی ظفر علی خاں کے کہنے پر باز رہا۔ اس نے اس سے پیشتر میری نظموں کو میری اجازت کے بغیر شائع کر دیا تھا۔ اب یہ سب معاملہ مولوی احمد دین وکیل کے سپرد کیا ہے کہ اگر کوئی میرا کلام میری اجازت کے بغیر چھاپے تو اس پر دعویٰ کر دیا جائے۔[۱]

۱۹۲۲ء کے بعد مولوی احمد دین بقول حکیم احمد شجاع مسلسل بیمار رہے۔ اس عرصہ میں اقبال مولوی صاحب کی مزاج پرسی کے لئے ان کے مکان پر، جو بھاٹی دروازہ میں تھا، جاتے رہے۔ جب مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو اقبال پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے جنازے میں شرکت نہ کر سکے۔ انہوں نے مولوی صاحب کے فرزند خواجہ بشیر احمد کے نام جو تعزیتی خط لکھا تھا وہ یہ ہے[۲]:۔

عزیزم بشیر۔ السلام علیکم

افسوس ہے کہ میں مولوی صاحب مرحوم کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔ مجھے اس سے دو ایک روز پہلے نقرس ہو گیا جس کی وجہ سے پاؤں میں سخت تکلیف تھی۔ حرکت سے قاصر رہا۔ دوسرے روز دانت کے درد کا بھی اضافہ ہو گیا۔ خواجہ صاحب (خواجہ فیروز دین[۳]) کے ہمدست آپ کو اپنی معذوری کا پیغام بھیجا تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ پیغام آپ تک پہنچا کہ نہ پہنچا۔ بہرحال مجھے یہ افسوس تا زیست رہے گا کہ مرحوم کے لئے آخری دعا جو کی گئی میں اس میں شریک ہونے سے محروم رہا۔ خدا تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ کل آپ کے ہاں حاضر ہونے کا قصد تھا مگر میں سب سے پہلے انجمن کے جلسے میں دیر ہو گئی۔ انشاء اللہ اب حاضر ہوں گا۔ امید ہے شام کے قریب آپ سب جائے قبر پر ہوتے ہوں گے زیادہ کیا عرض کروں۔ موت دعا کہ صبر جمیل کے۔ والسلام۔

محمد اقبال

علامہ اقبال اور مولوی احمد دین کی دوستی کے بارے میں حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں:۔

... اقبال اور مولوی احمد دین کے تعلقات بہت قریبی تھے۔ اور مخلصانہ ... مولوی صاحب اقبال سے دلی محبت رکھتے تھے اور ان کے کلام سے ان کو بڑا شغف تھا۔ اقبال بھی اگرچہ مولوی صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ لیکن ان کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھتے

(۱) ـ نقوش لاہور۔ مکاتیب نمبر جلد اول۔ ص ۲۰۶ (۲) لاہوری حبیبی۔ از حکیم احمد شجاع۔ نقوش لاہور۔ جنوری ۱۹۵۵ء صفحہ۔

(۲) یہ خط ہفتہ وار ہماری زبان، علی گڑھ یا [illegible] مارچ ۱۹۶۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مجھے اس کی نقل جناب عبداللہ قریشی صاحب کے ذریعہ دستیاب ہوئی ہے۔ ہماری زبان کے مطبوعہ متن میں بعض الفاظ غلط نقل ہوئے ہیں۔ یہاں قریشی صاحب کا [illegible] کردہ متن درج کیا جا رہا ہے۔

(۳) خواجہ فیروز الدین علامہ اقبال کے ہم زلف، گہرے دوست اور لاہور کے مشہور بیرسٹر تھے۔

اقبال نے مذاق ہی مذاق میں کہہ دیا کہ میں تو نظر ثانی کے بعد اپنے کلام کا مجموعہ ابھی مرتب ہی کر رہا تھا کہ مولوی صاحب نے "اقبال" کو بیچنا بھی شروع کر دیا۔ کم از کم وہ میری کتاب کا انتظار کر لیتے۔

مولوی صاحب نے جب یہ بات سنی تو اس کا کچھ اور ہی مطلب لیا۔ اقبال کا کلام چھاپ کر اقبال کو نقصان پہنچانا اور جو اشعار ان کے معیار سے گر چکے ہیں انھیں محفوظ کر کے اقبال کی شہرت کو بٹا لگانا مولوی صاحب کا مقصد نہ تھا۔ انہوں نے کتاب کی تمام جلدیں اپنے مکان کے صحن میں ڈھیر کر کے ان کو آگ لگا دی۔ خود کرسی بچھا کر ایک طرف بیٹھ گئے اور جب تک کتاب کا ایک ایک ورق جل کر راکھ نہ ہو گیا وہاں سے نہ ہلے۔ اور گھر پھونک تماشا دیکھتے رہے۔

اقبال کو اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے بڑا افسوس ظاہر کیا۔ مولوی صاحب سے معذرت طلب کر کے ان کو دوبارہ کتاب چھاپنے پر راضی کیا۔ چنانچہ "بانگ درا" کی اشاعت کے دو سال بعد ۱۹۲۶ء میں یہ کتاب از سر نو لکھ کر دوبارہ شائع کی گئی اور اس دفعہ کلام کا بہت سا حصہ حذف کر دیا گیا۔ صرف منتخب اشعار پر اکتفا کیا گیا۔[1]

مذکورہ بالا بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے کتاب کی اشاعت کو اس وجہ سے ناپسند فرمایا تھا کہ اس زمانے میں بانگ درا کی طباعت کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ "اقبال" میں علامہ کی تقریباً تمام اہم نظمیں شامل تھیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں بانگ درا کی اشاعت متاثر ہوتی۔ مولوی احمد دین کتاب اقبال سے عقیدت و محبت کا نتیجہ تھی جو انہوں نے کسی تاجرانہ خیال سے شائع نہیں کی تھی۔ اقبال کی شکایت بھی بے جا نہ تھی۔ لیکن مولوی احمد دین کا غصے میں آکر پوری کتاب کو جلا دینا۔ جہاں ایک طرف ان کی انتہا پسندی کی دلیل ہے وہیں دوسری طرف اس سے اس محبت و خلوص کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو اقبال کی ذات سے تھا۔ مندرجہ بالا بیانات میں جزئیات کی حد تک کہیں اختلاف ہے۔ البتہ عبداللہ قریشی صاحب نے بالکل ایک نئی بات لکھی ہے کہ علامہ اقبال نے مولوی احمد دین کو "اقبال فروشی" کا الزام دیا۔ علامہ اقبال کی ذات سے یہ بدگمانی کسی طرح مناسب نہیں۔ ایک دیرینہ دوست اور قدردان کے لئے اقبال کبھی ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔

اس معاملہ کا ایک پہلو تحقیق طلب ہے اور وہ یہ کہ جب مولوی احمد دین اور علامہ اقبال کے اتنے گہرے مراسم تھے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ علامہ اقبال کو کتاب کی طباعت کا پہلے سے علم نہ ہو۔ مولوی احمد دین کو تو علامہ اقبال نے ان لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنے پر متعین کر رکھا تھا جو بلا اجازت علامہ کا کلام شائع کرتے تھے۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ مولوی صاحب خود اس جرم کا ارتکاب کرتے جس کے سد باب کے لئے انہیں متعین کر رکھا تھا۔ مولوی صاحب کے فرزند خواجہ ریاض احمد کے بیان سے اس معاملہ پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ راقم الحروف کے نام انہوں نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء میں لکھا ہے :-

شیخ گلاب دین صاحب مرحوم جو والد صاحب کے دوست بھی تھے اور علامہ اقبال کے بھی۔ انہوں نے والد صاحب کو بتایا کہ کتاب "اقبال" کہیں بانگ درا پر (جو شائع ہونے والی تھی) اثر انداز نہ ہو۔ والد صاحب نے یہ سنا تو انہوں نے شیخ گلاب دین صاحب

---

[1] حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں۔ سہ ماہی "اقبال" لاہور بابت اکتوبر ۱۹۵۴ء صفحات ۴۴-۴۶

ناشر شیخ مبارک علی نے چھاپی۔ لیکن ابھی یہ کتاب شائع نہ ہوئی تھی کہ اقبال کو اپنے کلام کے مجموعہ کو شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور یہی وہ مجموعہ ہے جس نے بعد میں بانگ درا کی شکل اختیار کی۔ مولوی احمد دین نے اس خیال سے کہ ان کی کتاب کی اشاعت سے "بانگ درا" کی اشاعت کو نقصان پہونچے گا اپنی کتاب خود ہی تلف کر دی۔ اور اس طرح دنیائے ادب ایک بڑی مفید تحقیقی یادداشت سے محروم ہو گئی۔

شیخ مبارک علی صاحب لاہور کی گزشتہ نصف صدی کی علمی و تہذیبی زندگی کے ایک پہلو سے پوری طرح واقف ہیں۔ علامہ اقبال اور دیگر اکابر سے ان کے بہت گہرے مراسم تھے۔ مذکورہ بیان کے سلسلے میں میں نے ان کی رائے طلب کی تو انہوں نے یہ جواب ارسال فرمایا :۔

مولوی احمد دین اور ڈاکٹر اقبال صاحب کے تعلقات ہمیشہ برادرانہ رہے (شیخ صاحب) علامہ اقبال کسی اپنے دوست کے گھر کبھی نہ گئے۔ صرف مولوی احمد دین کی شخصیت ایسی تھی جہاں ڈاکٹر صاحب کی کسی قدر بے تکلفی تھی۔ وہ ان کے ہاں وقتاً فوقتاً جایا کرتے تھے۔ چنانچہ انہیں تعلقات کی بنا پر اور کچھ عقیدت کے تحت مولوی صاحب مرحوم نے "اقبال" لکھی جس میں ڈاکٹر صاحب کے حالات زندگی کے علاوہ ڈاکٹر مرحوم کی طویل نظمیں مثلاً شکوہ، جواب شکوہ، فریاد امت، طلوع اسلام وغیرہ بھی آگئی تھیں۔ جب یہ کتاب ڈاکٹر صاحب قبلہ کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے دیکھ کر یہ کہا کہ اس کتاب کے ہوتے ہوئے میرے دوسرے کلام کے مجموعے کی کیا ضرورت ہے؟ بظاہر وہ ناراض سے تھے۔ اس پر مولوی صاحب مرحوم نے اس کتاب کی کل کاپیاں نذر آتش کر دیں۔ کیونکہ ان کو ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں کافی دخل تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ اقبال صاحب کا دل کسی طرح بھی میلا ہو۔ جب ڈاکٹر صاحب کو اس واقعہ کا علم ہوا تو ان کو اس کا کافی صدمہ ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مولوی احمد دین نے اپنی کتاب "سرگزشت الفاظ" لکھی۔ جس پر ڈاکٹر اقبال نے سفارش کر کے پانچ صد روپیہ انعام دلوایا۔ . . . . . یہ کتاب (اقبال) مولوی صاحب نے ہی چھپوائی . . . . اس کی طباعت وغیرہ کسی چیز میں ہمارے ادارے کا دخل نہ تھا۔ صرف ہمارے پاس اس کا کچھ وقت کے لئے اسٹاک رہا۔ اس لئے (بطور تقسیم کنندہ) ہمارا نام اس کتاب پر تھا۔" (۱)

عبداللہ قریشی صاحب نے بھی اس سلسلے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کا بیان اگرچہ قدرے طویل ہے لیکن معاملے کے سب پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے نقل کرنا ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"کہتے ہیں کہ اس کتاب میں مولوی صاحب نے اقبال کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ان کی تمام ابتدائی نظمیں اور غزلیں جو انہوں نے ازرہ خلوص و محبت جمع کر رکھی تھیں شائع کر دی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح یہ منتشر کلام جمع ہو کر دستبرد حوادث سے محفوظ ہو جائے گا اور اقبال خوش ہوں گے۔ کیونکہ اس وقت تک ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ ان کی شاعری پر بھی کوئی مستند کتاب اردو زبان میں نہیں لکھی گئی تھی۔ مگر مولوی صاحب کا خیال غلط نکلا۔ انہیں مایوسی ہوئی۔ کیونکہ جب کتاب چھپ کر اقبال کے پاس پہونچی اور شیخ گلاب دین نے اس کے متعلق اقبال کی رائے دریافت کی

(۱) لاہور کا چیلسی، از حکیم احمد شجاع، مطبوعہ نقوش لاہور بابت جنوری ۱۹۶۲ء ص ۲۸

عبد القوی دسنوی

اقبال بھوپال میں

یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے جب میں عمر کی اس منزل میں تھا جہاں طفلی کی معصومیت کبھی تحیر کبھی تفکر اور کبھی تجسس سے ہمکنار رہتی ہو دنیا اس قدر محدود نظر آتی ہے جتنا گاؤں یا محلہ اور اس کی آبادی اتنی مختصر جتنی گاؤں والوں کی۔ محبت، پیار اور حاجت روائی کرنے والی شخصیت ماں کی، سب سے بارعب اور پُروقار شخصیت باپ کی اور سب سے زیادہ پُرہیبت شخصیت استاد کی ہوتی ہے۔ گاؤں کے مدرسے "انجمن اصلاح دسنہ" میں میرا داخلہ کرادیا گیا تھا۔ روز کا دستور تھا، صبح سویرے اٹھنا اور ناشتے سے فارغ ہوکر مدرسے کی راہ لینا۔ پڑھائی ہو یا نہ ہو، طبیعت مدرسے جانے کے لئے کبھی مائل نظر آتی اور کبھی بیزار۔

مدرسہ جب کھلتا تو سب سے پہلے مولوی علی حسن صاحب کی گرج دار آواز کانوں میں گونجتی۔ ہم لوگ خاموشی کے ساتھ کھڑے ہوجاتے اور پھر چند طلبہ علامہ اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" بڑے جوش وخروش کے ساتھ گاتے اور تمام مدرسے کے طلبہ ان کی آواز سے آواز ملاتے۔ میری زندگی میں یہ پہلی نظم تھی، جسے ہر روز لہک لہک کر گانے کا موقع ملتا تھا اور یہی وہ نظم تھی جس نے رفتہ رفتہ وطن کی عظمت کا احساس پیدا کیا اور دنیا والوں کے سامنے سربلندی کا جذبہ بیدار کیا۔

پھر ایک صبح ایسی آئی جسے میں اب تک بھلا نہ سکا۔ ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدرسے پہنچے تو ہمارے اساتذہ مغموم صورت بنائے کھڑے تھے، اس دن گھنٹہ بجنے کے بعد ترانہ نہیں گایا گیا۔ بلکہ ہمیں یہ خبر سنائی گئی کہ علامہ اقبال کا انتقال ہوگیا۔ وہی اقبال جس کا ترانہ ہر روز صبح کے وقت ہم بڑے جوش وخروش سے گاتے تھے۔ پھر چھٹی کا اعلان ہوا اور ہم لوگ خوش خوش گھر چل دیئے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس وقت ہم لوگوں کو اقبال کی موت پر کچھ رنج بھی ہوا یا نہیں۔ لیکن خیال ضرور آتا ہے کہ پہلی بار احساس تم ضرور پیدا ہوا تھا۔ شاید اساتذہ کو ملول اور رنجیدہ خاطر دیکھ کر ایسا ہوا ہو۔ لیکن جب گھر پہنچا تو بزرگوں میں بھی علامہ اقبال کی رحلت کا ذکر ہو رہا تھا جس کی وجہ سے یہ احساس ضرور دل میں پیدا ہو کہ ہمارا کوئی عزیز ہم سے بچھڑ گیا ہے۔ یا کوئی انمول یا پیاری چیز ہم سے چھین لی گئی ہو۔ بات آئی اور گئی۔ پھر ہم لوگ روزانہ مدرسے جاتے اور آتے رہے۔ لیکن مجھے خیال نہیں ہے کہ کبھی بھولے سے ہم لوگوں نے اقبال کو یاد کیا ہو۔ اور کرتے بھی کیسے۔ ہمارا ذہن ودماغ ایسے بلند انسان کو سمجھنے کے لائق کب تھا۔ اس لئے ہم ایسے عظیم سانحے اور گرانمایہ شخصیت

سے یہ کہا کہ ان کا مقصد کتاب لکھنے کا یہ ہرگز نہیں کہ اقبال کو کسی قسم کا نقصان ہو۔ اس لئے انہوں نے اس کتاب کو صحن میں رکھ کر بالکل جلا دیا۔

ریاض صاحب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے کتاب کی اشاعت پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ شیخ گلاب دین مرحوم کے سمجھانے پر مولوی صاحب نے کتاب کو جلایا۔ یہ بیان چونکہ مولوی صاحب کو بے حد قریب سے جاننے والے ایک شخص کا ہے، اس لئے اسے قبول کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے اس بیان کی روشنی میں علامہ اقبال کتاب کو جلانے کا سبب قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ علامہ کو یقیناً اس کتاب کے ضائع ہونے پر افسوس ہوا ہوگا۔ جبھی تو انہوں نے اصرار کر کے اس کتاب کو دوبارہ چھپوایا۔ اگر یہ کتاب علامہ اقبال کی ناپسندیدگی کی وجہ سے مولوی صاحب نے جلائی ہوتی تو وہ کبھی اسے شائع نہ کرتے۔

اس تاریخی کتاب کے ضائع شدہ ایڈیشن کا صرف ایک نسخہ باقی ہے جو خواجہ ریاض احمد صاحب کے پاس ہے۔ کاش یہ یادگار قومی عجائب گھر یا اقبال اکیڈمی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔[1] باقی آیندہ انشاء اللہ

م ۔ خ ا م ۔ خ

---

[1] اس مضمون کی تکمیل کے بعد معلوم ہوا کہ اس کتاب کا ایک اور نسخہ بھی ہے جو ان دنوں اتفاق سے راقم الحروف کے زیر مطالعہ ہے۔ اس پر خاص نوٹ آئندہ کسی اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔

اس سرزمین کی مردم شناسی اور قدر افزائی ہی کی وجہ سے اہل علم حضرات کی آمد کا سلسلہ یہاں جاری رہا۔ چنانچہ سید ظہیر الدین دہلوی، مرزا شاغل دہلوی، اسلم جیراجپوری، ذاکر حسین، ثاقب لکھنوی، احسن اللہ خاں ثاقب بدایونی، احمد علی شوق قدوائی، کلب احمد مانی جائسی، مضطر خیرآبادی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، افتخار عالم مارہروی، عبدالرزاق ابرائکہ، سر راس مسعود، ابن زبیری، نیاز فتحپوری، جگر مرادآبادی، علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ محوی صدیقی لکھنوی ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں جن کا قیام مختلف وقتوں میں یہاں رہا۔ ان میں زیادہ تر لوگ بغرض ملازمت یہاں آئے تھے۔ البتہ جگر مرادآبادی اور ثاقب وغیرہ کا تعلق ملازمت کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ نواب صاحب یا یہاں کے لوگوں کی کشش تھی جو بار بار انھیں یہاں کھینچ لاتی تھی ان میں سے چند نے تو بھوپال کو اپنا وطن ثانی بھی بنا لیا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کا تعلق بھوپال سے کچھ اور تھا۔ وہ نواب صاحب کے قدردان اور ان کے سیاسی شعور کے مداح تھے۔ دراصل نواب صاحب ہندوستانی سیاست سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور اس کی پیچیدگیوں سے باخبر رہتے تھے ویسے بیرون بھوپال سیاست سے ہٹ کر سماجی اور تعلیمی کارناموں سے بھی گہرا تعلق رکھتے تھے۔ انھی سماجی سیاسی اور تعلیمی کاموں کے لگاؤ کی وجہ سے دیدہ ور لوگوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اس طرح ہندوستان میں ان کے مداحوں کا حلقہ وسیع تھا۔ علامہ اقبال بھی نواب صاحب کے مداحوں میں سے تھے۔ لیکن یہ پتا نہ چل سکا کہ نواب صاحب سے ان کا تعلق کب پیدا ہوا اور کون سی چیز اس تعلق کا باعث بنی۔ البتہ علامہ اقبال کے ایک خط بنام غلام بھیک نیرنگ[1] مرحوم سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۲۷ء سے قبل ہی وہ نواب صاحب سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک چندے کے سلسلے میں نواب صاحب سے مدد کا یقین رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"لاہور ۲۴ جنوری ۱۹۲۷ء

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر کچھ کمی[2] چندے میں رہ گئی تو والیٔ بھوپال سے مدد کی التجا بہتر ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اسی تعلق کی بنا پر وہ اکثر بھوپال بھی تشریف لاتے تھے اور نواب صاحب کی سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے ان سے مشورہ بھی لیا کرتے تھے۔

دراصل ہندوستانی سیاست کا رنگ دیکھ کر علامہ اقبال آہستہ آہستہ سیاست میں دخیل ہو گئے تھے اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی بھی اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ سیاست سے ان کا اس قدر گہرا لگاؤ ہو گیا تھا کہ جب دوسری گول میز کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء میں منعقد ہوئی تو اس میں علامہ اقبال بھی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ان کے ساتھ غلام رسول مہر بھی تھے۔ غلام رسول مہر سیاسی شعور رکھنے کے علاوہ اس کانفرنس میں علامہ کے ساتھ اس لئے بھی ہوئے تھے کہ ان کی وجہ سے انھیں مدد ملے گی۔

نواب حمید اللہ خاں اپنے سیاسی افکار کی وجہ سے اس زمانے میں بڑی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ اس لئے علامہ اقبال نے کانفرنس میں شریک ہونے سے پہلے نواب صاحب سے ملنا مناسب سمجھا چنانچہ ۷ مئی ۱۹۳۱ء کو نذیر نیازی صاحب کو اسی سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

---

[1] غلام بھیک نیرنگ۔ [2] اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۰۹

کے کھو جانے سے متاثر نہیں ہوئے۔

۱۹۴۰ء میں تعلیم حاصل کرنے کھڑگپور (بنگال) چلا گیا۔ جب ۱۹۴۱ء کے دسمبر کی تعطیل گزار نے وطن پہنچا اور چھٹی ختم ہونے کو آئی تو معلوم ہوا کہ کھڑگپور میں جاپانیوں کی بمباری کا خطرہ ہے۔ چنانچہ وہاں جانے کے بجائے رانچی بھیج دیا گیا۔ یہیں اقبال کے مجموعۂ کلام "بانگ درا" کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ویسے یہ بات بالکل درست ہے کہ میری عمر کے اعتبار سے یہ کتاب یقیناً ابھی نہ تھی جسے ہم پڑھتے یا پڑھنے کا شوق رکھتے۔ لیکن میرے دوست رکن الدین کو اس کتاب کی نظمیں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" بہت پسند تھیں۔ انھیں ان نظموں کا پس منظر بھی بہت کچھ معلوم تھا۔ انھی کی وجہ سے اقبال کی ان دونوں نظموں سے مجھے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور ان نظموں کے مختلف بند بغیر سمجھے ہوئے زبانی یاد کر لیے۔ یہیں اقبال کی شاعری سے میری دوسری بار شناسائی ہوئی۔

جب میں تعلیم سے فراغت پاکر فروری ۱۹۴۶ء میں بھوپال آیا تو اس وقت تک اقبال کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کر چکا تھا اور ان کی عظمت کا معترف اور شاعری کا دلدادہ ہو چکا تھا۔ ان کے اذکار، خیالات اور تصورات دل کے مختلف گوشوں پر چھا سکہ جما چکے تھے۔ یہاں اقبال کے عاشق اور ان کے دیوانے ان کی آمد کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کرتے نظر آئے۔ میں نے ایسے لوگوں کی آنکھوں میں اس تذکرے کے ساتھ خوشی کی چمک، چہروں پر مسرت کی دمک اور دلوں میں فخر کے جذبات محسوس کئے لیکن مجھے یہ پتا نہ چل سکا کہ وہ یہاں کب آئے، کیوں آئے اور نواب صاحب بھوپال سے ان کے کس قسم کے تعلقات تھے؟ اور سر راس مسعود نے دوستی کا حق کس طرح ادا کیا؟ اس قسم کے خیالات ہمیشہ دل میں چٹکیاں لیتے رہے۔ یہاں کے لوگوں سے دوبارہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی مایوس ہونا پڑا۔ اس لئے کہ اس دور کے ان لوگوں میں سے جو علامہ سے قریب رہے تھے بہت کم موجود ہیں۔ باقی یا تو بھوپال چھوڑ چکے ہیں یا ملک عدم کی راہ لے چکے ہیں۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور باوجود نامساعد حالات کے کوشش جاری رکھی۔

علامہ اقبال سے ملنے والوں میں خاص طور سے ممنون حسن خاں صاحب کا نام لیا گیا۔ موصوف اس زمانے میں سر راس مسعود کے سکریٹری تھے۔ اور علامہ اقبال کی دیکھ ریکھ کا کام انجام دے رہے تھے۔ خان صاحب علامہ اقبال کے شیدائیوں میں سے ہیں اور اس دور کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کرتے ہیں۔ ان سے علامہ اقبال اور بھوپال کے تعلق سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی اور انھوں نے بہت حد تک میری رہنمائی، ہمت افزائی اور بڑی مدد کی۔ ان کے علاوہ عبدالحلیم انصاری صاحب، اقبال حسین خاں صاحب، حکیم قمرالحسن صاحب، زبیر احمد صدیقی صاحب، یوسف قیصر صاحب اور اختر سعید خاں صاحب سے اس سلسلے میں کافی تعاون ملا۔ دراصل ان صاحبان کی دلچسپیوں نے ہی اس کام کو اس منزل تک پہنچانے میں میری ہمت افزائی کی۔

سرزمین بھوپال

یہ خصوصیت ہے کہ یہاں ہر زمانے اور ہر دور میں ملک کے باکمالوں کی قدر ہوتی رہی ہے۔ شاید

تلاش میں ان کی کھو گیا میں تو دل میں میرے سما گئے وہ
پھر اب کہو تو بلاؤں کس کو پکاروں کس کو خطاب کیسا
ہر ایک ذرہ دمک رہا ہے ہر اک فضا میں ہے دل ربائی
یہ سارے کون و مکاں پہ چھایا ہے تیرا رنگیں شباب کیسا
کبھی ازل میں کسی نے چھیڑا تھا میرے تارِ نفس کو ہمدم
مگر ابھی تک فضا میں ہر سمت یہ بج رہا ہے رباب کیسا
وہ تم کو اقبالؔ خواب میں جب گلے سے اپنے لگا گئے ہیں
وہ خواب ہے زندگی کا حاصل بھلا بتاؤ وہ خواب کیسا

علامہ اقبال کئی سال سے درد گردہ کے مرض میں مبتلا تھے یہ تکلیف ۱۹۰۵ء میں شروع ہوئی تھی۔ سید نذیر نیازی کی مدد اور مشورے سے حکیم نابینا عبدالوہاب انصاری دہلوی کا علاج شروع ہوا اور کافی فائدہ ہوا چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب علامہ اقبال یکایک علیل ہوئے اور شروع میں انگریزی دوائیں استعمال کی گئیں تو کوئی فائدہ نہیں ہوا جس کے سبب علامہ افسردہ خاطر اور پریشان نظر آنے لگے۔

بیماری کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی کہ علامہ عید کی نماز پڑھنے (۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء) چودھری محمد حسین، جاوید اقبال اور اپنے ملازم علی بخش کے ساتھ شاہی مسجد گئے موسم سرما کا تھا۔ اس دن خاص طور سے ٹھنڈک میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ علامہ صرف شلوار اور کوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے۔ مسجد میں کافی دور تک ننگے پاؤں بھی چلنا پڑا تھا۔ مسجد سے واپسی پر دہی اور سویاں کھائیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عید کے دوسرے ہی روز سخت نزلے کی شکایت ہو گئی۔ نزلے کا علاج ہوا لیکن فائدہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ کچھ دنوں بعد کھانسی کی تکلیف ختم ہو گئی لیکن گلا بیٹھ گیا آواز اس قدر بیٹھ گئی تھی کہ وہ بات چیت کرتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی سرگوشیاں کرتا ہو۔ (نذیر نیازی۔ علامہ اقبال کی آخری علالت) آخر حکیم نابینا کا علاج شروع ہوا اور کافی فائدہ ہوا۔ اگرچہ آواز کی خرابی میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوئی۔ نذیر نیازی صاحب تحریر کرتے ہیں:۔

"اس طرح[1] ۱۹۳۴ء بخیر و خوبی گزر گیا۔ ۱۸ دسمبر کو جب حضرت علامہ علی گڑھ جاتے ہوئے دہلی سے گزرے اور میں اسٹیشن پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی صحت کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی۔ واپسی پر انھوں نے حکیم صاحب سے ملاقات کی۔ انھوں نے نبض دیکھ کر ہر طرح سے اطمینان کا اظہار کیا اور معمولی پرہیز اور دوائیں جاری رکھنے کی ہدایت کی"

سر سید احمد کے پوتے سر راس مسعود اسی زمانے میں بھوپال میں وزیر تعلیم تھے۔ علامہ اقبال سے وہ بے انتہا عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے اس تعلق کی وجہ مصنف "روزگار فقیر"[2] یہ بتاتے ہیں کہ،

---

[1] اقبال انجمن ترقی اردو ص ۲۰۴ [2] روزگار فقیر ص ۱۵۱

"میں پرسوں بھوپال جارہا ہوں۔ دو چار روز وہاں قیام رہے گا۔ اگر قومی سرمایہ مسلمان جمع کر سکیں تو میرا اندازہ ہے کہ مسلمانوں میں ہندوؤں کی نسبت زیادہ مادۂ قربانی اور اپنے حقوق کے لئے ایجی ٹیشن کرنے کی جرأت و ہمت موجود ہے"

علامہ اقبال سیاسی گفتگو کے سلسلے میں تشریف لا رہے تھے تاکہ نواب صاحب سے کانفرنس کے سلسلے میں تبادلۂ خیال ہو جائے۔ چنانچہ نذیر نیازی[1] لکھتے ہیں کہ "حضرت علامہ اقبال، بھوپال جا رہے تھے اور تقریب وہی سیاسی گفت و شنید"

علامہ اقبال کا قیام بھوپال میں زیادہ نہیں رہا۔ وہ ۹ مئی کو بھوپال کے لئے روانہ ہوئے تھے اور ۱۴ مئی کی صبح لاہور واپس پہنچ گئے ان کے ۱۴ مئی ۱۹۳۱ء کے مکتوب بنام مولوی محمد صالح صاحب[2] سے اس سفر کا مختصر احوال معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:

"میں ابھی صبح بھوپال سے واپس آیا۔ ریاست بھوپال میں بھی نواب صاحب بھوپال کی دعوت پر اسی مطلب کے واسطے گیا تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اختلافات رفع کرنے کی کوشش کر کے ان کو ایک مرکز پر متحد کیا جائے۔ معاملہ امید افزا ہے مگر افسوس ہے کہ چونکہ ہر روز قریب دو بجے رات تک جاگنا اور کام کرنا پڑا میں راہ میں بیمار ہوگیا — آج صبح واپس آیا ہوں۔"

جناب اقبال حسین خاں صاحب جو اس زمانے میں بی اے کرنے کے بعد نواب صاحب کے ساتھ رہتے تھے بیان کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نواب صاحب سے بات چیت کرنے کے بعد جب کمرے سے باہر آئے تو تھکے ہوئے تھے اور ان کے چہرے کے نقوش سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی اہم مسئلے پر گفتگو ہوئی ہے۔

اس سفر میں علامہ کا قیام "راحت منزل" میں تھا۔ جہاں کھانے کے کمرے میں علامہ اقبال سے ان کی تھوڑی بات چیت ہوئی۔ علامہ اقبال نے دریافت کیا کہ کیا آپ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اقبال حسین خاں صاحب نے جواب دیا کہ شعر و شاعری سے زیادہ تعلق تو نہیں ہے البتہ گاہے گاہے شعر کہہ لیتا ہوں۔ چنانچہ علامہ نے سنانے کی فرمائش کی جب خاں صاحب نے اپنی غزل سنائی تو علامہ نے پسند فرمایا۔ البتہ مطلع میں اصلاح کر دی۔ اصلاح شدہ شعر خاں صاحب کو اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے اپنا مطلع نکال دیا۔ اور اب تو انھیں اپنا شعر یاد بھی نہیں۔ پوری غزل حسب ذیل ہے:

نگاہ ہے پردہ سوز میری نقاب کیسا حجاب کیسا
تمھاری ان پردہ بندیوں کا ملا ہے تم کو جواب کیسا
نکل گئیں کیوں یہ بہکی باتیں قدم مرے کیسے لڑکھڑائے
نسیم کوچے سے کس کے آئی مہک رہا ہے گلاب کیسا
کسی کی مست انکھڑیوں میں نہ اپنے نظر تلطف کی میں نے پائی
تجھے مبارک تری نصیحت مری خطا کا حساب کیسا

[1] مکتوبات اقبال ص ۹۰ [2] اقبال نامہ ص ۳۰۶ -

جس گاڑی سے علامہ اقبال بھوپال آ رہے تھے، وہ رات کے وقت یہاں پہنچتی تھی۔ انھیں لینے کے لئے میں اور سر راس مسعود اسٹیشن گئے۔ نواب صاحب نے ملٹری سکریٹری کرنل سر اقبال محمد خاں (C.I.E.) کو بطور اپنے نمائندے کے بھیجا تھا۔ حالانکہ وہ شاہی مہمان کی حیثیت سے تشریف نہیں لا رہے تھے۔ اسٹیشن پر ہم لوگ پنجاب میل کی آمد سے کچھ دیر پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سر راس مسعود بڑی بے چینی سے علامہ کا انتظار کر رہے تھے جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کا منتظر ہو۔ جب گاڑی آئی تو ایک صاحب افغانی ٹوپی شلوار اور پنجابی کوٹ میں ملبوس پلیٹ فارم پر اترے۔ سر راس کی جب نظر ان پر پڑی تو اس طرف بڑی تیزی سے آگے بڑھے اور ان کے منہ کے اس قدر بوسے لئے کہ لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ میں ان کے پیچھے ہی کھڑا عجیب نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ تب ہی سر راس مسعود میری طرف متوجہ ہوئے اور علامہ اقبال سے کہا۔ اس لڑکے سے ملو یہ میرا سکریٹری ہے۔ تمھارا کلام کا عاشق ہے۔ اسے تم سے زیادہ تمھارا کلام یاد ہے۔ میں فرط مسرت سے آگے بڑھا جھک کر سلام کیا اور انھوں نے مجھے گلے سے لگالیا۔

اس کے بعد کرنل اقبال محمد خاں آگے بڑھے اور کہا کہ نواب صاحب نے سلام کے بعد یہ کہلوایا ہے کہ اگر آپ اور سر راس مسعود صاحب اجازت دیں تو شاہی مہمان خانے میں قیام کا انتظام کیا جائے۔ آپ کے وہاں قیام سے نواب صاحب کو بے حد خوشی ہوگی۔ علامہ اقبال نے مسکراتے ہوئے نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ میں تو اس وقت اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔ نواب صاحب سے ضرور ملوں گا۔ ان کو میرا سلام اور شکریہ پہنچا دیجئے گا۔

علامہ اقبال کے پاس بہت مختصر سامان تھا جو سر راس کی گاڑی کے پیچھے ہی آگیا۔ سامان اٹھانے والی گاڑی اگرچہ آئی تھی لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں پڑی اور وہ خالی واپس گئی۔

علامہ اقبال کا قیام "ریاض منزل" میں ہوا۔ یہ مکان بھوپال کے مشہور تالاب "بڑے تال" کے کنارے ہے۔ بھوپال کا یہ مقام بڑا حسین اور دلفریب ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس سرزمین کے لئے قدرت کا یہ ایک حسین عطیہ ہے۔ اس مکان کے بالائی حصے میں سر راس نے ایک کمرہ بنوایا تھا اسی میں انھیں ٹھیرایا گیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں بیٹھ کر اقبال نے اپنی نظم "نگاہ" تخلیق کی تھی۔ ہم لوگ جیسے ہی ریاض منزل پہنچے بیگم مسعود نے علامہ کا خیر مقدم کیا۔ علامہ اقبال ان سے بہت خلوص اور محبت کے ساتھ ملے۔

چونکہ سر راس مسعود کے کہنے پر نواب صاحب نے مجھے خاص طور سے ڈاکٹر صاحب کی ڈیوٹی میں مقرر کر دیا تھا۔ اور میری اس دفتر کی حاضری معاف کر دی گئی تھی۔ اس لئے صبح سے میں بجائے سر راس مسعود کے سکریٹری ہونے کے اقبال کا خادم ہو کر کام کرنے لگا تھا۔ سر راس نے علامہ کو بتا دیا تھا کہ انھیں جس بات کی ضرورت ہو اس کی اطلاع ممنون حسن خاں کو دیں۔ یہ اس کی تعمیل کریں گے۔

رات کے کھانے کا انتظام سر راس مسعود نے خاص طور سے کیا تھا۔ علامہ اقبال نے سر راس مسعود کے ساتھ ہی ڈائننگ روم میں کھانا کھایا۔ کھانے کے درمیان ہی علامہ اقبال نے کہا کہ میرا کھانا سادہ ہونا چاہئے اور ڈائننگ روم میں کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لئے اگر میں ڈائننگ روم میں نہ آسکوں تو برا نہ مانئے گا۔ مجھے جس وقت بھوک لگے گی کھا لوں گا۔ کھانے کے بعد میں علامہ اقبال کا کمرہ دیکھنے گیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بستر جو سر راس مسعود نے اپنے مہمان عزیز کے لئے بچھوایا تھا اسے ان کے ملازم نے اٹھا دیا تھا اور اس کی جگہ

"چونکہ سرراس مسعود ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے اس لئے ڈاکٹر محمد اقبال کے وہ غائبانہ مداحوں میں تھے اور ان کی ذات سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر ڈاکٹر صاحب سے ان کی دوستی کا آغاز غالباً حیدرآباد دکن سے ہوا (۱۴؍جنوری ۲۹ء) ڈاکٹر صاحب جب علی گڑھ تشریف لے گئے تو سرراس مسعود سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔"[1] ۱

چنانچہ علامہ اقبال کی علالت کی خبر سن کر وہ بے حد متفکر ہوئے۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ علامہ اقبال کا علاج بھوپال ہی میں ہو۔ یہ سرراس مسعود سے علامہ کا تعلق ہی تھا کہ وہ بھوپال میں علاج کے لئے تیار ہو گئے۔ اور ۳۱؍جنوری ۱۹۳۵ء کو بھوپال تشریف لائے۔ ۳۰؍جنوری کو ان کا قیام دہلی میں رہا۔ دہلی میں قیام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھی دنوں خالدہ ادیب خانم دہلی تشریف لائی ہوئی تھیں، ان کے خطبات کا سلسلہ جامعہ ملیہ دہلی کے زیر اہتمام ہو رہا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر انصاری نے کوشش کی تھی کہ ان کے کسی ایک خطبے کی صدارت علامہ اقبال فرمائیں۔ لیکن اس وقت انھوں نے خرابی صحت کا عذر پیش کیا تھا۔ مگر جب خطبوں کا سلسلہ شروع ہوا اور خالدہ ادیب خانم نے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق عجیب عجیب باتیں کہیں تو علامہ بے حد متفکر، متعجب اور مضطرب ہوئے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں ۲۳؍جنوری ۱۹۳۵ء کو وہ نذیر نیازی صاحب کو تحریر کرتے ہیں:

"مشرق کی روحانیت اور مغرب کی مادیت کے متعلق جو خیالات انھوں نے (خالدہ ادیب خانم) ظاہر کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر بہت محدود ہے .... کاش ان کو معلوم ہوتا کہ مشرق و مغرب کے کلچرل تصادم میں نبی اکرم صلعم کی شخصیت اور قرآن پاک نے کیا حصہ لیا۔ مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کیونکہ مسلمانوں کی فتوحات نے اسلام کے کلچرل اثرات کو دبائے رکھا۔ نیز خود مسلمان بھی رو ڈھائی سو سال تک یونانی فلسفے کا شکار ہو گئے۔"

اسی لئے علامہ کے دل میں خالدہ ادیب خانم سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ تاکہ ان سے مل کر ان کے اس قسم کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر سکیں۔ چنانچہ دہلی آنے کی اطلاع نذیر نیازی صاحب کو دی:

"میں ۲۹؍جنوری شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۳۰ کی صبح کو دہلی پہنچوں گا۔ فرنٹیئر میل سے سفر کروں گا جیسے کہ پہلے لکھ چکا ہوں۔ کونسل خانے میں قیام کروں گا .... باقی خیریت ہے۔ دوا ابھی میرے پاس ہے۔ مزید دوا کے لئے اسٹیشن پر گفتگو ہوگی۔ پھر اسے آپ بھوپال بمعرفت سرراس مسعود (ریاض منزل) ارسال کر دیں۔"[2]

پروگرام کے مطابق بھوپال تشریف لاتے ہوئے ۳۰؍جنوری کی صبح وہ دہلی اترے اور خالدہ ادیب خانم کے ایک خطبے کی صدارت کی اور اثنائے گفتگو میں انھیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن میرا خیال ہے کہ علامہ اقبال کی باتوں سے وہ متفق نہیں ہوئیں۔ اس کے بعد وہ بھوپال کے لئے روانہ ہوئے۔ اور ۳۱؍جنوری ۳۵ء کو وہ بھوپال پہنچے۔ بھوپال میں آمد کے سلسلے میں جناب ممنون حسن خاں بیان کرتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ جب وہ سرراس مسعود کی دعوت پر بھوپال تشریف لائے تھے۔ اس زمانے میں ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ گلے کی تکلیف کا اثر شروع ہو گیا تھا۔ سرراس مسعود نے انھیں بلانے کے لئے تار وغیرہ میرے ہی ذریعے بھجوائے تھے

[1] اقبال انجمن ترقی اردو، صفحہ ۳۰۵   [2] مکتوبات اقبال ص ۲۵۳

میں زیادہ تر خطوط آتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو سے علامہ کی صحت کے بارے میں خبریں نشر ہوتی تھیں

یہاں طبی معائنے کے بعد علاج شروع ہوا۔ علاج ULTRA VOILET RAYS کے ذریعے ہونا قرار پایا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن جو اس زمانے میں بھوپال کے سب سے اونچے ڈاکٹر شمار کئے جاتے تھے اور ڈاکٹر باسط دونوں علامہ کے معالج تھے۔ علامہ ۵ر فروری ۱۹۳۵ء کو نذیر نیازی کو بھوپال کی آب و ہوا اور علاج کے سلسلے میں آگاہ کرتے ہیں۔

"الحمد للہ[1] خیریت ہے۔ کھانسی کی شکایت اب باقی نہیں رہی۔ بھوپال کا موسم نہایت عمدہ ہے۔ امید ہے کہ اس کا صحت پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ طبی معائنہ کل ختم ہوا۔ یہاں کے ڈاکٹر نہایت ہوشیار ہیں۔ اور ہسپتال بھی نہایت عمدہ ہے طبی معائنے سے جو نہایت مکمل تھا حکیم صاحب کی بہت سی باتوں کی تائید ہوئی۔ بہرحال آج گیارہ بجے ULTRA VOILET RAYS (ماورائے بنفشی شعاعوں) کا غسل شروع ہوگا۔ جو ابتدا میں صرف سات منٹ روزانہ ہوگا"

۹ر فروری ۱۹۳۵ء کو علامہ اقبال نیازی صاحب کو دوبارہ اپنی صحت اور علاج کے متعلق خبر کرتے ہیں:۔

"بجلی اور[2] ULTRA VOILET RAYS سے علاج شروع ہے۔ ایک آدھ ہفتے کے بعد معلوم ہوگا کہ اس سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحبان یقین دلاتے ہیں کہ ضرور ہوگا ...... بھوپال میں موسم نہایت عمدہ ہے۔ فروری کے آخر تک بلکہ مارچ تک ایسا ہی رہے گا۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب اس وقت دہلی میں ہیں۔ ۱۷ر فروری کو واپس آئیں گے"

جب علامہ کو خفیف سا فائدہ ہوا تو ۱۳ر فروری ۱۹۳۵ء کو پھر تحریر فرماتے ہیں۔

"..... بجلی[3] کا علاج ابھی صرف چار دفعہ ہوا ہے۔ کچھ خفیف سا فرق آواز میں ہے مگر زیادہ وضاحت سے آٹھ دس دفعہ کے علاج کے بعد معلوم ہوگا اس واسطے ابھی آپ حکیم صاحب والی دوا ارسال نہ کریں۔

موسم بہت اچھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب صبح و شام دیکھتے ہیں۔ اور بہت پر امید ہیں کہ مہینے کے اختتام تک نمایاں فرق ہو جائے گا۔ نبض کی حالت اور دل اور پھیپھڑوں کی حالت بہت عمدہ ہے۔ میں انشاء اللہ اس ماہ کے آخر تک واپس ہوں گا بشرطیکہ کوئی خاص امر مانع نہ ہو"[4]

علامہ اقبال ۸ر مارچ کو بھوپال سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ یہاں تقریباً سوا مہینے ان کا قیام رہا۔ علاج سے افاقہ ہوا لیکن آواز میں بہت کم فرق پیدا ہو سکا۔ بقول نذیر نیازی صاحب:۔

"حسب قرار داد حضرت علامہ ۸ر مارچ ۳۵ء کی صبح کو دہلی تشریف لائے۔ صحت نہایت اچھی تھی، معالجین بھوپال کو یقین تھا کہ ان کے علاج سے حضرت علامہ کا مرض جاتا رہے گا۔"

چنانچہ علامہ لاہور سے ۱۹ر مارچ کو محمد حسین صاحب کو تحریر کرتے ہیں:۔

---

۱ مکتوبات اقبال ۲۵۶ ۲ مکتوبات اقبال ۲۵۰ ۳ مکتوبات اقبال ص ۲۰۲ ۴ مکتوبات اقبال ۲۶۳

بال کا معمولی بستر لگا رہا تھا۔ میں نے جب دریافت کیا تو ملازم نے بتایا کہ اقبال ہمیشہ اپنے بستر ہی پر سوتے ہیں۔ میں نے دیکھا علامہ اقبال کے بستر پر دو کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوان غالب۔ ملازم نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سفر میں زیادہ تر ان کتابوں کو ساتھ رکھتے ہیں۔ ان کے پلنگ کے قریب ہی ایک ہمابی حقہ رکھا ہوا تھا

دوسرے دن علامہ اقبال نے فرمایا کہ نواب صاحب سے ملنے کا وقت لے لیا جائے۔ چنانچہ ملنے کا وقت مقرر کر لیا گیا ٹھیک وقت پر سر راس علامہ اقبال کے ساتھ نواب صاحب سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے۔ میں بھی بحیثیت خادم ان کے ساتھ تھا۔ یہاں سے پہلے ہی ٹیلیفون کر دیا گیا تھا۔ کہ قصر سلطانی کے لئے ہم لوگ فلاں راستے سے آرہے ہیں۔ جیسے ہی گاڑی محل میں آکر رکی ہم لوگوں نے دیکھا کہ نواب صاحب نیچے کی سیڑھی پر علامہ اقبال سے ملنے کے لئے کھڑے ہیں۔ نواب صاحب بڑے احترام اور محبت کے ساتھ علامہ سے ملے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے بزرگوں سے مل رہے ہیں۔ پھر نواب صاحب علامہ کو اپنے کمرے میں لے گئے۔ جہاں صرف ہم چار آدمی تھے۔ میں سب سے پیچھے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا جلد ہی کافی کا دور چلا۔ نواب صاحب نے دریافت کیا کہ اقبال صاحب آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ جس پر علامہ نے کہا کسی قسم کی بھی تکلیف نہیں ہے۔ نواب صاحب نے صحت کے بارے میں پوچھا تو علامہ نے بیماری اور تمام علاج کی تفصیل بتائی۔ اس کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ نواب صاحب نے AN. INTERPRETATION OF HOLY QURAN IN THE LIGHT OF MODERN PHILOSOPHY کے بارے میں دریافت کیا۔ علامہ اقبال نے بتایا کہ اس کتاب کا خاکہ میرے ذہن میں ہے کچھ تیار بھی کیا ہے۔ لیکن کچھ کتابیں بیرون ملک میں ہیں انھیں دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ مجھے آکسفورڈ اور کیمبرج EXTENSION LECTURE کے لئے بلایا جا رہا ہے۔ اگر میں وہاں گیا تو ان کتابوں کو دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ نواب صاحب نے کہا کہ اگر یہ کتاب مکمل ہو جائے تو ساری ملت اسلامیہ بلکہ ساری دنیا کے لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور آپ نے مجھے جو تحفے دیئے ہیں ان میں سب سے بڑا تحفہ ہوگا۔ اگر اس میں کچھ امداد کی ضرورت ہو تو جیسا کہ میں نے مسعود سے کہا ہے ہر طرح امداد کے لئے تیار ہوں۔ پھر دوسری باتوں کا ذکر چھڑ گیا۔ اس کے بعد نواب صاحب سے علامہ اقبال نے جانے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے کہا کہ چونکہ آپ مصروف ہیں اس لئے جانے کی اجازت دیجئے۔ نواب صاحب گاڑی تک پہنچانے آئے۔ سر راس مسعود اور علامہ اقبال پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میں آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور گاڑی ریاض منزل کے لئے روانہ ہوئی۔

ممنون حسن خاں صاحب بتلاتے ہیں کہ علامہ اقبال چونکہ بیمار تھے اس لئے روزانہ کافی خطوط ایسے آتے تھے جن میں صحت کے بارے میں دریافت کیا جاتا تھا۔ اس لئے علامہ کے خطوط کے لئے سر راس مسعود کی طرح الگ MAIL BAG جاتا تھا۔ تمام خطوط ممنون حسن خاں اپنے پاس رکھتے تھے۔ صبح کے وقت تمام خطوط علامہ کو سنا دیئے جاتے تھے اور پھر خطوط کے جو کچھ وہ جواب لکھاتے تھے پہلے پنسل سے لکھ لئے جاتے تھے پھر صاف کر کے یا ٹائپ کر کے ان کے پاس دستخط کے لئے بھیج دیئے جاتے تھے۔ یہ خطوط نوجوانوں سے لے کر والیان ریاست تک کے ہوتے تھے۔ ... کے بارے میں ہوا کرتے تھے۔ بیرون ملک سے بھی اسی سلسلے

یا حیّ یا قیوم

راہی سوئے فردوس ہوئی مادرِ جاوید — لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پُر داغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار — اقبال نے تاریخ کہی سرمۂ مازاغ

علامہ کے لئے یہ زمانہ بڑی دشواریوں اور پریشانیوں کا تھا۔ ایک طرف ان کی اپنی صحت خراب تھی، آمدنی کا واحد ذریعہ وکالت تھی، جسے عرصے سے چھوڑے ہوئے تھے۔ جو کچھ جمع کیا تھا وہ جاوید منزل کی تعمیر میں خرچ کر دیا تھا۔ البتہ بہت معمولی رقم کتابوں کی فروخت سے آتی تھی۔ جو ناکافی تھی اور جب جاوید منزل منتقل ہوئے تو غالباً دوسرے ہی دن اہلیہ رخصت ہوگئیں (اقبال ص ۲۰۷) ہاتھ خالی و دل رنجیدہ، ذہن پراگندہ اور طبیعت خوددار، پریشانیوں کا علاج کس طرح ہوتا۔ ادھر چھوٹے چھوٹے بچوں کی دیکھ ریکھ اور تربیت کا سوال بھی اپنی جگہ بڑا اہم تھا۔ چاہتے تو ہزاروں راستے ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے نکل جاتے۔ لیکن ان کی بے غرضی، استغنا پسندی اور قلندرانہ شان آڑے آرہی تھی۔

سر راس مسعود علامہ اقبال کے شیدائیوں میں سے تھے اور ان سے بے انتہا خلوص برتتے تھے، یہ ان کی محبت ہی تھی جس کی وجہ سے علامہ اقبال بار بار بھوپال تشریف لاتے تھے۔ علامہ جب ان حالات سے دوچار ہوئے تو سر راس ان کے لئے بے حد فکر مند رہنے لگے۔ وہ ایسے نازک موڑ پر اپنے عزیز دوست کے لئے کچھ راستہ نکالنا چاہتے تھے۔ چونکہ وہ اس زمانے میں بھوپال میں وزیر تعلیم تھے، اس لئے انھیں نواب صاحب سے بڑی قربت حاصل تھی وہ اس سلسلے میں ان کی خاص توجہ چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ علامہ اقبال کی وظیفے کے طور پر نواب صاحب کچھ مدد کریں۔ علامہ اقبال کو اس بات کا علم ہوگیا تھا۔ چنانچہ ۲۶ر اپریل ۱۹۳۵ء کو سر راس مسعود کو جب خط لکھتے ہیں تو اپنے اس ارادے سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ وہ قرآن پر نوٹ لکھنا چاہتے ہیں۔

"...... آپ نے میرے متعلق جس دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ اگرچہ مجھے آپ سے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مجھے اس سلسلے میں کامیابی کی کچھ زیادہ توقع نہیں۔ مجھے کچھ عرصے پہلے تو اس خیال سے مسرت تھی کہ آپ کو اس کوشش میں کامیاب ہونے کی قوی امید تھی اور اس طرح میرے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصے سے میرے زیر غور ہیں۔ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیش کش مسلمانان عالم کو نہیں کر سکتا۔

بہر حال دیدہ باید ہر امر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے اگر عالم جدید میں اسلام کی اس خدمت کا شرف میرے لئے

"جناب[۵۱] عرشی صاحب

السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے میری صحت عامہ تو بہت بہتر ہو گئی ہے مگر آواز پر ابھی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا علاج برقی ایک سال تک جاری رہے گا۔ دو ماہ کے وقفہ بعد پھر بھوپال جانا ہوگا۔"

شیخ عبدالقادر صاحب علامہ اقبال کی بھوپال میں آمد اور علاج کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ "حیف[۵۲] کہ کچھ عرصے بعد گلے کی بیماری کی وجہ سے اس آواز کو صدمہ پہنچا کہ مرحوم اپنی عمر کے آخری سالوں میں معمولی بات چیت بھی بہت دھیمی آواز سے کر سکتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں جب میں لاہور سے انگلستان روانہ ہوا تو اقبال بیمار تھے۔ اسی بیماری کی وجہ سے وہ آکسفورڈ نہ آ سکے جہاں انہیں لیکچر دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اسی زمانے میں ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کو جو ان کے خاص قدر دانوں میں تھے، خیال آیا کہ ان کا معالجہ ہونا چاہئے انہیں اپنے ہاں بلا کر مہمان رکھا اور علاج بھی کرایا جس سے قدرے افاقہ ہوا۔ اور گفتگو میں کچھ آسانی پیدا ہو گئی مگر گلا پورا درست نہ ہو سکا"

اس مرتبہ جب تک علامہ اقبال کا قیام بھوپال میں رہا وہ سر راس مسعود کے ساتھ "ریاض منزل" میں رہے۔ جہاں میزبان نے اپنے مہمان عزیز کی آسائش و آرام کے سلسلے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ بیگم سر راس بھی علامہ کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھیں — چنانچہ علامہ اقبال نے اس کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

"..... دوران[۵۳] قیام بھوپال انھوں نے (لیڈی مسعود) جو توجہ مجھ پر مبذول کی ہے اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا"

بھوپال سے واپسی پر علامہ کی حالت بہتر ضرور تھی لیکن مکمل صحتیابی کے لئے ابھی کافی دیر تھی۔ آہستہ آہستہ افاقہ ہو رہا تھا کہ اچانک والدہ جاوید کو اپریل ۳۵ء میں میعادی بخار آ گیا۔ اگرچہ وہ سالہا سال سے بیمار تھیں لیکن یہ بیماری ایسی آئی کہ پھر جانبر نہ ہو سکیں۔ علامہ اقبال اس زمانے میں بے حد فکر مند رہتے تھے۔ آخر وہ منحوس گھڑی آ ہی گئی جس کا ڈر تھا۔ یعنی ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو انھوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دار فانی کو خیرباد کہا۔ اس ناگہانی موت کا علامہ اقبال کے قلب پر بڑا گہرا اثر پڑا جس کا اظہار انھوں نے اپنے ۲۴ مئی ۳۵ء کے خط بنام نذیر نیازی میں کیا ہے جس کے ہر ہر لفظ سے ان کی دلی کیفیات کا پتا چلتا ہے۔

"کل شام[۵۴] والدہ جاوید اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں ان کے آلام و مصائب کا خاتمہ ہوا اور میرے اطمینان قلب کا۔ اللہ فضل کرے۔ ہر چہ از دوست می رسد نیکوست۔ باقی رہا میں سو میری حالت وہی ہے جو بھوپال سے آتے وقت تھی .... بھوپال نہ جا سکوں گا جب تک بچوں کے لئے کوئی معقول انتظام نہ ہو جائے"

علامہ اقبال کی رفیقۂ حیات قبرستان بیبیاں پاکدامناں (ایمپرس روڈ لاہور) میں دفن ہوئیں اور قبر پر اقبا
ل نے

یہ عریضہ اعلیٰ حضرت کو سنا دیجئے۔ میں خود حاضر ہو کر شکریہ ادا کروں گا۔ اب میری درخواست صرف اسقدر ہے کہ احکام اس پنشن کے تو جاری ہوں گے سرکار عالی اپنے ہاتھ سے بھی اس مضمون کا ایک خط مجھے لکھ دیں جو آپ نے مجھے لکھا ہے یہ خط میری اولاد میں بطور یادگار رہے گا اور وہ اس پر فخر کریں گے ؎

علامہ اقبال کو نواب صاحب کے خط کا بے حد انتظار تھا۔ چنانچہ دو ہفتے بعد ۵ جون کو پھر وہ سر راس کو خط لکھتے ہیں تو اس کے لئے تاکید کرتے ہیں ،

.... ؎ امید ہے کہ نیز احکام متعلقہ پنشن جاری ہو گئے ہوں گے۔ اب مجھے صرف اس خط کا انتظار ہے جس کا ذکر میں نے اپنے گزشتہ خط میں کیا تھا۔ اعلیٰ [illegible] کھرالی سے واپس تشریف لے آئے ہوں تو وہ خط لکھوا کر بھجوا دیجئے۔ ؎

عبدالرشید طارق اعلان وظیفہ کے بعد علامہ سے ملنے اور مبارکباد دینے گئے جس کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں

" بھوپال ؎ سے وظیفے کا اعلان ہوا تو ۲ جون ۱۹۳۵ء کو میں ان کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کرنے گیا۔ وہ وسطی کمرے میں پلنگ پر لیٹے تھے۔ بے حد کمزور اور لاغر ہو گئے تھے۔ نظام کی خاموشی پر جب میں نے اظہار تاسف کیا تو کہنے لگے کبھی وہاں معاملہ اٹھا تھا اور منظوری ملنے والی تھی۔ مگر یہاں کے دو آدمیوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ میں حیرت زدہ ہو گیا کہ وہ کون بدبخت انسان ہو سکتے ہیں اور جب انھوں نے نام بتائے تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ دونوں مسلمانان ہند کی جلیل القدر ہستیاں مانی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب وفات پا چکے ہیں دوسرے سرکاری فرائض کی ادائی میں ہوائی جہازوں پر دنیا کے چکر کاٹتے پھرتے ہیں۔ ...."

دراصل نواب صاحب نے علامہ اقبال کی ایسے موقع پر مدد کی تھی جب وہ حقیقتاً بڑی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ ادھر حیدرآباد سے امید جاتی رہی تھی اس لئے وہ نواب صاحب کو اپنا بڑا محسن تصور کرنے لگے تھے اور اس عنایت کی شکرگزاری کا اظہار مختلف طریقوں سے کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات علامہ کے مزاج میں تھی کہ وہ دوسروں کی اچھائیوں اور خوبیوں کو بڑی عاجزی اور انکسار کے ساتھ سراہتے اور دوسروں کی مہربانیوں کا ہمیشہ احترام کرتے۔

جیساکہ کہا جا چکا ہے کہ علامہ اقبال وظیفہ محض اس غرض سے حاصل کرنا چاہتے تھے کہ زندگی کے باقی ایام سکون و اطمینان سے گزار دیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سر راس مسعود کی کوششوں سے جہاں نواب صاحب بھوپال نے پانچسو روپے کا وظیفہ مقرر کیا اس کے ساتھ سر آغا خاں نے بھی پانچسو روپے دینے کا وعدہ فرمایا۔ لیکن یہ اقبال کی قلندرانہ شان تھی کہ نواب صاحب کے علاوہ مزید کسی رقم کو قبول نہیں فرمایا بلکہ یہ کہہ کر کہ "میری موجودہ ضروریات کے لحاظ سے پانچسو روپے ماہوار مجھے بہت کافی ہیں اس سے زیادہ خرچ کی مجھے عادت نہیں اس لئے نواب صاحب کے وظیفے پر اکتفا کی جائے" (روزگار فقیر ص ۱۶۱) دراصل اقبال کی غیرت مندی، خودداری، عزت نفس اور قلندری کا تقاضا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ روپے کے خواہشمند کبھی نہیں ہوئے۔ علامہ اقبال تو اس شخص کے قدردان تھے جس کے بارے میں انھوں نے کہا ہے ؎

؎ اقبال نامہ حصہ اول ص ۳۶۲ ؎ ملفوظات اقبال ص ۲۱۰

مقدر ہو چکا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے لئے ضروری ذرائع بہم پہنچا دے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

۲ر مئی ۱۹۳۵ء کے خط میں دوبارہ وہ اپنی اس دیرینہ آرزو یعنی قرآن کریم پر نوٹ لکھنے کے خیال کا اظہار کرتے ہیں۔

"چراغِ سحری ہوں، بجھا چاہتا ہوں، تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں، جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اسے اسی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ قیامت کے دن آپ کے جدِ امجد (حضور نبی کریم) کی زیارت مجھے اس اطمینانِ خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضورؐ نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجا لا سکوں"

بہرحال سر راس مسعود کی کوشش بارآور ہوئی اور والیٔ بھوپال ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہوئے۔ ویسے نواب صاحب بھی علامہ اقبال کے مداح اور قدردان تھے۔ چنانچہ انھوں نے پانچسو روپے کا ماہانہ وظیفہ تاحیات علامہ اقبال کے لئے مقرر کیا۔ علامہ ان لوگوں میں سے تھے جو دوسروں کی معمولی توجہ اور تعاون کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور ہمیشہ ان کے احسان مند رہتے تھے، چنانچہ وظیفے کی اطلاع پاکر ۳۰ر مئی ۱۹۳۵ء کو اپنے دوست سر راس مسعود کو خط لکھتے ہیں اور والیٔ بھوپال کا شکریہ نہایت عاجزی و انکسار کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ "نوازش نامے کے لئے جس سے ایک گونہ اطمینان ہوا سراپا سپاس ہوں۔ میری خواہش تو حقیقت میں اس انسان کی خواہش ہے جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور سفرِ آخرت سے پہلے کچھ نہ کچھ خدمت انجام دینے کا متمنی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اعلیٰ حضرت کی خدمتِ اقدس میں اس مسئلے کو پیش کر دیں گے۔ اعلیٰ حضرت کے مراحم خسروانہ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ بھوپال میں میری آسائش کا انھیں اس قدر خیال ہے۔"

پہلی جون کو علامہ اقبال نذیر نیازی صاحب کو بھی وظیفے کی اطلاع دیتے ہیں اور اپنے اس ارادے کو ظاہر کرتے ہیں کہ بقیہ عمر وہ قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کریں گے۔

"اعلیٰ حضرت نواب صاحب نے میری لائف پنشن پانچسو روپے ماہوار مقرر کر دی ہے۔ خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ انھوں نے میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کر دوں گا۔"

اسی وجہ سے وہ نواب صاحب کے بے حد شکرگزار تھے کہ انھوں نے ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے اس قدر آسانیاں فراہم کر دیں۔ چنانچہ وہ ۳۰ر مئی کو سر راس کو تحریر کرتے ہیں،

"میں کس زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں انھوں نے ایسے وقت پر میری دستگیری فرمائی جب میں چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھا۔ خدا تعالیٰ ان کی عمر و دولت میں برکت دے۔ ہندوستان کے مسلمان شرفا میں کون ہے جو اعلیٰ حضرت اور ان کے دودمانِ عالی کا ممنونِ احسان نہیں ہے۔

دور دستاں را بہ احساں یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر می افگند

دنیا کے سامنے اسلام کا تعارف کرا سکیں۔ چنانچہ عبدالرشید طارق "مئے شبانہ" کے عنوان سے تحریر کرتے ہیں "پھر میں نے INTRODUCTION TO THE STUDY OF QURAN[۱] جو وہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے کے متعلق تذکرہ چھیڑا تو فرمانے لگے ہاں ذرا صحت اچھی ہو تو لکھنا شروع کروں گا۔ چاہتا ہوں کہ بڑے عالم تیسیر النظر اور صحیح المشرب فاضل دیوبند میسر آ جائے، مجھے حوالجات تلاش کر کے دیتا رہے اور لکھنا جائے۔ انگریزوں نے قرآن ہو تو نہایت ہی اچھی بات ہے۔ میں تنخواہ بھی دینے کو تیار ہوں۔ ایک بار کتاب شروع کی تو انشاء اللہ اسلام کے بارے میں یورپ کی تمام نظریات THEORIES توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔ ارادہ ہے کہ قانون کی تمام کتب یعنی فقہ، حدیث اور تفاسیر خرید کروں۔ یہ اب میسر کر ... کی ہیں۔ اس کے بعد جب کبھی بھی جانا ہوا اس کتاب کی بابت استفسار کرتا اور ہمیشہ خدا سے صحت کے لئے دعا کرتے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ علامہ اقبال اس کتاب کو لکھنے کے لئے کس قدر بے چین تھے اور اپنی صحت یابی کے اس لئے بھی خواہاں تھے کہ بہتر طریقے سے کتاب مذکورہ وجود میں آ جائے تاکہ اسلام سے متعلق یورپ کے نظریات باطل ثابت ہو جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی قانونی کتابیں بھی بیچ دینا چاہتے تھے۔[۲] اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انھیں اسلام سے کس قدر محبت تھی۔ عبدالمجید سالک صاحب کو درج ذیل تحریر سے بھی ان کے اسی قسم کے جذبے کی عکاسی ہوتی ہے۔

"اگرچہ خیالات میں قریب قریب ہر روز یہی ذکر رہتا تھا کہ میں ایک کتاب لکھ کر چھوڑ جاؤں گا جس کا منشاء یہ ہوگا کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں مطالعۂ قرآن کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے اور جتنے نظریے یورپ کے مستشرقین نے قرآن اور ادبیات اسلامی سے متعلق قائم کر رکھے ہیں، وہ سب کے سب خاک میں مل جائیں۔ اس کتاب کا نام کبھی کبھی AIDS TO THE STUDY OF QURAN بتایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ یہ ارادہ ہوا تھا کہ جس طرح نیٹشے نے THUS SPAKE ZARATHUSTRA زرتشت نے یوں کہا، لکھ کر بعض حقائق کو نہایت دلآویز پیرائے میں ظاہر کیا ہے اسی طرح علامہ بھی ایک کتاب لکھیں ———

"THE BOOK OF UNKNOWN PROPHET" (ایک گمنام نبی کی کتاب)

۱۹۳۵ء میں علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر تھے۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ انجمن کے اجلاس میں اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال شریک ہوں۔ چنانچہ دوران قیام بھوپال نواب صاحب کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ نواب صاحب نے لاہور کی دعوت کو اس شرط پر قبول کیا کہ اگر انگلستان جانا نہ ہوا تو لاہور کے اجلاس میں شریک ہوں گے۔ علامہ اقبال بھوپال کی واپسی پر سر راس مسعود کو ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو لاہور سے تحریر کرتے ہیں:

"...... میرا خیال[۳] ہے اعلیٰ حضرت کی لاہور کی تشریف آوری کے لئے ۱۲ اپریل موزوں ہوگی۔ ۲۰ اپریل کو تو گورنر جلاس میں رسمی شمولیت فرمائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ۱۲ اپریل تمام تر اعلیٰ حضرت اور مسلمانان پنجاب کے لئے ہی مخصوص رہے۔ اگر اعلیٰ حضرت انگلینڈ تشریف نہیں لے جا رہے ہیں تو اس انتظام کی طرف توجہ کیجیے

۱۔ ملفوظات اقبال ص ۲۱۰۔ ۲۔ ذکر اقبال ص ۳۴۲ ۳۔ اقبال نامہ حصہ اول ۳۵۲

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز ۱
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

چنانچہ سر اکبر حیدری نے جب نظام کے توشہ خانہ سے ایک ہزار روپے کا چک بھیجا تو انھوں نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں خواجہ غلام السیدین تحریر کرتے ہیں :-

"آخری عمر میں[۱] ان کا فقر اور بے نیازی کا انداز اور بڑھ گیا تھا جس نے ان کو دنیا کی اوچھی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اور خودشناسی اور انسان دوستی کے راستے خداشناسی کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ جب وہ خلوص کے ساتھ کہہ سکتے تھے ؎

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر — میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو

اس شانِ فقر کے ایک دو دلچسپ واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ سر راس مسعود کی خواہش تھی کہ اقبال کو آخری عمر میں اطمینان کے ساتھ ادبی علمی کام کرنے کا موقع ملے اور کسی طرح فکرِ معاش سے آزادی حاصل ہو جائے۔ ان کے توجہ دلانے سے نواب صاحب بھوپال اور ایک دوسرے دولتمند رئیس نے یہ سعادت حاصل کرنی چاہی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیں۔ اقبال بمشکل بھوپال کی کم تر رقم کو اس سے دو چند رقم کے مقابلے میں قبول کرنے پر راضی ہو گئے۔ اور وجہ یہ بیان کی کہ اول تو یہ رقم میری ضروریات کے لئے کافی ہے میں زیادہ کیوں لوں۔ دوسرے جب تک میرے دل میں کسی شخص کی کوئی خاص وقعت نہ ہو اس کی امداد قبول نہیں کر سکتا۔ یہ تھا غیرتِ فقر کا تقاضا۔ ایک ایسے زمانے میں جب روپے کے بازار میں تقریباً ہر شخص کی قیمت لگائی جا سکتی ہے، اور بڑے بڑے مشاہیر منصب وجاہ دولت کی خاطر ہر قسم کا ایثار کرنے کو تیار ہیں۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ انھیں سر اکبر حیدری کے ساتھ پیش آیا۔ واقعہ جانا بوجھا لیکن قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے "یوم اقبال" پر توشہ خانہ حضور نظام دکن کی طرف سے ایک ہزار روپے کی خطیر رقم بطور تواضع کے پیش کی جب وہ چک اس تمہید کے ساتھ اس قلندر کے پاس پہنچا تو اس نے ان اشعار کے ساتھ واپس کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

تھا یہ فرمانِ الٰہی کہ شکوہِ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر — حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش — کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول — جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

دراصل وہ چاہتے تھے کہ اس قدر وظیفہ مل جائے کہ دوسری ضرورتیں پوری ہو جائیں تاکہ صحت یابی کے بعد یکسوئی کے ساتھ

---

۱ آندھی میں چراغ ص ۱۳۲۔

"میں[1] اور چند دوسرے احباب اعلیٰ حضرت کے استعفے سے متعلق ایک بیان اورینٹل پریس میں بھیج رہے ہیں۔ میرے متعلق آپ کی جو تجویز ہے اس کا سرا آج مجھے انجام کار مل ہی گیا۔ مجھے یہ اطلاع ایک بھاولپوری دوست کے معرفت ملا ہے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب بھوپال نے ایک خط لکھا ہے۔ اس خط کے مضمون سے بھی مجھے تھوڑی بہت آگاہی ہوئی ہے۔ کیا یہ اطلاع درست ہے؟ اس خط کا جواب موصول ہو جانے پر میں اس مسئلے میں اپنی رائے آپ پر ظاہر کر سکوں گا۔"

علامہ اقبال کے نواب صاحب بھوپال سے جو کچھ تعلقات تھے اس پر روشنی اس بیان سے بھی پڑتی ہے جو انجمن حمایت اسلام لاہور نے بتقریب نصب سنگ بنیاد زنانہ اسلامیہ کالج لاہور ۲۰ نومبر ۱۹۴۲ء کو تحریر کیا تھا۔

"عالی شہرا!

حکیم الامت علامہ ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمۃ نے ۱۹۳۶ء میں جب "ضرب کلیم" حضور کی خدمت میں پیش کی تو یہ مختصر لیکن جامع پیشکش ان حضور کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ؎

تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است
دلِ تو بیند و اندیشۂ تو می داند

اس پیشکش کے اکثر پڑھنے والوں کو ملت اسلامیہ کے ان مقاصد سے آگاہی تھی جن کے حصول کی فکر اس ترجمان حقیقت کے قلب کو ہر وقت بے قرار رکھتی تھی۔ لیکن حقیقت پہلی دفعہ واضح ہوئی کہ فرمانروائے بھوپال اقبال کے نزدیک وہ "صاحب نظر" ہے جس کا دل سب کچھ دیکھتا ہے اور جس کا اندیشہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو اقبال کے ضمیر میں ہے۔ "پیش کش" کے پہلے شعر میں اس داستان کی طرف اشارہ تھا جو زمانے کی ان بوالعجبیوں پر مشتمل تھی جس سے امم ایشیا کو دوچار ہونا پڑا۔۔۔۔۔"

"اس پیشکش سے تقریباً پندرہ سال قبل حکیم الامت نے "مخدرات اسلام" کو خطاب کرتے ہوئے ان بوالعجبیوں کے ایک گوشے کو "رموز بے خودی"[2] میں یوں بے نقاب کیا ہے ؎

اے کہ رویت پردۂ ناموس ما
تابشِ سرمایۂ ناموس ما

دور حاضر تر فروش و پُر فن است
کاروانش نقدِ دیں را رہزن است

کور و یزداں ناشناس ادراک او
ناکساں زنجیریٔ پیچاک او

چشم او بیباک و ناپرواستے
پنجۂ مژگان او گیراستے

صید او آزاد خواند خویش را
کشتۂ او زندہ داند خویش را

از سر سود و زیاں سودا مزن
گام جز برجادۂ آبا مزن

---

[1] اقبال نامہ ص ۳۰۵ [2] اقبال نے دلی طرف اشارہ ہے۔

امید ہے اعلیٰحضرت کے لئے ایک علیحدہ دن مخصوص کرنے میں میری منشا کو آپ نے پا لیا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ۱
اب یہ قطعی طور پر طے پا گیا کہ اعلیٰ حضرت عازم انگلستان نہ ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو تار کے ذریعے اطلاع دیں اور یہ اطلاع بھی بذریعہ تار ہی دیدیجئے کہ ۱۲ر اپریل اعلیٰ حضرت کو منظور ہے۔ معاملہ معلومہ کی نسبت آپ کو کوئی اطلاع ملی ہے؟"

۱۹ر مارچ (۱۹۳۵ء) کو پھر سر راس مسعود کو اسی سلسلے میں خط لکھتے ہیں:۔

"اس امر کی اطلاع آپ نے نہیں دی کہ آیا ہز ہائی نس جلسۂ انجمن میں جلوہ افروز ہوں گے اور مجھ سے ہز ہائینس نے خود فرمایا تھا کہ انگلستان نہ گئے تو ضرور تشریف لائیں گے۔ یہاں اس خبر سے جوش مسرت کی کچھ انتہا نہ رہی۔ مہربانی کر کے مطلع فرمائیے کہ آیا ہز ہائی نس ولایت تشریف لے جائیں گے . . . . . "

"جب سے میں بھوپال سے واپس آیا ہوں۔ لوگ زمینوں سے متعلق دریافت کرتے ہیں میرے پاس کوئی ان شرائط کی کاپی نہیں ہے۔ جن کے مطابق اراضی دی جاتی ہے۔"

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نواب صاحب بھوپال لاہور تشریف لے جا سکے یا نہیں۔ لیکن علامہ اقبال سے تعلق ہی کی بنا پر نواب صاحب نے مجوزہ زنانہ یونیورسٹی کو اپنے نام نامی سے منسوب کئے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں جب نواب صاحب لاہور تشریف لے گئے تو انجمن حمایت الاسلام لاہور کے استقبالیہ سپاسنامے میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

"آج سے کم و بیش سات سال پہلے حضرت حکیم الامت ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ کے زمانہ صدارت انجمن میں ہماری عاجزانہ استدعا پر حضور والا نے مجوزہ زنانہ یونیورسٹی کو اپنے نام نامی سے منسوب کئے جانے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔"

علامہ اقبال کے دل میں نواب صاحب کی اعلیٰ صفات کی بنا پر بے حد قدر تھی۔ چنانچہ نواب صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلری کے عہدے سے استعفا دیدیا تو علامہ بے حد متفکر ہوئے۔ وہ نواب صاحب کے استعفے کے حق میں نہیں تھے۔ اس واقعے کے بعد ۲ر مئی ۱۹۳۵ء کو وہ سر راس مسعود کو لکھتے ہیں:۔

"یونیورسٹی کا چانسلر اب کون ہوگا۔ کاش اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال اپنے استعفے پر دوبارہ غور فرما سکتے۔ لیکن شعیب صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ اس کا کوئی امکان نہیں۔ یہ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ لارڈ ولنگڈن نواب صاحب کو استعفے پر مکرر غور کرنے پر ضرور مائل کریں گے۔"

"مجھے اطلاع دیجئے کہ اعلیٰ حضرت کا اس سلسلے میں کیا ارادہ ہے۔"

سر راس مسعود کو ایک دوسرے خط میں اس سلسلے میں اپنے اقدام سے دوبارہ آگاہ کرتے ہیں:۔

۱۹۴۴ء ... ۵۳ ـ اقبال نامہ، ص ۳۵۹ ـ

نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ "۱۶ر جولائی ۱۹۳۵ء کی صبح کو حضرت علامہ (فرنٹیر میل) دہلی تشریف لائے۔ میں اسٹیشن پر موجود تھا۔ شام کو بھوپال روانہ ہوگئے۔"[1]

"۱۷ر جولائی کو علامہ اقبال بھوپال پہنچے اور برقی علاج پھر شروع ہوا۔ ۱۹ر جولائی کو علامہ سید سلیمان ندوی کو آگاہ کرتے ہیں کہ "میں گلے کے برقی علاج کے لئے کچھ مدت کے لئے بھوپال میں مقیم ہوں۔"

یکم اگست کو اپنی صحت کی بہتری کا اظہار نذیر نیازی صاحب کے خط میں کیا۔ یہ خط شیش محل سے لکھا ہوا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ جلد ہی وہ ریاض منزل چھوڑ کر شیش محل میں منتقل ہوگئے تھے۔ "میری صحت ترقی کر رہی ہے۔ الحمد للہ۔ اگر آپ لاہور سے واپس آگئے تو اطلاع دیں۔"

علامہ اقبال ۱۰ر اگست کو بھوپال سے اپنی صحت کی بہتری کے بارے میں پھر اطلاع دیتے ہیں

"صحت[2] خوب ترقی کر رہی ہے۔ آواز میں بھی فرق ہے۔ امید ہے اب کے علاج سے فائدہ ہوگا۔ شاید ایک دفعہ اور بھوپال آنا پڑے گا۔ یعنی اس ہفتے بعد . . . . میں غالباً ۲۷ر یا ۲۸ر اگست کو یہاں سے روانہ ہوں گا۔"

اس سفر میں بھی علامہ کا قیام کچھ دنوں تک "ریاض منزل" بھوپال میں رہا۔ جہاں سر راس مسعود اور بیگم مسعود ان کے میزبان تھے۔ دونوں علامہ اقبال کا ہر طرح خیال رکھتے تھے اور ان کی دیکھ ریکھ اور ان کے آرام میں کسی قسم کی کمی پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ نذیر نیازی صاحب علامہ اقبال کی آخری علالت میں بیان کرتے ہیں: "سر راس مسعود ان کے آرام و آسائش کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ خود حضرت علامہ کو تعجب ہوتا۔ انھوں نے خود مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک روز جب[3] پیٹھ کے درد کا ہلکا سا دورہ ہوا تو ڈاکٹروں نے سر راس مسعود سے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اس درد کا اصل سبب ضعف قلب ہے۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ نقل و حرکت میں احتیاط رکھیں۔ حضرت علامہ کہتے ہیں، "ریاض منزل" میں میرا قیام بالائی کمروں میں تھا۔ میں جب اوپر جاتا تو سید صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ دونوں ہاتھوں سے مجھے سہارا دیتے ہیں تاکہ زینے پر چڑھتے ہوئے مجھے تکلیف نہ ہو۔ ایک آدھ روز تو خیر میں نے اپنے شفیق دوست کی پاسداری کے خیال سے کچھ نہ کہا لیکن جب تیسری مرتبہ پھر یہی صورت پیش آئی میں نے کہا، آپ اور لیڈی صاحبہ ناحق تکلیف کرتے ہیں۔ انھوں نے کوئی بات نہیں کہہ کر ٹال دیا۔ حضرت علامہ کہتے ہیں اسی دن یا شاید اگلے دن میں چھت پر ٹہل رہا تھا کہ سر راس مسعود دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور گھبرا کر کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کیا غضب کرتے ہیں آرام سے لیٹے رہیے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ انھوں نے بتلایا کہ ڈاکٹروں کے نزدیک میری بیماری کس قدر خطرناک ہے؟ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سر راس مسعود کے خلوص و محبت کا ان کے دل پر کیا اثر ہوگا۔"

عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں لکھتے ہیں کہ بھوپال سے واپسی پر علامہ بتایا کرتے تھے کہ آواز میں خفیف سی ترقی ہے۔ اگر پانچ چھ مزید کورس علاج کے پورے ہوگئے تو آواز کھل جائے گی۔ لیکن نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ . . .

---

[1] ذکر اقبال ص ۱۹۶ [2] مکتوبات اقبال ص ۲۸۰ [3] مکتوبات اقبال ص ۲۸۳ [4] اقبال انجمن ترقی اردو ص ۳۰۰

"دورِ حاضرہ کی تر فروشی" اور "پُرفنی" کے خلاف اس انتباہ کی مخاطب مخدراتِ اسلام تھیں۔ لیکن اس آوازۂ حق سے تمام ملت اسلامیہ کو ایک گہری نیند سے جگا دیا گیا۔ اور اسے آگاہ کیا گیا کہ دختران ملت کی تعلیم و تربیت سے ہماری غفلت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ غیر اسلامی اثرات اب ان کو بھی گرفت میں لیا چاہتے ہیں۔ وقت ہے کہ ان کو محفوظ رکھنے کی سعی کی جائے۔

اس سے چند سال بعد جو چارۂ کار خود حکیم الامت کی بصیرت نے تجویز کیا وہ یہ تھا کہ نسائے اسلام کے لیے قرآنی معارف و تہذیب اور دورِ حاضر کے ضروری اور قابل استفادہ علوم و فنون کی ایک مستقل یونیورسٹی قائم کی جائے اور اس مقصد کے انجام و تکمیل کے لیے فرمانروایان کی روایتی معارف پروری کے پیش نظر حضور والا کی ذات عالی صفات کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ بحیثیت صدر انجمن حمایت اسلام ۱۹۳۶ء میں بوساطت سر راس مسعود مرحوم انجمن کی اس تجویز کو حضور پرنور کے گوش گزار کیا گیا۔ ابھی اس تجویز کا عملی نفاذ زیر نظر تھا کہ ایک گلوگیر مرض جس کے علاج کا مزمن چارہ کرنے کے لیے خود حضور ستودہ صفات رہے اور ایک سے زیادہ بار اسی غرض کے لیے علامہ کو دارالاقبال بھوپال میں یاد فرمایا۔ بالآخر اپریل ۱۹۳۸ء ان کے جسد عنصری پر غالب آگیا اور وہ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔"

"جس تجویز کو اقبال کے دماغ نے اختراع کیا اور جسے اس نے صاحب نظر بھوپال کے گوش ہمایوں تک بحیثیت صدر انجمن حمایت اسلام پہنچایا انجمن کا فرض تھا اگر کلاً نہیں تو جزاً اسے قوت سے فعل میں لانے کے لیے اپنی بساط کے مطابق کوئی عملی تدبیر اختیار کرے۔" (ندیم جشن سالگرہ نمبر ۱۹۴۲ء)

علامہ اقبال دوسری مرتبہ بغرض علاج ۱۶ جولائی ۱۹۳۵ء کو بھوپال تشریف لائے۔ چنانچہ وہ سر راس مسعود کو ۲۰ جون ۱۹۳۵ء کو لاہور سے لکھتے ہیں:

"آپ کا خط مل گیا اور اعلیٰ حضرت کا والا نامہ بھی موصول ہو گیا ہے۔ جسے میں نے سادہ اور خوب صورت فریم میں لگوا دیا ہے۔ میں انشاء اللہ ۱۵ جولائی تک بھوپال پہنچوں گا۔ جاوید کو ہمراہ لانا ہوگا۔ علی بخش بھی ہمراہ ہوگا۔ شعیب صاحب کو بھی اپنے آنے کی اطلاع دے دوں گا۔ مگر یہ تو بتلائیے کہ میرا ایڈریس بھوپال میں کیا ہوگا۔ تاکہ میں گھر میں وہ ایڈریس چھوڑ جاؤں۔ اس طرح بچی منیرہ کی خیریت مجھے روز ملتی رہے گی جس جگہ مجھے ٹھہرنا ہوگا اس جگہ کا پتا [illegible] زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ آپ سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔" (اقبال نامہ حصہ اول۔ ص ۳۶۵)

۱۱ جولائی کو نذیر نیازی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں:

"میں[1] دو چار روز تک بھوپال جاؤں گا اور قریباً ڈیڑھ ماہ وہاں ٹھہروں گا۔ شاید اب تک چلا جاتا مگر بارش نہیں ہوئی۔ برسات شروع ہو جائے تو جاؤں۔"

---

[1] عبدالمجید سالک "ذکر اقبال" میں تحریر کرتے ہیں کہ ۱۵ جولائی کو علامہ نے پھر بھوپال کا سفر اختیار کیا تاکہ برقی علاج جاری رکھ

طوافِ مرقدِ حالی سزد ارباب معنی را　　　نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم

بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازیم　　　تو برخاکش گہر افشان و من برگِ گل افشانم

خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی مرتب "یادگارِ غالب" تحریر کرتے ہیں کہ اس موقع پر نواب صاحب نے حالی میموریل اسکول کے لئے دس ہزار روپے عنایت کئے تھے اور علامہ اقبال نے اس وقت یہ قطعہ کہہ کر خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد　　　سیمائے دگر اورا ز نمِ اشکِ سحر داد

حالی ز نوا ہائے جگر سوز نیاسود　　　تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

نواب صاحب اسی دن پانی پت سے روانہ ہوگئے۔ علامہ نے بھی صحت کی خرابی کی وجہ سے وہاں کا قیام مناسب نہ سمجھا اور مزید لوگوں نے روکنا چاہا، وہاں سے رخصت ہوئے۔

۹ ستمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور واپسی کے بعد علامہ کو جلد ہی بھوپال لوٹنا تھا تاکہ مکمل صحت یابی ہو جائے۔ لیکن سردی اور چونکہ پانی الاہل بازار دے کے علاج کی وجہ سے آواز بہتر ہوتی جا رہی تھی اس لئے چند روز کے لئے بھوپال کا جانا ملتوی ہوگیا۔ اب وہ جنوری ۱۹۳۶ء کے آخر تک بھوپال آ جانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ۱۰ جنوری ۳۶ء کو وہ نیازی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں کہ "میں جنوری کے آخر یا مارچ کے پہلے ہفتے میں بھوپال جانے کا قصد رکھتا ہوں"

پھر ۲۰ جنوری ۳۶ء کو تحریر کرتے ہیں "میرا حال بھی خدا کے فضل سے بہتر ہے۔ انشاء اللہ وسط فروری میں بھوپال جانے کا قصد ہے"

۹ فروری ۳۶ء کو بھوپال آ جانے کے پروگرام سے نذیر نیازی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں "میں بھی خدا کے فضل سے کسی قدر بہتر ہوں ... یا یکم مارچ کو بھوپال کا قصد رکھتا ہوں۔ باقی دفعہ دہلی نہ ٹھیریں کہ انشاء اللہ بھوپال سے واپسی پر تفصیل خانے میں ایک آدھ روز قیام ہے تاکہ سردار صلاح الدین اصرار کرتے ہیں ..... ارادہ ہے کہ تمام دن دہلی اسٹیشن پر ہی رہوں گا۔ وہاں سے پانچ بجے شام کی گاڑی میں بھوپال آ جاؤں گا۔"

۲۵ فروری کو صحیح روانگی کی تاریخ سے آگاہ کرتے ہیں "میں یہاں سے ۲۹ فروری کی شب کو فرنٹیئر میل سے چلوں گا۔ یا دوسری ٹرین جو اس کے قریب ہی لاہور سے چلتی ہے۔ بہرحال یکم مارچ کی صبح کو دہلی پہنچ کر دن بھر وہیں قیام کروں گا۔ ۴۔۵ بجے بعد دوپہر جو ٹرین بھوپال کی طرف جاتی ہے اس میں سوار ہوکر ۲ مارچ کو بھوپال پہنچوں گا"

علامہ اقبال حسبِ پروگرام دہلی پہنچے قیام کچھ دیر ریلوے اسٹیشن پر اور کچھ دیر تفصیل خانے میں رہا۔ تیسرے پہر بھوپال روانہ ہوگئے سفر بھی علاج کے لئے تھا۔ اگرچہ سرراس سے ملاقات کا پہلو بھی شامل تھا

طلوعِ اسلام

اسی زمانے میں یہ رسالہ طلوعِ اسلام دہلی سے جاری ہوا تھا۔ اس کا نام علامہ اقبال کی نظم "طلوعِ اسلام" کی نسبت سے رکھا گیا

"بھوپال سے واپسی کے بعد حضرت علامہ کی صحت ایک خاص نقطے پر آکر رک گئی ... بھوپال سے واپس آکر انھیں ایک حد تک کمزوری کا احساس ہو رہا تھا۔

یہ درست ہے کہ اس بار بھوپال سے آکر علامہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے۔ البتہ مرض میں کسی قدر افاقہ تھا اس لئے وہ وائنا جانے کے سلسلے میں سر راس مسعود کو ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے خط میں مشورہ دیتے ہیں: "میرے ایک دوست جو یہاں (لاہور) کے سادات میں سے ہیں اور مرض ذیابیطس کے پرانے مریض تھے۔ حال میں تندرست ہو کر وائنا (آسٹریا) سے واپس آئے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ دوران علاج میں انھوں نے اپنے ڈاکٹروں سے میرے مرض کا ذکر بھی کیا تھا۔ جس پر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر وہ بیمار یہاں آجائے تو میں گارنٹی کرتا ہوں کہ وہ بالکل تندرست ہو جائے گا۔ شاہ صاحب فروری میں پھر وائنا جانے والے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ چلوں اور وہاں چل کر علاج کراؤں۔ آپ اس بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں۔ فی الحال یہی صحت ترقی کر رہی ہے۔ آواز میں بھی قدرے امپرومنٹ ہے۔ ڈاکٹر عبد الباسط نے فوٹو میرے سینے کا لیا تھا۔ لیے ڈاکٹر عبد الرحمٰن وائنا بھیجنے والے تھے، معلوم نہیں ابھی تک بھیجا گیا کہ نہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب (عبد الباسط) کو خط لکھ کر دریافت کیا ہے وہاں سے ایکسپرٹ اوپینین آجانے پر آخری فیصلہ کروں گا۔ فی الحال آپ کی رائے چاہتا ہوں۔"

جشن صد سالہ ولادت حالی

۲۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں پانی پت میں جشن صد سالہ ولادت حالی منایا گیا۔ اس کی صدارت والیٔ بھوپال نے کی۔ علامہ اقبال نواب صاحب کے شیدائیوں میں سے تھے۔ اس لئے وہ بھی اس جشن میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ اس کی اطلاع وہ نذیر نیازی کو بھوپال سے (۲۱ اگست) اس طرح دیتے ہیں: "مولانا حالی کی سینٹنری اکتوبر ۱۹۳۵ء کے آخر میں ہوگی .... سینٹنری پانی پت میں ہوگی۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال صدر ہوں گے۔ میں بھی پانی پت میں اس موقع پر جاؤں گا۔"

علامہ اقبال اپنے پروگرام کے مطابق پانی پت نواب صاحب سے ایک روز قبل پہنچے۔ نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ "اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جب خواجہ حالی مرحوم و مغفور کی صد سالہ برسی منائی گئی تو میں پانی پت اس وقت پہنچا جب منتظمین جلسہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب، بھوپال کے خیر مقدم کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حضرت علامہ بھی نواب صاحب کی تشریف آوری سے ایک روز پہلے تشریف لے آئے تھے... اگلے روز والیٔ بھوپال تشریف لائے اور جلسہ منعقد ہوا تو اس میں حضرت علامہ نے بھی شرکت فرمائی۔"

حضرت علامہ اقبال جلسے میں شریک ضرور ہوئے لیکن چونکہ گلے میں تکلیف تھی اس لئے وہ نظم جو انھوں نے اس موقع کے لئے تحریر کی تھی نہ سنا سکے۔ بلکہ اسے کسی دوسرے نے پڑھ کر سنائی۔ نظم درج ذیل ہے:

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می بینم — چو محمل را گران بینم حدی را تیز تر کردم

حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو — ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم

---

۱ اقبال۔ انجمن ترقی اردو ص ۲۰۹ ۲ اقبال نامہ ص ۲۰۱ ۳ مکتوبات اقبال ص ۲۸۸

۱ طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را　　نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم

بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازیم　　تو بر خاکش گہر افشان و من برگ گل افشانم

خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی مرتب "یادگار غالب" تحریر کرتے ہیں کہ اس موقع پر نواب صاحب نے حالی میموریل اسکول کے لئے بیس ہزار روپے عنایت کئے تھے اور علامہ اقبال نے اس وقت یہ قطعہ کہہ کر خراج تحسین ادا کیا تھا۔

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد　　سیہ دگر ادائی از اشک سحر داد

حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود　　تا لالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد

نواب صاحب اسی دن پانی پت سے روانہ ہو گئے۔ علامہ نے بھی صحت کی خرابی کی وجہ سے وہاں کا قیام مناسب نہ سمجھا اور ہر چند کہ لوگوں نے روکنا چاہا، وہاں سے رخصت ہوئے۔

۹ ستمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور واپسی کے بعد علامہ کو جلد ہی بھوپال لوٹنا تھا تاکہ مکمل صحت یابی ہو جائے۔ لیکن سردی اور حکیم نابینا کے صاحبزادے کے علاج کی وجہ سے آواز بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے چند روز کے لئے بھوپال کا جانا ملتوی ہو گیا اب وہ جنوری ۱۹۳۶ء کے آخر میں بھوپال آجانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ۱۰ جنوری ۱۹۳۶ء کو وہ نیازی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں کہ "میں جنوری کے آخر یا مارچ کے پہلے ہفتے میں بھوپال جانے کا قصد رکھتا ہوں"[1]

۲۷ جنوری ۱۹۳۶ء کو تحریر کرتے ہیں۔ "میرا حال بھی خدا کے فضل سے بہتر ہے۔ انشاء اللہ وسط فروری میں بھوپال جانے کا قصد ہے"[2]

۱۹ فروری ۱۹۳۶ء کو بھوپال آ جانے کے پروگرام سے نذیر نیازی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں "میں بھی خدا کے فضل سے کسی قدر بہتر ہوں ... ری یا یکم مارچ کو بھوپال کا قصد رکھتا ہوں۔ جاتی دفعہ دہلی نہ ٹھیروں گا۔ انشاء اللہ بھوپال سے واپسی پر قنصل خانے میں ایک آدھ روز قیام ہے تاکہ سردار صلاح الدین اصرار کرتے ہیں۔ ... ارادہ ہے کہ تمام دن دہلی اسٹیشن پر ہی رہوں گا۔ وہاں سے پانچ بجے شام کی گاڑی میں بھوپال روانہ ہو جاؤں گا۔"

۲۵ فروری کو صحیح روانگی کی تاریخ سے آگاہ کرتے ہیں: "میں یہاں سے ۲۹ فروری کی شب کو فرنٹیر میل سے چلوں گا۔ یا دوسری ٹرین میں جو اس کے قریب ہی لاہور سے چلتی ہے۔ بہرحال یکم مارچ کی صبح کو دہلی پہنچ کر دن بھر وہیں قیام کروں گا۔ ۵.۴ بجے بعد دوپہر جو ٹرین بھوپال کی طرف جاتی ہے اس میں سوار ہو کر ۲ مارچ کو بھوپال پہنچوں گا"[3]

علامہ اقبال حسب پروگرام دہلی پہنچے قیام کچھ دیر ریلوے اسٹیشن پر اور کچھ دیر قنصل خانے میں رہا تیسرے پہر بھوپال روانہ ہو گئے یہ سفر بھی علاج کے لئے تھا۔ اگرچہ سر راس سے ملاقات کا پہلو بھی شامل تھا

طلوع اسلام

اسی زمانے میں یہ رسالہ طلوع اسلام دہلی سے جاری ہوا تھا۔ اس کا نام علامہ اقبال کی نظم "طلوع اسلام" کی نسبت سے رکھا گیا

---

[1] مکتوبات اقبال ص ۳۱۲ [2] مکتوبات اقبال ص ۳۱۶ [3] مکتوبات اقبال ص ۳۱۶ [4] مکتوبات اقبال ص ۳۲۵

"بھوپال سے واپسی کے بعد حضرت علامہ کی صحت ایک خاص نقطے پر آکر رک گئی ... بھوپال سے واپس آکر انھیں ایک حد تک کمزوری کا احساس ہو رہا تھا۔

یہ درست ہے کہ اس بار بھوپال سے آکر علامہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے۔ البتہ مرض میں کسی قدر افاقہ تھا اس لئے وہ وائنا جانے کے سلسلے میں سر راس مسعود کو ۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے خط میں مشورہ دیتے ہیں: "میرے ایک دوست جو یہاں (لاہور) کے سادات میں سے ہیں اور مرض ذیابیطس کے پرانے مریض تھے۔ حال میں تندرست ہو کر وائنا (آسٹریا) سے واپس آئے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ دوران علاج میں انھوں نے اپنے ڈاکٹروں سے میرے مرض کا ذکر بھی کیا تھا، جس پر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر وہ بیمار یہاں آجائے تو میں گارنٹی کرتا ہوں کہ وہ بالکل تندرست ہو جائے گا۔ شاہ صاحب فروری میں پھر وائنا جانے والے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ چلوں اور وہاں چل کر علاج کراؤں۔ آپ اس بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں۔ فی الحال یہ صحت ترقی کر رہی ہے۔ آواز میں بھی تدریجاً امپروومنٹ ہے۔ ڈاکٹر عبدالباسط نے فوٹو میرے سینے کا لیا تھا اسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن وائنا بھیجنے والے تھے، معلوم نہیں ابھی تک بھیجا ہے کہ نہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب (عبدالباسط) کو خط لکھ کر دریافت کیا ہے۔ وہاں سے اگر رپورٹ اور میڈیسن آجائے پر آخری فیصلہ کروں گا۔ فی الحال آپ کی رائے چاہتا ہوں۔"

جشن صد سالہ ولادت حالی

۲۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں پانی پت میں جشن صد سالہ ولادت حالی منایا گیا۔ اس کی صدارت والئ بھوپال نے کی۔ علامہ اقبال نواب صاحب کے شیدائیوں میں سے تھے۔ اس لئے وہ بھی اس جشن میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ اس کی اطلاع وہ نذیر نیازی کو بھوپال سے (۱۴ اگست) اس طرح دیتے ہیں: "مولانا حالی کی سینٹنری اکتوبر ۱۹۳۵ء کے آخر میں ہو گی ... سینٹنری پانی پت میں ہو گی۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال صدر ہوں گے۔ میں بھی پانی پت میں اس موقع پر جاؤں گا۔"

علامہ اقبال اپنے پروگرام کے مطابق پانی پت نواب صاحب سے ایک روز قبل پہنچے۔ نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ "اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جب خواجہ حالی مرحوم و مغفور کی صد سالہ برسی منائی گئی تو میں پانی پت اس وقت پہنچا جب منتظمین جلسہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کے خیر مقدم کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حضرت علامہ بھی نواب صاحب کی تشریف آوری سے ایک روز پہلے تشریف لے آئے تھے ... اگلے روز والئ بھوپال تشریف لائے اور جلسہ منعقد ہوا تو اس میں حضرت علامہ نے بھی شرکت فرمائی۔"

حضرت علامہ اقبال جلسے میں شریک ضرور ہوئے لیکن چونکہ گلے میں تکلیف تھی اس لئے وہ نظم جو انھوں نے اس موقع کے لئے تحریر کی تھی، نہ سنا سکے۔ بلکہ اسے کسی دوسرے نے پڑھ کر سنائی۔ نظم درج ذیل ہے ؎

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می بینم   چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر کردم

حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو   ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم

۱۔ اقبال نامہ (اردو) ص ۳۰۵   ۲۔ اقبال نامہ ص ۳۷۱   ۳۔ مکتوبات اقبال ص ۴۰۳

تو یہ شعر زبان پر تھا ۵

با پرستان شب دارم ستیز　　　　بازروغن درچراغ من بریز

پھر جب چند اشعار حضور صلعم کے عرض احوال میں ہوے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان اور بیرون ہند کے سیاسی اور اجتماعی حوادث نے حضرت علامہ کو اس قدر متاثر کیا کہ ان اشعار نے ایک مثنوی کی شکل اختیار کرلی"۔

۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال لاہور واپس لوٹے۔ یہی ان کا بھوپال کا آخری سفر تھا۔

"ضرب کلیم" کی اشاعت جولائی ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ اقبال کے اس مجموعے میں مندرجہ ذیل وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو انھوں نے بھوپال میں ریاض منزل اور شیش محل کے دوران قیام میں کہیں۔

(۱) صبح	شیش محل	(۸) حکومت	ریاض منزل
(۲) سلطانی	ریاض منزل	(۹) نگاہ	"
(۳) تصوف	"	(۱۰) امید	"
(۴) وحی	"	(۱۱) ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام	شیش محل
(۵) مومن	شیش محل		
(۶) امرائے عرب	"	(۱۲) جمعیت اقوام مشرق	" "
(۷) مقصود	ریاض منزل	(۱۳) مسولینی (۲۲ اگست ۱۹۳۵ء)	" "

علامہ اقبال نے اس مجموعے کا انتساب نواب حمید اللہ خاں کے نام مندرجہ ذیل اشعار کے ساتھ کیا:

اعلیٰ حضرت نواب سر محمد حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال کی خدمت میں،

زمانہ با اُمم ایشیا چہ کرد و کند　　　کسے نہ بود کہ ایں داستاں فرو خواند
تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است　　　دل تو بیند و اندیشۂ تو می داند
بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من　　　"کہ گُل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند"

یہ شعری مجموعہ جب شائع ہوا تو اس کی چھ کاپیاں بھوپال بھیجی گئیں جس کی تفصیل سے علامہ نے سر راس مسعود کو اس طرح آگاہ کیا:

آج میرے[۵۵] منشی طاہر دین آپ کی خدمت میں "ضرب کلیم" کی چھ کاپیاں ارسال کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کاپی آپ کی ہے اور باقی خاندان شاہی کے لئے۔ ایک اعلیٰ حضرت کے لئے۔ ایک شہزادی ولیعہد کے لئے اور دو اعلیٰ حضرت کے بھتیجوں کے لئے۔ اعلیٰ حضرت کے لئے جو کاپی ہے اس پر میرا نام کتاب کے صفحے پر ڈیڈیکیشن کے اشعار کے نیچے لکھا ہے۔ کوئی اور کاپی مطلوب ہو تو اطلاع دیجئے۔

---

۵۵ اقبال نامہ ص ۸۷۳

س کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دو شمارے ۱۹۳۶ء میں دہلی ہی سے نکلے۔ علامہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سے اس رسالے کو نواب صاحب بھوپال سے مدد مل جائے چنانچہ وہ نذیر نیازی صاحب کو ۲۰ مارچ ۱۹۳۶ء کو ایک خط اسی سلسلے میں لکھتے ہیں

"ڈیر نیازی صاحب السلام علیکم۔

امید ہے کہ یہ خط آپ کو دہلی میں مل جائے گا۔ آپ ایک عرضداشت اعلیٰ حضرت کے نام رسالہ "طلوع اسلام" کی مدد کے لئے لکھیے اور تینوں رسالے بھی ان کے نام ارسال کر دیجیے۔ عرضداشت میں رسالے کے اغراض و مقاصد اور اس کا نصب العین عمدہ الفاظ میں بیان کیجیے۔ نیز یہ بھی لکھیے کہ اس وقت سارے ہندوستان میں علمی اخباروں اور رسالوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی سوائے اعلیٰ حضرت کی ذات والا صفات کے اور کون ہے۔ یہ عرضداشت میرے نام ارسال کیجیے تاکہ میں اس پر اپنی سفارش لکھ کر سید راس مسعود کے پاس بھیج دوں۔"

جب یہ خط نذیر نیازی صاحب کو ملا تو ان کا بیان ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا اعلیٰ حضرت سے کس بنا پر طلوع اسلام کی امداد کے لئے درخواست کروں۔ عرضداشت کا مضمون بھی ذہن میں نہیں آتا تھا۔ جناب ... سے ذکر کیا انھوں نے کہا یہ ... داری کے معاملات ہیں تم ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ویسے حضرت علامہ کے ارشاد کی تعمیل ضروری ہے۔

بہرحال جوں توں کر کے ایک عرضداشت مرتب کی لیکن پھر بار چونکہ علامہ اقبال کے ایما پر لاہور منتقل ہو رہا تھا لہٰذا اس کی ترسیل میں تاخیر ہو گئی۔ حضرت علامہ نے بھی خاموشی پائی تو میرے مرحوم دوست سید سلامت اللہ کو خط لکھا"

مکتوب اقبال بنام سید سلامت اللہ حسب ذیل ہے:

"مکرم! نذیر نیازی صاحب پہنچ گئے ہیں یا نہ پہنچے ہیں۔ میں نے جو خط ان کو لکھا تھا اس کا کوئی جواب انھوں نے نہیں دیا۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ طلوع اسلام کی امداد کے لئے ایک عرضداشت اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کے نام لکھ کر میرے نام ارسال کر دیں۔ عرضداشت کا مضمون بھی میں نے اس خط میں لکھ کر دیا تھا۔ وہ اب تک خاموش ہیں۔ اگر انھوں نے تساہل کیا تو معاملہ دوسرے سال پر پڑ جائے گا۔ اس وقت بجٹ تیار ہو رہا ہے۔ اگر وہ فوراً عرضداشت بھیج دیں تو کام اسی سال ہو جائے گا۔ جہاں کہیں بھی ہوں ان کو تاکید کر دیں کہ عرضداشت میں اعلیٰ حضرت کو ایڈریس کیا جائے اور میرے پاس بھیجا جائے تاکہ میں اپنی سفارش لکھ سکوں۔"

نذیر نیازی صاحب نے حسب ارشاد علامہ عرضداشت بھیج دی جس کی رسید ۳۰ مارچ کو علامہ نے دی۔

"آپ کی عرضداشت پہنچ گئی ہے۔ میں انشاءاللہ ۵ اپریل کی شام کو ساڑھے سات بجے لاہور پہنچوں گا۔" (م۔ ۱، ص ۹)

جناب نذیر نیازی علامہ اقبال کے بھوپال کے اس آخری سفر میں ایک خواب کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:-

حضرت علامہ فرماتے ہیں: "میں بھوپال ہی میں مقیم تھا جب ایک روز خواب میں دیکھا، جیسے سر سید احمد خان مرحوم کہہ رہے ہیں کہ تم اپنی بیماری کا ذکر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کیوں نہیں کرتے۔ آنکھ کھلی

۔۔۔ اقبال کی آخری ملاقات ص ۔۔۔

فرما کر اپنا فرض ادا کیا۔ لیکن اقبال کی سعادتمندی کا حال یہ تھا کہ انھوں نے اپنی کتاب "ارمغان حجاز" بھی نواب صاحب ہی کی نذر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جس کی اطلاع انھوں نے سر راس کو دی تھی۔ سر راس مسعود اقبال سے پہلے فوت ہو گئے اور "ارمغان حجاز" اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ اس طرح اقبال کی اس خواہش و وعدہ کا جو یک گونہ وصیت کا حکم رکھتا ہے کسی کو علم نہ ہوا۔ اس مجموعۂ مکاتیب کی اشاعت کے بعد امید قوی ہے کہ اقبال کی اس خواہش کی تعمیل کی جائے گی۔ (دیباچہ)"

اقبال سے راس مسعود کا بڑا گہرا قلبی لگاؤ تھا۔ اور یہی حال اقبال کا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے بھوپال میں علامہ کی آمد اور ریاض منزل میں قیام کی وجہ بھی یہی تعلق تھا۔ بھوپال میں ان کا قیام زیادہ تر ریاض منزل یا شیش محل میں رہا جہاں اکثر بات چیت کی محفلیں جمتی تھیں۔ بیگم سر راس بھی آپس کی گفتگو میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ سر راس کو علامہ کے اشعار بہت پسند تھے۔ اس لئے ان کے کلام کا بڑا حصہ انھیں ازبر تھا۔ یہی حال بیگم سر راس کا بھی تھا۔ چنانچہ "ایک بار[۱] ڈاکٹر صاحب اور سر راس مسعود ایک محفل میں جمع تھے۔ راس مسعود کی طبیعت کو جو چہل سوجھی تو وہ ڈاکٹر صاحب سے بولے کہ آج ہم دونوں کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ رہے گا۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ آج ہم اشعار شاعر مشرق ہی کے سنائیں گے۔ کسی دوسرے شاعر کے اشعار قبول نہیں کئے جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے عزیز دوست کی فرمائش اور شرط کو مان لیا۔ رات کے آٹھ بجے کے قریب بیت بازی کا مقابلہ شروع ہوا اور دس بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شروع شروع میں تو ڈاکٹر صاحب نے بڑی تیزی سے اپنے اشعار سنائے مثلاً سر راس مسعود کا کہا ہوا شعر "ل" پر ٹوٹتا اور ڈاکٹر صاحب نے فوراً اپنا ایسا شعر سنایا جس کی ابتدا "ل" سے ہوتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب کے شعر سنانے کی رفتار دھیمی پڑتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آخر میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے شعر یاد کرنے میں بڑی تلاش اور غور و فکر سے کام لینا پڑا۔ مگر سر راس مسعود کے حافظے اور یادداشت کا یہ عالم تھا کہ وہ پوری روانی کے ساتھ علامہ اقبال کے اشعار سنائے جاتے تھے اور کسی طرح ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ آخر کار ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ اپنے دوست سر راس مسعود کے حق ہی میں دیا اور اس بات کا اعتراف کیا کہ انھیں اپنے اشعار اتنے یاد نہیں جتنے راس مسعود کو یاد ہیں۔ اور وہ (اقبال) ان (راس مسعود) کی حاضر جوابی اور برجستہ گوئی اور اقبال شناسی کے آگے سپر انداختہ ہیں۔ ع

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

عبدالرزاق کانپوری بیان کرتے ہیں کہ اقبال کے متعلق سر راس مسعود کا خیال تھا کہ "وہ حقیقی معنی میں شاعر ہے اور محض شاعر ہی نہیں ایک مفکر اور فلسفی بھی (یاد ایام ص ۲۸۴) اور اسی طرح علامہ اقبال سر راس کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "ان کا دماغ انگریز کا اور دل سچے مسلمان کا ہے۔"[۲] (روزگار فقیر ص ۱۵۴) علامہ نے مختلف موقعوں پر اس جملے کو دہرایا جس کے جواب میں سر راس نے ایک بار کہا "اقبال غنیمت ہے کہ میرا دماغ مسلمان کا اور دل انگریز کا نہیں ہے۔"

بھوپال میں ایکبار کسی محفل میں اقبال پر یہ اعتراض کیا گیا کہ وہ فارسی شعرا کے خیالات اپنی زبان میں پیش کرتے ہیں تو سر راس مسعود سننے کے لئے تیار نہیں ہوئے لیکن جب کسی نے اقبال کا یہ مصرع پیش کیا کہ ع

۱؎ روزگار فقیر ص ۱۵۷ ۲؎ روزگار فقیر ص ۱۵۴

میں خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ شاید سردیوں میں بھوپال آ سکوں"

پھر ۳۰ اگست کے خط میں مزید کا پیاں بھیجنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور سر راس مسعود کو اس سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ نواب صاحب نے ۔ تلطف آمیز خط لکھا ہے اور ضرب کلیم کی نظموں کے مقاصد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اُمید ہے کہ کل تک اور عمدہ جلدیں بن کر آئیں گی تو انھیں ارسال کروں گا مطمئن رہئے۔ مجھے یاد ہے بھولا نہیں ہوں۔ اعلیٰ حضرت کا خط بھی نہایت تلطف آمیز تھا جو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا۔ باقی رہی کتاب سو یہ ایک Topical چیز ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ بعض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ایک اعلان جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام۔"

علامہ اقبال نے اس مجموعۂ نظم کو نواب صاحب بھوپال کے نام انتساب کیوں کیا۔ اُسے لوگ جس انداز میں چاہیں سوچیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس انتساب کے ذریعے نواب صاحب سے دیرینہ دوستانہ تعلقات اور ان کے اس احسان کا جو انھوں نے ان کی بیماری کے وقت وظیفے کی صورت میں کیا تھا۔ اظہار تشکر کیا ہے۔ چنانچہ یوسف سلیم چشتی تحریر کرتے ہیں: "میں نے اس انتساب کی علت پر بارہا غور کیا لیکن اس کے علاوہ اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ مرحوم فطرتاً بہت احسان شناس واقع ہوئے تھے چنانچہ مجھے ان کی خدمت میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک حاضری کا موقع ملا اور میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ کوئی سلوک کرتا تھا تو وہ ہمیشہ اس کا تذکرہ شکر گزاری اور ممنونیت کے رنگ میں کیا کرتے تھے۔ چونکہ نواب صاحب بھوپال نے ان کی آخری علالت میں ان کے ساتھ بہت حسن سلوک کیا تھا اور علمی وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا اس لئے انھوں نے اس کا بدل اس رنگ میں کیا کہ "ضرب کلیم" کے ساتھ ان کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دیا۔ اور میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ انھوں نے نواب صاحب موصوف کے احسانات کا نعم البدل کر دیا۔

علامہ اقبال "ارمغان حجاز" بھی نواب صاحب کے نام انتساب کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے سر راس مسعود کو تحریر کیا تھا: "انشاء اللہ امید کہ سال آئندہ حج کروں گا۔ اور دربار رسالت میں بھی حاضری دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ ساتھ لاؤں گا کہ مسلمانان ہند یاد کریں گے یہ تحفہ بھی اعلیٰ حضرت کی نذر کیا جائے گا۔ خدا تعالیٰ انھیں عمر دراز عطا فرمائے۔ ۔۔۔ فروری یا مارچ میں دہلی جانے کا قصد ہے۔ ممکن ہوا تو چند روز کے لئے بھوپال آؤں گا"

لیکن ان کی وفات نے اس خواہش کو پورا ہونے نہیں دیا۔ شیخ عطاء اللہ مرتب اقبال نامہ اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں: "اقبال نے اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں فرماں روائے بھوپال کی ملت پرورانہ توجہات عالی کا جو احسانمندانہ اعتراف کیا ہے وہ ہی نہیں تمام ملت پر فرض ہے۔ اقبال نے ——— ز الطاف تو خیزد موج لالہ از خیابانم - کہہ کر اس حقیقت کا اظہار ضرب کلیم کے انتساب میں۔

۱۶۷ ۔ آثار [illegible] از ہ تر ماند

سر راس مسعود کے لئے ممکن نہ تھا کہ انکار کر سکیں۔ انھوں نے علامہ اقبال کو اس سلسلے میں لکھا تاکہ ان سے رائے معلوم کی جا سکے۔ علامہ اقبال کا احترام دونوں کرتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ "حکومت افغانستان اپنے تہذیبی و تعلیمی نظام کی تکمیل و ترتیب کے لئے ہندوستان کے علما کا جو وفد بلا رہی ہے اس کے ہمراہ ایک بے پردہ خاتون کے جانے کا افغانستان کے حکمرانوں پر جو اثر مرتب ہوگا وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ یعنی بیگم صاحبہ کو رفیق سفر بنانے کی وجہ سے ہندوستان کے مسلم ماہرین تعلیم کے خیالات و نظریات پر ان کا وہ اعتماد ہی باقی نہ رہے گا جس اعتماد کی بنا پر اس وفد کو بلایا گیا ہے۔" علامہ کے اس مشورے کو دونوں نے پسند کیا۔

افغانستان سے واپسی پر ڈاکٹر اقبال سے دریافت کیا گیا کہ "جب قرآن کریم تمام انسانوں کو علم و آگہی حاصل کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو پھر لڑکوں اور لڑکیوں کی جدید تعلیمی سہولتوں پر کیوں قدغن لگائی جاتی ہے؟" جس کے جواب میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔ "بے شک قرآن کریم میں حصول علم پر زور دیا گیا ہے لیکن اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک مکتب میں مل جل کر تعلیم حاصل کریں۔" اور علامہ نے اس کا عملی ثبوت یہ دیا کہ اپنی بچی منیرہ کے لئے علی گڑھ سے ایک معلمہ کا انتظام کیا تاکہ گھر پر ہی بچی کو اچھی تعلیم دی جا سکے۔

شعر کہتے وقت علامہ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اور وہی کیفیات بغیر کسی دقت کے شعر کے قالب میں ڈھل جاتے تھے۔ دوران قیام بھوپال میں بیگم راس مسعود کو علامہ اقبال کی اس کیفیت کا تجربہ ہوا۔ چنانچہ وہ بتاتی ہیں۔ "ڈاکٹر صاحب کی شعر گوئی کی کیفیت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے وجدان پر الہام کی بارش ہو رہی ہے۔ جب ایسا وقت آتا تو ڈاکٹر صاحب خلوت و تنہائی کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس فرماتے۔ وہ ایسے میں کسی کو اپنے پاس بٹھانا پسند نہ کرتے۔ یہاں تک کہ اپنے عزیز ترین دوست سے بھی بلا تکلف کہہ دیتے کہ بھائی اس وقت تو میں تنہائی چاہتا ہوں۔ ہاں کل کسی وقت آنا۔ پھر فرصت سے بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔ دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر صاحب کے تکیئے کے نیچے سے جو کاغذ برآمد ہوتا وہ تازہ ترین شعروں سے مزین ہوتا۔"

علامہ اقبال اپنی قوم کے لئے بے حد فکر مند رہا کرتے تھے۔ اکثر اس فکر سے اس قدر بے چین ہو جاتے تھے کہ دیر تک کوٹھی کے شہ نشین پر تنہا جا گئے رہتے اور زار و قطار روتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ "قوم کا تاریک مستقبل خود اپنی غلطیوں سے ایک مستقل حقیقت بنتا جاتا ہے۔ اور افراد کی بے حسی دیکھ کر میری مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔"

علامہ اقبال کو سر راس مسعود اور بیگم مسعود سے جو گہرا لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے بھوپال میں بڑے اصرار سے ایک خوش الحان قاری کو مقرر کرنے کو کہا تھا تاکہ ہر روز صبح کو وہ بیگم مسعود کو کلام پاک سنائیں۔ علامہ کا خیال تھا کہ دوران حمل میں ماں اگر اچھے لہجے کے ساتھ قرآن سنا کرے تو اس کا اچھا اثر بچے پر پڑتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ بیگم مسعود کو دوسری بچی پیدا ہونے والی تھی۔

جناب رشید احمد صدیقی تحریر کرتے ہیں ـــ "مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کے لئے فوراً آمادہ کرے۔ مرحوم خود بھی خیال رکھتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں۔ ایک دن مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری

۵ روزنگار فقیر ص ۱۴۷۔ ۶ روزگار فقیر ۱۶۵ ۷ روزگار فقیر ص ۱۵۰ ۸ روزگار فقیر ص ۱۵۲ ۹ گنجہائے گرانمایہ ص ۱۵۸

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اور ساتھ ہی عرفی کا وہ شعر پڑھا جس کا یہ مصرع لفظی ترجمہ ہے تو سید صاحب خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد مائل (نقوی) نے متعدد فارسی اشعار متقدمین شعراء کے سنائے جن کا اقبال نے چربا اتارا تھا، تو آخیر میں یہ فیصلہ کیا کہ مضامین تصوف میں اقبال نے ضرور متقدمین کے خیالات سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن یہ سرقہ نہیں ہے صرف تتبع ہے

لیڈی مسعود بھی علامہ کی شاعری سے بڑی دلچسپی رکھتی تھیں۔ ان کا شعری ذوق بڑا صاف ستھرا تھا۔ سر راس اور بیگم مسعود دونوں اقبال کی عظمتوں سے آگاہ تھے۔ اور ان سے محبت رکھتے تھے۔ بیگم مسعود کا بیان ہے کہ اقبال اکثر کہا کرتے تھے: "انگریز[۱] نے اپنی سلطنت کی بنیاد مسلمانوں کی ہڈیوں پر رکھی ہے۔"

علامہ اقبال کی کتاب بال جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تو انھوں نے ایک جلد اپنے دستخط کے ساتھ سر راس مسعود کو دی۔ بیگم مسعود اس وقت موجود تھیں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ "ڈاکٹر[۲] صاحب آپ کا کلام ان سے بہتر میں سمجھتی ہوں اور کتاب آپ ان کو عنایت فرما رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس فقرے سے لطف اندوز ہوئے اور فرمایا: "میں[۳] اپنا شعر سناتا ہوں تم میں سے جو کوئی اس کی زیادہ صحیح اور بہتر تشریح کرے گا وہی اس کتاب کا مستحق قرار پائے گا۔" اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنا یہ شعر پڑھا۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

دونوں نے شعر کا مطلب اپنے اپنے طور پر بتایا بیگم راس مسعود کی تشریح زیادہ بہتر تھی چنانچہ علامہ اقبال نے بال جبریل کے سرورق سے سر راس مسعود کے نام کی جگہ بیگم راس مسعود لکھ دیا۔ اور کتاب انھیں دیدی۔

علامہ اقبال اور بیگم مسعود کے درمیان ایک دن اس موضوع پر بحث ہوئی کہ لڑکے اور لڑکیوں میں عقد سے پہلے دونوں کے درمیان محبت اور انس کی جھلک کسی حد تک ضرور ہونی چاہیے جس پر علامہ نے فرمایا: "شادی[۴] کا بنیادی مقصد صالح، توانا اور خوش شکل اولاد پیدا کرنا ہے اور رومان کا اس میں دخل نہیں ہونا چاہیے۔"

ایک دن بیگم مسعود نے شکایت کے لہجے میں کہا کہ مرد حضرات تو رقص و سرود کی محفلوں اور کلب کے ذریعہ اپنی تفریح کا سامان بہم پہنچاتے ہیں لیکن عورتوں کو گھروں میں قید رہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: "میں[۵] جو کچھ کہتا ہوں اس میں تمام خواتین ہی کا فائدہ ہے"

حکومت افغانستان کی دعوت پر علامہ اقبال، سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی افغانستان تشریف لے گئے تھے تاکہ ان سے تعلیمی و مذہبی امور میں مشورے لئے جا سکیں۔ اس موقع پر بیگم مسعود بھی ساتھ جانا چاہتی تھیں۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی ا

---

[۱] روزگار فقیر ص ۱۹۵ [۲] روزگار فقیر ص ۱۵۶ [۳] ۱۵۵ [۴] روزگار فقیر ص

پونچی تھی اس کا کھانا پکواکر ایصال ثواب کے لئے غریبوں میں تقسیم کیا۔ عبدالحکیم جرّ کی عقیدت و محبت کے اس مظاہرے کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کے قریبی دوست تک حیران رہ گئے۔ ۵

علامہ اقبال بھوپال میں بہت کم ادھر اُدھر نکلتے تھے۔ البتہ شام کے وقت ٹہلنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ اور جمعے کے دن جامع مسجد نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ بہت کم لوگوں سے ان کا ملنا جلنا تھا۔ ملنے والوں میں امرا سے زیادہ وہ غربا کو پسند کرتے تھے، ان سے ملنے میں علامہ پہل کرتے تھے۔ چنانچہ خواجہ غلام السیدین تحریر کرتے ہیں ——— "انتقال سے کوئی دو سال پہلے جب وہ بھوپال میں مقیم تھے سر راس مسعود کے مقامی دوست اور بیرونی عائد برابر ان کے ہاں آتے رہتے تھے اور جب آتے تو ڈاکٹر اقبال سے ملنے کی خواہش کرتے اقبال اکثر یہ کہتے "کیوں بھئی مسعود کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ان کو کسی طرح ٹال دو۔" برخلاف اس کے جب وہ جمعے کے روز جامع مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو اکثر وہاں سے معمولی حیثیت کے غریب مسلمانوں کو ساتھ لے آتے اور بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور باتیں کرتے۔ یہ وہی اقبال تھے جنھوں نے کہا ہے :- ۵

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام دیدہ ام صدق و صفا اندر عوام

پروفیسر محمد زبیر صدیقی صدر شعبہ عربی حمیدیہ کالج بھوپال کا بیان ہے کہ علامہ نے جب شیش محل میں آکر قیام کیا تو وہ آٹھویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ علامہ کو جو سرکاری موٹر ملی تھی اس کے ڈرائیور جسیم حیدر تھے وہ زبیر صاحب کے ملاقاتی تھے۔ چنانچہ وہ اسکول سے واپسی پر اس موٹر پر بیٹھ جاتے تھے۔ اتفاق سے ایک روز ڈاکٹر صاحب مکان سے باہر آئے۔ غالباً وہ شاہ کی طرف جا رہے تھے انھیں دیکھ کر جسیم حیدر سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ جسیم حیدر نے بتایا کہ میں قاضی صاحب کا پوتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ اور دریافت کیا کہ میں کیا پڑھتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ عربی پڑھتا ہوں تو انھوں نے عربی کی گردان پوچھی اور مختلف قسم کے سوالات کئے۔ زبیر صاحب کا بیان ہے کہ اس کے بعد اکثر اس طرح علامہ سے ملاقات ہوتی رہی۔

جناب حکیم قمرالحسن صاحب چیف ایڈیٹر روزنامہ ندیم بھوپال فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں علامہ اقبال کا قیام شیش محل میں تھا وہ حکیم اولاد حسین صاحب کے ساتھ علامہ سے ملنے گئے۔ حکیم اولاد حسین، قمرالحسن صاحب کے رشتے کے بھائی اور بہنوئی بھی تھے۔ وہ یونانی علاج میں کافی تجربہ رکھتے تھے۔ علامہ اقبال ان سے طبی مشورہ چاہتے تھے۔ چنانچہ کچھ دیر تک تو علاج کے سلسلے میں گفتگو ہوتی رہی اس کے بعد حکیم اولاد حسین صاحب نے قمرالحسن صاحب کا تعارف کرایا۔ اس وقت قمرالحسن صاحب کی عمر مشکل سے ۲۲ سال رہی ہوگی۔ علامہ نے ان سے مختلف سوالات کئے اور دریافت کیا کہ "کیا لکھتے ہو" اس زمانے میں حکیم قمرالحسن صاحب افسانے اور انشائے لطیف لکھا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نئی پود ٹیگور کی انشا نگاری سے متاثر تھی۔ چنانچہ جب انھیں معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کو افسانے اور انشائے لطیف کا شوق ہے تو فرمایا کہ انشائے لطیف بے مقصد چیز ہے۔ نوجوانوں کو چاہئے وہ کوئی صحت مند اور تعمیری ادب پیش کریں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ طلبہ کو چاہئے کہ پہلے علم حاصل کریں اس لئے کہ بغیر

آندھی میں چراغ ص ۱۳۶

ب آئے ہوئے ہیں۔ لیڈی مسعود کہاں ہیں۔ علی بخش نے کسی قدر آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا۔ قرآن کیا سنیں گی وہ تو صبح ہی صبح ہی پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں۔ وہاں سے فرصت ملے تو آئیں۔ میں کیا کروں۔ مرحوم خاموش ہو گئے۔ فرمایا صبر! علی بخش صبر۔ یہ کام تھا ہی ضروری ہے۔

خدا کے فضل و کرم سے سر راس مسعود کے ہاں بچی پیدا ہوئی۔ علامہ کو یہ خبر سن کر بہت خوشی اور اطمینان ہوا کہ زچہ اور بچہ دونوں بفضلِ بخیر ہیں۔ علامہ اقبال ہی کی پسند سے اس بچی کا نام نادرہ رکھا گیا۔ اس موقع پر انھوں نے مندرجہ ذیل تاریخی قطعہ قلمبند کیا۔[۱]

راس مسعود جلیل القدر کو — جو کہ اصل و نسل میں مجدود ہے

یادگارِ سید والا گہر — نورِ چشم سید محمود ہے

راحتِ جان و جگر دختر ملی — شکر خالق منت معبود ہے

خانداں میں ایک لڑکی کا وجود — باعثِ برکاتِ لامحدود ہے

کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی

با سعادت دخترِ مسعود ہے

علامہ اقبال کو سر راس مسعود کے پہلے بچے کے انتقال پر بڑا افسوس ہوا تھا۔ چنانچہ لیڈی مسعود کی تسلی و تسکین کے لئے جب خط لکھا تو آخر ں یہ شعر لکھا تھا۔

در چمن بود و لیکن نتواں گفت کہ بود — آہ ازاں غنچہ کہ بادِ سحرا اش نہ کشود

نادرہ کی پیدائش اندور میں اپنے نانا عبدالرشید خاں کے ہاں ہوئی تھی، اس زمانے میں علامہ بھوپال ہی میں تھے۔ پیدائش کے تھوڑے دنوں ہی کے بعد بیگم مسعود بغیر اطلاع دئے ہوئے بھوپال آگئیں۔ اس وقت سر راس اور علامہ اقبال یک جا تھے۔ سر راس، بیگم کی اس اچانک آمد پر بے حد خوش ہوئے اور انتہائی شوق میں آگے بڑھ کر نادرہ کو گود میں لینا چاہا۔ علامہ نے جو خود بھی بے انتہا مسرور تھے فوراً کہا کہ "پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے"[۲] چنانچہ بیگم مسعود نے بچی کو علامہ کی گود میں دے دیا۔

جس زمانے میں علامہ بھوپال میں تھے، بیگم مسعود کے والد اندور میں تھے، انھوں نے علامہ کی دلبستگی کے لیے اندور سے ایک مصاحب بھیجدیا تھا۔ ان کا نام عبدالحکیم تھا۔ وہ اپنی طبیعت کی شوخی اور مزاج کی ظرافت کی وجہ سے "چرکی" کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ وہ لوگوں کا مزاج پہچان کر گفتگو کرتے تھے۔ اور اسی مناسبت سے لطیفے کہا کرتے تھے۔ علامہ اقبال بھی چرکی سے لطف اندوز ہونے لگے تھے، جب علامہ بھوپال سے رخصت ہونے لگے تو اس کی تعریف کی۔ چرکی اس تعریف سے بے حد خوش ہوئے۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ انھیں اس عظیم انسان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ وہ علامہ کے شیدائی ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب علامہ کے انتقال کی خبر ملی تو بقول مصنف[۳] "وہ زار و قطار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جیسے اس کے کسی ہمدرد اور کرم فرما بزرگ کی وفات کا سانحہ پیش آگیا ہے۔ اس غریب کے پاس جو کچھ جمع

۱۔ ۲۔ نگار فقرہ صد ۱۹۴۳ء ۳۔ گنجہائے گرانمایہ ص ۱۹۰۔

تو اس دیدہ ور کی بدولت حقائق و معارف کے بہت سے سربستہ راز وا ہو جاتے، الوان فطرت کی تفہیم، تشریح، آیات فطرت کی نگارش و اشاعت ایک نئے اسلوب و انداز سے عمل میں آتی۔ جس کے سبب انسان آرٹ اور فطرت کے قدیم اور روحانی [illegible] کو سمجھ سکتا اور ان کے الہامی پیغام کو جان سکتا۔

میں نے جب دریافت کیا کہ علامہ سے ملاقات کا اس قدر اشتیاق کیوں تھا تو فرمایا: اس لئے کہ مجھے ایسے عارف کامل کی تلاش تھی جس کے پاس تسخیر کائنات کا عمل بھی ہو اور وہ واقف اسرار ازل بھی ہو۔ اس مقصد کے پیش نظر اور حصول زندگی کی خاطر ذوق وجدان کو ساتھ لئے جستجو کی منزل پر تھا۔ علامہ اقبال سے ملنے کے لئے اس لئے بھی میرا جذبہ شوق تھا کہ وہ فن کا نقاد اور قدردان تھا۔ قدردان وہی ہو سکتا ہے جو نقاد بھی ہو سچا۔ سچا نقاد وہی ہو سکتا ہے جو ماہر ہو فن کا۔ عدل، انصاف اس کی صداقت [illegible] کا مظہر ہو۔ چونکہ وہ ان تمام اوصاف سے متصف تھا اس لئے اس نے فن کی تخلیق و نمود کو معجزۂ فن سے تعبیر کیا ہے۔

معجزۂ فن سے ہے خون جگر کی نمود

جہاں وہ ایک اچھا نقاد [illegible] تھا۔ [illegible] ساز ندۂ فطرت بھی تھا۔ اس لئے بیں سے برابد تلب پر سے کچھ رنگ ستائے تھے اس یقین اور اعتماد پر سے

جس نے رموز دل کے راز مخفی سمجھ گیا   سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

علامہ سے ملاقات کی دلچسپی کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ فطرت اور آرٹسٹ کے فطری تعلق اور روحانی رشتے کو سمجھتا تھا۔ دونوں کے مزاج اور مذاق سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ فطرت اپنی جگہ حسین ہے۔ بے شک۔ لیکن اس کو حسین سے حسین تر بنانے والا آرٹسٹ ہے اسی لئے اس نے کہا بھی ہے

آں ہنرمندے کہ بر فطرت فزود   راز خود را بر نگاہ ما کشود

اقبال رمزہائے فطرت کا امین و معتمد بھی تھا اور ترجمان فطرت بھی۔ جس نے بپاس اعتماد و دیانت بہت سی چیزیں مصلحتاً رمز و کنایہ میں ادا کی ہیں اور اپنی اس مصلحت کو ظاہر بھی کیا ہے یہ کہہ کر ع

حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایماں نیست

اور جب میں نے دریافت کیا کہ آپ نے علامہ کی تصویر کس جذبے کی وجہ سے بنائی تو انھوں نے جواب دیا کہ علامہ اقبال کے قیام بھوپال کے دوران جتنا اشتیاق ملاقات تیز ہوتا گیا، جذبۂ عقیدت بھی بڑھتا گیا۔ اسی نے میرے دل میں علامہ کی تصویر بنانے کی بنا ڈالی۔ جس کی وجہ سے میں اپنی عقیدت کیشی کو قلم کاری کے ذریعے ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ جو شبیہ اس وقت مقالے کی زینت ہے وہ قلم مصور کا نقش عقیدت ہے۔

جولائی ۱۹۳۷ء میں سر راس مسعود کا بھوپال میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کی خبر جب علامہ کو ملی تو وہ بے چین ہو گئے اور پہلے رنج ا۳ر جولائی کو خط ممنون حسن خاں صاحب کو لکھا۔

اچھے علم سے اچھا ادب تخلیق نہیں ہوتا۔

ممنون حسن خاں صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک بار علامہ اقبال نے سر راس مسعود سے کہا کہ حیدر آباد میں اردو یونیورسٹی قایم ہو چکی ہے آپ کا تعلق ہمارا جا اندور سے ہے آپ کوشش کیجئے کہ اندور میں ہندی یونیورسٹی قایم ہو جائے۔ سر راس مسعود نے علامہ کی یہ بات بہت پسند کی۔ اور کہا کہ بھوپال میں ترجمے کو اندور اور اجین سے سنسکرت اور ہندی کے علما آتے ہیں اور آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ یہاں ترجمے کا کام بھی ہو رہا ہے چنانچہ میگھ دوت کا ترجمہ ہو چکا ہے اب کالیداس کے مشہور ڈرامے شکنتلا کے ترجمے کا کام ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔

علامہ بھوپال میں تعلیم کے خواہاں تھے۔ انھیں اس بات کی خوشی تھی کہ سر راس مسعود یہاں کے وزیر تعلیم ہیں، اور اس لئے امید کرتے تھے کہ یہاں تعلیم عام ہو جائے گی۔ وہ نواب صاحب سے بھی خوش تھے اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ نواب صاحب اچھے دل اور روشن دماغ حکمراں ہیں، اس لئے انھیں امید تھی کہ قوم اور ملک کو ان کی ذات سے فائدہ پہنچے گا۔

بھوپال کے نامور مصور جناب عبدالحلیم انصاری جن کی کوئلے کی بنائی ہوئی تصویر ہم اس مقالے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں، علامہ اقبال سے دوران قیام بھوپال، دو بار ملے۔ چنانچہ وہ بتاتے ہیں کہ علامہ محمد اقبال سے پہلی مرتبہ سر راس مسعود مرحوم کے ہاں "ریاض منزل" میں ملاقات ہوئی اور دوسری مرتبہ جب وہ شیش محل میں مقیم تھے، چونکہ سر راس مسعود نے خاص طور سے انھیں علامہ اقبال کے کمرے میں لے جا کر تعارف کرایا تھا۔ اس لئے علامہ نے بھی خاص التفات فرمایا۔ چنانچہ عبدالحلیم انصاری صاحب جب علامہ سے ملنے کے لئے شیش محل گئے تو انھوں نے انھیں شلوار پہنے پلنگ پر بیٹھا پایا حقہ سامنے رکھا ہوا تھا۔ انھیں دیکھ کر فرمایا: سر راس مسعود نے آپ کے بارے میں کئی پسندیدہ باتیں بتلائی ہیں۔ میں چونکہ ان کے مزاج سے واقف ہوں اس لئے آپ کو بھی طرح سمجھا اور خوش ہوا۔"

عبدالحلیم انصاری صاحب نے کہا "آپ سے شرف نیاز میرے لئے اعزاز ہے اور خوش نصیبی بھی اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے مجھ کو آرٹ کے متعلق بہت سے مسائل سمجھنا اور بہت سے مراحل حل کرنا ہیں منزل عرفان کے۔" اتنی باتیں انھوں نے بڑی جسارت کے ساتھ کہی تھیں۔

علامہ اقبال نے دریافت کیا۔ آپ کا سبجیکٹ کیا ہے؟

عبدالحلیم صاحب نے جواب دیا "فطرت کشی اور مطالعہ فطرت" اور یہ بھی کہا کہ میں عام آرٹسٹوں کی طرح فطرت کو پینٹ ہی نہیں کرتا بلکہ اسے پڑھتا ہوں۔ فطرت میرے نزدیک ایک کتاب ہے الہامی جس کے مطالعہ سے روشنیاں حاصل ہوتی ہیں۔ الہام و عرفان کی اور رموز و نکات وا شگاف ہوتے ہیں علوم و فنون کے۔"

حلیم صاحب فرماتے ہیں کہ میرے خیالات سے علامہ نے دلچسپی لی اور فرمایا "آپ نے دلچسپ نظریہ پیش کیا ہے۔ میں چونکہ آج کل معالجین کی ہدایت کا پابند ہوں اس لئے پھر باتیں کروں گا۔" اس زمانے میں علامہ بجلی کے علاج کا ایک خاص کورس پورا کر رہے تھے

مجھے رلاتی ہے اہل جہاں کی بیدردی — فغان مرغ سحر کو وہ جانتے ہیں سرود

١ نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست — نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

علامہ اقبال کو مرا س کی وفات پر جو صدمہ ہوا تھا اس کا اندازہ لیڈی مسعود کے تعزیتی خط سے ہوتا ہے۔ "میں آپ کو صبر کی تلقین کیونکر کروں جبکہ میرا دل تقدیر کی شکایتوں سے خود لبریز ہے"

مندرجہ بالا جملے اس شخص کے ہیں جو زندگی کو جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں مشہور کرتا تھا۔ اور جس نے ہمیشہ صبر و ضبط ہمت و استقلال کا درس دیا۔

جب ٩ جنوری ١٩٣٨ء کو حیدرآباد نے یوم اقبال منانے میں پہل کی اور اس کی صدارت کے فرائض نظام دکن کے ولیعہد شہزادہ برار نے انجام دیئے۔ تو اس موقع پر نواب حمیداللہ خاں نے حسب ذیل پیام بھیجا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اقبال کی عظمت کے کس حد تک قدرداں تھے :

"مجھے مسرت ہوئی کہ یوم اقبال ہز ہائی نس پرنس آف برار ولی عہد خانوادہ آصفی کی صدارت میں منایا جارہا ہے۔ اقبال کے نغموں میں ہندوستانی قومیت کے راز مضمر ہیں۔ اس فلسفی شاعر نے اہل ہند کو خواب غفلت سے چونکا کران میں احساس بیداری پیدا کردیا"

(اقبال اور حیدرآباد صفحہ ٢٥)

٢١ اپریل ١٩٣٨ء کی صبح ساری دنیا اور خصوصاً عالم اسلامی کے لئے غمناک سانحے کا پیام لے کر آئی۔ اُدھر نیّر اعظم طلوع ہو رہا تھا اُدھر آفتاب علم و حکمت جس نے سالہا سال تک اپنے افکار و خیالات کی روشنی سے دنیا والوں کے قلب کو منور کیا تھا غروب ہو رہا تھا۔ ساڑھے چھ بجے صبح وہ منحوس گھڑی تھی جس نے شاعر مشرق سے دنیا کو محروم کردیا۔ علامہ اقبال اس عالم فانی سے رخصت ہوگئے۔

اس جانکاہ خبر نے ساری دنیا کو مغموم کردیا۔ خصوصیت سے ہندوستان کا چپّا چپّا ماتم خانہ بن گیا۔ جو قریب تھے وہ جاوید منزل کی طرف دوڑے اور تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے اور اپنے محبوب شاعر کا آخری دیدار کرتے ہوئے اسے سپرد خاک کیا۔ جو دور تھے انھوں نے تعزیتی جلسے اور رزولیوشن کے ذریعے اظہار غم کیا۔ بھوپال سے تو علامہ کا آخری زمانے میں بڑا گہرا تعلق ہوگیا تھا۔ اگرچہ وہ اس زمانے میں بھوپال تشریف لائے تھے جبکہ بیمار تھے اور اسی وجہ سے نہ تو وہ اس شہر کے علمی و ادبی جلسوں میں شریک ہوئے اور نہ ہی ان کا یہاں کے عام لوگوں سے تعلق پیدا ہوسکا۔ بلکہ خاص لوگوں ہی تک ان کے تعلقات محدود رہے۔ اور شہر کے کچھ ہی لوگ ان سے ملاقات کرسکے۔ ممنون حسن خاں، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر عبدالباسط، ڈاکٹر سلطان صاحبان کے علاوہ مائل نقوی، پنڈت ایا سیٹھ مٹھل داس، راجا امرت نرائن بسریا، رائے زادہ گووند پرشاد، آفتاب، ذکی وارثی، ارشد تھانوی، حامد سعید خاں، عبدالرزاق شفیق البرائکہ، حکیم ضیاء الحسن، ملا رموزی، قاضی محمد حسن صاحب قاضی شہر، مفتی انوار الحق، عبدالحلیم انصاری، یوسف قیصر، شمس سلام الدین، حکیم قمر الحسن، آصف شاہمیری وغیرہ صاحبان قابل ذکر ہیں۔ لیکن شہر کے عام لوگ بھی ان سے محبت کرتے تھے اور بھوپال میں ان کی آمد پر نہ صرف خوش تھے بلکہ فخر کرتے تھے۔ چنانچہ موت کی خبر نے سارے شہر میں غم کی لہر

"سید مسعود مرحوم کے انتقال کی ناگہانی خبر صبح اٹھتے ہی اخبار زمیندار سے معلوم ہوئی۔ میں نے اس خبر کو مشتبہ سمجھ کر آپ کے نام تار لکھا کہ اتنے میں سول اینڈ ملٹری گزٹ سے مرحوم کے انتقال کی سرکاری اطلاع معلوم ہوئی۔ سخت پریشان ہوں۔ مفصل حالات سے مجھے آگاہ کیجئے۔ میرے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہے" (اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۳۲۶)

"ذکر اقبال" میں عبدالمجید سالک صاحب تحریر کرتے ہیں: "دوست قدیم نواب ذوالفقار علی خاں اور ہمدم و دمساز رفیقۂ حیات والدۂ جاوید کی موت نے علامہ کو اس عالم ضعف و علالت میں بے حد روحانی صدمہ پہنچایا۔ لیکن ابھی ایک اور جانکاہ حادثہ باقی تھا یعنی سر راس مسعود جن سے علامہ کے قلبی اور روحانی تعلقات تھے اور جنہوں نے علامہ کی خاطرداری اور تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی آخر جولائی ۱۹۳۷ء میں دفعتاً انتقال کر گئے۔ علامہ نے یکم اگست ۱۹۳۷ء کو لیڈی مسعود کے نام تعزیت کا خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے دلی اضطراب نمایاں ہے۔" (ذکر اقبال۔ ص ۲۱۵)

۱۷ اگست ۱۹۳۷ء کو ممنون حسن صاحب کو خط لکھتے ہیں جس میں سر راس مسعود کے کتبہ مزار کے لئے وہ رباعی بھیجی جو اپنے کتبہ مزار کے لئے تحریر کی تھی۔

"ڈیر ممنون صاحب! مسعود مرحوم کے کتبہ مزار کے لئے میں نے مندرجہ ذیل رباعی انتخاب کی ہے۔

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل ۔۔۔۔ ز بند این و آں آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمے چند ۔۔۔۔ گلاں را رنگ و آب دادہ رفتم

یہ رباعی میں نے اپنے کتبہ مزار کے لئے لکھی تھی۔ لیکن تقدیر الٰہی یہ تھی کہ مسعود مرحوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے حالانکہ عمر کے اعتبار سے مجھ کو ان سے پہلے جانا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ رباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ ان کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے۔ لیکن اگر صرف ایک ہی مطلع ان کے سنگ مزار پر لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل شعر میرے خیال میں بہتر ہوگا۔

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں ۔۔۔۔ خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں

باقی خیریت ہے مسعود کا غم باقی رہے گا جب تک میں باقی ہوں" (اقبال نامہ صفحہ ۳۲۹)

۲ اکتوبر کو علامہ ممنون حسن خاں سے اسلامی فیملی لا کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو مسعود مرحوم کا ذکر اسی غمناک لہجے کے ساتھ کرتے ہیں: "شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ ریاست بھوپال میں اسلامی فیملی لا کے متعلق علماء کے مشورے کے بعد ایک ENACTMENT وضع کیا گیا تھا۔ اگر آپ کو معلوم نہیں تو شعیب صاحب سے معلوم کیجئے۔ اور اس کی ایک کاپی لے کر مجھے بھیج دیجئے زیادہ کیا لکھوں۔ سوائے اس کے کہ مسعود نہیں بھولتا" (اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۳۳۴)

علامہ نے سر راس کی موت پر جو نظم لکھی تھی وہ ارمغان حجاز میں "مسعود مرحوم" کی سرخی سے شائع ہوئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی ۔۔۔۔ وہ یادگار کمالات احمد و محمود

۲۔۱۰۔۲

مسٹر مصباح الدین احمد (۲۱) منشی نواب حسن صاحب (۲۲) منشی شبیر حسن صاحب (۲۳) منشی قریش مسیح وغیرہ۔

جلسہ کا افتتاح تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ مولانا احسان رسول صاحب نے سورۂ یاسین کے تیسرے رکوع کی قرأت فرمائی جس کو حاضرین جلسہ نے ادب سے کھڑے ہوکر سنا۔ اس کے بعد ذیل کے تین رزولیوشن جلسے میں پیش ہوکر باتفاق رائے منظور ہوئے

(۱) بھوپال میں شیفتگان اور خادمان علم و ادب کا یہ غیر معمولی جلسہ مشرق کے شاعر اعظم ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لا کے بے وقت اور پُر الم سانحہ وفات پر اپنے انتہائی حزن و ملال کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس کو ملت اسلامیہ کے لئے خصوصاً ایسے وقت میں جبکہ عالم اسلامی کو آپ کی حکیمانہ رہبری کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ناقابل تلافی نقصان تصور کرتا ہے۔

(۲) یہ جلسہ ہندوستان کے بلند پایہ شاعر و مفکر اعظم کی ان تمام علمی ادبی اور ملی خدمات کا دلی جذبات محبت و عقیدت مندی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے اور ان کو ملت اسلامیہ کے لئے خصوصاً اور تمام مشرقی اقوام کے لئے باعث احیا و بیداری قرار دیتا ہے۔

(۳) یہ جلسہ علامہ خلد آشیاں کے تمام اعزا اور پسماندگان کے ساتھ اس الم انگیز سانحہ پر دلی رنج کے ساتھ پرخلوص ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔"

صاحب صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں انتخاب صدارت پر حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ مجھ پر ایسے جلسہ تعزیت کی صدارت کا بار رکھا گیا ہے جس سے ہمارا دل درد و غم سے نڈھال ہے اس لئے کہ ہم سے آج وہ چیز چھین لی گئی ہے جس کی ابھی ہماری قومی و ملی بلکہ ملکی اور سیاسی زندگی کے لئے سخت ضرورت باقی تھی اور جس کا بدل اس وقت مستقبل قریب میں ہم کو نظر نہیں آتا۔ علامہ اقبال ہندوستانی قومیت کے لئے کیا رائے رکھتے تھے میں نہیں بتا سکتا۔ اور یہ کہ بحیثیت ہندوستانی ہونے کے کن علوم کے وہ ماہر تھے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ سارا ہندوستان اور نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا اور یورپ اس سے بے خبر نہیں ہے ان کی شاعری جو اپنے رنگ کی نرالی تھی، نہ صرف مسلمانوں کے دل سے ملوتھی بلکہ سارے ہندوستان اور ایشیا کا اس میں درد بھرا ہوا تھا۔ آخر میں آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ اس عظیم الشان نقصان سے ہم اپنے دل میں درد محسوس کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کی خدمات ملکی و ملی مالک حقیقی قبول فرما کر اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔"

اس کے بعد جناب محمود الحسن صدیقی ایڈیٹر ندیم نے علامہ اقبال کی ایک ایسی خصوصیت پر روشنی ڈالی جو صحیح طور پر قابل تحسین و تشکر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مشرقی اقوام کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً زندگی کا نظریہ ہے کہ "حالات و واقعات نے انسان پیدا کئے یا انسان حالات و واقعات پیدا کرتا ہے" اقبال کے کلام نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان حالات کو بدلتا ہے۔ اس بلند پایہ مفکر، بلند مرتبہ شاعر و ادیب نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ اس کے اندر زندگی اور جوش ملی پیدا کیا۔ اس سلسلے میں حالی کا نام بھی لیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ لیکن اقبال کی شاعری میں بلندی و عظمت اور انقلاب پیدا کرنے والی قوت مضمر ہے۔ گو ہم اقبال کی خدمت کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم اس کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں۔"

جناب سبزواری صاحب نے فرمایا کہ اقبال کی وفات سے ملک و قوم اور ادب کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ آپ نے اقبال ...

دوردادی۔ جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے۔ جن میں اس عظیم نقصان پر اظہار افسوس کیا گیا اور اپنے محبوب شاعر کی مغفرت کے لئے دعائیں کی گئیں۔

۲۳ر اپریل کو اہل بھوپال کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب سلام الدین خاں (سابق چیف جسٹس بھوپال) میونسپل بھوپال کے میدان میں منعقد ہوا۔ جس میں ایک ہزار کے قریب ہند و مسلمانوں نے شرکت کی جلسے کی رُوداد حسب ذیل ہے :۔

جلسے کا افتتاح قرآن حکیم کے پارۂ سیقول کے دوسرے رکوع سے کیا گیا۔ بعد ازاں صاحب صدر کی اجازت سے جناب چودھری محمد اطہر صاحب بی اے ایل ایل بی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بلدہ بھوپال نے رزولیوشن پیش کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی: "یقیناً دردمیں ڈوبی ہوئی تھی۔ آپ نے علامہ سر محمد اقبال تاجدار سخن کی زندگی پر تبصرہ مختصر مگر بلیغ اور جامع الفاظ میں کرتے ہوئے حاضرین جلسہ کو انعقاد جلسہ کی غرض سے آگاہ فرمایا۔ اس کے بعد ماسٹر آفاق حسین صاحب ہیڈ ماسٹر جہانگیریہ اسکول نے علامہ اقبال کی ذاتی خصوصیات اور شاعری سے بہت وضاحت سے حاضرین کو روشناس فرمایا۔ تیسرا نمبر بھوپال کے ایک سنسکرت عالم پنڈت لچھمن جی آیا کا تھا۔ آپ کی تقریر کا موضوع اقبال کی "مشرق سے محبت" تھا۔ آپ نے ان شعروں سے تقریر کا آغاز فرمایا۔

دلا نادانی پروانہ تا کے نگیری شیوۂ مردانہ تا کے

یکے خود را ز سوز خویشتن سوخت طواف آتش بیگانہ تا کے

آپ نے ان اشعار سے اقبال کے ان جذبات محبت کو واضح کیا ہے جو ان کے دل میں اپنے ملک ہندوستان سے بھرے ہوئے تھے۔

ازاں بعد جناب مولوی عبدالرزاق صاحب مولف "البرامکہ" اور جناب سعید رزمی صاحب نے ریزولیشن کی تائید میں جو تقریریں فرمائیں ان میں اقبال کی شاعری اور ان کے نظریے کی خصوصیت کی وضاحت اس خاص طور پر کی گئی۔ گو پرسوز الفاظ میں دوسرے نامور شعرا سے مقابلہ کرتے ہوئے سابق مرحوم کی شاعری کی خصوصیات کا ذکر فرمایا۔ لیکن اقبال مرحوم کی اس خصوصیت کو خاص طور پر نمایاں کیا کہ مرحوم نے فنی اور ذہنی حیثیت سے کسی کی تقلید نہیں کی۔ بلکہ نظام قدرت نے جو فضا پیدا کر رکھی ہے اس سے وہ متاثر تھے۔ علم کا نصب العین ان کے ذہن میں حکومت کی کرسیاں حاصل کرنے سے بہت بلند تھا۔ مرحوم نے اپنی شاعری کے ذریعہ فلسفۂ تعلیم دراس کے اصول سے ملک کو آشنا بنا دیا۔

دوسرا تعزیتی جلسہ بھوپال کے تمام خادمان علم و ادب کا زیر صدارت مولانا سید حامد رضوی صاحب وکیل دفتر اخبار ندیم میں ۲۴ اپریل ۱۹۳۸ء بوقت ۸ بجے شام منعقد ہوا۔ ذیل کے حضرات نے جلسے میں شرکت فرمائی :۔

(۱) مولانا سید حامد رضوی صاحب وکیل سابق ممبر لیجسلیٹو کونسل بھوپال (۲) مولانا ارشد تھانوی صاحب وکیل (۳) مولانا عبدالجلیل صاحب مائل نقوی (۴) مولوی محمد احمد صاحب سبزواری بی اے، عثمانیہ (۵) مسٹر محمود الحسن صدیقی بی اے علیگ، مدیر ندیم (۶) مولوی عبدالرزاق صاحب مہتمم ذخائر (۷) ضیاء الملک ملا رموزی (۸) ماسٹر سید ناصر علی صاحب ناصر الناوی (۹) ماسٹر سلیمان محمد خاں صاحب آرزو (۱۰) مسٹر سید حسن بی اے علیگ (۱۱) مسٹر منیر مظفر سیفی مدیر معاون ندیم (۱۲) منشی سید لطف علی صاحب اسسٹنٹ ریونیو سکریٹری ڈیوڑھی عیدگاہ کوٹھی (۱۳) مولوی عبدالقیوم صاحب (۱۴) منشی ظہور الحسن صاحب (۱۵) منشی محمد اسماعیل صاحب ہاتف (۱۶) منشی مطلوب عالم صاحب فاروقی (۱۷) منشی رحم حسین صاحب (۱۸) مولانا احسان رسول صاحب (۱۹) مسٹر نفیس احمد فاروقی (۲۰)

کا کلام ہر منزلِ حیات میں ان کی رہبری کرے گا، ہر مصیبت کے لئے ان کو سینہ سپر بنا دے گا، ہر موقع پر ان کے لئے مشعلِ راہ ہوگا۔"

"اقبال جا چکے، اپنا شاندار مشن پورا کر گئے۔ ان کے انتقال پر ملک و قوم جتنا ماتم کرے کم ہے، لیکن ماتم سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ اہلِ ملک ان کی تعلیم اور ان کے بلند و برتر خیالاتِ اعلیٰ و ارفع جذبات سے فائدہ اٹھائیں اور اٹھاتے رہیں۔

اقبال اتحاد اور محبت و اخوتِ انسانی کے پیغام رساں تھے، اقبال کی صحیح پرستاری یہ ہے کہ ہم بھی ملک میں اتحاد اور محبت و اخوت کی روشنی محسوس کریں۔ اور ملک کی فضا کو جو منافرت اور عناد و اختلافات سے مکدر ہو رہی ہے اس کو اتفاق اور باہم محبت و ہمدردی کی فضا سے بدل دیں۔"

بہت سے شعراء حضرات بھی علامہ کی وفات سے بے حد متاثر ہوئے چنانچہ ماتم اقبال میں کئی شعرا نے مرثیے لکھے۔ جن میں علامہ محوی صدیقی لکھنوی، حامد سعید خاں، جناب نائل نقوی، جناب حسیب الحسن صاحب قادری اور جناب اختر سعید صاحب کے مرثیے نظر سے گزرے۔ یہ تمام مرثیے ان کے درد و غم کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں ۔۔ جناب نائل نقوی کا مرثیہ "حسانِ اقبال" ملاحظہ کیجئے:۔

جو یہ کہتا ہے ہوا قیدی کا انتقال ۔۔۔ اس کا یہ کہنا غلط ہے، بلکہ بالکل محال
ختم دونوں کو نہ جینے کا بہانہ ہو گیا ۔۔۔ دیکھنے والوں کو لیکن کیا کہوں کیا ہو گیا
ابن آدم ہیں فقط ظاہر کا قائل کس قدر ۔۔۔ عالمِ باطن کی کیفیت سے بالکل بے خبر
یہ بصارت اس طرح صرفِ عمل ہوتی رہے ۔۔۔ اور قیامت ہے بصیرت بے خبر ہوتی رہے
یہ خبر اس کو نہیں فطرت کا یہ مقصد ہو فوت ۔۔۔ "مردِ مومن" پر نہیں غالب اگر آجائے موت
زندگی و موت کو پیروں سے ٹھکرائے ہوئے ۔۔۔ ہیں یہی رہتے ہیں جو کونین پر چھائے ہوئے
وہ حیات ان کو عطا کرتا ہے خلاقِ الصمد ۔۔۔ جس کا اک گوشہ ازل اور دوسرا گوشہ ابد
جزو و کل کو نظروں سے رکھتے ہیں گرماتے ہوئے ۔۔۔ موت تھراتی ہے ان کے سامنے آتے ہوئے

آ بتا دوں تجھ کو اے جو پائے رازِ سرمدی ۔۔۔ موت کی غفلت ہے کیا؟ اک شانِ حسنِ بے خودی
ہے جو محو سیر کیفیاتِ الا اللہ میں ۔۔۔ موت بھی اک منزلِ مسلسل ہے اسکی راہ میں
ان جواں مردوں کا یہ عالم نہیں غم کے لئے ۔۔۔ یہ بھی اک درسِ خودی ہے اہلِ عالم کے لئے
"ہاں گزر جا موت کی منزل سے اٹھلاتا ہوا ۔۔۔ مسکراتا رقص کرتا جھومتا گاتا ہوا؟"

اس جری کی موت پر اس طرح اظہارِ قلق ۔۔۔ جرأتِ ہمت کا دیتا تھا جو عالم کو سبق
یہ بجا ہے دل میں جب ہوتا ہو دردِ جاں گسل ۔۔۔ مضطرب ہو جاتے ہیں حساس اور ساں مشتعل
ان کو ضبطِ نالہ و شورِ فریاد کا مقدور ہے ۔۔۔ آدمی احساسِ غم پر فطرتاً مجبور ہے
بجلیاں گرتی ہیں جب پیہم حواس و ہوش پر ۔۔۔ آہ آخر آ ہی جاتی ہے [illegible]

کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نے اردو ادب میں ایک جدید دور کا آغاز کیا اس نے اس کو امام ادب کہنا بجا طور پر مناسب ہے۔ اقبال سے قبل اردو شاعری کی بنیاد گل و بلبل، لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد تک محدود تھی۔

جناب ارشد صاحب تھانوی نے کہا کہ اقبال نے اس دور میں جنم لیا جبکہ شعر و شاعری میں داغ کے رنگ کو پسند کیا جاتا تھا۔ اور ہر شاعر داغ کا تتبع کرتا تھا۔ اس وقت چند لوگ ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے اس پرانے رنگ کو چھوڑ کر ایک نئی روشنی اختیار کی اس میں علامہ اقبال، مولانا حالی، اور پروفیسر آزاد کا خاص حصہ ہے۔ اقبال کی وفات ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

جناب مرزا ظفر سیفی نے کہا کہ اقبال آج ہمارے کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ وہ بحیثیت شاعر نہ صرف اردو شاعری کے لئے باعث افتخار تھا بلکہ اس کی شخصیت ہندوستان کے لئے، ایشیا کے لئے اور عالم اسلام کے لئے مایۂ ناز تھی۔ اقبال نے جس نظریے کے تحت مسلم اقوام کے احیا کا مسئلہ پیش کیا وہ دوسرے الفاظ میں خود اقبال پر بھی حرف بحرف صادق آتا ہے۔ یعنی قوم میں سے بعض جلیل القدر افراد آگے چل کر اپنی قوموں کو بنایا کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال ایک ایسی قوم اور ایسے ملک میں پیدا ہوا جس نے اس کی شخصیت کو اس وقت نہیں پہچانا جب تک اس کی شہرت کا آفتاب مشرق سے طلوع ہو کر افق مغرب کے نصف النہار پر نہ پہنچ لیا۔ ہماری آنکھیں اس وقت کھلیں جب مغربی اقوام مسرت کے خطاب سے اس کی عظمت کا اعتراف کر چکی تھیں۔ دنیا کی تمام قوموں نے اقبال کی بین الاقوامی شخصیت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ [illegible] اقبال کو اپنا نا بھی چاہا۔ جرمنی نے کہا [illegible] اقبال کی شاعری اور فلسفہ گوئٹے کا مرہون منت ہے [illegible] نے کہا اقبال نے ہم سے سب کچھ سیکھا ہے [illegible] نے کہا اقبال ہمارا ہے حالانکہ اقبال وہی کہہ رہا تھا جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر کہا جا چکا ہے۔ [illegible] وہ بین الملتی [illegible] کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔

یکم مئی ۱۹۳۸ء کے اخبار [illegible] میں ایک طویل اداریہ لکھا گیا جس میں علامہ کے انتقال پر [illegible] غم کرتے ہوئے ان کی [illegible] عظمت پر روشنی ڈالی گئی۔ اداریہ میں کہا گیا۔

اقبال مرحوم ان انقلاب انگیز شعرا میں سے ہیں جن کی تخلیق ہنگامی تخلیق نہیں ہوتی۔ وہ فطرت کے پیغامبر ہوتے ہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں ایک عظیم الشان مشن لئے ہوئے۔ اپنی زندگی میں وہ اس مشن کو پھیلاتے ہیں۔ اس سبق کو دہراتے ہیں۔ قوم کو یاد دلاتے ہیں جو وہ بھولی ہوئی ہے۔ اس کے اجزائے قومیت میں ہم آہنگی پیدا کر کے اس کے پریشان اور منتشر شیرازے کو یکجا کرتے ہیں۔ اس کی اساس ملت کو استوار اور محکم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری الہامی غیبی کی آواز ہوتی ہے۔ ان کا ہر لفظ اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔ سوز و گداز ہوتا ہے اور وہ برق آشنا تڑپ ہوتی ہے جس سے ایک مضمحل اور پسماندہ قوم کی رگوں میں حیات نو کے شرارے پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ حقیقتاً قوم کے مستقبل کے بانی ہوتے ہیں، وہی ملت کے حقیقی محسن حقیقی راہبر اور صحیح معنوں میں مجدد اعظم کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ وہ شعرا ہیں جن کو زندہ جاوید کہا جاتا ہے۔ قوم کی ہر نسل جن کے کلام سے روح حاصل کرتی ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ ان کا مشن مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ خود لافانی ہوتا ہے۔ اقبال بھی ہندوستان بلکہ عالم مشرق کے زندۂ جاوید شعرا میں سے ہے۔ جس کی روح پر مسلمانوں کی قوم ہمیشہ درود اور رحمت بھیجے گی اور ان کی ہر نسل اس کو اپنا راہبر تصور کرے گی۔ اقبال

بھوپال کے عوام نے بھی علامہ سے گہرے تعلق اور عقیدت کا ثبوت "اقبال لائبریری" اور سالہا سال تک "یوم اقبال" منا کر دیا۔ علامہ کی یادگار "اقبال لائبریری" کی بنیاد یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء میں پڑی اور خدا کے فضل سے یہ کتب خانہ آہستہ آہستہ آج تک ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اس کتب خانے کا تعارف کراتے ہوئے اس کے جنرل سکریٹری نے اس کے دستور العمل میں تحریر کیا ہے کہ:۔ مفکر اعظم شاعر مشرق علامہ اقبال کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ نے اپنی شاعری سے جس طرح مردہ ہندوستانیوں کے دلوں میں زندگی کو رواں دواں کیا وہ عدیم النظیر اور بے مثال ہے۔

جس وقت علامہ کی یاد میں ہر جگہ یادگاریں قائم کی جا رہی تھیں تو سرزمین بھوپال کی علمی ادبی خدمات وروایات اور علامہ اقبال کے بھوپال سے قریب تعلق کی بنا پر یونانی شفاخانے کے گرد و پیش کے چند سرپھرے نوجوانوں نے عزم مصمم کیا کہ بھوپال میں علم و ادب کی ایسی شمع روشن کریں گے جو نہ صرف اقبال کی یاد تک محدود ہو بلکہ وہ عوام کو تو سیع مطالعہ کے اہم مقصد سے روشناس کراتے ہوئے مطالعے کی سہولتیں بہم پہنچائے۔

اقبال لائبریری کے قائم ہونے کے بعد ہی سے یہاں "یوم اقبال" منانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا جس کا مقصد تھا کہ عوام کو علامہ کے افکار و خیالات سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ یہاں سالہا سال تک "یوم اقبال" کا سلسلہ جاری رہا۔ جن میں مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، سر تیج بہادر سپرو، محمد الیاس برنی۔ راجگوپال اچاریہ۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ ابوالکلام آزاد۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق وغیرہ۔ صاحبان نے پیغامات بھیجے جن کے ذریعے یوم اقبال کو سراہا گیا۔ اور علامہ کی عظمت کا اعتراف کیا گیا۔

وہ لوگ جنھوں نے یوم اقبال کے سلسلے میں تقریریں کیں یا مقالات پڑھے حسب ذیل ہیں:۔ علامہ سید سلیمان ندوی، پروفیسر احتشام حسین۔ کوثر چاندپوری۔ کاشی پرشاد۔ لالہ ملک راج۔ سورج کلا سرور۔ پروفیسر سلیم۔ حامد رضوی۔ حامد حسین۔ سردار جعفری۔ ایم عرفان۔ ابراہیم مدعو۔ مولانا وجدی الحسینی۔ آفاق احمد۔ زہرہ جمال۔ ابراہیم یوسف۔ آصف شاہمیری وغیرہ۔

منتظمین یوم اقبال نے اس کی اہمیت اور مقصد حسب ذیل بتائے ہیں:۔

"زندہ قومیں اپنے نامور اسلاف کی یاد تازہ کرکے موجودہ نسلوں کو مردہ پرستی کا نہیں زندگی کا درس دیتی ہیں"۔

"علامہ اقبال گو اس عالم آب و گل میں موجود نہیں مگر ان کی شاعری اور ان کا پیغام آج بھی زندہ اور پائندہ ہے اور یہ ان کے افکار و نظریات کی صدائے بازگشت ہی ہے کہ ہر سال ہند اور پاکستان میں جا بجا اس عظیم انسان کو مختلف صورتوں سے خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے"۔

"اقبال کا پیغام کیا تھا؟ بچھڑی ہوئی انسانیت کے لئے "قُم" کی جان بخش آواز! پست ہمتی اور بے عملی کے لئے حوصلہ افزا للکار۔ تنگ نظری اور تعصب کو وسیع المشربی اور فراخ حوصلگی کا درس۔ خود فراموشی اور خود فریبی کو خودی اور خود آگاہی کی تعلیم، انفرادیت کو اجتماعیت میں ضم کر دینے کی تلقین۔ غرضکہ ہماری ہیئت اجتماعی کو فرد یا جمعیت کی حیثیت سے جتنے بھی مسائل سے واسطہ پڑتا ہے ان سب کا حل اقبال کے کلام اور پیغام میں موجود ہے۔ چنانچہ اسی پیغام سے ایک

ہاں جو رونا ہے تجھے تو اپنی ناکامی پہ رو
اپنی بربادی پہ اور اپنی سبک گامی پہ رو

تجھ کو رونا ہے کہ تیرا رہنما تھا مر گیا،
فخر اس کو ہے کہ اپنا کام پورا کر گیا

زندہ جاوید تھا وہ زندگی میں جا ملا،
غور کر تو زندگی سے اس کی تجھ کو کیا ملا

پوچھنا ہے مجھ کو ان سے جو ہیں وقفِ شورِ شیون
نالہ و فریاد تھی کیا قسمتِ مرگِ حسین؟

سن پسِ پردہ ذرا، کوئی صدائے راز ہے
ہاں! یہی اقبال کی ہلکی سی اک آواز ہے

کہہ رہا ہے اے رہینِ رنجِ اقبال السلام
منزلِ آفاق میں پہنچا دے یہ میرا پیام

ہے تمہیں درد جدائی پر یہ صدمہ بر محل
تھا مری مرضی پہ فطرت کا مگر ہر اک عمل

ہو چکا بس میرے ماتم میں بہت اندوہگیں
زندگی ہے مختصر اب وقت رونے کا نہیں

حشر برپا کر رکھا ہے شورِ حاضر و ماضی نے
امتحاں گاہِ عمل ہے دیکھ تیرے سامنے

گرمیِ ہمت سے اٹھ شعلے کو شرماتا ہوا
برق بن کر بڑھ اکڑتا اور بل کھاتا ہوا

جستجوئے ندرتِ قومی میں کھو میری طرح
زندہ ہو کر زندۂ جاوید ہو میری طرح

(ندیم۔ یکم مئی ۱۹۳۸ء)

جناب سید عبدالواحد صاحب مصنف Iqbal نے نواب صاحب بھوپال اور علامہ اقبال کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی خوب صورت بات کہی ہے:۔

DURING THE LAST PHASE, HIS STAY IN BHOPAL, MAINLY FOR TREATMENT, DESERVES SPECIAL MENTION, AS IT SERVED TO STRENGTHE TIES OF MUTUAL ESTEEM AND FRIENDSHIP WHICH CHARACTERISED HIS RELATION WITH THE NAWAB OF BHOPAL, WHOSE MUNIFICIENT TREATMENT REMINDS US OF THE RELATION BETWEEN THE DUKE OF WEIMAR AND GOETHE

(IQBAL — SEYD ABDUL WAHID, P 22)

شاعرِ مشرق علامہ اقبال اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ علامہ کی صحت یابی کے لئے نواب صاحب نے مخلصانہ کوشش کی۔ جسے اہلِ نظر نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اقبال کے سیرت نگاروں نے دل کھول کر نواب صاحب کو سراہا۔ اقبال کے چاہنے والوں کے دلوں میں ان کا احترام اس قدر بڑھ گیا کہ عبدالواحد مصنف اقبال نے کہا کہ نواب صاحب کا اقبال کے ساتھ وہی تعلق تھا جو ڈیوک آف ویمر کا گیٹے کے ساتھ تھا۔ بہرحال نواب صاحب کا یہ مخلصانہ اور ہمدردانہ سلوک نہ صرف ان کے لئے بلکہ اس سرزمین کے لئے باعثِ فخر بنا۔

--

(۱ محمد ایوب قادری

مولوی شمس الدین

۱۲ رجنوری ۱۹۶۸ء کو صبح ہی سے طبیعت پر عجیب حزن و یاس کی سی کیفیت طاری تھی۔ کچھ لکھنا چاہا مگر طبیعت آمادہ نہ ہوئی، پڑھنا چاہا تو آنکھوں تلے اندھیرا سا آگیا۔ دل کسی کام میں نہیں لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج کوئی بات ہونے والی ہے۔ وقت مقررہ پر کالج گیا مگر وہاں بھی طبیعت کچھ بندھی بندھی سی رہی۔ شام کو کالج سے جب گھر پہنچا تو ڈاک دیکھی۔ سب سے پہلے مخدومی جناب حکیم محمد موسیٰ صاحب امرت سری کا لفافہ کھولا۔ اور جیسے ہی نہایت رنج و افسوس " کے الفاظ پر نظر پڑی دل دھک سے ہوگیا۔ آخر پورا مکتوب پڑھا۔

۱۱/۱/۶۸

محترم جناب قادری صاحب۔ سلام مسنون

نہایت رنج و افسوس کے ساتھ اطلاع دے رہا ہوں کہ محترم مولوی شمس الدین صاحب تاجر کتب رات کے تین بجے ہم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ آج چار بجے پڑھا جائے گا۔ حق مغفرت کرے مولوی صاحب مرحوم و مغفور کے سب دوستوں کو اطلاع کر دیجئے۔

مخلص دن

محمد موسیٰ عفی عنہ

مورخہ ۱۱/۱/۶۸ ۱۲ بجے دن

تھوڑی دیر کے لئے سکتے کا سا عالم رہا۔ ایک شریف، کریم النفس، علم دوست، پیکر اخلاص و انکسار شخصیت سے ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ مولوی شمس الدین کتابوں کے شیدائی، اہل علم کے فدائی اور سراپا خلوص و کرم تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سنہ ۱۹۶۲ء کا ذکر ہے کہ میں ایک روز کراچی کی مشہور دوکان "بک لینڈ" پر گیا۔ ایک دوست میرے ساتھ تھے، میں نے کچھ

---

۱ "آہ آہ مولوی شمس الدین صاحب تاجر کتب لاہور" سے سال انتقال سنہ ۱۹۶۹ء برآمد ہوتا ہے (محمد ایوب قادری)

نئی زندگی اور اسی کلام سے ایک نئی تازگی حاصل کرنے کے لئے ہم یوم اقبال منا رہے ہیں اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ اس یوم اقبال میں مردہ پرستی کے رسوم ادا نہیں کئے جائیں گے بلکہ مُردوں کو زندہ رہنے کا چلن سکھایا جائے گا۔ کیونکہ یہ دن اس شخصیت کی یاد میں منایا جا رہا ہے جس نے مردہ قوموں کی رگوں میں زندگی کا گرم خون دوڑایا ہے"

(پوسٹر۔ یوم اقبال ۱۲ر جون ۵۸ء)

علامہ اقبال کا بھوپال میں قیام اس اعتبار سے مختصر رہا کہ وہ علاج کی غرض سے تین مرتبہ بھوپال تشریف لائے اور کم مدت کے لئے یہاں رہے۔

پہلی مرتبہ	۳۱ر جنوری ۳۵ء سے	۸ر مارچ ۳۵ء تک
دوسری مرتبہ	۱۷ر جولائی ۳۵ء سے	۹ر ستمبر ۳۵ء تک
تیسری مرتبہ	۲ر مارچ ۳۶ء سے	۹ر اپریل ۳۶ء تک

یعنی علاج کے سلسلے میں مختلف وقفوں میں ان کا یہاں قیام تقریباً سوا چار ماہ رہا۔ لیکن اس مختصر قیام پر بھی یہ سرزمین جس قدر فخر کرے جائز ہے اس سرزمین کی خوش نصیبی ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبال کی خدمت کا اسے کچھ موقع ملا۔

اور اہل علم کی خدمت کو اپنا مقصد حیات سمجھتے تھے۔ اہل ذوق کو ان کی مطلوبہ کتب فراہم کرنے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۶۳ء میں خاکسار ہندوستان سے کراچی واپس آیا تو دو ایک روز کے لئے لاہور بھی ٹھہرا۔ دہلی سے میں کچھ کتابیں بھی خرید کر لایا تھا۔ مولوی صاحب کی مجلس میں ضمناً دہلی کے کتب فروشوں کی تکنیک کا ذکر بھی آ گیا کہ میں نے مولوی بشیرالدین کی ضخیم کتاب "واقعات دارالحکومت دہلی" گلی قاسم جان میں پرانی کتابوں کے دوکاندار سے پچاس روپے میں خریدی۔ اور میں اس کتاب کی خریداری پر خوش ہوا۔ مگر دوسرے دن اردو بازار میں مجھے یہی کتاب بآسانی پچیس روپے میں مل گئی۔ لہٰذا میں نے یہ نسخہ بھی خرید لیا۔ مولوی شمس الدین صاحب نے چودھری بشیر احمد خاں صاحب کے ذریعہ سے خواہش ظاہر کی کہ پچاس روپے والا نسخہ اگر آپ چاہیں تو مجھے دیدیں۔ میں نے وہ نسخہ مولوی صاحب کو دے دیا۔ اب اس مبتدا کی خبر ملاحظہ ہو کہ کچھ دنوں بعد مجھے پھر لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو میرے ایک دوست نے کہا کہ قادری صاحب، بہت دنوں سے مجھے واقعات دارالحکومت دہلی کی تلاش تھی پچھلے دنوں یہ کتاب مولوی شمس الدین صاحب نے فراہم کر دی۔ میں نے پوچھا کتنے میں ملی۔ انہوں نے بتایا کہ صرف پچاس روپے میں مل گئی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا کہ مولوی شمس الدین صاحب کتب فروش ہیں یا کتب بخش!

ایک واقعہ اور سنیئے۔ پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کا مرتب کردہ تذکرۂ شعراء، مجموعۂ نغز (قدرت اللہ قاسم) کی پوری لاٹ بہت کم قیمت پر مل رہی تھی، مولوی صاحب کو اطلاع ملی۔ لیکن انہوں نے اس وجہ سے یہ خریداری مناسب نہ سمجھی کہ شاید میں پھر زیادہ قیمت پر فروخت کرنے لگوں اور یہ بات علم اور اہل علم کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ایک دانشور تاجر کتب نے اس کو خرید لیا اور اب وہ کتاب ان کے لئے کیمیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ کاش مولوی شمس الدین خرید لیتے تو ان کی گراں فروشی کے باوجود اہل علم کو ارزاں ہی پڑتی۔ اور اب تو اس تذکرے کی قیمت آسمان سے باتیں کرتی ہے۔

میں جب لاہور وارد ہوتا تو اندازہ ہوتا کہ مولوی صاحب خوشی سے بچھے جا رہے ہیں۔ نئی نئی کتابیں دکھاتے، مخطوطات کی زیارت کراتے۔ مختلف کتابوں، مخطوطات اور مصنفوں پر رائے زنی ہوتی۔ میری مطلوبہ چیزوں کو فراہم کر دیتے۔ دوستوں اور اہل علم کا جمگھٹا ہی رہتا تھا۔ بعض اوقات خاص خاص احباب کو مدعو کیا جاتا۔ چاء کے دور چلتے، "نعمت کدہ" پر تاخت ہوتی اور خوب محفلیں جمتیں۔ ہائے۔ مولوی صاحب کی کن کن باتوں کو یاد کیا جائے۔

لاہور کے قیام میں میرا مشغلہ کتابوں کی تلاش اور خریداری رہتا ہے۔ میں ادھر ادھر سے کتابیں لاتا اور مولوی صاحب کی دوکان پر رکھ دیتا۔ مولوی صاحب مجھے دور سے دیکھتے ہی دوڑتے اور ہمیشہ دوکان سے نیچے آ کر ہی کتابیں لے لیتے۔ ان کو سنبھال کر رکھتے۔ جب تک میں لاہور رہتا یہی سلسلہ رہتا۔ جب میں کراچی آتا تو ساری کتابیں مولوی صاحب کے سپرد کر آتا۔ وہ عزیزی چودھری بشیر احمد کے ذریعہ سے پیکٹ بنوا کر اور پیٹی میں بند کر کے ٹرک کے ذریعہ کراچی بھجواتے بلٹی کے ساتھ مکمل فہرست اور بعض اوقات ہدایات بھی ہوتیں۔ آہ کیا دوست نوازیاں تھیں۔

ان کا یہ طریقہ سارے دوستوں کے ساتھ تھا۔ مخدومی پیر حسام الدین صاحب راشدی نے بحسرت و تاسف فرمایا کہ

کتابیں دیکھیں۔ بعض کتابوں اور مصنفوں کا ذکر آیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سنجیدہ شخص سیتل پائی پر بیٹھے کتابیں دیکھنے میں مشغول ہیں۔ عمر چالیس سے متجاوز۔ سفید قمیص اور شلوار زیب تن ہے۔ چاروں طرف کتابیں جمع ہیں۔ اندازہ ہوا کہ وہ صاحب میری گفتگو میں بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔ انہوں نے میرے دوست سے میرے متعلق آہستہ سے پوچھ لیا اور پھر بڑے تپاک سے میری طرف بڑھ کر مخاطب ہوئے۔

"مجھے شمس الدین کہتے ہیں اور میرا لاہور میں کتابوں کا کاروبار ہے۔ آپ نے ماشاء اللہ تذکرہ علمائے ہند پر مقدمہ اور حواشی خوب لکھے ہیں۔"

مولوی صاحب نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

میں نے ان کی ہمت افزائی کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ مولوی صاحب! مجھے آپ کا غائبانہ تعارف مشتاق بکڈپو کراچی کے مالک اکرام احمد صاحب کے ذریعہ سے حاصل ہے۔ آپ کی کچھ خطی اور نایاب کتابیں بھی ان کے یہاں دیکھی تھیں۔ مختلف اہل علم اور دوستوں سے اکثر آپ کا ذکر سنا اور اشتیاق دید بھی تھا۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا۔ اور بہت سی باتیں ہوئیں مولوی صاحب نے وہ کتابیں دکھائیں جو انہوں نے یک لینڈ سے منتخب کی تھیں، ان میں مولوی سعید احمد مارہروی مرحوم کی کتاب "آثار خیر" خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ مولوی صاحب بہت دیر تک اس کتاب کی تعریف فرماتے رہے۔ درحقیقت یہ کتاب مفید معلومات سے پُر ہے۔ اس میں اسلامی ہند کے امور خیر یعنی مدرسوں، شفاخانوں، سڑکوں، سراؤں، نہروں، تالابوں، پلوں، لنگر خانوں اور خیرات خانوں وغیرہ کے حالات درج ہیں۔ اور مسلمان بادشاہوں کی علمی فیاضیوں کا تذکرہ ہے

اسی ملاقات میں مولوی صاحب نے فرمایا کہ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری آپ کو پیر غلام دستگیر نامی مرحوم کی کچھ تصانیف بھیجنی چاہتے تھے معلوم نہیں وہ کتابیں پہونچیں یا نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ وہ کتابیں مجھے مل گئیں۔ اور اب گفتگو کا موضوع پیر غلام دستگیر نامی مرحوم ان کا علمی شغف اور حکیم محمد موسیٰ صاحب تھے۔ یہ تھی مولوی شمس الدین صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

مولوی صاحب کا کئی ماہ کراچی میں قیام رہا اور متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ میں ان کی قیام گاہ نگار ہوٹل گیا اور میری درخواست پر وہ میرے غریب خانے پر بھی تشریف لائے۔ اور خوب محفل جمی۔ خاکسار کے ذخیرہ کتب کو ملاحظہ فرماتے رہے رخصت ہوتے وقت انہوں نے اپنے ان مخطوطات کی ایک تفصیلی فہرست بھی مرحمت فرمائی جو انہوں نے نیشنل میوزیم آف پاکستان (کراچی) کو فروخت کئے تھے۔ اور یہ فہرست مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی نے تیار کی تھی۔ میں نے اس فہرست میں سے ایک مضمون "قرآن کریم کا قدیم ترین فارسی ترجمہ" کے عنوان سے "بصائر" کراچی جنوری ۱۹۷۲ء میں شائع کر دیا۔ اور جب محترمی مسعود حسن صاحب شہاب ایڈیٹر الزبیر بہاولپور نے الزبیر کے کتب خانہ نمبر شائع کرنے کا پروگرام بنایا تو میں نے دوسرے مضامین کے ساتھ یہ تفصیلی فہرست بھی اپنے تعارفی نوٹ کے ساتھ شہاب صاحب کو بھیجدی۔ جو الزبیر کے کتب خانہ نمبر میں شائع ہو گئی ہے۔

... مولوی صاحب کی زندگی کتابوں اور اہل علم کی خدمت کے لئے وقف تھی۔ وہ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر

ایک میرے حصہ میں بھی آئی۔ یہ تھا اس مردِ قلندر کا اندازِ تجارت۔

حقیقت یہ ہے کہ مولوی شمس الدین مرحوم تاجرانِ کتب لاہور کی آبرو تھے۔ دیانت، امانت اور اخلاص و محبت ان کے نمایاں جوہر تھے۔ میرے ایک نہایت ہی قریبی عزیز تجارتِ کتب کا مشغلہ رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب ہمیشہ ان کی رہنمائی اور مدد کرتے، مفید مشورے دیتے اور مختلف نقصانات سے بچاتے۔ ایک مرتبہ لاہور کے ایک تاجرِ کتب نے ان عزیز سے ایک تجارتی معاملہ کیا۔ اور اس میں صفائی معاملات کا ثبوت نہ دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس واقعہ سے مولوی صاحب کو بہت دکھ ہوا۔ حالانکہ ان کا اس معاملہ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ میرا یہ خیال ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی بالواسطہ اور بلاواسطہ کوشش سے اس معاملہ کو سلجھایا۔ چودھری بشیر احمد خاں صاحب کی کوششوں کو بھی اس کے سلجھانے میں خاصا دخل رہا۔ میرے وہ عزیز مولوی صاحب کے نیاز مند ہوئے۔

مولوی صاحب کا اپنا ذاتی کتب خانہ نہایت منتخب اور اعلیٰ تھا۔ اس میں نایاب مطبوعات اور قیمتی مخطوطات تھے مطبوعات کا بیشتر حصہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا چھپا ہوا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں میں نے مولوی صاحب کے پاس مطبوعہ کتابوں کا ایک ایسا ہی ذخیرہ دیکھا۔ وہ کتابیں تمام تر لکھنؤ اور کانپور کی مطبوعہ تھیں۔ جن کی کتابت و طباعت اعلیٰ اور کاغذ دبیز تھا۔ میں نے اس میں سے کچھ کتابوں کے اقتباسات بھی لئے۔ مولوی صاحب اپنی کتابیں دکھا کر بھی بہت خوش ہوتے تھے اور مولوی صاحب کے کتب خانے سے بہت سے اہلِ علم، طلبا اور دوست مستفید ہوتے تھے۔

ستمبر ۱۹۶۶ء میں چودھری بشیر احمد خاں صاحب کی معیت میں مولوی صاحب کے دولتکدے پر حاضر ہوا اور ان کے ذاتی ذخیرۂ کتب کو دیکھا جو زیادہ تر تصوف، تاریخ، فہرست کتب اور تذکروں پر مشتمل تھا۔ خطی کتابیں بھی خاصی تھیں۔ میں نے علامہ فضل حق خیرآبادی کی ردعن المجدد، مولوی صاحب ہی کے یہاں دیکھی۔ افسوس کہ قلت وقت کی وجہ سے فہرست یا یادداشت مرتب نہ کر سکا۔ اس ذخیرے میں مجھے مولانا پروفیسر نور الحق علوی کی وہ درخواست ملی جو ایک طرح سے ان کے خودنوشت سوانحی اشارات پر مشتمل ہے۔ جس کو میں نے اپنے تعارفی نوٹ کے ساتھ ماہنامہ الرحیم حیدرآباد (اگست ۱۹۶۶ء) میں شائع کرا دیا ہے۔ اسی موقع پر ان کے رہیب شفیق احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔

مولوی صاحب کی مخطوطات پر گہری نظر تھی۔ رسم الخط کاغذ اور جلد سے مخطوطے کا اندازہ لگا لیتے تھے۔ اصلی اور جعلی مخطوطات کی پرکھ خوب رکھتے تھے۔ مختلف قسم کے خط اور خطاطوں کے حالات سے بھی واقف تھے۔ اور اس موضوع پر بھی ان کے کتب خانے میں خاصا مواد تھا۔

مولوی صاحب کو تصوف سے خاصا ذوق تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رح سے ان کو گہری عقیدت تھی۔ انہوں نے سب سے پہلی کتاب مجدد صاحبؒ کے حالات میں شائع کی تھی۔ اور قیام پاکستان سے پہلے وہ اکثر مجدد صاحب کے عرس میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ان کے ذخیرۂ کتب میں مجددی نقشبندی سلسلے کی خاصی چیزیں تھیں، لکھنؤ کے مشہور بزرگ مولانا عبد اللہ

کہ انہوں نے جنوری کے پہلے ہفتے میں فارسی کی کچھ کتابیں، دیوان غنی، بیدل وغیرہ مولوی صاحب سے لیں۔ انہوں نے احتیاط اور سلیقے سے پیکٹ بنا کر پیر صاحب کو دیا۔ جہاز کے سفر کی وجہ سے پیر صاحب وہ پیکٹ ایک دوست کے پاس لاہور چھوڑ آئے۔ پیر صاحب فرماتے ہیں کہ :

"اب وہ پیکٹ کھولنے کو جی نہیں چاہتا۔ کہ اب ایسے پیکٹ کون باندھ کر دیگا۔ مولوی شمس الدین صاحب کی طرح سلیقوں کی گانٹھیں کون باندھے گا" ۶

رفتید ولے نہ از دلِ ما

ستمبر ۱۹۶۶ء کا ذکر ہے کہ میں ایک روز دوکان پر پہنچا میرے ہاتھ میں میری کتاب "مولانا محمد احسن نانوتوی" کے چھپے ہوئے فرمے تھے۔ مولوی شمس الدین صاحب نے وہ فرمے دیکھنے کے بہانے لے لئے۔ تین چار گھنٹے کے بعد جب میں گھوم پھر کر واپس آیا تو مجھے ایک دیدہ زیب جلد کی شکل میں وہ فرمے ملے۔ "مولانا محمد احسن نانوتوی" کا یہ پہلا نسخہ تھا جو میں نے اپنے محترم دوست محمد عالم مختار حق صاحب کی خدمت میں مولوی صاحب کی دوکان پر نذر کر دیا۔ مولوی صاحب صحیح معنوں میں کتاب کے خدمت گزار تھے۔

میں جب لاہور حاضر ہوتا تو مولوی صاحب مجھے کوئی نہ کوئی نادر کتاب تحفۃً مرحمت فرماتے۔ ایک مرتبہ جی۔ ڈبلو لائٹنر پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کی مشہور کتاب سنین اسلام کی دو جلدیں مرحمت فرمائیں یہ وہ کتاب ہے جس کی تالیف میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور مولوی غلام مصطفےٰ نے لائٹنر کو مدد دی تھی، اور جس کی زبان کی اصلاح مولانا محمد حسین آزاد نے کی تھی۔ اور اسی کتاب کو دیکھ کر علامہ شبلی نعمانی کو تاریخ اسلام کو جدید انداز میں پیش کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا

ایک مرتبہ مولوی صاحب نے فرانسیسی زبان کی ایک قواعد مرحمت فرمائی۔ جس کا نام "اصول تحصیل لسان فرانسوی" تھا۔ یہ کتاب ترکی زبان میں سلطان عبدالحمید خان ثانی کے عہد میں تالیف ہوئی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی متعدد تصانیف اور تصوف پر متعدد کتابیں بھی مرحمت فرمائیں۔ یہی نہیں وہ میرے دوستوں کے ساتھ بھی یہی طریقہ برتتے تھے میں نے مولوی صاحب کا غائبانہ تعارف اپنے مخدوم حاجی محمد زبیر، سابق اسسٹنٹ لائبریرین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کرا دیا۔ ایک مرتبہ جب حاجی صاحب لاہور گئے تو وہ مولوی شمس الدین صاحب کی دوکان پر بھی گئے۔ انہوں نے میرے حوالے سے ملاقات کی اور دوکان سے کچھ کتابیں انتخاب کیں۔ جب قیمت کا سوال آیا تو مولوی شمس الدین ہیں کہ قیمت ہی نہیں لیتے۔ بالآخر حاجی محمد زبیر صاحب نے کہہ دیا کہ اگر آپ قیمت نہیں لیتے تو میں کتابیں نہیں لیتا۔ پھر خاص رعایت سے کتابوں کی قیمت لی۔

ستمبر ۱۹۶۶ء کے دوسرے ہفتے میں ایک "دوست" کی نظموں کا مجموعہ مکتبہ کارواں سے شائع ہوا۔ چونکہ وہ ایک قسم کا موسمی تحفہ تھا مولوی صاحب نے دس بارہ کتابیں منگوا کر تمام ان احباب میں تقسیم کر دیں جو اس وقت دوکان میں موجود تھے۔

جسے ضرورت ہو وہ لے جائے ورنہ وہاں اللہ تعالیٰ دے ہی دیتا ہے۔

نئے اور ناتجربہ کار ناشروں اور کتب فروشوں کی ہمت افزائی ان کے فرائض میں داخل تھی۔ میرے حلقے کے کئی ایسے حضرات ہیں کہ جنہوں نے کوئی کتاب چھاپی اور مولوی صاحب مرحوم کے پاس ان کی اجازت یا بلا اجازت دس بیس نسخے بھجوا دیئے۔ مولوی صاحب نے ان کو ٹھکانے لگا کر پیسے فراہم کر دیئے۔

ضرورتمند اور صاحب ذوق کو کتاب فراہم کر کے ان کو دلی مسرت ہوتی تھی۔ مولوی صاحب ضرورت مند کی کتاب کی تلاش و جستجو رکھتے تھے اور فراہم ہونے پر بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر معین الحق صاحب کو خزینۃ الاصفیا (مفتی غلام سرور لاہوری) کی سخت ضرورت تھی۔ یہ ضرورت مولوی صاحب کی کتاب میں درج کرا دی گئی۔ مولوی صاحب نے یہ نایاب کتاب تلاش کر کے ڈاکٹر صاحب کو بالکل واجبی قیمت پر پہنچا دی۔ اور یہ بات تو مرحوم نے مرتے دم تک نبھائی۔ مخدوم و محترم حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کو نواب احسن الزماں کی مشہور کتاب "القول المستحسن شرح فخر الحسن" کی ضرورت تھی۔ حکیم صاحب نے مولوی صاحب مرحوم سے کتاب فراہم کرنے کو کہا۔ چنانچہ مولوی صاحب نے کتاب فراہم کر لی اور جب مرض موت میں حکیم صاحب عیادت کے لئے تشریف لے گئے تو مولوی صاحب نے حکیم صاحب کو کتاب کی دستیابی کی اطلاع دی۔ حالانکہ اس وقت ان کی کتاب حیات کا آخری ورق الٹا جا رہا تھا۔

میں نے مولوی شمس الدین صاحب کو ہمیشہ ہشاش بشاش اور خوش و خرم پایا۔ چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ۔ کسی کی چغلی غیبت تو بڑی بات ہے وہ کسی کا نام بھی بغیر احترام کے لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک آدھ دفعہ میں نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب کو کسی کی کوئی بات پسند نہیں ہے تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد اس کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشہروی ان کی دوکان پر مجھ سے ملنے آئے۔ مولوی نوشہروی چونکہ پرانے تعلیم یافتہ اور بڑے آدمی تھے۔ اور پھر کھرے وہابی۔ نیمی کریلا اور نیم چڑھا۔ حاضرین میں سے ایک آدھ صاحب نے مولوی صاحب سے مخاطب ہونے کی کوشش کی مگر مولوی صاحب کب کسی کو خاطر میں لاتے تھے۔ حد یہ ہے کہ انہوں نے منہ پھیر لیا۔ میں نے دیکھا کہ مولوی شمس الدین مرحوم کو امام خاں صاحب کی یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن طرح دے گئے۔ مولوی نوشہروی نے اپنے خاص انداز میں بعض لوگوں پر تنقید شروع کر دی۔ میں نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب مرحوم کو یہ انداز پسند نہیں ہے مگر برداشت کر رہے ہیں۔

مولوی صاحب نے اپنی شخصیت خود بنائی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں موضع کھوڑ تحصیل حویلی (ٹوبہ) میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام احمد علی اور ان کا نام شمس الاسلام تھا۔ بچپن میں داغ یتیمی لگا۔ اعزا اقربا نے دھن دولت کے لالچ میں ان کا چراغ حیات گل کرنا چاہا۔ لہذا یہ اپنے گاؤں سے بھاگ کر وزیر آباد پہنچے وہاں حضرت میاں شیر محمد شرقپوری کے مرید شاہ قمر الدین کی سرپرستی میں لکھنے پڑھنے کا آغاز ہوا۔ پھر لاہور چلے آئے۔ اور مسجد مہران میں خلیفہ نصیر الدین سے فارسی اور عربی پڑھی۔ اور ان ہی کے زیر تربیت رہے۔ عربی و فارسی کی تعلیم ابتدائی منزلوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر مطالعہ، تجربہ، علمی شغف، اور کتابوں کی محبت و تجارت نے ان کو اہل علم کا ہم عصر بنا دیا۔ [illegible]

رف ۱۹۲۵ء) کے حالات میں ایک رسالہ مصباح المشائخ مؤلفہ حکیم محمد ہادی رضا خاں (منبع الطب پریس لکھنؤ ۱۹۲۵ء) مجھے ان کے یہاں ملا جس کو میں نے اپنے قیام گاہ (دولت کدہ حکیم محمد موسیٰ امرت سری) پر لاکر کچھ اقتباسات لئے:۔

مولوی شمس الدین مرحوم کو حنفیت اور نقشبندیت سے گویا عشق تھا۔

مولوی شمس الدین مرحوم کی دوکان اہل علم کا مرکز تھی اور وہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ مولوی صاحب کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ اس میں ہر مکتب فکر و خیال کے لوگ تھے یہ دوکان ایک قسم کا ادارہ تھی جہاں نہ صرف اہل علم کی آمد و رفت رہتی بلکہ مستقل نشست جمتی۔ علم و ادب پر گفتگو ہوتی۔ شعر و ادب پر اظہار خیال ہوتا۔ تصنیف و تالیف کا جائزہ لیا جاتا۔ مصنفین کے تذکرے ہوتے۔ کتابوں کی طباعت و اشاعت پر نقد و تبصرہ ہوتا۔ نفس کتاب پر تنقید ہوتی۔ یوں تو لوگ قاضی عبدالودود (پٹنہ)، مولانا امتیاز علی عرشی (رامپوری)، مالک رام (دہلی)، مولانا غلام رسول مہر (لاہور)، مولانا ماہر القادری (کراچی) جیسے نقادان علم و ادب کے تبصروں سے گھبراتے ہیں مگر میں مولوی شمس الدین مرحوم کی دوکان کو سب سے بڑی نقد گاہ سمجھتا تھا۔ وہاں مختلف حضرات ایک نشست میں ایک کتاب پر بڑی جچی تلی رائے کا اظہار کرتے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ اگر "ادارہ شمسیہ" میں کتاب پسند کرلی گئی تو علمی حلقوں میں باریابی کی مستحق ہوگئی اور ظاہر ہے کہ ادارۂ شمسیہ کے مستقل صدر تو مولوی صاحب ہی تھے۔

وہاں قدیم تعلیم یافتہ مدرس بھی پہنچتے تھے اور کالج و یونیورسٹی کے فارغ التحصیل پروفیسر اور ڈاکٹر بھی۔ یہی وہ مرکز تھا جہاں قدیم و جدید تعلیم یافتہ پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے۔ اور علم و ادب کے گوہر لٹاتے تھے۔ اگر وہاں مفتی سیاح الدین کاکاخیل (لائل پور)، مولانا احمد حسین بخاری (راولپنڈی)، مولوی شریف احمد شرافت نوشاہی (الحمۃ عالیہ)، شاہ بشیر گیلانی، مولوی محمد بخش مسلم بی اے۔ مولانا محمد عبدہ، حکیم محمد موسیٰ امرتسری۔ مولوی امام خاں نوشہروی اور مولوی عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ملیں گے تو ان کے ساتھ ہی پروفیسر مخدوم غلام محی الدین، پروفیسر علم الدین سالک، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فقیر محمد (بابائے پنجابی)، ملک عبداللطیف۔ علامہ اقبال احمد فاروقی۔ احسان دانش اور عتیق فکری (ملتان) بھی ملیں گے۔ بہت سے وہ بزرگ جن سے کراچی میں بسا اوقات ملنا دشوار ہوتا تھا ان سے لاہور میں مولوی شمس الدین مرحوم کی دوکان پر ملاقات ہونی ممکن تھی۔ ان میں ممتاز حسن، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر معین الحق، لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید وغیرہ قابل ذکر ہیں خواجہ رضوانی، محمد عالم مختار حق، چودھری بشیر احمد خاں وغیرہ تو اس ادارے کے مستقل حاضر باش ممبر ہیں۔

مولوی شمس الدین صاحب خاکسار کی کتابوں کی خاص جلدیں بندھواتے تھے۔ پھر میں نے یہ خود التزام کرلیا کہ خاص جلدیں بندھوا کر ان کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ اور وہ ان کتابوں کو قبول فرماکر مسرت کا اظہار فرماتے تھے۔

مولوی شمس الدین مرحوم راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نہایت غیور اور خوددار تھے۔ ایک مرتبہ میں نے بعض کتابوں کے متعلق عرض کیا کہ یہ کتابیں آپ فلاں لائبریری میں کیوں نہیں دیدیتے۔ وہاں ان کی قیمت اچھی مل جائے گی۔ مسکراکر خاموش ہوگئے۔ پھر اصرار کیا تو فرمایا بھئی قادری صاحب: وہاں کی پابندیاں میرے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ ... پہلے اطلاع کرائی جائے۔ پھر دو گھنٹے کے بعد شرف باریابی حاصل ہوگا۔ ایک خاص وقت پر کتابیں ملاحظہ فرمائی جائیں گی۔ پھر ان کی جرح قدح کی عادت۔ لہذا میں باز آیا ایسی تجارت سے۔

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

فنکار کا شباب

فنکار کا دل ایک شمع روشن ہے۔ جب تک وہ ادبی تخلیق کا عمل کرتا ہے وہ جواں سال رہتا ہے اس کے پاس کبھی بڑھاپا نہیں آتا۔ اس کو صرف ایک چیز نقصان پہنچا سکتی ہے، وہ ہے اس کے اندر کے شعلۂ جوالہ کا بجھنا! اور اس کے پیام کا اختتام۔ اس کو خود اس کا علم نہیں کب اس کے دل کا شعلہ بھڑک اٹھے گا اور کب اس کی طبیعت معمولی ادبی تخلیق سے قاصر رہے گی۔ جب بھی وہ ادبی تخلیق کرتا ہے اس کا قلب جوان ہوتا ہے۔ اس کو اس کے اندر کے ابلتے چشمے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اسی چشمے سے اپنے فن کا مواد اخذ کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے اندر کی دنیا روشن ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پیسے کے لئے لکھنے سے ادب پستی کی طرف مائل ہو جاتا ہے مگر ایسا نہیں۔ دیکھئے بیتھوون نے اپنی نویں عظیم سمفنی ۵۰ سکوں کے عوض بنائی تھی۔ اسی طرح شکسپیر اپنے فکاہی ڈراموں میں عوام کو خوش کرنے کے عناصر محض اس لئے پیش کرتا تھا کہ اس کو کچھ پیسے مل جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اندر عظمت بھری ہے تو وہ ہر صورت میں ظاہر ہوگی۔ اس لئے کہ فن کار کا دل جوان ہے۔ آج ستر برس کے فراق کی غزلیں دیکھئے کہ جوانی کے نشے سے لبریز ہیں۔ جوانی کا مظاہرہ محض عشقیہ جذبات میں نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ فن؟ جوں جوں عمر بڑھتی ہے فن کا شباب دوآتشہ ہوتا جاتا ہے۔

ٹالسٹائی کے ایک سکریٹری نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہ نوجوان تھا، یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی تھی کہ اس کو ٹالسٹائی کی خدمت کے لئے طلب کیا گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ میں ٹالسٹائی سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے گاؤں گیا ہے جہاں اس کی کافی وسیع کاشتکاری ہے۔ میں وہاں گیا۔ یورپ کے اس عظیم فنکار و مفکر کے بارے میں عظمت و جلال کے جذبات میرے دل میں موجزن تھے۔ میں گاؤں پہنچا اور اس کے گھر کی تلاش میں چلنے لگا۔ پتا چلانے کے لئے میں نے ایک شخص سے دریافت کیا جو ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی اور اس کے سر کے بال سفید تھے۔ اپنے لباس سے بھی وہ کسان معلوم ہوتا تھا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں۔ میں نے کہا میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ٹالسٹائی اس وقت گھر میں ہوں گے یا کھیت میں؟ اس نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ محبت سے بٹھا کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ جب میں اس سے ذرا مانوس ہو گیا تو اس نے چپکے سے میرے کان

ق ہو گیا کہ مولوی شمس الدین اور کتابیں لازم و ملزوم تھے، نادر و نایاب کتابوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس کی تڑپ میں بھوپال یدر آباد دکن تک پہنچے۔ مغربی پاکستان کے دیہات و قصبات میں پہنچتے اور نایاب چیزیں تلاش کر کے لاتے۔ یہی سبب تھا کہ ابوں کے شیدائی مولوی صاحب کو گھیرے رہتے۔

مولوی شمس الدین صاحب اچھے بھلے تھے کہ دفعۃً فالج کا دورہ پڑا اور چٹ پٹ ڈھائی تین دن میں اپنی کتاب حیات ختم رکے دار الخلد کی راہ لی اور حضرت شیخ طاہر بندگیؒ کے قرب میں آرام فرما ہوئے۔ مولوی صاحب مرحوم اپنے احباب اور دوستوں ، دل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی محبت و خلوص کا غیر فانی نقش چھوڑ گئے۔ عزیزوں اور دوستوں نے ماتم کیا۔ احباب شکبار ہوئے۔ شناسا جان پہچان والے بھی غم میں ڈوب گئے۔ دوستوں نے اپنی عقیدت کے پھول تحریر کی صورت میں، ختلف رسائل و جرائد جنگ، کراچی (احمد ندیم قاسمی) نوائے وقت لاہور (عبدالقادر حسن) کوہستان لاہور (محمد عالم مختار حق) مان لاہور (عابد نظامی) لاہور، لاہور (مولوی مسعود الرحمٰن) سواد اعظم لاہور (مفتی محمد حسین نعیمی) الاعتصام لاہور (رانا یر الٰہی) تبصرہ لاہور (مرزا جانباز) اور مجلہ طبیہ لاہور (حکیم محمد موسیٰ امرتسری) کی وساطت سے تیار کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ستان اپنے ایک عظیم فرزند سے محروم ہو گیا۔ اے مرنے والے اللہ تعالیٰ تیری تربت کو نور سے بھر دے اور جنت میں تیرے اتب بلند کرے۔ آمین۔

معین الدین دردائی

بہار کی ایک قدیم مثنوی

ہیر رانجھا

مصنفہ میر فضل علی

اس مثنوی پر دردائی صاحب کا مفصل مقدمہ جنوری ۶۸ء کے قومی زبان میں شائع کیا جاچکا ہے۔ اس مثنوی کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر ادارۂ قومی زبان کی درخواست پر دردائی صاحب نے اس کا متن بھی عنایت فرمایا ہے جسے یہاں شائع کیا جاتا ہے۔ اردو زبان و ادب کے محققین کے لیے یہ مثنوی بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اس سے اردو زبان کی تاریخ کی ایک گم شدہ کڑی کا سراغ ملتا ہے۔

ارے دل غور کر کیا کیا مزا ہے ۔۔۔ جدھر ہوں دیکھتا میرا خدا ہے
جو دیکھا ہر طرف ساری خدا ہے ۔۔۔ نہیں ذرہ کوئی اس سے جدا ہے
وہی ہر ایک کا مقصود جاں ہے ۔۔۔ نہاں آنکھوں سے گو سب پر عیاں ہے
اسی کے نور سے شمس و قمر ہے ۔۔۔ اسی کا نور ہر جا جلوہ گر ہے
وہی دریائے دل میں موج زن ہے ۔۔۔ اسی کے رشحے سے رنگیں چمن ہے
دلا کیا جلوۂ نور خدا ہے ۔۔۔ کہ جس کا شمہ یہ ارض و سما ہے
کیا ہے اس نے حسن و عشق پیدا ۔۔۔ دو عالم کو کیا ہے مست و شیدا
خدا عاشق ہے اور معشوق احمد ۔۔۔ خدا مطلوب اور طالب محمد
یہ کلمہ مشتہر ہے ہر طبق میں ۔۔۔ کہا لولاک حق نے اس کے حق میں
نہیں جبریل کو جس جا رسائی ۔۔۔ لیا اس جا میں جا فرماں روائی
کہاں جبریل کو یارا ہے اس جا ۔۔۔ رسائی ہو جہاں [illegible]

کہ میں ہی ٹالسٹائی ہوں۔ سکریٹری لکھتا ہے کہ بعد میں ہم دونوں اس طرح ایک دوسرے سے گھل مل گئے کہ ہم کو ایسا محسوس ہونے لگا گویا ٹالسٹائی بھی ہماری طرح ۲۰ سالہ جوان ہے۔ اور ہم دونوں کی عمریں ایک ہیں۔ دونوں ساتھ رہتے، ہنستے اور یکسانیت محسوس کرتے۔

اسی طرح محسوس ہوتا ہے کہ گوئٹے کا دل بھی آخر تک جوان تھا۔ اس کی عمر ۸۰ برس کی تھی اس نے یہ محسوس نہ کیا کہ وہ بوڑھا ہے، اور وہ ایک ۱۹ برس کی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ لڑکی حسین تھی اور گوئٹے کا عشق شدید تھا۔ اس کے دوستوں نے عبث کوشش کی کہ اس کو عشق سے اس عمر میں باز رکھیں۔ اس کی آرزو اور خواہش اس لڑکی سے شادی کی بڑھتی گئی۔ اس کے دوستوں نے اس کو غلط سمجھا۔ ان کو شاید یہ معلوم نہ تھا کہ فنکار کا دل کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

ہائینی HEINE نے گوئٹے کا مقابلہ کرنا چاہا۔ ہائینی ایک نوجوان شاعر تھا۔ اور گوئٹے بوڑھا۔ جب وہ آیا اور گوئٹے کے ہاں جانے کی اس کو اجازت ملی تو گوئٹے نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اور چپکا بیٹھا رہا۔ ہائینی جب وہاں سے باہر نکلا تو اس نے کہا کہ گوئٹے والے ایک خالی مہمل کچھ نہیں! یہ ہائینی کی غلطی تھی، اس نے صبر و انتظار سے کام نہ لیا ورنہ گوئٹے کی عبقریت اس کی نگاہوں کے سامنے ضرور بے نقاب ہوتی۔

فنکار اپنے جوان دل سے زندگی کی عظمت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور اس کے دل کی طرح اس کی ادبی تخلیق ہمیشہ ہمیشہ جواں سال اور اببہار رہتی ہے۔

علامہ شبلی کی اردو فارسی کی شاعری جس کا اکثر حصہ ان کی عمر آخر کی یادگار ہے۔ نہایت حسن و رعنائی کا ترجمان ہے۔ اس سے میرا مدعا ایک خاص لیلیٰ کی حمایت نہیں۔ اس لئے کہ میرے نزدیک تو علامہ کی برات کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کے بدترین دشمن تک ان کے لبنیٰ جانے لیس کہنے کو کوئی غلط رنگ نہ دے سکے۔ حالانکہ ندوہ سے ان کو نکلوا تک دیا۔ اگر وہ کوئی حقیقت ہوتی تو اس کو سب سے پہلے یہی لوگ طشت از بام کرتے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ علامہ شبلی ادیب جواں سال تھے، خود حالی نے جوانی گزر جانے کے بعد مسدس لکھی اور بقول انہی کے باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ اور ایک اعلیٰ فن و فکر کا نمونہ انہوں نے پیش کر دیا۔ خود علامہ شبلی کا آخری کارنامہ یعنی سیرت النبی علمی و ادبی شاہکار ہے۔ برس کے بوڑھے نے ایسا کارنامہ پیش کر دیا جو دلوں کی حرارت اور آنکھوں کی روشنی ہے۔ کیا خوب خود ہی فرمایا ہے۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت خیرالوریٰ شبلی
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ادبی تاریخ ایسی مثالوں سے پُر ہے۔ بوڑھے معذور غالب کے خطوط بستر مرض سے حسن و جوانیٔ فن کا شاہکار بن کر نکلتے تھے۔ سرسید کی آخری کارنامے اردو کی پیشانی کا نور ہیں۔ جسم بوڑھا ہوتا ہے فنا ہوتا ہے مگر ادب جوان رہتا ہے اور دوسروں کو پیام شباب دیتا ہے۔

ہے ایک کشتی نہایت خوبصورت — اور اس کی مانگ ہے پچھنے کی صورت
نہیں اُس پر کسی کی ہے سواری — مگر ملاح کو ہے انتظاری
جو دیکھا صورت محبوب خوابی — کیا چڑھنے کی کشتی پر شتابی
کہا ملاح سے اے کھینے والے — ذرا کشتی پہ مجھ کو بھی بٹھالے
کہا ملاح نے سن اے دیوانے — یہ کشتی دوسرے کی ہے بگانے
میں ہوں بیٹھا ہوا کشتی پہ تیار — یہ کشتی جس کی ہے وہ ہوئے سوار
سنا ہے صاحب کشتی نسا ہے — تیرے چڑھنے کی کب کشتی پہ جا ہے
بھلا تجھ کو چڑھاؤں کس طرح سے — جگہ اُس کی دکھاؤں کس طرح سے
تب اوس دم عاشق دل خستہ و زار — لگا کہنے کو با آہ شرر بار
نہیں مجھ کو چڑھا لیتا ہے ماجھی — فریب اس بات میں دیتا ہے ماجھی
لگا تب بانسلی اپنی بجانے — دل ملاح منکر کو رجھانے
بجائی بانسلی ایسی ہی اوس جا — ہوا ماجھی صدا پر اوس کے شیدا
کیا موقوف جب بنسی بجانا — ملا ملاح کے دل کو ٹھکانا
بہت خوش ہو لگا کہنے کو بہتر — بٹھاؤں گا تجھے کشتی کے اندر
یہ کشتی گر چہ ہے گی دوسرے کی — جب آوے گی وہ اس پر تب چڑھے گی
تو آ رے یار تجھ کو میں چڑھاؤں — مزا کشتی کے چڑھنے کا دکھاؤں
ذرا ابھی عشق کا سر درد شیدا — چڑھا کشتی پہ ہو مخمور شیدا
مکرر پھر لگا بنسی بجانے — ہوا ملاح کا دل بے ٹھکانے
صدا بنسی کی پھر اوس نے جو کی گوش — اوڑا ایک بار اوس کے سر سیتی ہوش
دل اوس کا مست ہو کر ملک شن کو — کیا یوں چھوڑ جوں بلبل چمن کو
ملی ماجھین کو فرصت اوس گھڑی آپ — کہ تھی یک کوٹھری کشتی جا گہ
پلنگ اوس میں سنہری یک دھری تھی — .... زری کا کہ وہ بھی تھی
منقش تکیہ اور توشک زری کا — پلنگ اوپر قرینے سے لگا تھا
فراغت سے وہ لیٹا اوس پلنگ پر — دوپٹا ایک دھانی منہ پہ رکھ کر
کبھوں کیا اس گھڑی نے کے من بھین کر — رکھے دھانی دوپٹا گورے تن پر

مکانِ لامکاں اس کا نشاں ہے ... زبان نعت

جہاں ہے جلوۂ ذاتِ محمدؐ
دو عالم پر توِ یک نورِ احمد

وا محمد رحمت اللعالمیں ہے
جنکی جبین دل پہ عالم کی جبیں ہے

درود حق سدا ہو جس پہ نازل
سوئے اب مدح میں ہیں اس کے مشکل

زبانِ خام کو طاقت کہاں ہے
کرے نعت اس کی جو معجز جہاں ہے

درود حق سدا بر جان او باد
دگر بر آل و بر یاران او باد

اب آگے نکتہ پردازے فسانہ
کرے تحریر قصہ عاشقانہ

اسی پردہ زمیں پر یک جواں تھا
کہ رانجھی نام عالم میں عیاں تھا

وہ تھا باشندۂ تختِ ہزارہ
بھرا تھا حسن سے تن اس کا سارا

بہ ملک خویش چوں خورشید او بود
جمال نازنیناں صید او بود

اسی خورشید کا یہ ماجرا ہے
کہ اک شب خواب میں کیا رونما ہے

کہ ہے دریا کنارے ایک کشتی
اسی کشتی میں ہے حورِ بہشتی

اسی دم عشق میں سرشار ہو کر
تو کیا ہے دیکھتا بیدار ہو کر

نہ وہ کشتی نہ وہ دریا نہ وہ حور
دریغا پڑ گیا اس حور سے دور

لگا کرنے وہاں وہ آہ و نالہ
عجب احوال تھا اس جا میں اس کا

لگا کہنے کہ رب العالمینا
کیا اس خواب نے دشوار جینا

تو کر اس راہ کی اب رہنموئی
کیا اس خواب نے مجھ سے زبونی

اگر ہم سے جدا ہو نا وہ خواب
نہ آتا ابر میں میرا وہ مہتاب

دعا یہ کر کے حق سے با دلِ زار
چلا ادھر جدھر تھی کشتی یار

ولے سچ اس طرح اپنی بنائے
بہارِ حسن جیوں گلشن میں آئے

رکھا چیرا زری کا سر کے اوپر
خیالات اس پری کا دل میں لے کر

کمر باریک پر کا جہا چڑھا کر
گلے دھانی دوپٹا یک لگا کر

سنہری بانسلی ایک ہاتھ میں لے
جہاں بے تاب ہو جس کی ندلے سے

چلا دریا طرف روتا دیوانا
و رونا اور ہنسی کا بجانا

لب دریا پہ جا بیٹھا دارش
تو کیا ہے دیکھتا وہ رفتہ از خوش

مقرر تشنۂ دیدار ہے یہ — نشہ میں عشق کے سرشار ہے یہ
یہ متوالا برہ کا ہو رہا ہے — اسی کے واسطے یہاں سو رہا ہے
غرض ہیر عشق کی ماتی کھڑی تھی — یہ باتیں ہر کسی کی سن رہی تھی
چلی اوس جا سے پھر وہ تلملاتی — دو آنکھوں مست و شہلا رنگ زاتی
جہاں دلدار تھا آرام کرتا — رکھے منہ پر وہ دھانی سا دوپٹا
وہ لیٹا جس جگہ تھا ماہ انور — پہنچ کر وہ دل شیدا و مضطر
دوپٹا اوس کے منہ پر سے اوٹھایا — دکھایئں سبز منہ پر سے ہٹایا
موندی تھی آنکھ دل اوس کا تھا بیدار — ہوا تھا عشق کے فن میں وہ ہوشیار
کھلی جب آنکھ تو کیا دیکھتا ہے — سرہانے یہ بیٹھی دل رہا ہے
یہ وہ ہے جس کو دیکھا خواب میں تھا — غرض بے تاب ہو اٹھ کر کے بیٹھا
جو سوچا عشق سے اوس کو نظر بھر — گرا مدہوش ہو کر پھر پلنگ پر
نشہ میں عشق کے یہ سوجھتا ہے — یہ ملک دلبری میں بادشا ہے
نہیں لیلیٰ اسے کہنا روا ہے — کہو کیا اس کو اسرار خدا ہے
عجب ہے شکل اس گل کی انوکھی — یہ شیریں سے زیادہ ہے گی میٹھی
جو دیکھے گا اسے برباد ہوگا — مثال کوہ کن فرہاد ہوگا
زلیخا بھی نہیں پاوے گی اوس کو — نگاہوں میں کبھی بھاوے کی اوس کو
زلیخا اوس کے جلوہ میں نہاں ہے — مگر یہ یوسف ثانی یہاں ہے
نشہ میں عشق کے یہ سوجھتا تھا — جو اتنے میں پلنگ پر اوٹھ کے بیٹھا
نگہ کی برچھیاں چلنے لگیں پھر — دل عشاق میں رہنے لگیں پھر
لگے دونوں کے دل میں عشق کے تیر — ہوئے گھائل نگہ کی کھا کے شمشیر
تڑپتے تھے وہ دونوں اوس جگہ پر — جو اتنے میں سہیلی ایک آکر
لگی اوس ہیر سے کہنے کو یہ بات — زیادہ یہاں کے رہنے میں ہے آفات
پدر تیرے نے جلدی تھا تلایا — مجھے چلتے ہوئے تھا یہ جتایا
تو لانا ہیر کو میرے شتابی — وگرنہ ہوگی سب کی خرابی
اگر اوس کو زیادہ دیر ہوگی — تو میں آؤں گا وہاں مرنے کے جوگی

جو موج عشق پر اوس کے نظر کی — لہر جون سبز پانی میں قمر کی
عجب کچھ حسن کا دریا ہے یارو — اسی سے دو جہاں برپا ہے یارو
اسی کے شوق میں ارض و سما ہے — تعشق مرکب راہ خدا ہے
وہ کشتی جس کی تھی نام اوس کا تھا ہیر — کیا قصد اوس نے گھر سے برلب نہر
چلی جس دم وہ دریا کے کنارے — کرشمہ ناز سے قد کو سنوارے
ہزاروں ساتھ لے اپنے سہیلی — کوئی بیلی تھی اور کوئی چنبیلی
وہ پہنچی اوس طرح دریا کنارہ — کہ جیوں چاروں طرف مہ کے ستارہ
جو پہنچی پاس کشتی کے وہ مہرو — تو کیا ہی دیکھتی ہے ایک جوان کو
دوپٹا اوڑھ سویا ہے پلنگ پر — رخ اوس کا ہے گا جوں ماہ منور
ہوئی تب ہیر دل میں مست شیدا — لگی یہ سوچنے کیا ہے خدایا
میری کشتی میں یہ دلدار کیا ہے — مرے مولا تیرا اسرار کیا ہے
کہا کس سی نے سن اے مہر انور — یہ ہے سالار جنوں کا مقرر
ترا بے ہوش کیوں مانجھی پڑا ہے — سے جن کا مگر یہ دلربا ہے
ترے مانجھی پہ سایہ ہے اسی کا — ترا مانجھی ستایا ہے اسی کا
اسی کے واسطے بے ہوش ہے وہ — اسی کے سایہ میں مدہوش ہے وہ
کسی نے آ کہا جھوٹی ہے بہنا — کرو موقوف جن کا نام لینا
مگر اس کا کنہیا نام ہے گا — سجانوں کیا ایسے یہاں کام ہے گا
سرہانے بانسلی کی ہے نشانی — مقرر یہ کنہیا ہے دیوانی
جبھی وہ دیکھتا ہے خوبصورت — ذرا اپنی دیکھا محبوب صورت
نشے میں عشق کے مخمور کرنا — محبت اپنی میں مسرور کرنا
مقرر ہیر کو دیکھا کہیں ہے — اسی کے واسطے سویا نہیں ہے
پلنگ پر اس کا سونا ہے بہانا — مگر ہے ہیر کو صورت دکھانا
دیکھا صورت بھلی اپنی نہ مانی — کیا ہے ہیر میرے کو دیوانی
کسی نے آ کہا اندھی ہوئی ہے — یہ ہے عاشق کسی کا آدمی ہے
کسی کے دیکھنے کا ہے پیا سا — [illegible]

مرے دلدار کو تو نے بلایا
میں ایسے درد کے درماں کو پایا

بدل ہوتی نہایت شاد و خرم
نثار ہوتی تھی دل سے اوس پہ ہر دم

کہیں وہ شوق میں انگڑائیاں لے
نگہ کرتی اوسے جمہوائیاں لے

کہیں جوبن کی لہریں دل سے بھرتی
کہیں زانو پہ اپنے سر کو دھرتی

کہیں آنکھوں سے نیند اوس کے فنا ہو
اوسے برآں جگاتے روز شب کو

کہیں ہے فکر میں رانجھی کے بے خواب
کبھی ہوتی تھی اوس کے غم میں بے تاب

کہیں بے باک ہو اوس کو سناتی
اسے رانجھی تجھ بیاں پھٹتی ہے چھاتی

وہ رانجھو تھا مقید نوکری کا
مگر باطن میں تھا قیدی اوس پری کا

پدر جب ہیر کا اوس خوش جواں کو
پہنچاتا کام پر بعض مکاں کو

جدائی اوس کی سے تب ہیر روتی
غم فرقت میں رو رو جان کھوتی

کبھی کہتی کہاں ہے وہ خدایا
مجھے جس نے لب دریا ستایا

جنھوں نے کشتی پر انکھیاں لڑائی
مرے سکھ چین کی کشتی ڈوبائی

دیا ہے دل کو میرے بے حواسی
رہوں ہوں میں سدا جیسے اداسی

جب آتا تھا فراغت کام سے کر
بہانے سے بلاتی تھی وہ اندر

سدا اوس قوم میں تھی بے حجابی
نہیں اس واسطے رانجھن سے چھپتی

جو کوئی کام ہوتا تھا وہ دلگیر
چلا جاتا تھا رہتی تھی جہاں ہیر

نگاہیں اوس گھڑی دوچار ہوتیں
نگہ کی برچھیاں دل پار ہوتیں

برہ کے آگ میں دونوں تھے جلتے
تپ غم میں سدا دونو تھے گلتے

محبت کا سخن تھی رفتہ رفتہ
کھلا آخر کو یہ راز نہفتہ

کسی نے جا کہا اس کے پدر کو
کہ کچھ بھی دیکھتا ہے اپنے گھر کو

تری دختر جو ہے تیری پیاری
برہ کا ہے اوسے آسیب بھاری

رہی ہے عشق کے آتش میں جلتی
بسان شمع سوز غم سے گلتی

کبھی وہ دل سے آہیں سرد بھرتی
کبھی چپکے ہے درد غم میں مرتی

کبھی وہ دیکھتی ہے آسماں کو
نگہ کرتی کبھی سر جہاں کو

سراسر اوس کے دل میں ہے اداسی
وہ ہے دیدار رانجھی کی پیاسی

چلا آؤں گا میں دریا کنارے — اگر اوس کو تو ہاں دیری لگا رے
سنی جو ہیر نے یہ بات اوس کی — لگی آنکھوں سے کرنے خون جاری
لگی تب پوچھنے نام اوس جواں کا — جواں بولا ہے میرا نام رانجھا
لگا تب پوچھنے وہ ہیر سے نام — بتایا ہیر اپنا نام خوش جام
بتا کے نام تب ڈر سے پدر کے — چلی گھر کو کہا رانجھی کو رانجھی
توں بیٹھا رہ ایسی دریا کنارے — بولا بھیجوں گا میں تجھ کو بھی پیارے
یہ باتیں سن کے رانجھی کچھ نہ بولا — لگا رونے بہا دل کا پھپھولا
اوتر کشتی سے دریا کے کنارے — کہا دل بیٹھ ٹک اس جا میں بارے
گئی یہ بات کہہ جو ہیر گھر کو — گیارہ بیٹا رانجھی بھی سر کو
جو پہنچی ہیر خدمت میں پدر کے — لگی کہنے سنا کے یہ پدر سے
کہ ہے ایک دریا کے کنارے — نپٹ افلاس میں بے روزگاری
کچھ اوس کو شوق ہے یاد خدا کا — مقرر ہے گا وہ صالح سدا کا
اگر نوکر رکھو اوس کو بلا کر — تجھے اقبال سے دے گا ملا کر
سبھی اوس میں ہے خوبی کی نشانی — نہیں ظاہر ہے اوس سے بدگمانی
قدم اوس کے بڑا ہیں برکت کے آثار — ہے گھر کے بیچ رکھنے کا سزاوار
پدر یہ بات میری مان لیجے — جو اس کے نوکری کا حکم دیجے
پدر نے تب کہا خوش ہو کے بہتر — کہاں ہے وہ جواں اے میری دختر
کہا تب ہیر نے دریا کے وارے — پریشاں خستہ او بے روزگارے
دیا ہے نوکری کا اوس کو دعا — رکھو جا کر اوسے جلدی سے بلوا
بتا اوس کا پدر نے اوس سے سن کر — بلانے کو پہنچایا ایک نوکر
بلالایا اوسے نوکر وہاں سے — بٹھایا ہیر کا تھا وہ جہاں سے
بتایا ہیر نے تھا جو ٹھکانا — وہ بیٹھا تھا وہیں بے آب و دانہ
لگا تب پیار سے نوکر جواں کو — ذرا سمجھا نہیں راز نہاں کو
ہوئی خوش ہیر اوس دم دل میں اپنے — لگی شکر خدا دل بیچ جپنے
لگی کہنے کو یوں بار خدایا — ہوا تیرے کرم کا مجھ پہ سایا

کیا خط نے بدل مسرور مجھ کو بہت بہتر ہوا منظور مجھ کو
۲ یہاں جلدی سے میں شادی کی خاطر کروں اسباب سب ہر نمط حاضر
وہاں تم کیجیو سامان شادی رہے باقی نہ کچھ ارمان شادی
جواب اوس آدمی کو لکھ بلایا لکھا جو کچھ کہ تھا وہ کہی سنایا
دیئے خط ہاتھ میں اوس کو کہا تب لکھا جو کچھ کہ تھا تم کو کہا سب
لکھا جو کچھ کہ ہے اوس خط کے اندر بیان کیجو زبانی کہن مقرر
کہ جس میں جلد ہو شادی کی باری یہی ہے دل کو میرے انتظاری
کیا رخصت یہ کہہ کر آدمی کو چلا وہ آدمی دل بیچ خوش ہو
دوا دو جلد پہنچا ہیر کے گھر دیا جو کچھ کے لایا تھا سمجھ کر
پدر نے ہیر کے جب خط کو دیکھا لگا تب مارنے وہ دم خوشی کا
پکارا ہے کوئی باہمن بلا لا لگن ہے مجھ کو پیاری کا دھرانا
وہیں ایک آدمی باہمن کو جا کر کیا حاضر شتابی سے بلا کر
برہمن کو بٹھایا پاس اپنے لگا ماں برہمن بیٹھ جپنے
پدر تب ہیر کا ہو کر کے خوشتر لگا یوں پوچھنے کہ روز بہتر
کہو دن کون بہتر بے خلل ہے کہا کون بے رنج و زلل ہے
برہمن نے جو پترا کھول دیکھا زحل اور مشتری کا کر کے لیکھا
بٹھایا ماہ مہیر کا ترینا یہ بیسا کھ ہے خوشتر مہینا
اوسی کے ساتویں منڈوار چانا ہے پہلا رسم شادی کا ٹھکانا
اور ہشتم کیجو تیاری کندوری بہم دختر کے ہو سب بات پوری
برہمن نے لکھے جب دن لگن کے کیا رخصت جو دینا تھا اوسے دے
برہمن تب گیا خوش ہو کے گھر کو پدر نے ہیر کے دل بیچ خوش ہو
تعیش روز کر سمدھی کو پہنچا وہ سمدھی اوس کے نے بھی خوب سمجھا
ہوئی جب بات اوسے منظور شادی لگی شادی کی ہو نیکو تیاری
بجا مردنگ ڈھولک اور نقارا کیا شادی کا جو تھا رسم سارا
دیا تب سونپ اوس دختر پری کو بدست نوشہ ملبس زری کو

سنا جو باپ نے اوس کی کہانی — کچھ اور ہی مدد اپنے دل میں ٹھانی
کیا اس کا تقرر ایک جگہ میں — جو اپنا قوم تھا اوس کی نگہ میں
سنا جب ہیر نے اس ماجرا کو — کہا رو رو کے تم میرے پدر ہو
تقرر نہ کیجئو تم ٹھکانا؟ — میرا دلدار ہے رانجھی دیوانا
پدر نے ہیر سے یہ بات سن کر — جھڑک کر یہ کہا کم بخت ابتر
یہ کیا کہتی ہے باتیں ابتری کی — نہیں یہ طور گھر کی بہتری کی
کہا تب ہیر نے اپنے پدر کو — مٹا دے کون جو کچھ کہ لکھا ہو
کبھیں رانجھی کو یاں چھوڑوں کہلا اب — اگر ہو سر پہ میرے سو بلا اب
میں اوس پر ہو رہی ہوں گی دیوانی — نہیں کٹنے کی اوس بن زندگانی
نہیں ہے کچھ ہمارا اس میں چارا — کہ تیجوں دل سیتی رانجھی پیارا
آفنگ عشق سے صیدی ہوئی ہوں — برہ کے بند میں قیدی ہوئی ہوں
پدر نے اوس کے دل کی کہہ پہچانا — اوٹھا چپکا وہاں سے ہو روانا
گیا خلوت میں یہ تدبیر کرنے — منگا کاغذ کو یہ تحریر کرنے
لکھا سمدھی کو خط اے قدردانا — پسر کے بیاہ کا کیجے ٹھکانا
تقرر ہو چکا اب بیاہ کیجے — پسر اپنے کا اب ہر ماہ کیجے
شتابی بیاہ کر دینا بھلا ہے — خدا جانے کہ آگے کیا بدا ہے
ادا میں بالا دختر سے بھی ہو گا — خدا جانے بچوں گا یا مرونگا
جو اں اب ہو گئی میری پیاری — کرو پیارے کے شادی کی تیاری
لکھا خط اور پکارا آدمی کو — دیا کر کے اشارا آدمی کو
کہ جا دے کے خط تم اوس نگر میں — میری دختر ہے مانگی جس شہر میں
لیا خط کو ہوا آدم روانا — وہاں پہنچا جہاں کا تھا ٹھکانا
جو پہنچا جا کے آدم اوس نگر میں — دیا جا کر کے خط سمدھی کے گھر میں
جو سمدھی اوس کے نے مضمون جانا — ملا اوس کو عبارت کا ٹھکانا
لکھی خط میں جو تھی شادی کی باتیں — نکالی پیچ کرنے وہ نشانیں
جواب اوس کا لکھا اکرام فرما — ہوئی جو ہو گئے تم ارقام فرما

جہیز اوس کو جو دینا تھا دیا سب — جو کچھ تھا رسم رخصت کا کیا سب
وہ تھا ایک رسم اوس فرقہ میں نیارا — کر دیتے رخصتی میں ایک نقارا
دیا تھیا نقارا ایک بھاری — و بیٹھا ایک شخص سے نا حد خواری
دیا اوس نے نقارے کو اٹھا کر — زمیں سے عاشق رانجھی کے سر پر
وہ رانجھی دل میں اپنے شاد ہو کر — نقارا کو اٹھا خوش ہو کے لے کر
چلا شکر یہ خدا ہر آن کرتا — فدا اوس دل ربا پر جان کرتا
کہا کہ میں چلا ہوں با پیادا — میری محبوب ہے اوپر محافہ
مری وہ شاہزادی کا میں غلام ہوں — اور اوس کی ...... تیز گام ہوں
نقارا کے اٹھانے کا اجور ا — ہے لینا ہیر شہزادی سے پورا
خدایا ہیر سے مجھ کو ملانا — نہیں ہے کچھ کہیں مرا ٹھکانا
میں اوس کے واسطے ہوں گا فقیری — کیا ہے بھول کر ساری امیری
سبھی آرام دوں گا چین اپنا — کیا ہے جھوٹ یا کہنہ دیکھو سپنا
یہی تھا دل میں رانجھی کے تصور — جو دیکھا ایک آدم کے نظر بھر
عجب ہے قدرت مولا نمودار — نقارے کا عجائب ہے گا اسرار
چلا جاتا ہے سر سے اوس کے بالا — عجب اسرار حق ظاہر ہے اوس جا
گیا اس طور سے دو کوس تک جب — کیا ڈیرا کسی جاگہ میں یک شب
اوسی شب کو پدر سے ہیر کے جا — کیا ظاہر کسی نے حال اوس کا
نقارے کے اٹھانے کا وہ مزدور — نہایت ہے کرامت بیچ مشہور
دیا اوس کو جو بوجھا ہے ڈہل کا — مرے نزدیک ہے موجب خلل کا
ڈہل جاتا ہے اوس کے سر سے برتر — وہ ہے مرد سے خدا کوئی مقرر
اگر بیگار کوئی دوسرا ہو — تو بہتر ہے تیرے حق میں بھلا ہو
پدر نے ہیر کے یہ بات سن کر — کہا اوس شخص سے رانجھی ہے ساحر
نہیں رانجھی کا اب جانا روا ہے — جہاں بیاری کا بیرے سا ہوا ہے
کیا محروم اوس کو نوکری سے — نقارے کو بجاؤں گا کسی سے
یہ کہہ کر ایک نوکر کو بلایا — نقارے ... ...

ہوا تب ہیر کا دل بے ٹھکانے — لگی اوس کے بدن میں تپ کبھی آنے
کہا دولہا نے اوس کے کیا غضب ہے — پری دلہن کو تپ ہے کیا سبب ہے
جو آیا تپ اوسے فی الفور ہے گا — نہیں وصلت کا کوئی طور ہے گا
تڑپتا رہ گیا دولہا بیچارا — ادھر اوس ہیر نے حق کو پکارا
خدا مالک تو ہے دونوں جہاں کا — تو ہے آگاہ ہی سِتر نہاں کا
سوا رانجھی نہ شوہر جانتی ہوں — نہیں دولہا کوئی بھی مانتی ہوں
اگر دولہا ہمارا ہے وہی ہے — مجھے رانجھی ملا تو حق سیتی ہے
میں ہوں حرمت اوسی کی تو بچالے — مری فریاد ٹک جلدی خدا لے
مجھے اس دم جو تو نے تپ دیا ہے — مری حرمت گئی کو رکھ لیا ہے
تو ہی ہے کارساز ما غریباں — تو ہی ہے رہنمائے ما اسیراں
پدر نے گرچہ سونپا اس جواں کو — تو ہی ہے جانتا سِرِ نہاں کو
کہ جیسے اس گھڑی حرمت بچایا — ملا رانجھی سے جلدی یا خدایا
وہ دولہا ہے نہیں منظور میرا — ملا رانجھی ہمارے سے سبیرا
خدا نے کر قبول اوس کی دعا کو — دیا مقصود دل اس دل ربا کو
دکھایا کچھ عجب اسرار اوس کو — بچایا از رہ دشوار اوس کو
پدر کو ہیر کے جس دم ارادا — ہوا دولہا یہاں سے اوس کو لے جا
کہا اے ہیر میرا دل کباب ہے — تیرے تپ سے نہایت اضطراب ہے
ہوا یہاں کی نہایت اب بُری ہے — اگر تبدیل ہو تو بہتری ہے
ہوا ہے تو جیسے تبدیل بہتر — کروں گا میں تجھے رخصت مقرر
کہ جس میں جان کا تیری بھلا ہو — ترا یہ مرض جلدی سے شفا ہو
تجھے اب ساہورے جانا روا ہے — اسی میں کچھ تری جی کا بھلا ہے
ہمیں کب بھیجنا تیرے روا ہے — وہاں ہو جا یہ تیرا ساہورا ہے
جدائی کب تری منظور ہے گی — مری چشموں کی تو ہی نور ہے گی
رہی تب ہیر چپکی کچھ نہ بولی — نہ کھولی کچھ گرہ دل کی بلکھوتی
کیا اوس کے پدر نے اوس کو رخصت — محافے پر چڑھی با درد و رقت

اگر حور و ملک سے ہو زن خوشتر — نہ اوس کو دیکھنا بابا نظر بھر
تب اوس دم دوں گا میں تجھ کو فقیری — فقیری میں بھری ساری امیری
کہا راگبجی نے اے مردانہ مولا — ترازو میں یہ دل کے میں نے تولا
کہ جس کے عشق کی ہے یہ کمائی — جنھوں نے راہ مجھ کو یہ دکھائی
نہیں میں چھوڑ سکتا اوس پری کو — اگر ہیں آپ کہتے بہتری کو
قلندر نے سنا اوس کے بیاں کو — وسمجھا دل میں اوس راز نہاں کو
مقرر عاشق صادق جواب ہے — اور اوس کے دل میں اسرار نہاں ہے
تبسم کر کہا راگبجی کو بہتر — پکڑتا ہاتھ ہوں تیرا مقرر
اگر صید نگاہ ہیر کا ہے — مقید زلف کے زنجیر کا ہے
مگر دل بیچ رکھا یاد مولا — بہ ظاہر ہیر کا باطن اوسی کا
کہا کہ ہر عضو سے دوست بادوست — زعرق و استخواں از گوشت تا پوست
نہ ہو غافل کیا کر یاد حق کا — نہیں ہو جاوے گا تازی حق سا
گنہ کرتے ہیں بندے ہر گھڑی میں — وہ رہتا ہے سبھوں کی بہتری میں
جو ایسے مہرباں کو بھول جاوے — بھلا کیوں کر نہ دوزخ اوس کو کھاوے
بھلوں کا کام سارا سب بھلا ہے — جو اوس کے دیکھنے کا مبتلا ہے
نہ جنت چاہتے نہ نار کے ڈر — اور اوس کے یاد میں رہتے ہیں خوشتر
وہی ہر ایک رنگ میں چھا رہا ہے — جدھر دیکھوں ہوں ہر ہر ہو رہا ہے
بجا اللہ کے سوا نہیں دوسرا ہے — اوسی کا پوجنا ہر دم روا ہے
یہ توں جو دیکھتا ہے شکل مٹی — سبھی کو پوجنا دھوکے کی ٹٹی
اور اس صورت سے اوسی کچھ مزا ہے — سبھی گنبد میں ایک ہی کی صدا ہے
نصیحت کر کے اوس مرد خدا نے — پکڑ کر ہاتھ لاگا رہ بتانے
جو کچھ سینہ میں تھا اوس کو بتایا — ارادت کے پیالے کو پلایا
وہ راگبجی عشق کی گرمی سے ہر دم — ہوا تھا خشک تن جیوں خشک ہیزم
قلندر نے کیا آتش دو بالا — ہوا اوس آگ سے تن شعلہ ایسا
لگی ہے آگ ہیزم خشک میں جب — جلے ہے سر سیتی سے تا بکر سب

کہا رانجھی کو کہہ دیجو یہاں سے — ابھی جاوے ادھر آیا جہاں سے
سنا رانجھی نے یہ جس وقت احوال — لباس فقر کرکے اپنا فی الحال
دعا مانگی خدا سے اے کریا — ہمارے حال پر ٹک رحم فرما
بتا کوئی سبیل اوس کے ملن کا — مجھے سدھ بدھ نہیں ہے اپنے من کا
خداوندا عجب ہے حال اپنا — ہوا پامال ناگہ دیکھ سپنا
نہیں جینے کی ہے امید مجھ کو — کیا ہے یار ہی نے صید مجھ کو
یوں ہی بکتا پھرتا تھا دیوانا — نہ کچھ تھا ٹھور اوس کا نہ ٹھکانا
وہاں نہ ہیر دولہا کے سنگاتی — گئی سسرال بار غم اوٹھاتی
وہاں جاتے ہوئے اوس کے بدن سے — گئی تپ دور ہو اچھی جتن سے
یہ تھی سب قدرت اللہ کی یارو — اوسی کا نام لے ہر دم پکارو
ہوا تب اوس کے شوہر کا ارادا — کروں قربت بھلا اب ہیر سے جا
ہوا جب ہیر کے قربت کو تیار — پڑا وہ شیخ اوس دم ہیچ بیمار
بلایا ایک طبیب باشفا کو — دکھایا نبض حکیم بے نوا کو
حکیم بے ریا تھا بسکہ ہشیار — کہا بیمار سے سن اے میرے یار
اگر زن پاس تو جاوے گا یکبار — مقرر موت سے ہووے گا پامال
سنا جب یہ طبیب باصفا سے — کہا رو رو کے یہ اس نے ریا سے
اگرچہ دل پر ہے موج عاری — دگر ہے بے نہایت بے قراری
اگر پرہیز تو نے بتایا — تو نزدیکی زن سے باز آیا
وہاں اوس ہیر کو حق نے بچایا — کیا عزت پہ اوس کے اپنے سایا
یہاں رانجھی ہوا بے تاب و مضطر — چلا سب پا و سر مثل قلندر
بھٹکتا جا رہا یک دشت اندر — وہاں بیٹھا ہوا تھا یک قلندر
کہا رانجھی نے اوس مردانہ حق کو — فقیری دیجئے اس مستحق کو
میں ہوں تصدیق سے تم پاس آیا — تیرے نعلین کا ہو مجھ پہ سایا
تفقد کیجئے اے میرے رہبر — کہ جس سے وصل حق ہو میرے اوپر
کہا درویش نے اے میرے بابا — اگر پرہیز بد سے تو کرے گا

جو چھلا گر گیا سوکھی زمیں پر ہوا گندم وہاں ہر طرف ابتر
لگا تب چھلا سے چننے کو گندم کہ یہ مجھ تک گزارا، ہیر اس دم
مگر پہنچی نہیں اس بھید کو ہیر کنیزوں سے کہا جوگی ہے درگیر
نکالو، دھکے دیکے در لگا دو شرارت کا مزا اوس کو چکھادو
نکالا لونڈیوں نے اوس کو در سے گیا عاشق غرض دلبر کے گھر سے
بچارا عاشق رانجھی وہاں سے گیا روتا ہوا شور و فغاں سے
الگ ایک باغ تھا اوس شہر اندر لگایا باغ میں جا اپنا بستر
لگا دھونی و بیٹھا اوس جگہ پر دھتا یک رہگذر اوس طرف ہوکر
جو کوئی اوس طرف ہوکر کے جاتا اوسے رو رو کے رانجھی یہ سناتا
کوئی آکر ملادے میری جانی اوس بن بھاری ہے اب زندگانی
جو کوئی پوچھتا توں کون ہے گا تو کہتا نام سے میرے تجھے کیا
غرض ایک روز دختر نیک نادر ہوئی وارد جہاں رانجھی کا بستر
کہا رانجھی نے اوس کو راز اپنا کیا اوس دم اوسے ہمراز اپنا
بتایا نام رانجھی کرکے تقریر کہا اور میں ہوں عاشق ہیر
کہے گی ہیر سے میری کہانی کہ ایک جوگی، مٹی اوس کی جوانی
وہ رانجھی نام ہے اپنا بتاتا وہ جوگی ہو تیرے ملنے کو آیا
تو بیٹھی گھر میں سکھ آرام پاوے دعاشق در پہ تیرے دھکے کھاوے
خردمندوں نے کیا بہتر کہا ہے بتوں کی ذات بیشک بیوفا ہے
کہا دختر نے بہتر میں کہوں گی خبر یہ ہیر کو تیرے میں دونگی
مگر کیا دیوے گا مجھ کو اے جوگی یہ باتیں ہیر تک تیری جو ہوگی
کہا رانجھی نے ہے کیا پاس میرے دعا مانگوں گا حق سے حق میں تیرے
کہا دختر نے بہتر لاکھ بہتر ہوئی میں تجھ دعا کرنے سے خوشتر
چلی وہ ہیر کے گھر کے لئے، راہ کرے تا ہیر کو جا کر کے آگاہ
جو پہنچی جاکے اوس کے گھر کے اندر کہا یہ ہیر کو اے ہیر خوشتر
ہے رانجھی نام وہ عاشق ہے تیرا کہا ہے باغ میں آ اوس نے ڈیرا
وہ آیا تھا جو تیرے در کے اوپر نکالا تو نے اوس کو دھکے دے کر
[illegible]

بھرا سینہ برہ کے آگ سے جب ۔۔۔ گیا گزرا ذہر کے لاگ سے تب
ہوا اس طرح سے وہ مست وشیدا ۔۔۔ رہا ہوش و حواس اوس کا نہ برجا
لگا کے فقیری کا ادداسا ۔۔۔ چلا اوس شہر رہتی ہیر جس جا
جو پہنچا ہر گلی سے رفتہ رفتہ ۔۔۔ ہوئی دل کی کلی اوس کی شگفتہ
لگا تب کھوجنے اوس گل پری کو ۔۔۔ کہ جس کے رنگ و بو پر دیتا جی کو
رکھے تھا داغ دل مانند لالا ۔۔۔ پیا تھا عشق کا اوس نے پیالا
وہ تھا مسرور انکھیاں نرگسی کا ۔۔۔ نہیں محتاج تھا وہ نرگسی کا
عجب کرپا خدا کی ذات کا تھا ۔۔۔ ایدھر پژمردہ دل پھرتا تھا رانجھا
اودھر وہ ہیر حق کو سیوتی تھی ۔۔۔ نہیں ہوتی تھی نافرمانی رضا کی
نہیں تھی ذکر اوسے تھی ذکر رانجھا ۔۔۔ اگر فکر اوسے تھی فکر رانجھا
گلے میں گیروے کفنی کو ڈھلے ۔۔۔ کرے تھی ہر گھڑی فریاد نالے
میرا باشندہ تخت ہزارا ۔۔۔ کہاں ہے مصطفٰے را مرتضٰے را
جو پہنچا جاکے رانجھی در پہ اوس کے ۔۔۔ گزر اوس کا ہوا جب گھر پہ اوس کے
ہوا سائل جو اوس کے در پہ رانجھا ۔۔۔ پلنگ پر سا ہیر لیٹی تھی اوسی جا
پڑی تھی یاد میں رانجھی کے ایسا ۔۔۔ نہ سمجھا یہ کہ رانجھی در پہ پہونچا
کہا اوس نے نند سے کام کیجے ۔۔۔ کھڑا ہے در پہ جوگی بھیجا دیجے
نند اوس کی جو آئی بھیک لے کر ۔۔۔ کھڑا جس جا تھا رانجھی اوس کے در پہ
کہا رانجھی نے بھیجا میں نہ لوں گا ۔۔۔ میں دھونی اس جگہ پر آج دوں گا
اگر وہ ہیر دے گی بھیک لوں گا ۔۔۔ دعا بسیار اوس کے حق میں دوں گا
نند نے ہیر کو یہ سب کہا جا ۔۔۔ نہیں لیتا ہے جوگی تیرا بھیجا
کہا تب ہیر نے اپنے نند کو ۔۔۔ بھجا دو زیادہ جس میں خوش ہو
نند اوس کی کر دو آثار گندم ۔۔۔ گئی لے بھیک دینے اوس کو اکادم
دیا رانجھی نے چھلا پیش کر کے ۔۔۔ کہ دے مائی جو کچھ ہو اس میں دھر کے
دیا اوس کے نند نے اوس کو بھیجا ۔۔۔ کیا ایک روز فن رانجھی نے اوس جا
کر چھلا بھیک کا ہاتھوں سے چھوڑا ۔۔۔ گلی چھلا کو در پر اوس کے توڑا

دعا کرکے اگر اوس کو ملا دے — مسافر کو ہمارے توں ملا دے
تو پھر کرتی ہوں تم سے میں بھی اقرار — ملا دونگی تمھاری ہیر دلدار
کہا رانجھی نے اے مائی ہے بہتر — دعا کرکے کروں میں تجھ کو خوشتر
مگر دلبر ہماری کو ملانا — ملاتا ہوں گا پیارے کو ملانا
نہ ایسا ہو نہیں بالا بتایا — مراد اپنی کو جب تم ہاتھ لانا
کہا تب اوس نے اے رانجھی قسم ہے — قسم ہے جان کی تیرے قسم ہے
ہوا خوش دل میں وہ مخمور رانجھی — دعا کرنے لگا مسرور رانجھی
وہ رکھ کرکے زمیں پر سر کو اپنے — دعا کرکر لگا رانجھی کلپنے
خدا نے سن لیا رونے کو اوس کے — دعا کرنے میں جی کھونے کو اوس کے
کیا انجام دل پر اوس کے ظاہر — چھپے اسرار سے رانجھی کو ماہر
کہ اے رانجھی دعا تیری قبول ہے — بھلا کس واسطے دل سے ملول ہے
نند کو ہیر کے یوں کہدے اس دم — تیرا عاشق ملے گا روز پنجم
بدل رانجھی نے تب انجام پایا — سر اپنے کو زمیں پر سے اوٹھایا
نند سے ہیر کے رانجھی یہ بولا — گرہ مقصد کا تیرے حق نے کھولا
توں روتی ہے مائی اوس جواں بن — ملے گا تجھ سے آکر پانچویں دن
یہ باتیں سن گئی خوش ہوکے گھر کو — لگایا راہ عاشق میں نظر کو
وہ بیٹھی انتظاری اوس دعا کے — دیا جو کچھ دعا تھا اوس کو رانجھی
ہوا سِرِّ خدا اس طرح ظاہر — جو عاشق اوس کا تھا مدت سے باہر
وہ آیا پانچویں دن اوس کے گھر میں — چھپا مقصد جو تھا اوس کے نظر میں
تب اوس دم اوس نے عاشق سے یہ پوچھا — کدھر آنکھوں سے یوں مرے چھپا تھا
کہا اوس نے یہاں سے نکلیں سو کوس — ہوا تھا جا ملازم شاہ جاموس
ہوا اس طور میرا دور جانا — بھلا آنے کا تھا کچھ بھی ٹھکانا
و لیکن کیا کہوں سِرِّ الٰہی — ہوا آنا ہمارا بے تباہی
فقیر سے باکرامت صاحب دل — اچانک یک جگہ مجھ کو گیا مل
انھوں نے ہاتھ کو میرے پکڑ کے — [illegible]

شکایت ہم ستی تیری کیا ہے
تجھے میں نے خبر اوس کی دیا ہے
رہی چپ ہیر سن کر وہ حکایت
گئی دختر بیان کردہ شکایت
کہا تب ہیر نے اپنی نند کو
اے بہنا ایک ہماری بات مانو
ہے رانجھی نام ایک عاشق ہمارا
گئے ہے' اہل دنیا' سے کنارا
ہے بیٹھا باغ میں بستر جمائے
بہت سا جوگ دل اندر کمائے
زبان اوس کی مثال تیر ہے گی
دعا اوس کی بجا اکسیر ہے گی
جو کہتا ہے سو ہوتا ہے مقرر
نہیں ہوتا ہے کہنا اوس کا ابتر
ترا عاشق سفر سے پھر نہ آیا
خبر اوس کی کہیں اب تک نہ پایا
دعا دیوے اگر اب تجھ کو رانجھی
ترا عاشق ابھی آوے سفر سے
نند نے ہیر کی یہ بات سن کر
تامل کر کہا سچا بھی جی بہتر
چلی جاتی ہوں میں رانجھی کے بستر
جو پہنچی جا کے خلنے باغ اندر
تو کیا ہے دیکھتی دھونی لگی ہے
اور ایک جوگی ہے اوس کو بے کلی ہے
اور اوس کے دل میں ہے گی اضطرابی
لگا دھونی ہے بیٹھا با خرابی
اور اوس کے دل میں ایسی کھلبلی ہے
نپٹ بے چین وہ عاشق دلی ہے
ہے سینہ بیچ اوس کے بیقراری
اور آنکھوں سے ہے اوس کے اشک جاری
گئی نزدیک تب اوس بے نوا کے
کہا اوس بے نوا نے ہاتھ اٹھا کے
سکھی رہ مائی توں آئی کدھر ہے
ترا شاید اسی بستی میں گھر ہے
نند نے ہیر کے اوس بے نوا کے
دیا بستر پہ سر اپنا نوا کے
و بولی اے فقیرے با کرامت
اسی بستی میں ہے مری اقامت
و پوچھا نام کہا کہتے تمھارا
کہا یہ نام رانجھی ہے ہمارا
بھٹکتا جا بجا جیو کر دیوانا
ہوا ہے ہیر کے ملنے کو آنا
نند پھر ہیر کی بولی اے جوگی
کہ جس کے واسطے ہے توں بروگی
مرا وعدہ ملانے کا ہے تجھ سے
مگر سن لیجئے ایک عرض مجھ سے
ہوا عاشق مجھ اوپر ایک جواں ہے
سفر میں مری آنکھوں سے نہاں ہے
و میں بھی جان سے اوس پر فدا ہوں
و تکتی راہ اوس کی کو سدا ہوں

جو دیکھتا بولتا کوئی نہیں ہے — لگا دروازہ بھی دو کا وہیں ہے
اوسی جاگہ کیا فریاد و نالا — بیگانے اور اپنے کو پوکارا
اے لوگو اب عجب کچھ ماجرا ہے — نہ رانجھی ہے نہ میری دلربا ہے
دکھایا ماجرا حق نے عجائب — کہ دونوں ہو گئے اس جا سے غائب
لگا تب ڈھونڈنے ہو کر دیوانا — کہیں پایا نہیں اوس کا ٹھکانا
نہیں جب ہاتھ آئی تیر اوس کے — پڑی یاد اپنی تقدیر اوس کی
وہ بیٹھا ہو کے چپ اپنے مکاں پر — نہ لایا لفظ شکوہ کا زباں پر
ہوا رانجھی وہاں جا کر ہویدا — کہ راجا اوس نگر کا دوسرا تھا
جوں ہی سب اوس نگر کے رہنے والے — وہیں کیا دیکھتے صورت جملے
لباس اپنا فقیری کا کئے ہے — اور ایک مہ رو کو زانو پر لئے ہے
سبھوں نے یہ کہا یارو یہ جوگی — مقرر عشق کا ہے گا بردگی
کہیں معشوق پایا ہے اوس نے — وہاں سے بے سبب لایا ہے اوس نے
مقرر ہے پریشانی میں ڈالا — کہ جس کے گھر سینی اوس کو نکالا
کیا آخر خبر راجہ کو جا کر — کہا لاؤ جواں کو اب بولا کر
جب آئے لینے کو راجہ کے آدم — ہوا رانجھی تب اپنے دل میں برہم
بھرا تھا اوس کے سینہ میں انگارا — چلے دل سے جو مولا کو پوکارا
اوسی دم لگ گئی آتش نگر میں — سبھی چھوٹے بڑے کے گھر بہ گھر میں
لگے جب لوگ آتش کو بوجھانے — ہوا رانجھی وہاں سے تب روانے
وہاں بھی کچھ کرامت کے عجائب — دکھا کر کے ہوا اوس جا سے غائب
ہوا رانجھی جو غائب اوس نگر سے — یہ نکلا آہ ہر ایک کے جگر سے
فقیرے باکرامت کو ستایا — نگر یہ مفت میں شب کے جلایا
غرض سب رہنے والے اوس نگر کے — رہے وہ پیٹتے سر افسوس کر کے
وہ رانجھی جو ہوا غائب نگر سے — نہیں واقف کوئی اوس کے خبر سے
عجب اسرار حق اوس جا ہے یارو — کہیں ہیں لوگ سب یہ متفق ہو
کہ تو سید تمک بیٹھیں گے رانجھی ہیر جیتے — اگرچہ دن بہت اوس کو ہیں بیتے

نند نے ہیر کے تب دل میں ٹھانا — کروں مقصد کا رانجھی کے ٹھکانا
وہ دل سے ہیر کو یہ فن سکھائی — کہ نکلا پاؤں میں اوس کے جو بھائی
کیا یہ شور اوس کے گھر کے اندر — کہ اوس کو سانپ نے کاٹا ہے آکر
پڑا شور و فغاں اوس کے مکاں میں — ہوا لرزا سبھوں کے سن کے جاں میں
ہوئے سب منتری آ جمع اوس جا — سبھوں نے اپنے منتر کو جگایا
وہ بے ہوشی کے فن میں یوں پڑی تھی — کہ جیسے سانپ کے کاٹے سیتی تھی
نند نے ہیر کے عیب کو بنا کر — کہا رانجھی کے پاس اس طرح جا کر
سنا کچھ تو نے اے رانجھی دیوانا — ملا محبوب اب میرا سیانا
ملایا تو نے جو میرے سجن کو — کروں ثابت بھی اب اپنے بچن کو
مجھے تھی ہیر کو تیرے ملانا — بلانے کا کیا ہے یہ ٹھکانا
اوس محبوب کو نکلا گرا کر — دیا ہے سانپ کا لہرا بجا کر
اے رانجھی یوں چلا چل جھاڑنے کو — ایسی حیلہ سے تجھ سے دو بدو ہو
یہ سن رانجھی اٹھا بستر سے خوش دم — چلا یاد خدا میں ہو کے بے غم
جو پہنچا ہیر کے نزدیک آ کے — تو کیا ہے دیکھنا اوس پاس جا کے
پڑی ہیر غش کی بے خودی میں — کھڑے ہیں لوگ اوس کی یاوری میں
اور اس کا جو کہ شوہر ہے کہاتا — کھڑا ہاتھوں سے سر اپنا پٹھاتا
کہا رانجھی نے اے بابا یہ کیا ہے — نہ رو مالک شفا کا وہ خدا ہے
کوئی ایک کوٹھری تنہا مکاں ہو — اور اوس میں ہیر جا کر کے نہاں ہو
دلمیں ہوں جھاڑنے کو اوس کے شامل — گھڑی دو میں شفا پاوے گی کامل
دکھانے کو جو آئی تھی پری کو — کیا خالی شتابی کوٹھری کو
بھجایا کوٹھری میں اس پری کو — گیا رانجھی وہاں افسوں گری کو
رہا در بند کر کے کوٹھری کا — کیا ہاتھ اپنے میں ہاتھ اوس پری کا
کرامت کے وہاں ایسے عجائب — ہوئے وے دونوں پھر اوس جا سے غائب
جو عرصہ ہو گیا اوس کو پہر کا — کسی کی کچھ خبر اوس جا نہ پایا
لگا آواز دینے اوس کا شوہر — کہ کیا کرتا ہے اے جوگی مسافر

وہاں ایک جھاڑ کو پکڑے ہوں لٹکا — ولیکن ہے بہت اس جا پہ کھٹکا
نظر آئے دو چوہے اسی دم — اور ہیں گے کاٹتے وے جھاڑ ہر دم
ہے او جلا ایک اور ایک کالا — دو بیٹھے کاٹتے ہیں جھاڑ اوس جا
تلے پاؤں کے دیکھا طاق ہے گا — اور اس میں سانپ بھی ہے ایک بیٹھا
نہ نیچے پاؤں رکھنے کی جگہ ہے — اور اوپر شیر کی مجھ پر نگہ ہے
جو پکڑے جھاڑ کو لٹکا ہوں اس دم — اوسے بھی کاٹتے چوہے ہیں ہر دم
ایسی دہشت میں لٹکا ہوں اوسی جا — جو اتنے میں شہد بھی مجھ کو سوجھا
کہ اوس کو میں کے اینٹے میں لگا ہے — اور اس دم اوس کو میں نے بھی چکھا ہے
چکھا وہ تھا مرے مرغوب خاطر — ہوا معروف لذت میں سراسر
نہ دہشت مار کا دل پر رہا کچھ — نہ کٹنے جھاڑ کا دہشت کیا کچھ
گیا ہوں بھول دہشت شیر کا بھی — مزے میں اوس شہد کے پھنس گیا جی
جو اتنے میں پسر بیدار ہو کر — تو ہے کیا دیکھتا بیزار ہو کر
نہ وہ ہے شہد اور کچھ بھی نہیں ہے — میں سویا ہوں نہیں وو کچھ نہیں ہے
جو دیکھا خواب میں سر خدا کو — گیا وہ پوچھنے کو ایک گدا کو
گدا تھا نام کا وہ بادشاہ تھا — نہایت واقف سر خدا تھا
کہا جب اوس گدا سے خواب سارا — لگا تب عرض کرنے کو خدا را
شنیدی از زبانم آنچہ خواہم — بیانش را عطا کن با جواہم
کہا تب اس گدا نے کرکے زاری — کہ اے بابا یہ ہے گی بات تمہاری
جو دیکھا شیر تو نے در قضا ہے — وہی اے دوست ہر ایک کی قضا ہے
وو در پے ہر کسی کے ہو رہا ہے — نہیں بندہ کسی سے وہ جدا ہے
مقرر شیر کے پنجہ میں آنا — کرے گر لاکھ صورت کا بہانا
جو دیکھا جھاڑ تھا وو زندگی ہے — رہا ہوں یوں لٹک کیا زندگی ہے
کہ نیچے سانپ کا خطرا پڑا ہے — اور اوپر شیر سر پر بھی کھڑا ہے
وہی خوش بخت جو سویا یہ جاگا — جو سویا ہے سراسر وہ ابھاگا
جو چوہے دیکھیں ہیں دن رات ہے گا — کہ جن کا تن ہے اوجلا اور کالا

بھرا ہے عشق میں کچھ اور اسرار   کبھی مرتے نہیں ہیں عاشق زار
نہیں برہ کی آگ ہوتی جس کے جی میں   وہ مردہ رہتے ہیں دونوں جہاں میں
عجب یہ عشق کا سودا ہے یارو   دیئے سے نقد جاں ملتا ہے یارو
جنھوں نے عشق کے بازی کو کھیلا   لیا دونوں جہاں کا اس نے پالا
یہ دنیا چند ساعت کا مزا ہے   گیا جو بھول کر اس کی سزا ہے
اری سودا کرو سودا کرو تم   خدا کی یاد سے ٹانڈا بھرو تم
عجب سودا یہاں کا ہے نفع کا   وہ ہی کم بخت ہے جو چھوڑے گا
کروڑوں پر نہیں وہاں ہاتھ آتا   جو کوڑی پر یہاں سودا بکاتا
جو آئے ہیں تو کچھ بھی لیجئے آپ   جہاز اپنی نہ خالی کیجئے آپ
یہاں بھولا تو ہو جاوے گا ناری   نکل جاوے گی سب شیخی تمھاری
یہاں کی مفلسی وہاں بہتری ہے   تہی دستی وہاں کی لینی بری ہے
کمائے کچھ جو آیا ہے یہاں کو   چلا جاوے گا آخر اس جہاں کو
بجے گا جب کہ رحلت کا نقارا   چلے گا کچھ نہیں اس وقت چارا
مسافر کو نہ سونا چاہیئے ہے   نہ پگڑی سر کا کھونا چاہیئے ہے
اگر سویا تو بے حرمت ہوا تو   ز تیغ راہ زن ناحق موا تو
اگر جاگے گا تو ایسے سفر میں   پڑے گا کب بھلا راہ خطر میں
بچے گا گر یہاں تو زندگی سے   جیئے گا وہاں سدا فرخندگی سے
ہوا گر پہلے مرنے کے جیا تو   . . . .
یہاں کی نیستی ہے وہاں کی ہستی   ہے ویرانی یہاں کی وہاں کی بستی
نہ چھوڑے گی قضا ہشیار رہنا   کمر باندھے ہوئے تیار رہنا

قصہ دیگر

پدر ایک شخص کا اپنے پسر کو   دکھایا خواب یہ لیل البدر کو
کہ پیچھے ہے میرے ایک شیر لاگا   وہ ڈر سے اس کے میں پھرتا ہوں بھاگا
چلا جاتا ہوں بھاگا راہ اندر   چھپا پھر اس کے ڈر سے چاہ اندر

نئے خزانے

جولائی تا دسمبر [illegible] کے رسائل کا موضوع وار اشاریہ

قسط دوم

مرتبہ

ابو سلمان شاہجہانپوری

انجمن ترقی اردو پاکستان

کراچی

یوں ہی کٹ جاتا ہے دن رات سگلا ۔۔۔ جواں مردی رکھے جو یاد رب کا
جو کرتا دل سیتی یاد خدا ہے ۔۔۔ اوسی کے واسطے ارمن دسما ہے
وو تو نے سانپ جو دیکھا ہے بلا ۔۔۔ وہ عزرائیل ہے حق کا پیادا
کہ جس دم جھاڑ چوہا کاٹے گا ۔۔۔ اوسی دم وہ فرشتہ آ ملے گا
پکڑ کر طوطی شیریں زباں کو ۔۔۔ وو لے جاوے گا اوس ملک نہاں کو
کنواں او جانیئے دنیا برادر ۔۔۔ شہد جو ہے مزا اوس کا سراسر
تو بھولا اوس شہد کے چاٹنے میں ۔۔۔ وو چوہے ہیں عمر کے کاٹنے میں
کہ بھولا جس مزے میں خوف سارا ۔۔۔ رہا نا ہیں خوف کچھ آنان ہارا
اے بابا خوف دل کے بیچ ہر دم ۔۔۔ تو کر اپنی بدی پر ہر گھڑی غم
سدا دل بیچ رکھ یاد خدا کو ۔۔۔ رہائی تیری ہو روز جزا کو
پدر تیرے کا ہے گا تجھ پہ سایا ۔۔۔ تجھے اب خواب غفلت سے جتایا
سنی تعبیر جس دم یہ گدا سے ۔۔۔ فقیری کی لباس اپنی بنا کے
رنگا کر گیروا تن کر کے جوگی ۔۔۔ تنبورا ہاتھ میں لے ہو بروگی
پھرا شہروں میں تنبورا بجاتا ۔۔۔ یہاں لے ہے یہاں نے ہے سناتا
محبت پیو سے یہاں تک لگایا ۔۔۔ کہ آخر کو سہاگن وہ کہایا
جو دل کا رس مزے میں آئے جی کو ۔۔۔ وو ہی پاوے گا اپنے پیارے پی کو
کرے گا جو کوئی یاد اوس کی دل سے ۔۔۔ کثافت سے نکل جاوے گا کل سے
غمیں ہجرت سے اوس کے خوں بہا کر ۔۔۔ پپیہا کی طرح پی پی کہا کر
تو پاوے گا اسی دم اپنے پی کو
کہ کر راہ نما فضل علی کو

تاریخ و سیاست

ابراہیم،	سلطان حیدر علی خاں کی جنگی حکمت عملی	امروز، لاہور، ص ۲، ۱۰ دسمبر
ابوالحسن علی ندوی	حادثۂ عربستان[1]	سیارہ، ص ۱۱۵ تا ۱۲۳، ستمبر
" "	عالم عرب کا المیہ	الجامعہ، ص ۱۲۵ تا ۱۴۹، اکتوبر نومبر
احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر سید	عظیم آباد کی عظمت	سب رس، ص ۳ تا ۹، جولائی
احسان بی اے	تحریک پاکستان کا تاریخی مواد ضبط تحریر میں آنا چاہیے	کوہستان، ص ۲، ۲۳ جولائی
" "	یہ تذکرہ ہے آزاد ہند فوج کا	" " ۵، ۱۳ اگست
احسان صابری	علاقائی تعاون برائے ترقی	" " ۱۱۴۲، ۱۷ اگست
احمد حسین، مولانا	مشرق وسطی کا بحران	نصرت، ص ۵ تا ۷، ستمبر
احمد قلعداری، قریشی احمد حسن	خاندان نوشاہیہ اور شاہان وقت کے شاہی فرامین اور تاریخی تحریریں	مجلہ ادارہ تحقیقات پاکستان، ص ۷ تا ۳۰، جولائی
اختر ملیح آبادی	دور اکبری کا ایک ورق	ہندوستانی ادب، ص ۱۲ تا ۱۵، اکتوبر نومبر
اسرار احمد سہاروی	فلسفۂ انقلاب	سیارہ، ص ۲۵ تا ۳۰، اکتوبر
" "	" "	" ص ۲۸ تا ۳۹، نومبر
اسماعیل بالک، ڈاکٹر محمد قطب الدین (مترجم)	عہد عثمانی میں مسلمانان بوسنیا کے علمی کارنامے	العلم، ص ۷۳ تا ۸۱، اپریل تا جون
اشرف، حکیم عبدالرحیم	پاکستان میں امن و سلامتی کا مسئلہ	المنبر، ص ۳-۴، ۲۷ اکتوبر
" "	عرب اسرائیل جنگ نمبر — ابتدائیہ[2]	" "
" "	کیا پاک بھارت جنگ اسی سال ہو گی	" ۱، ۸ و ۱۵ ستمبر

---

[1] اس سلسلے میں متعدد اہل قلم اور علما کے مضامین اس نمبر میں شامل ہیں

[2] عرب اسرائیل جنگ کے پس منظر، واقعات و حالات اور اس کے نتائج اور اس مسئلے کے ہر فکری و عملی پہلو پر مضامین کا ایک نہایت بیش قیمت اور معلومات افزا مجموعہ خاص نمبر کی صورت میں پیش کر دیا ہے اس میں پاک و ہند اور عالم اسلامی کے مشاہیر علما، فضلا اور ادبا نے حصہ لیا ہے۔ اس نمبر میں متعدد مضامین پاک و بھارت تعلقات، ستمبر ۶۵ء کی جنگ اور اس کے عواقب و نتائج پر بھی شامل ہیں (صفحہ ۱ تا ۲۰۰)

اس مرتبہ جولائی تا دسمبر ۱۹۶۶ء چھ ماہ کا اشاریہ ایک ساتھ ترتیب دیا گیا ہے اور یہ اس کی دوسری قسط ہے اس میں جنوری تا جون ۱۹۶۶ء کے بعض وہ رسائل بھی شامل ہیں جو بعد میں دستیاب ہوئے۔

اشاریے کی تیاری میں جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ صرف وہ حضرات لگا سکتے ہیں جو اس قسم کے کاموں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ رسائل کی فراہمی ایک بڑا مشکل کام ہے، اس کے لئے پوری کوشش کی جاتی ہے۔ پھر بھی رسالے نظر سے نہیں گزرتے۔ مدیران کرام کو بار بار خطوط لکھے جاتے ہیں اور —

واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

کے مصداق وہ تعاون حاصل نہیں ہوتا جو اس قسم کے کاموں کے لئے ضروری ہو۔ ہم نے اپنے وسائل کی حد تک اس اشاریے کو ہر اعتبار سے جامع بنانے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی ممکن ہے بعض رسائل نظر انداز ہو گئے ہوں۔ اور ان کے حوالے اس میں موجود نہ ہوں۔ ہم اپنے قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر کوئی حوالہ اس اشاریے میں نہ ہو تو وہ ہماری رہنمائی فرمائیں تاکہ آئندہ اقساط میں اسے شامل کر لیا جائے۔

(ادارہ)

آبادشاہ پوری	اشتراکی سامراج اور وسط ایشیا کے مسلمان	چراغِ راہ، ص ۳۰۹ تا ۳۱۴، د
"	روسی استعمار کی مسلم کش پالیسی	" ، ۲۹۵ تا ۳۰۰،
باقر، ڈاکٹر محمد	لاہور — وجہ تسمیہ اور تاریخ بنیاد	ارمغان، ص ۷ تا ۲۵، نومبر
بٹ، ڈاکٹر عطاء و / حکیم عبداللہ نصر } مترجم	فن طب کی عقلی قدریں	العلم، ص ۹۱ تا ۱۰۳، اکتوبر تا دسمبر
بشیر احمد، شیخ	قیامِ پاکستان — تاریخی جائزہ	الجامعہ، ص ۹ تا ۱۴، اگست
بشیر احمد، میاں	اسلامی ہند کی بیداری	قومی زبان، ص ۱۹ تا ۲۳، اگست
بشیر حسین جعفری	تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک	المنبر، ص ۵ تا ۷ + ۱۲، ۱۸ اگست
" "	عرب و اسرائیل جنگ — خرطوم کانفرنس کے بعد	" " ۵ تا ۶، ۲۷ اکتوبر
" "	مراکش	" " ۵ تا ۶، ۲۹ ستمبر
بلیغ الدین، شاہ	اسلامی مملکت کا آغاز	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۳ تا ۲۵، اگست
بیدار، عابد رضا	سرسید اور حسن ستادی (۲ خط)	آج کل، ص ۱۵ تا ۱۷، ستمبر
بھانو شنکر یاگنک	کوئٹ انڈیا کی تحریک	صبح امید، ص ۲۳ تا ۲۵، اکتوبر
پرویز	قائداعظم کا تصور پاکستان	طلوع اسلام، ص ۹ تا ۱۸، نومبر
تقی، سید محمد	اکتوبر ۱۹۱۷ء کا انقلاب	جنگ، ص ۱۳، ۲۸ اکتوبر
ثاقب زیروی	یہودی ہٹلر کی نظر میں	لاہور، ص ۱۱ تا ۱۲ + ۱۴، ۲۰ نومبر
جعفری، رئیس احمد	قائداعظم — کردار کی چند جھلکیاں	قندیل، ص ۱۰، ۲۷ دسمبر
جمیل الدین احمد	تحریک پاکستان کا ایک معرکہ	ماہ نو، ص ۹ تا ۱۳، اگست
حافظ، سید محی الدین	شاہان آصفیہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی	سب رس، ص ۲۶ تا ۲۸، ستمبر
حامی الدین خاں، محمد	پاک و ہند کے افغان حکمراں، امراء (۴)	العلم، ص ۹۹ تا ۱۴۳، اپریل تا جون
حسان کلیمی	انڈونیشیا میں کمیونسٹوں کا عروج و زوال	چراغ راہ، ص ۹۸۳ تا ۹۹۱، دسمبر
حسین، شاہ	شاہ حسین کی سرگزشت — کابینہ نے شاہی حکم ماننے سے انکار کردیا	
"		امروز، ص ۸، یکم اکتوبر
"	" " زرقہ کی بغاوت	" " ۸، ۲۲ "
"	" "	

…م عبدالرحیم	ہماری خارجہ پالیسی اور ملی تقاضے	المنبر، ص ۳، ۲۹ر ستمبر
اعجاز حسن قریشی	آنکھ سوچتی رہی (مشرق اوسط کے سیاسی حالات)(۳)	اردو ڈائجسٹ، ص ، دسمبر
افتخار حسین، آغا	عہد حاضر اور پسماندہ اقوام	نقوش، ص ۳۲ تا ۴۸، ستمبر
" "	فکر کی آزادی کا تصور	افکار، ص ۳۸ تا ۴۴، اکتوبر
الطاف حسن قریشی	جب سرحدوں پہ خون بہا(۴)	اردو ڈائجسٹ، ص ، ستمبر
" "	مشرق اوسط کے زخم (قدرت اللہ شہاب سے انٹرویو)	" " ۱۷ تا ۴۲، نومبر
امن گیسو دراز پاکستانی		
مولانا محمد مرزا منور علی بیگ	خلیج عقبہ۔ قومی خامیوں کا علاج	صحیفہ اہل حدیث، ص ۱۳ تا ۱۵، ۲۵ر جولائی
" "	خلیج عقبہ ـ کون سا ہتھیار زیادہ کارآمد ہے	" " " ۲۳ تا ۲۷، ۹ر۲۴ اگست
" "	خلیج عقبہ ـ قرآن مجید اور سیاسی بیانات	" " " ۲۳ تا ۲۸، ۷ر ستمبر
" "	خلیج عقبہ ـ مسئلہ بیت المقدس اور عیسائیت	" " " ۱۹ تا ۲۰، ۲۲ر ستمبر
" "	خلیج عقبہ (۵) ـ عنصر اتحاد	" " " ۲۷ تا ۳۰، ۱۲ر اکتوبر
"	.... عرب قومیت اور اسلامی اتحاد	" " " ۲۱ تا ۲۳، ۱۹ر نومبر
…حسن اصلاحی، مولانا	جماعت اسلامی، امریکہ اور اسرائیل	شہاب، ص ۲ تا ۷، ۲۹ر اکتوبر
…حسینی مفتی اعظم فلسطین		
…د منیر (مترجم)	قضیۂ فلسطین (۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۸ء تک)	الجامعہ، ص ۳۲ تا ۴۳، اکتوبر و نومبر
…شہ	اردن	زندگی، ص ۴۱ تا ۴۹، ستمبر
…ر قادری، پروفیسر	تنظیمات عثمانیہ	بصائر، ص ۸۷ تا ۹۸، جولائی
…اے		
…ینا بلگرامی (مترجم)	مغربی ایشیا ـ اسرائیلی نقطۂ نظر سے	جامعہ، ص ۱۴۴ تا ۱۵۴، ستمبر
…ی، ڈاکٹر محمد	چین میں اقتدار کی کشمکش	تحریک، ص ۱۸ تا ۱۹، ستمبر

…ن کی ابتدائی دو اقساط اکتوبر اور نومبر کے پرچوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

…جنگ پاک و بھارت کے سلسلے کے متعدد مضامین جن میں اس جنگ کے مختلف پہلوؤں اور اس سے پیدا شدہ حالات اور …منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

خورشید عالم	ویٹ نام کا عالمی کردار	طلوع اسلام، ص ۴۹ تا ۵۵، اکتوبر
راشدی، پیر علی محمد	اسرائیل کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟	جنگ، ص ۱۲، ۵ر اگست
" "	انقلاب روس	" " ۲۰، ۷ر نومبر
" "	اسرائیل کا وجود ناقابل برداشت ہے	" " ۸، ۱۸ر "
" "	تین مسئلے (ہانگ کانگ میں چینی اور انگریزی حکومت،	
	عرب اسرائیل اور کانگو کے سابق صدر شومبے)	" " ۱۲، ۲۹ر جولائی
" "	جنوبی ویٹ نام کے انتخابات	" " ۱۲، ۳۰ر ستمبر
" "	جوابی حملہ (پاک بھارت جنگ)	" " ۱۲، ۱۶ر "
" "	(عالمی سیاسی حالات)	" " ۲۰، ۲۸ر اگست
" "	غلام محمد سابق گورنر جنرل پاکستان	اخبار جہاں، ص ۸ تا ۹، ۴ر اکتوبر
" "	" " "	" " ۸ تا ۹، ۱۱ر "
" "	" " "	" " ۸ تا ۹، ۱۸ر "
" "	" " "	" " ۸ تا ۹، ۲۵ر "
" "	(ویٹ نام — ایک تجربہ گاہ)	جنگ، ص ۱۱، ۱۴ر اکتوبر
رسل، برٹرینڈ	بھارت عالمی سرد جنگ میں ...... (بھارت چین کے سرحدی تنازعے پر تبصرہ)	امروز، ص ۱۵، ۲۹ر جولائی
رشید احمد صدیقی، پروفیسر	علی گڑھ تحریک	مجلہ یادگار، ص ۱۰ تا ۱۴
رشیدی، جی		
رحمت علی (مترجم)	مغربی ایشیا — عرب نقطۂ نظر سے	جامعہ، ص ۱۲۶ تا ۱۳۳، ستمبر
رضوان احمد	قائداعظم کا لفظ پہلے کس نے استعمال کیا تھا؟	جنگ، ص ۷، ۲۹ر دسمبر
ریاض الرحمان شروانی	عرب اسرائیل جنگ اور ہم	نگار پاکستان، ص ۷ تا ۲۳، اکتوبر
ساقی، ضا۔م	داستان انقلاب (۱۹۵۸ء)	ساغر، ص ۴ تا ۵، ۱۷ر اکتوبر
" "	صدر ایوب کا دورۂ روس	" " ۴ تا ۸، ۲۴ر "
ستیہ پرکاش	شمالی ویٹ نام — بین الاقوامی انقلاب کا اڈہ	تحریک، ص ۱۰ تا ۱۹، جولائی
[illegible]	[illegible]	[illegible]

حسین، شاہ	شاہ حسین کی سرگزشت *	امروز، ص ۶، ۱۲ر نومبر
"	" "	" " ۶، ۱۹ر نومبر
"	" " (آخری قسط)	" " ۶، ۲۳ر نومبر
حسین خان	اشتراکیت اور معاشی ترقی	چراغ راہ، ص ۱۹۸ تا ۲۸۴، دسمبر
حفیظ اللہ پھلواروی	فرمان روایان سلطنت ماوا کے دور میں علمی ترقیاں	ہندوستانی ادب، ص ۱ تا ۱۷، دسمبر
" "	اسرائیل دنیا کے نقشے پر کیسے اور کیوں پیدا ہوا	کوہستان، ص ۶، ۸ر اکتوبر
حمید اللہ خاں (مترجم)	مہمات بریگیڈیر جیرارڈ (تیسری مہم)	العلم، ص ۳۳ تا ۴۴، جولائی تا ستمبر
خلیل حامدی	شام کی حزب البعث (۲)	ترجمان القرآن، ص ۳۹ تا ۵۰، ستمبر
" "	عراق کی صورت حال	" ۳۹ تا ۵۰، دسمبر
" "	عرب سوشلزم، نظریہ، تاریخ، تحریک اور نتائج	چراغ راہ، ص ۱۲۳ تا ۱۴۳، دسمبر
خورشید، عبدالسلام	دنیائے اسلام اور افریشیائی اقوام کی ترقی کے راستے	مشرق، ص ۲، ۳۰ر جولائی
" "	صدر ایوب اور حزب اختلاف	" " ۴، ۱۰ر ستمبر
" "	صدر ایوب کی خارجہ پالیسی	" " ۴، ۲۸ر اگست
" "	عربوں کو تنقید کی نہیں ہمدردی کی ضرورت ہے	شہاب، ص ۹، ۲۳ر جولائی
" "	قبرص کا مسئلہ	مشرق، ص ۱۲، ۲۵ر نومبر
" "	یمن کا حالیہ انقلاب	" " ۲، ۱۸ر نومبر
" "	ہندوستان کے ساتھ ہماری جنگ	" " ۴، ۳ر ستمبر
خورشید احمد	سقوط بیت المقدس	چراغ راہ، ص ۵ تا ۱۴، جولائی
"	یونیسکو کی "تاریخ انسانیت" اور پاکستان	" " ۱۵ تا ۲۸، "
خورشید عالم	اسرائیل کا عالمی کردار	طلوع اسلام، ص ۱۳ تا ۲۸، نومبر
"	افریقہ — ایشیا کا عالمی کردار	" " جولائی اگست
"	" "	" " ستمبر
"	" "	" " ۹ تا ۳۴، "
"	پھر دانت پیستی ہیں حلیبی ہلال پر[1]	" " ۲۲ تا ۳۲، جولائی

---

[1] عرب اسرائیل کشمکش اور یورپ کی دیگر طاقتوں کی سازشیں

عباد اللہ فاروقی، حافظ	ارض فلسطین کی اہمیت	الرحیم، ص ۱۸۲ تا ۱۸۷، اگست
" "	برصغیر کی مسلمان حکومتیں	" " ۱۴۵ تا ۱۵۲، جولائی
" "	حمام کی تاریخ	ماہ نو، ص ۷۳، ستمبر
" "	سنوسی تحریک[1]	الرحیم، ص ۳۷۶ تا ۳۸۴، اکتوبر
عباسی، عبدالرؤف	مالٹا	قندیل، ص ۱۲ تا ۱۳، ۱۳ ستمبر
عبدالباری ایم اے، مولانا	فلسطین اور	الجامعہ، ص ۷۳ تا ۸۴، اکتوبر نومبر
عبدالحمید صدیقی	اشارات (محمد ایوب خاں کی کتاب فرینڈز ناٹ ماسٹر) پر تبصرہ	ترجمان القرآن، ص ۲ تا ۱۶ + ۵۹ تا ۶۱، اکتو
" "	اشتراکیت کی فکری بنیادیں اور ان کا تنقیدی جائزہ	چراغ راہ، ص ۱۶۳ تا ۱۸۳، دسمبر
عبدالخبیر	ناصر اور دنیائے اسلام	تحریک، ص ۶ تا ۸، اگست
عبدالشکور، شیخ	غازی امان اللہ خاں اور کرنل لارنس آف عربیا	محفل، ص ۱۳ تا ۲۰، دسمبر
عبدالعلیم خاں، ڈاکٹر	الجیریا کی مختصر تاریخ	العلم، ص ۱۳ تا ۳۸، اکتوبر تا دسمبر
عبدالغفار خیری	امن عالم	صحیفہ اہل حدیث، ص ۱۱ تا ۱۲، ۱۹ نومبر
عبداللہ، ڈاکٹر سید	پاکستانی قومیت	قندیل، ص ۱۷ تا ۱۸، ۱۳ اگست
" "	کیا ہم ایک قوم ہیں؟	چٹان، ص ۶ تا ۸، ۱۲ اگست
عبدالماجد دریابادی، مولانا	جمہوریت کا انوکھا کھیل	صدق جدید، ص ۵، ۲۲ دسمبر
" "	بعد از جنگ (سیاسیات ہند)	" " ۵-۶، یکم دسمبر
عبدالمجید یمین، پروفیسر	برہمن آباد	بصائر، ص ۷۳ تا ۷۷، جولائی
عبدالودود		
یونس احمد (مترجم)	جہاد آزادی اور مسلمانان بنگالہ	ماہ نو، ص ۱۴ تا ۱۵، اگست
عزیز، ڈاکٹر محمد	مسلم دنیا کے معاشی مسائل	چراغ راہ، ص ۶ تا ۱۲، ستمبر
عشرت رحمانی	قائد ملت اور مسئلہ کشمیر	کوہستان، ص ۲، ۱۵ اکتوبر
غلام محمد، چودھری	عرب اسرائیل جنگ کا پس منظر	چراغ، ص ۷ تا ۱۸، نومبر

---

[1] یہ مضمون ہفت روزہ "لاہور" لاہور جلد ۱۶ مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۶۷ء میں بھی نقل کیا گیا ہے

قومی زبان کراچی	۱۱۴	اپریل ۷۸ء
سراج نظامی	بیت المقدس	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۰۹ تا ۱۱۰، اگست
سعید احمد اکبرآبادی، مولانا	علمائے حق کی اصلاحی کوششیں	شہاب، ص ۶ تا ۷، ۲۲ر اکتوبر
سعید، غلام باری	دیارِ عرب میں ایک سال	لاہور، ص ۵، ۶، ۲۵ر دسمبر
سیف، قاضی محمد اسلم	عرب ممالک اور مغربی اقوام	المنبر، ص ۵۵ تا ۵۶، ۸ر ۱۵ر نومبر
شاپریاں، اے ایم	آج کا ایران	امروز، ص ۲، ۲۶ر اکتوبر
شاہی، مجیب الرحمان	بیت المقدس	اخبارِ جہاں، ص ۱۴ تا ۱۵، ۱۲ر جولائی
"	مسلم لیگ کے چالیس برس	" ، ۱۴ تا ۱۵، ۱۶ر اگست
شاہد	جنگِ آزادی کا ہیرو — کالے خاں	ماہِ نو، ص ۲۰ تا ۲۱، اگست
شاہین، علی محمد	قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ — یمن	جنگ، ص ۵، ۱۸ر نومبر
شرن، برج دھاری	بہار	ہمایوں، ص ۷۴ تا ۷۸، اگست
شریف المجاہد	تحریکِ مجاہدین میں بنگالیوں کا حصہ	ثقافت، ص ۵۳ تا ۶۲، اکتوبر
شریف فاروق	جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی (محمد ایوب خاں)	جہاں نما، ص ۱۳ تا ۱۴، ۹ر ستمبر
شریف قادری، محمد	تحریکِ پاکستان میں علمائے کرام کا حصہ	تنذیل، ص ۹، ۱۳ر اگست
شمس، محمد باقر	لکھنؤ جو ایک شہر تھا	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۰۶ تا ۱۰۹، دسمبر
شمشاد محمد نوذی	ریاضی میں مسلمانوں کی خدمات	ثانوی تعلیم، ص ۲۲ تا ۳۵، ستمبر
شوودت گیانی، ڈاکٹر	وید کا زمانہ	ہمایوں، ص ۱۴۳ تا ۱۵۱، جون
شیر علی شاہ، مولانا	آہ! سرزمینِ قدس	انوارِ اسلام، ص ۵۳ تا ۴۴، اکتوبر
صادق کاشمیری، خواجہ	پاکستان میں حزبِ مخالف کا کردار	چٹان، ص ۷ تا ۸، ۱۳ر نومبر
"	مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات	" ، ۱۲ تا ۱۳، ۴ر دسمبر
"	میاں محمود علی قصوری سے (انٹرویو)	" ، ۱۲ تا ۱۴ + ۱۸، ۲ر اکتوبر
طیب، قاری محمد	عرب اسرائیل جنگ	" ، ۱۶ + ۱۷، ۱۹ر اکتوبر
ظفر اسحاق انصاری	عرب بعث پارٹی کی قومی اشتراکیت	چراغِ راہ، ص ۳۷ تا ۴۱، دسمبر
ظہیر کاشمیری	عرب نیشنلزم کی تحریک کا آغاز کب اور کیسے ہوا	کوہستان، ص ۸، ۸ر اکتوبر
[illegible]	[illegible]	[illegible]

مجیب، پروفیسر محمد	تقسیم ہند کا پس منظر	جامعہ، ص ۳ تا ۱۸، جولائی
〃 〃	قطب کی عمارتوں کا مجموعہ	ہندوستانی ادب، ص ۱۰ تا ۱۲، جولائی
محمد اسلام، حافظ	پاکستان کا قیام قائد اعظم کا عظیم کارنامہ	جنگ، ص ۵، ۲۷ دسمبر
〃 〃	صدر ایوب کی خارجہ پالیسی	〃 〃 ۲۹ اکتوبر
محمد افضل	وادی گندھارا کے تہذیبی آثار	ماہ نو، ص ۷ تا ۱۲، ستمبر
محمد حسین خاں زبیری	جنگ آزادی اور سرسید	مجلہ یادگار، ص ۹ تا ۱۸،
محمد سعید	الجزائر — ہر قربانی دینے کو تیار!	مشرق، ص ۸ تا ۹، ۲۹ اکتوبر
〃	صدر ایوب نے خارجہ پالیسی کو قومی مفادات کے سانچے میں ڈھال دیا۔	〃 〃 ۵، ۲۹ اکتوبر
محمود فاروقی	پہلی اسلامی ریاست	حریت، ص ۱۵، ۱۴ اگست
مدنی، محمود احمد	الجزائر	اخبار جہاں، ص ۱۰، ۸ نومبر
〃 〃	پاک سعودی فوجی معاہدہ	〃 〃 ۱۰، ۲۳ اگست
〃 〃	عرب سربراہ کانفرنس	〃 〃 ۱۰، ۲ ستمبر
〃 〃	یمن کے انقلاب کا پس منظر	〃 〃 ۹، ۲۲ نومبر
مشتاق احمد خاں، نواب	سقوط حیدرآباد	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۸۰ تا ۱۸۶، ستمبر
〃 〃	مسلمانوں کا دوسرا غرناطہ — حیدرآباد دکن	کوہستان، ص ۲ تا ۳، ۳ تا ۱۱، ۱۶ نومبر
مصطفیٰ علی بریلوی	عہد انگریزی میں قوانین عدلیہ و انتظامیہ کا ارتقا	العلم، ص ۴۵ تا ۵۱، جولائی تا ستمبر
〃 〃	نواح کراچی کے مشہور بلوچ قبائل	〃 〃 ۴۳ تا ۵۵، اکتوبر تا دسمبر
مقبول بیگ بدخشانی، پروفیسر مرزا	ایران کا دور جدید	ثقافت، ص ۲ تا ۲۷، اکتوبر
مقتدی خاں شروانی، محمد	مادر درسگاہ کا پہلا دن	مجلہ یادگار، ص ۱۴ تا ۱۶،
〃 〃	سرسید کی وفات	〃 〃 ۱۷ تا ۱۸،
ملکاؤنکر، ایس	مسئلہ فرقہ واریت کے چند اہم پہلو	تحریک، ص ۱۹ تا ۲۸، اکتوبر
ممتاز احمد	الجزائری سوشلزم	چراغ راہ، ص ۳۹۳، ۳۹۷، دسمبر
〃	الحاق کشمیر	〃 〃 ۵۷ تا ۶۸، نومبر

غلام احمد، ماجد	ایک عظیم شخصیت — امیر عبدالرحمان مرحوم والی افغانستان	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۵۳ تا ۱۵۸، جولائی
غور، عبدالرحمان	جنگ نامہ — ایک نایاب بلوچی دستاویز	امروز، ص ۲، ۱۹ر اکتوبر
فاروقی، ضیاءالاسلام	عرب اور اسرائیل	جامعہ، ص ۳۶ تا ۴۷، اگست
فقیر بخش	عالم عرب کا المیہ اور عالم اسلام کا چیلنج	نصرت، ص ۱۵ تا ۴۶، ستمبر
فیض علی نقوی، سید	اتحاد عالم اسلام	ساغر، ص ۹، ۲۰ر اکتوبر
〃 〃	〃	〃 〃 ۵، ۳۰ر 〃
قاسمی، غلام مصطفیٰ (مترجم)	آج کے الجزائر کی ایک جھلک	الرحیم، ص ۱۲۳ تا ۱۳۱، جولائی
قمر تسکین	بہاولپور کے قلعے	کوہستان، ص ۲، ۵ر نومبر
کامل، مولانا مظہر علی	قیام پاکستان کا مقصد اولیٰ	قومی زبان، ص ۵ تا ۱۰، اگست
کلام، محمد یعقوب خاں	سکندر اعظم کا ہندوستانی بیڑا	نیرنگ خیال، ص ۴۱ تا ۵۰، اگست
کلیم اختر	ایک ملک، ایک کہانی — ایک فن کار (تاریخ پاکستان)	قندیل، ص ۱۲ تا ۱۳، ۳۰ر اگست
کمال، ڈاکٹر احمد حسین	جماعت اسلامی کا مطالعہ	شہاب، ص ۶ تا ۷، ۱۷ر دسمبر
〃 〃	〃 〃	〃 〃 ۷ تا ۸، ۲۴ر 〃
کنیز فاطمہ یوسف، ڈاکٹر	عرب اسرائیل جنگ (۱۹۶۷ء)	نصرت، ص ۳ تا ۴۲، ستمبر
کوثر نیازی	عرب سربراہوں کے اہم فیصلے	الجامعہ، ص ۱۳۵ تا ۱۴۷، اکتوبر نومبر
〃	کیا علماء پاکستان کے خلاف تھے؟	شہاب، ص ۲، ۲۰ر ستمبر

<u>گارڈن ٹائے</u>

علی بن ایاز (مترجم)	کمیونسٹ چین کا کلچرل انقلاب	تحریک، ص ۱۳ تا ۱۴، دسمبر
گوپال متل	انقلاب روس ؁	〃 〃 ۳۰ تا ۴۴، نومبر
لطف اللہ، مولانا	اسرائیل — عالم اسلام کے لئے ایک عظیم چیلنج	المنبر، ص ۱۵ تا ۵۴، ۸ ر ۱۵ر ستمبر
للنتھل، الفریڈ۔ ایم	اسرائیل — حیرت انگیز انکشافات	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۳ تا ۳۲، جولائی
مائوسے تنگ	نارمن بیتھیون کی یاد میں	ہمایوں، ص ۳۱۹ تا ۳۲۲، اکتوبر
مجاہد حسین	جب قائد اعظم نے اردو میں دستخط کیے	جنگ، ص　　۲۶ر دسمبر

ہیسٹنگز، لارڈ

خورشید السلام	لارڈ ہیسٹنگز کی ڈائری	ہمایوں، ص ۳۰۶ تا ۳۱۰، اکتوبر
یعقوب حسن، سید	انقلاب اکتوبر کا پس منظر	مشرق، ص ۲، ۲۸ اکتوبر
یعقوب طاہر - ناصر احمد	پاکستان میں اشتراکی سرگرمیاں	چراغ راہ، ص ۱۲۴ تا ۱۴۴، دسمبر
یوسف علی	سندھ صوبہ بمبئی سے کیسے جدا ہوا	جنگ، ص ۲، ۲۵ دسمبر
ــــــــ	میاں ممتاز دولتانہ نے کہا	حریت، ص ۵، ۱۴ اگست
	نئی سوویٹ تاریخ	تحریک، ص ۳ تا ۴، دسمبر

تعلیم

اجمل، مولانا محمد	اسلامی نظام تعلیم	الجامعہ، ص ۲۰ تا ۳۲، جولائی
اختر، شیر محمد	تعلیمی مسائل	قندیل، ص ۳، ۳۰ جولائی
اختر، عبدالحفیظ	کچھ بچوں کی کتابوں کے بارے میں	تعلیم و تدریس، ص ۴۵ تا ۵۸، اکتوبر
اصغر علی، ڈاکٹر شیخ	پڑھنے کی اہمیت اور اس کے مدارج	" " ۴۵ تا ۵۲، "
افتخار حسین، آغا	ہیلی بری کالج میں مشرقی علوم کی تعلیم	افکار، ص ۴۱ تا ۴۴، جولائی
خلیل حامدی	عہد نبوی اور عہد صحابہ کی تعلیمی سرگرمیاں	فکر و خیال، ص ۱۳ تا ۱۸، "
رفعت اقبال	سائنس کی تعلیم کے تقاضے	تعلیم و تدریس، ص ۸۹ تا ۹۳، اکتوبر
زہرہ کاظمی	بچوں میں تعلیمی پس ماندگی	" " ۶۱ تا ۷۰، "
سرور، آل احمد	ہندوستانی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم	ہماری زبان، ص ۱ تا ۲، ۲۲ جولائی
تشکیل عادل زادہ	ملکی ترقی اور تعلیم	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۰ تا ۱۱، ستمبر
شہاب، قدرت اللہ	پاکستان کے تعلیمی تقاضے	الجامعہ، ص ۹ تا ۱۴ + ۱۹، جولائی
شبیر احمد، شیخ	اردو ذریعہ تعلیم	قندیل، ص ۱۴، ۴ جولائی
عارفی، محمد نعیم	روس کا نظام تعلیم	فکر و خیال، ص ۲۸ تا ۳۲، اکتوبر نومبر
عبدالحی حسنی، مولانا	ہند اور پاکستان کا قدیم درسی نظام	ثقافت، ص ۲۰ تا ۲۹، اگست
عبدالعزیز، ڈاکٹر محمد	بچوں کی بنیادی ضروریات اور نصاب	[illegible]

ممتاز لیاقت	صحرا کی جنگ	ہمدرد صحت، ص ۱۲۵ تا ۱۳۰، اگست
ممتاز احمد	ویت نام، امریکہ اور موشے دایان	آئین، ص ۹ + ۸، ۲۲ دسمبر
منیر، منیر احمد	معاہدہ استنبول	چٹان، ص ۱۱، ۲۴ جولائی
مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ	شرق اوسط کا المیہ	ترجمان القرآن، ص ۲۳ تا ۳۴، جولائی
مہر، مولانا غلام رسول	انجمن اقوام متحدہ اور عرب	المنبر، ص ۳۵ + ۴۴، ۸ و ۱۵ ستمبر
میکش اکبرآبادی	آگرہ اور آگرے والے	آج کل، ص ۸ تا ۱۲، ستمبر
نادم سیتاپوری	بیگمات اودھ کے خطوط کا تاریخی پس منظر	نقوش، ص ۱۰۱ تا ۱۰۸، ستمبر
ناز، ایم ایس	تاج محل	قندیل، ص ۱۲-۱۳، ۲۰ دسمبر
ناموس، ڈاکٹر ایم ایس	یورپ نے علوم یونان سے سیکھے یا مسلمانوں سے؟	ارمغان، ص ۱۴۲ تا ۱۴۷، نومبر
نصر، حکیم عبداللہ خاں	عرب و اسرائیل جنگ کا واقعاتی جائزہ	المنبر، ص ۶، ۷، ۸ جولائی
نظامانی، حاجی شبیر محمد		
طفیل احمد قریشی (مترجم)	قیصر فقیر نظامانی اور تیمور شاہ والی کابل	الرحیم، ص ۱۸۸ تا ۱۹۶، اگست
نعمانی، حکیم محمد صلاح الدین	چین میں علم طب کا فروغ	خبرنامہ طب، ص ۹ تا ۱۰، جولائی
نسیم صدیقی	بہ یاد چھ ستمبر[1]	سیارہ، ص ۹۰ تا ۹۲، ستمبر
"	پاکستان کی اقتصادی ترقی کا جائزہ	چراغ راہ، ص ۴۳ تا ۵۰، اگست
"	"	" ۴۴ تا ۵۰، ستمبر
نور الصباح بیگم	تحریک آزادی میں خواتین کا کردار	ماہ نو، ص ۱۶ تا ۱۹، اگست
وثیر، پروفیسر امین اللہ	عربوں کا اندلس	ثقافت، ص ۳ تا ۱۳، ستمبر
"	"	" ۴۱ تا ۴۵، اکتوبر
وحید الدین خاں	صدر ناصر اور عرب قومیت	شہاب، ص ۵ + ۸، ۸ اکتوبر
جذبہ غازی	پاکستان کمیونسٹ پارٹی — چند اہم انکشافات	چراغ راہ، ص ۳۴۳ تا ۳۴۶، دسمبر
ولی الحق انصاری، ڈاکٹر	الٰہ آباد — ایک علمی و ادبی مرکز کی حیثیت سے	نگار پاکستان، ص ۹۰ تا ۹۶، اکتوبر
ولی اللہ خاں، محمد	لاہور کے آثار قدیمہ پر ایک سرسری نظر	ارمغان، ص ۷۶ تا ۹۱، نومبر

---

[1] اس سلسلے میں متعدد اہل قلم کی تحریرات اس نمبر میں شامل ہیں۔

مہدی حسن، پروفیسر	اسلامی ثقافت و تہذیب	فکر و خیال، ص ۱۰ تا ۱۴، اکتوبر
نور الصباح بیگم	حیدرآباد دکن (یادیں)	اخبار جہاں، ص ۲۲ تا ۲۵، ۸ /
"	" "	" " ۱۴ تا ۱۵، ۱۵ /
"	" "	" " ۲۲ تا ۲۳، ۲۹
"	" "	" " ۲۴ تا ۲۵، ۶ ر د
نورانی، امیر حسن	فن خطاطی اور اس کا عہد بہ عہد ارتقا	جامعہ، ص ۴۰ تا ۵۵، جولائی
واحدی، ملا	دلی کے لوگ	ہمدرد صحت، ص ۳ تا ۱۵، "
وزیر آغا، ڈاکٹر	کلچر کا مسئلہ	اردو زبان، ص ۹ تا ۱۵، دسمبر

خود نوشت

احمد ندیم قاسمی	اردو میں آپ بیتیاں	امروز، ص ۷، ۹ ر جولائی
اکبر الہ آبادی	اکبر الہ آبادی کا روزنامچہ	قومی زبان، ص ۲۲ تا ۲۸، اکتوبر
نور، ڈاکٹر منوہر سہائے	پورن سنگھ سیٹھی کی کہانی خطوط کی زبانی	شان ہند، ص ۹ تا ۱۴، دسمبر
تمنا عمادی	میری شاعرانہ معرکہ آرائیاں	قومی زبان، ص ۳۷ تا ۴۴، اکتوبر
"	" "	" " ۳۳ تا ۴۳، نومبر
"	" "	" " ۳۹ تا ۴۶، دسمبر
حسین، شاہ	شاہ حسین کی سرگزشت[1]	امروز، ص ۲ ر جولائی
خالدہ ادیب خانم	انقلاب ترکی میں میرا حصہ	نگار پاکستان، ص ۳۷ تا ۴۱، اکتوبر
درد کاکوروی، مولوی نذر علی	نقوش ماضی	[illegible]، ص ۵۵ تا ۶۷، جولائی
عبدالحمید صدیقی، محمد	صدر ایوب کی خود نوشت سوانح حیات	شہاب، ص ۲ تا ۷، ۱۹ ر نومبر
" "	" "	" " ۲ تا ۷، ۲ ر دسمبر
" "	" "	" " ۳ تا ۷، ۳ ر دسمبر
عطاء الرحمان کاکوی، شاہ	شادی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی	نگار پاکستان، ص ۲۶ تا ۳۸، ستمبر

[1] سرگزشت کا یہ سلسلہ [illegible]

تہذیب و ثقافت

مقالہ

فارسی زبان و ادب

یہ رسالہ " اردو " کے ایسے مضامین کا انتخاب ہے جو فارسی زبان و ادب سے متعلق ہیں ، یہ انتخاب ممتاز ماہر ایرانیات سید حسام الدین راشدی نے کیا ہے اس مجموعے میں مندرجہ ذیل مقالے شامل ہیں ۔

- تصنیفات شیخ فریدالدین عطار — حافظ محمود شیرانی
- شاہنامے کا دیباچۂ قدیم — حکیم شمس اللہ قادری
- فردوسی کا مذہب — پروفیسر شیخ محمد اقبال
- رباعیاتِ عمر خیام — عبدالباری آسی لکھنوی
- فارسی زبان کے زیرسایہ اردو کی تدریجی ترقی — ڈاکٹر سید عبداللہ
- نواب صمصام الدولہ شہنواز خاں (صاحب مآثر الامراء) — محمد حسین محوی صدیقی

قیمت آٹھ روپے

انجمن ترقیِ اردو

بابائے اردو روڈ

کراچی

عصمت موہانی	اپنی کہانی اپنی زبانی	صبا / ص ۳۲ تا ۳۵ / جنوری تا مارچ
فرح پہلوی، ملکہ	شہنشاہ ایران سے میری پہلی ملاقات (انٹرویو)	اخبار جہاں / ص ۸-۹ / ۱۵ نومبر
"	" "	" " ۸-۹ / ۲۲ "
"	" "	" " ۱۰-۱۱ / ۶ دسمبر
قیصری بیگم	کتاب زندگی[1] (۲)	اردونامہ / ص ۷۰ تا ۸۳ / جون
"	" (۳)	" " ۷۹ تا ۱۱۴ / اکتوبر
کشفی، خان بہادر میجر مرزا ابوجعفر	ایک ہولناک آپ بیتی	العلم / ص ۹۶ تا ۱۰۰ / جولائی تا ستمبر
محروم، تلوک چند	دو مضمون	
	۱- میری ادبی اور شاعرانہ زندگی کی نشو ونما	
	۲- میرا نظریۂ شاعری	نقوش / ص ۱۵۶ تا ۱۶۳ / ستمبر
مشتاق احمد خاں	میری ڈائری	" " ۸۲ تا ۹۳ "
ولایت حسین، میر	میر ولایت حسین کی کہانی خود ان کی زبانی	مجلہ یادگار / ص ۳۴ تا ۳۰ /

خطوط

احمد نواز، ملک	چند نادر مکتوبات[2]	ماہ نو / ص ۱۲ تا ۱۴ / اکتوبر
اکبر الہ آبادی	افادات اکبر (اکبر الہ آبادی کا خط سید عشرت حسین کے نام ادھ ایک کتاب کی تمہید)	قومی زبان / ص ۵۹ تا ۶۴ / جولائی
برکاتی، حکیم محمود احمد	مکتوبات مولانا مناظر احسن گیلانی بنام محمود احمد برکاتی	معاصر / ص ۲۸ تا ۶۶ / اپریل
شرر، عبدالحلیم	اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط	قومی زبان / ص ۶۵ / جولائی
غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر	مکتوبات قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی	اردو / ص ۱۲۹ تا ۱۴۳ / اکتوبر
مہدی علی خاں، راجہ	خطوط راجہ ظرافت کے	اردو زبان / ص ۱۳ تا ۱۴ / اگست ستمبر
نیاز فتح پوری	مکتوبات بنام برہم ناتھ دت	نگار پاکستان / ص ۵۳ تا ۶۳ / ستمبر
" "	" " "	" ۳۳ تا ۳۶ / اکتوبر

---

[1] اس مضمون میں غلام یزدانی صاحب کا ایک خط بطور تبرک نقل کیا ہے جس میں اس سلسلے پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

[2] مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کے نام [illegible]، شبلی نعمانی [illegible]، محمد اسحاق [illegible] سیکرٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے خطوط

سہ ماہی

"اردو"

جنوری ۱۹۶۸ء کے شمارے کے مضامین

مسلسل مضامین

صفحات ۲۲۶ - ٹائپ کی طباعت - سفید کاغذ - متعدد تصویریں
فی شمارہ:- تین روپے پچاس پیسے - قیمت سالانہ بارہ روپے

کفایت شعاری

بڑی خوبی ہے

اپنی بچت

بینک آف بہاولپور لمیٹڈ

میں جمع کرائیے

نیشنل بینک آف پاکستان کی سبسی ڈیری

قومی زبان

کراچی

انجمن ترقی اردو

QAUMI ZABAN Karachi



مدیر: مشفق خواجہ
محمد مصلح الدین سعدی کے زیر اہتمام انجمن پریس سے شائع ہوا۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

قومی زبان

جلد ۳۲ شمارہ ۵

مئی سنہ ۱۹۶۸ء

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

قیمت: [illegible] روپے

قیمت: فی پرچہ ایک روپیہ

زیر تعمیر اردو کالج کے لئے عطیات

اب تک زیر تعمیر اردو کالج کے لئے مبلغ تین لاکھ تئیس ۲۳ ہزار پانچ سو نوے روپے جمع ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ماہ جو رقوم موصول ہوئیں ان کی تفصیل یہ ہے:

عطیات:-

آدم جی ڈیوٹنر پاکستان لمیٹیڈ آدم جی ہاؤس۔ میکلوڈ روڈ۔ کراچی	مبلغ دو ہزار دو سو پچاس روپے
میسرز شاہ نواز لمیٹڈ ۱۹۔ ویسٹ وہارف کراچی	مبلغ سات سو پچاس روپے
نذر انٹرنیشنل لمیٹڈ۔ کراچی	مبلغ پانچ سو روپے
میسرز انٹرنیشنل اسٹیل اینڈ جنرل انجنیئرز۔ الفلاح۔ مال روڈ، لاہور	مبلغ چار سو روپے صا
پرسٹیج ایڈمدٹاٹرنگ لمیٹڈ۔	مبلغ دو سو روپے

بذریعہ فروخت رسائد:-

جناب فیروز عباسی صاحب۔ کراچی	مبلغ پانچ سو تراسی روپے
جناب محمود احمد صاحب۔ ریجنل الکشن کمشنر مغربی پاکستان، لاہور	مبلغ تین سو روپے
پرنسپل اردو کالج	مبلغ ایک سو روپیہ
جناب جلیل قدوائی صاحب۔ کراچی	مبلغ تیس روپے

صا۔ اس ادارے کی طرف سے مبلغ ایک سو ایک روپے بھی موصول ہو چکے ہیں۔

فہرست

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

ڈاکٹر ممتاز حسن

پاکستان کی ثقافتی میراث

پاکستانی ثقافت ایک ایسی چیز ہے جو بہت سی چیزوں کے تال میل سے وجود میں آئی ہے۔ اگر میں اس کی کوئی نظیر پیش کرنا چاہوں تو وہ واحد چیز جس سے پاکستانی ثقافت کو مماثلت دی جا سکتی ہے امریکی قومیت ہے۔ جس طرح امریکہ میں یورپ کی مختلف قوموں کے ترکِ وطن کرنے والے افراد نے گھل مل کر ایک الگ قوم کی شکل اختیار کر لی ہے بالکل اسی طرح ان علاقوں کو جن پر اب پاکستان مشتمل ہے ایک ایسے بڑے ثقافتی طاس کی حیثیت حاصل رہی ہے جس میں ہر جانب سے اور ہر زمانے میں مختلف قوت اور وسعت کے دھارے بہہ کر آتے رہے ہیں۔ ازمنۂ قدیم میں آسٹریلیا میں جا کر آباد ہونے والے حامی النسل: فرلقی، منگول، ایرانی، یونانی، سیتھی، پارتھیائی اور کشن قوم کے لوگ پاکستان آئے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں عرب، ترک اور پٹھان آئے۔ پٹھانوں کے بعد وہ عظیم مغل آئے جن کی یاد ابھی تک حافظے میں تازہ ہے۔ مغلوں کے بعد آنے والے انگریز تھے جنھوں نے تمام جدید چیزوں کو رواج دیا۔ ان تمام لوگوں کی ثقافتوں کا مجموعہ وہ چیز ہے جسے ہم پاکستان کی ثقافتی میراث کہتے ہیں لیکن جب ہم میراث کے سوال پر آتے ہیں تو ہمیں ایک فرق کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ کیا ہمارے خیال میں وہ تمام چیزیں جو ہمیں ورثے میں ملی ہیں ہماری ثقافت کا جزو ہیں؟ میں یہ کہوں گا کہ ایسا نہیں ہے یقیناً یادگاریں ہماری میراث کا حصہ ہیں۔ لیکن ان علاقوں میں وقتاً فوقتاً زندگی سے متعلق جو تصور رہا ہے اس میں فرق پڑتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر میں موہن جو دڑو کی منصوبہ بندی کی تعریف کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس بات سے بھی آگاہ ہوں کہ ہمارا عقیدہ پروہت راجہ کے عقیدے سے مختلف ہے۔ وہ سورج کا پجاری تھا اور ہمارا ایمان ایک ایسے خدا پر ہے جو سورج نہیں ہے۔ اس ضمن میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے اس علاقے میں وقتاً فوقتاً لوگوں کے جو بھی معتقدات رہے ہوں ان کی جگہ مکمل طور پر اسلام نے لے لی ہے جس کا دنیا کے بارے میں خود اپنا ایک تصور اور ایک نظریہ ہے۔ آیئے اب ذرا موہن جو دڑو، ہڑپہ، ٹیکسلا جیسی تہذیبوں کے آثار کی اہمیت کا جائزہ لیں۔ ان بکھرے ہوئے آثار کی کیا اہمیت ہے؟ میرے خیال میں وہ یہ داستان بیان کرتے ہیں کہ طاقت اور فخر و مباہات کا کس طرح خاتمہ ہوتا ہے وہ انسان کے فانی ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ دوام اور بقا صرف خدا ہی کے لیے ہے وہ حقیقۃ الحقائق ہے جو اس کائنات کو قائم اور زندہ رکھتی ہے۔

اقامتی اردو کالج

کی

تعمیر میں حصہ لیجئے

اردو آپ کی

اردو کالج آپ کا

اس کالج کی زیر تعمیر عمارت میں ایک اینٹ آپ بھی رکھئے

اختر حسین

(اختر حسین)
ہلال پاکستان
صدر انجمن ترقی اردو

ے عہد حکومت تک یہ تصویریں ایرانی طرز پر بنائی جاتی تھیں۔ البتہ عہد جہانگیری میں اس میں تبدیلی ہوئی اور اس نے کچھ اور بھی اختیار کیا۔ جہانگیر فطرتی مناظر کا دلدادہ تھا۔ اسی لیے ان چھوٹی تصویروں میں پھولوں، درختوں اور چڑیوں جیسی قدرتی چیزوں کی تصویر کشی کی جانے لگی۔

مغلوں کے دبستانِ مصوری نے دوسرے مکتب ہائے مصوری کو بھی متاثر کیا۔ ان میں پہاڑی اور دکنی دبستان مشہور ہیں۔ ان دبستانوں سے تعلق رکھنے والے مصوروں نے انیسویں صدی عیسوی تک تصویریں بنانے کی روایت برقرار رکھی۔ اس کے بعد یہ فن عبدالرحمان چغتائی سے پہلے تک گویا ناپید رہا۔ عبدالرحمان چغتائی نے اس طرزِ مصوری کی تجدید کی۔

جہاں تک سنگ تراشی کے فن کا تعلق ہے سب سے پہلے جو چیز ذہن میں آتی ہے وہ گندھارا آرٹ ہے۔ گندھارا کی تہذیب پشاور سے جہلم تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں جو مجسمے بنائے گئے ان پر یونانی اثر نمایاں ہے۔ چنانچہ اسی اثر کے تحت گوتم بدھ کا سب سے پہلا مجسمہ گندھارا میں تیار کیا گیا۔ ٹیکسلا اور پشاور کے عجائب خانوں میں گندھارا طرز کے بنے ہوئے مجسموں کا خاصا ذخیرہ محفوظ ہے۔

ہمارے ہاں مشرقی اور مغربی پاکستان میں ہندوؤں کی سنگ تراشی اور مجسمہ سازی کا فن بھی ملتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں ایک نئے طریقے سے مہاتما بدھ کے مجسمے تیار کرنے کی داغ بیل پڑی۔ یہ مجسمے بسالٹ (گہرے رنگ کے آتش فشانی پتھر) سے تیار کیے جاتے تھے۔ اس کے بہت سے نادر قسم کے نمونے ڈھاکہ کے عجائب خانے، پہاڑ پور کی خانقاہوں اور دوسری جگہوں میں محفوظ ہیں۔ پہاڑ پور دنیا میں بودھ مذہب کی بڑی خانقاہوں میں سے ایک ہے۔

جہاں تک سفال سازی اور کوزہ گری کا تعلق ہے ہمارے ہاں اس کے انتہائی ابتدائی دور کے نمونے موجود ہیں۔ یہ نمونے کوٹ ڈیجی، موئن جو دڑو اور ٹیکسلا میں محفوظ ہیں۔ سفال سازی اور کوزہ گری کے مختلف قسم کے نمونے ہیں۔ موئن جو دڑو میں قلس اور نما کے سے نقوش کے برتن مقبول تھے۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں اقلیدسی ڈیزائن پسند کیے جاتے تھے۔ مسلمانوں کے دور میں انسانی شبیہیں بھی بنائی جاتی رہیں گو اس دور میں یہ رواج کم ہو گیا تھا۔

آخر میں ہم ذیلی فنون کو لیتے ہیں۔ اس قبیل کے آرٹ میں کھلونے بنانے کا فن، سکہ سازی اور پارچہ بافی شامل ہیں۔ سکہ سازی کا کام اسلامی تاریخ کی ابتدا سے شروع ہوا۔ ہمارے قومی عجائب خانے میں ایک سکہ ہے جو ۱۳۰ھ میں ڈھالا گیا تھا۔ برِ صغیر میں سب سے پہلے ٹکسال ٹیکسلا میں قائم کی گئی تھی۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں سکہ سازی کے فن کو کافی فروغ دیا گیا۔

ہمارے ملک میں مختلف ادوار کے فنِ تعمیر کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ سب سے قدیم تو موئن جو دڑو اور کوٹ ڈیجی کی اینٹوں کی بنی ہوئی عمارتوں کا طرزِ تعمیر ہے، یہ دو وادیِ سندھ کی تہذیب کی غیر معمولی مثالیں ہیں۔ ابھی تک ماہر یہ طے نہیں کر پائے ہیں کہ آیا کوٹ ڈیجی کے آثار موئن جو دڑو کی تہذیب کے ابتدائی مرحلہ کے آثار ہیں یا پیشتر کی ایک علیحدہ تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ کوٹ ڈیجی کے آثار اسی تہذیب کے ابتدائی مرحلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پاکستانی ثقافت کا موجودہ رنگ غالب طور پر اسلامی ہے اور اسے بالعموم اسلامی ثقافت کہا جاتا ہے۔ میں اس تصور کی زیادہ گہرائی میں جانا نہیں چاہتا ہوں کیونکہ مجھے اپنی کوتاہیوں کا پورا احساس ہے۔ میں بس یہی کہوں گا کہ اسلام سے مراد خدا کی وحدانیت بنی نوع انسان کی وحدت اور مساوات انسانی پر اصرار ہے۔ میرے عقیدے کے مطابق اسلامی ثقافت کا ایک تیسرا نمایاں جزو جستجو کا جذبہ ہے۔ قرآن کریم بار بار زور دیتا ہے کہ اَفَلاَ تَعْقِلُوْن (تم سمجھتے کیوں نہیں) اَفَلاَ تَتَفَکَّرُوْن (تم غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟) اَفَلاَ تَعْلَمُوْن (تم جانتے کیوں نہیں)۔

میری رائے میں مسلم ثقافت کی چوتھی خصوصیت اس کی زندگی کو بھرپور بنانے کی خواہش ہے۔ انسان محض اس لیے پیدا نہیں ہوا ہے کہ وہ زندگی کے ایک مخصوص رخ کو دیکھ لے۔ اس کے سامنے پوری زندگی ہوتی ہے اور اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کتاب زندگی کے ایک ایک نقطے کو پڑھے گا۔ میں اس کا تذکرہ اس لئے کر رہا ہوں کہ اس تصور نے ان لوگوں کے پورے زاویۂ نظر کو متاثر کیا ہے جنھوں نے بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے خوبصورت مسجدیں، شاندار مدرسے قائم کئے اور ملک گیر سڑکیں تعمیر کی ہیں۔

یہ چند موٹی موٹی باتیں بتانے کے بعد اب میں اپنی ثقافتی میراث کے موضوع کی طرف آؤں گا۔ پاکستان کے ثقافتی خزانوں کو چھ بڑے درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جو یہ ہیں۔

- فن تعمیر
- مخطوطات اور خطاطی کے نادر نمونے
- چھوٹی تصویروں کی نقاشی
- سنگ تراشی
- سفال سازی
- ذیلی فنونِ لطیفہ

خطاطی ہی کی ذیل میں، نقش و نگار کے ذریعے کتابوں کی آرائش کا فن ہے۔ اس فن کو دنیائے اسلام اور برصغیر میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ مخطوطات کی خوب آرائش کی جاتی تھی اور انھیں مطلا و مذہب کیا جاتا تھا۔ تحریر کو دلکش اور نظر فریب بنانے کے لیے گہرے گہرے طلائی، نیلے، نارنجی اور دوسرے رنگ استعمال کیے جاتے تھے۔ کتابوں کو مطلا کرنے کا فن ترکوں کے ساتھ برصغیر میں پہنچا، پٹھانوں کے دور میں پروان چڑھا اور مغلوں کے ہاتھوں عروج کو پہنچا۔

فن تعمیر اور خطاطی کے بعد چھوٹی چھوٹی تصویروں یا تصویر پتوں کا نمبر آتا ہے۔ خوشنویسی کی طرح اس معاملہ میں بھی ہم ایران کے مرہونِ منت ہیں۔ یہاں چھوٹی تصویروں اور شبیہوں کے بنانے کی ابتدا عبدالصمد اور میر علی نے کی۔ یہ دونوں ایران کے مشہور مصور تھے۔ جب ہمایوں ایران سے واپس ہو کر ہندوستان میں تخت نشین ہوا تو یہ دونوں ایران سے اس کے ساتھ آئے تھے۔ اکبر

نشان کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔

برِ صغیر میں مسلمانوں کے عہد میں پارچہ بافی کو بھی کم ترقی نہیں دی گئی۔ مثال کے طور پر کشمیری شال کو لیجئے۔ یہ دنیا بھر میں پسند کی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب مصر میں نپولین کو ایک کشمیری شال پیش کی گئی تو اُسے یہ اتنی پسند آئی کہ اس نے سوچا کہ یہ اس کی محبوبہ جوزیفائن کے لیے موزوں ہوگی۔

موئن جو دڑو اور کوٹ ڈیجی کے بعد وہ مختلف طرز ہائے تعمیر ہیں جن کے آثار حسب ذیل مقامات پر محفوظ ہیں۔ ٹیکسیلا میں "بھیڑ" نامی ٹیلہ جو قدیم ہخامنشی دور (قبل مسیح) کے ایرانی باشندوں کی آبادی تھی، "سرکپ" جو یونانیوں کی بستی تھی اور "سرسکھ" جو وسطی ایشیا سے آنے والے قدیم کشن باشندوں کا شہر تھا۔ ان مقامات پر یونانی طرز کی کئی عمارتیں، بودھوں کی خانقاہیں اور ایک زرتشتی عبادت گاہ بھی تھی۔

ٹیکسیلا کی یادگاروں میں پارتھیا نامی قدیم (شمال مشرقی ایرانی) علاقے کا رنگ بھی نمایاں ہے اور قدیم یونانی علاقے "ڈورس" کا اثر بھی۔ اس علاقے سے تعلق رکھنے والے لوگ پارتھیا والوں سے پہلے آئے تھے۔ ٹیکسیلا کے دور کے بعد فن تعمیر کی ترقی کے اور کئی مرحلے آتے ہیں یہاں تک کہ ہم مسلمانوں کے دور میں پہنچ جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے دور کا آغاز سندھ میں عرب حکومت سے ہوتا ہے جس کی یادگاریں منصورہ اور بھنبھور کے آثار میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد غزنوی، غوری اور غلام خاندان آتے ہیں۔ غلام خاندان کے بادشاہوں نے لاہور اور دہلی میں بہت سی یادگاریں تعمیر کرائیں۔ اس دور کے فن تعمیر کا مشہور ترین نمونہ قطب مینار ہے جو اب بھی دہلی کے پرانے شہر کے لیے وجہ زیبائش ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی یادگاروں میں ہندو فن تعمیر کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ پورے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے میری رائے یہ ہے کہ ہندو طرز تعمیر میں تفصیلات کی بڑی فراوانی ہوتی ہے اور بسا اوقات، عمارتوں کے بیرونی خطوط ان تفصیلات میں کھو جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس میں روشنی اور ہوا کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے یا بہت تھوڑا رکھا جاتا ہے۔ یہ دو عوامل۔ روشنی اور ہوا۔ اس مسلم فن تعمیر میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جس نے برصغیر میں ترقی کی۔ تغلقوں اور خلجیوں کے دور میں منگولوں کے حملے کے بعد، فوجی یا قلعہ نما طرز کی تعمیر کا بھی رواج ہو گیا۔ اس کی ایک مثال ملتان میں رکن عالم کا مقبرہ ہے۔

مسلمانوں کا فن تعمیر مغل دور میں کمال کو پہنچا۔ اقبال نے اس فن تعمیر کی کیفیت کی وضاحت دلبری یا قاہری کے الفاظ سے کی ہے۔ یہ خوبی دہلی اور لاہور کی بادشاہی مسجدوں یا حسن و رعنائی کی اعلیٰ ترین یادگار تاج محل میں انتہائی نمایاں نظر آتی ہے۔

مسلم دور کی بعض یادگاروں مثلاً لاہور میں مسجد وزیر خاں، مشرقی پاکستان میں بی بی پری کا مقبرہ اور لال باغ کی مناسب طور پر نگہداشت نہیں کی گئی ہے گو کہ وہ بڑی خوبصورت چیزیں ہیں۔

اس کے بعد میں خطاطی اور مخطوطات کا تذکرہ کروں گا۔ میں ادب کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو بذات خود ایک موضوع ہے۔ خطاطی ایک ایسی چیز ہے جسے مسلمانوں نے ایک عظیم فن کی شکل دی۔ خطاطی کا پہلا مرحلہ خط کوفی ہے۔ اس کی جگہ جلد ہی نسخ نے لے لی جو دسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچا۔ سترھویں صدی میں اسے اور ترقی دے کر ایرانیوں نے خط نستعلیق نکالا۔ نستعلیق کو خوبصورت ترین خط مانا گیا ہے۔ اس میں بمشکل ہی کوئی خط سیدھا ہوتا ہے۔ یہ خط زیادہ تر خوشنما دائروں والی ایک حسین ترتیب پر مشتمل ہوتا ہے۔

پاکستان میں ہم نے نسخ اور نستعلیق کے علاوہ طغروں کو بھی ترقی دی۔ طغروں کو، جسے خصوصیت کے ساتھ مشرقی پاکستان میں ترقی دی گئی، مختلف بنیادی خیال یا نقش ہوتے ہیں مثلاً تیر اور کمان۔ طغرے شہنشاہ یا حکمراں کے تمام سرکاری احکامات پر امتیاز

ڈاکٹر انصار اللہ نظر

اردو میں تدوین

(۱)

اردو میں عام طور پر تدوین کے کام کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اس کام کی قدر و قیمت اور اہمیت پورے طور پر احساس عام طور سے نہیں کیا گیا۔ اکثر اہل علم بھی اسے دوسرے درجے کا کام سمجھتے ہیں۔ زیادہ افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ وہ حضرات نے بھی جن کا واقعی سرمایہ افتخار یہی ہے اب تک نہ تو اس مسئلے پر غور کیا ہے کہ تدوین کا مقصد کیا ہے اور نہ اس کے اصول و ضوابط اور حدود کے تعین ہی کی فکر کی ہے انتہا یہ ہے کہ قدما نے اس کے لئے "ترتیب" کی اصطلاح استعمال کی تھی وہی آج تک رائج ہے درانحالیکہ اب "ترتیب" کی حیثیت عمل تدوین کے ایک شعبے سے زیادہ نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اردو میں تدوین کا کام لیا ہے اس کی تاریخ بھی تقریباً اتنی ہی پرانی ہے جتنی تصنیف و تالیف کی۔ صوفیائے کرام کے ملفوظات اور فرمودات کے جمع کرنے کا دستور اس وقت بھی تھا جب اردو میں باقاعدہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اور اس کام کو بھی تدوین کے دائرے میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اس وقت میرے لئے یہ بتانا ممکن نہیں کہ تدوین کا قدیم ترین نمونہ کب اور کس کے ہاتھوں وجود میں آیا اور اس کے اسباب و محرکات کیا تھے لیکن تذکروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں تدوین کا دائرہ مواد کی فراہمی یا اس کی ترتیب تک محدود تھا چنانچہ اس وقت اس عمل کے لئے "ترتیب" کی اصطلاح مناسب بھی تھی۔ کسی خاص مقصد کے تحت کسی ایک تخلیق کے مختلف اجزا یا مختلف تخلیقات کی مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کرنا ہی اس زمانے میں تدوین کا مقصود و مفہوم تھا، اس سے زیادہ کی عام طور پر مدون سے توقع بھی نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن دوسرے تمام علوم کی طرح اس فن نے بھی بتدریج ترقی کی ہے اور آج اردو میں یہ باقاعدہ اور باضابطہ ایک فن ہے جس کے کئی شعبے ہیں۔ چنانچہ اب یہ ضروری ہے کہ اس فن کے تمام اچھے نمونوں کو سامنے رکھ کر اس کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ اس مقالے کا مقصد یہی ہے۔

مناسب تو یہ تھا کہ دیوان زادہ حاتم سے شروع کر کے تدوین کے تقریباً سبھی نمونوں کا ذکر تاریخی ترتیب کے ساتھ کیا

تو ایک مثال ہوتی اس سے بھی زیادہ پیچیدہ مسائل مدون کے سامنے آتے ہیں یہیں اس کی ذمہ داری اور اس کی دقت کا اندازہ ہوتا ہے یہیں اس کی صلاحیتوں کے جوہر کھلتے ہیں اور یہی مواقع ہیں جہاں تدوین کی اہمیت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں، غور کیجئے تو مدون کی ادنیٰ لغزش کے نتیجہ میں بھی تنقید ہی نہیں تحقیق میں بھی بڑی سے بڑی غلطی کے لیے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں بلاشبہ تدوین کی اہمیت ادبیات کے مطالعہ کے سلسلے میں بنیادی ہے اور یہ ایک نہایت نازک اور اہم فن ہے۔

میر رشک کا زمانہ وہ تھا جب تدوین کا کام ابتدائی مراحل میں تھا۔ اس وقت تک کوئی ایسا نمونہ موجود نہیں جسے معیاری یا مثالی کہا جا سکتا اور جسے سامنے رکھ کر کام کو آگے بڑھایا جا سکتا۔ انھوں نے اپنی طبیعت کی رہبری سے کام کیا اور اپنے طریقہ کار کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے ؎

مرتب ہوا جب کہ دیوان سب | مجھے قصد صحت کا پیدا ہوا
قلمزد ہیں آخر کی [illegible] تھا | وہ تحریر [illegible] سہوا
ہوئیں سہو کاتب کی نظمیں درست | بنا [illegible] اصلاح ہوا
مجھے دخل اس سے زیادہ نہ تھا | تبدل میں جو کچھ جو پیدا ہوا
اگر سہو اس پر بھی پائے کوئی | ہوں انسان اس میں عجب کیا ہوا

ان اشعار سے رشک کے نظریۂ تدوین کو سمجھنا آسان ہے۔ ان کے نزدیک اس فن کے چار شعبے ہو سکتے ہیں۔

۱۔ فراہمی مواد یا تلاش متن
۲۔ ترتیب متن
۳۔ تصحیح متن
اور ۴۔ تنقید متن

عام حالات میں مرتب ترتیب میں دخل نہیں دیتا لیکن رشک نے اپنے عمل سے یہ ظاہر کیا ہے کہ ترتیب بھی مدون کے دائرۂ عمل و اختیار میں ہے یعنی وہ حسب ضرورت متن کی ترتیب میں بھی اپنے اختیار کا استعمال کر سکتا ہے۔ چنانچہ کلیات ناسخ کے خاتمہ میں ہے۔

کلیات مذکور (ناسخ) بہ طرز دلکش با حجم قلیل کہ دیوان دوم ضمن بہ دفتر پریشان بر حاشیہ و دیوان [illegible] بہ دفتر شعر بر حاشیہ و ہر ردیف بہ ضمیمہ دفتر پریشان و مثنوی و رباعیات و تاریخہا نیز در متن و بعض از تاریخہا و رباعیات بر حاشیہ ۔۔۔ زیور طبع پوشیدہ ترتیب کے بعد تصحیح اغلاط کا کام تھا اس کی بھی رشک نے دو صورتیں بیان کی ہیں "سہو کاتب" اور "نسیان املا" اول الذکر کی تصحیح تو اصل مسودہ سے مقابلہ کر کے کی جا سکتی ہے یہی کام "بہ دقت ریزنگاہ" سے ہوتا ہے نسیان املا اس سے مختلف ہے، خود مصنف سے کوئی لفظ یا کسی لفظ کا حرف [illegible] اور اغلاط کی تصحیح بھی خود [illegible] ہوا ہے اور یہ کام بھی بہت زیادہ مشکل ہے۔ لیکن [illegible] ہوتے اپنے اصول [illegible] اپنی طبیعت اور اپنے نظریہ [illegible] ۔ اگرچہ رشک نے [illegible]

جاتا لیکن اس وقت میرے لئے بوجوہ یہ بات ممکن نہیں مجھے جس ترتیب سے ضروری کتاب دستیاب ہوتی جائے گی ان عنوا کے تحت ان کا تعارف کراتا رہوں گا۔

دیوان ناسخ

لکھنؤ میں تلامذۂ ناسخ و آتش نے زبان و ادب کے سلسلے میں جہاں اور نئے امکانات کی نشاندہی کی تھی وہیں انھوں نے تدوین کے دائرے کو بھی وسیع کیا۔ ان میں میر علی اوسط رشک کی شخصیت اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ انھوں نے دوسروں کے مقابلے میں تدوین کا کام زیادہ کیا ہے۔ اپنے استاد کی مختلف تصانیف کے علاوہ خود اپنی تصنیفات کو انھوں نے مدون کیا اور تدوین کے کام سے متعلق اس غلط فہمی کو دور کیا اور عملاً یہ بتایا کہ یہ بات بالکل ضروری نہیں کہ مدون دوسرے ہی کی تصانیف کی تدوین کرے گا۔ وہ ضرورت محسوس کرے تو خود اپنی تصنیف کو بھی مدون کر سکتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اپنی تصنیف کی تدوین کا کام نسبتاً آسان ہوتا ہوگا۔ فارسی کا مشہور مقولہ کہ "تصنیف را مصنف نکو کند بیان" ہر موقع پر لازماً صحیح ثابت نہیں ہوتا بسا اوقات دوسرا شخص اپنے علم و فضل ذکاوت و ذہانت کے سبب خود مصنف کے مقابلے میں کم وقت میں زیادہ آسانی اور بہتر طریقہ پر اس کی کسی تصنیف کی تدوین کر سکتا ہے۔

میر رشک نے اپنے استاد شیخ امام بخش ناسخ کا کلیات مدون کرنے کے بعد ایک قطعہ تاریخ اس عنوان سے کہا۔

"تصحیح اغلاط و تنقید الفاظ کلیات ناسخ"

اس عنوان سے بھی رشک کے تدوین سے متعلق تصور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ غزلیات کے جمع کرنے انھیں ایک مخصوص اصول کے ساتھ مرتب کرنے اور پھر "تصحیح اغلاط" اور "تنقید الفاظ" کو بھی وہ تدوین ہی کا شعبہ سمجھتے تھے۔ بظاہر تصحیح اغلاط کا کام مشکل نہیں کہ مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تنقید الفاظ والی منزل نہایت مشکل ہے اس کے لئے مدون زیر بحث پر حاکمانہ قدرت کے ساتھ ساتھ نہایت ذکی اور سلیم طبیعت بھی شرط لازم ہے۔ مدون کے سامنے اس منزل پر جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا اندازہ کرنا کچھ آسان نہیں، مختلف نسخوں میں ایسے دو یا زاید الفاظ بھی مل سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک اتفاقاً بہ لحاظ معنی بھی مناسب و برمحل ہو سکتا ہے اور فنی نقطہ نظر سے بھی موزوں ہو سکتا ہے مثال کے طور پر ناسخ کا ایک شعر ہے ؎

ہے نا واقف رہ پہلے ہے رہبر موجود کور سے آگے قدم دیکھ عصا لے رکھا

دیوان ناسخ کے کچھ نسخوں میں مصرعہ ثانی میں "کور" ہے باقی میں "گور" لکھا ہے دونوں الفاظ شعر میں موزوں بھی ہیں اور مناسب بھی یہ بھی حقیقت ہے کہ قدیم مخطوطات میں کاف تازی اور کاف فارسی میں ایک اور دو مرکز کا التزام نہیں ہوتا

ل رشک نے بہت پہلے واقعہ دیوان زادہ مرتب کر چکے تھے اس پر تفصیلی بحث کسی اگلی اشاعت میں کروں گا۔ غالباً خود اپنی کو ایک مقصود نقطہ نظر سے مدون کرنے کی یہ پہلی مثال ہے۔

اور دیوانِ ذوق میں کتنی ہی تحقیقی غلطیاں ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان کے ذریعہ آزاد نے تدوین کے بہترین اصول کی نشان دہی کر دی ہے۔ تدوین کی حد تک خود آزاد کو بھی اپنے کارناموں پر ناز تھا۔ آبِ حیات سے متعلق انشاءاللہ پھر کسی موقع پہ عرض کروں گا اس وقت دیوانِ ذوق کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کے متعلق خود اس کے مدون یعنی آزاد کا یہ خیال ہے کہ

آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا ہوگا (مجموعہ مکتوباتِ آزاد ص۹۵)

سب سے پہلا مرحلہ فراہمی متن کا تھا۔ ذوق کا حال یہ تھا کہ انھوں نے خود اپنے کلام کی حفاظت نہیں کی حال یہ تھا کہ ان کے عزیز ترین دوست مولوی محمد باقر کو گلشن بے خار کے لیے ان کے کلام کی تلاش ہوئی تو انھیں صرف ایک سو اکسٹھ شعر دستیاب ہوئے جنھیں انھوں نے اس نوٹ کے ساتھ داخلِ تذکرہ کیا۔

”یہاں تک اشعار تذکرہ سابق میں سے نقل کیے گئے اور باقی مہتمم مطبع نے بہت کوشش سے بہم پہنچا کر لکھے ہیں“ (گلشن بے خار طبع ۱۲۹۵ھ)

آزاد نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد دیوان کی ترتیب کا کام دوبارہ[1] شروع کیا، اس وقت تک ان کے بہت کچھ مسودات ضائع ہو چکے ہیں، بقول آزاد ”زمانے کی ہوا ایسی بدل چکی تھی“ مستقبل قریب میں اس کے دوبارہ[2] شائع ہونے کا بھی امکان نہ تھا ان حالات میں انھوں نے معتبر اور غیر معتبر سبھی ذرائع سے فائدہ اٹھایا اور جہاں سے بھی اور جس حال میں بھی استاد کا کلام دستیاب ہوا انھوں نے اسے حاصل کیا۔ دیوانِ ذوق میں کئی غزلوں کے متعلق خود آزاد نے لکھا ہے کہ یہ کسی مجہول الحال یا پیرانہ سال شخص نے انھیں سنائی تھیں۔ آزاد کے اس رویہ پر محققین نے عام طور پر نکتہ چینی کی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ آزاد کا یہ طریقۂ کار اتنا قابلِ مذمت ہرگز نہیں تھا بلکہ سچ پوچھئے تو اس طرح آزاد نے بڑا کام کیا، غیر معتبر ذریعوں سے بھی آزاد نے جو حالات یا کلام حاصل کیا ہے اس میں قابلِ ذکر حصہ تحقیق کے بعد اب صحیح ثابت ہو چکا ہے۔ اگر آزاد نے اس کی فراہمی کے سلسلے میں یہ طریقۂ کار اختیار نہ کیا ہوتا تو ہم یقینی طور پر اس حصہ سے بھی محروم ہو چکے ہوتے۔ مدون کے لیے لازم ہے کہ وہ تمام وسائل استعمال کرے، کسی ایک ذریعہ کو بھی جس تک اس کی رسائی ممکن ہے نظر انداز کر دینا تدوین کی شریعت میں جائز نہیں ہو سکتا۔

---

[1] آزاد کا بیان ہے کہ:

استاد مرحوم کا دیوان ایک دفعہ مرتب کیا وہ ضائع ہو گیا اب پھر فرصت پاؤں تو دوبارہ محنت کروں (مجموعہ مکتوباتِ آزاد ص۱۱۱)

[2] آزاد کے الفاظ اس سلسلے میں یہ ہیں:

”چاہا کہ اب دیوان کو پھر سنبھالوں مگر مروت اور حمیت نے اجازت نہ دی کیونکہ استاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں تصنیف سے بے ترتیب پڑے ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں اگر میں ان کے باب میں بے پروائی کروں گا تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ جو دنیا میں تھوڑا رہ گیا ہے بے موت مر جائے گا“ (مجموعہ مکتوب آزاد ص۱۰۰)

دخل نہیں دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی مدون کی ہوئی کم و بیش سبھی کتابوں میں املا ان کے اپنے رسم تحریر کے مطابق ہے، اس کا اندازہ ان کتابوں کے بغور مطالعہ سے ہوتا ہے چنانچہ سراج نظم کے متعلق قاضی عبدالودود صاحب کی رائے بھی یہ ہے کہ

"مطبوعہ نسخے کی یہ خصوصیت بھی قابل توجہ ہے کہ کاتب نے جس نسخے کو سامنے رکھ کر کاپیاں لکھی تھیں وہ رشک کا مکتوبہ تھا اور نسخہ مطبوعہ کی تصحیح انھیں کے ذمے تھی املا اور رسم کتابت من حیث الاکثر یقین ہے کہ رشک کے مسلک کے مطابق ہو" (معاصر ۲/۱۹۷)

میرے نزدیک اس نوعیت کی تصحیح تصرف کی حدود میں آجاتی ہے جس کا بہرحال مدون کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ املا اور رسم تحریر نہ صرف کسی کتاب کے زمانہ تحریر کا تعین کرنے میں مفید ہوتا ہے بلکہ اس سے اس کے کاتب کو بھی پہچاننے میں مدد مل سکتی ہے۔

تدوین کا آخری لیکن سب سے مشکل شعبہ "تنقید الفاظ" ہے اگر مدون کے سامنے ایک کتاب کے کئی مخطوطات ہوں اور ان میں اختلاف بھی ہو تو کسی عبارت کو ترجیح دینا اور دوسری کو اس کے مقابلے میں کم تر قرار دینا بڑی سوجھ بوجھ کا کام ہے اس کے لیے اس موضوع سے متعلق مدون کا ذاتی علم ہی کافی نہیں ہے۔ مصنف کے حالات، اس کے مزاج اور اس کے مبلغ علم سے بھی بخوبی واقف ہونا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک پہلو بھی کمزور ہے اور مدون نے فطرتاً نکتہ رس اور نکتہ شناس طبیعت نہیں پائی ہے تو صحیح نتائج تک پہنچنا مشکل ہی ہے۔ میر رشک نے غالباً کام کی اہمیت اور نزاکت کو محسوس کر لیا تھا چنانچہ یہ بات بہت واضح الفاظ میں کہی کہ میں نے ناسخ کا شاگرد رہ کر جو کچھ حاصل کیا تھا اس علم کی بنیاد پر ان کے کلیات کی تصحیح کا کام کیا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اپنے دور میں اس علم کی وجہ سے اس کام کے لیے وہ سب سے زیادہ[له] اہل بھی سمجھے گئے۔

تدوین کا فن عجیب و غریب ہے، اتنا مشکل، اتنا نازک اور اتنا اہم ہونے کے باوجود یہ فن عوامی ہرگز نہیں ہے۔ مدون کے کارناموں کی افادیت اور اہمیت بھی محدود ہی ہے، اس کی محنت کی داد اور اس کی فضیلت کا اعتراف صرف اہل تحقیق کر سکتے ہیں۔ وہی تدوین کے کارناموں سے صحیح معنوں میں استفادہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس فن کی دقت یہ بھی ہے کہ مدون نہایت دیانت داری کے ساتھ کام کرنے کے باوجود کوئی ادعا نہیں کر سکتا کہ یہاں ہمیشہ اضافے کی گنجائش رہتی ہے چنانچہ اس کام کے کرنے کا حوصلہ وہی کر سکتا ہے جسے نہ ستائش کی تمنا ہو، نہ صلے کی خواہش۔ مدون کا سب سے بڑا انعام خود اس کا کام ہے۔

دیوان ذوق

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سلطنت کی بساط ہی نہیں الٹی، اردو ادبیات کا مزاج بھی بدلا، کچھ انگریزی کے زیر اثر اور کچھ صاحبان انگریزیہ کی سرپرستی کے نتیجے کے طور پر اردو نثر و نظم میں مختلف اصناف وجود میں آئیں اس بدلتے ہوئے ماحول میں پروفیسر محمد حسین آزاد وہ پہلا برگزیدہ عالم ہے جس نے تدوین کے اصولوں کی طرف توجہ کی۔ آب حیات

له ناسخ کے کلیات کے علاوہ ان کی بعض مثنویاں بھی چھپیں ہیں اور قابل لحاظ یہ حقیقت ہے کہ ان سب کی تصحیح کا کام رشک ہی نے کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ رشک اس عہد کے سب سے بڑے عالم تھے، لکھنؤ میں یقینی طور پر اور بھی اہل علم موجود تھے مگر اس کام کے لیے ناسخ سے واقفیت بھی شرط تھی۔

ہیں بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا
کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا مٹے حرفوں کا اجالنا اس زمانے کے خیالات کو سمیٹنا
حالتوں کا تصور باندھنا بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا
میرا کام نہ تھا خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی، میں حاضر
اور خدا ناظر تھا، راتیں صبح ہو گئیں اور دن اندھیرے ہو گئے جب یہ مہم سرانجام
ہوئی " (مقدمہ دیوان ذوق)

اختلاف نسخ کی یہ تمام عملی صورتیں آزاد کے سامنے ہی پیش نہیں آئیں ہر مدون ان سے دو چار ہوتا ہے اور اس کے سامنے یہی کچھ مشکلات درپیش ہوتی ہیں، ناواقف لوگ عموماً مصنف کے ہاتھ کی تحریروں کو مستند سمجھتے ہیں حالانکہ ان میں غلطی کے تمام تر امکانات ہوتے ہیں، پھر مصنف وقتاً فوقتاً نظرثانی میں ان میں ترمیم و اضافے بھی کرتا رہتا ہے۔ اصولاً ان میں سے کسی ایک کو متن کی تیاری کے لیے بنیاد بنا لینا نہایت غلط ہے ہمیں ہر تحریر کے پس منظر کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ان میں کون سی تحریر لائق ترجیح ہے۔ آزاد نے اس سلسلے میں جو طریقہ کار بیان کیا ہے وہی فی الواقع صحیح بھی ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ آزاد بعض مصلحتوں کی بنا پر شعوری یا غیر شعوری طور پر تصرف کے مرتکب ہوئے ہیں۔

متن کی تصحیح کے بعد متن کی تحقیق کا کام ہے، اس کے دو درجات ہیں اول یہ کہ یہ معلوم کیا جائے کہ متن جس مصنف سے منسوب کیا جا رہا ہے اسی کا ہے؟ دوم متن میں جو بیان کیا گیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟ آزاد نے یہ دونوں کام کئے تو ہیں لیکن یہی ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے یہ کام دراصل تحقیق کا ہے اور آزاد تحقیق کے اصولوں کے عالم تو ہیں ان پر عامل بالکل نہیں۔ دیوان ذوق کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بعض اشعار کے متعلق یہ معلوم کر لیا کہ یہ دوسرے شعرا کے ہیں۔ یا انھیں یہ معلوم تھا کہ بعض اشعار کو ذوق نے قلمزد کر دیا تھا، چنانچہ کہیں کہیں انھوں نے اس طرف اشارے بھی کئے ہیں لیکن اس سلسلے میں انھوں نے وہ محنت نہیں کی جو تحقیقی کام کے لئے لازم ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ ذوق کی زندگی ہی میں ان کے کلام کے متعلق اختلافی صورت پیدا ہو گئی تھی مثال کے طور پر یہ شعر

چار ٹکڑے کرو دل کے کہ نہیں ہو سکتا   لب کو دوں رخ کو نہ دوں زلف کو دوں تل کو نہ دوں

گلشن بے خار اور گلستان بے خزاں میں "ظفر" کے نام سے لکھا ہے درانحالیکہ ان کے عزیز دوست صہبائی کے بیان کے مطابق یہ "شیخ ابراہیم ذوق سلمہ اللہ تعالیٰ کا شعر" ہے لیکن بعض اشعار کے متعلق جن کو آزاد نے دیوان ذوق میں شامل کر دیا ہے یہ تحقیق مشکل نہیں تھی کہ وہ ذوق کے نہیں۔ مثلاً ان غزلوں میں سے ایک مطلع درج ذیل ہے جن کے متعلق خود آزاد کا بیان ہے کہ یہ استاد ذوق نے ناسخ کی غزلوں کو سامنے رکھ کر کہی تھیں ؎

سرو عاشق ہو گیا اس غیرت شمشاد کا   غل مچایا قمریوں نے بھی مبارک باد کا

آزاد سے پہلے عام طور پر دواوین کی ترتیب بہ لحاظ ردیف ہوتی تھی۔ آزاد نے اس میں اضافہ کیا یعنی ہر ردیف کی غزلوں کی ترتیب اس طرح کرنی چاہی ہے کہ پہلے استاد کا معتبر و مستند کلام ہے پھر وہ غزلیں ہیں جن پر انھوں نے نظر ثانی نہیں کر سکی پھر وہ غزلیں جو کسی دوسرے (نسبتاً کم معتبر) ذریعہ سے ان تک پہنچی تھیں اور آخر میں ناتمام غزلیات اور ابیات ۔ یہ صحیح ہے کہ آزاد نے اپنے اس طریقہ کار کی کہیں صراحت نہیں کی ہے لیکن دیوان ذوق کے بغور مطالعہ کے بعد اسے محسوس کر لینا مشکل نہیں۔

ترتیب کے سلسلے میں آزاد نے ایک اضافہ اور بھی کیا یعنی اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ جس غزل سے متعلق کوئی قابل ذکر واقعہ پیش آیا ہے اسے بھی لکھ دیں آزاد کے الفاظ اس سلسلے میں یہ ہیں ۔

"جس جس موقع پر کوئی صورت خاص پیش آئی یا کوئی نظم کسی تقریب خاص سے لکھی گئی یا کوئی لطیفہ قابل آگاہی شگفتہ ہوا وہ بھی جا بجا درج کرتا ہوں"

(مقدمہ دیوان ذوق)

غزل یوں بھی عجیب صنف سخن ہے کبھی تو شاعر ایک نشست میں غزلیں کی غزلیں کہتا چلا جاتا ہے اور کبھی ایک شعر سے زیادہ نہیں کہہ پاتا - خود ذوق کے ساتھ بھی ایسے واقعات پیش آتے رہے کہ ایک مطلع کہنے کے بعد برسوں گزر گئے اس زمین میں شعر نہ کہا کئی سال بعد طبیعت موزوں ہوئی تو غزل پوری کی - اس کے علاوہ شاعر اپنے کلام پر نظر ثانی کرتا رہتا ہے ایسی صورت میں تمام کلام کی ترتیب بہ لحاظ زمانہ عام حالات میں بھی ممکن نہیں، پھر ذوق کے حالات تو اور بھی الجھے ہوئے ہیں پھر بھی آزاد نے اپنے وسائل کی حد تک کلام کے زمانہ تعین کی کوشش کی ہے ، اور جگہ جگہ کلام پر رائے دیتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ بچپن کا کلام ہے ، یہ ابتدائے شباب کی غزل ہے ، اس پر شاہ نصیر کا اثر غالب ہے وغیرہ گویا مدون نے کلام کے بہ لحاظ زمانہ مرتب کئے جانے کی اہمیت کو بھی بخوبی محسوس کر لیا تھا اور اس بات پر فخر بھی کیا ہے۔

آزاد سے پہلے دیوان ذوق کو حافظ ویران وغیرہ تلامذۂ ذوق نے مرتب کرکے شائع کر دیا تھا اور اس کے بعض قلمی اور نقلی ایڈیشن بھی سامنے آ چکے تھے مگر آزاد نے نہ ان میں مندرجہ کلام پر اکتفا کی اور نہ ان پر اعتماد کیا بلکہ خود تلاش و جستجو کی ۔ تصحیح متن کا کام کتنا مشکل اور کتنا نازک تھا اس کا آزاد کو بخوبی اندازہ تھا انھوں نے اس کام کو "مہم" کہہ کے لکھتے ہیں ۔

"ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے دیوان مروجہ میں کچھ چھپے اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے کبھی کچھ سنے اچھے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں

سیّد مصطفےٰ علی بریلوی

ساٹھ سال قبل کی ایک اُردو کانفرنس

قیام پاکستان سے قبل ہندوستان کے جملہ صوبوں کے مسلمانوں میں اردو زبان کی مقبولیت بڑھی ہوئی تھی۔ یہ ...یت کچھ یو۔ پی۔ حیدرآباد۔ دلی اور پنجاب تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ مدراس، کاٹھیاواڑ۔ مہاراشٹر۔ راجستان۔ ...ں ہر جگہ کے مسلمان اردو زبان سے گہری وابستگی کا اظہار کرتے تھے۔ مسلمانانِ ہند کو اردو زبان سے یہ گہرا تعلق اس وج... تھا اور آج بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ کیونکہ اس زبان کے ذریعے ان کے بچے اسلامی علوم و فنون سے قریب تر ہو جاتے

—

قدرت کا یہ عجیب نظام ہے کہ تخریبی قوتوں کے ساتھ ساتھ ہمیشہ تعمیری قوتیں بھی سرگرم عمل رہتی ہیں۔ چنانچہ ...وں نے اپنی بساط کے مطابق اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے واسطے زبردست جدوجہد کی۔ اس سلسلے میں اتنی ...مقدار میں لٹریچر موجود ہے کہ اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ ابھی چند روز کی بات ہے راقم ایک پرانے انگریزی مجلے ...ین ایجوکیشن بمبئی بابت جون ۱۹۰۹ء کی ورق گردانی کر رہا تھا، ایک اردو کانفرنس کے عنوان پر نظر پڑی۔ تفصیل ...جب پڑھا تو اس دور کے نیک نفس مسلمانوں کی قومی جدوجہد کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔

موجودہ دور میں جبکہ اردو کی ہمہ گیری پر حرف لایا جا رہا ہے یہ روداد یقیناً دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ اس کانفرنس ...ح رواں ایک بزرگ رفیع الدین نامی تھے۔

...صد کانفرنس اس کانفرنس کا انعقاد بمبئی پریزیڈنسی کے مشہور شہر پونا میں کیا گیا تھا۔ مقاصد کانفرنس حسب ذیل تھے:۔

۱۔ بمبئی پریزیڈنسی میں اردو کی حیثیت اور مستقبل کی ترقیات کا جائزہ لینا۔
۲۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیمات کے بارے میں عام مسلمانوں کی مشکلات کا جائزہ لینا۔
۳۔ مسلمانوں کے واسطے مخصوص ٹریننگ کالجوں کے قیام پر غور کرنا۔
۴۔ مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق متفرق امور کا جائزہ۔

لیکن یہی مطلع دیوان ناسخ میں بھی موجود ہے، ناسخ کا دیوان ذوق کی زندگی ہی میں چھپ کر شایع ہو چکا ہے اور آزاد بہ آسانی اس الحاق کو دریافت کر سکتے تھے۔

دیوان کی تدوین کے سلسلے میں متن میں جو کچھ مذکور ہوا اس کی صحت کے پرکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن آزاد نے اس سے متعلق واقعات لکھ کر تدوین کے مختلف شعبوں میں "تحشیہ" کا اضافہ کیا۔ اس کام کی اہمیت کا بیان انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

> "تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ اس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو یہ کام کا نہیں اور کون سی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا اسی واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا جو بات سلسلہ حالات میں مسلسل ہو سکے گی ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔ (مقدمہ دیوان ذوق)

شاعر کے کلام ہی پر منحصر نہیں کسی بھی تحریر کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس سے متعلق تمام امور اہمیت رکھتے ہیں چنانچہ مدون پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ ایسے تمام متعلق واقعات اور امور کی نشاندہی کر دے تاکہ متن کی تفہیم میں سہولت ہو۔

کوئی کتاب بھی جو مدون کی جا رہی ہے خواہ نثر میں ہو یا نظم میں، اس کے مالہ اور ماعلیہ سے بھی قاری کو واقف کرانا مدون ہی کی ذمہ داری ہے آزاد نے اس ضرورت کو بھی محسوس کیا اور اس طرح انھوں نے دیوان سے پہلے نہ صرف ذوق کے حالات لکھے بلکہ ان کے کلام کی اہمیت کی بھی وضاحت کی اور یہ بھی بتایا کہ یہ دیوان کس طرح مدون ہوا ہے۔ یہ تو نہیں کہا کہ یہ آزاد کی ایجاد ہے لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ جس وضاحت سے آزاد نے دیوان ذوق کے مقدمہ میں ذوق، ان کے کلام اور تدوین کے سلسلے میں اپنے طریقہ کار کا ذکر کیا ہے ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ اس طرح آزاد نے تدوین کے فن کو بخوبی ترقی دی۔ میر رشک کے عہد تک تدوین کے شعبے چار تھے۔ آزاد نے دیوان ذوق مدون کر کے ان کی تعداد چھ بتائی یعنی

(۱) تعارف متن (مقدمہ)، (۲) فراہمی متن، (۳) ترتیب متن (۴) تصحیح متن، (۵) تنقید متن، اور (۶) تحشیہ

آزاد کے بعد سے کم از کم شعبوں کی حد تک تدوین کے فن میں اب تک کوئی اضافہ ممکن نہیں ہو سکا ہے یہ آزاد کا بڑا کارنامہ ہے

اس کانفرنس کا افسوس کے ساتھ خیال ہے کہ مرہٹوں کی تاریخ پر جس قدر توجہ کی جا رہی ہے اتنی توجہ مسلمانوں کی تاریخ کیجانب
، جارہی ہے۔

...ر شارپ ناظم تعلیمات کی تقریر

مسٹر شارپ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن نے اپنی تقریر میں فرمایا: ڈائرکٹری کا جائزہ لینے کے بعد میں نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ اردو مضامین کے بارے
...منٹ کے روبرو ایک رپورٹ پیش کی۔ اس میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا گیا تھا کہ مسلمان ایک جگہ پر اردو اسکول کھولنے کے
لیے درخواست کرتے ہیں لیکن جب اسکول کھل جاتا ہے تو پھر اس کے واسطے بچے نہیں ملتے لہذا وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر
. اردو کی حوصلہ افزائی نہیں ہو رہی ہے۔ اب مجھ کو بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو مقامی زبانوں کے مقابلے میں اردو زبان
یادہ ضرورت ہے۔

اس کام کے واسطے اسپیشل پرائمری اسکول مہیا کئے جاتا ہیں، جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو۔ لیکن ایک اہم سوال یہ ہے کہ معدودے چند مسلمان ہی پرائمری اسکول سے اونچے کلاس میں پہنچتے ہیں۔ اس بارے میں کانفرنس رفع مشکلات کے بارے . روشنی ڈالے تو میں خوشی کے ساتھ ان کو حل کرنے کے بارے میں غور کروں گا۔ جہاں تک اردو ٹریننگ کالج کھولنے کا ہے جو کانفرنس کی خواہش ہے تو یہ بات اگرچہ قابل تعریف ہے لیکن جب ہم مالیاتی نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو اس پر عملدرآمد بہت مشکل نظر آتا ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ فی الوقت کیوں نہ ایسی شکل پیدا کی جائے کہ جو مسلمان مروجہ .روں میں تربیت پائیں اردو میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ فاضل ہو جائیں؟

...بر رسالہ انڈین ایجوکیشن کا ...رنس کے ریزولیشن پر تبصرہ

ایڈیٹر صاحب نے پہلے ریزولیوشن پر تبصرے سے گریز کرتے ہوئے لکھا کہ اس پر بحث کرنا فعل عبث ہے۔ ریزولیوشن پر تبصرہ کرتے ہوئے ایڈیٹر صاحب نے
...ا ... اگر کبھی تعلیمی مضامین مثلاً تاریخ، حفظان صحت وغیرہ بجائے گجراتی، کناری، مرہٹی وغیرہ زبانوں کے اردو میں پڑھائے
... تو محکمہ تعلیم کس حد تک مسلمانوں کو مطمئن کر سکتا ہے۔ مقصدی مضامین، مثلاً کہانی سنانا، مضمون نگاری وغیرہ جزوی حد
اضلاعی اور دیسی زبان میں پڑھائے جا سکتے ہیں۔ فی الوقت اس سے زیادہ بات منظور نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اس صورت
کے باوصف بہت سے مسلمان والدین اپنے بچوں کو گجراتی مرہٹی اور کناری اسکولوں میں بھیجنے کو اولیت دیتے ہیں۔
ان والدین کے اس اقدام کا سبب یہ ہے کہ کاروبار نیز سرکاری دفاتر کی زبان گجراتی مرہٹی اور کناری ہے۔ اگر یہ
...ت جاری رہی تو نیم اردو اسکول بالکل خالی ہو جائیں گے۔ بعض لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ اضلاعی بولیاں بطور سیکنڈ لینگویج
...ری رہیں۔ لیکن اگر کانفرنس نے اس بات پر اصرار کیا تو طلبہ کے والدین بمشکل اس بات پر راضی ہوں گے۔ چونکہ اردو
...ری زبان نہیں ہے اس لئے اس کو سیکنڈ لینگویج ہی رہنا چاہیے۔ ایک قطعی اردو اسکول مع مقامی زبانوں کے صرف
صورت میں منظور کیا جا سکتا ہے کہ اس مخصوص علاقے میں مسلمان خاندانوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہو۔ یہ لوگ اردو بولتے ہوں

افتتاح کانفرنس

مولوی رفیع الدین کی تقریر

کانفرنس کا افتتاح اس زمانے کی عمومی رسم کے مطابق ایک انگریز مسٹر شارپ ناظم تعلیمات بمبئی نے کیا تھا۔ سب سے پہلے مولوی رفیع الدین نے کانفرنس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں کے واسطے ایک مخصوص اردو ٹریننگ کالج فوراً قایم ہوجانا چاہیے۔ اس وقت مسلمان طلبہ کی تعداد متفرق ٹریننگ سنٹروں میں تقریباً ،، الخ۔ آپ نے زور دیا کہ ان سب مسلمان طلبہ کو اردو ٹریننگ کالج میں یک جا کر دیا جائے اور ان کی تعلیم و تربیت اردو زبان کے ذریعے انجام دی جائے۔ مولوی رفیع الدین کا اندازہ تھا کہ مجوزہ کالج صرف دس ہزار روپے کے صرف سے قایم ہوسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے مزید بیان کیا کہ گورنمنٹ ۲۳ غیر مسلم طالبات کے واسطے سات ہزار سالانہ کے صرفے سے ایک ٹریننگ کالج برائے خواتین چلا رہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ۱۷۷ مسلم طلبہ کے واسطے گورنمنٹ اردو ٹریننگ کالج قایم نہ کرے۔

ریزولیوشن

مولوی رفیع الدین کی مندرجہ بالا تقریر کے بعد متعدد ریزولیشن پاس ہوئے جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"بمبئی پریزیڈنسی میں اردو جو مسلمانوں کی مادری زبان ہے (یہ ۱۹۰۹ء کا واقعہ ہے جب صوبہ سندھ، بہار اغسٹر کاٹھیاواڑ، گجرات سب بمبئی پریزیڈنسی میں شامل تھے) میدان چھوڑ رہی ہے اور تباہ ہو رہی ہے۔ یہ کانفرنس اس کیفیت کو مسلمان قوم کے لئے بہت بڑا المیہ قرار دیتی ہے۔ موجودہ اردو پرائمری اسکولوں کی خراب حالت اس المیئے کا سبب ہے۔"

"یہ نام نہاد اردو پرائمری اسکول در اصل گجراتی، مرہٹی، کناری اسکول ہیں۔ جن میں اردو ثانوی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ نتیجتہً مسلمان دوسری اقوام کے مقابلے میں نا قابل رہ جاتے ہیں۔ ان حالات کے تحت کانفرنس کا خیال ہے کہ اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے اور محض ثانوی زبان کی حیثیت سے نہ رکھا جائے۔"

"جو پرائمری تعلیم مسلمانوں کے واسطے مہیا کی گئی ہے اس کی خرابیاں صرف اس وجہ سے ہیں کہ گورنمنٹ نے ایک علیحدہ اردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ ٹریننگ کالج نہیں قایم کیا ہے۔ کیونکہ اردو اسکول کے اساتذہ کو ٹریننگ دوسرے کالجوں میں دی جاتی ہے۔ اور وہ لوگ اردو پڑھانے کے لائق نہیں ہوتے۔ نیز جو اردو کلاسیں ٹریننگ کالج سے منسلک ہیں، وہ موجودہ ضروریات کے واسطے قطعاً ناکافی ہیں۔ اس واسطے اردو اسکولوں کی حالت بہتر بنانے کے واسطے اردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ ٹریننگ کالج کا قیام ضروری ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر یہ کانفرنس گورنمنٹ سے درخواست کرتی ہے کہ ایک ایسے کالج کے قیام کا انتظام کرے۔"

"اس کانفرنس کی رائے ہے کہ اردو زبان کی مقبولیت میں اضافے کی غرض سے اعلیٰ معیار کی درسی کتابوں کی اشاعت پر انعامات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔"

"گورنمنٹ سے درخواست کی جاتی ہے کہ پریزیڈنسی کے ہر ڈویژن میں ایک مسلمان ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز مقرر کیا جائے۔"

میرذوالفقار علی خاں صفؔا

میرذوالفقار علی نام، حسینی ہاشمی وجعفری۔ خان خطابی معلوم ہوتا ہے۔ صفؔا۔ بقول بعض میر تقی میؔر کے شاگرد تھے، مگر انہوں نے خود اپنے تلمذ کے متعلق مرزا رفیع سوؔدا کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تعجب ہے کہ شمالی ہند کے مشہور ومعروف مولف تذکرہ گلشن بے خار، مصطفیٰ خاں شیفتہ صفؔا سے بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ صفا تخلص از اسمش آگہی دست نداد۔ از وست ؎

محتسب جھوٹ ہے کس نے بھری شیشے میں　　رہ گئی ہے مرے آنسو کی تری شیشے میں

اور یہ شعر دیوان صفا میں موجود ہے۔ (ص ۱۴۶)

صفا کا تعلق زیادہ تر مدراس اور حیدرآباد دکن سے رہا اور یہیں جاں بحق ہوئے۔ تذکرۂ عروس الاذکار کے مولف نصیر الدین نعش حیدرآبادی رقمطراز ہیں:۔

صفا تخلص، ذوالفقار علی خاں از ساکنان قصبہ بریلی خود را از تلمذ یا بندگان میر تقی میرؔ مرحوم متہم می ساخت۔ فی الجملہ بہ مہارت سخنگوئی شعر را بطورے کہ در آں زمانہ رواج داشتہ بخوبی گفتہ۔ بخصوص مثنوی چھومنتر کہ در آرایش و عشق و معشوق از خامۂ فکرش ریختہ بسیار با صفا ست، از مایدۂ کرم شاہ یار الملک بہادر رونق وظیفہ خوار بود، و اشعار ایشاں بہ مکتب اصلاحش درست و ہموار آوردہ اند کہ روزے بہادر موصوف مصرع فرمودند ؎

ناتواں دل کو محبت کا غم زینہ آیا

صفا گفت:۔　　مور کے ہاتھ سلیماں کا نگینہ آیا

اور است ؎

بابا یہ تری دولت ظاہر ہے نہ گم ہو　　ٹک آنکھ اٹھا دیکھ جو ہم ہیں وہی تم ہو
پردیس کا جینا ہے صفا مرگ سے بدتر　　تب لذت دنیا ہے کہ ساتھ اپنا کنبہ ہو

اور ضلعی زبان نہ بولتے ہوں۔ نیز اپنی روزمرہ کی زندگی اور اپنا حساب کتاب بھی اردو میں رکھتے ہوں۔

جہاں تک صوبہ بمبئی کے میونسپل اردو اسکولوں کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ یہ اسکول نہ تو اعلا کارگردگی کے حامل ہیں اور نہ ہی مقبول ہیں جیسا کہ ہونا چاہیے۔ ایڈیٹر صاحب کے خیال میں اعلا کارکردگی مندرجہ ذیل طریقوں سے پیدا ہو سکتی تھی :۔

(۱) کورس میں اضافہ کرکے

(۲) دوسرے مضامین کا بوجھ ہلکا کرکے۔

آگے چل کر ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ یہ دونوں باتیں مناسب نہیں ہیں بلکہ عملی اقدام یہ بتایا کہ :۔

(۱) اساتذہ زیادہ محنت کریں۔

(۲) تربیت یافتہ عملہ بڑھایا جائے۔

اردو ٹریننگ کالج کے بارے میں ایڈیٹر صاحب نے اپنا اردو دشمن رویہ کھل کر ظاہر کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں روپے کا مسئلہ بھی اگر حل کر لیا جائے تو یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس طرح مسلمان بچوں کو دوسری برادریوں سے بالکل علیحدہ کر لیا جائے۔ نیز اس طرح مسلمان ضلعی زبان نہ جان سکیں گے وغیرہ۔

اس کے بعد ایڈیٹر صاحب نے تجویز کیا کہ اردو کورس ٹریننگ کالجوں میں دوبارہ مرتب کر لیا جائے۔ تاریخ نویسی میں گورنمنٹ کی جانبداری کے بارے میں کہا گیا کہ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے جب بھی کوئی کتاب محکمہ تعلیمات چھاپے تو اس امر کا بطور خاص خیال رکھے :

(۱) مسلمان انسپکٹر کو ضلع کے جملہ اسکولوں کے معائنے کا اختیار دیا جائے (۲) نیز مسلمان ڈپٹی انسپکٹر اردو اسکولوں پر انسپکٹر کے تحت کنٹرول قائم رکھے (۳) مسلمان ڈپٹی انسپکٹر اردو اسکولوں کے متعلق علیحدہ رپورٹ پیش کرے (۴) مسلمان ڈپٹی انسپکٹر کو حسب ضرورت انسپکٹر کو مخاطب کرنے کا حق حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔

مندرجہ بالا مختصر کانفرنس کی کیفیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانانِ ہند نے کس قدر نامساعد حالات میں پونا، بمبئی، گجرات اور سندھ میں اردو کا جھنڈا بلند کیا۔ جن لوگوں کو مسلمانوں کی تعلیمی جد و جہد کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کانفرنس کے اکثر مطالبے سابقہ برطانوی حکومت کو قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم آزادیٔ ملک سے قبل ہی بہت حد تک اردو کی جنگ جیت چکے تھے۔ ۱۹۳۸ـ۳۹ء میں علیگڑھ یونیورسٹی میں ہائی اسکول تک اردو ذریعہ تعلیم تھی۔ بمبئی میں ایم اے تک اردو فارسی کی گنجائش تھی۔ جامعہ عثمانیہ تو تمام تر اردو کی علمبردار تھی۔ یوپی، دہلی، دیسی ریاستوں میں عملاً اردو کو عدالتی زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں اردو کے واسطے دروازے بند ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں اردو دو قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ بہر نوع یہ نسل خوش قسمت ہے کہ اس کے سامنے پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ لیکن اردو کے محاذ پہ ہمارا کام ابھی باقی ہے۔

اور مدراسی شعرا جن کی زبان ان کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتی تھی، خوب نوک جھوک رہی۔ پھر مدراس سے حیدرآباد دکن آ گئے۔ راجہ چندو لال کے پاس باریاب ہوئے۔ پانسو روپیہ ماہوار تنخواہ ملا کرتی تھی۔ نیز ان کے دوسرے مربی و سرپرست نواب شاہ یار الملک بہادر المتخلص بہ رونق تھے۔ جو بڑے علم دوست امیر تھے۔ صفا کا حیدرآباد ہی میں ۱۲۶۰ھ میں انتقال ہوا۔ بقول خود "۔ ہو گئے آخر صفا پردیس کے "

تصنیفات :۔

حملۂ حیدری جلد ۱ (فارسی) کا ترجمہ ذوالفقار علی صفا نے کیا تھا

" جلد ۲ " محمد مرزا۔ مرزا ابن شاہ تجلی علی نے کیا۔ جن سے صفا کے خاص مراسم تھے۔ بایماء برادر صفا (میر اکبر علی خاں)

زاد الآخرت :۔ (دہ مجلس۔ شہادت امام حسن و حسین رض) تقریباً چار ہزار بیت)۔ تالیف ۱۲۱۷ھ (بمقام مدراس) جو طبع بھی ہو چکی ہے۔ جس کا ایک مطبوعہ نسخہ مطبع محمدی بمبئی ۱۳۵۲ھ۔ احقر کے پاس بھی ہے

مناظرۂ صفا و فیاض ویلوری۔ تالیف ۱۲۱۹ھ (بمقام مدراس) ۱۸۱ صفحات مسطر ۱۱، "۵ × ۸"۔ جس میں مرزا حسن لکھنوی اور شہزادہ مرزا علی بخت اظفری مقیم مدراس کی تقریظ بھی ہے (مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ بہادر) جس کا خلاصہ یہ ہے اور یہ رائے ہے کہ اہل زبان اہل زبان ہی ہے۔ اور یہ چیز اس میں فطری ہوتی ہے۔ اہل دکن اہل زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

صفا نے ناظم ویلوری کے ایک قصیدے کی خوب دھجیاں اڑائی ہیں جو اس مناظرے کے بانی مبانی تھے۔

دیوان صفا

مخطوطہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد دکن۔ اوراق ۱۹ سطر ۱۲ تا ۱۵۔ مع مثنوی چھوٹی تر۔ یہ مثنوی پندرہ صفحات پر مشتمل ہے تقریباً سوا دو سوا اشعار ہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جامعہ عثمانیہ میں بھی ہے۔ اور تیسرا نسخہ کتب خانہ ایوان بانی حیدرآباد دکن میں میری نظر سے گزرا ہے۔ آغاز!

ہو جو ولولہ چشم کا، یا ابروؤں کی آن کا (کذا)
اپنی آنکھوں پر رکھے مطلع مرے دیوان کا

غزل مشتمل بر تخلص :۔

سنی جو اُن نے غزل میں مرا تخلص ہے　　کہا کہ اپنا یہ کچھ آشنا تخلص ہے
مرے سخن سے جو اس کو کمال ہے کرجوش　　بدل کے میں نے کہا دوسرا تخلص ہے
اسے سخن سے مرے کیونکہ آشنائی ہو　　کہ نت نئی ہے غزل نت نیا تخلص ہے

گویند کہ بوقت نزع فرمودہ ؎

بدفعۃ رفتہ چور ہو کر دیس کے
ہو گئے آخر صفا پردیس کے

طائر روحش از قفس کالبد پرواز نمود (عروس الاذکار ص ۱۰۳)۔

مولف تذکرۂ شعرائے دکن میں بھی صفا کے حالات ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے :۔

صفا (میر ذوالفقار علی خاں) لکھنوی۔ مشاہیر شرفا۔ شاگرد میر تقی میر۔ شاعری میں یگانۂ روزگار، شہر لکھنؤ سے بنگالہ گئے۔ امرا و رؤسا کی مدح میں قصائد لکھے۔ وہاں سے چنیا پٹن (مدراس) وہاں عزت و آبرو سے بسر کی۔ پھر میر (میر ابوالقاسم) وزیر حیدر آباد کے زمانہ میں حیدر آباد آئے۔ راجہ چندو لال کے درباری مصاحب اور پانسو تنخواہ تا مرگ جلیس و انیس رہے۔ مرد باکمال، خوش فکر، خوش طبع، ظریف، لطیف وضع۔ ان کا دیوان قصائد، غزلیات رباعیات کا ذخیرہ ہے۔ چند مثنویاں بھی کہیں۔ مثنوی چھومنتر مشہور ہے۔ ہندی فارسی کے شاعر تھے۔ ذخائر میں دیوان نہیں ملا البتہ فارسی قصیدے کی چند بیت ہیں (ص ۶۱۵ جلد ۲) مقطع یہ ہے :۔

جہان ہمت و انصاف راجہ چندو لال — کہ ہست خاک درِ او طلائے دست افشاں

گلزار آصفی میں لکھا ہے۔ "تا حال از ہیچ ولایت مانند او جامع علوم و کمالات احدے دیگر نہ آمد" ص ۲۷۴۔

صفا کو میر سے تلمذ تھا۔ مگر ایک شعر میں اشارہ کیا ہے کہ میں سودا کا تربیت یافتہ ہوں ؎

اے صفا کیوں نہ ہو تو رونق بازار جنوں
تربیت تیرے تئیں حضرتِ سودا کی ہے

سیر و سیاحت :۔

جا اصفہاں ملک بھی کیا چار سو کا سیر — لیکن نہ اپنے دل سے گیا لکھنؤ کا سیر

اس سے پتہ چلتا ہے کہ صفا نے ایران کی بھی سیر کی تھی۔ اصل وطن بریلی تھا، مگر زیادہ عرصہ تک لکھنؤ میں رہے اس لئے لکھنوی مشہور ہو گئے۔ دہلی بھی گئے تھے، حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی رح اور قطب مینار دہلی اور وہاں کے مناظر کی تعریف میں شعر ہیں :۔ ؎

وہ سیر مکان قطب صاحب — وہ جھرنے کا لطف و لذت کاک

تلاش معاش میں لکھنؤ سے بنگال گئے اور وہاں کے امرا کی مدح میں قصائد لکھے، کچھ معقول صلہ نہ ملا وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ بندر یا چنیا پٹن مدراس پہنچے۔ غالباً یہ زمانہ نواب عمدۃ الامرا (۱۲۱۶ھ) کا تھا یہاں مرزا علی بخت اظفری ان کے خواجہ تاش سے صحبتیں گرم رہیں

محاورہ بندی :-

زہے بگاڑ کر گرِ یا کبھی کا میل نہ تھا — یہی مثل ہے کہ پھر ان تلوں میں تیل نہ تھا
یہ کائنات ہے جو پڑے بڑے کھلاڑی کی — بڑے میاں کو سوا اس کے کوئی کھیل نہ تھا

نکتۂ رہی بر محل خوش آیا — مت ہر گھڑی لے عنقا چڑھا ناک

مہندی کے بدلے ظالم دل میرا مل رہا ہے — کیا اس کے ہاتھ آیا کیا اس کے ہاتھ آیا

سگِ لیلیٰ کو شاید قیس کا دھوکہ ہوا یارو — جو سنکر شب مری زنجیر کی جھنکار اٹھ بیٹھا

کیا بھلا چنگا تھا کا فرمفت سودا ہو گیا — ہائے میرے لاڈلے دل یہ تجھے کیا ہو گیا

ہونٹوں پہ اس کی انگلی کا انداز کیا کہوں — پہلو ہے گل ہو جیسے کہ سرو چمن کی شاخ

جب سے نظر آیا ہے کسی کان کا سبزہ — آنسو کی لڑی مثل زمرد کے بھری ہے

بے ثباتیٔ دنیا :-

لگا ہی ہے چل کوچ تیار رہ — ذرا اے مسافر سبکبار رہ
غرض یادِ لیلیٰ ہے اے قیس دل — تو صحرا میں رہ یا بکہسار رہ
پلک لگنے پائے نہ اے محوِ زلف — شبِ قدر ہے آج بیدار رہ
غنیمت ہے یہ فرصتِ عمر یار — جہاں میں کوئی دم نہ بیکار رہ

مہندی کو لگا یار نہ راحت میں خلل ڈال — جب شوقِ حنا ہو کوئی دل تلووں سے مل ڈال

نیا قافیہ وردیف :-

نہ مجھ پہ یوں کر کس لے دل لے دل — خدا کے واسطے بس لے دل لے دل
کہیں ایسا ہو نا زیست ر دو سے — نہ اتنا کھل کھلا ہنس آدل لے دل
پڑے ہیں آہ کیسے تجھ میں نا سود — یہ چھ سات آٹھ نو دس آدل لے دل

اپنے تئیں کام نہیں آؤ کہ مت آؤ تم — ہم نے اب صبر کیا، اپنا کیا پاؤ تم
میں نے غم کھایا نہیں، غم نے مجھے کھایا ہے — ناصحو، بس نہ عبث جان مری کھاؤ تم
اتنی بک بک سے بھلا فائدہ پر ہم کو کیا — منہ تمہارا دکھے گا شوق سے چلاؤ تم
آپ کے ہاتھ مرے قتل او پر شاہد ہیں — اپنے انکار کا شاہد تو بھلا لاؤ تم
دیکھ پر خاش رقیبوں کی لگا کہنے شوخ — کس کا منہ تکتے ہو جانے دو عنقا جاؤ تم

متاخرین میں داغ دہلوی کی غزل اسی طرز میں خوب ہے۔ عنقا کے قافئے ہیں: آسامار بیٹھے ہیں اخدائی نوار وغیرہ محاورے خوب

رکھا نہ دہر نے نام و نشاں ہمارا حیف — مگر بساط میں باقی رہا تخلص ہے
رہے گا اس سے مرا نام خلق میں دایم — کہوں اسے خلف الصدق یا تخلص سے
جزئی ذات جو ہیں میر ذوالفقار علی — انھیں بزرگ کا شاید تخلص ہے

شعران کا ضرب المثل ہے :-

کون سنتا ہے فغان درویش — قہر درویش بجانِ درویش

رب الامثال خوب باندھتے ہیں :-

مرنا مرا سن وہ شوخ بیباک — کہنے لگا خس کم جہاں پاک
دل کو مت جانیو اپنا دشمن — ہے یہ کم بخت بغل کا دشمن

دل آتش و آہ آتش و سوزِ نفس آتش — کیونکہ نہ ہوسے صیاد میں بہر نفس آتش
شوخی تو اک بلا ہے تغافل علی الخصوص — ہے آگے قہر جاں یہ تساہل علی الخصوص
دیکھتا تھا تب جو تو محفل میں لے جاتا نہ رقص — شمع پر حالت لحق طاری کرتا تھا پروانہ رقص
داغ سینے کے مرے روشن ہیں اس انداز سے — جیوں مرادوں میں کرے روشن کوئی گھر کے چراغ
گر نہ سمجھو ساغر پُرمے کو جام مہر سے — ہیں جناب حضرت زر کے یہ لڑکے کے چراغ
نہ تجھ سے زر کے ہیں طالب نہ مال کے مشتاق ، — فقیر آئے ہیں بادا جلال کے مشتاق
بیاں میں کرتا ہوں تفسیر طور موسے کی — تو بول جل جلال ، او جلال کے مشتاق

اندازِ بیان اور شوخی :-

دل اور خوں ناب کیا تب یخن دل سمجھا — مشکل آساں ہوئی آساں کو جو مشکل سمجھا

شب کو جو ذکر ابروئے پُرخم کا چل پڑا — وہ ہنس کے بولا جی مرے تیغے میں بل پڑا
قربان جاؤں اپنے میں بسمل کے رقص پر — یوں ہاتھ پاؤں جھاڑے کہ قاتل اُچھل پڑا
یہ تجمل نہ کرے کیوں ترا بسمل پیدا — کھا کے پیکان کیا اس نے نیا دل پیدا
بحرِ الفت میں سمجھ رکھیو قدم حضرت دل — یہ وہ دریا ہے کہ جس کا نہیں ساحل پیدا
سلسلہ یار کا جو چاہے تری محفل میں — پہلے جوں شمع کرے اشکِ مسلسل پیدا
قیس بیہودہ جو محمل کے پڑا تھا پیچھے — دل میں کیا کر نہ سکا لیلی و محمل پیدا
کوئی دم لے روحِ فرہاد استعانت شرط ہے — کام پھر ہم سے کوئی لینا ہے جوئے شیر کا

یہ بھی کوئی طور ہے اے شخص تجھے سودا ہے　　خوب بالفرض تو فرہاد ہوا یا مجنوں
ایسی باتوں سے پری وش کوئی ہاتھ آئے ہیں　　یوں جو ہوتا تو ہر اک دل شدہ ہوتا مجنوں
تحفۂ ہمدرد تھا ٹک دل کے بہلانے کو صفا　　آج کے روز زمانے میں جو ہوتا مجنوں
کیا رنگ اڑ رہا ہے فقیروں کے راگ میں　　ہیں مست رات دن یہ لنگوٹی کے پھاگ میں
مت جانیو دنیا کے دھندے میں یہ لاگے ہیں　　اے پیک اجل تجھ سے ہم دو قدم آگے ہیں
سوتوں کو جگانے سے حاصل تجھے اے محشر　　مت چھیڑ یہ بےچارے کئی رات کے جاگے ہیں
کیا خانِ صفا تم بھی پابند محبت ہو　　اب تک بھی جو پاؤں میں دو نیل کے دھاگے ہیں

سب ذیل چار غزلہ میں صفا نے فصاحت و بلاغت اور جدت طبعی کے خوب دھوئیں اڑائے ہیں، جس طرح کہ میاں نشا اور مصحفی نے "گردن" کی ردیف میں جولانی دکھائی تھی ۔۵

یوں باندھ سر گنبد دل بھبوت کا دھواں　　منڈف میں ہو جوں آتش ابد صوت کا دھواں
کل بات جو کچھ چل پڑی یک دم میں نکالا　　لعل لب پاں خوردہ نے یاقوت کا دھواں
انگریزی لڑاکے دھری لکھ سکے جلد ہی (کذا)　　دو دے کے لینے پکڑے جو باروت کا دھواں
قیدی جو تری چاہِ ذقن کا کرے اک آہ　　نکلے نہ کوے سے دل ہاروت کا دھواں
اُس زلف کا دانہ جو ہو باروت میں جوہر　　بو مشک مارے تودۂ باروت کا دھواں (کذا)
یاروں نے جو کیبا رگی سلفہ کا ترا قہ　　اف کر کے نکالا دل مبہوت کا دھواں
یاقوت کی مہتاب کو دھر سب پہ نکالا　　یاقوت لب یار نے یاقوت کا دھواں
یاقوت مرا شوخ کے وہ اس کے سے لانا　　نکلے نہ کہیں مفت میں تابوت کا دھواں
کہہ لاؤں صفا ایک غزل سحر کی پتلی　　جس سے کہ اُڑے بابل دہاروت کا دھواں

دو غزلہ : ۵

اُف کر جو نکالوں دلِ مبہوت کا دھواں　　جوں گیند لڑکتا پھرے ماروت کا دھواں
کیا لعلِ مے زیب پہ پھبتی کہی میں نے　　اے صل علا آتش یاقوت کا دھواں
جس مغز میں مشعل کا دھواں بیٹھا نہ نکلا　　اس شعلہ کا فر میں ہے ملبوت کا دھواں
جوں تیغ علم دار شجاعت سے سپاہی　　کاجل ہو اگر خانۂ رجپوت کا دھواں
اخوند جی ہوئے دو مرے گنڈے کی دھونی　　چھو چھا میں نکالو نہ عبث سوت کا دھواں

اندھے ہیں ؎

جنہیں وے منہ کو کھولے گھیتے بلدار بیٹھے ہیں
یہ گنج حسن پر دو سانپ کنڈل مار بیٹھے ہیں

ہمیں ایک ہی پیالہ نے گیا شاباش یاروں کو
کہ خم کے خم چڑھا کر بر درِ خمار بیٹھے ہیں

جوانی کے گئے ہمراہ شور و شر جوانی کے
بھلا ہو وے بڑھاپے! آہ کہ لاچار بیٹھے ہیں

دو غزلہ ؎

خبر اپنی نہیں مسکن فلاطوں وار بیٹھے ہیں ،
یہ دیوانے سب اپنے کام میں ہوشیار بیٹھے ہیں

انھیں کہہ دو کہ اپنے جی سے ہم بیزار بیٹھے ہیں ،
رفو کرنے کو کیوں چاک گریباں یار بیٹھے ہیں

فقط دنیا کی خاطر شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی ہے
کہ جو دیکھے ہے سمجھے ہے بڑے دیندار بیٹھے ہیں

سرِ بزمِ خرابات اُن نے جو بیٹھا مجھے دیکھا
کہا کیوں خیر تو ہے کچھ جو آسا مار بیٹھے ہیں

پھر اپنے منہ ہی منہ میں بڑبڑا بولا زہے صورت
ذرا اسلوب دیکھو کیسا خدائی خوار بیٹھے ہیں

کسی کے در سے پھر راندے گئے شاید صفا صاحب
جو کل سے منہ کری مارے پسِ دیوار بیٹھے ہیں

ہمیں معلوم ہے سرکار کے وعدوں کی کیفیت
فقط بارہ برس سے ہم سے صبح و شام کرتے ہیں

کون سی شکل ہے کس منہ پہ کسی کو چاہیں
نہ دلِ گرم رہا یہ نہ وہ ٹھنڈی آہیں

یاد آ جاتا ہے جس وقت کسی کا ملنا ،
ہار ہوتے ہیں گلے اپنے کے پھروں باہیں

اب نہ گرمانے کا فر کو تو پھر کب افسوس
یہ ہوا گرمی کی یہ تاک کی ٹھنڈی چاہیں

ق
کل جو گھر ان کے پہ دستک دی کہا میں جی ہوت
کہے صاحب کہیں باہر کو سدھارے یا ہیں

بولا درباں کہ صفا آپ ہی ہیں سبحان اللہ
اس کرامات پہ یہ غلغلہ یہ افواہیں

ردیف مجنوں کی غزل خوب کہی ہے ۔

چھوڑ مکتب جو ہوا سلسلہ برپا مجنوں
عشق نے بڑھ کے کہا عشق ہے بھیا مجنوں

اللہ اللہ رے ترا عشق خدا کے گھر کو
کہتا تھا ہے یہ لبِ خیمۂ لیلیٰ مجنوں!

پھر کے محمل سے ذرا دیکھئے کیا ہے لیلیٰ
ساتھ ناقہ کے چلا آئے ہے لپٹا مجنوں

بولے واللہ لقد اعلم ما کنت لبیب
راہ الیٰ وادیک فواعجبا یا مجنوں

پدر و مادر ایسے پھریں تھیں جوں جوں توں توں (کذا)
پھرتا تھا رخ سوئے خانۂ لیلیٰ مجنوں؟ (کذا)

واہ رے جذبِ محبت ترا اللہ اللہ
کل کا پتلا کہوں یا قبلہ نما تھا مجنوں

پال اشک

سرشار اور ان کا عہد

فسانۂ آزاد، سیرِ کہسار، جامِ سرشار اور دیگر تصانیف کے مصنف پنڈت رتن ناتھ سرشار کی شخصیت میں باغ و
ی کیفیت تھی۔

سرشار کی طبیعت سیلانیوں کی سی تھی۔ ان کی ہر ادا سے آزادی اور بے نیازی کا اظہار ہوتا ہے' زندگی
نے کبھی کسی کی پابندی گوارا نہیں کی۔ کھیری کے اسکول سے اُکتائے تو نولکشور کے ہاں آ گئے' نول کشور سے
ے تو فری لانس جرنلسٹ بن گئے۔ آپ نے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت کو وضع پابندی سمجھ کر
یا۔ بے نیاز اتنے تھے کہ کبھی کسی رئیس کے ہاں نہیں گئے۔ اور نہ ہی کبھی اپنی کسی تخلیق کی نقل اپنے پاس
ـ

سرشار بلا کے بے پروا تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ دن بھر سیر گشت کرتے رہتے تھے اور کاتب انھیں تلاش
رہتا تھا۔ آپ نے جو لکھا قلم برداشتہ لکھا۔ اور اس پر نظرِ ثانی بھی نہیں کی۔ اس سے جہاں ان کی بے پروائی
ی ہے وہاں خود اعتمادی کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

سرشار کو تعصب سے کوئی دخل نہ تھا۔ ہندو مسلمان دونوں آپ کی نظر میں یکساں تھے۔ اسی لئے آپ
ت ہندوستانی تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی۔

سرشار نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ سیاسی اعتبار سے افراتفری اور سماجی اور ادبی طور پر اصلاحات کا
ـا۔

سیاسی طور پر اودھ کا نوابی دور ختم ہو رہا تھا، اُدھر نواب "بابر بہ عیش کوش" کے مقولے پر عمل پیرا تھے۔
ن سروکار تھا تو صرف عیش پرستی سے، اور اگر ان کا کوئی کام تھا تو فقط بٹیر بازی! اگر کسی نواب کا بٹیر گم ہو
س کا جو حال ہوتا اس کی کیفیت سرشار نے فسانۂ آزاد میں یوں بیان کی ہے:۔

سہ غزلہ : ۵

اللہ رے دھواں دھار تری جالی کی کرتی — یہ سوت ہے یا عالم ناسوت کا دھواں
امروت نے جوں چھیڑا جو کی سیب ذقن سے — دانتوں سے نکالا وہیں امروٹ کا دھواں
باروت سے لڑکوں نے بنائی جو چھچھوندر — کب کم تھا چھچھوندر سے یہ باروت کا دھواں
ہم چلہ کے جاڑے میں دکھا دیویں گے تمکو — یاقوت لب یار سے یاقوت کا دھواں
اب بحر رمل میں ہو غزل اک متلون — ہر رکن میں ایک چرخ ہے ملسوت کا دھواں
بس خان صفا رہنے دو، ناحق نہ نکالو — ہرتا فیہ مندرس و فرتوت کا دھواں

چہار غزلہ : ۵

یوں مرے سینہ میں ہے سوز دروں کا دھواں — جوں ... میں ہو کسی جوگی کی دھونی کا دھواں

رباعیات صفا :۔ اس دیوان میں صفا کی صرف پانچ رباعیاں ہیں۔ بعض یہ ہیں :

طفل اشکی پلا یہ گیسو سے ہے — جی ناک میں اس طفلک بد خو سے ہے
واں زلف کوئی ہلے، یہاں دوڑ چلا — لے ہاتھ میں کالے ناگ کو جو سے ہے

ہے ایک تو آپ بھولا بھالا کافر — پھر اس کے اوپر کان کا بالا کافر
بس مرگئے دیکھتے ہی اللہ اللہ — جادو برحق ہے، کرنے والا کافر

مثنوی چھومنتر :۔ (۲۲۵) ابیات ۵

آغاز : محو ہے ساری خدائی عشق کی — بل بے کافرماجرائی عشق کی

خاتمہ : دردمندوں کے لئے درماں ہو یہ — دل کی بیماری کو حرز جاں ہے یہ

توپ کا گولا چھوٹتے ہی لوگوں میں جس طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں اس کا ذکر سرشار کامنی میں یوں بیان کرتے ہیں :-

"دھنا دھن! دھنا دھن!! توپ کی گھن گرج کی آوازیں جو گونجیں تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے۔ ایں یہ توپ کیسی دغتی ہیں۔ کسی نے کہا۔ کوئی بڑا لاٹ آیا ہوگا۔"

کوئی۔ "معلوم ہوتا ہے حیدرآباد والا نواب یا کشمیر کا مہاراجہ آیا ہے"

کسی نے کہا۔ "ارے میاں نہ کوئی آیا ہے نہ گیا ہے، چاند ماری ہو رہی ہے۔"

کوئی بول اٹھا۔ "بھئی آواز تو دھاوے کی سی ہے، لال کرتی کے گوروں اور کالی پلٹن میں لڑائی ہو رہی ہوگی۔ ہم جانتے ہیں گارد پر دھاوا ہے یا پار جاکے چھنبٹ پر مورچہ باندھا جائے۔"

اپنی اپنی رائے کے مطابق سب گذرے بازیاں کرتے اور سرکاری توپ خانے سے توپ کی دنادن کی آوازیں برابر آتی تھیں۔

"تھوڑی دیر میں سب کو معلوم ہوگیا کہ کمانڈر انچیف ہندوستان یعنی ہندوستان بھر کی فوج کے افسر اعلیٰ جن کا درجہ عہدہ اس ملک میں صرف گورنر جنرل کے درجے سے کم ہے، وہ رونق افروز ہوئے ہیں۔ اور یہ شلک سلامی ہیں کے خیر مقدم کی ہے۔"

ادھر مشرقی تہذیب کی روایات دم توڑتی جا رہی تھیں اور ادھر مغربی تہذیب کی صحت مند قدریں ہماری تہذیب میں داخل ہوتی جا رہی تھیں۔ پریس کا اجرا ہوچکا تھا اور نئے نئے اخبارات شائع ہو رہے تھے۔ علاوہ ازیں انگریزی تعلیم کا اثر بھی ہمارے تمدن پر پڑتا جا رہا تھا۔ اور روشن دماغ لوگوں میں ایک ایسا طبقہ بھی تھا جس کا یہ عقیدہ دن بدن زور پکڑتا جا رہا تھا کہ مغربی تہذیب ہی سے ہندوستان کا بھلا ہوگا۔ اس کی ترجمانی سرشار "سیر کہسار" میں اپنی زبان سے کرتے ہیں۔

"اب واقعی ان ہی لوگوں سے ہندوستان کو فائدہ کی امید ہوسکتی ہے جو مغربی تہذیب اور شائستگی سے واقف ہیں۔ ظاہر ہے کہ مغربی تہذیب اور شائستگی سے انھیں لوگوں کو زیادہ تر واقفیت حاصل ہوسکتی ہے جو یورپ کے ملکوں کی سیر کرتے ہیں۔ اور یورپ میں قیام کیا ہے۔ اگر ہم اپنی حالت میں ترقی کرنا چاہتے ہیں، تو ہم پر یہ فرض ہے کہ اکثر باتوں میں شائستہ قوموں کی تقلید کریں۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ مسجد کے ملاؤں کے بہکاوے میں آئیں اور انگریزی تعلیم کو گناہ سمجھیں۔"

اس دور میں تعلیم کی طرف اور خصوصاً تعلیم نسواں کی جانب خوب زور دیا جا رہا تھا، فسانۂ آزاد کی ہیروئن تعلیم نسواں کے بارے میں یوں فرماتی ہیں :-

"واقعی ہندوستان میں تعلیم نسواں کی بدرجہ غایت ضرورت ہے۔ تعلیم نسواں سے صرف عورتوں ہی کو فائدہ نہ ہوگا بلکہ مرد بھی فوائد تعلیم حاصل کریں گے۔ ایک یہی فائدہ کیا کم ہے کہ اگر عورتیں تربیت یافتہ ہوں گی تو مردوں کو مارے شرم کے ضرور پڑھنا پڑے گا۔"

- اتنے میں چوبدار برہنہ سر، پریشان و مضطر لپکتا ہوا آیا

خداوند، بڑا غضب ہوگیا۔ کیا کہوں! کیا کہوں!!

"کہو۔ ایں خیر ہے؟ بولو تو!"

سب کا رنگ فق کہ خدا ہی خیر کرے۔ نواب کا کلیجہ دہل گیا۔

"میاں کچھ تو بولو، سر سے تو کھیلو۔ آخر کیا آفت آئی کچھ معلوم تو ہو؟"

چوبدار "(ہاتھ جوڑ کر) جان بخشی ہو تو عرض کروں۔ بٹیر سب اُڑ گئے۔"

نواب:۔ (ہاتھ ملتے ہوئے)" سب! ارے، سب اڑ گئے! ہائے میرے صف شکن کو جو ڈھونڈ لائے ہزار نقد انعام گنوائے۔ اس وقت جیتے جی مرتا۔ ان! ابھی ابھی سانڈنی سواروں کو حکم دو کہ بیس کوس کا دورہ کر جہاں صف شکن لے سمجھا بجھا کرے آئیں!"

اس زمانے میں لوگ حکیموں کے معتقد ہوتے تھے، ڈاکٹروں پر ان کا بھروسا نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے گھر میں گھستے ہی لوگ اس کا جس طرح مذاق اڑاتے تھے اس کا حال بھی سرشار نے فسانۂ آزاد میں یوں بیان کر دیا ہے:۔

"ڈاکٹر صاحب کا محلسرا میں داخل ہونا تھا کہ دلھن کی ہمجولیوں نے دریچوں، چقوں، دروازوں اور منفذ مقاموں سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھنا شروع کیا۔

ایک:۔ "لے بوا ذرا قطع دیکھو۔ آدمی کیا ہے نوبت کا دھونسا ہے"

دوسری:۔ "تو کیا یہ چار آنے والا فرخ آبادی تربوز ہے"

تیسری:۔ "یہ تمباکو کا پنڈا ہے یا آدمی ہے۔ اوہ، حد بھر کالا۔ اس کے آگے چراغ ماند پڑ رہا ہے۔ کالے کے آگے چراغ نہیں جلتا"

چوتھی:۔ "آبنوس کا کندا ہے، الٹا توا انگوٹھا"

پانچویں:۔ "اور اس کالی کالی صورت پر یہ لال ٹوپی۔ ماشاء اللہ اسے کس قدر زیب دیتی ہے"

چھٹی:۔ "ذری جا کے امی جان کو سمجھاؤ تو کہ اس لنگوٹے لنگور سے کیا علاج ہوگا۔ کوئی اچھا حکیم بلائیو اس جنگلی کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا"

ادھر انگریزی عملداری آہستہ آہستہ اپنے پاؤں پھیلا رہی تھی۔ تمام ریاستوں کی خودمختاری کا بھرم کھلتا جا رہا تھا۔ اور یونین جیک نے تمام ریاستوں کے قومی پھریروں کی جگہ لے لی تھی۔ غدر جیسا ہولناک اور دل سوز سانحہ ابھی ابھی ہو گزرا تھا۔ اور ہر طرف اس کا چرچا تھا۔ اگر کہیں کوئی انگریز افسر لکھنؤ آتا تو اس کا شاہانہ استقبال کیا جاتا تھا۔

"اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم لوگ پرانے ڈھروں پر آنکھ بند کرکے چلے جائیں۔ پرانی لکیر کے فقیر ہوں۔ اب اور ہے۔ اب ہم کو یہ تعلیم ہوتی ہے کہ شائستگی کے میدان میں قدم بڑھائیں۔ اور دیکھو اور غور کرو کہ زمانۂ سلف کی رسم و رواج قدیم میں کون کون امور قابل تبدیل ہیں"

یہ ہیں سرشار کے عقائد و نظریات ! لہٰذا یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ سرشار صحیح معنوں میں ایک ترقی پسند تھے۔ انھوں نے ہر رجعت پسندی کے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کی۔

اُس زمانے میں مسز اینی بیسنٹ کی تھیاسوفیکل سوسائٹی، سر سید کی اصلاحی تحریک، برہمو سماج اور آریا سماج کے علاوہ عیسائی مشنری کا دور دورہ تھا۔ سمندر پار جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ پھر بھی ترقی پسند لوگ روایت سے بغاوت کرنے لگے۔ یہ تھا سرشار کا سیاسی اور سماجی ماحول جس سے سرشار کی وسیع الخیالی اور بالغ نظری کا احساس ہوتا ہے۔ آیئے اب ان کے عہد کے ادبی رجحانات کا جائزہ لیا جائے۔

اردو شاعری میں حالی کی ترقی پسندی زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اس کا اعتراف سرشار نے سیر کہسار میں یوں کیا ہے:۔

"اب نیچریہ شاعری کی طرف لوگ بہت زیادہ مائل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ شاعری کو ایک کارآمد شغل بنائیں۔ غزل کے پڑھنے سے بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکلے گا کہ اگر شاعر نے تشبیہ اور رعایت کا پہلو اختیار کیا ہو تو ایک ساعت کے لئے پڑھنے والے کا جی خوش ہو جائے۔

علاوہ ازیں انگریزی اور دیگر یورپین ادب کا اثر بھی ہمارے ادب پر پڑتا جا رہا تھا۔ انگریزی طرز پر مضمون نگار کی ابتدا ہو چکی تھی، ناول نویسی اور افسانہ نگاری کے فن میں بھی نئے نئے تجربے کئے جا رہے تھے۔ صحافتی ناول کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ یہی نہیں بلکہ طنز و مزاح اور ظرافت کے میدان میں بھی صحت مند قدریں جنم لے رہی تھیں۔

سرشار سے کچھ عرصے قبل ہندوستان کے ادبی ماحول پر رجب علی بیگ سرور اپنا سکہ چلا چکے تھے مگر ان کے ہاں سرا تھی۔ ان کے قصے حسین تخیل، رنگینی الفاظ، اور چٹخارے دار زبان کے آئینہ دار ضرور تھے مگر ان میں زندگی کی دھڑکن کے بجائے خوابوں ہی کو پناہ گاہ بنا لینے کے عناصر کی فراوانی تھی۔

ڈپٹی نذیر احمد، منشی سجاد حسین، عبدالحلیم شرر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف اور تربھون ناتھ ہجر سرشار کے ہمعصر تھے۔ ڈپٹی نے ناصحانہ اور واعظانہ پناہ گاہ میں پناہ لی۔ انھوں نے ہمارے سماج کے رستے ہوئے ہر ناسور پر نشتر نہیں بلکہ بغیر مرہم کے پھاہا رکھے۔

شرر نے یوں تو اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔ لیکن انھوں نے زندگی بھر اپنے فن پر تاریخ کا خول چڑھائے رکھا۔ منشی سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف اور پنڈت تربھون ناتھ ہجر نے اردو ادب کو طنز و مزاح کے نہایت لطیف اشارے دیئے۔

سرشار کے عقائد و نظریات ایک ترقی پسند ادیب کے عقاید و نظریات تھے۔ مذہب کے متعلق آپ کا عقیدہ فسانۂ آزاد کے مطالعہ سے یوں ظاہر ہوتا ہے:

"مذہب ایک نہایت عظیم حقیقت الامر جزوِ خلقت انسانی ہے۔ نفس الامر ہر ایک قدیم مذہب کا عمدہ ہے اور جو تمام اس میں داخل ہیں وہ اہل مذہب اور ان کے مخالفین کی کج بحثیوں کے نتائج ہیں"۔

سرشار ہمارے سماج میں انقلاب لانا چاہتے تھے، ان کا انقلاب نعروں اور خون خرابے کا انقلاب نہیں تھا، بلکہ عوام کی قوت فکر کو تعمیری سانچوں میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ اسی لئے فسانۂ آزاد میں فرماتے ہیں:

فت اللہ بدوی

گلدستۂ بہارِ بے خزاں

یہ گلدستہ بریلی سے فروری سنہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اخبار روز افزوں، ہفتہ وار کا ایڈیٹر میر محمود علی، اس کا مہتمم بھی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب داغ کے مشورہ سے اس گلدستہ کا اجرا ہوا تھا اور وہ اس کے سرپرست تھے۔ میرا تحریر موجود ہے اس سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ ہم اس عبارت کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

"ہم بہت فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمیں گلدستہ کے لئے یہ مبارک نام، جہاں استاد ناظم یار جنگ بلبلِ ہندوستان عالی جناب حضرت نواب مرزا خانصاحب داغ مدظلہٗ نے عطا فرمایا تھا۔"

الٰہی پھول پھول اس باغ کا رشکِ گلستاں ہو
بہارِ بے خزاں میں شورِ مرغانِ غزلخواں ہو

جہاں تک مہتمم گلدستہ کے متعلق معلومات کا تعلق ہے، وہ بہت مختصر ہیں۔ میر محمود علی بریلی کے باشندے تھے۔ روزافزوں کے ایڈیٹر ہونے کے باعث، آپ کو سیاست اور ادب پر گہری نظر تھی۔ آپ ایک اچھے شاعر تھے اور داغ تلامذہ میں داخل تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اخبار روز افزوں، اس زمانہ میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اور سیاسی اور ادبی باعث، عزت اور تکریم کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ یہ اخبار سال سنہ ۱۹۰۲ء میں جاری ہوا تھا اور غالباً سنہ ۱۹۰۳ء میں لیا ـــ گلدستہ بہارِ بے خزاں کی پشت پر اس اخبار کے متعلق جو اشتہار دیا گیا ہے، وہ بڑا دلچسپ ہے۔ یہاں اشتہار کو بغیر کسی ردّ و بدل کے نقل کیا جاتا ہے۔ تاکہ ایک فراموش شدہ ادبی شاہکار کی قدر و قیمت کی خبر پڑھ سکے۔

"اخبار روز افزوں"

نے ملک میں اپنی روز افزوں ترقی سنہ ۱۹۰۱ء سے نہایت مستعدی

انجمن کی نئی مطبوعات

جو عنقریب شائع ہو رہی ہیں

۱ - مقاماتِ ناصری۔ میر ناصر علی کے انشائیوں کا مجموعہ مرتبہ انصار ناصری
۲ - تذکرۂ عروس الاذکار۔ مصنفہ نصیر الدین نقش مرتبہ افسر امروہوی
۳ - شمالی ہند کی نثری داستانیں (نظر ثانی شدہ ایڈیشن) ڈاکٹر گیان چند۔
۴ - شمالی ہند کی منظوم داستانیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔
۵ - اشاریہ اُردو۔ رسالہ "اُردو" کے چالیس سالہ شماروں کا اشاریہ
۶ - لغت کبیر اُردو (جلد اوّل) بابائے اُردو مرحوم۔
۷ - انگریزی ادب کی تاریخ ڈاکٹر احسن فاروقی۔
۸ - تاریخ سلطنت مسلمانان روس۔ مزمل لیسین۔
۹ - اُردو تھیٹر۔ جلد چہارم۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی
۱۰ - تذکرۂ ہمیشہ بہار۔ مصنفہ کشن چند اخلاص۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ،

کراچی ۱

شکل تصویر ہو کیوں، کس نے بنایا حیراں　　　کچھ تو ہم سے بھی کہو آئینہ میں کیا دیکھا
جان دینے کے سوا، عشق میں چارہ کیا ہے　　　دل دیا جس نے اُسے موت کا جویا دیکھا
شبِ وعدہ تھا کبھی امید کبھی یاس میں دل　　　کبھی دلبر کا کبھی موت کا رستا دیکھا

تہ و بالا ہوئے افلاک نہ کہتا تھا اثر
کچھ اثر آپ نے اس آہ رسا کا دیکھا

(۲) آثم - جناب حافظ حضور احمد بریلوی مصنف ذائقہ عشق من ارشد تلامذہ حضرت امیر مینائیؒ

گیسوئے یار پہ ہم نے جسے شیدا دیکھا　　　بال بھی اُس کا نہ ہوتے ہوئے بیکا دیکھا
کیا وہ عطرِ گلِ جنت کی حقیقت سمجھے　　　جس نے تیرے رُخِ رنگیں کا پسینا دیکھا
دشتِ ایمن کی طرح ہو گئیں گلیاں روشن　　　تیرے ہر نقشِ قدم کو یدِ بیضا دیکھا
گل کہیں، خار کہیں، نور کہیں، نار کہیں　　　تیری قدرت کا عجب رنگ خدایا دیکھا
خواب میں بھی نہ مجھے رشک کی برداشت ہوئی　　　رو اُٹھا غیر کے ساتھ اُس کو جو ہنستا دیکھا
بس کہ تھا دل کو ترے کوچہ کا اے حور خیال　　　رات کو خواب میں جنت کا تماشا دیکھا

دل مرا سنگِ حوادث سے بھی ٹوٹا نہ کبھی
ہم نے پتھر سے بھی مضبوط یہ شیشا دیکھا

(۳) احمد - جناب حکیم احمد یار بیگ بریلوی شاگرد جناب قیصر بریلوی

کیا بتائیں کہ شبِ ہجر میں کیا کیا دیکھا　　　تیرہ بختی نے جو کچھ ہم کو دکھایا دیکھا
خاکساری سے دلوں کو ہے تجلّی حاصل　　　رو کشِ مہر اُسے دشت کا ذرّا دیکھا

ہمسری تجھ سے کرے ماہِ منور کیونکر
تیری تصویر کو خورشید سے اعلیٰ دیکھا

(۴) ارشاد - حافظ محمد ارشاد علی صاحب بریلوی، شاگرد جناب حسن بریلوی

آج پردہ رُخِ جاناں سے جو اُٹھا دیکھا　　　شوق وارماں میں قیامت کا تڑپنا دیکھا
تیری قامت سے قیامت کو نہیں کچھ نسبت　　　فتنۂ حشر تری چال سے برپا دیکھا
زندگی زہر سے بدتر ہے غمِ فرقت میں　　　آپ نے میٹھی نظر سے مجھے اچھا دیکھا
مر مٹا پردہ کیا جس سے مری جاں تو نے　　　جی گیا جس نے ترا جلوۂ زیبا دیکھا
حسن تیرا سا کسی میں نہ ادا تیری سی　　　حق تو یہ ہے تجھے ہر بات میں یکتا دیکھا

کے ساتھ حمایت مذہب اور پولیٹیکل معاملات پر اپنی آزادانہ رائیں ظاہر کر کے بڑا نام پیدا کیا ہے ۔ ہم اس کی نسبت ناظرین والا تمکین کی خدمت میں صرف اس قدر عرض کرتے ہیں کہ اگر آپ کو ایسا اخبار دیکھنے کا شوق ہے جو سچوں کا دوست، جھوٹوں کا دشمن، قوم کا خیر خواہ، گورنمنٹ کا مشیر، رعایا کے حقوق کا دستگیر ہو تو شہر بریلی کا مشہور اخبار روز افزوں ہفتہ وار دیکھئے، جس میں ہر شخص کی طبیعت کا عمدہ سامان موجود ہے ۔ اگر آپ کو فاضلانہ مضامین پڑھنے سے شوق ہے تو ایڈیٹوریل مضامین ملاحظہ فرمائیں ۔ اور اگر آپ کو علم دین اور مسائل شرعیہ سے دلچسپی ہے تو مذاکرہ علمیہ سے آپ کی پوری تسکین ہو سکتی ہے ۔ اگر آپ خبروں کے شایق ہیں تو عطر مجموعہ اور جام جہاں نما کی سیر کیجئے ۔ اگر آپ کو شعر و سخن سے دلبستگی ہے تو نامی گرامی شعرائے زمانہ کا کلام جو نہایت حسن انتظام سے شائع کیا جاتا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔"

اس اشتہار کے پڑھنے سے ہم اس نتیجہ پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں کہ اخبار روز افزوں، اپنے دور کا ایک کامیاب اخبار ہوگا ۔

'بہار بے خزاں' میں اکثر بریلی کے شعراء کا کلام موجود ہے ۔ اس لئے اس گلدستہ کو بریلی کے شعراء کا ایک مختصر تذکرہ سمجھنا چاہیئے ۔ حقیقت میں یہ گلدستہ 'یادرفتگاں' کا ایک ایسا مرقع ہے، جس سے گزرے ہوئے شعراء کے نام اور ان کے کلام کا نشان مل جاتا ہے ۔ یہ کوئی کم فائدہ نہیں ہے ۔ مرور ایام نے جن برگزیدہ شخصیتوں کے نام اور کلام کو مٹا دیا ہے، وہ ہمارے سامنے گویا پھر زندہ ہو جاتے ہیں ' بہار بے خزاں' کی اوّلین اشاعت میں جو مصرع طرح دیا گیا تھا وہ یہ تھا:

جلوۂ یار کا آنکھوں نے تماشا دیکھا

گلدستہ میں شعرائے گرامی کا کلام حروف تہجی کی ترتیب سے دیا گیا ہے اور اس مشاعرہ کا آغاز محمد حسن صاحب آثر کے کلام سے ہوتا ہے ۔ ہم اس ترتیب سے انتخاب پیش کریں گے ۔

(۱) اثر ۔ جناب منشی محمد حسن بدایونی تلمیذ جناب حسن بریلوی ۔

پوچھتے کیا ہو شب ہجر میں کیا کیا دیکھا — اب دکھائے نہ خدا خیر جو دیکھا دیکھا
طالب دید کبھی ویسا ہی ہو جیسا ہو تمہیں — جس کو وہ آنکھ ملی اس نے وہ جلوہ دیکھا
رگ گردن کے قریب ہو کے یہ چھپنا کیا خوب (کذا) — جلوۂ یار نرالا ترا پردا دیکھا
غش پہ غش طالب دیدار کو آتے ہیں یہاں — پھر کہے کون کہ محفل میں تری کیا دیکھا
ان کی محفل میں گئے تھے کہ گئے آپ سے آپ — واہ اے حضرت دل خوب تماشا دیکھا

(۱۰) اعجاز ۔ جناب منشی محمد اعجاز حسین شہر کہنہ بریلوی ۔

کیا کہوں نامۂ محبوب میں کیا کیا دیکھا
سچ تو یہ ہے کہ جو قسمت کا لکھا تھا دیکھا

طرفہ انداز ترے ناز و ادا کا دیکھا
بات میں بات، کرشمہ میں کرشمہ دیکھا

اے فغاں تو نے کیا راز سے اُن کو آگاہ
پڑ گیا روزنِ دیوار میں رخنا دیکھا

تھی یہ ناکامی قسمت کہ رہا میں ناکام
اُس نے خنجر کو کئی بار نکالا دیکھا

آگیا یاد چراغِ شب فرقت مجھ کو
قبر میں داغ جگر کا جو اُجالا دیکھا

دیکھنا تھا تو مجھے تیغ سے بسمل کرتے
کر دیا خاک تو کیا خاک تماشا دیکھا

شبِ فرقت بھی کوئی اچھی طرح سے اعجاز
بیکسی ساتھ ہوئی جب مجھے تنہا دیکھا

(۱۱) اعزاز ۔ جناب منشی نور احمد سہارنپوری تلمیذ حضرت آثم بریلوی

لبِ جاں بخش کو اے جانِ مسیحا دیکھا
کوئی بیمار نہ ہوتے ہوئے اچھا دیکھا

جس نے اے یار تمہارا رُخِ زیبا دیکھا
اُس نے اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھا

فصلِ گل میں بھی افسردہ ہی رہا دل اپنا
کبھی شاداب نہ یہ نخلِ تمنا دیکھا

نالہ کش سوزِ فراق بت ترسا میں رہی
دل کا ہر آبلہ ناقوس کلیسا دیکھا

دھج نئی وضع نئی رنگ نیا گھات نئی
ہر ادا میں ترا انداز نرالا دیکھا

وعدۂ وصل نے اعزاز پہ آفت توڑی
رات بھر آپ کا کم بخت نے رستا دیکھا

(۱۲) اعلیٰ ۔ جناب منشی محمد اعلیٰ حسین حمیدی صدیقی بدایونی تلمیذ حضرت محسن کاکوروی ۔

چشمِ بیمار کا بیمار زمانا دیکھا
اچھے اچھوں کو ترے عشق میں مرتا دیکھا

آپ ہی جلوہ دکھا کر مجھے بیہوش کیا
آپ ہی ناز سے کہتے ہیں کہو کیا دیکھا

مُردہ زندہ کئے پازیب کی جھنکاروں نے
تیری رفتار میں اعجاز مسیحا دیکھا

رشکِ اغیار گوارا نہ کیا اعلیٰ نے
جان دی ہجر میں اے جانِ مسیحا دیکھا

(۱۳) افسر ۔ جناب منشی محمد مصطفےٰ خاں بریلوی، شاگرد حضرت آثم بریلوی ۔

اس قدر دستِ حنائی کا تصور ہے بندھا
جاری ان آنکھوں سے اک خون کا دریا دیکھا

نامہ بر یہ تو بتا دے کہ مرا خط لے کر　　یار نے غیر سے پڑھوا کے سُنا یا دیکھا

نہیں آتا تھا کسی طرح نہ آئے ارشاد
لو دمِ بازپسیں بھی اُنھیں بلوا دیکھا

(۵) ارشد۔ جناب منشی محمد احمد ارشد خان تلمیذ حضرت قیصر بریلوی

اُس کے کوچہ میں یہی روز تماشا دیکھا　　کوئی بے جان کوئی ہم نے تڑپتا دیکھا

کسی مہوش پہ ضرور آپ کا دل آیا ہے
ہم نے ارشد تمھیں جب دیکھا تو روتا دیکھا

(۶) ارم۔ جناب منشی محمد پیارے علی شاگرد حضرت آشم بریلوی

کیا کہوں حسن میں اُس شوخ کے کیا کیا دیکھا　　نازنیں غمزہ و عشوہ میں کرشما دیکھا

اب سمجھ میں میرے والشمس کی معنی آئے　　آج بے پردہ جو نورِ رُخِ زیبا دیکھا

مفت بدنام ہوئے ہجر کے صدمے جھیلے
آپ کو عشق میں ہم نے یہ نتیجا دیکھا

(۷) ازہر۔ جناب منشی سید علی احمد شاہ بریلوی تلمیذ حضرت زہیر بریلوی۔

کروٹیں لاکھوں ہی لیں بسترِ تنہائی پر　　کوئی پہلو بھی نہ آرام جگر کا دیکھا

دیکھ اندوہ، غم و حسرت و ارماں کے ہجوم　　کیا کہوں فرقتِ دلدار میں کیا کیا دیکھا

شرق تم کہو دل کو کہ ہمیشہ ہم نے
اک نہ اک داغِ الم اس میں چمکتا دیکھا

(۸) ارمان۔ جناب منشی عبدالاحد بریلوی تلمیذ حضرت قیس دہلوی

کیا کہیں چاہنے والے نے ترے کیا دیکھا　　اُس کو جو اُس کے مقدر نے دکھایا دیکھا

درد پہلو میں تڑپ دل میں جگر میں ناسور　　کیا کہوں عشق میں اُس شوخ کے کیا کیا دیکھا

جس کی الفت میں زمانہ کو بنایا دشمن　　وائے تقدیر کہ اُس کو بھی نہ اپنا دیکھا

دل میں ارمان یہ ارمان رہا جاتا ہے
جا کے طیبہ نہ شہنشاہ کا روضہ دیکھا

(۹) اصغر۔ جناب منشی اصغر حسین بریلوی

غسل شبنم نے دیا گرد بیاباں نے کفن　　اپنی کشتہ کا جفا کار جنازا دیکھا

آج وہ چار نکل آئے کتنے آنسو میرے — ہے یہ طوفان جو کہتے ہو کہ دریا دیکھا

عہد کا پاس تو کوئی نہیں کرتا ارشد
موت کو ہم نے مگر وعدہ کا سچا دیکھا

(۱۷) بریان ۔ جناب حکیم رگھبیر سہائے جہان آبادی ایڈیٹر آریہ پتر تلمیذ حضرت یزدانی میرٹھی ۔

اے حسیں جس نے ترا عشق جنوں زا دیکھا — اُس نے معمورۂ دنیا کو بھی صحرا دیکھا
چھوڑ کر جاتے ہو کیوں مجھ کو ترش رو ہو کر — ایسا کیا غیر کے گھر آپ نے میٹھا دیکھا

دیر و کعبہ کی طرف اُس نے ارادہ نہ کیا
جس نے گھر تیرا کبھی اے بتِ رعنا دیکھا

(۱۸) تمنا ۔ جناب مرزا عبدالمجید بیگ بریلوی تلمیذ حضرت قیس سہولوی ۔

نہ تڑپنا کبھی دیکھا نہ پھڑکنا دیکھا — خاک تم نے کسی بسمل کا تماشا دیکھا
نہ پری میں ہے یہ انداز نہ حوروں میں ادا — تجھ کو اے جانِ جہاں سب سے نرالا دیکھا
میرے نالے بلانے کے فلک سے لوٹے — اُلٹی تقدیر کا اپنی اثر اُلٹا دیکھا

رات دن قبر پہ رہتا ہے حسینوں کا ہجوم
خاک میں مل کے تمنا یہ تماشا دیکھا

(۱۹) حسن ۔ عالی جناب مولانا مولوی محمد حسن خاں بریلوی تلمیذ حضرت فصیح الملک داغ دہلوی سلمہ القوی

بات پوچھی نہ کبھی حال ہمارا دیکھا — جائیے جائیے بس آپ کو دیکھا دیکھا
کیوں گرا خاک پہ کیوں ہوش گئے کیا گزری — دیکھنے والے سے پوچھے تو کوئی کیا دیکھا
کان وہ کان ہے جس نے تری آواز سنی — آنکھ وہ آنکھ ہے جس نے ترا جلوہ دیکھا
تم گئے دشت میں تو دشت کو گلشن پایا — تم چلے باغ سے تو باغ کو صحرا دیکھا
جس جگہ پائی ترے کشتۂ دیدار کی خاک — ابرِ رحمت کو وہاں جھک کے برستا دیکھا
تشنہ کامی سے تڑپتے ہوئے موجیں پائیں — لبِ کوثر کو ترے دید کا پیاسا دیکھا

جس سے ہوں سوختہ جانوں کے کلیجے ٹھنڈے
انھیں جلووں سے حسن طور کو جلتا دیکھا

(۲۰) دل ۔ جناب منشی محمد احسان اللہ خاں بریلوی تلمیذ حضرت قیس سہولوی :

اللہ اللہ وہ کسی کا رخِ زیبا دیکھا — سامنے جس کے خجل ماہ دو ہفتا دیکھا

مُردہ دل ہوتے ہیں دیدار سے اُن کے زندہ — ان حسینوں میں یہ اعجازِ مسیحا دیکھا
ذبح کر کر وہ مرا طائرِ دل کہتے ہیں — مرغِ بسمل کے تڑپنے کا تماشا دیکھا
گل گلزارِ جہاں کیوں نہ رخِ رنگیں ہو — سرو سے بڑھ کے جب اُن کا قدِ رعنا دیکھا

دل میں آتا ہے کروں چاک گریباں افسر
پہلوئے غیر میں پھر یار کو بیٹھا دیکھا

(۱۴) اوج - جناب منشی محمد جان وکیل عدالت بریلی -

قتل کا کچھ بھی نہ قاتل نے تماشا دیکھا — جب تڑپتے ہی نہ دیکھا مجھے تو کیا دیکھا
سرو موزونیٔ قامت پہ اکڑتا تھا بہت — آج اُس نے بھی قدِ یار سے نیچا دیکھا
دل طلب تم نے کیا جان بھی دیدی ہم نے — تم نے ہم سا بھی کوئی چاہنے والا دیکھا
جس جگہ درد اٹھا بیٹھ گیا دل میرا — دل پہ درد نے کیا ساتھ نباہا دیکھا

صاد مضموں گل و شبنم کا ہوا پیش نظر
تیرے رخ پر جو کبھی ہم نے پسینا دیکھا

(۱۵) اوج - جناب نانک چند بریلوی تلمیذ حضرت حسن بریلوی -

حشر میں بھی نہ کوئی دیکھنے والا دیکھا — جسے دیکھا اُسے مشتاق تماشا دیکھا
برق جلوہ نے تو آنکھوں پہ گرا دی بجلی — کیا کہیں ہم سے اگر پوچھے کوئی کیا دیکھا
دشمنِ جاں نہ سہی آپ مسیحا ہی سہی — کسی بیمارِ محبت کو بھی اچھا دیکھا
وہ اگر آئیں جنازہ پہ تو کوئی کہہ دے — جانے والے نے بہت آپ کا رستا دیکھا
آئینہ اور ترے حسن کے قابل کیا خوب — تو نے بھی کس کی طرف میرے خود آرا دیکھا

بزم دشمن میں مدارات ہوا تھا جانا
خیر اب کیا کہوں اے اوج جو دیکھا دیکھا

(۱۶) ارشد - جناب حکیم ارشد میاں فرخ آبادی تلمیذ حضرت طاہر فرخ آبادی -

آج بسمل کی طرح مجھ کو تڑپتا دیکھا — جو نہ دیکھا تھا وہ قاتل نے تماشا دیکھا
تھم گئے آنکھ سے بہتے ہوئے آنسوائے ضبط — بند کوزے میں کیا ہم نے یہ دریا دیکھا
دل وہ دل ہے جو ہوا محو تجلی تیرا — آنکھ وہ آنکھ ہے جس نے رُخِ زیبا دیکھا
آئینہ سامنے رکھ لو تو ملے صاف جواب — ہم سے کیا پوچھتے ہو کوئی بھی ہم سا دیکھا

ہوکے بیتاب مرے گھر میں وہ آئے قیصرؔ
جذبۂ عاشقِ مشتاق نظارا دیکھا

(۲۴) ناشاد - جناب منشی صاحبداد خاں بریلوی تلمیذ حضرت قیصر بریلوی

جس نے اے جان ترے حسن کا جلوہ دیکھا ہم نے بیہوش اسے صورتِ موسیٰ دیکھا
اس بتِ شوخ کا جب بام پہ جلوا دیکھا اوج پر اپنے مقدر کا ستارا دیکھا
بے اجل مرتے ہیں شمشیر سے اس کے لاکھوں
کوچۂ یار میں قبضہ نہ قضا کا دیکھا

(۲۵) کوثر - جناب مولوی حکیم محمد عابد علی رئیس خیرآبادی تلمیذ حضرت امیر مرحوم

آج ہم نے رخِ پُر نور کا جلوہ دیکھا قدرتِ صانعِ مطلق کا تماشا دیکھا
اس قدر یادِ لبِ لعل میں آنکھیں روئیں ہر سرِ مو سے رواں خون کا دریا دیکھا
چمنِ دہر میں دیکھے ہیں ہزاروں گل رو پر نہ تجھ سا کوئی ہم نے گلِ رعنا دیکھا
اے فلک تو ہی بتا تجھ کو قسم مجنوں کی عاشقوں میں کوئی ناشاد بھی مجھ سا دیکھا
شاق ہے منزلِ ہستی سے عدم کو جانا اے اجل کوئی نہ ساتھی ہے نہ رستا دیکھا
جوشِ گریہ نے مرے داغ معاصی دھوئے جامۂ تن میں فرشتوں نے نہ دھبا دیکھا
کشتۂ خنجرِ ابرو تھا کسی کا شاید
ماہِ نو دیکھ کے کوثر کو تڑپتا دیکھا

(۲۶) بی جواہر جان صاحبہ طوائف بریلوی

ہم نے بے مثل تجھے اے بت ترسا دیکھا ساری دنیا سے ترا حسن نرالا دیکھا
رشکِ اغیار سہے صدمۂ فرقت جھیلے کیوں دلِ زار محبت کا نتیجا دیکھا
سب جسے مہر جہاں تاب کہا کرتے ہیں ہم نے وہ بھی تری تصویر کا خاکہ دیکھا
کبھی دل میں ہے تصور کبھی آنکھوں میں خیال کس جگہ تم کو اے جان تمنا دیکھا
تم موئی جاتی ہو فرقت میں جواہر جس کی
اس جفا کار کو اغیار پہ شیدا دیکھا

اس طرح مشاعرہ کے اندراج کے بعد "گلدستہ بہار بے خزاں" کے آخری ورق پر گلدستہ کے اجرا کی تاریخ دی گئی ہے یہ تاریخ حافظ حضور احمد بریلوی متخلص بہ آثم کے فکر کا نتیجہ ہے:

جس نے جو بن ترے سینہ پہ اُبھرتا دیکھا   کس طرح چھاتی پہ اپنے وہ دھرے گا پتھر

حضرتِ دلؔ کا زمانہ سے نرالا دل ہے
آ گیا ٹوٹ کے اُس پر جسے اچھا دیکھا

(۲۱) شوقؔ - جناب منشی مکھن لال بریلوی تلمیذ حضرت امیرؔ مرحوم لکھنوی۔

ایک دن بھی نہ اثر جذبۂ دل کا دیکھا   عمر بھر اُس بُتِ بے مہر کا رستا دیکھا
بسملِ ناز کا انداز نرالا دیکھا   ایسا تڑپا کہ زمانہ نے تماشا دیکھا
دو ٹھکانے ہیں ترے زلف کے دیوانوں کے   سیرِ زنداں کی کبھی گہ کبھی صحرا دیکھا

سیل خوں دیکھتا ہوں سر سے بھی اونچا اے شوقؔ
چشمِ خوں بار یہ کہتی ہے ابھی کیا دیکھا

(۲۲) عاشقؔ. میر محمود علی مہتمم گلدستہ و ایڈیٹر اخبار روز افزوں بریلی تلمیذ حسنؔ مدظلہ العالی

دلِ حیراں میں خیالِ رخِ زیبا دیکھا   آج آئینہ میں آئینہ کا جلوا دیکھا
لوٹتا دیکھا کوئی، کوئی تڑپتا دیکھا   بزمِ قاتل میں بھی مقتل کا تماشا دیکھا
اُس کے دل سے کوئی حال شبِ وعدہ پوچھے   شام سے جس نے سحر تک تہ ارستا دیکھا
میرا یہ حال، دلِ زار کی حالت وہ کچھ   چاہنے والوں نے چاہت کا نتیجا دیکھا

کیا بچے اُس کی نظر میں مہ کامل عاشقؔ
خواب میں یار کا جس نے رخِ زیبا دیکھا

(۲۳) قیصرؔ - جناب مولوی مرزا رستم بیگ بریلوی تلمیذ حضرت عزیزؔ مرحوم بریلوی۔

ہم نے جس شان میں دیکھا وہی یکتا دیکھا   پردہ دیکھا تو فقط ایک دوئی کا دیکھا
غور سے ہم نے تمھارا جو سراپا دیکھا   بخدا قدرتِ خالق کا تماشا دیکھا
شورِ محشر تری رفتار سے برپا دیکھا   آسماں اور زمیں کو تہ و بالا دیکھا
قاصد آیا مگر آیا نہ جواب خطِ شوق   یہ بھی اک کاتبِ تقدیر کا لکھا دیکھا
اس قدر شہرۂ آفاق ہے حسنِ محبوب   جس نے کانوں سے سنا آنکھ سے گویا دیکھا
فکرِ اشعار سے شاعر کو ہے رفعت حاصل   سر بزانو جو ہوا عالمِ بالا دیکھا
حسنِ معشوق ازل کا ہے نمونہ یہ جہاں   جو سُنا تھا وہ سُنا ہم نے جو دیکھا دیکھا
ذات جیسی اُس کے جو مظہر ہیں سب آثارِ حیات   عین خلوت میں اسے انجمن آرا دیکھا

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

بنگال کا ایک قدیم کتب خانہ

کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے کتنے کتب خانے ہیں جن کا دامن کبھی علم کے خزانے سے بھرپور تھا اور جو کہ گردش زمانہ کے ہاتھوں لُٹ ،جن کا آج کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ چند قدیم کتب خانے اب محض کھنڈرات ہیں اور وہ کھنڈرات اس بات کی گواہی دیتے عمارت عالی شان تھی۔ اب بھی چند قدیم کتب خانے ہیں جن کے در و دیوار پر سبزہ اُگ آیا ہے، دیواریں گرنے لگی ہیں جن میں کی بیشمار ہیں نہ معلوم کہاں اور کیونکر گم ہوگئی ہیں یا برائے نام صرف چند کتابیں باقی ہیں۔ ایسا ہی ایک قدیم کتب خانہ جس میں اب ب کتابیں رہ گئی ہیں ــــ اتر پاڑا لائبریری ہے، جسے جے کرشن لائبریری کہتے ہیں۔ اور مرحوم جے کرشن نے بری کو آج سے ایک سو دس سال قبل قائم کیا تھا۔

اتر پاڑا، کلکتہ سے دس کیلومیٹر کے فاصلے پر ضلع ہگلی میں واقع ہے۔ مرحوم جے کرشن مکھرجی کے دادا، نندگوپال مکھرجی فارسی عالم تھے اور ڈھاکا کلکٹری میں منشی تھے آپ ہی سب سے قبل اتر پاڑا میں آکر بس گئے، چونکہ یہیں آپ کا سسرال تھا۔ جے کرشن دہن نے بھی اتر پاڑا ہی میں شادی کی۔ جے کرشن کے ماموں جے شنکر سنسکرت کے بڑے عالم گزرے ہیں۔ اور خاص کر نیائے ماپنے عہد کے نامی گرامی پنڈت تھے۔

جے کرشن مکھرجی مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۰۸ء میں بمقام اتر پاڑا پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں حاصل کی اور نہ مانے انہوں نے فارسی بھی پڑھی تھی، ان دنوں جبکہ جے کرشن لڑکپن تھا، ان کے والد جگموہن انگریزی پلٹن میں ملازم تھے۔ لہٰذا کو انگریزوں سے تعلقات رکھنے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا اچھا موقع ملا۔ جب جگموہن کا تبادلہ میرٹھ میں ہوا تو جے کرشن بھی گئے۔ جے کرشن کو نہ صرف لکھنے پڑھنے سے غیر معمولی دلچسپی تھی، بلکہ وہ نہایت ذہین بھی تھے۔ میرٹھ میں فوجیوں کے لئے جو تھا، کہا جاتا ہے کہ جے کرشن نے اس کتب خانہ کی ایک ایک کتاب پڑھ ڈالی تھی۔ جس سے نہ صرف ان کے علم میں اضافہ ہوا بلکہ س اور دلچسپی بڑھ گئی۔

۱۸ء میں برٹش فوج نے ریاست بھرت پور حملہ کیا اور قلعہ کو فتح کر لیا ان انگریز فوجیوں کے ساتھ جگموہن اور ان کے بیٹے

تاریخ آغاز سال ہجری، گلدستہ بہار بے خزاں۔

عجب گلدستۂ عاشق ہے رنگیں — یہ سب پرچوں میں پرچہ گلستاں ہے
کدھر ہیں شائقیں آئیں خریدیں — رقم اس میں کلام شاعراں ہے
نہ کیوں مثل صدف ہوں حرف اُس کے — ہر اک نقطہ جب اُس کا دُر فشاں ہے
زباں اچھی سخن اچھا ہے اس میں — فصاحت ساتھ معنوں کے عیاں ہے

لکھی تاریخ آثم نے یہ اس کی
بہت زیبا بہار بے خزاں ہے

۱۳۲۰ھ

اُس میں کوئی شک نہیں کہ "گلدستہ بہار بے خزاں" اُس دور کے گلدستوں میں امتیازی درجہ رکھتا تھا، اور بریلی کے شعراء کی کثیر تعداد دیکھ کر ہمیں یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ یہ شہر اُس زمانے میں اردو شاعری کے لئے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

مدد نہیں کی۔
جے کرشن جو دل میں ٹھان لیتے تھے وہ کر کے ہی دم لیتے تھے۔ جب ان کو اطراف سے مایوسی ہوئی تو انہوں نے مصمم
ارادہ کیا کہ اگر کوئی ان کی مدد نہیں کرے گا تب بھی وہ لائبریری ضرور قائم کریں گے۔ پھر کیا تھا، ۱۸۵۰ء میں وہ کتب خانہ
کی تعمیر کرنے میں لگ گئے۔ بتاریخ ۱۵ اپریل ۱۸۵۹ء کو آخر کار اسی ہزار (۸۰۰۰۰) روپیوں کی لاگت سے اترپاڑا لائبریری
نے مکمل کر ڈالا اور لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ اس کتب خانے کے اخراجات کو چلانے کے لئے انہوں نے سالانہ
یکسو (۲۱۰۰) روپیوں کی آمدنی کے لائق جائداد کو کاغذات لائبریری کے لئے وقف کر دیئے۔ لائبریری کے ملازمین کی تنخواہ
لانہ نو سو روپے نیز کتب و رسائل کی خرید کے لئے سالانہ مزید ایک ہزار دو سو روپیوں کا انتظام کر دیا۔
ذرا سوچیئے تو آج بھی حیرت ہوگی کہ ایک فرد واحد نے علم کی خاطر کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ انہوں نے اتنی عظیم الشان عمارت
کے لئے تعمیر کی جتنی عالی شان عمارت ان دنوں نہ صرف بنگال میں بلکہ پورے ہندوستان بھر میں کہیں نہیں تھی۔ اور
دور میں اس طرح مفت کتابیں ہر خاص و عام کے لئے پورے ہندوستان میں کسی کتب خانہ سے مل سکتی تھیں اس
جے کرشن کا کتب خانہ ہندوستان بھر میں اپنی مثال آپ رہا ہے۔
اس کتب خانہ کو دیکھنے کے لئے جے کرشن کی دعوت پر لارڈ لارنس، لارڈ ڈفرن، لارڈ رپن، گورنر سر ایسلی ایڈن
، سر اسٹوارڈ بیلی، مارکوئس آف ہنٹلی جیسے لوگ آئے۔ جے کرشن لائبریری کے ابتدائی دور میں یہاں بیس ہزار سے
یں تھیں۔ جے کرشن کے ماموں جیسا کہ کہا جا چکا ہے اپنے عہد کے بڑے سنسکرت عالم تھے، اپنی تمام کتابیں جن میں
کی تعداد کثیر تھی اس کتب خانے کے حوالے کر دیں۔ جب ملک ملک کے لوگ آنے لگے تو جے کرشن نے اس دور
یاب ہونے والی مختلف زبانوں کے لغت ہندوستان سے اور بیرون ممالک سے منگوائے تاکہ سب عالم اپنا کام
۔ آج سے ایک سو دس سال قبل کسی فرد واحد کا ایسا کارنامہ انجام دینا ایک عجوبہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ آج بھی کون
بڑی ہمت کر سکتا ہے۔ جے کرشن لائبریری کے قیام کی خبر نے اس وقت کی دنیا میں ایک ہل چل مچا دی۔ دنیا
دنے سے عالم اس حیرت انگیز کارنامے کو دیکھنے اور یہاں مطالعہ کرنے آنے لگے۔ جے کرشن نے نہ صرف کتب خانہ
تھا بلکہ باہر سے آنے والے محققین جن کے رہنے کے لئے اترپاڑا میں کوئی انتظام نہیں تھا، کے لئے لائبریری کی اوپری
قیام و طعام کا بالکل مفت انتظام بھی کیا جہاں رہ کر وہ اپنے تحقیقی کاموں کو بخوبی
دے سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ریورنڈ لانگ کنگ ہام اور مسں میری کارپینٹر
سے ملکی عالم رہے ہیں۔ یہی وہ کتب خانہ ہے جہاں طویل تین سال تک رہ کر سر ولیم ہنٹر نے اپنی مشہور
امپیریل گزیٹر (Imperial Gazetteer) کو مکمل کیا۔ مختلف عالموں نے اس کتب خانے کے سلسلے
تاثرات کے طور پر اپنی تصانیف میں قلمبند کیا ہے اس سے اس کی عظمت و اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سر ولیم ہنٹر نے

جے کرشن بطور کلرک شامل تھے۔ قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد ان کے ہاتھ کافی دولت آئی۔ اسی دولت سے ۱۸۲۴ء میں جے کرشن نے نیلام میں اترپاڑا کی زمینداری خریدی اور اس طرح یہ گھرانہ ایک زمیندار گھرانہ بنا۔

غدر، ۱۸۵۷ء کا ہنگامی دور ختم ہونے کے بعد جب امن قایم ہوا تو جے کرشن نے ہگلی، بارڑا، بردوان، مدنی پور، بیربھوم اور ضلع ۲۴ پرگنہ میں کافی زمین جائداد خرید کر دہ بنگال کے ایک رئیس زمیندار بن گئے۔

اگر جے کرشن محض ایک بڑے زمیندار کی طرح شان و شوکت اور عیش و نشاط سے زندگی کے دن گزار دیتے، جس طرح اکثر زمینداروں نے گزاری ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کی یاد میں صفحے سیاہ کئے جائیں لیکن جے کرشن نے عام زمینداروں کیطرح زندگی بسر نہیں کی بلکہ انہوں نے ملک کی فلاح و بہبود کے لئے سماج سُدھار کے لئے، عوام کی خدمت کے لئے، علم و ادب کی ترقی کے لئے تا حیات جد و جہد کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ جے کرشن کی کوششوں سے اترپاڑا کا چھوٹا سا گاؤں دیکھتے ہی دیکھتے ایک شہر بن گیا۔ اور اس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کرلی۔ اترپاڑا میں انہوں نے پکی سڑکیں بنوائیں۔ چالیس ہزار روپیوں کی لاگت سے ایک عالی شان ہسپتال قایم کیا۔ ۱۸۵۰ء میں پچاس ہزار روپیہ صرف کرکے ایک انگریزی اسکول قایم کیا۔ ۱۸۸۷ء میں اترپاڑا کالج قایم کیا۔ اسکول اور ہسپتال کے اخراجات کے لئے دو ہزار روپیہ سالانہ آمدنی کے لائق جائداد وقف کر دی تاکہ یہ ادارے چل سکیں۔ نہ صرف اترپاڑا بلکہ بے گچی، مایاپور، جینتہ اور دیگر کئی مقامات پر جملہ ۳۱ پرائمری اسکول قایم کئے اور ان کے اخراجات کا انتظام کر دیا۔ اترپاڑا کے علاوہ دیگر مقامات پر مزید ہسپتال قایم کئے اور نہ صرف اترپاڑا لائبریری قایم کی بلکہ ۱۸۷۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی لائبریری کے لئے پانچ ہزار روپیہ بطور عطیہ دیا۔

۱۸۵۴ء میں جے کرشن مکرجی نے محسوس کیا کہ اسکول اور کالج سے نکلنے کے بعد طلبہ علمی دنیا سے دور ہو جاتے ہیں لہٰذا اسکول اور کالج کے دروازوں سے باہر نکلنے کے بعد طلبہ میں سے اکثر مالی طور پر اس قابل نہیں رہتے کہ اپنے علمی ذوق کو پروان چڑھانے کے لئے کتابیں خرید کر مطالعہ جاری رکھیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ علم کی دنیا سے دور ہو جاتے ہیں ان کا ذوق مرجھا جاتا ہے۔ اور ان سے دنیا کو جو کچھ مل سکتا تھا اس سے دنیا محروم رہ جاتی ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ایک ایسا کتب خانہ قایم کرنے کی ٹھان لی جہاں قیمتی سے قیمتی کتابیں بھی علم کے متوالوں کے لئے موجود ہوں اور بالکل مفت نہ صرف انہیں لائبریری میں رہ کر پڑھنے کو مل جائیں بلکہ اگر وہ چاہیں تو ضروری کتابوں کو اپنے ساتھ گھر بھی لے جا سکیں۔ اس مقصد کے لئے جے کرشن نے مورخہ ۲۳ اگست ۱۸۵۴ء کو ضلع بردوان کے ریوینیو کمشنر کے ذریعہ اترپاڑا میں ایک کتب خانہ قایم کرنے کے لئے سرکار انگریز سے درخواست کی اور اس درخواست میں یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کام کے لئے اپنی طرف سے وہ دو ہزار پانچسو روپیہ بطور عطیہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ نیز دیگر اخراجات ہر ماہ تیس روپیہ کتب خانے کے لئے دینا منظور کر لیا ہے۔ عرصہ تک وہ اس اپیل کو لے کر سرکاری حلقوں میں دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ لیکن انگریزی حکومت نے اس سلسلہ میں ان

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے گیارھویں ایڈیشن میں اس کتب خانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے،

"Uttarpara is famous for the Public Library, founded and endowed by Joy Kisson Mukherjee, which is specially rich in books of local topography."

بنگال کے کئی مشہور و مقبول عالموں نے اس لائبریری سے فائدہ اٹھایا ہے۔ جن میں یہ چند نام یقیناً قابل ذکر ہیں:۔
ایشور چندر ودیا ساگر۔ بھودیو مکھرجی۔ مائکل مدھوسودن دت۔ سر سریندر ناتھ بنرجی۔ بپن پال۔ شری آرو بندو۔ سر ایڈون آرنالڈ۔ بدھو دیو مکھرجی۔ پادری لانگ۔ کیشب چندر سین اور سرت چندر چٹرجی وغیرہ۔

بہرحال اس کتب خانہ کی تعریف جتنی بھی کی جائے کم ہے۔ لیکن اس کتب خانے کی حالت جے کرشن کی وفات (۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء) کے بعد سے بگڑنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ اس کا آفتاب غروب ہوتا گیا۔ کتابیں زمانہ کے ہاتھوں لٹتی رہیں۔ حالانکہ یہ وہی کتب خانہ ہے جہاں کئی عالم آئے اور جس سے انہوں نے فیض اٹھایا لیکن آج اس کی حالت واقعی قابل رحم ہے۔ غالباً اس کا پورا خزانہ ہی لٹ گیا۔ اور اس کا نام و نشان تک مٹ جاتا اگر آخری دنوں میں عوام کی جد و جہد اور اپیل پر غور کرتے ہوئے حکومت مغربی بنگال اور حکومت ہند اس کے انتظام کو اپنے ہاتھوں نہیں لے لیتی۔ ۱۹۵۸ء میں حکومت نے اس کتب خانہ کا انتظام سنبھال لیا۔ اور اب یہ ایک سرکاری پبلک لائبریری ہے۔ جسے حکومت کی طرف سے امداد ملا کرتی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس کتب خانے کی قدیم کتابیں جو اب تک لٹنے سے بچی رہ گئیں ہیں محفوظ رکھنے کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ اور لائبریری کی مالی حالت کو سدھارا جائے۔

عرصے سے میری خواہش تھی کہ میں اس کتب خانے میں مطالعہ کتب کے لئے جاؤں اور حال ہی میں مجھے اس کا موقع ملا ہے۔ میں اس کتب خانہ کے موجودہ لائبریرین شری ترون کمار متر کا شکر گزار ہوں جنہوں نے پوری دلچسپی سے میرے کام میں مدد فرمائی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کتب خانہ میں عربی فارسی اور اردو کی بھی ہزاروں کتابیں رسائل تھے، لیکن اب برائے نام ہی چند محفوظ رہ گئے ہیں۔ شری ترون کمار متر نے مجھے ۱۹۰۴ء میں شائع شدہ اس لائبریری کی ایک فہرست کتب دکھائی۔ جس میں سینکڑوں عربی فارسی و اردو کے علاوہ چند قدیم اخبارات مثلاً آگرہ اخبار کے فائل کا ذکر ہے۔ مرحوم سر جدو ناتھ سرکار نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے، کہ انہوں نے اس کتب خانے میں "آگرہ اخبار" کا فائل برائے ۱۸۳۸ء، ۴۱، ۴۴ اور ۴۵ کے دیکھے ہیں۔ لیکن اب یہ اخبارات نہیں ہیں لائبریری کی مذکورہ فہرست میں درج شدہ بیشتر کتابیں اب موجود نہیں ہیں۔ عربی فارسی اور اردو کی جو کچھ کتابیں مجھے یہاں دیکھنے کو ملی ہیں ذیل میں ان کا مختصر ذکر کرتا ہوں یہ تمام کتابیں انیسویں صدی کے ابتدائی دور سے لے کر درمیانی عہد تک کی ہیں لہذا یہ کتابیں یقیناً کم یاب ہیں اور ان میں کئی ایسی بھی ہیں جو جہاں تک مجھے علم ہے بنگال کے کسی اور کتب خانے میں نہیں

مذکورہ گزیٹر میں لکھا — :

Special acKnowledgements are due to Baboo Jay Kissen MuKharjee for the use of his large and excellent library at UttarPara. in Hoogly Distt: .... They have tended to lessen the inevitable disadvantages under which literary work has to be done in India, Seperated by half the globe from these great libraries of reference, which more fortunate writers in England have at their disposal.

مس میری کارپینٹر اپنی تصنیف "ہندوستان میں چھ ماہ" جو ۱۸۶۹ء کی تصنیف ہے میں لکھتی ہیں :-

Some twenty years ago, Baboo Joy Kisen Mukerjee, having got an English School and a dispensary endowed in the town of Ooterparrah, perceived the growing want of a library, with a reading room attached to it, for the benifit of his Countrymen. In Order to supply This desideratum The Baboo applied to Government through The Commissioner of Revenue, Bardawan Division to establish one on Similar terms with those of English School and the dispensary, but not succeeding in his attempts, he under took the work without any extraneous aid from the state............ In Conclusion permit me to state that the Library is largely availed of by the educated natives of the place, and by Englishmen residing on the Railway line and the Balee Paper Mill; and its Circulation of books is Calculated on an average to be 350 volumes in a month."

فارسی تصانیف

(۱) نام کتاب وثیقۂ جدیدہ۔ سرورق پر پہلے انگریزی اور اس کے بعد فارسی میں ذیل کی عبارتیں درج ہیں:
"The new Testament of our Lord and Savior Jesus Christ, in the Persian language"
"وثیقۂ جدیدہ" خداوند و رہانندہ ما عیسائے مسیح کہ آنرا ہنری مارتن قیس ترجمہ نمودہ" یہ کتاب لیتھو میں چھاپی گئی ہے۔ جسے کلکتہ بائیبل پریس میں چھاپ کر کلکتہ اکسیلری بائیبل سوسائٹی نے ۱۸۴۲ء میں شائع کیا۔ صفحات ۳۲۸ ہیں۔ کتاب کی حالت اچھی ہے۔

(۲) نام کتاب "منتخب المواعظ" مصنف کرشن چندر گھوس۔ اس میں مختلف حکایات ہیں جن کو مصنف نے انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ جملہ ۱۰۲ حکایات ہیں۔ اور صفحات ۱۷۱ ہیں۔ سرورق پر درج ہے "منتخب المواعظ حکایات انگریزی با صلاحات عبارات فارسی بوساطت مشقت کشن چندر گھوس۔ ساکن محلہ سوبھا بازار ترکیب و ترتیب گردید" یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۳۲ء میں چھپا تھا۔ اور اس کی پانچسو جلدیں چھپی تھیں۔ یہ دوسرا ایڈیشن ۱۸۳۸ء کا ہے جسے کلکتہ اسکول بک سوسائٹی نے طلبہ کے لئے شائع کیا ہے۔ تعداد اشاعت ایک ہزار۔ کرشن چندر گھوس اپنے عہد کے اچھے اردو شاعر گذرے ہیں جن کا مختصر ذکر میری تصنیف "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات" میں شامل ہے۔

(۳) طوطی نامہ۔ سرورق موجود نہیں ہے۔ آخر میں لکھا ہے کہ "قبل ازیں نسخہ بذا الطبع در آمدہ بود۔ بالفعل از بسکہ نایاب است چوں اکثر طالبان از فوائد آں محروم اند لہذا محمد فیض اللہ نسخہ مذکور را از نسخہ مطبوعہ سابق جا بجا درست نمودہ بشراکت شیخ رمضان لکھنوی بمطبع محمدیہ کہ شراکت ایں جانب و منشی البشیر الدین احمد صاحب است" یہ ۱۲۶۴ھ میں چھاپی گئی ہے۔ صفحات ۱۰۸ ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت ہمارے لئے یہ ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جسے بانی کتب خانہ مرحوم جے کرشن نے پڑھی ہے اس پر بطور مالک کتاب کسی نے لکھ رکھا ہے: "طوطی نامہ سرکار بابو جے کشنو بہادر دام اقبالہ"

(۴) "منتخبات فارسی" جلد دوم۔ کلکتہ اسکول بک سوسائٹی نے طلبہ کے لئے ۱۸۳۶ء میں چھاپا۔ یہ سید ابو الجلیل[1] کے ان خطوط کا انتخاب ہے جو انہوں نے اپنے فرزند نیک میر سید محمد کو لکھا تھا۔ سید ابو الجلیل بمقام بلگرام ریاست اودھ میں ۱۰۹۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۳۸ھ میں ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔ اس کتاب کے ایک صفحہ پر اصل فارسی خط اور مقابل کے صفحہ پر اس کا انگریزی ترجمہ ہے کتاب پر ایسٹ انڈیا کالج کی مہر ہے۔ اس کے جملہ صفحات ۱۷۱ ہیں۔

(۵) کتاب شکرستان در نحوی زبان پارسی" مصنفہ یونس اوکسفردی۔ صفحات ۱۰۰۔ پبلشر جے رچرڈسن۔ ڈنس سالسبری Dans Salisbury کورٹ، فلیٹ اسٹریٹ

(۶) "منتخبات فارسی" جلد اول۔ کلکتہ اسکول بک سوسائٹی نے طلبہ کے لئے ۱۸۳۵ء میں شائع کیا۔ صفحات

---

[1] ان کا نام عبد الجلیل ہے آپ نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کے دادا تھے۔ فاضل مضمون نگار نے ان کا نام ابو الجلیل صحیح نہیں پڑھا (ادارہ)

ہیں۔ لہٰذا یہاں کی کتابوں کا یہ تذکرہ محققین ادب کے لئے کارآمد ضرور ہوگا۔

قلمی کتابیں

(۱) نام کتاب- ہدایت اسلام "گلستان و منتخب شاہ نامہ"۔ اس کتاب کے مالک جیسا کہ کتاب کے آخر میں درج ہے کبھی رائے شاردا پرشاد سین تھے، کتاب کی موجودہ حالت قابل افسوس صفحات ایک دوسرے سے چپٹے ہوئے ہیں، اور جگہ جگہ سے پھٹ چکے ہیں۔ پھر بھی جو کچھ باقی ہے اس سے علم ہوا کہ یہ بمقام شہر بردوان (موجودہ مغربی بنگال) ۱۲۲۹ بنگلہ سنہ، مطابق ماہ فروری ۱۸۲۲ء کو لکھی گئی۔ کاتب کے نام کا پتہ نہ چل سکا اور ان کی تعداد ۲۳۶ ہے اور ہر صفحہ پر ۱۵ سطریں ہیں۔

(۲) گلستان کا ایک نسخہ ہے صفحات کی تعداد درج نہیں ہے اور اب شمار کرنا دوبھر ہے۔ چونکہ صفحات کھولنے کی کوشش سے کئی صفحے پھٹ جائیں گے۔ اندازاً تین سو صفحات ہوں گے۔ ہر صفحہ پر ۱۱ سطریں ہیں، کتابت کالی اور لال روشنائی سے کی گئی ہے۔ خاتمۃ الکتاب سے یہ جملے پڑھے جا سکے "تمام شد کتاب گلستان بتوفیق باری یہ کتاب رائے روشن لال صاحب کے لئے اور آخر میں یہ چند الفاظ صاف ہیں۔ "و شکر کہ این نامہ بعنوان رسید بیشتر از عمر بپایان رسید۔ تحریر فی التاریخ دوم ماہ اگہن ۱۲۳۵ سنہ بنگلہ۔ خط خام فقیر حقیر اضعف ساکن چندن نگر ضلع ہگلی (مغربی بنگال)

(۳) گلستان سعدی۔ ایک اور نسخہ ہے لیکن اس کی حالت بھی مذکورہ کتاب کی سی ہے۔ کاتب کا نام تک پڑھا نہیں جا سکا اس کے صفحات بھی اندازاً تین سو سے کم نہیں ہوں گے۔ ہر صفحہ پر ۱۵ سطریں ہیں

چھپی ہوئی عربی تصانیف

(۱) نام کتاب۔ "نحو میر۔ زبان عربی فارسی۔ آخر میں درج ہے "تمام شد نسخہ نحو میر من تالیف قدوۂ علما سید علی شریف" تعداد صفحات ۶۴

(۲) نام کتاب۔ "منتخب الصرف" تالیف مولوی سید امیر حیدر بلگرامی مفتی صدر عدالت متعلقہ صوبہ بنگالہ و بہار و اڑیسہ۔ در سنہ ۱۲۱۳ھ" یہ عربی صرف و نحو کی کتاب ہے ۱۸۴۹ء میں اس کتاب کے مالک جوالا ناتھ پنڈت تھے۔ چونکہ اس کتاب پر بطور مالک کتاب ان کا نام لکھا ہوا ہے کتاب کے جملہ صفحات ۱۶۷ ہیں۔

(۳) نام تصنیف "گلستان" از شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی یہ کتاب مطبع استفین آستن صاحب در موضع ہارٹفرڈ سے ۱۸۶۳ء میں چھپی ہے جیسا کہ انگریزی دیباچہ میں کہا گیا ہے اس کی ترتیب میں ڈاکٹر اسپرنگر نے جو کلکتہ فورٹ ولیم کالج کے ممتحن تھے مدد کی اور یہ اُن کی اس تصنیف جو کہ کلکتہ سے ۱۸۵۱ء میں چھپی تھی، کے بنیاد پر مع ضروری اضافے کے ترتیب دی گئی ہے۔ اصل کتاب کے صفحات ۱۲۰ ہیں اس کے بعد ایسے مشکل الفاظ کی ایک لغت ہے جن کا استعمال کتاب میں ہوا ہے اس حصے کے صفحات ۱۴۳ ہیں۔ اور انگریزی دیباچے کے صفحات ۶ ہیں۔ اس طرح جملہ صفحات ۲۶۹ ہوتے ہیں۔

مصنف جان گلکرسٹ "یہ کتاب بمقام کلکتہ در کارخانہ ہرکارہ تیار کردہ تامس ہالنگ بری سنہ طبع ۱۸۰۹ء ہے۔ اردو و فارسی کے صفحات ۳۲ ہیں۔

(۵) نام کتاب۔ تواریخ ہند۔ مصنفہ جان کلارک مارسمن جناب جے مور صاحب نے جو بنگال سول سروس میں ملازم تھے یہ ترجمہ آگرہ اسکول بک سوسائٹی کے لئے کیا تھا۔ سرورق پر جو کچھ درج ہے اس سے ہمارے علم میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ کہ یہ زمانہ قدیم سے مغلوں کے آغاز سلطنت تک کی تاریخ ہے۔ جسے آگرہ اسکول بک سوسائٹی کے حکم سے باہتمام سکریٹری پادری جمیس مور صاحب نے بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سے ۱۸۴۳ء میں چھاپ کر شائع کیا۔ صفحات ۲۹۲ ہیں۔

(۶) کتاب کا نام صرف انگریزی میں یہ لکھا گیا ہے The Hindustanee and English students' Assistant یہ اردو صرف و نحو کی ابتدائی کتاب ہے۔ انگریزی کا حصہ چنسورہ کے باشندے مسٹر پیرسن Mr. Pearson نے اور اردو کا حصہ کسی دیسی مترجم نے لکھا ہے۔ کتاب ۱۸۲۹ء میں بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ میں چھپی ہے۔ صفحات ۳۷۴ ہیں۔

(۷) نام کتاب "فارماکوپیا" یعنی قرابادین، شہر لندن کا جو دارالسلطنت انگلینڈ کا ہے۔ یہ طبی تصنیف ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ کتاب کے آخری صفحات نہیں ہیں۔ صرف ۴۸۴ صفحات تک موجود ہیں۔

(۸) نام کتاب "نادرالکشور" یہ انگریزی، فارسی، عربی، بنگلہ اور ہندوستانی (اردو) زبانوں کا گرامر ہے۔ مصنف دیبی پرشاد رائے ہیں۔ اس ایڈیشن کو شیخ محمد رمضان نے مولوی فیض اللہ کے فارسی چھاپہ خانہ واقع کلکتہ میں ۱۸۲۲ء کو چھاپا۔ صفحات ۱۹۶ ہیں۔

(۹) نام کتاب "تاریخ جلسۂ قیصری" سائز ۹½ × ۱۲ انچ ہے۔ سرورق پر مزید یہ کہا گیا ہے کہ "جو اعلیٰ حضرت ملکہ معظمہ کے خطاب قیصر ہند اختیار کرنے کی تقریب سے یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو دہلی میں منعقد ہوا مع واقعات تاریخ اور احوال روساء ہند ماضی و حال۔ مصنفہ جناب جے ٹالبائز ویلر صاحب۔ مصنف تاریخ ہند وغیرہ جس کو لالہ پیارے لال صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقہ انبالہ نے ترجمہ کیا۔ حسب الحکم جناب معلی القاب نواب وائسرائے و گورنر جنرل ہند لاہور کے سرکاری مطبع میں بابو چندر ناتھ متر، کیوریٹر کے اہتمام سے چھاپی گئی ۱۸۸۳ء میں ہے" اس تصنیف میں کئی راجے مہاراجے اور نوابوں کی خوب صورت تصاویر ہیں۔ جملہ صفحات ۱۲۳ ہیں علاوہ تصاویر کے۔

(۱۰) نام کتاب: تاریخ ممالک چین ۔ مصنف جیمز کارکرن صاحب جو عدالت دیوانی صدر کلکتہ کے مترجم تھے اور جن کی ایک اور تصنیف کا نام "جوہر اخلاق" ہے۔ سبب تالیف کا بیان کرتے ہوئے مصنف رقمطراز ہے۔ "چونکہ بندے کو علمائے ہندوستان سے محبت قلبی ہے اور ان بزرگواروں کے فیضان صحبت سے اتنا ملکہ اس غیر زبان میں پیدا ہوا ہے کہ یہ عبارت بے ہندوستانی کی مدد کے لکھتا ہوں۔ لازم ہوا کہ ایسی عنایت اور مرحمت کے عوض میں کوئی ایسا تحفہ ان کے نذر کروں کہ جس میں اگر دوسرا

۱۸۹ ہیں۔ یہ تزوکات تیموری، پند نامہ وگلستان وغیرہ کا ایک انتخاب ہے۔

اردو تصانیف

(۱) نام کتاب "مفید صبیان" جلد دوم۔ یہ اسپ کی کہانیوں Aesop's fables کا اردو ترجمہ ہے جسے کلکتہ اسکول بک سوسائٹی نے طلبہ کے لئے ۱۸۵۰ء میں شائع کیا "لقمان حکیم کی حکایتیں" سے کتاب شروع ہوئی ہے اور پہلی حکایت "مرغ اور جوہر" کی ہے۔ جملہ ۲۳۷ حکایات ہیں اور صفحات ۲۴۷ ہیں۔ غالباً چند اور صفحات تھے۔ جو پھٹ چکے ہیں کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔

(۲) مذکورہ تصنیف کی جلد سوم ہے۔ اس میں "خرد افروز" کی حکایات شامل ہیں۔ حکایات ۹۰ ہیں۔ اس ایڈیشن کو کلکتہ اسکول بک سوسائٹی نے ۱۸۴۷ء میں شائع کیا۔ صفحات ۲۰۳ ہیں۔ پہلی حکایت یہ ہے ــــ "ایک آدمی نے کسی جنگل میں دولت پائی۔ سوچا کہ اگر تمام دولت کو فقط آپ ہی اٹھاؤں تو ایک مدت گزر جائے گی تب بھی سب نہ اٹھ سکے گی۔ بہتر ہے کہ کئی مزدور لاؤں اور چار پاؤں کو کرائے کروں کہ یکبارگی سب کی سب لے جاؤں۔ اس خیال خام پر نا آشنا اور ناآزمائے ہوئے مزدوروں کو بے تامل اور بغیر دوراندیشی کے روپیوں کے توڑوں سمیت اپنے آگے روانہ کر دیا تاکہ اس پر کوئی تہمت نہ کرے۔ مزدوران روپیوں کو صلاح کر کے اپنے گھر لے گئے جب وہ بے فکر مرد گھر پہنچا ہاتھ اس کے سوائے حسرت وپشیمانی کے کچھ نہ لگا۔ اور حق یوں ہے کہ فائدہ کتاب کے سمجھنے میں ہے نہ یاد کرنے میں۔

(۳) نام کتاب "علم ہیئت کا چھوٹا رسالہ" سرورق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ترجمہ کیا گیا۔ طالب علموں کے واسطے اور انگریزی اور ہندوستانی زبان میں چھاپا گیا ــــ سنہ طبع ۱۸۳۶ء ہے اور کلکتہ اسکول بک سوسائٹی نے اسے بیپٹسٹ مشن پریس سرکلر روڈ کلکتہ سے چھاپ کر شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ باتصویر ہے۔ کتاب کے اردو دیباچہ میں کہا گیا ہے کہ اس ارادے پر یہ کتاب تیار کی گئی بطور سبقوں کے اور احوال سورج اور چاند اور ستاروں کا اور اس کے ساتھ باتیں نصیحت کی لکھی گئیں تاکہ طالب علم اس کے پڑھنے سے بے انتہا کاریگری اور عجائبات خدا کی اپنے دل میں غور کرے اور اس کا خیال متوجہ ہو خدا پر جس نے سب کچھ بنایا ہے۔ اور جانے کہ بندگی کرنا اس کی سب سے افضل عقلمندی ہے " ــــ مصنف کا نام درج نہیں ہے لیکن دیباچے سے قبل کے صفحے سے ہمارے علم میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ نصیرالدین حیدر شاہ نے اس کتاب کے جملہ مصارف برداشت کئے ہیں چونکہ مصنف شکر یہ ادا کرتے ہوئے رقمطراز ہے " واجب ہے مصنف پر کہ بیان شکر گزاری عنایت بادشاہی کا کہ یہ کتاب جناب ابوالنصر قطب الدین سلیمان جاہ سلطان عادل فرشیہ زماں نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ کی مرحمت اور امداد مصارف سے چھاپی گئی۔ اب تقسیم کی جائے گی مدرسوں اور مکتب خانوں میں جس جگہ ضرورت ہوگی "۔ صفحات ۱۲۸ ہیں اور آخر میں مشکل الفاظ کی انگریزی اردو لغت ہے جو اس تصنیف میں استعمال کئے گئے ہیں۔

(۴) نام کتاب "نوایجاد" یعنی نقشۂ افعال فارسی مع مصدرات آں و مترادف ہندوستانی در فارسی و انگریزی

ہوکر شائع ہوا۔ صفحات ۳۴۴ ہیں۔

(۱۴) نام کتاب " قصہ کامروپ وکلا " مصنف تحسین الدین۔ کتاب کے سرورق کے مطابق فرانس کے بین الاقوامی شہرت یافتہ عالم گارساں دتاسی نے اس کی تصحیح کی ہے اور یہ شہر پارس کے بادشاہی چھاپہ خانہ میں چھپا ہے۔ سنہ طبع ۱۸۳۵ء مطابق ۱۲۵۱ ہجری۔ ان اشعار سے کتاب کی ابتدا ہوئی ہے۔

الٰہی بحق تو کیہ تار ہے   دو عالم کا پیدا کرنہار ہے
نہ کوئی کرسے تیری قدرت بیاں   نہیں علم تیرا کسی پر عیاں
دو جگ بیں سکل کار تیرا اپار   اچمبھا رساجگ می تیرا بھنڈار

آخر میں مناجات میر حسن پر یہ تصنیف ختم ہوتی ہے۔ جس کا پہلا شعر حسب ذیل ہے :-

الٰہی بحق رسول امین   بحق علی و باصحب و ین

جملہ صفحات ۹۰ ہیں۔ کتاب کی حالت اچھی ہے بہترین طور پر ٹائپ میں چھاپی گئی ہے

(۱۵) نام کتاب " ترجمہ الف لیلہ کی۔ یہ کتاب چار جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ دیباچہ میں مترجم منشی عبدالکریم لکھتے ہیں کہ " ابتدائے شعور سے کمال شوق دیکھنے کتابوں قصے کہانی کا تھا اور سب قصوں میں تمنا الف لیلی کی زیادہ رہتی تھی اور وہ عربی میں الف لیلہ و لیلہ یعنی ایک ہزار ایک رات ہے۔ جس وقت راقم دار الامارۃ کلکتہ میں عہدۂ جلیلۂ میر منشی گری دفتر فارسی نواب گورنر جنرل بہادر سے سرفراز تھا وہ کتاب سواد و سورات کے کہ جس کو شیخ احمد عرب شروانی نے اسکے پڑھانے صاحبان عالی شان کالج کلکتہ کے بہ کمال تلاش عرب سے منگوائی چھپوایا تھا میسر نہ آئی۔ آخرکار جب راقم مدتقرر پنشن لکھنو میں کہ مولد اپنا ہے خانہ نشین ہوا۔ وہ نسخہ تمام و کمال انگریزی زبان میں مع تصویرات بہم پہنچا۔ راقم دو برس تک اس کا ترجمہ کرتا رہا اور سنہ ۱۲۵۵ھ میں تمام کیا "۔ کتاب کی چاروں جلدوں کو ملا کر ۷۲۳ کل صفحات ہیں۔ سامطبع مصطفائی واقع کانپور زیر اہتمام محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں مغفور کے سنہ ۱۳۰۱ھ میں چھپکر تیار ہوئی۔

(۱۶) نام کتاب " منتخبات ہندی جلد اول و دوم۔ از جان شکسپیر۔ پانچواں ایڈیشن ہے ۱۸۴۶ء میں یہ ایڈیشن لندن میں چھپا ہے۔ جلد اول کے صفحات ۲۰۹ ، اور جلد دوم کے ۱۹۶ ہیں۔ جلد دوم ۱۸۴۴ء کا ہے جو کہ چوتھا ایڈیشن ہے۔

(۱۷) نام کتاب " An introduction To The Hindustani language "
مصنف جان شکسپیر۔ یہ لندن سے سنہ ۱۸۴۵ء میں چھپی ہے صفحات ۲۴۵ ہیں۔

تکلف نہ پایا جائے تو کم از کم اتنا تو ہو کہ نادر و نایاب ہووے۔ القصہ جس وقت کہ بازیچہ گردوں نے مجھے اپنا تماشہ دکھایا اور تقدیر نے کلکتہ میں دوبارہ پہنچایا، اسی فکر میں تھا کہ ایک روز یہ ناچیز مصنف جوہر اخلاق دانشمندوں کی مجلس میں بیٹھ بوستان دانش کے پھولوں کی بو سے دماغ عقل کو معطر کر رہا تھا کہ اتفاقاً ادھر ادھر کی نقل اور حکایت اور اخبار اور روا کے بیان میں کشور ختا کا ذکر آیا۔ اس وقت ایک بزرگ نے فرمایا کہ چونکہ اس مملکت بزرگ کی تاریخ عرب اور ایران ا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ اس سبب سے ہندوستان کے علمائے معتبر کو بھی وہاں کے حال سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی میرے خیال میں آیا کہ اگر کوئی ایسی تاریخ تالیف کی جائے کہ بر سبیل اجمال اس ملک کے جزو حالات کو شامل ہووے تو نہایت مفید اور مقبول خاص و عام ہووے اور اپنا دلی مطلب حاصل ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ القصہ اس کی بنا ہوئی ـــ " یہ کتاب کی صرف جلد اول ہے جو پادری تامس کے مطبع کلکتہ میں بماہ نومبر ۱۸۴۸ء چھپی ہے۔ یہ تصنیف دو جلدوں میں ہے اور اس کا دوسرا حصہ میں نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی لائبریری کلکتہ میں دیکھی ہے۔ جلد اول کے صفحات ۲۵۹ ہیں۔

(۱۱) ایک ہی جلد میں دو الگ الگ کتابیں ہیں لیکن دونوں کی حالت اب خراب ہے۔ پہلی کتاب کا سرورق غائب ہے۔ یہ انگریزی اردو لغت ہے۔ صفحات ۵ سے موجود ہیں۔ اور آخری صفحہ ۱۱۷ ہے۔ اس کے بعد اس کتاب کا دوسرا حصہ (Hindoostanee Tales) یعنی ہندوستانی حکایات شروع ہوئی ہیں جو ۶۳ صفحہ پر ختم ہے ا کے بعد دوسری کتاب " قواعد زبان ہندوستانی " ہے۔ جس کے مصنف جان گلکرسٹ ہیں اس کے سرورق پر حسب ذیل اشعار ہیں :-

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جوان ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو،
اللہ ہے اللہ کہ کیا نظم و بیان ہے

یہ کتابیں کس سنہ کی ہیں علم نہیں ہوسکا۔ صرف اتنا درج ہے کہ یہ کرانیکل پریس کلکتہ میں چھاپی گئی ہیں۔ گلکرسٹ کی ہندوستانی حکایات کے صفحات ۳۱۶ ہیں۔

(۱۲) نام کتاب " منتخبات ہندی۔ مصنفہ جان شیکسپیر۔ یہ کتاب یکم جنوری ۱۸۴۳ء میں شہر لندن سے چھپ کر شائع ہوئی ہے انگریزی حصے کے صفحات ۱۵۴ اور اردو کے ۱۵۰ ہیں۔ اس میں آرائش محفل کے علاوہ چند دیگر حکایات کا انتخاب شامل

(۱۳) نام کتاب ـــ Introduction To The Hindustani Language

یعنی ہندوستانی زبان دانی کا قاعدہ۔ یہ کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے اور اس کا یہ چوتھا ایڈیشن ہے۔ مصنف ریوارنڈ ڈبلیو، ایٹس ڈی ڈی ہیں۔ یہ ایڈیشن بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سے ۱۸۴۱ء میں

بزمِ اقبال

(۲)

علمی و ادبی خدمات:

مولوی احمد دین کی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزری۔ انہوں نے اردو زبان کو بہت کچھ دیا۔ اس زبان پر ان کے بے شمار احسانات ہیں۔ محمد حسین آزاد کے بعد جس صاحب علم نے لسانیات اور خصوصاً تحقیق الفاظ پر مفصل بحث کی، وہ مولوی صاحب ہی تھے۔ ان کی کتاب "سرگزشت الفاظ" اس موضوع پر پہلی کامیاب کوشش ہے۔ اردو تنقید میں سائنٹفک انداز سب سے پہلے انہوں نے ہی اختیار کیا۔ "اقبال" جہاں ایک طرف علامہ کے فن کا پہلا کامیاب تجزیہ ہے، وہیں دوسری طرف اردو ادب میں بھی علمی تنقید کا پہلا کامیاب نمونہ ہے۔ سیرت و سوانح میں بھی مولوی صاحب نے قابل قدر کارنامے چھوڑے ہیں خصوصاً اورنگ زیب عالمگیر پر ان کی کتاب اس اعتبار سے اولیت رکھتی ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ اورنگ زیب کا مدلل دفاع پیش کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب کی ان علمی و ادبی خدمات پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنے کی بجائے ان کی تمام تصانیف کا جائزہ آئندہ سطور میں پیش کیا جائے گا اور اس سے معلوم ہوگا کہ ماہر لسانیات نقاد اور سوانح نگار کی حیثیت سے ان کا کیا درجہ ہے۔

مضمون نگاری:۔

ایک مضمون نگار کی حیثیت سے مولوی صاحب ایک بلند مقام کے مستحق ہیں۔ ان کا کام ہماری نظر سے اوجھل رہا یہ ان کا نہیں ہمارا قصور ہے۔

"پیسہ اخبار"۔ "غم خوار عالم" اور "ازہر اخبار" کے علاوہ مولوی صاحب نے اس زمانے کے دوسرے اخباروں میں بھی ضرور لکھا ہوگا۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں جب شیخ عبدالقادر نے "مخزن" جاری کیا تو اس کے پہلے ہی شمارے میں مولوی احمد دین کا ایک مضمون "مطالعۂ الفاظ" شائع کیا۔ مضمون کے ساتھ شیخ صاحب نے یہ نوٹ لکھا۔

"ذیل میں ہم ایک تمہیدی مضمون "مطالعۂ الفاظ" پر درج کرتے ہیں۔ اس کے لکھنے والے ہمارے مکرم دوست مولوی احمد دین صاحب بی اے، وکیل، مصنف "اورنگزیب" ہیں۔ مولوی احمد دین صاحب اپنے زمانۂ تعلیم میں نامور طلبہ

ہفت مقالہ

(فارسی زبان وادب)

یہ رسالہ "اردو" کے لیے مضامین کا انتخاب ہے جو فارسی زبان وادب سے متعلق ہیں۔ یہ انتخاب ممتاز ماہر ایرانیات سید حسام الدین راشدی نے کیا ہے۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل مقالے شامل ہیں۔

- تصنیفات شیخ فریدالدین عطار — حافظ محمود شیرانی
- شاہ نامے کا دیباچۂ قدیم — حکیم شمس اللہ قادری
- فردوسی کا مذہب — پرفیسر شیخ محمد اقبال
- رباعیات عمر خیام — عبدالباری آسی لکھنوی
- فارسی زبان کے زیر سایہ زبان اردو کی تدریجی ترقی — ڈاکٹر سید عبداللہ
- نواب صمصام الدولہ شہنواز خاں (مصنف مآثر الامراء) — محمد حسین محوی صدیقی

پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مسلمان جب تک ایسے لوگوں کے اثر سے آزاد نہ ہوں گے جو مذہب کی آڑ میں ذاتی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ اس وقت تک قومی ترقی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انجمن حمایت الاسلام کو عاشق قرار دیا ہے قوم کو معشوق اور خود غرض مذہب فروشوں کو رقیب بنا کر پیش کیا ہے۔ عاشق معشوق سے شکوے گلے کرتا ہے اور رقیب کی بداعمالیوں کی داستان بیان کرتا ہے۔ مضمون کا تمثیلی انداز قاری کو اصل معاملے کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ یہ فن مولوی احمد دین نے اپنے استاد محمد حسین آزاد سے سیکھا ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاگرد اگر استاد سے آگے نہیں بڑھا تو اس سے پیچھے بھی نہیں رہا۔ اس انشائیے میں اس زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ سر سید ان کی تحریک اور ان کے مخالفوں کی سرگرمیوں کو چند سطروں میں اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام حالات کا ایک ایک پہلو نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"آپ کی ان رسوائیوں اور ذلتوں کے درمیان آپ کے باغ کے مالی کی وہی مالی جس نے تیرہ سو سال ہوئے کہ قسم قسم کے پھل بوٹے، دور دور سے اکٹھے کر کے خوب صورت چمنوں میں سجا دیئے تھے۔ یادگار ایک بڈھے جوان نے آپ کی اس حالت کو دیکھا۔ اپنے نانا کے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودوں کو سوکھ سوکھ کر کانٹا ہوتے دیکھ کر ایک آگ سی اس کے دل میں لگ گئی اور اس نے کوشش کی کہ وہی آگ کچھ اور دلوں میں بھی جہاں کہیں ہوں لگا کر ایک تماشا دیکھے اور دکھائے۔ کہ آگ سے گلزار کیسے کھلتا ہے۔

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

بڈھے کی اس آگ سے ایک بھبوکا اٹھا اور اٹھتے ہی چاروں طرف سے اس پر پانی ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ان دنوں میں ہوا بھی کچھ ایسی چل رہی تھی کہ اس آگ کی چنگاریاں ادھر ادھر پھیل گئیں اور اس سے باغ میں عجب ہل چل سی مچ گئی۔ ایک طرف تو وہ چنگاریاں ایسی خشک ٹہنیوں اور پتوں میں جا پڑیں کہ یک لخت آگ بھڑک اٹھی۔ اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جو کچھ سامنے آیا بڈھے کی خواہشوں کے برخلاف جلا کر خاک کر ڈالا۔ دوسری طرف آگ بجھانے والوں نے بے سوچے سمجھے اس قدر پانی ڈالا کہ آگ تو بجھ گئی مگر پانی پودوں اور بڑے بڑے درختوں کو بھی بہا کر لے گیا۔ درخت اگرچہ باغ کی چار دیواری کے اندر ہی رہے مگر دیکھا تو بے سر و سامانی کی حالت میں پڑے ہاتھ پاؤں پھیلائے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودوں اور گھاس کو پھوٹنے اور پھیلنے اور سر اٹھانے سے روک رہے ہیں۔ اور باغ کی پرورش کرنے والے سیلوں کی سد راہ بنے بیٹھے ہیں۔

باغ کی دیوار پر ایک بلبل جو اسی باغ کی ہوا خواہ تھی، اور یہیں کی تربیت یافتہ، باغ کے اس ویرانے پر آنسو بہا رہی تھی، اور اپنے نالوں سے دلوں کو ہلا رہی تھی۔ زار زار روتی تھی اور کہتی تھی —

قدیم وضع پہ قایم رہوں اگر اکبر ۔۔۔ تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا

میں رہے ہیں۔ اور فراغت تحصیل کے بعد لاہور کے نامی وکلاء میں ہیں۔ اس سلسلۂ مضامین کی تکمیل پر یقیناً سب ناظرین کی رائے ہوگی کہ یہ اردو میں ایک مفید اور نئی چیز ہے۔[1]

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۰۱ء تک مولوی صاحب کو مصنف کی حیثیت سے اچھی خاصی شہرت حاصل تھی۔ اس مضمون کی دوسری قسط ستمبر ۱۹۰۱ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ یہ مضمون دراصل مولوی صاحب کی بلند پایہ تصنیف "سرگزشت الفاظ" کا ابتدائی نقش ہے۔ "مخزن" میں مولوی صاحب کے دو اور مضامین بھی ملتے ہیں جو یہ ہیں :-

۱۔ "لاہور کا محرم" شمارہ بابت ماہ اگست، ۱۹۰۱ء۔[2]

۲۔ "مجاز و حقیقت۔" شمارہ بابت ماہ اپریل، ۱۹۰۲ء[3]

اول الذکر مضمون میں لاہور کے محرم کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اور دوسرے مضمون میں نہایت شاعرانہ انداز میں مجاز و حقیقت کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے :

"حسن بتان موسیقی کے دلکش نغموں کی طرح ظاہر کے تاروں سے باطن کے پردے ہلاتا ہے۔ اس کی اداؤں میں بھی وہی جادو کے انداز ہیں۔ اگر کوئی گا رہا ہو تو کان لگاؤ، دیکھو تو کس جادو کے انداز سے مست ترانوں کی ہوش ربا سریلی آواز ہمارے دل کی ناپیدا پیچ در پیچ راہوں میں سے ہولی ہولی اپنی اٹکھیلیوں سے اس کے نازک سے نازک پردوں کو چھیڑتی جاتی ہے۔ اور اپنی اس سحر اثر چال سے ہماری موجودہ اور گزشتہ زندگی کے تاروں میں ایک خاموش حرکت یگانگت پیدا کر رہی ہے۔ اس کے تھوڑے سے چھیڑنے سے آن کی آن میں ہماری عمر بھر کی سوز و الفت کی چنگاریاں جو محنت و کلفت کے ساتوں میں بکھری پڑی تھیں، ہمارا دل گداز کئے دیتی تھیں۔"

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، مولوی صاحب کا کئی اخبارات سے تعلق رہا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے ان اخبارات میں بہت مضامین لکھے ہوں گے۔ مگر ان مضامین کی نشاندہی ممکن نہیں۔ جو چار مضامین دریافت کئے جا سکے ہیں۔ ان میں "راز و نیاز" ایک بلند پایہ ادبی تخلیق ہے۔ اسے اردو کے بہترین انشائیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون مولوی صاحب نے جیسا کہ ذکر آ چکا ہے، انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھنے کے لئے لکھا تھا۔ لیکن بوجوہ اسے مکمل طور پر اجلاس میں پڑھا نہ جا سکا اور بعد میں ۱۹۰۴ء کی سالانہ روداد میں شائع ہوا۔[4] اس انشائیے میں مصنف نے تمثیلی انداز میں ایک بہت بڑے قومی مسئلے

---

[1] "مخزن" لاہور۔ جلد ۱، شمارہ ۱۔ بابت اپریل ۱۹۰۱ء ص ۸

[2] یہ مضمون راقم الحروف نے روزنامہ جنگ کراچی کے محرم نمبر (۳ مئی، ۱۹۶۴ء) میں بھی شائع کرا دیا تھا

[3] دوسری بار یہ مضمون "قومی زبان" بابت ستمبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔

[4] دوسری مرتبہ یہ مضمون "قومی زبان" کراچی بابت ماہ اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔

۱۳۔ اقبال ۔

چار مزید کتابیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں پورے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مولوی احمد دین کی تصانیف ہیں یا نہیں۔ مولوی صاحب کی کتاب "حیات نور جہاں" کے سرورق ۲۔ اور ۳ پر دس کتابوں کا اشتہار ہے۔ کسی کتاب کے ساتھ مصنف کا نام نہیں ہے۔ لیکن ان میں سے چھ یقینی طور پر مولوی صاحب کی ہیں جو راقم الحروف کی نظر سے گزر چکی ہیں یا دوسرے ذرائع سے ان کا مولوی احمد دین کی تصنیف ہونا ثابت ہے۔ باقی چار کتابیں یہ ہیں :

۱۔ ملا دوپیازہ

۲۔ دوست محمد خاں

۳۔ راجہ بیر بر

۴ حیات نور جہان و جہانگیر

ممکن ہے کہ یہ چاروں کتابیں بھی مولوی احمد دین کی تصنیف ہوں۔ ان چاروں کا موضوع تاریخ ہے اور یہ بقیہ کتابوں ہی کے سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان میں سے ایک یعنی "دوست محمد خاں" میری نظر سے گزری ہے۔ اس پر مصنف کے نام کی جگہ "مؤلفہ کارپردازان دفتر اردو اخبار لاہور" لکھا ہے۔ جہاں تک اس کتاب کے انداز تحریر کا میں نے تجزیہ کیا ہے یہ مولوی صاحب ہی کی تالیف معلوم ہوتی ہے۔ شاید کسی مصلحت کی بنا پر ان کا نام نہ دیا گیا ہو۔ کتاب کے سرورق پر مطالب کتاب کا جو خلاصہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے :

"سلطنت افغانستان کے مختصر حالات۔ ابدالی خاندان کے کمزور بادشاہوں کے عہد سلطنت میں اس کی تباہی۔ فتح خان کی ہمت کوشش اور افغانستان کی اصلاح۔ اس کا دردناک انجام۔ دوست محمد خاں اور اس کے بھائیوں کی خانہ جنگیاں۔ دوست محمد خاں کا امیر کابل ہونا۔ انگریزوں کا شاہ شجاع کو تخت نشین کرنا۔ دوست محمد خاں کا اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کرنا۔ اکبر خان اس کے بیٹے کا انگریزی سپاہ کا صفایا کرنا۔ دوست محمد خان کی واپسی وغیرہ کے دلچسپ اور تاریخی حالات"

یہ کتاب ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے مطبع اردو اخبار کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔

محولہ بالا اشتہار میں بقیہ تین "مشتبہ" کتابوں کی جو تفصیل دی گئی ہے اسے یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۔ "ملا دوپیازہ : ابوالمظفر ملا دوپیازہ کے حالات زندگی ایسے مذاق آمیز پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں کہ انسان ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جائے اور ہاں حالات بھی تو ایسے شخص کے ہیں جو مذاق مجسم تھا"

۲۔ "راجہ بیر بر :۔ اکبر کے دربار میں ابوالظرافت بیر بر کی جو عزت ہوتی تھی اُس کا شہرہ ہر ایک نے سنا ہوگا۔ اگر صحیح حالات معلوم کرنے ہوں تو راجہ بیر بر کا مطالعہ فرمائیں"

جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں   خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و داویلا

احمد دین کا صرف یہی ایک مضمون انھیں اردو زبان کا ایک صاحب طرز انشاپرداز منوانے کے لئے کافی ہے۔

تصانیف :

مولوی صاحب کی تصانیف وتراجم کے بارے میں قطعی طور پر کچھ بتانا ممکن نہیں ہے۔ منشی محمد دین فوق نے ان کی صرف کتابوں ا- عالمگیر"۔" اقبال"۔ اور" سرگزشت الفاظ" کے نام گنوائے ہیں۔ [۱]

مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے بھی "نقوش" لاہور نمبر میں اسی بیان کو دہرایا ہے۔ [۲]

ان حضرات کے علاوہ کسی اور نے مولوی صاحب کی تصانیف کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ راقم الحروف نے ان کی گدہ تصانیف اور رو تراجم کا سراغ لگایا ہے۔ اگر مزید چھان بین کی جائے تو اور بھی بہت سی تصانیف کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

مولوی صاحب نے زیادہ تر تاریخی موضوعات پر لکھا ہے۔ تیرہ کتابوں میں سے دو ادبی و لسانی موضوعات پر ہیں۔ کا موضوع معلوم نہ ہو سکا اور باقی دس تاریخی موضوعات پر ہیں۔

ان تصانیف وتراجم کے نام یہ ہیں :-

۱. ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب ۔
۲. افواج دنیا (ترجمہ)
۳. اسرار حرم (ترجمہ)
۴. حیات ٹوڈرمل
۵. جلال الدین اکبر
۶. دُرِّ مکتوم (حیات زیب النسا)
۷. مہاتما بدھ ۔
۸. شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ
۹. لیلیٰ یا محاصرہ غرناطہ ۔
۱۰. ابوالفضل کے سوانح عمری
۱۱. سوانح عمری حاتم طائی
۱۲. سرگزشت الفاظ ۔

---

[۱] تاریخ اقوام کشمیر۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۴ء صفحات ۴۳ - ۵۴۲

[۲] " نقوش ۔ لاہور نمبر ص ۹۱۵

ردد کرنے پر ساری توجہ صرف نہیں کی بلکہ اورنگ زیب کی داستان حیات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ خود بخود ہر الزام کی قلعی کھلتی چلی جاتی ہے۔ اورنگ زیب پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ اس نے راجپوتوں، مرہٹوں اور دکنیوں کو بلا وجہ نشانہ ستم بنایا۔ مولوی صاحب نے ان تمام حالات وواقعات کا مورخانہ بصیرت کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ جن کی بنا پر اورنگ زیب ان تینوں کے خلاف نبرد آزما ہوا۔ یہ کتاب اورنگ زیب کی ایک غیر جانبدارانہ تصویر پیش کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف کی اپنے موضوع سے عقیدت جا بجا نظر آتی ہے لیکن یہ عقیدت اظہار حقیقت میں کہیں رکاوٹ نہیں بنتی۔

اسی موضوع پر علامہ شبلی نعمانی کی کتاب "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" مولوی احمد دین کی کتاب کی اشاعت کے کئی سال بعد ۱۹۰۰ء میں منظر عام پر آئی۔ علامہ شبلی نے صرف اورنگ زیب پر عائد شدہ الزامات کو رد کیا ہے مکمل سوانح عمری نہیں لکھی۔ لیکن مولوی احمد دین نے اورنگ زیب کی پوری زندگی کی تصویر کشی کی ہے اور اسی ضمن میں متعصب مورخین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔ اس اعتبار سے دونوں کتابوں کا موضوع بڑی حد تک ایک ہی ہے اور ان میں خاصی مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض الزامات کی تردید میں دونوں نے یکساں انداز اختیار کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تحقیقی اعتبار سے شبلی کا پلّا بھاری ہے لیکن یہ خیال کرنا بے جا نہ ہوگا کہ شبلی نے جب اپنی کتاب لکھی ہوگی تو احمد دین کی تصنیف ضرور ان کے پیش نظر رہی ہوگی۔ مولوی احمد دین کی کتاب اردو میں اورنگ زیب کی پہلی مکمل سوانح عمری ہے۔ اس لئے شبلی کی نظر سے یہ کتاب ضرور گزری ہوگی اور ویسے بھی جن دنوں میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی اس زمانے میں علامہ شبلی لاہور ہی میں مقیم تھے۔

مولوی احمد دین کی کتاب کو اپنے زمانے میں خاصی شہرت ملی۔ مگر شبلی کی کتاب کی اشاعت کے بعد اس کی اہمیت کم ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ نقش دنگار طاق نسیاں بن گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ نصف صدی میں اورنگ زیب پر بہت کام ہوا ہے لیکن آج بھی اس کتاب کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں۔ مولوی صاحب کی کتاب نے اورنگ زیب کی شخصیت کو سمجھنے میں جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

افواج دنیا :۔

یہ ۲۹۶ صفحات کی ایک کتاب ہے جو انگریزی کی کسی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ یہ ۱۹۰۱ء میں مطبع خادم التعلیم پنجاب لاہور کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا موضوع دنیا کے مختلف ممالک (مثلاً آسٹریا، بلجیم، برازیل، بلگیریا، چلی، چین، ڈنمارک، مصر، انگلستان وغیرہ) کی افواج سے متعلق ہے۔ ہر ملک کی فوج کی خصوصیات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ ابتدا میں ایک فرہنگ اصطلاحات ہے جس میں تقریباً چالیس انگریزی اصطلاحات کی تشریح مترجم کی طرف سے دی گئی ہے۔ ترجمہ رواں دواں اور شگفتہ زبان میں ہے۔

اسرار حرم :۔

یہ رینالڈس کے ناول "دی لوز آف دی حرم" کا اردو ترجمہ ہے۔ جسے حکیم رام کشن جنرل بک مرچنٹ، کٹرہ تاکشاں، لوہاری گیٹ، لاہور نے شائع کیا تھا۔ یہ ترجمہ ۲۱۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولوی صاحب نے لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ اصل کے مطالب کو اختصار اور خالص تخلیقی انداز

۲۔ حیات نورجہان و جہانگیر ۔ ہندوستان کی حسین ملکہ نورجہاں اور مشہور حسن پرست بادشاہ شہنشاہ جہانگیر کے مکمل اور صحیح حالات نہایت معتبر اور چیدہ مورخوں کے اقوال، غلط بیانی کی تردید ۔

مولوی صاحب کی جو تصانیف دریافت کی جا سکی ہیں ان میں سے بیشتر ادارہ اردو اخبار کی طرف سے شائع ہو تھیں ۔ ان میں سے کسی کتاب پر بھی سال تصنیف یا سال طباعت درج نہیں ہے۔ ذیل میں مولوی صاحب کی تصانیف کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے اس میں پیسہ اخبار کے ادارے کی طرف سے شائع شدہ کتابوں کے بعد اردو اخبار کی شائع کردہ کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سن وار ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب ۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء سے پہلے شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۴ء میں کارخ پیسہ اخبار کی طرف سے شائع ہوا۔ اور یہی راقم الحروف کے پیش نظر ہے۔ یہ ۱۳۶ صفحات کی کتاب ہے جس میں اورنگ زیب کے حالا اور اس کے عہد کے معاشرتی و سیاسی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ مولوی صاحب نے دیباچے میں تفصیل سے اس کتاب کی وجہ تصنیف کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اورنگ زیب پر جو مختلف نوعیت کے الزامات لگائے جاتے ہیں، وہ اُن مغربی سیاحوں کے بیانات کا نتیجہ ہیں، جنھوں نے کچھ عرصے ہندوستان میں قیام کرنے کے بعد بلا تحقیق اپنے خیالات کو تا صداقت بنا کر پیش کیا۔ مولوی صاحب نے ایسے سیاحوں، خصوصاً برنیر کے بعض بیانات بطور نمونہ پیش کر کے بتایا ہے کہ سیاح ہندوستان اور یہاں کے باشندوں کو کس حد تک سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان سیاحوں کے بیانات کو مغربی مورخوں نے بھی بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔ اور اس طرح اورنگ زیب کی ایک ایسی تصویر پیش کی جو اصل سے کوئی مطا نہ رکھتی تھی۔ مولوی صاحب کا خیال ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مغربی مورخین فارسی زبان سے نابلد تھے، وہ اصل مآخذ کو پڑھنے اور سمجھنے کی زحمت گوارا نہ کر سکے اور اس بنا پر ان کی تصانیف حقیقت سے دور ہو گئیں۔ اورنگ مغربی مورخین کی ناانصافی کی ایک وجہ انھوں نے یہ بھی بیان کی ہے ۔

"کسی شہنشاہ ہند کی تاریخ لکھنے کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ اس کا مورخ ہند کے قومی و ملکی حالات سے بخوبی واقف ہو اور جب تک ان حالات سے کسی شخص کو پوری واقفیت نہ ہو، اس کی کتاب اپنے ہیرو کے کیرکٹر کا پورا آئینہ نہیں ہو سکتی۔ اورنگ زیب کے یورپین مورخین اس امر میں بھی قاصر تھے۔ انھوں نے اورنگزیب کے کیرکٹر لکھنے کے وقت اپنی قوم اور ملت کی عادات و خیالات کو جو ان کے طبعی ہیں مقیاس ٹھہرایا ہے اور اس مقیاس سے اس کا اندازہ کرنے میں وہ سیدھی راہ سے کہیں دور جا پڑتے ہیں[1]"

مولوی صاحب نے ان مورخین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے خیال سے یہ سوانح عمری لکھی۔ انھوں نے الزامات

[1] دیباچہ اورنگ زیب عالمگیر، مصنفہ احمد دین۔ ص ۳۔

لینفرج المدد۔ سر ایڈورڈ سلیوان بارٹ کی تاریخ موسومہ ہندوستان کے فاتح، جنگجو اور مدبر۔ فریڈرک آگسٹس لونٹ نوئر کی تاریخ انگریزی "شہنشاہ اکبر"۔

مولف کو اس بات کا افسوس ہے کہ بعض دلچسپ باتیں جو طویل تاریخوں میں دی گئی ہیں اس سوانح عمری میں اختصار کو مدنظر رکھ کر قلم انداز کرنی پڑی ہیں۔

لیبلے یا محاصرۂ غرناطہ :۔

یہ کتاب راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذری۔ اس کی اطلاع "حیات ٹوڈر مل" کے سرورق سے ملتی ہے۔ جہاں مصنف کے نام کے ساتھ اس کی چند تصانیف کے نام بھی درج کیے گئے ہیں۔ بظاہر یہ کتاب کوئی تاریخی ناول معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے "اسرار حرم" کی طرح یہ بھی کسی کتاب کا ترجمہ ہو۔

ذیل کی تین کتابیں بھی میری نظر سے نہیں گزریں۔ حیات ٹوڈر مل کے اندرونی سرورق پر ان کا اشتہار ہے۔ اس اشتہار میں ان کتابوں کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے :۔

دُرِ مکتوم۔ یعنی حیات زیب النسا :۔ شہنشاہ عالمگیر کی پیاری بیٹی زیب النسا کی ابتدائی زندگی، ذہانت و جودت، تحصیل علم، شاعرانہ مذاق، مشاعروں کی کیفیت، عشق و محبت کے چرچے، شادی کی تجویزیں، بیگم کا شادی سے انکار، اس کی عاقل خاں صوبہ دار لاہور سے پاک محبت اور اس کا مہلک نتیجہ، بیگم کی قید، شاعری اور وفات۔ نہایت ولولہ انگیز بیان میں تحریر کی گئی ہے۔

مہاتما بُدھ :۔ ساکی من یا گوتم کی سوانح عمری۔ جس میں کپل وستو کے شہزادے کی ابتدائی تعلیم، دنیا سے نفرت، غور و فکر، الدین کے مشورے سے شادی کرنے (کذا) اس کی بیوی کی عفت و عصمت اور اطاعت، اس کے چار عبرت بخش نظارے دیکھ کر دنیا سے قطع تعلق کرنے (کذا) فقیرانہ ریاضت، تلاش حق، معرفت، جدید مذہب کی تلقین، ہزارہا باشندوں کے پیرو ہونے کے حالات اس عمدگی سے حوالۂ قلم کیے گئے ہیں کہ ناظرین بے ساختہ تعریف کریں۔

شیرِ پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ :۔ سکھوں کے مذہب کا آغاز، اس کے بانی گرو نانک صاحب اور دیگر گروؤں کے مختصر حالات، سکھوں کی لوٹ مار، اس مذہب کا نشوونما۔ اور سکھوں کی قوم کا رفتہ رفتہ ترقی کر کے سکھ سرداروں کا پنجاب و ہندوستان کے شر علاقوں پر قابض ہونا۔ رنجیت سنگھ کے آبا و اجداد اور خود اس کا ان سرداروں کو مطیع کرنا۔ اس کی شجاعت و لیاقت، مہمات، نظام، فوج اور سلطنت کی صحیح صحیح کیفیت۔

سوانح عمری حاتم طائی :۔ یہ ۵۱ صفحات کا ایک رسالہ ہے۔ جس میں حاتم کے مختصر حالات اور چھ حکایتیں درج ہیں۔ ناشر رسالہ طباعت کی صراحت سرورق پر ان الفاظ میں کی گئی ہے :

"حکیم رام کشن مالک تجارتی کتب خانہ دکارخانہ جڑی بوٹی (پنجاب) نے ۱۹۲۲ء میں ہندوستان اسٹیم پریس لاہور میں باہتمام گورانداتا مل بہار دواجیہ۔ پرنٹر و پبلشر سے چھپی۔

میں پیش کیا ہے۔ ابتدا میں ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۳ء کی لکھی ہوئی مولوی صاحب کی مختصر سی تمہید بھی ہے،

ناظرین! آپ کی تفریح طبع کے لئے انگلستان کے جادو نگار ناولسٹ رینلڈس کے ایک نہایت عمدہ ناول "دی لوز آف دی حرم" کو اردو قالب میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس خیال سے کہ آپ کی طبیعت پر اس کا مطالعہ شاق نہ گزرے ہم نے اختصار اور دلچسپی کو مدنظر رکھا ہے۔ اور آپ کو روزمرہ کی دلکشی اردو زبان میں اس کا ویسا ہی مزا آئے گا جیسا کہ رینلڈس کی اصلی زبان پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد آپ بخوشی "اسرار حرم" کے مطالعے میں مشغول ہوں۔"

حیات ٹوڈرمل :-

اس میں شہنشاہ اکبر کے وزیر راجہ ٹوڈرمل کے حالات زندگی دیئے گئے ہیں۔ ۵۴ صفحات کی اس مختصر سی کتاب میں ٹوڈرمل زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کی فوجی اور انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کی ذہانت اور علمی دلچسپیوں کی روداد پیش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں مولوی احمد دین نے اپنے استاد مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف "دربار اکبری" سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ کتاب دراصل "دربار اکبری" ہی کے فیضان کا نتیجہ ہے۔ اسے منشی اگر وال تاجر کتب مہتمم کتب خانہ تعلیم پنجاب و پروپر اردو اخبار انارکلی لاہور نے فیض عام پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا تھا۔

جلال الدین محمد اکبر :-

راقم الحروف کے سامنے کتاب کے دو ایڈیشن ہیں۔ لیکن دونوں پر تاریخ طباعت درج نہیں۔ نیز یہ صراحت بھی نہیں ملتی کہ ایڈیشن کون سا ہے۔ اور دوسرا کون سا۔ دونوں مرتبہ یہ کتاب منشی اگر وال تاجر کتب ہی نے شائع کی۔ دونوں ایڈیشنوں میں کوئی فرق نہ سوائے اس کے کہ ایک ایڈیشن کے صفحات ۱۱۵ ہیں اور دوسرے کے ۱۳۶۔ اس کتاب کے مختصر سے دیباچے میں موضوع اور ماخذ ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

" موجودہ سوانح عمری میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس مشہور و معروف بادشاہ کے کارناموں، ایجادوں، انتظام، فتوحات وغیرہ کو خوبی کے ساتھ قلم بند کیا جائے۔ اس مختصر سی لائف کی مطالعے سے ناظرین پر خود واضح ہو جائے گا کہ خاکسار مولف کو اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔ وہ اس کی مدح سرائی میں ایک حرف بھی لکھنا نہیں چاہتا اور "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" کے مقولہ پر عمل کر کے ہمایوں کے سعادت مند بیٹے اور بابر کے نامور پوتے کے حالات پبلک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اصحاب بینش اور دانش سے قدردانی کی امید ہے۔

اس لائف میں مندرجہ ذیل تاریخوں سے مدد لی گئی ہے۔ مولف نے اپنی طرف سے کوئی خیالی یا بے سروپا امر ایزاد نہیں کیا۔ جو لکھا ہے معتبر تاریخوں کی سند پر لکھا ہے۔ خواہ ان تاریخوں کا نام ہر ایک مقام پر نہ بھی دیا گیا ہو۔

دربار اکبری مولفہ مولوی محمد حسین آزاد۔ سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور۔ جے تالبہائے و ہیلر کی تاریخ ہند۔ تاریخ ہند مؤ

مظفر اقبال

میر مہدی مجروح کی ایک کمیاب تحریر

میرے پیش نگاہ ایک قدیم مطبوعہ کتاب "مؤید الاسلام" ہے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر مشہور مستشرق "اف جون ڈیون پورٹ" کی لکھی ہوئی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ مترجم کا نام عنایت الرحمان خاں صاحب دہلوی ہے اور اس کے طابع و ناشر خواجہ قمرالدین خاں صاحب عرف خواجہ میرزا صاحب خلف الصدق خواجہ بدرالدین خاں صاحب عرف خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال' ہیں۔ ۱۵ × ۲۰ س۔م سائز کے دو سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب مطبع بدرالدجیٰ واقع دہلی کوچہ نواب محمد چاندنی چوک متصل عجائب خانہ سے ۱۲۸۷ھ م ۱۸۷۰ء میں طبع ہو کر شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے آخری صفحے پر قطعہ تاریخ طبع از مرزا یوسف علی خاں صاحب متخلص بہ عزیز درج ہے:

مطبع نغز ہست بدرالدجےٰ   اندراں یافت ایں کتاب انجام
متبرک بہ رب بود سالش   طبع گشت ایں مؤید الاسلام
۲۰۲   ۱۰۸۵

اس قطعے کے علاوہ مندرجہ ذیل تحریر بھی ملتی ہے:

"تمام شد مؤید الاسلام ۱۸۷۰ء ماہ جولائی"

کتاب کے شروع میں تقریباً پانچ صفحات پر مشتمل دیباچہ کتاب ہے جس کے آخر میں روش قدیم کے مطابق دیباچہ نگار نے اپنے نام کا اظہار کیا ہے۔ اور اسی سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ دیباچہ غالب کے محبوب شاگرد میر مہدی حسین مجروح دہلوی کے قلم کا رہین منت ہے۔ میر مہدی مجروح کی نثر کے نمونے بہت ہی کم یاب ہیں۔ مالک رام صاحب اپنی گراں قدر تالیف "تلامذہ غالب" میں لکھتے ہیں[۱]:

"...... دو نثری رسالے بھی یادگار چھوڑے۔ ایک حضرت رسول کریم کے معجزات کے بیان میں انوار الاعجاز اور دوسرا ائمہ کے بیان میں "ہدیۃ الائمہ" دونوں اب کمیاب ہیں۔ ایک تذکرہ بھی طلسم راز لکھا تھا یہ بھی اب

---

[۱] تلامذہ غالب مؤلفہ مالک رام صاحب ص ۴۰۳

ابوالفضل کے سوانح عمری :۔ یہ ۳۲ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے جس میں ابوالفضل کے حالات زندگی پیش کئے گ
اسے پندرہ ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں ابوالفضل کی پیدائش سے وفات تک کے تمام اہم واقعات کو اجمالاً لکھا گیا ہے۔
نے تمام ضروری معلومات اس انداز سے دی ہیں کہ موضوع کی زندگی کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا۔ ابوالفضل کی خوبیوں کے س
اس کی خامیوں پر بھی نظر ڈالی ہے اور جہاں ایک طرف اس الزام کی تردید کی ہے کہ وہ محض اکبر کا ایک خوشامدی تھا، وہیں دو
طرف یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اس نے علماء کی مخالفت کرکے کچھ اچھا نہیں کیا۔

میرے پیش نظر اس کتاب کا جو نسخہ ہے اس کا سرورق ضائع ہو چکا ہے۔ آخری صفحے پر چند کتابوں کا اشتہار ہے جس کے نی
"فضل الدین تاجر کتب قومی و مہتمم اخبار اشاعت لاہور کشمیری بازار" درج ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب اسی ناشر نے شائع کی ہوگی۔ کت
آخر میں مصنف کا نام "احمد دین لاہوریہ" لکھا ہے۔ (م۔ خ)

استکمال دین کا باعث ہو۔

نعت　وہ وہ (کذا) جس کے سبب جہان کی نمایش و آدم کی پیدائش ہوئی۔ راقم ؎

ہوا ثابت یہ پیدائش سی اوس کی　　　خدا بندونپہ اپنی مہربان ہی

وہ جس کی نعلین تاج سر عرش بریں وہ جس کی ادنا خدمتگاروں میں روح الامین وہ جس کی خاک آستان پر سر عجز آسمان وہ جسکا علوم زمین و زمان وہ کہ اگر اوسکا قدم مبارک زمین پر نہ آتا کار رسالت یوہیں ناتمام رہجاتا وہ اوج رسالت کا ماہ دو ہفتہ وہ سپہر کرامت کا مہر درخشندہ وہ جس کا زمین سی بالائی عرش ایکدم میں گزار ہوا وہ جسکا براق برق رفتار رہوار ہوا وہ خدا جسکا وہ طالب دیدار ہی وہ باعث نازش پروردگار ہی وہ جس کی تحت لوا (کذا) پیغمبران مرسلین وہ کون یعنی حضرت ابوالقاسم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین۔ میر ممنون ؎

محمد عربی بادشاہ عرش حریم　　　کری ہی روح قدس جسکی در کی دربانی

اوسی خدا تو نہیں کہہ سکوں پہ کہتا ہوں　　　کہ اوس کے مرتبہ دانی میں ہی خدا دانی

لباس بشر میں نور خدا تھا واللہ اعلم کیا ماجرا تھا بندہ ہو کر خدا کا حبیب ہو یہ رتبہ کس کو نصیب ہو ؎ (غالب)

ثنائی دیر بینۂ کردگار　　　بوی ایزد از خویش امیدوار

نداز نہان پردۂ برزدہ　　　نفاتِ خدا معجزی سر زدہ

خاتم نگین رسالت وہ گوہر دریائی جلالت قصر اسلام کو اوسکی معمار شرع نی قوی اساس بنایا ظلمت جہل کو اوسکی نور جمال نی محو کیا ذات مقدس کا اگر دنیا میں ظہور نہوتا تو قیامت تک رجس اصنام بیت الحرام سی نہ دور ہوتا وہ نور پاک نہاد اگر اس ظلمت بنیاد کی رونق نہ بڑھاتا اور وجود قدم مسعود زمین کو آسمان نہ بناتا تو گم کردہ راہوں کو راہ نجات کون دکہاتا باغ بہشت یونہیں خالی رہ جاتا۔ بہشت اوس کی محبونکی فرش راہ ہی چشمۂ کوثر کو اوسکی خادمونکی چاہ ہی جب وہ اپنا رتبۂ شفاعت دکہائی اطاعت کو گناہ پر رشک آئے گا۔ خسرو ؎

پردہ کش امت شوریدہ کار　　　ضامن آمرزش پروردگار

عذر ز عاصی بود اندر گناہ　　　طرفہ کہ من عاصی و او عذرخواہ

موسیٰ کے ید بیضا ہاتھ آیا مگر ویسا دستِ قمر شگاف کسی نی نپایا۔ رسالت نی اوسکی نسبت ذاتی سی زینت پائی نبوت نی اوسکی سبب سے رفعت دکہائی مہر انور کو اسی بات کی جلن ہی کہ اوسکی روضۂ اقدس میں میں نہیں اور شمع روشن ہی آسمان کو زمین سی اسی کا رشک ہی کہ اسپر کیوں حضرت کا مزار ہی اوسکی حکم سی رجعت آفتاب کا کیا استعجاب ہی اگر وہ اپنی لب معجز نما سی فرمائی تو زمین آسمان اور آسمان زمین ہو جائی شجر و حجر و انسان و حیوان اوس کی اثبات رسالت کی گواہی میں ہمہ تن زبان ہوی ہر ایک عہد میں مداحی کردگار کی دین کی بڑھنی کی سامان ہوی۔ سچ ہی محبت حق اسی کہتی ہیں اور اثبات دعوی راستی کی یہی معنی ہیں حضرت

نایاب ہے۔

مالک رام صاحب نے مجروح کے اس دیباچے کا ذکر نہیں کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ "تلامذہ غالب" کے وقت تک یقیناً انھیں اس دیباچے کی اطلاع نہیں تھی۔ اس لئے یہ اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ اور اسی کے پیش نظر میں نے اسے منظر عام پر لانا اپنا فرض سمجھا۔ اس سے قبل کہ مکمل عبارت نقل کی جائے قارئین کو اس امر سے آگاہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متن کا املا جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سزاوار پرستش اوس وحدہٗ لاشریک کی ذات ہی جس کی ایک لفظ کن کی یہہ ساری کائنات ہی اوس کی در کمال میں آسمان سی ہزاروں حباب اوس کی پرتو نور اجلالسی مہر و ماہ سی لاکھوں کواکب ضیایاب قطرۂ آب اوسکی فیض عمیم سی گوہر نایاب بن جاتا ہی پتھر اوس کی عنایت عمیم سی یاقوت ناب ہوجاتا ہی وہ دانۂ خشک سی سبزۂ تر نکالتا ہی کی حکم سی خاک سی آب پاک جاری ہوتا ہی کبھی شام ہی کبھی صبح ہی کبھی دن ہی کبھی شب ہی غرض اوس صانع مطلق کا رہی وہ عجب ہی جب اوس کا دریائی غضب جوش میں آتا ہی فرعون سا انا ربکم الاعلیٰ کہنی والا غرقۂ طوفان ہو جاتا ہی جب وہ اپنا زور جبروت دکھاتا ہی تب پشہ سی نمرود کا مغز نکلواتا ہی اور اوس کی قصر عظمت تک کہ اوہام پہنچنے کی کیا مجال اوس کی افزائش رحمت کا ہرگز نہ بیان ہو اگرچہ ہر موئی تن زبان ہو اوس نی آدمیکو اشرف المخلوقات بنایا جو ہر قابلیت عطا فرمایا دیدۂ بینا دیا تا اوس کی صنائع بدائع کو نظر تامل سی دیکھیں اور عبرت پذیر ہوں اور گوش ہوش عنایت کیا تا اوس کا کلام ہدایت فرجام سنیں اور صراط مستقیم پر رہگیر ہوں اوس نی پیغمبر و رسول بھیجا اونہیں معجزات باہرہ عنایت فرمائی تا رہروان وادیٔ ضلالت کو راہ پر لائیں اور گم گشتگان طریق گمراہی کو رستہ بتائیں ہرچند اون خاصان خدانی رسالت میں سعی تمام فرمائی ہر ایک کو راہ رستگاری دکہائی مگر شیطان نی انسانوں کو ایسا بہکایا تہا کہ طریق نجات کی طرف کو پانوٗ نہ پڑتا تہا حضرت نوح علیہ السلام کی ہزار برس کی پند و نصائح نی یہہ نتیجہ دکہایا تہا کہ ایک گروہ قلیل سات ستر آدمیوں کا لایا تہا پھر حضرت خلیل اللہ علیٰ نبینا و علیہ السلام نی شیوع ملت حنفی میں سعی بی پایاں اور کوشش فراواں کی مگر ضلالت و گمرہی نہ گئی بعد اوسکی حضرت موسیٰ علیہ السلام نی تیغ و تیغ زبان سی کام لیا مگر مشرکین نی نمانا اور اوس برگزیدہ خدا کا سمجہانا افسانا جانا باوجود تمام عمر اعلان کلمۂ حق میں بسر کی مگر بت پرستی کی موقوفی کی کوئی صورت نہ بنی اون کی بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کی دین اور ہدایت خلق کیلئے مامور ہوئی اون حضرت نی کمال رفق و مدارا سی ہر ایک کو سمجہایا خدائی یکتا کی بندگی کا شیوہ بتایا مگر سوائی چند اشخاص کی کسینی اوس واحد مطلق کو یکتائی نمانا اور طریق راستی کو نجانا بس جبکہ کار تبلیغ رسالت ہر نبی مرسل کی وقت میں ناتمام رہا اس واسطے ایزدی مقتضی اس امر کے ہوئی کہ اب جہان کو اوس کی وجود باوجود سی رونق بخشی کہ وہ سالکان مسالک گمرہی کو شاہراہ ہدایت پر لائی و ایسا ن قافلہ بشیہ جہالت کو منزل مقصود دکہائی اور بموجب آیۂ وافی الہدایت الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی اتمام نعمت

مراسلات

یری شاعرانہ معرکہ آرائیاں

آپ کا رسالہ "قومی زبان" دسمبر ۱۹۶۷ء میری نظر سے گزرا "علامہ" تمنا عمادی کے مضمون "میری شاعرانہ معرکہ آرائیاں" نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اپنی معرکہ آرائیوں کا بیا ود مولوی صاحب موصوف کے قلم سے عامیانہ تعلی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس طرح کے فقرے، اپنی تعریف میں شاید اب متروک سمجھے جاتے ہیں۔

یوں تو پورے مضمون میں کوئی ایسی بات نہیں جن کے بیان سے اردو زبان و ادب کے متعلق قارئین کے معلومات یں مفید اضافہ ہو یا جن سے مولوی صاحب کا وقار بڑھتا ہو یا ان کی معرکہ آرائیاں ثابت ہوتی ہوں۔ اس رسالے کے صفحہ رمولوی صاحب حضرت فضل الحق آزاد کے ساتھ اپنے تعلقات کا حال لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں "فارسی اور اردو پر پوری قدرت رکھتے تھے اور خوب کہتے تھے مگر بڑے کہنہ مشق مگر یہ کسی قدر عربی بھی جانتے تھے"...... مولوی صاحب کا یہ بے محل "مگر" سمجھ میں نہیں آیا۔ آزاد کی فارسی اور اردو پر قدرت رکھنے اور خوب کہنے کی صفتوں کو بیان کرنے سے شاید مولوی صاحب ی انانیت کو ٹھیس لگی لہٰذا اس چرمے سے چھٹکارا پانے کے لیے انھیں اس فقرے "مگر یہ کسی قدر عربی بھی جانتے تھے" کا اضافہ رنا پڑا۔ آگے چل کر خود فرماتے ہیں "مجھ کو عربی میں منظوم خط لکھتے تھے"۔ میرے خیال میں عربی میں منظوم خط لکھنے والا اور ا بھی مولوی تمنا جیسے "مستند" عالم کو "کسی قدر" سے ضرور کچھ زیادہ ہی عربی سے واقف ہوگا ورنہ جن زبانوں پر ہ قدرت رکھتا ہے انھیں چھوڑ کر وہ جس زبان میں کمزور ہے اس میں منظوم خط کیوں لکھے گا۔ بہرحال یہ تو مولوی صاحب ی عنایت ہے کہ انھوں نے کم سے کم اتنا اعتراف کیا کہ آزاد اردو اور فارسی پر قدرت رکھتے تھے اور عربی میں منظوم خط لکھتے تھے۔ یہاں تک تو مولوی صاحب نے آزاد کو اپنے طور پر سراہا لیکن ان کے بعد ایک بھونڈا جملہ "ان کی عربی کا استاد نا فارسی کی طرح نہ تھی" لکھ کر تعریف میں تخفیف بھی کر دی۔ مولوی صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ کاستوں میں ایسے ایسے فارسی ال گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں کہ مولوی صاحب ان کی ناک کو بھی نہیں پا سکتے۔ ان جملوں میں کسی کو عرفی نیچا دکھلانے

کی علویت مرتبہ کو منکران نبوت بھی مانتے ہیں اور اہل استغفار کی زبانسے بھی کلمات حق نکل جاتی ہیں فی زمانہ دارالسلطنت لندن میں صاحبان انگلشیہ میں سے ایک صاحب جنکا نام نامی جون ڈیون پورٹ (کذا) صاحب ہی اور نہایت اپنی علم میں ذی استعداد و مورخ بے بدل و انصاف دوست و راستی آشنا ہیں انھوں نے کچھ ہماری حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منافع عمری تحریر کیا ہی اور بعض بعض الزامات کا جو غیر مذہبوں نے بسبب تعصب مذہبی کی آں حضرت کی نسبت لگائی ہیں اون کا جواب لکھکر اون کو دفع کیا ہی جب وہ کتاب چھپکر ہندوستان میں آئی تو اوسکی پڑھنی کو ہر ایک دوستدار نبوی کی طبیعت لہرائی جو کہ زبان انگریزی ہر ایک نہیں جانتا اسواسطی مشفقی خواجہ قمرالدینخاں صاحب عرف خواجہ مرزا صاحب خلف الصدق خواجہ بدرالدینخاں صاحب عرف خواجہ امانصاحب مترجم بوستان خیال کہ جوان سنجیدہ و فہمیدہ ہیں اونہوں نے یہہ چاہا یہہ کتاب زبان انگریزیسی اردو زبان میں ترجمہ ہو جائے تا ہر ایک مشتاق اوسکی پڑھنی سے حظ اٹھاوی اور اس کار خیر کی انصرام میں ثواب بھی عائد حال ہو جائی یہ خیال کر کی خواجہ صاحب موصوف نے اس کی درستی میں کر ہمت چست باندھی اور محمد عنایت الرحمٰن خانصاحب سی کہ وہ فن ترجمہ نگاری میں دستگاہ تام رکھتی ہیں کتاب مذکور کا ترجمہ کروایا جب ترجمہ ہو چکا تو موید الاسلام نام رکھا اور قصد انطباع کیا اور اس خاکسار ہیچمدان ہیچ مداں مجروح سی دیباچہ لکھنی کو فرمایا بندہ خواجہ صاحب کا حکم بسر و چشم بجالایا کسواسطی کہ رضاجوئی احباب و کار ثواب ہے۔ اب آگی اصل مطلب کتاب کی فقط

اشاریۂ غالب

مجلسِ یادگارِ غالب پنجاب یونیورسٹی (اورینٹل کالج، لاہور) فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کی صدسالہ برسی شایانِ شان طریقے پر منانے کا اہتمام کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں مجلس نے مطبوعات اور تقریبات کا ایک جامع پروگرام وضع کیا ہے۔ اشاریۂ غالب (ببلیوگرافی)، اسی پروگرام کا ایک حصہ ہے۔

پچھلے سو برس میں غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے، یہ کتاب ایک جامع اشاریئے (انڈکس) کی شکل میں اس کا تعارف کرائے گی۔ مجوزہ اشاریے میں تصانیفِ غالب کے علاوہ، غالب پر لکھی ہوئی جزوی و کلی تصانیف اور اخبارات و رسائل میں غالب کی سیرت و شخصیت اور فکر و فن سے تعلق رکھنے والے مقالات و مضامین کے حوالے ابجدی ترتیب سے۔

(ا) باعتبارِ مصنف

(ب) باعتبارِ موضوع

ضروری صراحتوں کے ساتھ درج ہوں گے۔ نمونہ یہ ہے:

غالب پر مستقل کتابیں:

۱- شوکت سبزواری، ڈاکٹر: "غالب۔ فکر و فن" (مجموعۂ مضامین)

طبع اوّل: انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) کراچی، ۱۹۶۱ء

سائز: $\frac{۱۸×۲۲}{۸}$ صفحات: ۲۶۴

۲- عرشی، امتیاز علی خاں (مرتب): "فرہنگِ غالب"

(یعنی۔ فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت، ہندی اور اردو لغات کی تحقیق و تشریح غالب کے اپنے الفاظ میں)

طبع اوّل: اشاعت خانہ رامپور، ۱۹۴۷ء

سائز: $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ صفحات ۲۹۶

۳- مالک رام: "ذکرِ غالب"

طبع اوّل: اپریل ۱۹۳۸ء		طبع دوم: اکتوبر ۱۹۵۰ء

طبع سوم: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، جنوری ۱۹۵۵ء

سائز: $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ صفحات ۲۸۴

غالب سے متعلق مضامین:

۱- آفتاب احمد: "غالب کے اردو قصیدے"

کی کوشش کی گئی ہے لیکن آگے چل کر مولوی صاحب اپنے اصلی رنگ میں سامنے آجاتے ہیں جب وہ یہ فرماتے ہیں" اپنے قلم سے اپنے ہم عصر دلا میں شاید کسی کی تعریف اس قدر کہ اس کو اپنے آپ سے بڑھایا ہو، میرے سوا نہیں کی" اس جملہ کو خود مولوی صاحب کے قلم سے نہیں نکلنا چاہیئے تھا۔ اس سے بہت بھدے قسم کی خودستائی ظاہر ہوتی ہے۔ مولوی صاحب جب تک بہار میں تھے دوسرے درجے کے شاعر سمجھے جاتے تھے اور آزاد کے مدمقابل تو کیا ان سے بہت نیچے درجے کے شاعر مانے جاتے تھے، وہ ان کی اتنی تعریف کیوں کرتے کہ اپنے آپ سے بڑھا دیتے۔ یہ کسی ذی فہم کی سمجھ سے باہر ہے۔ مجھے آزاد کا عزیز اور شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کی قربت کا فیض حاصل تھا میں نے کبھی ان کی زبان سے مولوی تمنا کی کوئی خاص تعریف نہیں سنی۔ بہت ایسے مواقع آئے جب میں نے مولوی صاحب کو اگر شاگرد نہیں تو ایک معتقد کی طرح حضرت آزاد مرحوم کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھے ہوئے اور اشعار سناتے ہوئے دیکھا لیکن ان کے حق میں رسمی، اخلاقی اور معمولی داد سے زیادہ آزاد کی زبان سے کوئی فقرہ نہیں سنا، آزاد ہر چھوٹے بڑے شاعر کا کلام سنتے تھے اور کوئی شعر پسند آتا تھا تو داد دیتے تھے۔ مولوی صاحب کی کوئی غیر معمولی تعریف میں نے ان کی زبان سے نہیں سنی نہ مولوی صاحب کی موجودگی میں اور نہ ان کے غائبانہ میں۔

مولوی صاحب پھر فرماتے ہیں" ان کے متعدد عربی قطعے منظوم خطوط کی حیثیت سے ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں جن میں اپنی نومشقی کا اعتراف کیا ہے اور میری کافی تعریف ہر خط میں کی ہے۔"

کاش مولوی صاحب ان میں سے چند خطوط کو آپ کے پاس بھیج دیتے اور آپ ان کے عکس اپنے رسالہ میں شائع کرتے ہندوستان اور پاکستان میں ابھی آزاد کے قدر دانوں کی کمی نہیں یہ قطعات شوق سے پڑھے جاتے یوں بھی کسی بڑے شاعر کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت مفید کام ہوتا اور ساتھ ہی ساتھ مولوی صاحب کو آزاد کی نومشقی کے اعتراف" اور اپنی تعریف کے ثبوت کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کا موقع مل جاتا۔

آزاد مولوی تمنا سے عمر میں خاصے بڑے تھے علم میں بہت اونچے اور شاعر کی حیثیت سے ان سے بہت بلند تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کا شمار ہندوستان کے اساتذہ میں کیا جاتا تھا اور تمنا شاعر اور زباں داں کی حیثیت سے بہار کے دوسرے درجے کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ یوں اپنے منہ سے اپنی جتنی تعریف چاہیں کرلیں اور جو لوگ دارِ بقا کی طرف رخصت ہو چکے ہیں ان کے متعلق جو چاہیں کہہ لیں۔ اور ان کی زبان میں جو چاہیں ڈال دیں۔ ان کو اختیار ہے لیکن اس معرکہ آرائی کے بیان سے ان کے وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ شعرا یا نکتہ سنجوں کی پرکھ ان کے کلام سے ہوتی ہے نہ کہ خودستائی سے۔ مشہور مقولہ ہے کہ

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

(ڈاکٹر) سید عبدالمجید شمس

سابق پرنسپل کامرس کالج، پٹنہ و مصنف" مثنوی حیات وکائنات"

نئی کتابیں

تذکرہ مخزن نکات ۔

مصنف :۔ قایم چاند پوری
مرتب :۔ ڈاکٹر اقتدا حسن
صفحات :۔ ۳۰۴
قیمت :۔ پانچ روپے
ناشر :۔ مجلس ترقی ادب لاہور
تبصرہ نگار :۔ تحسین سروری

مجلس ترقی ادب لاہور زبان وادب کی جو خدمت کررہی ہے، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اب تک اس ادارے ے مختلف علوم وفنون پر جو کتابیں شائع کی ہیں وہ کافی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ اگرچہ مجلس نے جدید علوم پر بھی کئی تابیں چھاپی ہیں لیکن اس نے "اردو کا کلاسیکی ادب" کے نام سے جو سلسلۂ مطبوعات شروع کیا ہے، وہ بڑا قابل قدر ہے۔ س سلسلے میں نظم ونثر کی ایسی کتابیں شائع کرنا مقصود ہے جو ہمارے ادب میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں، خاص کر گرامی قدر شعرا ے دیوان اور شعرائے اردو کے تذکروں کی اشاعت میں مجلس ترقی ادب سرگرم کار ہے۔ اگر اس ادارے نے اپنے دائرہ کار و اور وسیع کیا تو بڑی تعداد میں ایسی تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو جائیں گی جو نہایت کار آمد ہونے کے باوجود عام دسترس سے باہر ہیں۔ اور وہ مختلف کتب خانوں میں یا اشخاص کے پاس کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہیں۔

قایم چاند پوری کا کلیات ابھی تک شائع نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر اقتدا حسن نے پاک وہند اور یورپ کے مختلف خطی نسخوں کی مدد سے کلیات قایم کا ایک متن تیار کیا تھا۔ جسے مجلس ترقی ادب نے دو جلدوں میں چھاپ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے قایم چاند پوری کا تذکرۂ شعرائے اردو "مخزن نکات" بھی مرتب کیا ہے۔ اس کو بھی مجلس ترقی ادب نے لاہور سے شائع کر دیا ہے "مخزن نکات" اگرچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۲۹ء میں اورنگ آباد

نیا دور، لکھنؤ جون ۱۹۵۷ء

۲ - آلِ احمد سرور: " غالب کا ذہنی ارتقا "

مشمولہ: ادب اور نظریہ (مجموعۂ مضامین)

ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ طبع اول ۱۹۵۴ء

۳ - حمید احمد خاں: " غالب اور بیدل "

ہمایوں، لاہور جنوری ۱۹۳۸ء

۴ - فرمان فتح پوری (ڈاکٹر): " کلامِ غالب کا طنزیہ پہلو "

نگار، لکھنؤ اکتوبر ۱۹۵۷ء

۵ - مہر، غلام رسول: " غالب کا سفرِ کلکتہ "

اردو، اورنگ آباد اپریل ۱۹۳۶ء

۶ - وقار عظیم، سید: غالب کے خطوط اور اُن کی احباب پرستی "

ساقی، دہلی جنوری ۱۹۴۴ء

راقم الحروف نے سجاد باقر رضوی صاحب (نائبِ معتمد: مجلسِ یادگارِ غالب) کے تعاون سے " اشاریۂ غا کا بہت سا کام مکمل کر لیا ہے۔ اندراجات کی تعداد دو ہزار کے قریب ہو چکی ہے اور توقع ہے کہ اب بھی بہت سی ایسی ہوں گی جن تک مرتبین کی رسائی نہیں ہوئی۔ ان کی کوشش ہے کہ اشاریہ ہر اعتبار سے مکمل اور جامع ہو غالبیات پر بنیادی کتاب حوالہ کا کام دے۔

اس ضمن میں اہلِ علم سے عموماً اور غالب پر لکھنے والوں سے خصوصاً درخواست ہے کہ وہ نمونۂ بالا کے مطا غالب سے متعلق مواد کی نشاندہی اور قدیم و جدید اخبارات و رسائل سے مقالات و مضامین کے مندرجات فراہمی میں راقم الحروف کی اعانت فرمائیں۔

تعاون کا طالب سید معین الرحمان لکچرار اردو، شعبہ السنہ ایف سی۔ کالج، لاہور (

شعرا کا کوئی تذکرہ معرض وجود میں نہیں آیا تھا" (ص ۲۰)

ڈاکٹر صاحب نے تذکرۂ قائم سے بعض داخلی ثبوت پیش کرتے ہوئے میر اور گردیزی کے تذکروں کی اولیت کا خیال ذہن سے نکالنا چاہا ہے۔ اس طرح پھر ایک بار محققین کو شعرائے اردو کے اولین تذکرے پر بحث کرنے کا موقع دیا ہے۔ فاضل مرتب نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان میں سے ایک ملاحظہ ہو:

"..... چند اور بھی تراجم ہیں جو ۱۱۶۵ھ سے قبل لکھے گئے۔ ایک دلاور خاں ہیں جن کا تخلص قائم نے ہمرنگ درج کیا ہے۔ لیکن میر اور گردیزی نے بے رنگ۔ میر نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ یہ پہلے ہمرنگ تخلص کرتے تھے گویا قائم نے ان کا احوال تخلص کی تبدیلی سے قبل تحریر کیا۔ گردیزی یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کا انتقال چند سال پہلے ہوا جبکہ قائم ان کی زندگی کی دعا کرتے ہیں" (ص ۲۱)

اسی طرح اقتدا حسن نے شاہ ولی اللہ اشتیاق اور شرف الدین مضمون کے انتقال پر قائم کے بیانات کی روشنی میں تحریر کیا ہے کہ ان دونوں کا احوال ۱۱۶۸ھ میں قلم بند ہوا۔ (ص ۲۱)

مرتب نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ قائم نے شعرا کے احوال و اشعار کا جو مجموعہ ترتیب دینا شروع کیا تھا اس نے رفتہ رفتہ باقاعدہ ایک تذکرے کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۱۶۸ھ میں اس کی تکمیل کی گئی اور بیشتر شعرا کے حالات اسی زمانے میں قلم بند کئے گئے۔ اس طرح ۱۱۶۸ھ میں جب یہ تذکرہ مکمل ہوا تو خواجہ اکرم نے اس کی تاریخ لکھی۔ مادہ تاریخ "مخزن نکات" تھا۔ یہی مادہ تذکرے کا نام قرار پایا

ڈاکٹر اقتدا حسن نے ۱۱۶۸ھ کے بعد کے اضافے بھی تلاش کر لئے ہیں۔ جن کا سلسلہ ۱۱۷۴ھ تک جاری رہا۔ ۱۱۷۲ھ کے اضافے کا ایک ثبوت یہ پیش کیا ہے۔

"میر درد کے احوال میں قائم ان کے رسالے "واردات" کا ذکر کرتے ہیں۔ بیان سے یہ بھی ظاہر ہے کہ بوقت تحریر میر درد کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب بقید حیات تھے۔ میر درد کے الفاظ میں صحیفۂ واردات ۱۱۷۲ھ میں لکھا گیا۔ ..... گویا مخزن میں درد کا ترجمہ ۱۱۷۲ھ میں شامل کیا گیا" (ص ۲۳)

۱۱۵۵ھ سے قبل اور ۱۱۶۸ھ کے چھ سال بعد کی تحریریں ثابت کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ کامل سترہ سال میں اس تذکرے کی تکمیل ہوئی اور اس کا آغاز نکات الشعرا سے آٹھ اور تذکرۂ گردیزی سے نو سال قبل ہوا تھا۔

مخزن نکات کے مآخذ (یعنی ذرائع معلومات) پر بھی مرتب نے بحث کی ہے۔ بیاض غالب کے احوال میں ضمناً تذکرۂ سودا بھی زیر بحث آیا ہے۔ قائم نے مجموعۂ نغز میں شیخ سعدی کے احوال میں تذکرۂ سودا کا ذکر کیا تھا اور لکھا تھا کہ سودا نے اتحادِ تخلص کی بنا پر سعدی (ہندی) کو سعدی شیرازی خیال کر لیا۔ پھر میر نے سعدی کے متعلق ایسا خیال کرنے والوں کو غلط بتایا۔ اس سے ہمارے محققین نے نتیجہ نکالا کہ میر صاحب کی مراد تذکرۂ سودا سے ہے۔ لیکن اقتدا حسن نے تذکرۂ سودا کے سلسلے میں چند سوال اٹھائے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ سودا نے کوئی تذکرہ قلم بند نہیں کیا تھا۔ میر صاحب نے سعدی کے ترجمہ میں، جو لکھا ہے۔

سے شائع کیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر اقتدا احسن کا مرتبہ یہ نسخہ کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔

تذکرۂ قایم کی اہمیت محض اس لئے نہیں ہے کہ یہ شعرائے اردو کے ابتدائی تذکروں میں سے ہے۔ بلکہ فنی اور معلوماتی نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک خاص تذکرہ ہے۔ بعض اصحاب نقد و نظر کا یہ خیال ہے کہ شعرا کی طبقہ وار تقسیم اور زبان کے تدریجی ارتقا کے جائزہ کا رجحان پہلے پہل قایم کے مخزن نکات سے پیدا ہوتا ہے۔ بعد کو جن لوگوں نے اپنے تذکروں میں ادوار قایم کئے ہیں وہ قایم ہی کے مقلد ہیں۔ یہاں تک کہ آزاد نے آب حیات کو بھی مخزن نکات کے طرز پر مرتب کیا۔

مخزن نکات ہی ایسا تذکرہ ہے جس میں شعرائے دکن کی تعداد اور تذکروں سے زیادہ ہے۔ جس کی وجہ سے اردو زبان کی تاریخ کے سلسلے میں یہ تذکرہ رہنمائی کرتا ہے۔ اشپرنگر نے تذکرۂ قایم کے متعلق جو رائے قایم کی تھی وہ درست معلوم ہوتی ہے۔ کہ "ہندوستانی ادب کی ابتدائی تاریخ معلوم کرنے کے لئے یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے"

اگرچہ مخزن نکات چھپ چکا تھا، لیکن اس کو بھی اب چالیس سال ہونے کو آئے اس دوران میں اردو کے تحقیقی سرمائے میں کافی اضافہ ہو چکا ہے اور ہماری تحقیق نے جو انداز نظر اختیار کیا ہے، اس کے لحاظ سے مخزن نکات جیسے ماخذ کو سامنے رکھنا ازبس ضروری ہے۔ اس کے علاوہ انجمن کے نسخے کا متن جس خطی نسخے پر مبنی ہے وہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اچھا نسخہ نہیں تھا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ نسخہ کس کی ملکیت تھا اور اب کہاں ہے۔

ڈاکٹر اقتدا احسن نے مخزن نکات کے اُس مخطوطے سے متن تیار کیا ہے جو انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں محفوظ ہے اور ان کا قیاس ہے کہ یہ شاہان اودھ کے کتب خانوں کا وہی نسخہ ہے جس سے اسپرنگر نے اپنی فہرست شعرا کی تیاری میں مدد لی تھی۔ ساتھ ہی انجمن ترقی اردو کے مطبوعہ نسخے کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔

شروع میں مرتب کا (۳۶) صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے۔ قایم چاند پوری کے واقعات زندگی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں ان کے حالات کے ساتھ ساتھ اس وقت کے عام معاشی و معاشرتی اور سیاسی و ثقافتی حالات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ غرض قایم کی تاریخ پیدائش سے کر ان کی وفات تک تمام حالات مستند حوالوں کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد مخزن نکات پر مختلف ذیلی عنوانات کے تحت بحث کی ہے۔

قایم نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے تذکرے سے قبل شعرائے ریختہ کا کوئی تذکرہ قلمبند نہیں ہوا۔ جبکہ ان کے تذکرے کا سال ترتیب ۱۱۶۸ھ ثابت ہے۔ میر نے نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ میں لکھا اور فتح علی گردیزی نے اپنا تذکرہ ۱۱۶۶ھ میں مرتب کیا اس لئے ہمارے محققین قایم کے اس دعوے کو باطل قرار دیتے آئے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اقتدا احسن نے قایم کے دعوے کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں،

"بعض داخلی شواہد کی روشنی میں قایم کا یہ دعویٰ بے محل نظر نہیں آتا اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ تذکرۂ قایم کی داغ بیل ۱۱۶۵ھ سے بہت پہلے پڑ چکی تھی اور جب قایم یہ سطور لکھ رہے تھے، اس وقت تک ریختہ گو

صفحہ (۱۰۰) پر پیوندی کاغذ چپکا ہوا ہے جس کو چھڑا کر رستم علی تاجر کتب کا اشتہار پڑھا جا سکتا ہے۔ اس خصوص میں حقیقی واقعہ بیان کردوں تو غالباً نامناسب نہ ہوگا۔

واقعہ یہ تھا کہ مخزن نکات کا ایک قلمی نسخہ تنقیدات عبدالحق کے مرتب و ناشر محمد تراب علی خاں باز مرحوم کو دستیاب ہوا انھوں نے اس کو مولوی محمد عمر یافعی مرحوم کو دکھایا۔ پھر دونوں نے باہمی مشورے سے کسی دوسرے نسخے سے تصحیح کئے بغیر، بلا مقدمہ چھاپ دیا۔ آخری صفحے پر سید رستم علی کا نام جو کہ باقاعدہ تاجر کتب تھے، ناشر کی حیثیت سے ڈال دیا۔ ابھی اس کا سرورق چھپ ہی رہا تھا کہ مولوی عبدالحق صاحب کو اورنگ آباد میں اس تذکرے کے طبع ہونے کی اطلاع ہوئی۔ انھوں نے فوراً لکھ کر تذکرے کے تمام مطبوعہ فرمے اورنگ آباد منگوا لئے۔ بعد میں مولوی صاحب نے مقدمہ لکھ کر شامل تذکرہ کیا۔ اس طرح مخزن نکات کی اشاعت عمل میں آئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انجمن نے اورنگ آباد میں اپنا ٹائپ پریس قائم کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۲ صفحے کا مولوی صاحب کا مقدمہ ٹائپ میں اور متن (مع فہرست مضامین و صحت نامہ) لیتھو طباعت میں ہے۔ اگر مولوی صاحب اس کی تصحیح و ترتیب کرتے اور ان کی نگرانی میں متن کی طباعت ہوتی تو ظاہر ہے اس وقت اس نسخے میں جو اغلاط ہیں وہ ہرگز نہ ہوتیں۔

مخزن نکات کے اورنگ آباد سے شائع ہونے کے بعد شیخ چاند مرحوم نے جبکہ وہ مجلۂ عثمانیہ کے مدیر و مہتمم تھے۔ مجلۂ عثمانیہ کے شمارہ (۱) جلد (۳) سنہ ۱۹۳۰ء میں مخزن نکات پر ایک تفصیلی تبصرہ لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مخزن نکات کا ایک قلمی نسخہ بڑی تلاش اور کوشش سے دستیاب ہوا ہے جس کی تصحیح کرکے مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی اردو کی جانب سے طبع اور شائع کیا ہے" (۴۳) لیکن مولوی عبدالحق صاحب نے نہ اپنی کسی تلاش و کوشش کا ذکر کیا ہے اور نہ وہ تصحیح کا دعویٰ کرتے ہیں وہ قائم کے حالات اور ان کی شاعرانہ حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے صرف اتنا لکھتے ہیں،

"اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کے تذکرۂ شعرا کا ذکر کیا ہے جو اب تک نایاب تھا اور اب شائع کیا جاتا ہے"

(مقدمہ مخزن نکات ص ۶)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شیخ چاند نے محض رسمی طور پر تبصرہ میں یہ جملہ لکھ دیا اور یقین ہے کہ وہ مخزن نکات کی طباعت و اشاعت کے اصل واقعہ سے ضرور واقف تھے۔

اس موقع پر ایک اور واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انجمن ترقی اردو کا سنہ ۱۹۵۵ء میں جب پنجاہ سالہ جشن تاسیس منایا گیا، مولوی عمر یافعی صاحب حیدرآباد دکن سے مولوی عبدالحق صاحب کی دعوت پر کراچی آئے تھے، کئی ماہ وہ مولوی صاحب کے مہمان رہے۔ اس دوران میں مولوی محمود احمد عباسی نے ایک روز مخزن نکات کا ایک قلمی نسخہ لا کر یافعی صاحب کو دکھایا چونکہ اس نسخے میں مطبوعہ نسخے سے کچھ شعرا زائد تھے، نیز عبارتوں اور حالات شعرا میں بھی اختلاف تھا اس لئے یہ نسخہ یافعی صاحب نے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور یہ کہا کہ حیدرآباد میں میرے پاس اس کے دو اور نسخے ہیں۔ میں ان سے اس کا مقابلہ کرکے آپ کا نسخہ لوٹا دوں گا۔ عباسی صاحب مروت میں خاموش ہو گئے۔ اور یافعی صاحب ان کا نسخہ حیدرآباد لے گئے لیکن حیدرآباد جا کر وہ ایسے بیمار ہوئے کہ بستر سے پھر کبھی نہ اٹھے۔ آخر ۲۰ اگست سنہ ۱۹۶۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد

"آنچہ بعض این را شیخ سعدی گمان بردہ اند خطا است ۵

اقتدا حسن کا خیال ہے کہ یہ قطعی اشارہ ہے تذکرۂ قائم کی طرف۔

بیاض طالب کے علاوہ بیاض عزلت اور خان آرزو کے تذکرۂ مجمع النفائس کے ضمن میں مرتب نے یہ نتائج اخذ کئے، ہو قریب العہد ہونے کی وجہ سے میر، گردیزی اور قائم کے تذکروں کے یہ سب مشترکہ طور پر مآخذ رہے ہیں جس کی وجہ سے بعض شا کے نمونۂ کلام میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ انتخاب کلام کی یکسانیت کی بنا پر یہ کہنا کہ قائم نے میر سے استفادہ کیا ہے درست ہو گا۔

لیکن اقتدا حسن یہ مانتے بھی ہیں کہ قائم نے اگرچہ ۱۱۶۵ھ میں اپنے تذکرے کی ابتدا کر دی تھی لیکن چونکہ ۱۱۶۸ھ تک اس اضافے کرتے رہے تھے۔ اور اس دوران میں جب تذکرۂ میر (۱۱۶۵ھ) تالیف ہوا تو اس سے بھی انھوں نے استفادہ کیا۔

بیس ۲ صفحات کی اس تحقیقی بحث کے بعد مخزن نکات کا تنقیدی جائزہ دیا گیا ہے۔ تذکرے میں تین طبقات کی تقسیم، اقسام ریختہ، زبان کے بارے میں تذکرہ نگار کی رائے، تلاش لفظ و ایہام کی مذمت، تذکرے میں تاریخ کا عنصر، سیاسی حالات کی عکاسی، سیرۃ شخصی روابط کی بازگشت۔ مولف کا محل سکونت اور ہمسائے۔ نقد و تبصرہ وغیرہ۔ اس کے بعد مخزن نکات کے ان دو نسخوں کی تفصیل بتائی گئی ہے جن سے موجودہ متن تیار کیا گیا۔ دو نسخوں میں شدید قسم کے اختلاف ہیں جنھیں مرتب نے حاشیوں میں درج کر دیا ہے۔ جن شعرا کے تواریخ پیدائش و انتقال دوسرے ذرائع سے دستیاب ہوئے ہیں انھیں بھی حاشیے میں دیدیا گیا ہے۔ اسی طرح اعلام و اسمائے کتب کے بارے میں بھی صراحت موجود ہے۔

مرتب نے ایک ضمیمہ بھی شامل تذکرہ کیا ہے جس میں میر، گردیزی اور قائم کے تذکروں میں شامل شعرا کی فہرست دی ہے۔ جن شعرا کے سن وفات تحقیق ہو سکے وہ بھی درج کر دیئے گئے ہیں اس کے بعد کتابیات اور آخر میں متن و تعلیقات کا ا

انجمن ترقی اردو کے مطبوعہ نسخے کے بارے میں اقتدا حسن لکھتے ہیں کہ اس کے مآخذ سے متعلق تفصیلات تاریکی میں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ مخطوطہ کس کی ملکیت میں تھا۔ حیدرآباد دکن کے کتب خانۂ نواب سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ کا میں تلاش کرنے پر بھی اس قلمی نسخے کا انھیں سراغ نہ ملا"

انجمن کے اسی زیر بحث نسخے کے متعلق مزید یہ لکھا ہے کہ "جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کے پاس اس نسخے کی ایک مطبوعہ اور اس کے ابتدائی پروف دستیاب ہوئے ہیں، جس سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس تذکرے کا متن اصل میں ڈیوڑھی سنقہ چھتہ بازار حیدرآباد دکن کے ایک تاجر کتب سید رستم علی نے لیتھو میں چھپوایا تھا، معلوم ایسا ہوتا ہے بعد میں انجمن ترقی ار اس کے حقوق حاصل کر لئے اور اس پر مولوی عبدالحق مرحوم نے مقدمہ لکھ کر شائع کروا دیا (ص ۸۰) پر تاجر کا نام اور اشا چھپ چکا تھا۔ جسے دبیز کاغذ کے پرزے میں محفوظ کر دیا گیا"

اقتدا حسن نے جو خیال ظاہر کیا ہے اس کی حقیقت بھی یہی ہے۔ مخزن نکات کے اب بھی بعض ایسے نسخے مل جاتے ہیں

رگ ساز

مصنف :- شاہین غازی پوری
صفحات :- ۱۴۴
قیمت :- پانچ روپے
ملنے کا پتہ :- پاک کتاب گھر ۴۹ پٹواٹولی ڈھاکہ ۱ (مشرقی پاکستان)
تبصرہ نگار :- شمیم احمد

رگ ساز کو پڑھ کر مجھے بے اختیار "جدیدیت" کی اس تحریک کا خیال آیا جو یورپ میں بھی ۲۵ سال قبل پٹری سے اتر چکی ہے۔ لیکن پاکستان میں ایک تازہ واردات ہے۔ گویا ہماری جدیدیت بھی چوتھائی صدی پرانی ہوتی ہے۔ جدیدیت کیا ہے۔ اس کے اسرار و رموز اور مفاہیم کو پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ ہر لمحہ نیا ہے اور اس نئے کے معنی جدید ہیں۔ خوب! اگر ہر نئی چیز جدیدیت کا موضوع ہے تو پھر تین ترک اس پر لازم ملتے ہیں۔ ترک آدمیت، ترک الفاظ، اور ترکِ ترک۔ کیونکہ یہ تینوں چیزیں بہت پرانی ہیں اور یہ ہرگز یکسر نئی نہیں ہو سکتیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں خاصے پڑھے لکھے لوگ روایت سے اس طرح گھن کھاتے ہیں جیسے جذامی سے۔ روایت کے معنی ان کے یہاں صرف تکرار کے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ بالکل بھول جاتے ہیں کہ روایت کے بغیر کوئی نیا لمحہ یا نئی حقیقت دریافت ہی نہیں ہو سکتی۔ نیا آپ کس چیز کو کہیں گے جب تک اس کو نیا قرار دینے کا معیار اور بنیاد موجود نہ ہو یا پرانے کے مقابلے پر ہی تو ہو سکتا ہے۔ ورنہ ہر چیز پرانی بھی ہے اور نئی بھی۔ دراصل روایت کے زندہ شعور سے اصلاً یہ حضرات واقف ہیں۔ روایات ہرگز جامد حنوط اور عمومی اشیائے ادراک اور محسوسات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ہر زمانے کے جدید ترین طرزِ احساس اور رویّے کے اظہار سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے ادبی شعور میں وہی چیزیں زندہ اور تازہ رہتی ہیں جنہیں ہر زمانے کے ادب میں جدید ترین اضافہ کہا جا سکتا ہے ہر دور ہزاروں شاعروں اور ادیبوں سے گونجتا رہتا ہے۔ مگر روایت میں ہر دور کی ہزاروں تحریریں شامل نہیں ہوتیں۔ بلکہ صرف وہی تحریریں روایات بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں جن میں فنکار نے انسانیت اور آدمیت کے ہر اس تجربے کو جو وہ ازل سے کام میں لا رہا ہے اپنے زمانے کے مختلف اور بدلے ہوئے شعور کے ساتھ تبدیل کیا ہو۔ گویا روایت صرف جدید طرزِ احساس اور رویّہ کے موثر ترین لمحوں سے بنتی ہے۔ اور زندہ شعور کو ایک کڑی میں پروتی ہے۔ ہر جدید زمانہ اور جدید شعور اسی طرح روایت کے صحت مند سلسلہ میں ایک نئی کڑی بن کر پھر جدیدیت کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔ ہمارے یہاں جدیدیت کے دعویدار اس حقیقت سے بالکل ناواقف ہیں۔ دراصل ان کی تحریریں آدمی یا شئے سے کٹ کر صرف جدید خیال کا اظہار کرتی ہیں۔ یا وہ فیشن جسے جدید کہا جاتا ہے، اس کا اظہار کرتی ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اپنے دکھ کا ابلاغ کریں تو پھر اس جدیدیت کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ جس کو میں نٹ بازی کہتا ہوں۔ دوسری بات جدیدیت کے نام سے پہننے کو جدیدیت کے آثار متعین کئے جائیں۔ مثلاً آج ٹیڈی لباس یعنی تنگ پاجامہ سب سے جدید فیشن ہے۔ مگر کیا یہ

ان کے ورثا نے ان کے تمام ذخیرہ کتب کو فروخت کر دیا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر اقتدا حسن کے دو مآخذ نسخوں کے علاوہ تین نسخوں کا وجود تھا۔ اب خدا جانے وہ نسخے کہاں ہیں ان تین میں ایک تو راقم سطور کی نظر سے بھی گزرا تھا۔

مخزن نکات میں شامل شعرا کی تعداد کا مسئلہ بھی خاصا اہم ہے۔ گارساں دتاسی نے (۱۱۰) شاعر بتلائے تھے، لیکن نسخۂ انجمن تر (۱۲۰) ہیں۔ اس میں بھی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ لکھنؤ کی طباعت میں جو فہرست شعرا دی گئی ہے اس میں کاتب نے نمبر ۲ پر کا نام لکھ کر محمد افضل، افضل کے ساتھ بھی نمبر ۲ لکھ دیا۔ کتابت کی اس غلطی کی وجہ سے آخری شاعر قائم پر (۱۱۹) کا نمبر آیا۔ جو درصد (۱۲۰) ہونا چاہیے تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی ظاہر ہے اس کو (۱۱۹) شاعروں کا تذکرہ سمجھا ہوگا اور انھوں نے جب مقدمہ تعداد شعرا (۱۱۹) کا ہندسہ لکھا تو غلطی سے (۱۱۴) چھپ گیا۔ شیخ چاند نے فہرست کے خانۂ شمار میں دیکھ کر اپنے تبصرے میں (۱۱۹) شعر تذکرہ بتایا۔ حکیم شمس اللہ قادری نے اپنے مضمون تاریخ ادبیات اردو کے قابل استناد مصادر (رسالہ ہندوستانی الہ آباد۔ اکتوبر میں تعداد شعرا (۱۱۴) بتائی ہے اور یہی تعداد ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے معرکہ آرا مقالہ "شعرائے اردو کے تذکرے" (طبع لاہور ۱۹۵۲ء میں لکھی ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہمارے ان گرامی قدر علمائے ادب نے "مخزن نکات" جیسے اہم تذکرے پر محققانہ اور مبصرانہ ڈالنے کی کوشش نہ فرمائی اور محض روایتی بیانات اور قیاسات پر اپنی رائیں پیش کر دیں۔

مخزن نکات کے زیر نظر اڈیشن میں شعرا کی تعداد (۱۲۸) ہے۔ ان میں امیر خسرو اور منعم دو ایسے شاعر ہیں جن کا ترجمہ الگ تو نہیں تھا البتہ علی الترتیب سعدی اور ناجی کے ساتھ تذکرہ نگار نے انھیں ملا دیا ہے۔ لیکن اقتدا حسن نے ان دو شعرا کے نمبر الگ قائم ہیں۔ لندن کے نسخے میں مطبوعہ کے مقابلہ میں (۶) شاعر زائد ہیں اس طرح موجودہ اڈیشن میں (۱۲۸) شاعر ہوئے۔

مرتب نے یہ ثبوت بھی فراہم کئے ہیں کہ انجمن کے مطبوعہ نسخے کا متن مخزن نکات کے کسی ابتدائی نسخے پر مبنی ہے۔ اور لندن کے نسخے بعد کے اضافے یا حذف عبارات کافی موجود ہیں۔

مخزن نکات کی ترتیب و تحشی میں جس دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے وہ قوبل ہر ہے لیکن مرتب سے بعض فروگزاشتیں بھی یقیناً ہو گئی۔ مثلاً ایک جگہ سودا کی تصنیف "تنبیہ الغافلین" کا ذکر آیا ہے، میرا جہاں تک خیال ہے سودا نے اس نام کی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ البتہ عبرت الغا ہے۔ غالباً اقتدا حسن کی مراد یہی کتاب ہے غلطی سے تنبیہ الغافلین لکھ گئے۔

نسخۂ انجمن میں ندیم تخلص کے شاعر کا نام مراد علی قلی ہے (ص ۲۵) اور جدید اڈیشن میں میرزا علی قلی (ص ۱۲) اسی طرح منتو کہ رائے بیتاب کو نسخۂ انجمن میں سنتو کہ رائے بیتاب لکھا گیا تھا۔ (ص ۵۹) ظاہر ہے یہ نسخۂ انجمن کے مبیضہ نویس یا کاتب کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ لیکن جدید اڈیشن کے کی طرف سے حاشیہ میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ بعض جگہ مرتب نے قیاسی تصحیحات سے کام لیا ہے ایسے بیشتر مقامات پر انھیں غلط فہمی ہوئی ہے تذکرے کی طباعت کے بعد انھیں خود بھی ان غلطیوں کا احساس ہوا تو انھوں نے یہ اچھا کیا کہ غلط نامے میں ایسی تصحیحات کو خارج کر دیا۔

بہرحال یہ ایسی معمولی فروگزاشتیں ہیں جن کی وجہ سے مخزن نکات کی اس اشاعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تذکرۂ قائم کی اس اشاعت پر اور مجلس ترقی ادب لاہور قابل مبارکباد ہیں۔

لیکن کم از کم ایک حقیقت کا اعتراف ضرور کرنا پڑتا ہے کہ ان کی تنقید رسمی جملوں اور گھسے پٹے تنقیدی فقروں سے مبرا ہے۔ اور انھوں نے نفس مضمون میں پوری طرح شامل ہو کر بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ "پاکستانی کلچر" کی طرح اس مجموعے کے بعض مضامین خصوصاً ادب یا مابعد الادب میں انھوں نے کسی قوم میں "نظام خیال" کی موجودگی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ نظام خیال کے انحطاط پذیر ہونے سے کس طرح تخلیقی عمل سرد پڑ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی ان سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن کسی قابل ذکر ادب کی تخلیق کے محرکات میں سے ایک اہم محرک نظام خیال کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے کو جمیل جالبی نے "پاکستانی کلچر" میں خاصی تفصیل سے پیش کیا ہے اور اپنے موقف کی حمایت میں اقوام عالم کی تاریخ کے بعض اہم حوالے بڑی محنت سے جمع کئے ہیں۔ "مہدی افادی کا ادبی مقام" "حسن عسکری کے افسانے" "سارتر، وجودیت اور ادب" اور "آدھا شاعر" اس مجموعے کے دلچسپ اور فکر انگیز مضامین ہیں۔

جمیل جالبی کے یہاں ۶۰ء کے بعد سے تنقید میں نمایاں طور پر "میں" کی شمولیت کا احساس ہوتا ہے۔ "سارتر مجھ سے کہہ رہا ہے" "میں ادب کو ..... سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں ادیب کا کام .... ہے۔ جب میں عہد حاضر کے اردو ادب اور ادیبوں کا خیال کرتا ہوں" جیسے جملوں سے انھوں نے خود کو اپنے تنقیدی مضامین میں بڑے التزام سے قائم و موجود رکھا ہے۔ ان کی تنقید میں "میں" کی شمولیت سے ایک ادیب کی ڈائری کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ فکشن یا ڈائری کے انداز میں تنقید لکھنے کا ایک نیا امکان جمیل جالبی کے ان تنقیدی مضامین میں نظر آتا ہے۔

جمیل جالبی کو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ سے خاصی محبت اور عقیدت معلوم ہوتی ہے۔ اردو تنقید کے لئے یہ بھی ایک نیک فال ہے۔ کیونکہ ہمارے پرانے نقادوں نے اس کی تنقید پر ذرا کم ہی سنجیدگی سے توجہ دی ہے اور بعض نے تو اسے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ ایلیٹ سے اختلاف کے باوجود بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے، مثلاً وہ ہمارے بیشتر نقادوں کی طرح "میں یہ کہتا ہوں"۔ "میرا یہ دعویٰ ہے"۔ "ادب کے بارے میں میرا یہ فیصلہ ہے"۔ "سارے ادیب جھک مار رہے ہیں" کہہ کر قاری کو ایک کمتر مخلوق قرار دے کر اشتعال نہیں دلاتا ہے بلکہ جہاں قطعیت سے بات کہنی ہوتی ہے، وہاں بھی وہ Perhaps اور Probably کا استعمال کرتا ہے تاکہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ کہنے والا اولمپس کی بلندی سے آپ سے مخاطب کر رہا ہے۔ اور آپ کی سوچ پر احسان جتا رہا ہے۔ تنقید میں اس قسم کی شریفانہ لچک بہت ضروری ہے "تنقید اور تجربہ" میں ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جمیل جالبی نے مغرب کی جدید تنقید سے بہت سی باتیں سیکھی ہیں۔ لیکن ابھی ایک طرح کی ادبی صحافت یا محض صحافت سے وہ اپنا دامن مکمل طور پر چھڑا نہیں سکے ہیں۔ یہ صحافت "نذیر احمد اور ہمارے تہذیبی رشتے"۔ "اردو ادب کا ایک سال" اور "حاجی بغلول" میں کافی نمایاں ہے۔ اس جملۂ معترضہ کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ جمیل جالبی کی تنقیدی کتاب قاری کو سوچنے پر مائل کرتی ہے اور بلاشبہ ان کی تنقید نصابی تنقید سے ایک یگانہ چاشنی رکھتی ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی "اردو کے تنقیدی سرمائے میں "تنقید اور تجربہ" یقیناً ایک قیمتی اضافہ ہے۔

حقیقت نہیں کہ جدید لڑکی کی پرنانی چوڑی دار پاجامہ پہنا کرتی تھی۔ پھر یہ جدیدیت کیسے ہوئی اور اس نے کیسے خود کو دہرا
اسی طرح میر کی شاعری کے احیاء کے کیا معنی ہوئے؟

شاہین غازی پوری ان معنوں میں جدید شاعر ہیں کہ وہ ۱۹۶۸ء میں پہلا مجموعہ دے رہے ہیں۔ اور ان کی نوجوا
اسی عہد میں سامنے آئی ہے۔ مگر وہ ان معنوں میں جدید شاعر نہیں ہیں کہ صرف جدید ہونے کے خبط میں مبتلا ہوں۔ اسی لئے ا
کی شاعری میں تازگی بھی ہے اور اعتماد بھی۔ ان کا مجموعہ کلام رگِ ساز پڑھ کر مجھے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء کے دور کی شاعری
احیاء کا احساس ہوا۔ وہی تازہ لب ولہجہ زندگی میں پہلے پہل داخل ہونے کا احساس اور اپنے وجود کی معنویت اور اس سے
مختلف ردعمل۔ جس میں حیرت بھی ہے، تکلیف بھی ہے اور آرزوؤں اور یادوں کی جھلکیاں بھی۔ انھوں نے ہیئت کے جد
تجربوں سے بھی بہت فیض اٹھایا ہے مگر ہر جگہ انھوں نے شعور اور حیات کا اثبات کیا ہے۔ کہیں الجھاؤ یا خلفشارِ ذہنی موجو
نہیں ہے۔ صاف اور واضح خیالات اور اس سے بھی زیادہ شفاف طرزِ اظہار ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ مجھے ایسا معلو
ہوا کہ رگِ ساز نے ۱۹۶۸ء میں ۱۹۴۰ء کو دوبارہ دریافت کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ شاعر کی حیثیت میں بہت اچھ
شاعر نہیں ہیں۔ ان کے یہاں پیچیدہ اور گہرے محسوسات اور انوکھے طرزِ احساس کی بڑی کمی ہے، وہ کوئی چیز دہراتے ہیں تو ا
میں ان کا اپنا ذاتی اپروچ وہ کیمیاوی عمل نہیں کرتا جس سے ہمیں ایک نئی دنیا کا احساس ہو۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ ان کی شاعری
میں بنیادی شعری لہر موجود ہے۔ اور وہ الفاظ کے استعمال کا بہت خوب صورت پیرایہ رکھتے ہیں۔ اور زبان کے ا
رنگوں سے بخوبی واقف ہیں جو ایک رنگ کو دوسرے رنگ میں بدل کر نیا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ اور اسے بدرنگ نہیں ہ
دیتا۔ میں رگِ ساز اور شاہین غازی پوری کا ادبی دنیا میں تہِ دل سے خیرمقدم کرتا ہوں۔

تنقید اور تجربہ

مصنف :۔ جمیل جالبی

ناشر :۔ مشتاق بک ڈپو، شیلڈن روڈ، کراچی

صفحات :۔ ۴۰۶

قیمت :۔ آٹھ روپے پچاس پیسے

تبصرہ نگار :۔ سحر انصاری

جمیل جالبی اپنی فکر انگیز کتاب "پاکستانی کلچر" کی وجہ سے ادبی حلقوں میں ایک سنجیدہ ادیب کی حیثیت سے جانے پہچانے
جاتے ہیں۔ انھوں نے تنقید کو تہذیبی اور فکری رشتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں بعض موقعوں
پر خاصی جرأت، بیباکی اور دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ "تنقید اور تجربہ" ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں نظری اور
عملی تنقید کے چند اچھے نمونے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ جمیل جالبی کے کسی بنیادی استدلال یا موقف سے اختلاف کیا جا سکتا ہے

گرد و پیش

ایک جائزہ

تنگ نظری کے نام پر حقوق کی بہت سی تحریکیں اٹھتی ہیں اور کامیاب ہوتی ہیں۔ اور ان کا ایک پہلو بہت ہی مفید ہوتا ہے کہ اس سے کسی نہ کسی حد تک کچھ جائز مطالبات پورے ہو جاتے ہیں۔ اور جب یہ مطالبات بغیر کسی ہنگامے، تشدد، فساد اور نفرت کے مان لئے جائیں تو یہ اس قوم یا اس نسل کی ذہنی صحت مندی کی دلیل ہے۔ لیکن تنگ نظری اس وقت بہت ہولناک اور بدترین ذہنیت اور خود غرضی کا شاہکار بن جاتی ہے۔ جب مطالبہ پورا ہو جانے کے بعد بھی پچھلی نفرت اور بغض کا اظہار کیا جائے۔ ہمیں بہت ہی تکلیف اور تشویش ہے اس بات پر کہ مشرقی پاکستان میں عوامی گاڑیوں کے اردو نمبر کی پلیٹوں کے خلاف کارروائی ہو رہی ہے۔ جبکہ اردو ایک ویسی ہی قومی زبان ہے جیسی بنگلہ۔

ایک صدارتی تقریر

اورینٹل کالج لاہور کی انجمن اردو کی افتتاحی تقریب میں صدر جلسہ مولانا حامد علی خاں نے ارشاد فرمایا کہ انگریزی کا تسلط ہماری صلاحیتوں کو زنگ آلود کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ اور یہ چیز طلبہ پر خصوصاً اثر انداز ہو رہی ہے۔ وہ امتحان پاس کرنے کے لئے سارا سال محنت کرتے ہیں اور محض انگریزی میں ناکام ہونے کے باعث وہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پاتے۔ مولانا حامد علی خاں مکتبہ فرینکلین کے ڈائرکٹر ہیں۔ آپ نے کہا کہ طلبہ کا زیادہ وقت اور صلاحیتیں ایک غیر ملکی زبان کو سیکھنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں نہ اس زبان پر عبور حاصل ہو پاتا ہے اور نہ دوسرے مضامین پر۔ آپ نے کہا کہ غلامی میں اردو کے ساتھ یہ سلوک سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن حصولِ آزادی کے بعد اردو کو اس کا جائز اور صحیح مقام ملنا چاہئے۔

مقابلے کے امتحانات اور قومی زبانیں

لاہور میں ۱۴ مارچ کو آل پاکستان اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک جلسے میں صدر جلسہ میاں نذیر احمد نے کہا کہ پاکستان

مشتاق بکڈپو کے مالک اور اس کتاب کے ناشر اکرام احمد صاحب نے اس کی طباعت میں نفاست کا خاص خیال رکھا ہے۔ توقع ہے کہ وہ آیندہ بھی اسی قسم کی علمی اور ادبی کتابیں خصوصی دلچسپی کے ساتھ شائع کرتے رہیں گے۔

نظام کانپور (قرآن نمبر)

دینی صحافت کے بارے میں میری کوئی اچھی رائے نہیں ہے۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے اس میں "حسن" نامی چیز کو عنقا ہی پایا۔ نہ معیار میں، نہ انتخاب و ترتیب مضامین میں اور نہ کتابت و طباعت میں۔ لیکن نظام کے قرآن نمبر اور اس کے علاوہ جو دو ایک عام نمبر نظر سے گزرے ہیں انھیں دیکھ کر اس کے مدیر مولانا قمرالدین مظاہری کے حسن ذوق و معیار نظر کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس نمبر میں برصغیر پاک و ہند کے علماء و فضلا اور مشہور لکھنے والوں کی کاوش ہائے فکر و تحقیق شامل ہیں۔ علوم و معارف قرآن اور مسلمانوں کی خدمات قرآن کے ہر پہلو پر مقالات و معلومات کا یہ ایک نہایت عمدہ اور جامع مجموعہ ہے۔

صفحات ۴۲۶۔ کاغذ سفید۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت چار روپے

پتہ:۔ ماہنامہ نظام۔ مدنی منزل۔ کرنیل گنج۔ کانپور (یو۔ پی)۔ انجم سلمان شاہجہاں پوری

گلشن ہمیشہ بہار

نصراللہ خاں خویشگی نے یہ تذکرہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ "گلشن بے خار" کے جواب میں لکھا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں یہ پہلی بار شائع ہوا تھا۔ پہلی اشاعت کے بہت کم نسخے اب دستیاب ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی (استاد شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی) نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس میں ۹۱۴ شاعروں کے حالات ہیں۔ مرتب نے جا بجا حواشی لکھ کر اس کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ آفسٹ کی طباعت۔

صفحات ۳۴۳۔ قیمت آٹھ روپے

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ

کراچی ۱

میں ایم اے کیا تھا۔ ڈاکٹر قیوم نے یہ اعزاز دو سال میں حاصل کیا جبکہ عموماً طلبہ تین سال میں یہ کورس مکمل کرتے ہیں۔

قومی کتب خانہ مرکزی حکومت نے نیشنل لائبریری آف پاکستان اسلام آباد کو قومی کتب خانہ قرار دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ سنٹرل لائبریری ڈھاکہ اور لیاقت میموریل لائبریری کراچی کو بھی یہی حیثیت دی ہے۔ کاپی رائٹ کے قانون کی رو سے ملک میں چھپنے والی تمام کتب اور اخبارات کا ایک ایک نسخہ ان قومی کتب خانوں کو فراہم کرنا لازمی ہوگا۔ خلاف ورزی کرنے والا جرمانہ کا مستوجب ہوگا۔

ادیبوں کو یقین دہانی کراچی میں ۲۱ مارچ کو کمشنر کراچی جناب سید دربار علیشاہ نے یقین دلایا ہے کہ ادیبوں کو جلد از جلد قطعات اراضی الاٹ کر دیئے جائیں گے۔ یہ یقین دہانی انجمن مصنفین کے ایک وفد کو دلائی گئی ہے۔ جس نے ادیبوں کو اس پرانے مطالبے کی طرف انکی توجہ مبذول کرائی تھی۔

پاکستانی ادیب کو مغربی جرمنی کے چانسلر کا تحفہ مغربی جرمنی کے ڈاکٹر کیسنگر نے نامور پاکستانی ادیب ڈاکٹر ریاض الحسن کو گوئٹے کی کتاب "اطالوی سفر ۱۷۸۶ - ۱۷۸۸" کا ایک خاص ایڈیشن تحفتاً پیش کیا ہے۔

پچھلے دنوں کیسنگر اپنے سرکاری دورے پر راولپنڈی تشریف لائے تھے تو ڈاکٹر ریاض الحسن نے گوئٹے کے ناول کا اردو ترجمہ "نوجوان ورتھر کی داستان غم" انہیں پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر کیسنگر نے ڈاکٹر ریاض الحسن کی اس کوشش کو سراہتے ہوئے کہا ہے کہ یہ کتاب پاکستان جرمن تعلقات میں بھی ایک اہم کردار ادا کرے گی۔

کلام پاک کے نسخوں کی نمائش کلام پاک کے نسخوں کی ایک نمائش رنگون میں ۴ مارچ کو ہوئی۔ اس میں ایک چینی مسلمان کا لکھا ہوا کلام پاک کا ایسا نسخہ بھی شامل تھا جو دو سو سال قبل لکھا گیا تھا۔ اس نمائش میں قرآن مجید کے نسخوں کے علاوہ اس کے تراجم بھی رکھے گئے تھے۔ جن میں برمی زبان میں ترجمہ شدہ وہ نسخہ بھی شامل تھا جس کو پونے دو سال ہو چکے ہیں۔

غیر ملکی زبانیں شیخ الجامعہ سندھ ڈاکٹر محمد صالح قریشی نے ایک انٹرویو میں بتایا ہے کہ جامعہ سندھ میں جرمن فرانسیسی، عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اور بہت جلد ترکی چینی اور روسی زبانیں سکھانے کا انتظام بھی ہو رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ چار طالب علم روسی زبان سیکھنے کے لئے روس بھیجے گئے ہیں۔

اس آئینہ خانے میں

جسٹس کارنیلیئس کی سبکدوشی :۔ لاہور ۲۹ فروری۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، عظیم محب وطن

تہذیب و تمدن کی ترقی و ترویج کے لئے ضروری ہے کہ ملکی زبانوں اردو اور بنگالی کی تعلیم کو عام کیا جائے اور مطالبہ کیا کہ مقابلہ امتحانات میں انگریزی کے ساتھ اردو اور بنگالی زبانوں میں پرچے حل کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ کیونکہ بی۔ اے اور ایم۔ اے تک ڈگری امتحانات میں انگریزی کے علاوہ اردو اور بنگلہ میں پرچے حل کرنیکی اجازت ہے۔ اس طرح مقابلہ کے امتحانات میں ان کی دادرسی ہوسکے گی جنہوں نے ڈگری امتحانات میں قومی زبانوں کو ترجیح دی تھی اور یہ موقع نہ دینا ان طلبہ کے ساتھ بے انصافی ظلم ہے۔

عدالت میں اردو

قیام پاکستان کے بعد ۱۸ مارچ کو کراچی میں پہلی بار ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کی عدالت میں ایک مقدمہ کی کارروائی اردو میں ہوئی۔ آرام باغ تھانے کے اقدام قتل کے ایک مقدمہ میں سبحان بخش کی جانب سے درخواست ضمانت اردو میں پیش ہوئی۔ اور ان کے وکیل سید اظہار حیدر رضوی نے اس پر اردو میں بحث کی۔

غیر ملکی اور قومی زبان

پاکستان میں اطالیہ کے سفیر جناب ریزیو مینران نے کہا ہے کہ وہ تربیلا بند کی تعمیر کے اطالوی ٹھیکیداروں سے کہیں گے کہ ان کا جو فنی عملہ پاکستان آئے وہ اسے اردو ضرور سکھائیں۔ انھوں نے کہا اطالوی باشندوں کے اردو سیکھنے سے پاکستان اور اطالیہ کے عوام کے درمیان دوستی اور خیر سگالی کے فروغ میں مدد ملیگی۔

ذریعۂ تعلیم کیا ہو؟

اسلام آباد ۲۸ اپریل کی ایک اطلاع ہے کہ پاکستان کے ماہرین تعلیم کی دو سب کمیٹیاں قائم کر دی گئی ہیں جو اس بات کا فیصلہ کریں گی کہ ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے انگریزی کا مستقبل کیا ہو اور وہ کب تک برقرار رکھی جائے۔ یہ کمیٹیاں عنقریب اپنی رپورٹ پیش کر دیں گی۔

تعلیمی۔ علمی۔ ادبی اور تہذیبی خبریں

جامعۂ کراچی کا جلسۂ تقسیم اسناد

۱۱ مارچ کو کراچی یونیورسٹی میں جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ جس میں سفارتی نمائندے حکام، ماہرین تعلیم اور عمائدین شہر شریک تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی شیخ الجامعہ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ معاشرے کے استحکام کا انحصار ذہن کے منور ہونے پر اتنا ہی ہوتا ہے۔ زندگی کے اعلیٰ نظریات اور راست بازی پر ہوتا ہے۔ اردو میں امتیاز حاصل کرنے پر تمغۂ بابائے اردو مع پانچسو روپے اس بار احسن صدیقی کو تفویض کیا گیا۔ شیخ الجامعہ نے پیچیدہ اور دقیق آلات کی فراہمی کی ضرورت پر زور دیا۔ امیر بلدیہ کراچی کا شکریہ ادا کیا۔ جس نے جامعہ کی مشکلات سے متاثر ہو کر ایک لاکھ روپیہ کی امداد دی۔

تہران یونیورسٹی میں

۱۵ مارچ کو تہران یونیورسٹی میں ایک پاکستانی طالب علم سید قیوم سلیمانی کو فارسی میں ڈاکٹر کی ڈگری تفویض کی گئی۔ سید قیوم سلیمانی سوات میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے فارسی اور

جشن غالب کے سلسلے میں غالب کے تمام کلام کو بنگلہ میں منتقل کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اور اردو کے ادیبوں پر مشتمل ایک بورڈ قائم کر دیا ہے۔ جس نے اپنا کام کلکتہ میں تندہی سے شروع کر دیا ہے۔ انجمن اتحاد طلبہ اردو آرٹس کالج حیدرآباد کے زیر اہتمام یوم غالب پر دو روزہ اجلاس منعقد ہوا جس میں حیدرآباد کے تمام قابل ذکر ادیبوں اور شاعروں نے مقالے، تقاریر اور منظومات پیش کیں۔ دہلی میں ۱۵ فروری کو صدر جمہوریہ ہند نے غالب میموریل ہال کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقعہ پر متعدد اہم شخصیات نے تقاریر کیں۔ اس تقریب کی چند تقاریر درج ذیل ہیں۔

صدر مملکت ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے مرزا غالب کی یادگار عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کہا میں ریاست دہلی کے لفٹیننٹ گورنر جہا صاحب کا دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمارے ملک کے مایہ ناز اردو اور فارسی زبان کے بے مثل شاعر۔ اردو کی جدید نثر کے بانی۔ مرنجانِ مرنج انسان دوستی اور وسیع المشربی کی تمثال۔ ہمسرِ عرفی و طالب اسد اللہ خاں غالب کی یادگار عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنے کا شرف مجھے بخشا۔ اس بات کی مجھے اور بھی خوشی ہے کہ یہ موقع مجھے دہلی میں ملا کہ غالب ان لوگوں میں ہیں۔ جن سے اس مردم خیز شہر کی آبرو ہے۔ یہ وہ تاریخی شہر ہے۔ جس نے سب سے زیادہ واضح طور پر ہندوستانی تہذیب کے ایک گنگا جمنی تہذیب ہونے کے تصور نے شکل لی۔ ملک کے ہر سچے بہی خواہ کا یہی ارمان ہونا چاہیئے کہ اس کی آئندہ ترقی اس ڈگر پر چلے۔ اردو زبان مجھے یہ کہنے میں خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستانی تمدن کے اس رجحان مقدر کا علم ہے۔ دہلی میں اس کا گھر ہے۔ اس کا مرکز رہا ہے۔ دہلی کے چپے چپے پر اس کے آثار، زمانہ کی بے اعتنائی کے باوجود نمایاں ہیں۔ اس کے بنانے سنوارنے نکھارنے والوں کے تاروں جیسے درخشانی جھرمٹ اس کی خاک تلے روپوشس ہیں۔

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک

دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز!

دہلی ہی ان کی آرزوؤں ولولوں اور کاوشوں کا مرکز تھا۔ سیکھنا سکھانا۔ بنا بنانا، کہنا اور سننا۔ دینا اور لینا کھلے دل سے ساتھ دینا اور ساتھ لینا ان کا شعار تھا۔ انہوں نے ہندوستان کی اس تقدیر کو جو آج پھر اس پر منکشف ہو رہی ہے آج سے صدیوں پہلے تاڑ لیا تھا اور جان گئے تھے کہ ان کے پیارے وطن میں قدرت آدمیت کا ایک نیا سانچہ بنانا چاہتی ہے۔ جس میں متعدد قومیں اور بھانت بھانت کے تمدنوں کا امتزاج ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کبھی کبھی سوچوں میں بہت سے ناموافق حالات کے باوجود بھی کہ یہ سانچہ اب پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ہندوستان کی شوکت عمل سے شاید سارے جہاں میں بنے گا۔ اور اس کے بنانے کے شرف میں پیارا دیس کسی اور سے پیچھے نہ رہے گا۔

میں خیال کی رو میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مقصد اس بات پر اپنی احسانمندی، اور مسرت کو ظاہر کرنا تھا کہ ایک ایسے نامور کی یادگار کی بنیاد رکھنے کے لئے آپ نے مجھے یاد کیا۔ جس کے نام لینے سے یہ سب خیال دل میں آنے لگتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جس عمارت کا سنگ بنیاد آج رکھا گیا ہے وہ جلد بن کر تیار ہو جائیگی مگر عمارت کا بن جانا پہلی اور سب سے غیر اہم منزل ہے۔ عمارتیں، تو محض ......

ردو کے زبردست حامی اور اسلامی قوانین کے عالمی وکیل جناب اے آر کارنیلیس اپنے عہدے سے ریٹائر ہوگئے ۔ پ نے اپنی رخصت کی ایک الوداعی تقریب میں ایک بار پھر اردو کے موقف میں اپنے دلائل دے کر پاکستان کی سربلندی اور ومی شعور کے فروغ کے لیے قومی زبان کو مکمل طور پر اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس تقریب میں جسٹس کارنیلیس کو زبردست راج تحسین پیش کیا گیا ۔ اور ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ جسٹس کارنیلیس نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے مستقل قیام کے لیے لاہور میں رہنا پسند کیا ہے ۔

جوش ملیح آبادی کو خراج تحسین اردو سوسائٹی آدم جی کالج کی جانب سے کراچی میں ۲۹ فروری کو حضرت جوش ملیح آبادی کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ جس کی صدارت کرتے ہوئے جناب حکیم محمد سعید دہلوی نے ارشاد فرمایا کہ جوش ملیح آبادی ان عظیم انسانوں میں سے ہیں جنہیں بلا تامل قوم کی دولت کہا جا سکتا ہے ۔

یادوں کے چراغ

حضرت شاہ ولی اللہ کی یاد لاہور میں ۲۹ فروری کو حضرت شاہ ولی اللہ کی یاد منائی گئی۔ آپ کی تعلیمات پر ایک مجلس مذاکرہ میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس جناب ایس اے رحمٰن نے ارشاد فرمایا کہ پاکستانیوں کو چاہیئے کہ وہ شاہ ولی اللہ کے فلسفے کو اپنائیں اور ان کے نظریات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لیں۔ آپ نے کہا شاہ صاحب کے فلسفے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی معاشرے کی برائیوں اور تباہیوں کو روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو راستہ بنایا ہے وہ اسلام ہے جو فرد کو بتاتا ہے کہ وہ کائنات کو کس طرح اپنے تابع کرے۔ اعلیٰ انسانی اقدار کو روح معاشرہ بنا دے۔ مذاکرے میں جسٹس رحمٰن کے علاوہ ۔۔ ڈاکٹر سید عبداللہ راجہ سید اکبر اور مولانا نعیم صدیقی نے بھی تقریریں اور مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ چاہتے تھے کہ انسان کو ایسی تعلیم ملے جو اسے جاودانی مسرت کے لیے زندہ رہنا اور مرنا سکھائے ۔

بیادِ غالب فروری کا مہینہ اردو کے زندہ جاوید شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی یادوں کا مہینہ ہے جب میں برصغیر پاک وہند میں اس عظیم شاعر کی یاد کو دلوں میں زندہ کر دیا جاتا ہے ۔ جیسے جیسے غالب کی صد سالہ برسی قریب آ رہی ہے ۔ غالب کے پرستاروں کی سرگرمیاں تیز ہوتی جا رہی ہیں ۔ بزم ادب سوسائٹی کے زیر اہتمام ساہیوال میں ۱۶ مارچ کو یوم غالب منایا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر لے ڈی نسیم نے کی۔ گورنمنٹ کالج جھنگ کی بزم ادب کے زیر اہتمام بھی ۲۲ مارچ کو بیاد غالب مقالات کی نشست اور مشاعرے کا انتظام کیا گیا۔ جس میں کالج کے اساتذہ اور طلبہ نے مقالات پڑھے ۔ بعد میں ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ انجمن ترقی اردو مغربی بنگال نے صد سالہ

جشن غالب کے سلسلے میں غالب کے تمام کلام کو بنگلہ میں منتقل کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اور اردو کے ادیبوں پر مشتمل ایک بورڈ قائم کر دیا ہے۔ جس نے اپنا کام کلکتہ میں تندہی سے شروع کر دیا ہے۔ انجمن اتحاد طلبہ اردو آرٹس کالج حیدرآباد کے زیر اہتمام یوم غالب پر دو روزہ اجلاس منعقد ہوا جس میں حیدرآباد کے تمام قابل ذکر ادیبوں اور شاعروں نے مقالے، تقاریر اور منظومات پیش کیں۔ دہلی میں ۱۵ فروری کو صدر جمہوریہ ہند نے غالب میموریل ہال کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقعے پر متعدد اہم شخصیات نے تقاریر کیں۔ اس تقریب کی چند تقاریر درج ذیل ہیں۔

صدر مملکت ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے مرزا غالب کی یادگار عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کہا میں ریاست دہلی کے لفٹننٹ گورنر جہا صاحب کا دل سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے ہمارے ملک کے مایہ ناز اردو اور فارسی زبان کے بے مثل شاعر۔ اردو کی جدید نثر کے بانی۔ مرنجانِ مرنج انسان دوستی اور وسیع المشربی کی تمثال۔ ہمسر عرفی وطالب اسد اللہ خاں غالب کی یادگار عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کا شرف مجھے بخشا۔ اس بات کی مجھے اور بھی خوشی ہے کہ یہ موقع مجھے دہلی میں ملا کہ غالب ان لوگوں میں ہیں۔ جن سے اس مردم خیز شہر کی آبرو ہے۔ یہ وہ تاریخی شہر ہے جس نے سب سے زیادہ واضح طور پر ہندوستانی تہذیب کے ایک گنگا جمنی تہذیب ہونے کے تصور نے شکل لی۔ ملک کے ہر سچے بہی خواہ کا یہی ارمان ہونا چاہیئے کہ اس کی آئندہ ترقی اس ڈگر پر چلے اردو زبان مجھے یہ کہنے میں خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستانی تمدن کے اس رجحان مقدر کا علم ہے۔ دہلی میں اس کا گھر ہے۔ اس کا مرکز رہا ہے۔ دہلی کے چپے چپے پر اس کے آثار، زمانہ کی بے اعتنائی کے باوجود نمایاں ہیں۔ اس کے بنانے سنوارنے نکھارنے والوں کے تاروں جیسے درخشانی جھرمٹ اس کی خاک تلے روپوش ہیں۔

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز!

دہلی ہی ان کی آرزوؤں ولولوں اور کاوشوں کا مرکز تھا۔ سیکھنا سکھانا۔ بننا بنانا، کہنا اور سننا۔ دینا اور لینا کھلے دل سے ساتھ دینا اور ساتھ لینا ان کا شعار تھا۔ انہوں نے ہندوستان کی اس تقدیر کو جو آج پھر اس پر منکشف ہو رہی ہے آج سے صدیوں پہلے تاڑ لیا تھا اور جان گئے تھے کہ ان کے پیارے وطن میں قدرت آدمیت کا ایک نیا سانچہ بنانا چاہتی ہے۔ جس میں متعدد قومیں اور بھانت بھانت کے تمدنوں کا امتزاج ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کبھی کبھی سوچوں میں بہت سے ناموافق حالات کے باوجود بھی کہ یہ سانچہ اب پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ہندوستان کی شوکت عمل سے شاید سارے جہاں میں بنے گا۔ اور اس کے بنانے کے شرف میں پیارا دیس کسی اور سے پیچھے نہ رہے گا۔

میں خیال کی رو میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مقصد اس بات پر اپنی احسانمندی، اور مسرت کو ظاہر کرنا تھا کہ ایک ایسے نامور کی یادگار کی بنیاد رکھنے کے لئے آپ نے مجھے یاد کیا۔ جس کے نام لینے سے یہ سب خیال دل میں آنے لگتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جس عمارت کا سنگ بنیاد آج رکھا گیا ہے وہ جلد بن کر تیار ہو جائیگی۔ مگر عمارت کا بن جانا پہلی اور سب سے غیر اہم منزل ہے۔ عمارتیں تو مقبرے بھی ہیں

اردو کے زبردست حامی اور اسلامی توانین کے عالمی وکیل جناب اے آر کارنیلیئس اپنے عہدے سے ریٹائر ہوگئے ۔ آپ نے اپنی رخصت کی ایک الوداعی تقریب میں ایک بار پھر اردو کے موقف میں اپنے دلائل دے کر پاکستان کی سربلندی اور قومی شعور کے فروغ کے لیے قومی زبان کو مکمل طور پر اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس تقریب میں جسٹس کارنیلیئس کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا ۔ اور ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ جسٹس کارنیلیئس نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے مستقل قیام کے لیے لاہور میں رہنا پسند کیا ہے ۔

جوش ملیح آبادی کو خراج تحسین اردو سوسائٹی آدم جی کالج کی جانب سے کراچی میں ۲۹ فروری کو حضرت جوش ملیح آبادی کے ساتھ ایک شام منائی گئی جس کی صدارت کرتے ہوئے جناب حکیم محمد سعید دہلوی نے ارشاد فرمایا کہ جوش ملیح آبادی ان عظیم انسانوں میں سے ہیں جنہیں بلا تامل قوم کی دولت کہا جاسکتا ہے ۔

یادوں کے چراغ

حضرت شاہ ولی اللہ کی یاد لاہور میں ۲۶ فروری کو حضرت شاہ ولی اللہ کی یاد منائی گئی۔ آپ کی تعلیمات پر ایک مجلس مذاکرہ میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس جناب ایس اے رحمٰن نے ارشاد فرمایا کہ پاکستانیوں کو چاہیئے کہ وہ شاہ ولی اللہ کے فلسفے کو اپنائیں اور ان کے نظریات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لیں۔ آپ نے کہا شاہ صاحب کے فلسفے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی معاشرے کی برائیوں اور تباہیوں کو روکنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو راستہ بنایا ہے وہ اسلام ہے جو فرد کو بتاتا ہے کہ وہ کائنات کو کس طرح اپنے تابع کرے۔ اعلیٰ انسانی اقدار کو روح معاشرہ بنا دے۔ مذاکرے میں جسٹس رحمٰن کے علاوہ ۔۔ ڈاکٹر سید عبداللہ راجہ سید اکبر اور مولانا نعیم صدیقی نے بھی تقریریں اور مقالے پیش کئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ چاہتے تھے کہ انسان کو ایسی تعلیم ملے جو اسے جاودانی مسرت کے لئے زندہ رہنا اور مرنا سکھائے ۔

بیادِ غالب فروری کا مہینہ اردو کے زندہ جاوید شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی یادوں کا مہینہ ہے جس میں برصغیر پاک و ہند میں اس عظیم شاعر کی یاد کو دلوں میں زندہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے جیسے غالب کی صد سالہ برسی قریب آرہی ہے۔ غالب کے پرستاروں کی سرگرمیاں تیز ہوتی جارہی ہیں ۔ بزم ادب سوسائٹی کے زیر اہتمام ساہیوال میں ۲۰ مارچ کو یوم غالب منایا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر لے ڈی نسیم نے کی۔ گورنمنٹ کالج جھنگ کی بزم ادب کے زیر اہتمام بھی ۲۲ مارچ کو بیاد غالب مقالات کی نشست اور مشاعرے کا انتظام کیا گیا۔ جس میں کالج کے اساتذہ اور طلبہ نے مقالات پڑھے ۔ بعد میں ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ انجمن ترقی اردو مغربی بنگال نے صد سالہ

جناب شاہ نے غالب کا موازنہ شیکسپیئر سے کرتے ہوئے کہ دونوں کی تخلیقات میں زندگی کے ہر موقع کے لئے اشعار ملتے ہیں اور دونوں ہی نوع انسان کی ہر قلبی اور ذہنی منزل پر ایک دوست اور راہنما کی طرح جلوہ گر ہوتے ہیں ۔

جناب شاہ نے کہا کہ غالب ایک بڑے باہمت اور بلند نگاہ شاعر تھے اور اس وصف کی بدولت وہ حوادثِ زمانہ سے مردانہ وار سرخرو ہوئے ۔ زندگی بھر ان پر مفلسی طاری رہی لیکن وہ کبھی مایوس نہ ہوئے ۔ انہوں نے ہمیشہ امید سے کام لیا ۔ وہ ایک بہت بڑے آشاوادی تھے ۔ رنج و غم نے انہیں ضرور متاثر کیا ۔ لیکن اس کیفیت کے اظہار میں ایک حسن اور ایک دلکشی ہے ۔

طرحی مشاعرے سے قبل ایک بزم مقالات منعقد ہوئی جس کا افتتاح مرکزی وزیر صنعتی ترقیات جناب فخرالدین علی احمد نے کیا ۔

جناب فخرالدین علی احمد نے غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات کا جو آئندہ سال منائی جا رہی ہے ۔ خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ ملک کی مختلف ریاستوں میں خصوصی پروگرام مرتب کئے جا رہے ہیں ۔

بزم مقالات کی صدارت ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے کی ۔ موصوف نے کہا کہ غالب کو جو چیز دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی قوت فکر ہے ۔ غالب ایک انٹیلکچول شاعر ہے جس کے کلام میں تخیلی ذہن موجزن ہے ۔ وہ پہلے اردو شاعر ہیں جن کے ہاں ہمیں تخیلی فکر ملتی ہے ۔ زندگی کے بارے میں ایسے تصورات پیش کئے گئے ہیں جو ہماری سوچنے کی قوت کو انگیز کرتے ہیں ذوق ناسخ اور میر زبان ۔ بیان اور محاوروں کے استاد ہیں ۔ لیکن ان کے ہاں غالب کا تفکر نہیں ہے ۔

غالب کی ایک اور خصوصیت ان کی انفرادیت ہے جو ان کی ہر غزل میں نظر آتی ہے ۔ ان کے کلام میں ایک مردانہ قسم کی انانیت ہے جو تکبر سے مبرا ہے ۔

ڈاکٹر تارا چند نے کہا کہ اگر شاعری پیغمبری ہے تو غالب کو پیغمبری کا رتبہ مل سکتا ہے ۔ انہوں نے اردو زبان کو لافانی بنایا اور اپنی نثر و نظم سے اردو ادب میں ایک ایسا اضافہ کیا جس پر ادب ہمیشہ ہمیشہ ناز کریگا ۔

شاعر مشرق کے حضور

اپریل کا مہینہ شاعر مشرق علامہ اقبال کی حضوری کا ہے اور پرستاران اقبال اس عظیم شاعر کے حضور پہلے دست خراج تحسین پیش کرنے لگے ۔ پنجاب یونیورسٹی سینٹ ہال لاہور میں ۱۶ مارچ کو "مذہب اور سائنس اقبال کی نظر میں" کے زیر عنوان اسلام آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے کہا ہے کہ حکیم الامت مذہب اور سائنس میں کسی قسم کا تضاد نہیں سمجھتے تھے ۔ ۱۰ مارچ کو ایک سینما میں شاعر مشرق کی زندگی اور شاعری پر مشتمل ایک دستاویزی فلم کی نمائش کی گئی یہ فلم نیفرو ۔ وحید الدین نے بنائی ہے ۔ جس کا منظر نامہ اور ترتیب فیض احمد فیض کے سپرد تھی ۔ اور تدوین و صدا بندی جناب زیڈ اے بخاری نے فرمائی ہے ۔ اس موقع پر تمام دانشور موجود تھے ۔

اس فلم [illegible]

کر رہ جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس میں زندگی کی قوتیں کارفرما ہوں تو دعا کرتا ہوں کہ اس عمارت میں کام کرنے والوں کی ایسی مدد ہو کہ نہ غالب کو نئے نئے روپ میں قوم کے سامنے زندہ کر کے لائیں اور جو افکار اور جو اقدار غالب کی زندگی میں کارفرما تھیں ان کو دل اور دماغ دونوں کے سہارے سمجھیں سمجھائیں اور ان کی تنقید سے بھی نہ گھبرائیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا۔ اگلے سال ان کی سو سالہ برسی منائی جائیگی۔ اس موقع پر غالباً غالب کے سلسلے میں بہت سے ادارے بہت سے کام انجام دیں گے۔ ان کی کتابوں کے تنقیدی ایڈیشن جگہ جگہ سے نکلیں گے ان کی زندگی سے متعلق بہت سے سوال جن کا جواب اب تک اطمینان بخش نہیں ملا ان کی کھوج کی جائیگی۔ غالب پر پچھلے دنوں خاصا تحقیقی کام ہوا بھی ہے۔ مگر بہت کچھ اور ہو سکتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کام کی صحیح جگہ یونیورسٹیاں ہیں کہ تلاش حق میں ریاضت ان کا منصب اور ان کا فرض ہے۔ جن چیزوں کی بعض دفعہ بظاہر بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کی تحقیق میں اہل علم سر کھپاتے ہیں وہ باہر والوں کو حقیر معلوم ہوں مگر سچ یہ ہے کہ ان کے کام کا بڑا اہم جز ہیں۔ جب کوئی شاعر یا ادیب یا مورخ یا مدبر ایسے بلند مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے جیسے کہ غالب کو شعر و ادب کی دنیا میں نصیب ہے اور یونیورسٹی سے اپنی توجہ کا مستحق مانیں تو پھر ہر چیز جو بڑی بات مستحق توجہ ہو جاتی ہے۔ اور تحقیقی کام کے سب ہی آداب ہر جزئیہ میں ملحوظ رکھنے ہوتے ہیں مگر شاعر پر توجہ کا ایک اور بڑا میدان خود اس کا شعر ہے۔ اس لئے کہ میرے خیال میں شعر ایک وجود مستقل رکھتا ہے۔ شاعر سے الگ۔

ہتہ ہے کہ آئندہ دنیا آدمیوں اور چیزوں کی غالب کو ضرور گھیرے ہوتے تھے اور اس کا جتنا سراغ لگ جائے اچھا ہے مگر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ایک دنیا وہ ہے جو غالب نے خود بنائی ہے۔ بسائی ہے سجائی ہے۔ الفاظ اور معانی کی ایک دنیا جو اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔ اس دنیا میں رہنے، اس سے لطف اندوز ہونے کبھی کبھی اس میں گم ہو جانے کا سامان ہونا اور مجھے امید ہے کہ یہ یادگار جو آج آپ بنانا شروع کر رہے ہیں۔ اس کام میں مدد دے گی۔ غالب کی بنائی ہوئی دنیا کا شہری بنانے میں صاحبان ذوق کی مدد دیگی۔ مجھے امید ہے کہ یہاں غالب سے متعلق ہر کتاب خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو یہاں سے ملے گی۔ شعر کی ماہیت سے متعلق، غالب کے ہمعصر شاعروں کے متعلق، غالب کے عہد سے متعلق مکمل سے مکمل سرمایہ یہاں جمع کر دیا جائے گا۔ مشاعرے اور مناظمے بھی یہاں ہوا کریں گے اور ذوق شعری کی تربیت کے جتن بھی کئے جائیں گے۔ خود اس عمارت کی اندرونی سجاوٹ ایسی بنائی جاسکے گی کہ غالب کا زمانہ آنکھوں کے سامنے آجائے۔

جناب یحییٰ شاہ نے اظہار خیال کیا۔ غالب ایک بہت بڑے انقلابی تھے۔ جنہوں نے اپنے دور کی ناہمواریوں پر آزادی بلند حوصلگی سے اظہار خیال کیا اور عوام کو سوچنے کے نئے زاویوں اور زندگی کی نئی راہوں سے روشناس کیا۔

صاحب موصوف اس موقع پر منعقدہ ایک طرحی مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے جس میں دہلی اور بیرون دہلی کے بہ شعرا نے اپنے خصوصی کلام سے غالب کو خراج عقیدت پیش کیا۔

ردو کے لیے چند گز زمین

نئی دہلی میں انجمن ترقی اردو کے دفتر "اردو گھر" کا سنگ بنیاد رکھنے کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے مشہور شاعر اور سابق جج آنند نرائن ملا نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اردو کی ہمہ گیری اور بت کے پیش نظر اسے ہندوستان کی ایک قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ انہوں نے طنزاً کہا کہ ہم حکومت کے ممنون ہیں کہ اس ع ملک میں ہمیں بمشکل یہ چند گز زمین حاصل ہوئی ہے جسے ہم اردو گھر کہہ سکیں۔

ـــ اپیل

بروسلز میں انسانی حقوق کے دفاع کے نام پر ایک اپیل شائع ہوئی ہے۔ جس پر ۲۰۰ دانشوروں کے دستخط ہیں اور اس میں کہا گیا ہے کہ لیناوسکی اور ڈینئل! درروا ور روسی ادیبوں کو رہا کر دیا جائے اور ان لاف مقدمہ واپس لیا جائے جو ان پر ان کی بعض تحریروں کی وجہ سے چلایا جا رہا ہے۔

یر اعظم ہند کی زبانی

انجمن ترقی اردو کی عمارت "اردو گھر" کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے وزیر اعظم ہندوستان مسز اندرا گاندھی نے اردو کے سلسلے میں اپنی دشواریوں کا ذکر کر کے اپنی بے چارگی کا اظہار ار دو کے حق میں یہ بیان دیا کہ "اردو رنگا رنگ تہذیب اور ثقافت کی علامت ہے۔ جس کے محاورے سب سمجھ لیتے ہیں۔ اور جس کی راہ میں لسانی تعصب اور فرقہ واریت حائل ہے۔" انہوں نے اس بات کا انکشاف بھی کیا۔ ان کے پاس جو وفد اردو کے سلسلے میں آتے ہیں۔ ان میں غیر مسلم حضرات کی ہمیشہ اکثریت رہی ہے۔

علامہ شبلی کی یاد میں

اعظمی طلبہ کی انجمن کے زیر اہتمام یونین ہال علی گڑھ میں ۴ مارچ ۱۹۶۸ء کو علامہ شبلی نعمانی کی یاد بڑی شان و شوکت سے منائی گئی۔ جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ نے شبلی کی علمی اور ادبی خدمات پر مقالے پڑھے اور خراج تحسین پیش کیا۔ اس موقعہ پر طلبہ نے بھی شبلی اور علیگڑھ کے تعلق سے مضامین پیش کئے۔

اطہر پرویز کو انعام

مرکزی وزیر تعلیم نے بچوں کے ادب سے متعلق تیرہویں انعامی مقابلہ میں اطہر پرویز کی تصنیف "ہمارا ہندوستان" کو ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا ہے۔

ہندی کے زبردستی نفاذ کی مخالفت

ہندوستانی فوجی عملہ کے سربراہ جنرل پی کمار منگلم نے لکھنؤ یونیورسٹی یونین کا افتتاح کرتے ہوئے زبانوں کی مخالفت کے بڑھتے ہوئے رجحانات اظہار تشویش کیا اور کہا کہ ہندی کو زبردستی جنوب پر مسلط کئے جانے کی کوئی وجہ نہیں اور زبان کی مخالفت کرتے ہوئے دوسروں جذبات، نظریات اور حقوق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ردو سے ناانصافی

آل انڈیا امریکن لیگ کے صدر شری بھگت امین چند نے کہا ہے کہ اردو زبان ایک انمول خزانہ ہے جس کو کچھ فرقہ پرست ختم کر دینا چاہتے ہیں اور اپنی سیاسی ذہنیت کی وجہ سے اس کو رملکی قرار دے کر اس کا گلا گھونٹ دینا چاہتے ہیں۔ بھگت امین چند نے کہا کہ اردو اخبار نکالنے والے جب اردو

نظریہ سے ہم آہنگ نہیں ــــ ادھر مشرق اور پاکستان کے اس عظیم شاعر کی یاد میں اسپین کے مشہور شہر قرطبہ میں اس کی میونسپل کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ قرطبہ کے ایک چوک کو شاعر مشرق سے منسوب کرکے "اقبال چوک" کا نام دیدیا جائے۔ اس بات کی اطلاع کمیٹی نے پاکستان کے سفیر برائے اسپین کے نام ایک خط میں دی ہے۔ کراچی میں اقبال کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ علامہ اقبال اور ان کی تعلیمات پر شائع ہونے والی بہترین کتاب پر ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا جائے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ نے علامہ اقبال کی یاد میں اقبال میموریل کمیٹی قائم کی ہے جو "یاد اقبال" کے نام سے ایک پروگرام مرتب کریگی۔ اور ایک میگزین شائع کرے گی۔

گورکی کا صد سالہ جشن

پاک سوویت دوستی و ثقافتی انجمن کی جانب سے کراچی اور لاہور میں روس کے انقلابی شاعر میکسم گورکی کا صد سالہ جشن منایا گیا جس میں پاکستانی ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی اور مقالات پڑھے۔ شعرا نے اپنا کلام سنایا اور گورکی پر دستاویزی فلموں کی نمائش ہوئی۔

سرسید کی یاد میں

۱۷ اپریل کو سکھر میں یوم سرسید منایا گیا۔ جو انجمن مصنفین پاکستان کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ جناب آفاق صدیقی نے اپنے سپاسنامہ میں ڈپٹی کمشنر سکھر سے اپیل کی کہ سکھر میں گرلز ڈگری کالج کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ڈپٹی کمشنر نے اس سلسلہ میں کوشش کرنیکا یقین دلایا اور کہا کہ اگر ہم سکھر سے بڑے شہر میں ڈگری گرلز کالج قائم کریں تو سرسید کو خراج عقیدت پیش کرنیکا اس سے بڑا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر ضیاالدین یادگار مباحثہ

جناب ای ایچ جعفری نے ڈاکٹر ضیا الدین یادگاری مباحثہ میں تقریر کرتے ہوئے ممتاز ماہر تعلیم، حساب داں اور علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور وائس چانسلر جناب ڈاکٹر ضیا الدین کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ ان کی خدمت ناقابل فراموش ہیں۔ وہ قائد اعظم کے دست راست تھے۔

آئینہ ہند

اردو میں عید کارڈ

ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ۴۲ ممبروں کی اپیل پر اس مرتبہ پہلی بار ہندوستانی پارلیمنٹ نے اردو میں عید کارڈ شائع کئے۔ یہ کارڈ ہمیشہ انگریزی میں شائع کئے جاتے تھے۔ اس بار مولانا اسحاق سنبھلی، بشیر احمد خاں اور لطافت علیخاں صاحب سمیت ۴۲ ممبروں کے اصرار پر ان کی مادری زبان میں عید کارڈ شائع ہوئے ہیں۔

ذوق کا مزار منہدم

یہ خبر ادبی حلقوں میں بہت رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ اردو کے مشہور شاعر اور قصیدہ نگار شیخ ابراہیم ذوق کا مزار منہدم کرکے وہاں کی میونسپل کارپوریشن نے اب ... انا للہ وانا الیہ راجعون ...

نئے خزانے

جولائی تا دسمبر ۱۹۸۶ء کے رسائل کا موضوع وار اشاریہ

قسط سوم

مرتبہ
ابو سلمان شاہجہانپوری

انجمن ترقی اردو پاکستان
کراچی

کی مخالفت کرتے ہیں تو مجھے بہت حیرت ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت اردو کے پھیلاؤ کے لئے کوئی توجہ نہیں کر رہی ہے۔ اور اردو کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پورے ہندوستان میں صرف ریاست جموں و کشمیر میں اردو کو سرکاری حیثیت حاصل ہے۔

کلیات مصحفی کی اشاعت

علمی مجلس دلی ایک غیر تجارتی ادارہ ہے جس کا مقصد تاریخ ادب اردو کے بنیادی ماخذ اور اہم متون کی اشاعت ہے۔ تذکرۂ گلشن ہند، حیدر بخش حیدری مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد، نیز کلیات میر جلد اول مشتمل بر دو دواوین غزلیات کے بعد علمی مجلس نے کلیات مصحفی کی اشاعت کا آغاز کر دیا ہے۔ اسے اردو کے نامور محقق نثار احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے یہ مصحفی کے جملہ کلام منظوم اور تصانیف نثر کو محیط ہوگا۔ جلد اول و دوم شائع ہو چکی ہیں۔ جن کی قیمت بالترتیب سات روپے پچھتر پیسے اور چھ روپے پچھتر پیسے ہے۔ تفصیلات کے لئے خط لکھئے۔

علمی مجلس ۱۴۲۹۔ فراش خانہ۔ دہلی ۶

ڈاکٹر نارنگ کی نئی کتاب

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی نئی کتاب "ریڈنگز ان لٹریری اردو پروز" (Readings in Literary Urdu Prose) وسکانسن یونی ورسٹی (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) سے شائع ہو گئی ہے۔ یہ کتاب ان طلبہ کے لئے ہے۔ اردو جن کی مادری زبان نہیں۔ اردو کی سو سالہ نثر کا انتخاب پیش کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعے ثانوی سطح پر نہ صرف اردو زبان و ادب کی تعلیم دی جا سکے۔ بلکہ اردو کی پشت پر جو مخصوص تہذیبی تصور ہے۔ اس کے بنیادی عناصر بھی سامنے آجائیں۔ کتاب میں میر امن، مرزا غالب، محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، آل احمد سرور، سید احتشام حسین کرشن چندر وغیرہ مصنفین کی تحریریں شامل ہیں۔ اس میں ذخیرۂ الفاظ کو چونکہ سائنٹیفک طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے مشکل الفاظ کی تعداد بتدریج بڑھا دی گئی ہے۔ وضاحتی فرہنگ میں الفاظ کے معنی کے علاوہ لسانیاتی، تاریخی اور سماجی حواشی بھی شامل ہیں۔ امریکہ سے نستعلیق میں شائع ہونے والی یہ پہلی باضابطہ کتاب ہے۔ جو نہایت خوبصورت انداز میں شائع کی گئی ہے امریکہ اور یورپ کے بعض مقتدر اسکالروں نے کتاب کا خیر مقدم کیا ہے اور یہ امید ظاہر کی ہے کہ مغرب میں اردو کے ایک اچھے ثانوی انتخاب کی جو کمی مدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت سے وہ پوری ہو جائیگی۔

ریندر پرشاد سکینہ بدایونی	بنام طالب کاشمیری	قومی زبان، ص ۱۲۰، ستمبر

سیرت و سیاحت

برخان، میجر جنرل محمد	میرا سفر چین	سیارہ ڈائجسٹ، ص جولائی و اگست
قیس درانی، بیگم	القدس ۔ ایک سفر نامہ	ماہ نو، ص ۹۱، ستمبر
میف، غلام باری	دیار عرب میں ایک سال (۱)	لاہور، ص ۱۰ تا ۱۱، ۱۱ دسمبر
ریف فاروقی	میں نے مغربی جرمنی میں کیا دیکھا (۳)	جہاں نما، ص ۱۹ تا ۲۲، ۱۷ اکتوبر
بدالرشید، لفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر خواجہ	مشاہدات امریکہ	صدق جدید، ص ۷، ۸، ۲۲ نومبر
بدالماجد دریابادی، مولانا	دو دن بھوپال میں	" " ۵، ۶، ۱۷ "
لیم الشان صدیقی	سرشار کا سفر حیدرآباد	آج کل، ص ۳۷ تا ۴۱، اکتوبر
بک		
ریف الحسن (مترجم)	آذربائیجانی سیاح ڈھاکہ میں	بصائر، ص ۲۳ تا ۴۴، اکتوبر

شخصیات

آزاد، مولانا ابوالکلام

سلمان شاہجہاں پوری	مولانا ابوالکلام آزاد پر پہلی کتاب	ہندوستانی ادب، ص ۵۰ تا ۵۴، اپریل تا جون
ہشام احمد ندوی، ڈاکٹر سید	غبار خاطر ادب کے آئینہ میں	سب رس، ص ۲۷ تا ۲۹، دسمبر
لمی، عبداللطیف	انڈیا ونس فریڈم ۔۔۔ کیا مولانا آزاد کی تصنیف ہے؟	کتابی دنیا، ص ۸ تا ۱۳ + ۱۵، جون جولائی
"	" " " " " [1]	چٹان، ص ۷ تا ۹ + ۲۰، ۱۷ جولائی
رشید، عبدالسلام	مولانا آزاد اور جداگانہ حقوق کا مطالبہ	مشرق، ص ۴، ۲ جولائی
ض الحسن، ڈاکٹر	ترجمان القرآن (مولانا ابوالکلام آزاد)	قومی زبان، ص ۷ تا ۱۴، اکتوبر
جد، عبدالغفور	غبار خاطر پر ایک ناقدانہ نظر	صریر خامہ، ص ۱۴۳ تا ۲۲۴

---

[1] اس بحث کے سلسلے میں مہر محمد خاں شہاب، مولانا غلام رسول مہر، سید محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی اور ڈاکٹر ریاض الرحمان خان شروانی کے خطوط۔

اس مرتبہ جولائی تا دسمبر ۱۹۶۷ء چھ ماہ کا اشاریہ ایک ساتھ ترتیب دیا گیا ہے اور یہ اس کی تیسری قسط ہے۔ اس میں جنوری تا جون ۱۹۶۷ء کے بعض وہ رسائل بھی شامل ہیں جو بعد میں دستیاب ہوئے۔

اشاریے کی تیاری میں جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ صرف وہ حضرات لگا سکتے ہیں جو اس قسم کے کاموں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ رسائل کی فراہمی ایک بڑا مشکل کام ہے، اس کے لئے پوری کوشش کی جاتی ہے۔ پھر بھی رسالے نظر سے نہیں گزرتے۔ مدیران کرام کو بار بار خطوط لکھے جاتے ہیں اور ــــ

واں ایک خاموشی تری سب کے جواب میں

کے مصداق وہ تعاون حاصل نہیں ہوتا جو اس قسم کے کاموں کے لئے ضروری ہے۔ ہم نے اپنے وسائل کی حد تک اس اشاریے کو ہر اعتبار سے جامع بنانے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی ممکن ہے بعض رسائل نظر انداز ہو گئے ہوں اور ان کے حوالے اس میں موجود نہ ہوں۔ ہم اپنے قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر کوئی حوالہ اس اشاریے میں نہ ہو تو وہ ہماری رہنمائی فرمائیں تاکہ آئندہ اقساط میں اسے شامل کر لیا جائے۔

(ادارہ)

خلوتی راز	حکیم الامت کے خلاف ایک سازش	چٹان، ص ۵ تا ۸، ۲۴ دسمبر
″	″ ″	″ ″ ۱۲ تا ۱۳، ۳۱ر ″
″	″ ″	″ ″ ۵ تا ۸، ۲۸ر ″
رشید احمد	اقبال	ساقی، ص ۹۰، ۲۴ر جولائی
سمیع احمد ہاشمی، ڈاکٹر سید	ڈاکٹر اقبال اور سید سلیمان ندوی	سب رس، ص ۳ تا ۷، ستمبر
سلام سندیلوی، ڈاکٹر	فطرت میں روح کا وجود اور اقبال	نئی قدریں، ص ۴۲ تا ۵۴،
سلمیٰ خاں	اقبال کا فلسفہ خودی	کتابی دنیا، ص ۱۳ تا ۱۵، اگست دسمبر
شمس الدین صدیقی، پروفیسر	اقبال اور عام قارئین	سیارہ، ص ۲۲ تا ۲۷، نومبر
شوق امرتسری	اقبال کا فلسفہ خودی	فاران، ص ۳۰ تا ۳۵، جون
عبدالرحمان، سید صباح الدین	حضرت سید صاحبؒ (سید سلیمان ندوی) اور ڈاکٹر اقبالؒ	معارف، ص ۵ تا ۲۸، جولائی
عبدالرشید، میاں	اقبال کا فکری کارنامہ	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۹۰ تا ۲۲۲، اپریل
عبداللہ قریشی، محمد	معاصر شعرا اقبال کی نظر میں	ادبی دنیا، ص ۷۱ تا ۷۸، اکتوبر
″ ″	″ ″	سب رس، ص ۹ تا ۱۳، ″
عزیز احمد، ناٹک	اقبال اور اسلامی سوشلزم	چراغ راہ، ص ۶۰ تا ۶۴، دسمبر
فضلی، نورالحق	کلامِ اقبال میں تصرف	چٹان، ص ۲۲، ۱۷ر دسمبر
محروم، تلوک چند	علامہ اقبال سے ایک مختصر ملاقات	نقوش، ص ۱۶۳ تا ۱۶۵، ستمبر
محمد مسعود، پروفیسر	غیر ملکی زبانوں میں کلامِ اقبال کے تراجم	صریر خامہ، ص ۸۸ تا ۹۲
نظیر صدیقی	اقبال اور پاکستان	اردو زبان، ص ۴۳ تا ۵۰، اگست ستمبر
	روس میں اقبال کی مقبولیت	مشرق، ص ۲، اکتوبر

بابائے اردو

ابوسلمان شاہجہان پوری	مکتوبات بابائے اردو بنام محمد اجمل خاں	قومی زبان، ص ۱۰۲ تا ۱۱۳، ستمبر
اختر حسین، صدر انجمن ترقی اردو	بابائے اردو کی چھٹی برسی	″ ″ ۹۵ تا ۹۸، ″
ادیب، سید مسعود حسن رضوی	مکتوبات عبدالحق بنام سید مسعود حسن رضوی ادیب	″ ″ ۹۸ تا ۱۱۲، ″
جعفری، رئیس احمد	بابائے اردو	امروز، ص ۵، ۱۷ر اگست

شمس تبریز خاں	مولانا (ابوالکلام) آزاد اور آزاد بلگرامی	فاران، ص ، جون
شہاب مالیرکوٹلوی، مہر محمد خاں	آزادی ہند کی غلطیاں[1]	جامعہ، ص ۳۱۰ تا ۳۲۲، دسمبر
فرید احمد	انڈیا ونس فریڈم سے متعلق	چٹان، ص ۱۷ تا ۱۸، ۳ر جولائی
گوپال متل	مولانا آزاد کی فی البدیہہ گوئی اور حاضر جوابی[2]	تحریک، ص ۲، اگست
مشفق خواجہ	غبار خاطر کا نیا ایڈیشن	کتابی دنیا، ص ۱۱ تا ۱۲، اگست وستمبر
مہر، مولانا غلام رسول	انڈیا ونس فریڈم — کیا مولانا آزاد کی تصنیف ہے؟	" " جون جولائی
——	مولانا آزاد کا فتویٰ (قادیانی کافر ہیں؟)	لاہور، ص ۲، ۱۳ر جولائی

اقبال

ابواللیث صدیقی	اقبال کا مرد مومن	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۳۳ تا ۴۲، اکتوبر
ابوذر عثمانی، پروفیسر	حدیث اقبال	سیارہ، ص ۲۹ تا ۳۴، جولائی
احمد شجاع، حکیم	اقبال کا قیام لاہور	نقوش، ص ۷ تا ۴۴
اقبال، علامہ	اقبال بنام شاد[3]	لاہور، ص ۶، ۱۰، ۸ر اگست
" "	دو خط تلوک چند محروم کے نام	نقوش، ص ۱۵۵، ستمبر
" "	خطوط بنام اکبر شاہ خاں نجیب آبادی	ادبی دنیا، ص ۷ تا ۸، اکتوبر
آزاد، جگن ناتھ	اقبال اور مفکرین مغرب	آج کل، ص ۱۳ تا ۱۴، مئی
بروہی، اے کے	اقبال، اجتہاد اور اسلامی سوشلزم	چراغ راہ، ص ۲۲۴ تا ۲۹۴، دسمبر
جالوف، انور علیم	اقبال بیسویں صدی کے عظیم فرزند ہیں	کوہستان، ص ۱۰، ۲۸ر ستمبر
جوہر، سر کیجے رام	حالی، اکبر اور اقبال	لاہور، ص ۲ تا ۳، ۲۰ر نومبر
خلش کاشمیری، آغا	پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر	ہماری زبان، ص ۷، ۱۵ر اگست

---

[1] انڈیا ونس فریڈم کی تصنیفی حیثیت کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر کے مضمون کے جواب میں

[2] یہ مضمون تجلی، دیوبند، بابت ماہ ستمبر میں صفحہ ۲۹ پر بھی نقل کیا گیا ہے۔

[3] منقول از سہ ماہی اردو، کراچی اپریل ۱۹۶۷ء

نورالدین، ڈاکٹر ابو سعید	مشرقی پاکستان میں اردو کی تحریک اور بابائے اردو	قومی زبان، ص ۹۶ تا ۹۷، ستمبر
ہارون خان شروانی، پروفیسر	بابائے اردو	" " ۲۳ تا ۲۶، "
ہاشم رضا، سید	عالم با عمل (مولوی عبدالحق)	" " ۲۰ تا ۳۳، "
———	بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم	اخبار جہاں، ص ۱۲، ۲۰ اگست

غالب

احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر سید	غالب کا فلسفہ امید و یاس	قومی زبان، ص ۳۰ تا ۳۴، اگست
احسن فاروقی، ڈاکٹر محمد	میر اور غالب	نئی قدریں، ص ۲۰ تا ۳۱،
رضا اللہ خاں	خطوط غالب	صریر خامہ، ص ۲۱۸ تا ۲۲۰،
طیب انصاری	یگانہ فن — غالب	سب رس، ص ۳۲ تا ۳۴، نومبر
دانش، امتیاز علی	مرزا غالب کا زائچہ	ماہ نو، ص ۲ تا ۹، ستمبر
کوثر چاندپوری	جہانِ غالب	قومی زبان، ص ۵ تا ۳۸، اگست
محمود احمد برکاتی	لا ادریت اور غالب	نگار پاکستان، ص ۳ تا ۸، ستمبر
مسلم ضیائی	غالب کا زائچہ اور تاریخ ولادت	ہندوستانی ادب، ص ۵ تا ۷، اپریل تا جون

دیگر شخصیات

ادیب و شاعر

ابوبکر صدیقی	اکبر الہ آبادی اپنے عہد کے آئینے میں	ادبی دنیا، ص ۹۲ تا ۵۰، اکتوبر
ابوالفضل عثمانی	منشی دیبی پرشاد بشاش	شان ہند، ص ۷ تا ۸، اگست
احسان بی اے	مولانا چراغ حسن حسرت	کوہستان، ص ۵، ۲ جولائی
احسن علی مرزا	یاد یار مہرباں — نظر حیدر آبادی	صبا، ص ۱۳ تا ۱۹، اگست
احمد، پروفیسر سید	اکبر الہ آبادی کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر	بہار، ص ۶ تا ۴۸، اپریل
احمد ندیم قاسمی	کچھ اپنے نظریۂ فن کے بارے میں	امروز، ص ۷، ۲ جولائی
احمد ہمدانی	تسلیم صحرائی اذاں سے شاعری تک	نئی قدریں، ص ۲۸۲ تا ۲۸۸،

درد ائی، محمد معین الدین	ایک عظیم انسان (مولوی عبدالحق)	قومی زبان، ص ۴۹ تا ۵۰، ستمبر
رشدی، محمد حبیب اللہ	بیادِ عبدالحق	" " ۱۵۳ تا ۲۲۳، "
رشیدہ رضویہ	خط بنام محمودہ رضویہ	" " ۱۴۸ تا ۱۵۰، "
سلیم تمنائی	محمد ایا سیٹھ (سے انٹرویو)	" " ۱۱۲ تا ۱۱۴، "
سہیل عظیم آبادی	شرافت کا آئینہ (مولوی عبدالحق مرحوم)	" " ۳۵ تا ۴۲، "
شبیر علی کاظمی، پروفیسر	زود فریب (مولوی عبدالحق مرحوم)	" " ۷۷ تا ۷۹، "
شمیم احمد	ڈاکٹر سید عابد حسین (سے انٹرویو)	" " ۸۳ تا ۸۸، "
"	غلام محمد خاں "	" " ۱۰۵ تا ۱۰۸، "
"	شیخ حامد ابن حسین "	" " ۱۰۹ تا ۱۱۱، "
شہریار، ڈاکٹر باحیدر	تہران میں یوم بابائے اردو	" " ۱۷ تا ۲۲، "
عبدالحق، مولوی	خطوط بنام ڈاکٹر مظفر الدین قریشی	" " ۱۲۱ تا ۱۳۱، "
عبدالحق، بابائے اردو	عزیز النسا بیگم (والدہ سرسید احمد خاں)	" " ۵ تا ۱۰، نومبر
"	لغت کبیر (۲)	اردو، ص ۱۴۹ تا ۱۹۷، اکتوبر
عبدالماجد دریابادی، مولانا	بابائے اردو	امروز، ص ۲، ۱ راگست
فضل احمد صدیقی	بابائے اردو بمبئی سے بلدیہ کراچی تک	قومی زبان، ص ۷۶ تا ۸۹، ستمبر
قدرت نقوی، سید	مولوی عبدالحق کے لسانی افکار	" " ۵۰ تا ۶۱، "
کوثر چاند پوری	ایک یادداشت (مولوی عبدالحق مرحوم)	" " ۶۲ تا ۶۶، "
محبت، عظیم الدین	مولوی عبدالحق	امروز، ص ۴ تا ۵، ۱۳ راگست
محمد بیگ مرحوم، مولوی	مقدمات عبدالحق	قومی زبان، ص ۳۴ تا ۴۸، ستمبر
محمد حسین خاں زبیری	بنام محمد امین زبیری	" " ۱۳۵ تا ۱۴۰، "
محمد سعید، حکیم	بڑا آدمی (مولوی عبدالحق مرحوم)	" " ۳۳، "
محی الدین احمد	مشاہدات (مولوی عبدالحق)	" " ۸۰ تا ۸۲، "
مشتاق احمد خاں، نواب	مولوی صاحب (بابائے اردو عبدالحق)	جنگ، ص ۵، ۱۶ راگست
معین الرحمان، پروفیسر	چند ہم عصر اور مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری	صریر خامہ، ص ۳۹ تا ۴۰، ۲۱
نرگس صادق	منیر بانو بنت نواب منظور جنگ	قومی زبان، ص ۹۰ تا ۱۰۰، ستمبر

اعجاز فاروقی	ڈاکٹر وزیر آغا	اردو زبان، ص ۵۰ تا ۶۲، دسمبر
اعظم علی راکہ	فلسفہ حسن و عشق اور آتش	صریر خامہ، ص ۱۳۳ تا ۱۴۱،
افضل ملک، محمد	مولانا (صلاح الدین) کی تنقید	اردو زبان، ص ۳۴ تا ۳۷، جولائی
الیاس عشقی	ایک نئی آواز (تنویر عباس)	نئی قدریں، ص ۱۳ تا ۱۷،
"	تنہائی اور آشوب درد کا شاعر — احمد فراز	" " ۳۹۰ تا ۴۲۰،
امجد کندیانی	عرش صدیقی — ایک مطالعہ	" " ۵۷۷ تا ۵۸۳،
امداد نظامی	مجیب خیرآبادی — شخصیت اور فن	" " ۵۹۰ تا ۵۹۷،
امیر حسن عابدی	سنجر کاشی	برہان، ص ۳۱۱ تا ۳۱۶، نومبر
انجم اعظمی	جاں نثار اختر کی شاعری	نئی قدریں، ص ۴۱۸ تا ۴۵۸،
"	ڈپٹی نذیر احمد — ایک مطالعہ	افکار، ص اگست
انور سدید	فن کار، قاری اور افتخار جالب	اردو زبان، ص ۲۰ تا ۲۲، دسمبر
"	مولانا کا اسلوب (مولانا صلاح الدین)	" " ۳۸ تا ۴۴، جولائی
انور صدیقی	کچھ فانی کے بارے میں	جامعہ، ص ۱۱۹ تا ۱۲۵، ستمبر
انیس سلطانہ	شعلہ و شبنم (جوش ملیح آبادی) میں منظر نگاری	فروغ اردو، ص ۱۵ تا ۱۹۔ دسمبر
انیس ناگی	ولی کا اسلوب معانی	نئی قدریں، ص ۲۱ تا ۲۶،
ایوب قادری، پروفیسر	احسن مارہروی عظیم شاعر اور صاحب طرز ادیب	مشرق، ص ۱۱، ۲ ستمبر
" "	شاہد احمد دہلوی	بصائر، ص ۱۱۲ تا ۱۲۰، جولائی
" "	شمس العلما علامہ شبلی نعمانی (۱)	العلم، ص ۳۳ تا ۳۸، اپریل تا جون
" "	شبلی نعمانی (۲)	" " ۶۶ تا ۷۳، جولائی تا ستمبر
آزاد، جگن ناتھ	محروم اور ان کی شاعری	ہمایوں، ص ۴۲۳ تا ۴۲۸، جولائی
" "	میرے والد [1]	نقوش، ص ۱۸۷ تا ۱۹۳، ستمبر

---

[1] نقوش کے زیر نظر نمبر میں تلوک چند محروم پر مندرجہ ذیل مضامین بھی شامل ہیں :-
میرے استاد از جگن سرشار، محروم کی نظم نگاری از عبدالمغنی، محروم کی غزل از ڈاکٹر محمد حسن، تلوک چند کی فارسی شاعری از عبادالدین
بغت اللہ بچوں کا شاعر از ہنسراج رہبر۔

اخلاق حسین زبیری	مولوی سید عبدالودود دآؤد سہسوانی	العلم، ص ۹۳ تا ۹۹، اپریل
ادیب، ڈاکٹر لطیف حسین	امیرالدین آزاد اور ان کا کلام	معارف، ص ۴۲۶ تا ۴۳۷، دسمبر
"	عبقری اور ان کا کلام	قومی زبان، ص ۳ تا ۱۸، دسمبر
ادیب، مسعود حسن رضوی	مسکین مرثیہ گو	آج کل، ص ۴ تا ۱۰، مئی
ادیب، میرزا	شائلاک —— ایک کردار، ایک ذہنیت	ہمدرد ڈائجسٹ، ص ۱۷ تا ۲۲، دسمبر
"	مصطفیٰ زیدی	کتاب لاہور، ص ۱۵ تا ۲۸، نومبر
ادیب سہیل	ادیب اور فن کار (شاہد احمد دہلوی)	ماہ نو، ص ۱۱ تا ۱۲، جولائی
"	صلاح الدین محمد —— میری نظر میں	نئی قدریں، ص ۶۴۷ تا ۶۵۴،
ارشد، عبدالحمید	تابش انوری	" " ۶۴۳ تا ۶۴۹،
اسرار محمد خاں	مصحفی میری نظر میں	حریر خامہ، ص ۲۱۶ تا ۲۳۲،
اسلام، ڈاکٹر محمد	اصغر گونڈوی	نیرنگ خیال، ص ۷۵ تا ۸۰، اگست
"	حضرت اثر لکھنوی سے میری ملاقاتیں	ہماری زبان، ص ۳، ۴، یکم ستمبر
اسلم، ایم	شاہد احمد دہلوی میری نظر میں	ہندوستانی ادب، ص ۸ تا ۱۱، ستمبر
اسلم انصاری	ریزہ ریزہ کا شاعر — ظہور نظر	نئی قدریں، ص ۴۳۴ تا ۴۴۴،
اسلم فرخی، ڈاکٹر	ذات کا خول اور احمد ہمدانی	" " ۵۶۲ تا ۵۷۰،
اشتیاق طالب	مجاز کی انفرادیت	نقوش، ص ۱۴۸ تا ۱۵۱،
اشرف بخاری، سید	راشد — ایک مطالعہ	نئی قدریں، ص ۱۳۵ تا ۱۴۰،
اشفاق حسین	یار عزیز (سعادت کے انتقال پر)	صبا، ص ۷ تا ۱۲، اگست
اصغر، غلام جیلانی	مولانا (صلاح الدین احمد) اور میں	اردو زبان، ص ۸ تا ۲۱، جولائی
اطہر جاوید، سلیمان	اردو نظم میں حالی کا مقام	سب رس، ص ۸ تا ۳۰، نومبر
اطہر جاوید، سلیمان	رشید احمد صدیقی کی مرقع نگاری	کتاب لکھنؤ، ص ۵۹ تا ۶۲، دسمبر
اظہر، غلام حسین	مولانا (صلاح الدین احمد) کا نظریہ ادب	اردو زبان، ص ۳۴ ــ ۴۶، جولائی
اعتبار ساجد	اعجاز اکرم	تنزیل، ص ۲۰، ۱۵ نومبر
"	سید نذر شاہ	" " ۱۴، ۲۰ دسمبر
"	واجد علی قیصر	" " ۱۰، ۱۶ اگست

حسرت کاس گنجوی	شاہد احمد دہلوی	سب رس، ص ۱۴ تا ۱۷، نومبر
حمید نسیم	ضیا جالندھری کا فکر و فن	ماہ نو، ص ۱۹ تا ۲۴، جولائی
حقی، محفوظ الحق	ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی یاد میں	جنگ، ص ۷، ۲۵ دسمبر
حمیدہ سلطان	گل بدن	آج کل، ص ۳ تا ۵، جولائی
حالی خلد	سید ہاشم رضا	اخبار جہاں، ص ۴۶ ۴۴، ۶ دسمبر
"	فیض احمد فیض	" ۷ ۱۰، ۲۰ ر "
الدعرفان	احمد ندیم قاسمی ایک تاثر	آج کل، ص ۸ تا ۱۵، جولائی
"	لب آشنائے خندہ (راجہ مہدی علی خاں)	صبح، ص ۲۵ تا ۳۸، جون تا ستمبر
ن رشید، ڈاکٹر	مولانا حالی اور ان کی قومی شاعری	تحریر خامہ، ص ۷ تا ۴۲،
ق انجم، ڈاکٹر	فراق گورکھپوری	نئی قدریں، ص ۷۷ تا ۸۰،
ر داشرف	مخدوم کی شاعری کا ابتدائی دور	سب رس، ص ۳۲ تا ۳۵، جولائی
دائی، محمد معین الدین	عبدالرحیم خاں	قومی زبان، ص ۳۷ تا ۴۳، جولائی
صدیقی	قاضی غیاث الدین صاحب	صبا، ص ۲۰ تا ۳۰، اگست
لفقار، ڈاکٹر غلام حسین	افادات اکبر	قومی زبان، ص ۱۹ تا ۲۷، اگست
چاندپوری	سیماب اکبرآبادی	اردو ادب، ص ۵ تا ۲۲،
لعل	جگن ناتھ آزاد	نئی قدریں، ص ۴۸۹ تا ۴۹۴،
مانہ سعید	غم پسند شاعر — میر	خاتون دکن، ص ۵ تا ۱۳، اکتوبر تا دسمبر
ر احمد، سید	اصغر صاحب	جامعہ، ص ۱۴۴ تا ۱۵۲، ستمبر
ہمدانی	پشتو کا ایک ابھرتا ہوا فن کار (سردار خاں فنا)	افکار، ص ۶۳ تا ۶۴، نومبر
شیخ صدیقی	سرسید اپنے طرز ادا کے آئینے میں	تحریر خامہ، ص ۱۵۰ تا ۱۵۳،
، احمد عقیل	باقر صاحب	نئی قدریں، ص ۴۷۵ تا ۴۸۰،
، کوکب الصباح	ساحر — گیت اور فن	" ۲۷۷ تا ۲۸۲،
الدین احمد	مولانا سعید احمد مارہروی	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۱۴ تا ۱۹، نومبر
عمر	مدنی کے فن کی فکری بنیادیں	نئی قدریں، ص ۲۲۹ تا ۲۳۲،
انی	رباعیات آہ (ڈاکٹر ...) ترجمہ	۱۰ ... ،

آفاق صدیقی	مجید امجد کی چار نظمیں	نئی قدریں، ص ۲۳۷ تا ۲۴۴،
"	ناصر کاظمی کی غزلیں	" " ۲۲۱ تا ۲۲۸،
آفتاب اختر	میر تقی میر کی سیکولر مزاجی	آج کل، ص ۱۴ تا ۱۷، نومبر
بشیر انصاری	اکبر حمیدی	قندیل، ص ۲۰، ۲۵ر اکتوبر
بشیر حسین، ڈاکٹر	احوال و آثار استاد سعید نفیسی	ثقافت، ص ۹ تا ۲۰، دسمبر
بلقیس سلطان بیگم	محمد اعظم — مصنف تاریخ واقعات کشمیر	مجلہ ادارہ تحقیقات پاکستان، ص ۱-۲۶،
بینش سلیمی	بندِ قبا سے رشتۂ انفاس دوراں تک (عزیز حامد مدنی)	نئی قدریں، ص ۲۱۷ تا ۲۲۸،
"	قابل اجمیری	" " ۵۴۹ تا ۵۵۵،
پریم چند، منشی	شاعرِ اعظم کالیداس	ہمایوں، ص ۳۵۷ تا ۳۷۳، جون
تبسم کاشمیری	عباس اطہر	نئی قدریں، ص ۴۷ تا ۵۱،
ثریا جمال	شاگرد حالی — حکیم آزاد انصاری	آج کل، ص ۴۶ تا ۴۸، نومبر
جان مکاراوسکی پیش مروج	چیکوسلواکیہ کا عظیم شاعر پیٹر بیزرک	ہمایوں، ص ۹۳۳ تا ۹۳۷، اکتوبر
جاوید، عبداللہ ——	ن۔م۔ راشد	نئی قدریں، ص ۱۲۲ تا ۱۳۴،
جعفر حسن، ڈاکٹر	کبیر کی شخصیت اور فن (۲)	لاہور، ص ۶ تا ۸، ۱۲ تا ۱۳: ۲۶ر ستمبر
جعفری، مولانا رئیس احمد	عبدالحلیم شرر ایک مورخ کی حیثیت سے	ثقافت، ص ۳۷-۴۹، جولائی
جلیل قدوائی	اثر لکھنوی کی یاد	قومی زبان، ص ۱۵ تا ۲۰، اگست
جمیل جالبی	شاہد احمد دہلوی	کتاب لکھنؤ، ص ۲۰ تا ۲۸، "
جمیلہ شاہین	میراجی کا سفرِ شوق	فنون، ص ۷۱ تا ۸۰، جولائی و اگست
جمیل ملک	قطعے کا دریچہ اور ندیم	داستان، ص ۱۵ تا ۴۲،
"	وزیر آغا کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ	نئی قدریں، ص ۲۵۶ تا ۲۷۶،
جوش ملیح آبادی	میں اور شاہد مرحوم	ماہ نو، ص ۱۰، جولائی
جوہر، نربھے رام	معین احسن جذبی	نئی قدریں، ص ۲۸۹ تا ۲۹۷،
حامد علی خاں، ڈاکٹر	ہندوستان کا امراؤ القیس (ناصر الملت ناصر حسین لکھنوی)	برہان، ص ۲۸۹ تا ۲۹۸، نومبر
حسرت کاس گنجوی	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	نگار پاکستان، ص ۲۰ تا ۵۹، ستمبر

شریف، ڈاکٹر محمد جمال	فیروز شاہ بہمنی	سب رس، ص ۲۳ تا ۲۶، نومبر
" "	عبدل — ابراہیم نامہ کا مصنف	" " ۲۰ تا ۲۲، اکتوبر
شفقت حسین	سجاد حیدر یلدرم کا اسلوب	اوراق، ص ۲۶۰ تا ۲۷۰،
شکیل احمد صدیقی	عشقیہ شاعری اور جگر مرادآبادی	ہندوستانی ادب، ص ۴۰ تا ۴۴، اپریل تا جون
شمشیر انصاری، حاجی	سرسید کے ادبی افکار	سب رس، ص ۵ تا ۲۸، اکتوبر
شمیم، ایم اے	خصوصیات کلام میر	نگار پاکستان، ص ۴۷ تا ۵۵، "
شمیم حنفی	کچھ فانی کے بارے میں	ہندوستانی ادب، ص ۷ تا ۱۹، اکتوبر نومبر
شمیم فرید	اطہر نفیس	نئی قدریں، ص ۴۱ تا ۴۴،
شنکر، دی	چکبست کا رنگ تغزل	ارشاد، ص ۳۷ تا ۳۹، ستمبر اکتوبر
شورش کاشمیری	مولانا ظفر علی خاں	صبح، ص ۴۴ تا ۷۴، جون تا ستمبر
شوق، ست پرکاش	حضرت فراق سے ایک انٹرویو	نیرنگ خیال، ص ۲۵ تا ۳۸، "
شہابی، انتظام اللہ	دبستان اکبرآباد (۳)	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۱۶ تا ۲۲، اکتوبر
"	" (۴)	" " ۷ تا ۱۳، نومبر
"	" (۵)	" " ۱۳ تا ۱۶، دسمبر
شہرت بخاری	منیا جالندھری	نئی قدریں، ص ۳۷ تا ۴۲،
شہزاد منظر	سومرسیٹ مام	اوراق، ص ۵۳ تا ۵۸،
صابر شاہ پوری	حضرت راجہ باگ سوار	خاتون دکن، ص ۲۳ تا ۳۵، اکتوبر تا دسمبر
صدیقی، ایم اے	جون ایلیا — شاعر یا شاعری	نئی قدریں، ص ۳۴ تا ۴۰،
صفدر ادیب	عشرت رحمانی	کتاب لاہور، ص ۴۷ تا ۴۹،
"	منشی پریم چند	" " ۲۷ تا ۳۰، نومبر
صوفی، فقیر محمد	ایک یادگار ملاقات (مولانا صلاح الدین احمد سے)	اردو زبان، ص ۱۲ تا ۱۴، جولائی
صوفی رشید، پروفیسر	منظر ایوبی اور اس کا فن	نئی قدریں، ص ۵۵۶ تا ۵۶۱،
صہبا، ابوظفر	صبا اکبرآبادی	" " ۴۲۹ تا ۴۳۳،
ضمیر علی	آخری سلام کی وادی میں	" " ۵۰۱ تا ۵۰۷،
"	[illegible]	" " ۱۰۰ تا ۱۱۱،

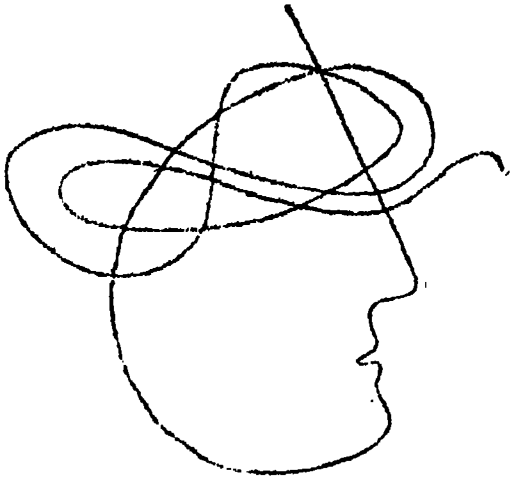
ستار طاہر	قتیل شفائی	نئی قدریں، ص ۲۸۴ تا ۲۸۸،
سجاد باقر رضوی	قطرے سے گہر ہونے تک (تیغ الہ آبادی)	″ ″ ۱۸۰ تا ۱۹۷،
سحر انصاری	اختر الایمان کی شاعری	″ ″ ۱۷۳ تا ۱۸۲،
سخاوت مرزا	علامہ مرزا قاسم علی بیگ اخگر حیدرآبادی	اردو ادب، ص ۱۳۵ تا ۱۳۹،
″	مولوی محمد مہدی واصف اور ان کی تصنیفات	العلم، ص ۳۷ تا ۴۷، جولائی تا ستمبر
″	″ ″ ″ (۲)	″ ″ ۴۴ تا ۵۱، اکتوبر تا دسمبر
سخی احمد ہاشمی، ڈاکٹر	مولانا شبلی اور ترکی	صریر خامہ، ص ۴۴ تا ۴۹.
″	مولانا شبلی کی قومی شاعری	فروغ اردو، ص ۶۰ تا ۶۲، دسمبر
سرمد، آل احمد	اثر صاحب کی یاد میں	آج کل، ص ۱۸ تا ۱۹، ستمبر
″	جعفر علی خاں اثر کی یاد میں	کتابی دنیا، ص جون جولائی
سرور تونسوی	مشاعرہ عرس خواجہ شاہ سلیمان تونسوی جے پور	شان ہند، ص ۷ تا ۱۵، جولائی
سری نیواس لاہوتی	پنڈت ونشی دھر	صبا، ص ۱۳ تا ۴۲، اگست
سعادت نظیر	اصغر کا تصوف	نگار پاکستان، ص ۲۴ تا ۴۶، اکتوبر
سلیم احمد	جوش اور خدا	نئی قدریں، ص ۶۰ تا ۷۶،
سلیمان اطہر	جدید اردو نثر کے چند طنز و مزاح نگار	خاتون دکن، ص ۷ تا ۲۱، اکتوبر تا دسمبر
سلیمان حسین، ڈاکٹر سید	برق لکھنوی — شاگرد ناسخ	ہماری زبان، ص ۱، ۲ و ۱۲، یکم جولائی
سنصاد مغنی	عبدالعزیز فطرت مرحوم	امروز، ص ۱۲، ۱۲ نومبر
سہیل عظیم آبادی	میں اور میرا فن	نقش، ص ۱۳۴ تا ۱۳۶،
شاد، نریش کمار	ایک خود پرست شاعر	نئی قدریں، ص ۵۹ تا ۶۶،
شانتی رنجن بھٹاچاریہ	بنگال کے یورپین مصنفین اردو	صحیفہ، ص ۸۶ تا ۱۱۰، جولائی
شاہد احمد دہلوی	محمد حسین آزاد دہلوی	ہندوستانی ادب، ص ۵ تا ۸، جولائی
″	منٹو	کتاب لکھنؤ، ص ۱۵ تا ۱۹، اگست
شاہد عشقی	بت گر یا بت شکن (سرشار صدیقی)	نئی قدریں، ص ۶۰ تا ۶۴،
شبلی پانی پتی، خواجہ اویس احمد	مولانا الطاف حسین حالی	امروز، ص ۱۳، ۱۳ دسمبر
شرر نعمانی	رشک رام پوری	نئی قدریں، ص ۱۴۱ تا ۱۴۶،

طاہر، تارا چرن رستوگی	کلام چکبست لکھنوی	شان ہند، ص ۹ تا ۱۲، نومبر
طاہر فاروقی، پروفیسر	ظفر کی شاعری	سر بر خامہ، ص ۱۰ تا ۱۷،
طیب انصاری	جوش ملیح آبادی	قومی زبان، ص ۳۱ تا ۴۰، دسمبر
ظہیر کاشمیری	نظیر اکبرآبادی	کوہستان، ص ۱۵ + ۱۲، ۳۰ جولائی
عارف، اخلاق حسین	شبلی کی قومی شاعری	آج کل، ص ۲۵ تا ۳۲، ستمبر
عالی، جمیل الدین	اس کے مرنے سے مرگئی دلی [۱]	قومی زبان، ص ۱۳ تا ۱۸، جولائی
عبدالرحمان، سید صباح الدین	مولانا شبلی نعمانی	خاتون دکن، ص ۱۱ تا ۱۹، اگست ستمبر
عبدالسلام	مولانا شرر اور جاسوسی عنصر	ساقی، ص ۱۹ تا ۲۲، اکتوبر نومبر
عبدالشکور، شیخ	غازی امان اللہ خاں	ہندوستانی ادب، ص ۱۹ تا ۲۴، جولائی
عبدالقوی دسنوی، پروفیسر	علامہ محوی صدیقی	قومی زبان، ص ۸۹ تا ۹۲، ستمبر
عبداللہ، پروفیسر محمد	نذر الاسلام کی شاعری	سیارہ، ص ۲۳ تا ۳۸، جولائی
عبدالمجید سالک	صلاح الدین احمد	ادبی دنیا، ص ۵ تا ۹، اگست
عبدالمغنی	ناؤس سہسرامی کا تغزل	نقوش، ص ۱۲۲ تا ۱۴۰،
عرش صدیقی	عارف عبدالمتین اور اس کی شاعری	نئی قدریں، ص ۲۵۷ تا ۲۶۰،
عزیز، پروفیسر غلام ربانی	غنیمت کنجاہی کی شاعری پر ایک نظر	مجلہ ادارہ تحقیقات پاکستان، ص ۹۵ تا ۱۰۸، جولائی
عزیز خاں، محمد	جمیل الدین عالی	نئی قدریں، ص ۲۶۳ تا ۲۶۵،
عصمت اللہ	آغاز [۲]	اردو زبان، ص ۷، جولائی
عطا کاکوی	اکبر دانا پوری	قومی زبان، ص ۹۲ تا ۹۶، اکتوبر

---

[۱] قومی زبان کے اس شمارے میں شاہد احمد دہلوی کی یاد میں عالی صاحب کے مضمون کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، محمد ایوب قادری، شتاق احمد قادری، مشتاق احمد، نصراللہ خاں عزیز، کے مضامین اور شاہد مرحوم کی خود نوشت اور ایک اداریہ تحریر بھی شامل ہے (صفحہ ۲ تا ۵۳)

[۲] اردو زبان کا یہ مولانا صلاح الدین نمبر ہے اس میں متعدد اہل علم حضرات کے مضامین ہیں۔ بعض مضامین کے حوالے الگ ہیں ان کے علاوہ مندرجہ ذیل اہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔ سجاد نقوی، مشتاق قمر، اقبال منہاس، راحش میتاز اور مولانا کے تبرکات بھی شامل ہیں۔



خیالِ مُسلسل ...

منصوبوں کی جانچ پڑتال .... اِمکانات کا تجزیہ ....
صورت حال کا جائزہ ..... ہمیں ہمیشہ ہی آپ کی ضرورتوں کو
بہتر سمجھنے کی فکر رہتی ہے۔ اس طرح ہماری تمام
کوششوں کا مقصد آپ کے مسئلوں کو بہتر سے بہتر جانچنا اور آپ کو
سُودمند مواقع فراہم کرنا ہے۔
مُلک ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ترقی کے اِس دَور میں بینکاری
کی ضروریات لامحدود ہیں —— ہمیں احساس ہے کہ
اس میدان میں ہم نے ابھی صرف ابتدائی
مراحل طے کئے ہیں —— اور ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔
اس کا ہمیں مُسلسل خیال رہتا ہے۔

UBL یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

UBL-46-193-66-UD

سہ ماہی "اردو"

اپریل ۶۸ء کے شمارے کی ایک جھلک

تذکرۂ مسرت افزا۔	قاضی عبدالودود
کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
بنجامن شلز	نیّر اقبال
اردوئے ہندی و ہندوستانی	ڈاکٹر شوکت سبزواری
قدیم فارسی فرہنگوں میں پیش از آریائی کلمات	ڈاکٹر محمد باقر
عربی تنقید کے بنیادی رجحانات	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی
نئی کتابیں	میرزا ادیب، ڈاکٹر اسلم فرخی، قدرت نقوی، محبوب سلمان شاہجہانپوری

مسلسل مضامین

تتمۂ پھول بن	تصنیف : محمد حیدر ابن جعفر ترتیب و مقدمہ: شیخ چاند ابن حسین
تذکرۂ ہمیشہ بہار	تصنیف : کشن چند اخلاص ترتیب : ڈاکٹر وحید قریشی
لغت کبیر اردو	بابائے اردو

قیمت فی پرچہ : تین روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ - کراچی ۱



گرمیوں میں
بہار
کا لطف!
SHARBAT
ROOH AFZA
گرمی کی زحمت اور سختی سے بچنے کے لئے
روح افزا کی تازگی بخش تاثیر سے فائدہ اٹھایئے اور
اس موسم میں اس کا مسلسل استعمال رکھئے۔ یہ خوش ذائقہ
فرحت بخش مشروب ہر شخص کو بھاتا اور گرمی میں
بہار کا سماں پیدا کرتا ہے۔
کوئی اور مشروب اس کا مقابل نہیں۔
روح افزا
مشروب مشرق
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ
ہمدرد
united
H.R.A.I/861

قومی زبان

کراچی

انجمن ترقی اردو

Monthly QAOMI ZABAN Karachi



مدیر : مشفق خواجہ
محمد مصلح الدین سعدی کے زیر اہتمام انجمن پریس سے شائع ہوا ۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

قومی زبان

جلد ۳۲ شمارہ ۶

جون ۱۹۶۸ء

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

قیمت: فی پرچہ ایک روپیہ قیمت: سالانہ دس روپے

زیرتعمیر اُردو کالج کیلئے عطیات

اب تک زیر تعمیر اُردو کالج کے لئے مبلغ تین لاکھ چوبیس ہزار نو سو پندرہ روپے جمع ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ماہ جو رقم بذریعہ فروخت رسائد موصول ہوئیں ان کی تفصیل یہ ہے:۔

پروفیسر خلیل اللہ صاحب وائس پرنسپل اُردو کالج کراچی	مبلغ ایک ہزار روپے
الائیڈ پبلشرز لمیٹڈ کراچی	مبلغ دو سو روپے صرف
بیگم صاحبہ جناب اکبر حسین صاحب کراچی۔	مبلغ پچھتر روپے صرف۔
جناب غلام علی صاحب راولپنڈی	مبلغ پچاس روپے صرف۔

فہرست

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
(سکریٹری انٹرنیشنل آرگنائزنگ کمیٹی)
جشن صد سالہ غالب

جشنِ غالب

عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین نے مجھے جشن غالب کی بین الاقوامی تنظیمی کمیٹی کا معتمد مقرر کیا تھا۔ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں نے یہ اعزاز بخوشی منظور کیا اور جشن غالب کی کمیٹیوں کی تنظیم کی غرض سے مندرجہ ذیل ممالک کا سفر کیا۔

۱۔ انگلستان ۲۔ امریکہ ۳۔ کناڈا ۴۔ فرانس ۵۔ اٹلی ۶۔ نیدرلینڈ ۷۔ چیکوسلواکیہ ۸۔ سوویٹ یونین ۹۔ ایران۔

انگلستان:۔ انگلستان میں میں نے جن عالموں سے رابطہ قائم کیا اور جنہوں نے میرے ساتھ مکمل تعاون کا وعدہ فرمایا۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) ۱۔ پروفیسر سی فلپس ڈائرکٹر اسکول آف اورنیٹل اینڈ افریکن اسٹیڈیز لندن ۲۔ پروفیسر اے جے آربری کیمبرج یونیورسٹی ۳۔ سر ٹینز روئے میکلین ممبر پارلیمنٹ ۴۔ پروفیسر ریبون اسپیر کیمبرج یونیورسٹی ۵۔ مسٹر رالف رسل، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹیڈیز لندن ۶۔ مسٹر کیبرنان۔ ایڈنبرا یونیورسٹی ۷۔ مسٹر ایس سی سٹن لائبریرین۔ انڈیا آفس لائبریری ۸۔ مس جین ریڈکلف۔ انڈیا آفس لائبریری ۹۔ مسٹر سائمن ڈگبی لندن یونیورسٹی۔

(ب) ان حضرات سے صلاح مشورے سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

(۱) انگلستان میں ایک قومی کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ جس کے صدر پروفیسر سی فلپس اور سکریٹری رالف رسل صاحب ہیں۔ ۲۔ غالب پر ایک سمینار منعقد کیا جائے گا۔ ۳۔ غالب سے متعلق ایک نمائش ہوگی۔ ۴۔ غالب کی زندگی اور ان کے کارناموں سے متعلق ایک آپرا پیش کیا جائیگا۔ ۵۔ غالب کی اردو تخلیقات کا انگریزی ترجمہ رالف رسل صاحب اور ڈاکٹر خورشید الاسلام نے مشترکہ طور پر کرلیا ہے جس کی اشاعت کا اہتمام یونسکو کر رہی ہے۔ ۶۔ میں نے برٹش میوزیم۔ انڈیا آفس لائبریری۔ ونڈسر پیلیس لائبریری اور انگلستان کے نیشنل آرکائیوز میں غالب کے ان تمام غیر مطبوعہ خطوط کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو لندن میں مقیم حکام کے نام لکھے گئے تھے۔ یہ تحقیق ابھی جاری ہے۔

امریکہ: میں دہلی یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اگست ۱۹۶۷ء میں این آربر (مشی گن امریکہ) گیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے دنیا کے ممتاز مستشرقین اور علمائے اردو سے جشن صد سالہ غالب

اقامتی اردو کالج

کی

تعمیر میں حصہ لیجیے

اردو آپ کی

اردو کالج آپ کا

اس کالج کی زیرِ تعمیر عمارت میں ایک اینٹ آپ بھی رکھیے

اختر حسین

(اختر حسین)
ہلالِ پاکستان
صدر انجمن ترقی اردو

(۵) اس قسم کے کام کو ایک مستقل حیثیت دینے کے لیے یونسکو سے درخواست کی جائے کہ وہ کسی ممتاز ہندوستانی محقق کو اردو سے متعلق ماخذ کا تمام نادر ذخیرہ جو ساری دنیا میں بکھرا پڑا ہے اس کا جائزہ کرلے تمام ضروری معلومات کے ساتھ شائع کرے۔ اردو کے ان تمام مخطوطات، نایاب کتابوں اور قدیم اخبارات و رسائل کی مائیکرو فلمیں بنائی جائیں جو ہندوستان، پاکستان، مغربی جرمنی، فرانس، ویٹی کن، انگلستان اور آئرلینڈ کے ذاتی اور پبلک کتب خانوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان ماخذ و مصادر سے ان تمام عالموں کی مدد ہوگی جو ہندوستان کی تاریخ یا ارتقا کے کسی شعبہ پر بھی تحقیق کر رہے ہوں گے۔ ایشیا کے اس تہذیبی سرمائے کو جو آہستہ آہستہ ضائع ہوتا جا رہا ہے، محفوظ کرنے کے سلسلے میں یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔

اس یونسکو سمینار نے بھی جو کابل میں ۳۱ جولائی تا ۴ اگست، ۱۹۶۷ء منعقد ہوا تھا ان نوادر کے تحفظ کی فوری اہمیت پر زور دیا تھا۔

۶۔ یونسکو کے ماہرین کے ایک جلسے نے جو کہ پیرس میں ۲۴ تا ۲۸ اپریل، ۱۹۶۷ء کو وسط ایشیا تہذیبوں کے مطالعے کی غرض سے ہوا تھا۔ یہ تجویز کیا تھا کہ ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی کے درمیان وسط ایشیائی ادبیات کے مطالعے کا کام جس کی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی ہے، جلد شروع ہونا چاہیے۔ یہ بات متفقہ طور پر مان لی گئی تھی کہ اس عہد کا مطالعہ ۱۹۷۰۔ ۱۹۷۱ء ہونے والے پروجیکٹ کے لئے تجویز کیا جائے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالب (جن کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا) وسط ایشیائی جمہوریتوں، ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور ایران کے درمیان تعاون اور باہمی ربط و تعلق کا بہترین ذریعہ بن سکتے ہیں کیوں کہ غالب نے اردو اور فارسی دونوں میں لکھا تھا اور ان کے آبا و اجداد سمرقند سے ہندوستان آئے تھے۔

ان باتوں کے پیش نظر یونسکو سے درخواست کی جائے کہ وہ دو فیلوشپ منظور کرے جو دنیا کے دو ممتاز عالموں کو دیے جائیں۔ تاکہ وہ یورپ کی اہم زبانوں میں غالب کی تخلیقات کا ترجمہ کر سکیں۔

۷۔ یونسکو ایک غالب البم کی اشاعت میں جو ان کی تحریروں اور تصویروں کے عکس پر مشتمل ہوگا امداد کرے۔

۸۔ یونسکو ایک ایسی کتاب کی تیاری کے لئے امداد دے جس میں دو سو صفحات کے اندر غالب کی زندگی اور ان کے کلام کا جائزہ ہو۔ یہ کتاب عام پڑھنے والوں کے لئے ہوگی اور دنیا کی تمام اہم زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوگا۔

۹۔ یونسکو غالب اور ان کے عہد سے متعلق ایک ایسے ادبی میوزیم کے قیام کے لئے مدد کرے جس میں کتابوں کے عکس، مائیکرو فلم، قطعات، لباس، قلمی تصویریں۔ اصلی خطوط اور غالب اور ان کے معاصرین کی تخلیقات کے پہلے ایڈیشن رکھے جائیں۔

۳۔ لی آن میں مندرجہ ذیل حضرات سے ملاقات ہوئی جنہوں نے میرے اعزاز میں ایک لنچ پر خاص طور سے مدعو کیا تھا۔

۱۔ پروفیسر جینے نے بہ ذات ریکٹر آف ایجوکیشن و ڈین فیکلٹی آف لیٹرز یونیورسٹی لی آن۔

کے سلسلے میں تبادلہ خیالات کیا۔

یہاں بھی ایک قومی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی جس کے صدر پروفیسر ناصر ن براؤن سیکرٹری چودہری محمد نعیم اور اراکین میں پروفیسر عبدالرحمان بارکر پروفیسر رابن سن اور پروفیسر داؤد رہبر شامل ہیں۔

امریکہ میں جشن غالب کے سلسلے میں مندرجہ ذیل پروگرام بنایا گیا ہے۔

(۱) غالب کی ایک ببلوگرافی مرتب کی جائے ۲۔ غالب سے متعلق تنقیدی نگارشات کا ایک انتخاب مرتب کیا جائے۔ ۳۔ ۱۹۶۹ء (سال جشن) ہندوستان یا پاکستان کے کسی عالم کو اردو ادب پر کام کرنے کے لئے مدعو کیا جائے۔

کناڈا، میں مونٹریل کے ادارہ علوم اسلامیہ میں گیا اور جشن غالب کے سلسلے میں ان حضرات کا تعاون حاصل کیا۔

(۱) پروفیسر عبدالرحمان بارکر صدر شعبہ علوم اسلامیہ میکگل یونیورسٹی ۲۔ پروفیسر عزیز احمد۔ یونیورسٹی آف ٹورنٹو۔

فرانس:۔ (الف) پیرس میں میں نے جن حضرات سے رابطہ قائم کیا۔ ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) پروفیسر آندرے گم برے تیر پروفیسر اردو نیشنل اسکول آف اورنٹیل لینگویجز۔ پیرس ۲۔ کاؤنٹ ہنری ڈی لا باستید ھیڈ آف مغرب سولیزیشن اسکول آف اورنٹیل لینگویجز ۳۔ ڈاکٹر ایم لاکومب۔ ڈائرکٹر آف دی انسٹی ٹیوٹ آف انڈین سولیزیشن ۴۔ ایم پے لاؤ ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز۔

(ب) پروفیسر اندرے گم برے تیر غالب کی دس غزلوں کا ترجمہ فرانسیسی میں کر رہے ہیں۔ ان کا نام یونسکو نے منظور کر لیا ہے

(ج) پروفیسر گم برے تیر جشن غالب کی فرانسیسی قومی کمیٹی کے سکریٹری ہوں گے۔

ڈاکٹر لاکومب پروفیسر جے فیوزا اس کمیٹی کے صدر ہوں گے۔

۳۔ یونیسکو:۔ یونیسکو پیرس میں مندرجہ ذیل حضرات سے بہت اہم گفتگو ہوئی۔

(۱) ڈاکٹر طہٰ حسین پارٹی سی پیشن پروگرام ۲۔ مسٹر ایس روزنتھال پبلسٹی پروگرام ڈائرکٹر آرکے لوائے۔ ۳۔ ڈاکٹر موروشی ڈپٹی سنٹرل ایشیا پروگرام ۴۔ مسٹر طہمان او شیلا ڈویژن ۵۔ جناب معظم حسین ایجوکیشن۔

۴۔ یونسکو کے ارباب حل وعقد سے گفتگو کے دوران مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی گئیں۔ اگر یہ ہماری نیشنل کمیشن کی جانب سے پیش کی جائیں تو یونیسکو ان پر ہمدردانہ غور کرے گی

۱۔ یونسکو سے درخواست کی جائے کہ جشن غالب کی تقریبات کو اپنی منظور شدہ تقریبات کی فہرست میں شامل کرے ۲۔ یونسکو ایک قرار کے ذریعہ صد سالہ جشن غالب کو مع اس کے مالی پہلوؤں کے تسلیم کرے۔ ۳۔ یونسکو مندرجہ ذیل امور کے لئے رقم فراہم کرے۔

(الف) غالب پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد کیا جائے جو یونسکو کے پارٹی سی پیشن پروگرام کے تحت ہو۔

(ب) اس جشن میں حصہ لینے کے لئے امریکہ، انگلستان، سوویت یونین، فرانس، ہالینڈ، ایران، افغانستان، چیکوسلواکیہ، پاکستان وغیرہ سے آنے والے عالموں کو یونسکو سفر خرچ فراہم کرے۔

(ج) یونسکو ان مقالات کو غالب پر ایک یادگار جلد کی شکل میں شائع کرے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی

اقبال کا پیغام

بسم اللہ ، اقبال ہی کے ایک شعر سے ہوتی ہے ؎

با پرستارانِ شب دارم ستیز   باز روغن در چراغِ من بریز

اسلام اور مسلمانوں پر اغیار کی عنایتوں کی داستان پرانی بھی ہے اور طول طویل بھی۔ یہ عنایتیں اور نوازشیں مختلف وقتوں میں، مختلف شکلوں میں، مختلف جگہوں پر، مختلف طریقوں سے ہوتی رہی ہیں۔ کبھی اسلام کی تعلیم کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی، کبھی حضور کی ذات اقدس پر، تدلیس اور غلط بیانی کا سہارا لے کر ناروا حملے جائز رکھے گئے۔ کبھی مسلمانوں کو جابر ظالم وحشی اور علم دشمن ثابت کرنے میں عدل و انصاف اور حق و صداقت کے اصولوں کو طاق پر رکھ دیا گیا۔ دور کیوں جایئے برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے اوراق اُلٹ کر دیکھ لیجئے کہ ان پر کیسی کیسی گزری، اور کیا کیا نہ بیتی۔ لیکن خدا کا فضل ہمیشہ شامل حال رہا۔ ہر آڑے وقت میں، ہم میں ہی، ایک نہ ایک شخص ایسا ضرور پیدا ہو گیا جس نے ہوا کا رخ بدل کر رکھ دیا، اور آئی بلا ٹل نہیں گئی تو اس کی شدتیں، کم از کم، اتنی ضرور کم ہو گئیں کہ ضرر رساں نہ رہیں۔ اقبال بھی انھیں میں سے ایک ہیں۔

علامہ اقبالؒ کی سیرت و شخصیت، علم و فضل، فکر و نظر، فلسفہ و شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے ان پر لکھنے والوں میں بڑے بڑے، اچھے بہت اچھے، جوان نوجوان، بوڑھے اور ادھیڑ سب شامل ہیں۔ اقبال کے انداز نظر، طریق کار، اور اسلوب بیان کا مشکل ہی سے کوئی پہلو ایسا ملے گا جسے حتی المقدور سمجھنے سمجھانے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ لیکن گنتی کی چند کتابوں کو چھوڑ کر باقی سب آواز بازگشت ہی نظر آتی ہیں۔ مضامین اور مقالوں کا بھی یہی حال ہے اس صورت حال کو امید افزا کہنا مشکل ہے۔ پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے تو اس مشکل کا حل کیا ہے؟

حل مشکل نہیں بشرطیکہ چند بنیادی باتیں نظر انداز نہ کر دی جائیں۔

پہلی یہ کہ اقبال کے کلام کے ساتھ، ان کے خطبات، استفسارات، جوابات، یہاں تک کہ اُن کے خطوط کے ایک

۲۔ پروفیسر دیبراس . . . . . . پروفیسر انگریزی۔
۳۔ ڈاکٹر رانڈری . . . . . . پروفیسر سنسکرت
۴۔ ڈاکٹر دباریر . . . . . . پروفیسر چینی زبان
۵۔ ڈاکٹر اجین . . . . . . پروفیسر فارسی
۶۔ ڈاکٹر ای سیف . . . . . . پروفیسر مسلم تہذیب و تمدن
۷۔ ڈاکٹر اسے لیر . . . . . . پروفیسر جاپانی زبان
۸۔ مسٹر سولار بکیڑی کابینہ کے صدر

یہ طے پایا کہ یونیورسٹی آف پی آن میں صد سالہ جشن غالب کمیٹی زیر صدارت ڈاکٹر ٹیلر ڈاٹ تشکیل کی جائے۔

(بشکریہ۔ ترقی اردو۔ حیدرآباد دکن)

ہے "نرگسیت" ہے "زاغیت" ہے "ابلیسیت" ہے۔

اقبال کا پیغام کیا ہے؟

اس سیدھے سادے سوال کو (بے سمجھے بوجھے جواب دے دے کر) کچھ اس درجہ الجھا دیا گیا ہے اور تاویلات کا سہارا لے کر اتنا پیچ در پیچ اور مشکل بنا دیا گیا ہے کہ اس کی حیثیت ایک ایسے عقیدے کی ہو گئی جس کا حل آسان نہیں رہا اس صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اقبال کے کلام میں خود ان کا "پیام" تلاش کرنے کے بجائے، اپنے اپنے، پہلے سے سوچے ہوئے "خیال" کے جواز کی جستجو میں مصروف ہو جاتے ہیں اور جوئندہ یابندہ کے مصداق اپنی اپنی اس کوشش میں اپنی دانست میں کامیاب بھی۔ "ریسرچ" کے بارے میں رشید احمد صدیقی نے ایک بہت عمدہ اور بڑے پتے کی بات کہہ دی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "ریسرچ" میں جس چیز کی تلاش مقصود ہوتی ہے۔ وہ تو جہاں کی تہاں رہ جاتی ہے البتہ دوسری باتیں ضرور دریافت کر لی جاتی ہیں"۔ اقبال پر جو کام ہو چکا ہے اس کا بیشتر حصہ کچھ اسی قسم کا ہے۔ اقبال کا پیغام، لمبا چوڑا نہیں، پیچیدہ نہیں، مشکل نہیں، آسان ہے۔ سیدھا سادا ہے۔ مختصر ہے۔ مگر ہے بڑا جامع اور مانع پیغام یہ ہے:

"بہ مصطفیٰ برساں خویش را"

اقبال کا سارا کلام، اقبال کا سارا فلسفہ اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ اس پیغام کے مخاطب حسین احمد مدنی ہی نہیں ہم سب ہیں۔ مسلمان ہی نہیں، دنیائے انسانیت ہے۔ سرکار دو عالمؐ حبیب رب العالمین، رحمت اللعالمین ہیں۔ اُس سے زیادہ نادان، تنگ نظر، تنگ ظرف، کوتاہ بیں اور کون ہوگا جو سرور کائناتؐ کو فقط "رحمت المسلمین" سمجھے اور بنی نوع انسان کو ان نعمتوں اور برکتوں سے محروم کر دے جو اس کا حق تھیں، ہیں اور رہیں گی۔ یہ دوسری بات کہ وہ اپنے اس حق سے غافل رہے اور اسے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اقبال کی شاعری کو الف سے ے تک پڑھ جائیے۔ یہی ایک آواز بار بار، بہ تکرار گونجتی ہوئی آپ کو محسوس ہوگی۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را — خویش را بہ مصطفیٰ برساں

اقبال کو "مرد مومن" یا "انسان کامل" کا تصور، کہاں سے ملا، اور کس کا طفیل ہے؟ نٹشے وغیرہ کا طفیل ہے اس بے پناہ عقیدت و محبت، شیفتگی اور گرویدگی کا جو اس برہمن زادے کو سرور کائنات، سرکار دو عالم، حبیب خدا، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے اور جس کا پرتو ان کے فرمودات میں قدم قدم پر جھلکتا نظر آتا ہے، مثال کے طور پر دریا سے کچھ قطرے پیش ہیں۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است   اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است

ایک لفظ کا مطالعہ اس نظر سے کیا جائے کہ یہ سب ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں جو بدلتے ہوئے علمی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی حالات کے زیر اثر گھٹتی بڑھتی، اور ضرورت کے مطابق مڑتی اور خم کھاتی رہی ہیں۔ مرض سے افاقہ، افاقہ سے صحت تک کے درمیانی وقفوں میں دوائیں اور غذائیں ہی نہیں بدلتیں اور بدلی جاتی ہیں، پرہیز کی ہدایتوں میں بھی ردو بدل کیا جاتا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ اچھا معالج مرض اور صحت پر ہی نہیں ان دونوں کی رفتار پر بھی کڑی نظر رکھتا ہے۔ رفتار ہی کو دیکھ کر نسخہ میں ردو بدل کیا جاتا ہے۔ اقبال پر تضاد فکر کا الزام لگانے والے اس موٹی سی بات کو اتنی چھوٹی اور حقیر سمجھتے ہیں کہ اسے خاطر ہی میں نہیں لاتے اور جو جی میں آتا ہے بکتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری یہ کہ "اقبال شناسی" کے لیے "خبر" اور "نظر" یکساں طور پر ضروری ہیں۔ محض "خبر" پر بھروسا کر لینا، اسی کو کار کشا کارساز سمجھ بیٹھنا اور "نظر" کو سرے سے نظر انداز کر دینا کوئی معقول بات نہیں۔ خصوصاً اس زمانے میں جب "عقل" ہی رہبر کامل مان کر اس کے اتباع کو حاصل حیات اور ذریعہ نجات فرض کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ بقول اکبر (الہ آبادی) ع

علم ہم کو ملا ہے تپ کر، عقل ہم کو ملی ہے تل کر

تیسری۔ اس دور میں جب جنسی کج روی اور نفسیاتی بیماریوں تک کا سراغ لگا لیا گیا ہے "روح کی بیماریوں" سے اغماض و انکار میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرف ہم نے توجہ ہی نہیں کی ہے، کاش ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کے دعویدار "اپنا دکھ درد" بھی سمجھنے کی کوشش کرتے جو اپنا نہیں اپنوں کا نہیں دوسرے کا کیا اور کیسے ہو سکتا ہے۔

چوتھی۔ اقبال نے اپنی شاعری میں جو اصطلاحیں اور علامتیں استعمال کی ہیں انھیں "آواز" اور "رنگ" سے آگے کچھ سمجھنا ذوق شعری اور سخن شناسی دونوں کی توہین ہے۔ "بادہ و ساغر" کے ان خوش رنگ پردوں کے پیچھے فکر و فن کی جو دنیا اقبال نے بسائی اور خون جگر سے سجائی ہے، وہ انسانیت کو اس مرکز کی طرف متوجہ کر دینا چاہتی ہے جو اس کے شایان شان ہے۔ انسان، خلیفۃ اللہ ہے، اشرف المخلوقات ہے۔ اس کے لیے عزائم میں، ارادوں میں، حوصلوں میں پختگی اور مضبوطی ہی کافی نہیں، یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے "مقاصد" بھی بلند ہوں۔ اقبال نے اپنی شاعری کا سارا زور اسی پر صرف کر دیا ہے۔ ہوا اور خلا، چاند اور ستاروں کی تسخیر، کوئی ایسا کارنامہ نہیں، جو انسان کے لیے واقعی باعث فخر ہو۔ "چھوٹے موذیوں کو" مار کر خوش ہونا اور اس پر فخر کرنا، اس قوت، سطوت اور اقتدار کی توہین ہے، جن سے انسان نوازا گیا ہے۔ اقبال نے نہ صرف "بڑے موذی" سے ٹکرانے، اور اسے زیر کر کے قابو میں لانے کی تلقین کی ہے۔ بلکہ وہ داؤں پیچ بھی بتا دیئے ہیں جن کی مدد سے "اس دیو بے زنجیر" کو قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ اقبال ایسی شاہینی "پر لعنت بھیجتے ہیں جو" نہنگ و اژدہا و شیر نر کے مار لینے ہی کو اپنی معراج سمجھے۔ یہ "شاہینی" نہیں "روباہی"

ام عمارہ

اقبال کی شاعری میں عورت کا تصوّر

اقبال بڑے شاعر ہیں، اقبال اردو کے بہت بڑے شاعر ہیں، اقبال عصرِ جدید کی آبرو ہیں ۔ آج تک عصرِ جدید نے ان سے بڑا شاعر نہیں پیدا کیا ۔ یہ ہیں وہ باتیں جو اقبال کے متعلق کہی اور سنی جاتی ہیں ۔ اور کوئی بھی انھیں باطل قرار نہیں دے سکتا ۔

یہ واقعہ ہے کہ اقبال کو اگر ان کی شاعری کے آئینے میں دیکھا جائے تو ان کے یہاں فکر و فلسفہ کا وہ نکھار نظر آئے گا جو قدیم شاعروں میں صرف غالب کے یہاں نظر آتا ہے اور ہمارے آپ کے عہد میں تو اب بھی اقبال ہی اقبال نظر آتے ہیں ۔

فکر و فلسفے کی یہی گہرائی اور گیرائی تھی جس کی بدولت غالب کو قطرے میں دجلہ نہ دیکھنے والی آنکھ دیدۂ بینا نہیں بچوں کا کھیل نظر آتی ہے ۔ اور اسی فکر نے اقبال کو اقبال بنایا ۔ ان کی شاعری میں بڑی وسعت ہے، وہ صرف ذات میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتے ۔ ساری کائنات ان کی شاعری کا محور ہے ۔ اور اس کائنات کے بسنے والوں میں سب سے اہم مخلوق مرد اور عورت کی ذات ہے ۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ شاعری کی دنیا میں ہمارے شعراء نے کائنات کی اس نصف بہتر یعنی عورت کو کن ناموں سے پکارا ہے کس عنوان سے یاد کیا ہے ۔ اور اسے کون سا مقام عطا کیا ہے ۔ قدیم شاعری غزلوں پر مبنی ہے اور غزل میں محبوب کبھی بھی مونث نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ شاعرات بھی جب غزل میں اپنے جذبات کا اظہار کرتی تھیں تو ان کا انداز بیان کسی مرد سے قطعی مختلف نہیں ہوتا تھا ۔ یہ تھی عورت کی تہی دستی اور کم ہمتی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے روپ میں پیش کرنے سے عاجز تھی ۔ کیونکہ شعر کی اچھائی کے لیے جو معیار تھا ۔ اس میں اگر عورت داخل ہو جاتی ہے ریختہ ریختی سے بدل جاتا ہے ۔ اور یہ ریختی کیا ہے ۔ آپ اور ہم سب ہی اس سے واقف ہیں ۔

لیکن جیسے جیسے وقت بدلا حالات بدلتے گئے اور تہذیب کے آزر نے جب نئے نئے صنم تراشے تو اردو شاعری

من اے میرِ امم داد از تو خواہم — مرا یاراں غزل خوانے شمردند

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر — روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور اگر بینی حسابم ناگزیر — از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر
گرد تو گردد حریم کائنات — از تو خواہم یک نگاہ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی — کشتی و دریا و طوفانم توئی
آہوم زار و زبون و ناتواں — کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہاں
اے پناہ من حریم کوئے تو — من بہ امیدے رمیدم سوئے تو

"احمد شجاع یہ سوچ کر میں اکثر مضطرب رہتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسول اللہؐ کی عمر سے زیادہ نہ ہوجائے"

"مسلمانوں کی بہترین تلوار دعا ہے اس سے کام لینا چاہیئے اور نبی کریمؐ پر درود بھیجنا چاہیئے"

حافظ محمد فضل الرحمان انصاری کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"عربی زبان میں مہارت پیدا کیجئے۔ اسلامی علوم، اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ، تصوف، فقہ، تفسیر کا بغور مطالعہ کرکے محمد عربیؐ کی روح تک پہنچنے کی کوشش کیجئے"

ایک اور خط میں سید راس مسعود سے مخاطب ہیں:

ڈیر مسعود

چراغ سحری ہوں، بجھا چاہتا ہوں، تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلم بند کرجاؤں تاکہ قیامت کے دن آپ کے جد امجد، حضور نبی کریم کی زیارت مجھے اس اطمینان خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی خبر حضورؐ نے ہم تک پہنچائی۔ کوئی خدمت بجا لا سکا۔ سید محفوظ علی بدایونی کے نام ایک خط میں یہ سطریں نظر آتی ہیں۔

"میں تو اس قابل نہیں کہ حضورؐ کے روضہ مبارک پر یاد بھی کیا جا سکوں۔ تاہم حضورؐ کے اس ارشاد سے جرارت ہوتی ہے (الصالح لی) یعنی گنہ گار میرے لیے ہے۔

غلام بھیک نیرنگ کو تبلیغی کاموں کی داد اس طرح دی جاتی ہے۔

"جس جانفشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے اس کا اجر حضور سرورِ کائناتؐ ہی دے سکتے ہیں"

کیا یہ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام نہیں، کہ اسرار خودی کا مترجم ڈاکٹر نکلسن دیباچہ میں یہ کہنے پر مجبور ہو کہ:

"یہ مثنوی زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمدؐ اور قرآن کی طرف بلاتی ہے"

اور ہم ان کے کلام کے مطالعہ میں "محمدؐ اور قرآن حکیم" سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھیں۔ جو ان کے پیام کا محور و مرکز ہیں

اور ابتری آجاتی ہے ؂

بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

اقبال عورت کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں لیکن کس انداز میں۔ ان کے نزدیک عورت کائنات کی بساط پر پھیلی ہوئی تصویر کا سب سے خوبصورت رنگ ہے ۔ اس کے وجود سے زندگی کا سوز دروں ہے۔ اس کی مشت خاک شرف میں ثریا سے بڑھ کر ہے۔ وغیرہ وغیرہ

لیکن عورت جس کے شعلے سے شرار افلاطون ٹوٹ سکتا ہے ۔ اقبال کے نزدیک مکالمات فلاطون لکھنے یا افلاطون بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے ؂

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

تہذیب جدید اور تعلیم مردوں کے لیے ترقی کا زینہ ہے ۔ خود اقبال اسی تعلیم کو حاصل کر کے اسی نئی روشنی سے اکتساب کر کے اپنی چشم تنگ کو کثرت نظارہ سے وا کرتے پھرے اور انھوں نے زندگی کا نئے نئے عنوان سے مطالعہ کیا۔ لیکن عورت کے باب میں ۔ یہی انھیں سم قاتل ۔ اور یہی تعلیم انھیں اس کی نسوانیت کی موت نظر آتی ہے ۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

عورت ان کے یہاں ایک آزاد اور زندہ روح کا نام نہیں بلکہ روایات اور اصولوں میں جکڑی ہوئی پیدا ہوئی ہے ۔

انھوں نے عورت کو مرد کے مقابلے میں بڑا خفش سے زیادہ نہیں سمجھا ہے ان کے نزدیک تو عورت میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے جوہر کی نمائش کر سکے کیونکہ ان کے خیال میں عورت اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے بھی مرد کی رہین منت ہے ؂

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر

کے ناخداؤں نے بھی شعر و سخن کا چولا بدلا ۔ نئے نئے موضوعات اور نئے نئے عنوانات کے ساتھ جدید شاعری ہمارے آئی اور عورت جو اردو شاعری میں ریختی کے روپ میں موجود تھی یا مثنویوں کا کردار تھی ۔ اس جدید دور کی شاعری میں براہِ راست نظموں کا عنوان بنی ۔

حالی کا اردو شعر و ادب پر بڑا احسان ہے انھوں نے اپنے فکر و فن سے اسے بہت کچھ سنوارا اور نکھارا۔ لیکن عورت کے معاملے میں وہ زیادہ سے زیادہ اس کی چپ کی داد دیتے نظر آتے ہیں اور یا بہت خوش ہوئے تو ماؤں، بہنوں، اور بیٹیوں کو دنیا کی عزت و حرمت کا امین قرار دے کے مطمئن ہو جاتے ہیں ۔ اکبر کے خیالات عورت کے بارے میں کیا تھے ۔ اس کا ذکر ہم یہاں پر نہیں کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اکبر اور اقبال کے مسلک میں بنیادی فرق ہے ۔ اور یہ اکبر کا کیا ہے ۔ ان کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ وہ بڑے ہی تنگ دل اور تنگ نظر تھے ۔ اور جب نگاہوں میں وسعت نہ ہو تو دلوں میں وسعت کہاں سے آ سکتی ہے ۔

خیر یہ تو تھیں اکبر کی باتیں جن کی تنگ دلی اور تنگ نظری مسلم الثبوت ہے ۔ آیئے اقبال کی باتیں کریں ۔

اقبال ۔ جنھیں قلب و نظر کی وسعت میں کائنات کی وسعت نظر آتی ہے ۔ تو دیکھیں کہ اس وسیع النظر شاعر نے جب کائنات کی عورت کو اپنا موضوع بنایا تو کس وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے ۔

اقبال بڑے وسیع النظر اور وسیع القلب سہی لیکن عورت کے باب میں وہ ہمیں لکیر کے فقیر نظر آتے ہیں ۔ انھوں نے بھی عورت کو شرافت و پاکبازی کا ایسا مجموعہ قرار دیا ہے جس کی نہ خوبیاں ہی اس کی اپنی ہیں اور نہ اس کی کمزوریاں ہی اس کی اپنی ہیں گویا وہ ایسی موم کی گڑیا ہے جس کے افعال اور کردار کی تمام تر اچھائیوں اور برائیوں کے ذمہ دار مرد ہیں ۔

ان کے نزدیک عورت کا وجود ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل بھی مردوں ہی کی عقل کا رہینِ منت ہے ۔ گویا عورت معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں برابر کی شریک نہیں بلکہ محض مٹی کی مورت ہے جو اقبال کی نظر میں بنیادی طور پر پاکباز اور شریف اور بے قصور ہے ۔ اور جس کی اشک شوئی کے لیے اس کی شرافت کی گواہی انھوں نے مہ و پرویں تک سے دلوادی ہے ۔

قصورِ زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں

اقبال بھی عورت کو خلوت کی زینت سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں اس دور کی رسوائی اس جلوت کی ہوس کی بدولت ہوتی ہے جہاں نگاہیں تو روشن ہو جاتی ہیں لیکن دل کا آئینہ تکدر سے پاک نہیں نظر آتا ہے ۔ ان کی وسیع النظری تو یہ ہے کہ عورت کو چاہیئے کہ اپنے وجود کو محدود سے محدود تر کر دے اور یہی نہیں انھوں نے عورت کے ذوقِ نظارہ کو بھی حدود کا پابند خیال کیا ہے ۔ ان کے خیال میں اگر ذوقِ نظر متعینہ حدود سے آگے بڑھ جاتا ہے تو افکار میں پراگندگی

نوشاد نوری

اقبال ـــــ تاریخی عظمت

اقبال کا تفکر ذو سریع الحس شیشۂ خوردبینی میں واضح نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب تاریخ ایک جنگ عظیم سے نکل کر دوسری جنگ عظیم میں داخل ہو رہی تھی ـــ اور "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" کے اقبال پر یہ واضح ہونے لگا تھا کہ "گہر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند" اور

میں اصل کا خاص سومناتی   آبا مرے لاتی و مناتی

کہنے والے اقبال نے اعتراف کر لیا تھا کہ "

محمد عربی سے ہے عالم عربی

اور اسی سنگ میل سے، اپنی لوح تربت تک اقبال کا سارا سفر، یقین و شکوک، اعتراف و استکبار اور رد و قبول میں گزر گیا ہے ہر محسوس کرنے والے کی طرح، ہر سوچنے والے کی طرح اور ہر مفکر کی طرح،

اقبال کے فکری تضاد کا مسئلہ، اقبال کے عقائد کی روح کو سمجھے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ اور جنھیں اقبال کے غور و فکر کی اساس سے جذباتی ربط اور معنوی ہم آہنگی رہی ہے وہ انتہائی خلوص بن اقبال کے اس شعر کی تشریح بن گئے ہیں۔

فکر انساں بت پرستے بت گرے
ہر زماں در جستجوئے پیکر ے

اور انھوں نے اپریل ۱۹۳۸ء کے بعد ہی اقبال کا بت تراش کر اپنے اپنے طاقچوں اور آتش دانوں پر بٹھا رکھا ہے۔ جنھیں اتفاق سے اقبال کے شعلۂ تفکر کی آنچ تک نصیب نہ ہو سکی ان کے لیے اقبال سے زیادہ دقیق اور متضاد کوئی دوسرا شخص پیدا ہی نہ ہو سکا۔ ناقدین کی یہ کیفیت قابل رحم ہے اور اقبال پر ان کی مطبوعات کا ایک بڑا ذخیرہ قومی سرمائے کے بجائے قومی خسارہ بن گیا ہے۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے۔

ہم اقبال کو ان کے پیغامات کے پیغمبرانہ پس منظر میں مشروط طور پر دیکھتے ہیں۔ کیونکہ جہاں اقبال نے یہ دعویٰ

اقبال کے یہاں عورت ایک مجہول اور مظلوم شے ہے اس کی ذات ایک ایسا مسئلہ ہے جو لاینحل ہے اس کی تنہا اس کی تعلیم سب کچھ انھیں بیکار نظر آتی ہے۔ ان کے لیے عورت کا تنہا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ چاہے وہ تعلیم مزین ہو یا تہذیب جدید سے آراستہ وہ عورت کو اس کی بے دست و پائی کا یقین دلانا چاہتے ہیں ؎

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

حالی اور ان کے معاصر کس حد تک آزادیٔ نسواں کے حامی تھے ہمیں اس سے بحث نہیں۔ آیئے ہم یہ دیکھیں کہ ایک عہد گزر جانے کے بعد اپنے زمانے میں جب اقبال نے آزادیٔ نسواں پر قلم اٹھایا تو ان کے خیالات کیا ہیں ہمیں یہ دیکھ کے یقیناً تعجب ہوتا ہے کہ ان کے خیالات بھی کسی روایتی مرد سے زیادہ روشن نہیں ہیں۔ اور شاعر مشرق کی تمام رجائیت اور وسیع النظری ہمیں آزادیٔ نسواں کے باب میں تنگ نظری اور رجعت پرستی کے سمندر میں غوطے لگاتی نظر آتی ہے۔

ان کی مصلحت کوشی انھیں کھلم کھلا کچھ کہنے سے روکتی ہے۔ کیونکہ انھیں ڈر ہے کہ کہیں تہذیب کے فرزند انھیں تنگ نظر نہ سمجھیں اس لیے نہایت عقلمندی سے اپنی معذوری کا اعتراف کرتے ہوئے عورت کو جسے وہ پہلے بھی نیک کمزور سیدھی اور معصوم کہتے آئے ہیں۔ بڑے اطمینان سے زمرد کا گلوبند پہنا دیتے ہیں ؎

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردان خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

عورت جو کارگاہ ہستی میں مردوں کے دوش بدوش چلنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور جس کے کارناموں سے تاریخ عالم کے ابواب روشن ہیں وہ اقبال کو دنیا کی سب سے مظلوم و معتوب مخلوق نظر آتی ہے۔ جس کے لیے وہ غمناک اور افسردہ نظر آتے ہیں۔ جس کی مظلومیت انھیں ایک ایسی گرہ نظر آتی ہے جسے ان جیسا صاحب نظر بھی کھول لینے سے عاجز ہے ؎

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

○

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں　　اور

یہی صفات اقبال کے سارے فکر و فلسفے کی عروق و شریان میں رواں دواں ہیں ۔ اور یہی صفات اقبال کے علم، فقر، عشق خودی، مرد مومن اور مرد قلندر کی تعبیر کرتے ہیں ۔

علم را بر تن زنی مارے بود

علم را بر دل زنی یارے بود　　اور

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے

ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم

اس کی بڑھتی ہوئی بیباکی و بے تابی سے

تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم　　اور

عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفیٰ

عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود

عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک

عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

اور　　خودی کا سر نہاں لا الٰہ الا اللہ

خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

اور　　مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اور　　مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر ــ اور اقبال کی نظر میں ان عقائد کے بغیر نہ کائنات کا کوئی معنوی وجود ہے اور نہ زندگی کا کوئی معقول جواز ۔

تری نگاہ میں باقی نہیں خدا کا وجود

میری نگاہ میں باقی نہیں وجود تیرا

کیا ہے کہ

وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں اگر ہوتا
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

وہیں

یہ بھی کہا گیا ہے کہ

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور
ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف

اور

ہم اقبال کو اہلِ خرد مانتے ہیں اور کوئی اہلِ خرد اصول سے مستثنیٰ نہیں اور اقبال کا سارا وجود "ایک اضطراب مسلسل غیاب ہو کہ حضور" میں محدود اور متحرک ہے۔

اقبال کے غور و فکر کی اساس پر روشنی ڈالنے کا رجحان غلط ہے، بلکہ اس بنیاد کی شعاعیں اقبال کی پتلیوں میں نفوذ کر گئی تھیں اقبال کے دل میں اتر گئی تھیں اور اقبال کے ہونٹ سے روشنی بن کر ابل پڑی تھیں۔

عالم کا موجود اور فقر کا موجود اور
اشهد ان لا اله، اشهد ان لا اله

اور

اقبال نے زمانے کی سخت گیری کا تجزیہ نہایت سادہ الفاظ میں کیا تھا۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

اور

اقبال نے اپنے تگ و تاز اور جد و جہد کی خود حد بندی کی تھی کہ

مرد مسلماں ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

اور

اقبال کی ساری فکری سرگرمیاں کلمہ طیب، کلمہ شہادت اور کلمہ توحید کی حدیں نہیں توڑتیں بلکہ مزید تا خود ٹوٹ جاتی ہیں۔

مٹا دیا میرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا اللہ

ایمان اور عقیدے کی یہ بنیاد انسانی صفات میں ان قوتوں کو جلا بخشتی ہے جس کی بابت کہا گیا ہے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
فطرت کے مقاصد کا عیار اس کے لئے

رشید حسن خاں

نسیم کا سالِ وفات[1]

پنڈت دیاشنکر کول، نسیم تخلص، نسلاً کشمیری پنڈت، لکھنؤ کے رہنے والے، پنڈت گنگا پرشاد کول کے بیٹے اور خواجہ حیدر علی آتش[2] کے شاگرد تھے۔ سالِ ولادت بہ قولِ چکبست ۱۸۱۱ء تھا[3]۔ بیشتر قدیم تذکروں میں سالِ وفات درج نہیں۔ جن لوگوں نے اس سلسلے میں کچھ لکھا ہے، اُن کے مختلف بیانات نے خاصی الجھن پیدا کر دی ہے، خصوصاً چکبست کے بعض بیانات نے۔ چونکہ سالِ وفات کے ضمن میں نسیم کی زندۂ جاوید مثنوی، گلزارِ نسیم کے سنینِ تصنیف و طبع بھی زیرِ بحث آتے ہیں۔ اس بنا پر پہلے ان سنین کا تعین ضروری ہے۔

مصنف کی صراحت کے مطابق مثنوی گلزارِ نسیم سنہ ۱۲۵۴ھ (۳۹ - ۱۸۳۸ء) میں تکمیل کو پہنچی۔ کتاب کے آخر میں نسیم کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ شامل ہے جو اس پر مشتمل ہے۔ اس قطعے کا عنوان ہے: "قطعۂ تاریخِ اختتامِ تصنیف از مصنف" قطعہ یہ ہے:

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد — گلزارِ نسیم نام بنہاد
بشنید و نوید ہاتفی داد — "توقیعِ قبول روزِ لیش باد"[4]

۱۲۵۴

یہ مثنوی پہلی بار سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں میر حسن رضوی کے مطبع حسنی میں چھپی تھی۔ اس ایڈیشن کی اہمیت یہ ہے کہ "تصحیح و مقابلے" کا فرض خود مصنف نے انجام دیا تھا۔ اس مطبوعہ نسخے کے آخر میں مصنف ہی کا کہا ہوا قطعۂ تاریخِ طبع بھی موجود ہے چونکہ

---

[1] اس مضمون میں اصلاً نسیم کے سالِ وفات سے بحث کی گئی ہے۔ اور ضمناً بعض اور باتوں کا بھی ذکر آگیا ہے۔

[2] تذکرۂ نادر ص ۱۶۴ — دیباچۂ مثنوی گلزارِ نسیم مرتبۂ چکبست، مطبوعۂ مطبع بے نرائن ورما، خیال گنج، لکھنؤ، سالِ طبع سنہ ۱۹۰۵ء۔

[3] دیباچۂ مثنوی گلزارِ نسیم مرتبۂ چکبست۔

[4] مثنوی گلزارِ نسیم مطبوعۂ مطبع حسنی لکھنؤ، سالِ طبع سنہ ۱۸۴۴ء۔

اور یہی وہ اسباب تھے جس نے ساری عمر اقبال کو اپنے عقائد کے دینی دعرلیں حد میں متحرک اور فعال رکھا اور اپنے معاصرؔ سے کاٹے غیر متعلق اور کا ہے متصادم اور یہی اُن کی تاریخی عظمت ہے۔ لیکن ایک مفکر کی حیثیت سے ایک مکمل فکر کو اقبال دے بھی کیا سکتے تھے جب قرآن حکیم نے خود اعلان کیا ہو " اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ دِیْنًا" ۔ تمھارے رب نے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں۔

ہم کی معلومات کے مطابق، عالمِ وجود میں آنے کے تقریباً چھٹے سال بعد ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں پہلی بار طبع ہوئی۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، بیش تر قابلِ ذکر معاصر یا متاخر تذکرہ نگاروں نے نسیم کا سالِ وفات نہیں لکھا۔ مثلاً سراپا سخن، سخن شعرا، شمیم سخن، آبِ حیات اور جلوۂ خضر میں سالِ وفات کا ذکر نہیں۔ البتہ صاحبِ تذکرۂ گلستانِ سخن[1] نے اس کی صراحت کی ہے:

"پانچ چھ برس ہوئے کہ اُنیس بیس برس کی عمر میں مثلِ نسیم و صبا گلشنِ دنیا سے گزر گیا۔" (گلستانِ سخن ص ۵۰۸)

مولفِ تذکرہ کی صراحت کے مطابق تذکرے کا آغاز یکم شعبان ۱۲۶۴ھ کو ہوا (دیباچۂ تذکرہ ص ۱۴) اور آخر شوال ۱۲۷۰ھ میں اختتام پذیر ہوا (ص ۵۸۵)۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مولف نے نسیم کا حال ۱۲۷۰ھ میں لکھا، تو اس صورت میں نسیم کا سالِ وفات ۱۲۶۵ھ (۴۹ - ۱۸۴۸ء) یا ۱۲۶۶ھ (۵۰ - ۱۸۴۹ء) قرار پاتا ہے۔

---

[1] اس تذکرے پر بہ حیثیت مولف (صاحبِ عالم) مرزا قادر بخش صابرؔ دہلوی - تلمیذ مولانا صہبائی و حافظ عبدالرحمان خاں احسانؔ (خم خانۂ جاوید) متوفی [illegible] (تاریخِ لطیف، قلمی، مخزونۂ رضا لائبریری رام پور) کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ اس کی عبارتیں مولانا صہبائی کی اصلاح سے مزین ہیں۔ متعدد حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ تذکرہ دراصل مولانا صہبائی کی تالیف کردہ ہے۔ مخدومی عرشیؔ صاحب نے اس سے اختلاف کیا ہے: "کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ دراصل اس تذکرے کے مصنف امام بخش صہبائی ہیں۔ اس قسم کی رائیں، حسنِ ظن اور صاف دلی سے بعید ہیں اور پچھلے بزرگوں پر بغیر کسی دستاویزی شہادت کے سخت نکتہ چینی کا موجب ہیں، اس لیے میں اس کے ماننے پر آمادہ نہیں" (مقدمۂ دستور الفصاحت ص ۱۰۲)

محترمی قاضی عبدالودود صاحب نے، عرشیؔ صاحب کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: "اگر دستاویزی شہادت سے صابرؔ یا صہبائی کا اقرار نامہ مراد ہے تو یہ واقعی موجود نہیں۔ لیکن غالبؔ، گلستانِ سخن کو صہبائی ہی کی تصنیف سمجھتے تھے اور نساخؔ (سخن شعرا ص ۲۷۲) اور سری رام (دیباچۂ خم خانۂ جاوید جلد ۱ ص ۲) کی بھی یہی رائے ہے۔ صہبائی و صابرؔ کا بزرگان سلف میں ہونا خارج از بحث ہے۔ غالبؔ، صہبائی کے ہم عصر ہیں، لیکن باوجود اس کے کہ لطائفِ غیبی میں غالبؔ کی ستائش کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا، اس کا لفظ لفظ غالبؔ کے قلم سے ہے۔ ...... میرے نزدیک شعرا کے حالات و اشعار بیش تر صابرؔ اور کم تر صہبائی کے فراہم کردہ ہیں۔ لیکن عبارت سراسر صہبائی کی ہے۔ اور مقدمے کے علمی مباحث کے وہ تنہا ذمے دار ہیں" (قدیم دلی کالج نمبر - دلی کالج میگزین بابت [illegible])

میرے پیشِ نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۲۹۱ھ میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن مطبع فخری دہلی سے ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوا تھا (مقدمۂ دستور الفصاحت ص ۱۰۲) رضا لائبریری رام پور میں یہ ایڈیشن موجود ہے۔

بعد کے ایڈیشنوں سے بالعموم یہ قطعہ غیر حاضر ہے، اس لیے ذیل میں اس کو نقل کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ خاتمۃ الطبع کی
عبارت بھی نقل کی جاتی ہے جو مذکورہ باتوں کو ظاہر کرتی ہے۔ عبارتِ خاتمۃ الطبع:

"در ینولا پنڈت دیا شنکر متخلص بہ نسیم، کہ در فنِ شاعری کمال
بہم رسانیدہ اند و یکی از شاگردانِ خواجہ صاحب وحید عصر و یکتای زمان
خواجہ حیدر علی متخلص بآتش ہستند، قصۂ تاج الملوک و بکاولی را
از نثر بنظم آوردہ بگلزارِ نسیم موسوم ساختہ بودند، باحسن اوقات و
اسعد زمان، در بیت السلطنت لکھنؤ، بمحلۂ محمود نگر متصل اکبری دروازہ
در مطبع حسنی سیدی سندی میر حسن رضوی ولد میر حسن عرف میر کامل مرحوم
مغفور، بتصحیح و مقابلۂ مصنف، حلیۂ طبع پوشیدہ" (ص ۷۹)

ص ۸۷ پر نسیم کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ طبع ملتا ہے:

ای خالق کردگار شکرا	شکرا شکرا ہزار شکرا
کین جملہ ز ابتدا خبر داد	شاخ قلم چنیں ثمر داد
در عہد خلافت شہنشاہ	امجد علی شاہ خلد اللہ
سید حسن آنکہ طبع پاکش	چوں مطبع اوست خوب و دلکش
از سعی رضا شنید و بستود	در مطبع خویش طبع فرمود
چوں زیور طبع نیک پوشید	بہر تاریخ طبع کوشید
گلزار نسیم شد چو مسموع	گل گفت کہ تازہ گشت مطبوع

۱۲۶۰

اس تفصیل سے یہ قطعی طور پر متعین ہو جاتا ہے کہ مثنوی کی تکمیل ۱۲۵۴ھ (۳۹-۱۸۳۸ء) میں ہوئی اور اب

لہ یہ ایڈیشن نایاب ہے۔ چکبست نے اُس زمانے میں اس کی کم یابی کا ذکر کیا ہے (مقدمۂ گلزارِ نسیم)، آج کل یہ کم یاب تر ہے۔ رضا لائبریری رام پور میں اس اشاعت کا ایک نسخہ محفوظ ہے اور میں نے اسی سے استفادہ کیا ہے۔ یہ ایڈیشن اسّی صفحات پر مشتمل ہے۔ ص ۷۸ تک مثنوی ہے، ص ۸۰ پر دو قطعات تاریخ طبع ہیں، پہلا قطعہ نسیم کا ہے (جس کو اوپر نقل کر دیا گیا ہے) دوسرا کرامت علی اظہر کا۔ ص ۷۹ پر خاتمۃ الطبع کی عبارت ہے (اس کو بھی اوپر نقل کر دیا گیا ہے) آخری صفحہ غلط نامے کا ہے۔ چکبست نے ۱۹۰۵ء میں مثنوی مذکور کا جو ایڈیشن شائع کیا تھا اور جو معرکۂ چکبست و شرر کی بنیاد بنا تھا۔ وہ اُن کی صراحت کے مطابق اسی نسخے پر مبنی تھا (مقدمۂ گلزارِ نسیم)

نون ہے، جس کے متعلق عنوان کے ذیل میں یہ صراحت ملتی ہے کہ ۱۹۰۸ء میں رسالہ کشمیر درپن میں شائع ہو چکا ہے۔ اس صراحت سے اس مضمون کا زمانۂ تحریر متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں چکبست نے لکھا تھا:

"۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے...... اٹھائیس برس کی عمر میں یہ مثنوی تیار
ہوئی...... گلزار نسیم کو شائع ہوئے چار برس گزرے تھے کہ باغ جوانی پر اوس
پڑ گئی...... ۱۸۴۳ء میں بتیس سال کی عمر میں وفات پائی" (ص ۳، ۱۸)

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، مثنوی گلزار نسیم کا سالِ طبع ۱۲۶۰ھ ہے۔ "گلزار نسیم کو شائع ہوئے چار برس گزرے تھے کہ باغ جوانی پر اوس پڑ گئی" کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۲۶۴ھ میں نسیم کا انتقال ہوا، جو ۴۸-۱۸۴۷ء کے مطابق ہے اور یہ اسی مضمون میں خود اُن کے تحریر کردہ عیسوی سنہ سے بھی مختلف ہے اور اُن کے بعد کے بیانات سے بھی۔

یہ مضمون ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا، ۱۹۰۵ء میں اُن کی مُرتّب کی ہوئی مثنوی گلزار نسیم شائع ہوئی[1] اس کے مقدمے

بقیہ صفحہ سابق)

یہ بات پیش نظر رہنا چاہیئے کہ جس وقت چکبست نے مثنوی گلزار نسیم کو اپنے معرکۃ الآرا مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا، ن کی عمر بائیس تیئیس سال کی تھی۔ اور اُسی سال (۱۹۰۵ء میں) انھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی (بہار گلشن کشمیر جلد دل)۔ اس لحاظ سے یہ امر چنداں باعث تعجب نہیں کہ مقدمے میں کہیں کہیں اعتدال کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا جس ، بنا پر اُن کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور چونکہ یہ اُن کے ابتدائی دور کا کام ہے، اس لیے ان مضامین میں سنین ، جو غلطیاں ہیں، اُن پر بھی زیادہ تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ان مضامین کے بعد، جن لوگوں نے نسیم و گلزار نسیم سے متعلق کچھ لکھا۔ اُن میں سے بیش تر نے چکبست کے مضامین ہی کو پیش نظر رکھا، بلکہ متعدد کتابوں میں تو دراصل چکبست ہی کی عبارتوں کو معمولی حذف و اضافے کے ساتھ شامل کر لیا گیا۔ مثال کے طور پر بہار گلشن کشمیر اور یادِ رفتگاں (مولفہ جگر بریلوی) کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح واپہ کہ جس کے سامنے جو مضمون آ گیا۔ اُس نے اُسی مضمون کے سنین کو بلا تامل لکھ دیا، اور اس طرح مختلف کتابوں میں نسیم کا سال وفات مختلف ملتا ہے۔ ماخذ ان سب کا چکبست کے یہی مضامین ہیں، جن میں انھوں نے مختلف سنین لکھے ہیں۔

[1] یہ مطبع بے نرائن ورما، خیال گنج، لکھنؤ، میں چھپی تھی۔ شروع میں ۴۱ صفحے کا مقدمہ مرتب ہے۔ پھر نئے ہندسے ڈالے گئے ہیں۔ ص ۱۰۰ تک مثنوی ہے۔ ص ۵۵ سے انتخاب دیوان نسیم شروع ہوتا ہے۔ یہ ص ۷۲ پر ختم ہوتا ہے۔ کتابت و طباعت میں خاص اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چکبست نے یہ صراحت کر دی ہے کہ انھوں نے اپنے متن کی بنیاد، اولین ایڈیشن، یعنی نسخۂ مطبوعہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود[1] کے مولف نے نسیم کے ترجمے میں گلستان سخن کی عبارت کا بڑا حصہ نقل کرلیا ہے، مولف نے لکھا ہے:

"اور جو رائے مرزا قادر بخش صابر .... کی ان کے اور ان کے کلام دست بستہ کی بابت ہے، وہ ہم یہاں لکھتے ہیں" (ص ۱۳۲)

لیکن نقل عبارت میں اتنا تصرف ہوا ہے کہ صورت حال بالکل بدل گئی ہے، گلستان سخن کے "پانچ چھے برس" "اکیس بائیس برس" میں بدل گئے ہیں۔

"اکیس بائیس برس ہوئے کہ اُنیس بیس برس کی عمر میں مثل نسیم وصبا کے دنیا سے گزر گیا" (آثار الشعرائے ہنود ص ۱۳۲)

گلستان سخن کی عبارت سے جس سنہ وفات کا تعین ہوتا ہے، وہ بجائے خود غلط ہے۔ صاحب تذکرہ نے اُس غلط کو، غلط تر کے درجے پر پہنچا دیا۔

مضامین چکبست[2] میں "پنڈت دیا شنکر کول نسیم" کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے اور یہ اس مجموعے کا پہلا

---

[1] مولفہ دیبی پرشاد بشاش و عروقی، خلف منشی نحقن لال بہجت۔ بزرگوں کا وطن بھوپال تھا، دو پشت سے اجمیر میں سکونت اختیار ... چار سال سے نائب سررشتہ دار محکمۂ اپیل ریاست جودھپور ہیں۔ (تذکرۂ مذکور)۔ یہ تذکرہ ۱۳۰۱ھ (۸۳ - ۱۸۸۲ء) میں ... ل ہوا۔ مادۂ تاریخ تکمیل "مخزن الاشعار" ہے۔ ستمبر ۱۸۸۵ء میں مطبع رضوی دہلی میں چھپا۔ چھپنے کے وقت تک اضافے ہوتے ہے۔ اس تذکرے کا ایک نسخہ ہارڈنگ لائبریری دہلی میں محفوظ ہے اور وہی پیش نظر ہے۔

[2] یہ پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی (ولادت ۱۸۸۲ء - وفات ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء - (بہار گلشن کشمیر، جلد اول)) کے مضامین ... وعہ ہے، جس کو انڈین پریس الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ میرے سامنے اس کی دو اشاعتیں ہیں - ایک ۱۹۳۳ء کی اور دوسری ۱۹۴۶ء ... -ان دونوں اشاعتوں میں ایسی کوئی صراحت نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ مجموعہ پہلی بار کب شائع ہوا تھا۔ رسالہ اردو بابت ۱۹۲۹ء ... جلے شمارے میں اس مجموعے پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں پہلی بار شائع ہوا ہوگا ... ے میں نسیم و گلزار نسیم سے متعلق تین مضمون ہیں، ایک تو یہی مضمون۔ یہ گویا نسیم و گلزار نسیم کے سلسلے کی پہلی تحریر ہے ان کے قلم ... - اس کے دو سال بعد جب ۱۹۰۵ء میں انھوں نے مثنوی کا نیا ایڈیشن شائع کیا تو اس پر ایک مفصل مقدمہ لکھا اور اس پہلے مضمون ... حصہ، اس مقدمے میں شامل کرلیا - یہی مقدمہ اس مجموعۂ مضامین کا دوسرا مضمون ہے - تیسرا مضمون وہ ہے جو مولانا عبدالحلیم شرر ... تراضات کے جواب میں لکھا گیا تھا - اس سلسلے کے دو مضامین اور ہیں جو اس مجموعے میں شامل نہیں، لیکن معرکۂ چکبست و شرر میں ... ہیں - یہ دونوں مضامین بھی مولانا شرر کے جوابات پر مشتمل ہیں - (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عاشق لکھنوی۱؎ کا ایک مصرع تاریخ درج کرکے، اس کی سند پر لکھا ہے کہ ۱۲۶۰ھ میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ وہ مصرع یہ ہے ؎

کشیدہ "آہ" وبگفتہ "نسیم باغ جناں"

(معرکۂ چکبست و شرر ص ۱۱۷)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قواعد تاریخ گوئی کے لحاظ سے، اس مصرع سے ۱۲۶۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ مادۂ تاریخ "نسیم باغ جناں" ہے، جس میں سے "آہ" کے اعداد کا تخرجہ منظور ہے۔ "نسیم باغ جناں" سے ۱۲۶۷ھ برآمد ہوتے ہیں، ان میں سے لفظ "آہ"۲؎ کے چھے عدد نکال دیے جائیں، تو ۱۲۶۱ بچیں گے، اور یہی دراصل نسیم کا صحیح سال وفات ہے۔ اس کی تائید رشک لکھنوی۳؎ کے کہے ہوئے قطعۂ تاریخ سے بھی ہوتی ہے۔ رشک کے مجموعہ دواوین۴؎ میں قطعۂ تاریخ وفات

۱؎ چکبست نے یہ صراحت نہیں کی ہے کہ یہ کون سے عاشق ہیں۔ لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ چکبست کی مراد مرزا محمد مرتضیٰ عرف مچھو بیگ عاشق لکھنوی سے ہوگی۔ یہ اودھ پنچ کے معروف نامہ نگار تھے اور ستم ظریف کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ مضامین چکبست میں، ان پر ایک چھوٹا سا مضمون بھی موجود ہے۔ یہ مرزا اچھو بیگ کے لڑکے، اور نسیم دہلوی کے شاگرد تھے (شعلۂ جوالہ) متوفی ۱۸۹۵ء / ۱۳۱۳ھ (تاریخ لطیف قلمی کتاب خانہ رام پور) ان کا لغت بہار ہند چھپ چکا ہے۔ یہ لغت اصلاً چار حصوں پر مشتمل تھا، لیکن صرف پہلا حصہ چھپ چکا ہے جو حرف الف پر مشتمل ہے۔ یہ لغت مطبع شوکت جعفری لکھنؤ میں جون ۱۸۸۶ء میں چھپا تھا، صفحات ۴۴۴۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ باقی تین حصے مرتب بھی ہو پائے تھے یا نہیں۔ اس لغت کا ایک نسخہ دہلی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اودھ پنچ میں ان کے شائع شدہ کچھ مضامین کا ایک مجموعہ چشمۂ بصیرت کے نام سے شائع ہوا تھا (مضامین چکبست ص ۲۴۴) لیکن میری نظر سے یہ نہیں گزرا۔ مرزا صاحب کی کوئی اور کتاب بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

۲؎ قواعد تاریخ گوئی کے لحاظ سے الف ممدودہ کا ایک ہی عدد لیا جائے گا۔ تفصیل کے لیے دیکھئے جلال لکھنوی کا رسالہ "افادۂ تاریخ"۔ امیر مینائی نے امیر اللغات میں لکھا ہے: "۔۔۔۔ قاعدۂ جمل میں ایک ہی عدد اس کا لیا جاتا ہے اور بعض مورخین نے خال خال جو اس الف کے دو عدد لیے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ مشرب نہایت ضعیف اور ضرورت تاریخ اس کا منشا ہے" (امیر اللغات ص ۱۰) جب تک اس کا ثبوت موجود نہ ہو کہ واقعۃً کسی ضرورت سے الف ممدودہ کے دو عدد مراد لیے گئے ہیں، اس وقت تک یہی سمجھا جائے گا کہ ایک ہی عدد لیا گیا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے، چونکہ رشک کی کہی ہوئی تاریخ موجود ہے۔ جس سے ۱۲۶۱ ہی برآمد ہوتے ہیں، اس بنا پر عاشق کے مصرع میں بھی الف ممدودہ کا ایک ہی عدد مراد لیا جائے گا۔

۳؎ میر علی اوسط رشک لکھنوی، تلمیذ ناسخ، متوفی ۱۲۸۵ھ (کلیات منیر) معلومات زبان و قواعد شاعری میں یکتا تھے۔ عہد ناسخ سے منسوب بہت سی اصلاحات و قواعد کے واضع دراصل رشک تھے۔ (آب حیات ذکر ناسخ)

۴؎ رشک کے دو دیوان ایک ہی مجلد میں ان کی زندگی ہی میں ۱۲۶۳ھ میں شائع ہوئے تھے۔ ایک دیوان متن میں ہے، دوسرا حاشیے پر۔ ایک کا نام نظم مبارک ہے اور دوسرے کا نظم گرامی۔ یہ تاریخی نام ہیں، جن سے سال ترتیب دواوین بالترتیب ۱۲۵۳ھ

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں انھوں نے اس سلسلے میں مختلف باتیں لکھیں:-

"پچیس برس کی عمر میں یہ مثنوی تیار ہوئی ...... گلزار نسیم کو طبع ہوئے ایک برس گزرا تھا کہ باغ جوانی پر اوس پڑ گئی۔ سینے کی بیماری نے دفعتہً خاتمہ کر دیا ...... ۱۸۴۳ء میں تخمیناً بتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔"

سالِ ولادت دونوں مضامین میں ۱۸۱۱ء، "پچیس برس کی عمر میں یہ مثنوی تیار ہوئی" کا مطلب یہ ہوا کہ مثنوی کا سال تصنیف ۱۸۳۶ء ہے، جو ۵۲-۱۲۵۱ھ کے مطابق ہے اور یہ کسی طرح قابلِ قبول نہیں، کیونکہ مصنف کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ موجود ہے، جس سے سالِ تکمیل ۱۲۵۴ھ معلوم ہوتا ہے۔ "گلزار نسیم کو طبع ہوئے ایک برس گزرا تھا کہ باغ جوانی پر اوس پڑ گئی" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۰ھ میں نسیم کا انتقال ہوا ہوگا، کیونکہ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، مثنوی کا سال طبع ۱۲۵۹ھ ہے۔ اور یہ ۱۸۴۴ء کے مطابق ہے۔ یہ اُن کے درج کردہ عیسوی سنہ سے بھی مختلف ہے اور اُن کے پچھلے بیانات سے بھی مختلف ہے۔

چکبست نے ایک اور مضمون میں ۱۲۶۱ھ کو سالِ وفات بتایا ہے۔ یہ مضمون اُن کے مجموعۂ مضامین میں شامل نہیں، ہاں معرکۂ چکبست و شرر[1] میں موجود ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ نسیم، اپنے بعض معاصرین سے پہلے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو چکے تھے، اس مضمون میں نسیم اور اُن کے بعض معاصرین کے سنہ وفات درج کیے گئے ہیں، نسیم کے سلسلے میں

(بقیہ صفحۂ سابق) مطبع میر حسن رضوی پر رکھی ہے۔ مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ احتیاط و اہتمام کے باوصف، متعدد مقامات پر متن اصل سے مختلف ہو گیا ہے۔ اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ چکبست کے کسی معترض نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ غالباً اصل نسخے کی کم یابی اس کا سبب بنی۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ معرکہ آخر میں ادبی سے زیادہ شخصی بن گیا تھا۔ یہ ایڈیشن بھی اب کم یاب ہے۔ رضا لائبریری رام پور میں یہ اشاعت موجود ہے اور میں نے اسی سے استفادہ کیا ہے۔

[1] مرتبہ "مرزا محمد شفیع شیرازی ثم لکھنوی" مطبوعہ نول کشور پریس۔ مرتب کے الفاظ میں "اس مجموعے میں یہ التزام کیا ہے کہ گلزار نسیم کی بحث کے متعلق جس قدر سنجیدہ مضامین دستیاب ہو سکے وہ شائع کر دیے ہیں"۔ چکبست اور شرر میں جو معرکہ ہوا تھا، اور جس میں اُس زمانے کے متعدد اہلِ قلم نے سنجیدگی یا غیر سنجیدگی کے ساتھ حصہ لیا تھا، یہ اس کی واحد دستاویز ہے۔ مرتب نے زیادہ غیر سنجیدہ مضامین کو شامل نہیں کیا ہے ہاں بطور نمونہ ایسے چند مضامین کے بعض نمونے حاشیوں میں یکجا کر دیے ہیں۔ میرے سامنے اس کا وہ ایڈیشن ہے جس پر "بار اول ۱۹۱۵ء" چھپا ہوا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ خاتمۂ کتاب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی بار مارچ ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی تھی

چکبست نے ایک مضمون میں ۱۸۴۳ء، دوسرے مضمون میں ۱۸۴۳ء اور تیسرے مضمون ۱۲۶۰ھ سال وفات لکھا ہے۔ بعد کے لکھنے والوں کا ماخذ بالعموم چکبست کے یہی مضامین ہیں، اس لیے بعض کتابوں میں نسیم کا سالِ وفات ۱۸۴۵ء ملتا ہے (مثلاً بہارِ گلشن کشمیر[1]) بعض میں ۱۸۴۳ء (مثلاً یادرفتگاں[2]، مولفہ جگر بریلوی - مرآۃ الشعرا[3]، مولفہ محمد یحییٰ تنہا) اور بعض میں ۱۲۶۰ھ (مثلاً: تاریخ ادب[4] اردو مولفہ رام بابو سکسینہ) - البتہ چند اندراجات اس سے مستثنیٰ ہیں۔

انتخاب نادر[5] میں سالِ وفات ۱۸۶۱ء لکھا ہوا ہے - نظامی بدایونی نے قاموس المشاہیر[6] میں اور عبدالشکور شیدا نے

---

[1] یہ "تذکرۂ شعرائے کشمیری پنڈتاں" ہے، پنڈت برج کشن کول بے خبر اور پنڈت جگ موہن ناتھ رینا شوق کا مرتب کیا ہوا، دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے - پہلی جلد میں بقول مرتب ۱۸۵ شاعروں کا ذکر ہے اور دوسری جلد میں ۱۹۴ شعرا کا تذکرہ ہے۔ پہلی جلد انڈین پریس الہ آباد سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تھی اور دوسری جلد اسی پریس سے ۱۹۳۲ء میں چھپی تھی۔

[2] مولفہ شیام موہن لال جگر بریلوی - اس میں ۴۲ ہندو اہل قلم کا حال یکجا کر دیا گیا ہے - ان میں دو نثر نگار ہیں اور باقی شاعر۔ سالِ طبع یا تالیف درج نہیں، لیکن ایک مقدمہ نگار کے مقدمے کے آخر میں ۱۰ نومبر ۱۹۲۹ء درج ہے - اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے - کل صفحات ۳۰۰ - حالات کے ذیل میں تحقیق سے کم کام لیا گیا ہے اور مولف کا انداز نظر سراسر عذر باقی ہے - مطبوعہ مطبع انوار احمدی لکھنؤ۔

[3] مطبوعہ الکٹرک پریس لاہور - سال طبع یا سال تالیف مذکور نہیں - البتہ مقدمہ مولف میں درج ہے کہ ۱۹۲۰ء سے اس کی ترتیب کا آغاز ہوا - اور مقدمے کے آخر میں ۱۰ دسمبر ۱۹۲۵ء ثبت ہے - یہ کتاب بہت سے اغلاط کا گنجینہ ہے، اور بہ حیثیت تاریخ نہایت معمولی کتاب ہے۔

[4] مترجمہ عسکری صاحب مرحوم - میرے سامنے اس کا چوتھا ایڈیشن ہے، مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔

[5] مرتبہ سرراس مسعود - یہ دراصل شعرا کا انتخاب ہے - لیکن چونکہ انتخاب کلام سے پہلے چند سطریں شاعروں سے متعلق بھی لکھ دی گئی ہیں - اس لیے تذکرے کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے - میرے سامنے اس کا پانچواں ایڈیشن ہے - ناشر کی صراحت کے بموجب پہلا ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا - سارے ایڈیشن نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئے ہیں - مقدمہ مرتب کے آخر میں ۷ اگست ۱۹۲۲ء درج ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگست ۱۹۲۲ء تک اس کی ترتیب مکمل ہو چکی تھی - اور اسی سال شائع ہو گیا تھا۔

[6] یہ کتاب دو جلدوں میں ہے - مرتب کی صراحت کے مطابق پہلی جلد کا مسودہ ۱۹۲۲ء میں حوالۂ پریس کیا گیا تھا - (خاتمہ جلد دوم) ۱۹۲۴ء میں پہلی جلد اور ۱۹۲۶ء میں دوسری جلد شائع ہوئی - دونوں جلدیں نظامی پریس بدایوں میں چھپی تھیں - نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں اس کتاب کے متعلق عرشی صاحب کی رائے درج کر دی جائے موصوف نے لکھا ہے "یہ دراصل مسٹر بیل کی انگریزی کتاب موسومہ "این اورینٹل بایوگریفیکل ڈکشنری" پر مبنی ہے - اس لیے اس کی ترتیب وغیرہ میں وہ تمام کوتاہیاں موجود ہیں جو بیل سے سرزد ہوئی تھیں - کچھ اسما اور معلومات دوسری کتابوں سے بھی بڑھا دیئے گئے ہیں" (مقدمہ دستور الفصاحت ص ۱۱۲)

نسیم موجود ہے، جس سے یہی سنہ ۱۲۶۱ نکلتا ہے:

حسرت دیاس ہوای دنیا — برد نسیم زجیفہ ہی ہی

بزم مشاعرہ بود و شنیدم — مُرد نسیم زجیفہ ہائے ہی

فوراً مصرع مادہ گفتم — "مرد نسیم زجیفہ ہی ہی"

۱۲۶۱ھ

اِس طرح یہ مسلم ہو جاتا ہے کہ سنہ ۱۲۶۱ھ (مطابق سنہ ۱۸۴۵ء) نسیم کا سالِ وفات ہے۔ نسیم کا سالِ ولادت سنہ ۱۸۱۱ء ہے جو سنہ ۱۲۲۶ھ کے مطابق ہے۔ یہ چکبست کا قول ہے، چونکہ اِس سلسلے میں کوئی اس سے قدیم ماخذ ہمارے سامنے نہیں اور معنا مِن چکبست میں بھی اسی سنہ کو بلا اختلاف متعدد جگہ لکھا گیا ہے، اس لیے بہ ظاہر اس کو درست ماننے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے انتقال کے وقت اُن کی عمر چونتیس ۳۴، پینتیس ۳۵ سال ہوگی۔ (زمانۂ ولادت کے سلسلے میں تذکرۂ گلستانِ سخن کی عبارت سے جو کچھ مترشح ہوتا ہے، وہ کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، اس لیے اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے)

مثنوی کا سالِ تکمیل سنہ ۱۲۵۴ھ ہے۔ اس لیے، اختتامِ مثنوی کے وقت نسیم کی عمر تقریباً اٹھائیس ۲۸ برس کی ہوگی۔ مثنوی کا سالِ طبع سنہ ۱۲۶۰ھ ہے، اس حساب سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مثنوی شائع ہونے کے تقریباً ایک سال بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ چونکہ کسی واقعے کے ضمن میں تاریخ اور مہینے کا علم نہیں، اِس لیے یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ تاریخ اور مہینہ معلوم ہو جانے کی صورت میں ان تعینات میں چند ماہ کا یا اس سے کچھ زیادہ فرق رونما ہو جائے۔ مثلاً یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ مثنوی چھپنے کے ایک سال اور چند ماہ بعد ان کا انتقال ہوا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مدت ایک سال سے کم ہو۔

(بقیہ صفحۂ سابق)

اور سنہ ۱۲۷۱ھ معلوم ہوتے ہیں۔ تیسرا دیوان جو ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا (دیباچہ نفس اللغۃ) شائع نہیں ہو سکا۔ اسی کا ایک نسخہ پاکستان میں ہے اور ایک آزاد لائبریری علی گڑھ میں (حواشی تذکرۂ ابن امین اللہ طوفان ص ۴۴)

لہ دیوان رشک میں بذیل تاریخ یہ صراحت نہیں کہ یہ کون سے نسیم ہیں۔ صرف تخلص ہے، نام مذکور نہیں۔ لیکن سارے قیاسات اس کے موید ہیں کہ یہ گلزارِ نسیم والے نسیم کا قطعۂ تاریخ ہے۔ اور باتوں کے علاوہ، بڑی بات یہ ہے کہ لکھنؤ میں اُس عہد میں نسیم دہلوی کے سوا اور کوئی معروف یا قابلِ ذکر شاعر اس تخلص کا نہیں تھا۔ اور نسیم دہلوی اس کے بہت بعد مرے ہیں۔ نسیم دہلوی کا سالِ وفات سنہ ۱۲۸۳ھ ہے (دیباچہ دیوانِ نسیم موسوم بہ دفترِ شگرف، نوشتہ امیر اللہ تسلیم) چکبست نے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ ہیضے کی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی اور وہ آتش لکھنوی کا قطعۂ تاریخ موجود ہے، جس سے یہی سنہ نکلتا ہے۔ اس بنا پر کسی شک کے بغیر اس کو تسلیم کیا گیا ہے۔

دونوں اشاعتوں میں ایک ہے - اس بنا پر ۱۲۵۳ھ کو ظاہراً کتابت کی غلطی ماننا چاہیئے - (۲) دوسری غلطی (جو آج کل عام طور سے پائی جاتی ہے) یہ ہے کہ انھوں نے سالِ ترتیب ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء لکھا ہے - چونکہ یہ معلوم نہیں کہ مثنوی کی تکمیل ۱۲۵۴ھ کے اوائل میں ہوئی یا اواخر میں، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عیسوی ۱۸۳۸ء ہوگا یا ۱۸۳۹ء - کیونکہ ۱۲۵۴ھ میں ماہ شوال کے وسط سے ۱۸۳۹ء کا آغاز ہو جاتا ہے - ایسے مواقع پر جب تک کہ تاریخ اور مہینہ نہ معلوم ہوں، یہ ضروری ہے کہ دونوں سنہ لکھے جائیں -

اس بحث کے بعد، ضمناً بعض اور باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے -

تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود کے مولف نے، نسیم کے ترجمے میں، گلزارِ نسیم اور سحر البیان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اور بعض بعض اصحاب دونوں ہی کو لاجواب بتاتے ہیں مگر مرزا غالب نے جو رائے اس بارے میں دی ہے - وہ بہت اچھی ہے، انصاف یہ ہے کہ خوب انصاف کی کہی ہے، یعنی کسی نے غالب سے پوچھا تھا کہ دونوں میں کون بہتر ہے تو انھوں نے فرمایا کہ مثنوی میر حسن فصاحت است و گلزار بلاغت" (ص ۱۳۲)

غالب سے جو قول منسوب کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں - عبارت کی نامعقولیت مزید برآں - مجھے باوصف تلاش غالب کی کسی ایسی رائے کا پتہ نہیں چلا - میں نے مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی (زاد مجدہ) سے دریافت کیا، موصوف نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا - عرشی صاحب نے میرے عریضے کے جواب میں تحریر فرمایا -

"مثنوی میر حسن اور گلزارِ نسیم کے سلسلے میں غالب کے نام سے جو قول آپ نے تحریر فرمایا ہے، میں نے کہیں غالب کے یہاں نہیں پایا نہ کسی ایسے راوی کی سند سے سنا جو غالب کا قول نقل کرنے میں مستند مانا جاتا ہوں پھر جیسا کہ آپ نے خود تحریر فرمایا ہے، کوئی پڑھا لکھا اس انداز پر لفظ فصاحت و بلاغت کو استعمال بھی نہیں کرتا - (مکتوب عرشی صاحب)

نساخ[1] نے اپنے تذکرے میں نسیم کے متعلق لکھا ہے:

"اپنے مذہب کو ترک کر کے مشرف باسلام ہوئے تھے" (سخن شعرا ص ۵۱۸)

---

[1] مولوی عبدالغفور خاں نساخ - متوفی ۱۳۰۶ھ (مقدمہ دستور الفصاحت ص ۱۰۴)

بیاضِ سخن[1] میں یہی سنہ لکھا ہے۔ قاموس المشاہیر کی تکمیل سے سال بھر پہلے ہی انتخاب زریں نظامی صاحب کے اہتمام سے، الطیب کے مطبع میں چھپا تھا، اس بنا پر میرا قیاس ہے کہ نظامی صاحب نے یہ غلطی اسی انتخاب سے مستعار لی اور صاحب بیاضِ سخن نے ان میں سے کسی ایک سے۔

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ خواجہ عبدالرؤف[2] عشرت لکھنوی نے اپنی تالیف ہندو شعرا[3] میں ۱۸۴۴ء نسیم کا سالِ وفات لکھا ہے۔

سالِ ولادت کے سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ رام بابو سکسینہ کی کتاب تاریخ ادبِ اردو میں نسیم کا سالِ ولادت ۱۲۲۶ھ لکھا ہوا ہے جو ۱۸۱۱ء کے مطابق ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی کتاب لکھنؤ کا دبستانِ شاعری[4] میں بھی یہی سنہ ملتا ہے۔ اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، دونوں میں ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء لکھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابو اللیث صاحب نے یہ سنہ رام پور کی کتاب سے اخذ کیا۔ رام بابو نے حسبِ معمول اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا، نہ ابو اللیث صاحب نے اس کی ضرورت سمجھی چکبست کے درج کردہ سنہ ولادت ۱۸۱۱ء کے بجائے، ۱۸۱۲ء کو تسلیم کرنے کے لیے، اس سے قدیم سنہ درکار ہے۔ جب تک چکبست کے درج کردہ سنہ کے خلاف کوئی قابلِ قبول شہادت نہ ملے، اُس وقت تک اُسی کو صحیح سمجھا جائے گا۔

ابو اللیث صاحب کی کتاب میں، دو اور محلِ نظر مقامات بھی ہیں: (۱) کتاب کی پہلی اشاعت میں مثنوی گلزارِ نسیم کا سالِ ترتیب ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء لکھا ہوا ہے۔ ہجری سنہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن دوسری اشاعت میں ۱۲۵۴ھ/۱۸۲۸ء ملتا ہے۔ چونکہ عیسوی سنہ

---

[1] اصل میں یہ منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ چونکہ اجمالاً شعرا کے حالات بھی لکھ دیے گئے ہیں اس لیے تذکرے والی بات پیدا ہو گئی ہے۔ میرے پیشِ نظر اس کتاب کا جو نسخہ ہے، اس کا سرورق غائب ہے۔ قریشی صاحب نے لکھا ہے کہ مولف نے اس کو ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں حیدر آباد دکن سے شائع کیا تھا۔

[2] متوفی: ۱۹۱۲ء (یادِ رفتگاں۔ از مولانا سید سلیمان ندوی۔ شائع کردہ مکتبۃ الشرق کراچی۔ ص ۲۲۹)

[3] پہلی بار جنوری ۱۹۳۱ء میں نامی پریس لکھنؤ میں چھپی تھی۔ سالِ ترتیب مذکور نہیں، البتہ مولف نے مقدمے میں لکھا ہے کہ "یہ تذکرہ ابتدائے زبانِ اردو سے ۱۹۳۰ء تک کا ہے" معمولی کتاب ہے۔

[4] یہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ پہلی بار سلسلۂ مطبوعات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ دوبارہ مولف کی نظرِ ثانی اور اضافوں کے ساتھ اردو مرکز لاہور نے اس کو شائع کیا ہے۔ اس پر سنِ اشاعت درج نہیں۔ البتہ مصنف کے مقدمے کے آخر میں اکتوبر ۱۹۵۵ء درج ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب جس بے احتیاطی کے ساتھ لکھی گئی تھی نظرِ ثانی بھی اسی بے احتیاطی کے ساتھ کی گئی ہے۔

"گل بکاؤلی کا قصہ بہت ہی دلفریب ہے - اس میں ہندی تعلیم و عقائد کو، قرآن کی تعلیم میں سمویا ہے - یہ ہندوستان جدید کی بہت بڑی خصوصیت ہے - اس قصے کو ایک تو نہال چند نے لکھا ہے، جس میں نثر اور نظم ملی ہوئی ہے - نسیم نے اسے گلزارِ نسیم کے نام سے منظوم کیا ہے نسیم آگرہ کالج میں پروفیسر تھے" (خطبات گارساں دتاسی ص ۱۵۶)

اس عبارت کا جزو اول، کہ قصہ گل بکاؤلی میں قرآنی تعلیمات کو ہندی تعلیم میں سمویا گیا ہے، محل نظر ہے - نسیم کی مثنوی میں اس عنصر کا وجود نہیں - ہاں نہال چند لاہوری کے نثری ترجمے - مذہبِ عشق[1] کی متعدد داستانوں کے آخر میں ایسی عبارتیں ہیں جن میں متصوفانہ پیرایے میں کچھ باتیں کہی گئی ہیں - ان باتوں کا تعلق تصوف کی تعلیمات سے ہے، قرآنی تعلیمات سے براہ راست ان کا تعلق نہیں - گل بکاؤلی کے قصے میں ہند ایرانی داستانی عناصر کی کارفرمائی ہے اور ایک دو باتیں اسلامی قصص کا چربہ معلوم ہوتی ہیں اور بس - قرآنی تعلیمات سے اسے کوئی علاقہ نہیں -

رہا دوسرا جزو کہ نسیم، آگرہ کالج میں پروفیسر تھے، یہ غلط محض ہے - میرا خیال یہ ہے کہ مثنوی گلزارِ نسیم، دتاسی کی نظر سے گزری ہی نہیں تھی، اس نے صرف مذہبِ عشق کو دیکھا تھا، اور اس نے یہ فرض کر لیا کہ مذہبِ عشق میں جو کچھ ہے، وہ سب گلزارِ نسیم میں بھی موجود ہوگا -

چکبست نے جب یہ مقدمہ لکھا تھا، اس وقت ان کی عمر بائیس تئیس سال کی تھی، اس عمر میں اگر عبارت میں جذباتیت اور اس کے اثر سے مبالغہ پسندی اور انتہا پسندی ہو تو غلط ہونے کے باوجود چنداں قابل تعجب نہیں - مقدمے میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں - بلکہ یہ حقیقت ہے کہ چکبست نے اسی جذبے سے سرشار ہو کر، کچھ ایسی باتیں لکھ دیں، جن کا صحت سے تعلق نہیں معلوم ہوتا - مثلاً نسیم کے معرکے ناسخ اور بعض دوسرے شعرا سے - میرا خیال ہے کہ ان معرکوں کی حیثیت یا تو ذہنی اختراع کی ہے یا یہ اسی قسم کے افراد کی روایتوں پر مبنی ہیں - اس موضوع پر پھر کبھی ذرا تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی -

ان کی مبالغہ پسندی کا اندازہ صرف ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے: گلزارِ نسیم کی زبان مستند ہے - اس کے ثبوت میں وہ لکھتے ہیں

---

[1] نہال چند لاہوری نے ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر، عزت اللہ بنگالی کے لکھے ہوئے فارسی قصہ تاج الملوک و گل بکاؤلی کا بعض ترمیموں کے ساتھ اردو میں ترجمہ کیا تھا مذہبِ عشق کے نام سے، یہ تاریخی نام ہے، جس سے سالِ تکمیل ۱۲۱۷ھ نکلتا ہے - میرے سامنے وہ نسخہ ہے جسے مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا ہے - اس کا پہلا ایڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا -

مولف شمیم سخن[1] نے بھی یہی لکھا ہے :

"سنا جاتا ہے کہ مذہب آبائی کو ترک کرکے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے" (شمیم سخن ص ۲۲۸)

یہ محض یادر ہوا بات معلوم ہوتی ہے اور اس کا کوئی قابل قبول ثبوت موجود نہیں۔ چکبست نے بھی اس الزام کا ذکر کیا ہے لیکن اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ لکھتے ہیں : "ایک تذکرہ نویس صاحب فرماتے ہیں کہ نسیم مشرف بہ اسلام تھے، اس کا جواب مجھے نہیں آتا۔ خیر یہ تو پرانے زمانے کے لوگوں کی قبا ہی ہے" (مضامین چکبست ص ۱۲۹) میرا خیال ہے کہ چکبست کا اشارہ نساخ ہی کی طرف ہے۔ اس سے پہلے مولوی سید احمد دہلوی[2] اپنے لغت فرہنگ آصفیہ کی چوتھی جلد میں (سال طبع ۱۹۰۸ء) نساخ ہی کا حوالہ دے کر اسے مشکوک لکھ چکے تھے۔ انھوں نے لفظ نسیم کے ذیل میں، دیا شنکر نسیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"بقول صاحب تذکرۂ سخن شعرا مسلمان ہوگئے تھے، لیکن اس وقت کا نام
نہ لکھنے سے یہ امر قابل تامل ہے" (فرہنگ آصفیہ جلد چہارم ص ۵۶۳)

جواہر سخن[3] کے مولف نے بھی اس الزام کے پایۂ تحقیق تک نہ پہنچنے کا ذکر کیا ہے :

"مشہور ہے کہ اپنا مذہب ترک کرکے مسلمان ہوگئے تھے، لیکن یہ امر
پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچا" (جواہر سخن، جلد سوم، ص ۴۰۳)

میرا قیاس ہے کہ اس الزام کا جن لوگوں نے ذکر کیا ہے، ان سب کا مآخذ، نساخ کا تذکرہ ہی ہے۔ اور اس تبدیل مذہب کے بہتان کی بھی وہی حیثیت ہے جو اس الزام کی تھی کہ آتش نے خود مثنوی کہہ کر، اپنے شاگرد کے حوالے کردی۔

انجمن ترقی اردو نے خطبات گارساں دتاسی کا جو اردو ترجمہ شائع کیا تھا (سال طبع ۱۹۳۵ء)، اس کے ص ۱۵۶ پر نسیم و گلزار نسیم کے متعلق یہ عبارت ملتی ہے :

---

[1] تالیف مولوی عبدالحی صفا بدایونی۔ مولف کی صراحت بموجب یہ تذکرہ ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں تکمیل کو پہنچا تھا۔

[2] متوفی ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء (عظمت رفتہ، تالیف ضیاء الدین احمد برنی ص ۱۲۱۔ شائع کردہ تعلیمی مرکز کراچی سال طبع ۱۹۶۱ء)

[3] ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی فرمائش پر، مولوی محمد مبین چڑیا کوٹی نے، اردو شاعری کی مختلف اصناف کا ایک طویل انتخاب مرتب کیا تھا اس نام سے۔ جلد اول کے دیباچہ نگار ڈاکٹر تارا چند کی صراحت کے مطابق شعری انتخاب چھ جلدوں پر مشتمل ہے، لیکن میری نظر سے صرف پہلی چار جلدیں گزری ہیں۔ ہر جلد پر مرتب کے علاوہ ایک اور صاحب نے نظر ثانی کی ہے۔ اس تیسری جلد پر نظر ثانی کا فرض مرحوم آثر لکھنوی نے انجام دیا تھا۔ تیسری جلد پر سال طبع درج نہیں۔ البتہ پہلی جلد ۱۹۳۱ء میں دوسری ۱۹۳۲ء میں اور چوتھی ۱۹۳۹ء میں چھپی تھی۔ یہ اگرچہ شعری انتخاب ہے، لیکن مرتب نے ہر شاعر کے سلسلے میں آغاز میں مختصر سے حالات لکھ دیے ہیں۔

گلزارِ نسیم آیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ امیر مینائی، اس کو نسیم کی تصنیف ہی نہیں مانتے ہیں، درست نہیں۔ کیونکہ کم از کم ایک جگہ اسی لغت میں امیر مینائی نے نہایت واضح طریقے سے، گلزارِ نسیم کو، نسیم کی تصنیف بتایا ہے۔ "آج کدھر سے چاند نکلا" کے ذیل میں انھوں نے لکھا ہے:

"اور نسیم لکھنوی نے گلزارِ نسیم میں چاند کی جگہ خورشید بھی کہا ہے:

طالع سے کیے تھی ایسی امید: نکلا ہے کدھر سے آج خورشید"

(امیر اللغات، حصہ اول، ص ۶۵)

اس واضح قول کے بعد، یہ کہ امیر مینائی، اسے نسیم کی تصنیف نہیں سمجھتے تھے، بڑی زیادتی ہے۔ امیر اللغات میں بہت سے مقامات پر ایسا ہوا ہے کہ مثالیہ فقروں کے ساتھ صرف کتاب کا نام لکھ دیا گیا ہے، مصنف کا نام نہیں لیا گیا۔ مثلاً صفحہ ۲۶ پر فسانۂ عجائب کی سند مذکور ہے لیکن سرور کا نام نہیں آیا۔ یا صفحات ۱۲۹، ۱۴۴، ۱۵۰ پر عود ہندی سے کلمات منقول ہیں، اور مصنف کا نام نہیں لکھا گیا۔ نسیم کے سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ اس لغت میں نسیم دہلوی[1] کے بہت سے اشعار سند میں منقول ہیں اور ہر جگہ صرف نسیم لکھا گیا ہے۔ غالباً التباس سے بچنے کے لیے، نسیم لکھنوی کے اشعار کے ساتھ مثنوی گلزارِ نسیم لکھا گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ چکبست کی بیش تر توجہ، مقدمے پر مبذول رہی ہے، جس میں مبالغے، جانب داری اور انتہا پسندی کا رنگ تیز ہو گیا ہے، اس شغف نے ان کو اصل متن کی تصحیح کی طرف کماحقہ متوجہ نہیں ہونے دیا، جس کے نتیجے میں ان کا مرتب کیا ہوا متن، بہت سی اہم غلطیوں کا ہدف بن گیا۔ ان میں سے بعض غلطیاں ایسی ہیں، جنھوں نے مستقلاً غلط فہمی پیدا کر دی۔ میں یہاں بطور مثال صرف ایک ایسی غلطی کا ذکر کرتا ہوں۔

چکبست نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ انھوں نے اس نئے ایڈیشن میں یائے معروف و مجہول کا امتیاز ملحوظ رکھا ہے (مضامین چکبست ص ۲۱۵) جب کہ پرانے ایڈیشن (طبع اول سے مراد ہے) میں ایسا نہیں ہے۔ لیکن ایک جگہ بے احتیاطی یا کسی اور وجہ سے یہ امتیاز ملحوظ نہیں رہ سکا ہے اور اس سے ایک مستقل غلطی کا اضافہ ہو گیا۔ مثنوی گلزارِ نسیم کے پرانے یعنی پہلے ایڈیشن میں یہ شعر اسی طرح چھپا ہوا ہے:

صاد آنکھوں کی دیکھ کر پھیر کی بینائی کے چہرے پر نظر کی

چکبست کے مرتبہ نسخے میں بھی یہ شعر بالکل اسی طرح چھپا ہے۔ یہ شعر جس طرح چھپا ہے، اس کی بنا پر حرف صاد کی تانیث

---

[1] اصغر علی خاں نسیم، خلف نواب آغا علی خاں دہلوی، تلمیذ مومن، متوفی ۱۴، رمضان ۱۲۸۳ھ (دیباچہ دیوان نسیم موسوم بہ "دفتر شکرف"۔ نوشتہ تسلیم لکھنوی، تلمیذ نسیم)

"......... گلزار نسیم کی زبان، لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ لکھنؤ کے مشہور و معروف شاعر منشی امیر احمد صاحب مینائی نے امیر اللغات میں زبان و محاورے کی بحث میں "گلزار نسیم کے سینکڑوں شعر سند کے طور پر پیش کئے ہیں" (مضامین چکبست ص ۱۷۸)

"سینکڑوں شعر" بڑا مبالغہ ہے۔ امیر اللغات[1] کے پہلے حصے میں سند کے اشعار، دوسری جلد کے مقابلے میں زیادہ ہیں دوسرے حصے کے آغاز ہی میں مولف نے اس کی صراحت کردی ہے کہ اس حصے میں "اشعار مثالیہ بہت کم دیئے ہیں" (امیر اللغات حصہ دوم ص ۱۸) پہلا حصہ، ۳۱۷ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس میں گلزار نسیم کے کل ۷۰ شعر بطور سند آئے ہیں (شمار میں دو شعروں کی غلطی ممکن ہے) دوسرے حصے کا کیا حال ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ شروع کے پچاس صفحوں میں صرف تین شعر ملتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دونوں حصوں میں ملا کر، سو شعر بھی بہ مشکل آئے ہوں گے۔ امیر اللغات کا دوسرا حصہ ۲۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں اسی سلسلے میں جلیل مانکپوری[2] کے ایک قول کا بھی ذکر کر دیا جائے جو امیر اللغات ہی سے متعلق ہے اور چکبست کے درج کردہ بعض افسانوں کی طرح صحت سے دور ہے۔ معرکۂ چکبست و شرر میں حصہ لیتے ہوئے انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

"امیر اللغات میں جس کتاب کا شعر لکھا گیا ہے، خواہ دیوان ہو یا مثنوی یا مرثیہ یا قصائد، سلام، اس کے ساتھ مصنف کا تخلص لکھا گیا، مگر بر خلاف اس کے، گلزار نسیم کا شعر جہاں دیا ہے، وہاں گلزار نسیم لکھا ہے، نسیم نہیں لکھا۔ یہ بھی دلیل قوی اس کی ہے کہ صاحب امیر اللغات کے نزدیک، گلزار نسیم، نسیم کی تصنیف نہ تھی۔"

(معرکۂ چکبست و شرر ص ۱۹۷)

جلیل کا یہ لکھنا تو صحیح ہے کہ امیر اللغات میں گلزار نسیم کے اشعار جہاں جہاں سند میں آئے ہیں، وہاں ان کے ساتھ لفظ

---

[1] تالیف امیر مینائی متوفی ۱۳۱۸ھ (سوانح امیر، مرتبہ جلیل مانکپوری ص ۹۱) یہ لغت صرف الف ممدودہ و مقصورہ کی ردیف تک چھپ سکا، دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول ۱۸۹۱ء میں اور دوسرا حصہ ۱۸۹۲ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا۔

[2] حافظ جلیل حسن جلیل، تلمیذ و جانشین امیر مینائی۔ متوفی: ۷ جنوری ۱۹۴۶ء۔ (یاد رفتگاں۔ از مولانا سید سلیمان ندوی شائع کردہ مکتبۃ الشرق کراچی، ص ۳۷۳)

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر

انتخاب رغمی

یہ صحیح ہے کہ اساتذۂ قدیم کے دواوین بھی مخمسوں سے خالی نہیں، لیکن اس کو ایک جداگانہ صنفِ سخن کی حیثیت سے فروغ بخشنا لکھنؤ کے مخصوص ماحول ہی کی دین ہے۔ شعرائے لکھنؤ، بالخصوص تلامذۂ ناسخ و آتش نے جس کثرت سے مخمسے لکھے اُسے دیکھ کر یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اس دور میں غزل کے بعد شاید یہی صنفِ سخن سب سے زیادہ مقبول تھی۔ میرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنے "فسانۂ عجائب" میں مختلف دلچسپ چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کا نام بھی لیا ہے۔

"طوطے نے شہزادے کو سخنانِ دلچسپ، قصصِ عجیب، حکایاتِ غریب، شعرِ خوب، مخمسہائے مرغوب سنا اپنے دامِ محبت میں اسیر کیا"

اس میں کچھ شک نہیں کہ مخمسے کے پہلے چار مصرعوں میں ردیف و قافیہ کی تکرار سے جو دلکش کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ کسی دوسری صنفِ سخن میں نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ مشاقیِ سخن کا ثبوت پیش کرنے کے لئے بھی یہ صنف بہت اہم ہے۔ لکھنؤ میں اس عہد کے کئی شعرا نے غزلوں کے علاوہ مخمسوں کے دواوین بھی تیار کئے۔ ان میں سے ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کا "دیوانِ غریب" مشہور ہے جس کی تلخیص پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب عرصہ ہوا "تذکرۂ نادر" کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک "دیوان" مجھے بھی دریافت ہوا۔ اور اس کا خلاصہ انتخاب رغمی کے نام سے نذرِ ناظرین ہے۔

یہ دیوان ممکن ہے اپنی اصلی حالت میں ردیف وار مرتب کیا گیا ہو لیکن امتدادِ زمانہ سے اس کے اوراق کی ترتیب اصل کے مطابق باقی نہیں رہی اور اب چونکہ اس کی ترتیب کے متعلق کوئی قطعی بات کہنا ممکن نہیں اسے دیوان کے بجائے بیاض کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ قلمی بیاض ناسخ کے ایک غیر معروف لیکن بہت اہم شاگرد رغمی کے مخمسوں کا مجموعہ ہے۔ اور اس وقت جناب سید ہاشم علی سبز پوش ابن جناب سید شاہد علی فائق گورکھپوری مرحوم کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔ میں سبز پوش صاحب موصوف کا احسانمند ہوں کہ انھوں نے مجھے اس بیاض سے استفادہ کا نہ صرف موقع دیا بلکہ اس سے متعلق بعض قابلِ ذکر واقعات اور حالات سے بھی بڑی خندہ پیشانی سے مجھے مطلع

ظاہر ہوتی ہے۔ یہ شعر بھی ہدفِ اعتراض بنا تھا، لیکن اس تذکیر و تانیث کی بنا پر نہیں، بلکہ دوسرے مصرع کی بنا پر، اس وجہ سے اس شعر کی تکرار ہوئی ہے چکبست کے مضامین میں بھی اور دوسروں کے مضامین میں بھی، اور ہر جگہ پہلے مصرع میں "صاد آنکھوں کی ملتا ہے" مؤلفین: فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات، ارمغان احباب[1] و رشحات صفیر[2] نے، نسیم کے اسی مذکورہ شعر کی بنا پر، اس کی تانیث کا بھی دعویٰ کیا اور نسیم کے اسی ایک شعر کو، تانیث کی مثال میں پیش کیا۔ حالانکہ یہ شعر اصولاً اس کی تانیث کی سند میں کام نہیں آسکتا (تفصیل کے دیکھئے راقم الحروف کا مضمون "مشترک الفاظ"، مطبوعہ نقوش لاہور)

---

[1] اس رسالے کا مضمون تذکیر و تانیث ہے، مؤلفہ منشی قادر علی صفی پوری، بلازم ریاست بھوپال، یہ رسالہ مطبع شاہجہانی بھوپال میں ۱۳۱۸ھ میں چھپا تھا

[2] تالیف سید فرزند احمد صفیر بلگرامی (متوفی ۱۸۹۰ء و تلمیذ غالب) میرے سامنے اس کا وہ ایڈیشن ہے جو صفیر کی نظر ثانی کے بعد مطبع احمدی پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ تذکیر و تانیث کے موضوع پر نہایت قابل ذکر تالیف ہے۔

رغمی کے بیٹوں میں سے ایک کا حال عبداللہ خاں ضیغم نے اپنے تذکرے میں اس طرح لکھا ہے :۔

"سلیم تخلص، محمد سلیم اللہ نام عرف محمد عبداللطیف ابن مولوی محمد عظیم اللہ رغمی سسید پوری ہیں۔ عربی فارسی انگریزی حسب ضرورت کے جانتے ہیں۔ مدرستہ العلوم میں تعلیم پائی . . . عمر چھبیس برس کی ہے (ضیغم ص ۱۷۹)"

یہ بات ناممکنات میں نہیں ہے کہ یہ مصرعے انھیں لطیف کے ہوں لیکن اس پر یقین کر لینے کے لئے بہرحال کوئی مستحکم دلیل موجود نہیں ہے۔

بیاض کے کاتب، مرتب کا نام، زمانۂ کتابت و ترتیب وغیرہ کا کسی اندراج سے پتا نہیں چلتا۔ البتہ شروع کے آخری سادہ صفحے پر اردو میں یہ عبارت ملتی ہے :

"مملوکہ محمدر وح اللہ (کذا) عباسی"

بیاض کے آخر میں ایک سادہ صفحہ پر اسی شخص کا نام انگریزی میں اس طرح لکھا ہے :

"S. Mohammad Ruhullah Abbasi Hashmi . 1922"

اردو کی تحریر انگریزی کے مقابلے میں بہت طفلانہ ہے۔ خصوصاً نام کا املا تک صحیح نہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ اس شخص کو یہ بیاض اوائل عمر ہی میں مل گئی تھی، البتہ سنہ ۱۹۲۲ء کی تحریر میں پختگی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس سال سے کافی عرصہ پہلے یہ بیاض محمد روح اللہ عباسی کی ملکیت تھی۔

سید ہاشم علی سبز پوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ روح اللہ عباسی کے والد محمد رفیع اللہ عباسی چریا کوٹ[1] ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ لیکن خود روح اللہ کا قیام زیادہ تر جونپور اور غازی پور میں رہتا تھا۔ ان کے خاندان کی جناب ہاشم علی سبز پوش کے خاندان سے بھی قرابت کا کچھ سلسلہ تھا، روح اللہ اور رغمی دونوں کا عباسی النسب اور ہم وطن ہونا، اس بیاض کا بچپن ہی میں روح اللہ کے قبضے میں آ جانا اور دونوں کے ناموں میں مماثلت کا ہونا غالباً اسی سبب سے ہے کہ دونوں میں کچھ خاندانی تعلق بھی تھا۔ عین ممکن ہے کہ رغمی ہی کے سلسلے سے یہ بیاض روح اللہ اور پھر جناب سبز پوش تک پہنچی ہو۔

بیاض معمولی کتابی سائز پر ہے، اس میں مختلف رنگوں اور قسموں کا کاغذ استعمال کیا گیا ہے، مثلاً سفید، نیلا، بادامی، باریک موٹا وغیرہ لیکن سب کاغذات قیمتی اور اچھے ہیں، کاتب اگرچہ خوشخط ہے لیکن غلط نویس ہے۔ چنانچہ صدا بمعنی آواز کو سدا۔ اور سدا بمعنی ہمیشہ کو صدا لکھتا ہے۔ اس عہد کے رسم الخط کی کم و بیش تمام خصوصیات اس کے یہاں ملتی ہیں۔ مثلاً کاف تازی اور کاف فارسی میں ایک اور دو مرکز کا التزام نہیں ہے۔ یائے معروف اور یائے مجہول کے محل استعمال میں امتیاز نہیں کیا گیا ہے چنانچہ بعض دلچسپ غلط فہمیاں بھی ممکن ہیں مثلاً ایک شعر ہے :۔

خیر تو ہے کیوں نظر آتے ہو مرجھائے ہوئے صورت برگ خزاں ہیں گل سے رخساران دنوں

---

[1] گورکھپور کے سبز پوش خاندان کے بزرگوں کا وطن چریا کوٹ ہی تھا۔ وہاں سے یہ گورکھپور میں آکر آباد ہو گئے۔

کیا[۵] یہ بیاض اپنی اصلی حالت میں خاصی ضخیم رہی ہوگی، امتدادِ زمانہ سے اس کے کچھ اوراق ضائع ہوگئے ہیں۔ (اب ان کی صحیح تعداد کا تخمینہ بھی ممکن نہیں۔) اس کے مالکان نے وقتاً فوقتاً اس کی حفاظت کے خیال سے چند بار اس کی جلد بندی بھی کرائی، اس کا ثبوت جلد ساز کی بے احتیاطی سے ملتا ہے، کہ اس نے نہ صرف اوراق کی ترتیب بدل دی ہے، نہ صرف اوراق کو اکثر کٹوا دیا ہے بلکہ ان کی تراش بھی اس طرح کی ہے کہ اکثر تحریریں مجروح ہوگئی ہیں، موجودہ صورت میں اس کی ضخامت ۲۴۸ صفحات کی ہے۔ شروع اور آخر کے اٹھارہ اٹھارہ صفحات سادہ چھوڑ دیئے گئے ہیں اور یہ مذکورہ شمار میں نہیں۔ درمیان میں بھی بعض جگہوں پر ایک ایک دو دو صفحے سادے ہیں۔ اب صفحات کی ترتیب کا درست کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ان میں نہ تو اعدادِ شمار درج ہیں، اور نہ "ترک" ہی کا التزام ہے، اس لئے بحالتِ موجودہ ہی میں نے اس کے صفحات پر اعداد و شمار تحریر کر دیئے ہیں۔

صفحہ ۱ سے "شیخ امام بخش ناسخ" کی مشہور غزل کا خمسہ شروع ہوتا ہے، جس کا مطلع ہے :-

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اس کے شروع میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا ہے، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شاید یہی بیاض کا صفحہ اول ہو۔

صفحہ ۱۳ پر وہ مشہور شعر لکھا ہے جس کا مصرعِ ثانی ضرب المثل ہو کر رہ گیا ہے۔ ۶

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہی بیاض کا آخری صفحہ ہوگا۔ کیونکہ اس کا بھی امکان ہے کہ کاتب نے ایک شاعر کی غزلوں کے خمسے لکھ چکنے کے بعد دوسرے شاعر کی غزلوں کی تضمین نئے صفحے سے شروع کی ہوں۔ صفحہ ۲۴۸ (موجودہ حالت میں آخری صفحہ) پر ذیل کے تین مصرعے تحریر ہیں :-

.... ایسی غزل لکھی لطیف خستہ نے
خدا اٹھے گا شاعروں کو لطیف کے اشعار سے
اس لطافت سے لکھی غزل ... لطیف خستہ نے

---

[۵] سبز پوش صاحب موصوف کی اجازت سے راقم سطور نے استاذ محترم ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کی نگرانی میں اس ذخیرۂ کتب کے مطبوعات اور مخطوطات کی مکمل فہرست کئی سال ہوئے بنا دی تھی، اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ کس قدر اہم کتب خانہ ہے۔ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے مولانا سبحان اللہ کلکشن میں محزونہ کئی مخطوطات سبز پوش صاحب کے اس ذخیرۂ کتب میں موجود مخطوطات کی نقل ہیں۔ مرزا محمد رضا برق لکھنوی کا وہ دیوان بھی یہیں موجود ہے جس سے مرتب جواہر سخن مولانا محمد مبین کیفی چریاکوٹی نے استفادہ کیا ہے اور جس پر خود برق کے ہاتھ کی ایک اہم تحریر موجود ہے۔

ہے اس کی فہرست درج ذیل ہے ۔

تخلص و نام شاعر	مصرع غزل	نوعیت تضمین	تخلص و نام شاعر	مصرع غزل	نوعیت تضمین
آتش۔ خواجہ	کام ہے شیشہ سے ہم کو اور ساغر سے غرض	مخمس	آتش۔ خواجہ	چمن کا رنگ تجھ بن اپنی آنکھوں میں بدل ہے	مخمس
حیدر مسلی	کمر یار سے کب کی ہوئی تلوار جدا	"	حیدر مسلی	سانپ کا زہر یہ گیسو ہیں اگلنے والے	"
"	طرہ اسے جو حسن دل زار نے کیا	"	"	خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری	"
"	خدا نے برق تجلی تجھے جمال دیا	"	"	تازہ ہو دماغ اپنا تمنا ہے تو یہ ہے	"
"	تری زلفوں نے بل کھایا تو ہوتا	"	"	بیدرد کی محفل میں سزاوار نہیں تھے	"
"	اور تا چند لے دست ہوس قاتل کی گردن کا	"	"	ساتھ ہے بعد فنا حسرت فتراک ہنوز	"
"	آفت جاں ہے ترا اے سرو گل اندام قص	"		جلا میں شمع کی مانند عمر بھر خاموش	"
"	نشۂ عشق کا اثر ہے شرط	"		تار تار پیرہن میں بس گئی ہے بوئے دوست	"
"	رجوع بندہ کی اس طرح ہے خدا کی طرف	"			
"	سامنا کرنا ہی کیا اس کا شبستاں میں چراغ	"	الم۔ نواب	کر چکے ہیں عشق زلف یار کا	مسدس
"	یہ دل ہے جب سے تمہارے خیال سے واقف	"	محمد حسین خاں	غنچے دیکھ تو صیاد توڑے تو نے سالے پر	"
"	مرے دل کو شوق فنا نہیں ہے کہ لب تک آتی دعا نہیں	"	"	کس کے آئینۂ رخسار کا حیراں ہوں میں	"
"	دیوانگی نے عالم کیا کیا دکھا دیئے ہیں	"	"	اک جا برنگ بوئے گل اپنا مکاں نہیں	"
"	ٹھوکریں مار کے مردوں کو جلاتے نہ چلو	"	"	چھوٹ جائے گردہ زلف گرہ گیر ہاتھ سے	"
"	جو نعمت عشق کی چاہو تو راحت جان ایذا کو	"	"	شوق حرم نہ ہو نہ ہو دیر میں دل لگا ہے	"
"	محبت سے بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو	"	"	دن کو اٹھی فراق سے لذت وصال کی	
"	یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے	"		تعریف کیا ہو حسن بت پر غرور کی	مخمس
"	باغباں انصاف پر بلبل کے آیا چاہیے	"		دل اپنا ہے کس شوخ پہ مائل نہیں معلوم	
"	وہی جنوں کی خونخواری جو آگے تھی سو اب بھی ہے	"		انھی زلف یار کے سودے میں رو چکے	
"	جمال حور و پری پر ہے طعنہ زن متی	"		شوق بتاں ہے اس دل مضطر کے واسطے	
"	زلف کے سودے میں اپنے سر کو پھوڑا چاہیے			پڑا ہے آنسو پلک پہ اپنی نہ چھیڑ آپ ہی ٹپک پڑے گا	

مثلاً مولوی کریم الدین نے انشا کے حال میں لکھا ہے

"عہد دولت امیر الامرا نواب ذوالفقار الدولہ بہادر عفی عنہ کے . . . . وارد حضرت دہلی ہوئے" (طبقات ص ۲۰۳)

مصرعۂ اول اس طرح لکھا ہے :

خیر تو ہے کیوں نظر آتی ہو مرجھائی ہوئی

بیاض میں جا بجا اشعار پر اصلاحیں بھی کی گئی ہیں، لیکن ان اصلاحوں کی تحریر اصل سے مختلف معلوم نہیں ہوتی۔ کاتب عام طور پر مصنف، یا مصنف کے استاد یا کاتب ہی کو پہنچتا ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ اس کی کتابت سے پہلے رنگین کے ناسخ کا انتقال ہو چکا تھا، اس بنا پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ بیاض خود رنگین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اصلاحوں کی کچھ مثالیں یہ ہیں :- ع

گیا وہ شوق، وہ عالم، نہیں وہ تقریریں

یہ مصرعہ قلم زد کر دیا گیا ہے۔ دوسرا مصرعہ اس طرح لکھا ہے : ع

گیا وہ عشق، نہیں وہ صدا نہ تقریریں

اسی طرح ایک مصرعہ پہلے اس طرح لکھا تھا۔ ع

ہوا جو سامنا رنگیں تو وہ دم بھر نہیں ٹھیرے

تصحیح اس طرح کی گئی : ع - "ہوا جو سامنا رنگیں کا پہلے وار میں کاٹے"

اصلاح مزید یوں ہوئی : ع " ہوا جو سامنا رنگیں تو ایک ہی وار میں کاٹے "

بسمل کی ایک غزل کی تضمین پر عنوان اس طرح قایم کیا گیا ہے :

" از بسمل غزل و مخمس از رنگیں عفی عنہ "

اگرچہ "عفی عنہ" دوسرے کے نام کے ساتھ بھی لکھا گیا ہے لیکن رواج عام جو کچھ ہے اس کی بنیاد پر قیاس بالا کو تقویت پہنچتی ہے۔ البتہ ریحانی کی غزل کے خمسے سے بات کسی قدر الجھتی ہے جس کا آخری بند یہ ہے :

فصاحت طرفہ ریحانی شاعر (کذا) کی زبانی ہے بلاغت کی یہ ..... شیرینی ..... کی نشانی ہے

یہ رونق انجمن کی ہے یہ شمع ..... ہے یہی عادت ہے ریحانی یہی معجز بیانی ہے

حلاوت شعر تر میں ہو فزوں قند مکرر سے

پہلے مصرعے میں ریحانی تخلص اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خمسہ خود ریحانی کا ہے۔ بیاض رنگین میں اس کے اندراج کا یہ سبب ہو سکتا ہے کہ رنگین نے اسے پسند کیا ہو اور بطور یادداشت لکھ لیا ہو۔

یہ بیاض رنگین نے غالباً زمانۂ شباب میں مرتب کی تھی، یہ بات ان کے بعض اشعار سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک مصرعہ ہے :

ع۔ ہوا ہوں پیر بس رنگیں کہاں وہ توقیریں

اس بیاض میں انھوں نے اپنے پسندیدہ مختلف شعرا کی غزلوں پر مخمسے وغیرہ لکھے ہیں۔ موجودہ بیاض میں جو کچھ کلام

تخلص و نام شاعر	مصرع غزل	نوعیت تضمین
ناسخ شیخ امام بخش	چراغ زیست مرا جب تلک کہ روشن تھا	مخمس
"	ہر پھول تیرے رشک سے جب آب ہو گیا	"
"	کام خونریزی ہے اس یوسف بازاری کا	"
"	جب زمین شعر کا میں باغباں پیدا ہوا	"
"	جی لیتی ہے وہ زلف سیہ نام ہمارا	"
"	کیا گزر اس کے دہاں تنگ سے ہو بات کا	"
"	جلوہ رخسار جاناں سے نکل آتی ہے دھوپ	"
"	چشم عاشق کو برابر ہے دلا گھر باہر	"
"	دست خالی ہی ملا ہے ہمیں ساغر کے عوض	"
"	چاک کرنے کی نہیں پاتا ہوں طاقت ہاتھ میں	"
"	خوں فشاں چھالے ہیں مثل چشم گریاں پاؤں میں	"
"	لگنے دو خاک کوچۂ دلدار پاؤں میں	"
"	مجھ کو عریانی میں کیا ہو پیرہن کی آرزو	"
"	ملی ہے جنوں سے وحشت کروں کیا طوق آہن کو	"
"	جس طرح بعد سفیدی کے نہیں بال سیاہ	"
"	دھوپ بہتر پر شب فرقت کی بدتر چاندنی	"
"	پھر بہار آئی چمن میں زخم گل آئے ہوئے	"
"	پستی ہے جو وہاں خاک گرہ گیر گلے میں	"
"	کوئے جاناں دیکھ پائے گل تو گلشن چھوڑ دے	"
"	سو تصور سے بہتر ہے کہانی سحر دل کی	"
"	نالہ و گل کا جوش ہے بلبلوں کا خروش	"
"	پاس یار جانی ہے بادہ ارغوانی ہے	"
نذیر خواجہ محمد نذیر	سر مرا کاٹ کے پچھتائیے گا	"
"	نہ کیا ذبح گیا چھوڑ کے بسمل قاتل	"

تخلص و نام شاعر	مصرع غزل	نوعیت تضمین
نذیر خواجہ محمد نذیر	اٹھا اٹھا کے جو پردہ نگاہ کرتے ہیں	مخمس
"	ہیں آج دست غیب تیرے آشنا کے ہاتھ	"

(مخمسات رنگین بر غزلیات اردو بر غزلیات فارسی)

تخلص و نام شاعر	مصرع غزل	نوعیت تضمین
جامی	جہاں روشن است از جمال محمد	مخمس
شہید	شے ہمہ رو زلف تو سودائے دل	"
"	افتد چو عکس عارض گلگوں در آئینہ	"
قدسی[1]	مرحبا سید مکی مدنی العربی	مخمس و مسبع

بیاض کی موجودہ کیفیت یہی ہے یہ غزلیں موجود ہیں یقین ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی مخمسے وغیرہ رہے ہوں۔ رنگین صاحب تصانیف شخص تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ان کے متعلق لکھا ہے:۔

"اردو فارسی کی انشا پردازی میں کئی مجلد لکھ چھوڑے ہیں۔ جانتے ہیں کہ ان کی فصل اب بالکل نکل گئی، ہوا مخالف ہے اس لئے نہ آپ گوشۂ عافیت سے نکلتے ہیں، نہ انھیں نکالتے ہیں"

کئی سال ہوئے قاضی عبدالودود صاحب نے ایک

---

[1] قاضی عبدالودود صاحب اس غزل کے متعلق لکھتے ہیں:۔ "یہ غزل ممکن ہے کہ قدسی تخلص کے کسی شاعر کی ہو۔ لیکن ایرانی قدسی (محمد جان) کے دیوان کے متعدد نسخوں سے جو میری نظر سے گزرے ہیں غیر حاضر ہے اور کسی تذکرہ میں بھی ان کے نام سے نہیں ہے"

تخلص ونام شاعر	مصرع غزل	نوعیت تضمین	تخلص ونام شاعر	مصرع غزل	نوعیت تضمین
تسمل شاگرد آتش	دہن آنکھوں سے ہوا خلق کی پنہاں تیرا	مخمس	رند سید محمد خاں	ہاتھ کا تیرے اگر چھلا نشانی ہائے شمع	مخمس
"	شکل کو دیکھ کے ہو جاتے آزار ہیں آپ		"	کہاں تلک تری الفت کریں بیاں مشتاق	"
	نکلا جو یار زلف پریشاں کو چھوڑ کر		"	پڑتی ہے آکے جان پہ آخر بلائے دل	"
	[illegible] پیمانہ کا جاتا رہا لحاظ		"	میکدے میں کرتے ہیں گر رندے آشام رقص	"
	آتی نہیں ہے [illegible] کو شب فرقت میں نظر صبح		"	ہو گیا ہے عشق کا پھر تیز بازار دلوں	"
	در پے خرابیوں کے ہے لیل و نہار چرخ		"	کیسی ہے حسرت دید رخ جاناں مجھ کو	مسدس
	قتل عالم کو تری گرمی ہے رفتار صنم			ناز کافر نہ اٹھا سنت دیں دار نہ کھینچ	مخمس
	جس سے الفت گماں کرتے ہیں		شفا	شانہ جو کر کے چھوڑ دے وہ خوش خرام زلف	"
	جدھر وہ آنکھ اٹھا کر نگاہ کرتے ہیں		فیض	مزاج اب ہے جہانے تازہ پر کچھ اس ستمگر کا	"
	وصل کہہ ہے یار کا میرے رہاں نہیں			تم کھل کے تو کچھ بات مری جاں نہیں کہتے	"
	پھولیں گل و یاسمن ہمیشہ			دل کرو خالی تو یہ مینائے خضر ٹوٹ جائے	"
	کوئی دن ایسا نہ تھا ایسی کوئی رات نہ تھی		محیط	محیط خلق پہ کیوں تیری جستجو نہ رہے	"
	چشم بیمار کے نظارے سے صحت ہو گی		نادر	ہر چند کہ ہم سے تجھے الفت نہیں قاتل	"
	کسے ہے سرو و گل و لالہ و سمن سے غرض		"	کیونکر اس چاہ ذقن سے دل مضطر نکلے	"
			"	سر پہ کبھی احسان مسیحا نہیں رکھتے	"
زخمی علیم اللہ	نہیں تہہ بڑھا کچھ حسن کا ملبوس و زیور سے	غزل	"	للہ اپنے کاکل پیچاں بنائیے	"
ریحانی	ہماری آتش الفت ہے کوئی کہہ دے ستمگر سے	مخمس از ریحانی	"	آج تشہیر مری ہوئے گی غوغا یہ ہے	"
رند سید محمد خاں	جستجوئے شاہد مقصود ہے ملے دل عبث	مخمس	"	ہم عشق کبھی مثل زلیخا نہ کریں گے	"
"	دو دن سے منہ بنائے ہے غنچہ دہن عبث	"	"	یہ خوب غذائے دل بیمار نکالی	"
"	سکت کہاں جو کرے تیرا ناتواں فریاد	"	ناسخ شیخ	مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا	"
"	کھلے ہیں کیا ترے بازو پہ سیم بر تعویذ	"	امام بخش	کوئی مضمون اگر لکھتا ہوں اس حال پریشاں کا	"
	مجھ کو پہنچا یا کسی نے بھی نہ اس دلبر کے پاس	"	"	یہ نور ہے رخ [illegible] جبیں کا کہ [illegible]	"
	خار ہیں کھاتا ہوں غیروں کے لئے دسترس	"	"	تیر سے جاتے ہی تیرا رنگ چمن ہو جائے گا	"
	نالے شرر فشاں رہے تاب فغاں تلک	"	"	گل کو جب دیکھا وہ گلگوں پیرہن آ گیا	"

اس کے بعد میں نے کتاب مرتب کر کے اس کا مسودہ پیش کیا۔ موصوف محترم نے اسے ملاحظہ فرمایا اور رعنی کے سلسلۂ حالات میں بعض بیش قیمت ہدایات سے بھی سرفراز فرمایا۔ میں ان عنایات کے لئے احسان مند ہوں۔

انتخاب رعنی کے کچھ اجزا رسالہ پگڈنڈی امرتسر میں بالاقساط شائع ہو چکے ہیں اس کے لئے میں مدیر رسالہ کا شکر گزار ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ اب نظر ثانی میں اس میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ ہو چکا ہے۔

تذکرہ شعرائے اردو جو دراصل کسی کتاب کا ضمیمہ ہے، مرتب کر کے شائع کیا ہے، جس کا مصنف کوئی "ابن امین اللہ طوفان" ہے۔ ابھی تک یہ بات متیقن نہیں کہ وہ "ابن طوفان"[1] رنگین ہی تھا۔ اس لیے اس بیاض (مجموعۂ مخمسات) کے متعلق یہ کہنا کہ رنگین کی واحد تصنیف ہے جواب تک دریافت ہو سکی ہے کچھ غلط نہیں۔

رنگین نے اپنے عہد کے کئی غیر معروف اردو شعرا کے علاوہ اس زمانے کے بعض اکابر شعرا کے کلام کی تضمینیں کہی ہیں۔ مشاہیر شعرا کے سلسلے میں یہ بات خصوصیت سے اہم ہے کہ اس میں ان کی کچھ ایسی غزلیں بھی شامل ہیں جو ان کے متداول دواوین میں موجود نہیں ہیں۔ ان کی افادیت کے پیش نظر ان کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ چونکہ یہ تمام غزلیں رنگین نے مخمس، مسدس وغیرہ کہنے کے لئے منتخب کی تھیں، اس لئے اس مجموعہ کا نام "انتخاب رنگین" مناسب معلوم ہوا۔ اس سے رنگین کی پسند اور ان کی طبیعت کے میلان کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس انتخاب میں آتش، ناسخ اور وزیر کی غزلوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ جو ان کے مطبوعہ دواوین میں شامل ہیں۔ اتفاق کہ رند اور وزیر کی ایسی کوئی غزل نہ بچی جو اس اصول کے تحت اس انتخاب میں شامل کی جا سکتی۔ ناصر کے متعلق اگرچہ یہ مسلم ہے کہ انھوں نے کئی دواوین مرتب کئے تھے، لیکن ان کا کلام عام طور پر نہیں ملتا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے تذکرۂ ناصر میں ان کے حالات کافی تفصیل سے لکھے ہیں لیکن خیال ہے کہ موصوف کو بھی ان کا کلام (بجز ایک مشہور شعر کے) نہ مل سکا۔ چنانچہ وہ اس میں شامل نہیں ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان کی تمام غزلیں انتخاب میں شامل کی جائیں۔ بسمل، ریحانی، شفا، محیط اور فدا وغیرہ غیر معروف شعرا ہیں ان کے کلام کا بھی اس انتخاب میں شامل کیا جانا ضروری معلوم ہوا البتہ فارسی شعرا کی غزلیں مشہور بھی ہیں اور اردو کے نقطۂ نظر سے ان کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں اس لئے انھیں اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

رنگین نے اس مجموعہ مخمسات وغیرہ کو ایک بیاض کی صورت میں مرتب کیا تھا اس لئے انھوں نے شعرا کے حالات بلکہ نام لکھنے کا بھی التزام نہیں کیا ہے ناسخ اور آتش وغیرہ کی شخصیتیں محتاج تعارف نہیں اس لئے اب ان کے حالات تفصیل سے لکھنا غیر ضروری معلوم ہوا۔ صرف ضروری تاریخیں لکھ دی ہیں البتہ غیر معروف شعرا کے حالات جو کچھ بھی مل سکے وہی حاشیہ پر لکھ دیئے ہیں۔

جب مجھے انتخاب رنگین کی ترتیب کا خیال ہوا تو میں نے یہ بات قاضی عبدالودود صاحب کی خدمت میں عرض کی۔ جناب نے اس سلسلے میں میری ہمت افزائی کی اور فرمایا کہ "کتاب کے بارے میں آپ کا منصوبہ ٹھیک ہے"

---

[1] قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں:

ناسخ کا ایک نام تذکرہ ابن طوفان میں عبداللہ درج ہے اور آزاد نے رنگین کے حوالے سے ناسخ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ شامل نہیں اس میرا خیال تھا کہ یہ تذکرہ رنگین کا نہیں لیکن رنگین کا خط بنام آزاد جو چند سال قبل چھپا تھا اس میں جہاں تک مجھے یاد ہے یہ نام موجود ہے۔ اب میرا خیال ہے کہ امکان یہی ہے کہ رنگین اس کے مصنف ہیں۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ یہ بات ناممکن نہیں کہ رنگین تذکرے کے مصنف ہوں مگر وہ ہیں تو ... بعد لکھا ہوں گے۔ میں نے خود یہ فیصلہ کیا ہے کہ رنگین نہیں مگر امکان سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔

افسر صدیقی

کتب خانۂ خاص کی بیاضیں

(۱)

اردو کے وہ شعرائے قدیم جن کے دواوین دستیاب نہیں ہوتے ان کا کلام قلمی بیاضوں میں مل جاتا ہے، جن شعرا کے دواوین شائع ہو چکے ہیں یا قلمی صورت میں محفوظ ہیں، ان کا بھی بہت سا ایسا کلام ان بیاضوں میں مل جاتا ہے جو دواوین میں شامل نہیں اس اعتبار سے بیاضوں کی بڑی اہمیت ہے لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ ان بیاضوں پر اہلِ تحقیق نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ انجمن کے کتب خانۂ خاص میں بہت سی بیاضیں ہیں جن میں ایسا مواد موجود ہے جس سے اردو شاعری کی تاریخ کی بہت سی گمشدہ کڑیوں کا سراغ مل جاتا ہے ــــــــ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان بیاضوں کو "قومی زبان" میں شائع کر دیا جائے۔ تاکہ اہلِ تحقیق ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس سلسلے میں یہ طریق کار اختیار کیا گیا ہے کہ شعرا کا صرف غیر مطبوعہ کلام شائع کیا جائے اور مطبوعہ کلام کا حوالہ دے دیا جائے۔ اگر مطبوعہ کلام اور بیاض میں مندرجہ کلام میں کچھ فرق ہو تو اس کی صراحت کر دی جائے۔ اس سلسلے کا آغاز جس بیاض سے ہو رہا ہے، کتب خانۂ خاص کی فہرست میں اس کا نمبر ۳۳ ک (قلمی) ہے (ادارہ)

یہ بیاض مکمل نہیں ہے۔ کاتب نے برقؔ کی چھٹی غزل لکھتے لکھتے چھوڑ دی ہے۔ اس طرح باقی صفحہ سادہ رہ گیا ہے اور فناؔ کی نویں غزل کے صرف چھ اشعار لکھے ہیں، چھٹے شعر پر صفحہ مکمل ہو گیا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کاتب نے خود ہی بیاض کا باقی حصہ مکمل نہیں کیا یا بیاض کے آخری اوراق ضائع ہو گئے۔ چونکہ کاتب نے ترک کا طریقہ استعمال نہیں کیا اس لئے یقین کے ساتھ کوئی بات کہنا مشکل ہے۔

بیاض میں کل ۴۸ صفحات ہیں۔ خط نستعلیق ہے۔ مصرعے عام طور پر آڑے ترچھے لکھے گئے ہیں۔ سطروں کی تعداد ہر صفحہ پر مختلف ہے۔ کاتب کا نام اور تاریخ کتابت درج نہیں۔ قیاس کا تقاضا ہے کہ یہ بیاض کم سے کم ایک صدی قبل لکھی گئی ہو گی۔

بیاض میں کل ۱۹ غزلیں ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

مرزا محمد رضا برقؔ کی ۶ غزلیں، ان میں سے ایک غزل نامکمل ہے

اللہ داد بیگ سبقتؔ کی ۲ غزلیں۔

مرزا محمد تقی ہوسؔ کی ایک غزل۔

...... نامعلوم ایک غزل۔

بدنام اس کو روزنِ دیوار نے کیا　　رخنہ خدنگ، آہ دلِ زار نے کیا
جس دم کنارہ اس گہرِ شہوار نے کیا　　دریا میں غرق چشمِ گہربار نے کیا
پرگرد پھر کے لائے ہیں تا بو میں یار کو　　مقصود نقطہ کو خطِ پرکار نے کیا
دیکھا جو مجھ کو آنکھ اٹھا کر شفا ہوئی　　اچھا تمہاری نرگسِ بیمار نے کیا
آیا سوادِ کوچۂ زلفِ سیاہ یاد[1]　　سودائی تیرے سایۂ دیوار نے کیا
بیماریٔ فراق سے بچنا محال ہے　　زندہ دوبارہ شربتِ دیدار نے کیا
کیا کیا الجھ کے یاد میں زلفوں کی جان دی[2]　　قصہ تمام طولِ شبِ تار نے کیا
اس مہر کی تلاش میں گردش ہی پیش ماہ　　سیارہ مجھ کو اخترِ سیار نے کیا
آنے ہی اس کے اڑ گئی بختوں کی تیرگی　　دن رات کو شعاعِ رخِ یار نے کیا
مر مر گیا فراق میں کہتے ہیں اس کو ضبط　　شکوہ نہ درد کا ترے بیمار نے کیا
دل پھٹ گیا جو غیر کو جھانکا وہ شوخ چشم　　الفت میں رخنہ رخنہ[3] دیوار نے کیا
چکرا گئے کمر میں نزاکت سے بل پڑا　　بیکل دمِ خرام اسے یار نے کیا
مجھ کو جنوں میں پاس رہا رازِ عشق کا　　پوشیدہ داغِ سر سری دستار نے کیا
آتے نہیں ہیں صاف نظر چینِ الف سے　　پیدا طلب میں مشکِ ختن یار نے کیا
یوسف سے وہ عزیز ہے اس کی نگاہ میں　　جس کو پسند جس کے خریدار نے کیا
جو ہے علیل [illegible] ہے اس کی علیل پر　　میرا علاج نرگسِ بیمار نے کیا
آنکھوں سے دل ہلاک ہوا قعرِ چشم میں　　روزن رکھے ستم مرے معمار نے کیا
پریوں کی طرح سے گئیں اڑ کر کہاریاں　　جب یاد اس پری کے ہوادار نے کیا
دریائے نور ہے بدن اس رشکِ حور کا　　اثباتِ موج رشتۂ زنار نے کیا
شل ملتے ملتے ہاتھ ہوئے برق ہجر میں　　بیکار میرے ہاتھوں کو رفتار نے کیا

غزل (۳)

برق کی تیسری غزل کا مطلع یہ ہے

کبھی خیال میں موئے کمر نہیں آتا　　مثالِ تارِ نظر کیا نظر نہیں آتا

(مخطوطہ میں مصرع اول کو مصرع دوم اور مصرع دوم کو مصرع اول کر کے لکھا ہے۔

---

[1] مخطوطہ میں "یار" لکھا ہے۔ [2] مخطوطہ میں "دا" ہے۔ [3] رخنہ رخنہ کے بدلے رفتہ رفتہ تحریر ہے۔

عبدالکریم خاں حنا کی ۹ غزلیں۔ ان میں سے ایک غزل نامکمل ہے۔

کاتب کا خط پختہ ضرور ہے لیکن وہ غلط نویس ہے۔ لفظوں کو ملا کر لکھنے کا خوگر ہے۔ یائے معروف و مجہول کو لکھتا ہے۔ بیاض میں کتابت و املا کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ بعض مقامات پر ہم نے نقل کرنے میں یہ غلطیاں دور کر دی لیکن ابھی بہت سے مقامات ایسے ہیں جو ہماری سمجھ میں نہ آ سکے۔ ایسے مقامات پر سوالیہ علامت (کذا) موجود ہے اس کے باوجود بیاض اہم ہے اور اس سے گذشتہ صدی کی لکھنوی شاعری کے اچھے نمونے سامنے آتے ہیں۔

کلام برق

مرزا محمد رضا برق لکھنوی تھے، ان کا خطاب فتح الدولہ بخشی الملک تھا۔ شعر گوئی میں امام بخش ناسخ سے اصلاح لی، آخری فرمانروائے اودھ نواب واجد علی شاہ اختر کے مصاحب تھے۔ اور ان کے ہمراہ مٹیا برج کلکتہ چلے گئے تھے وہیں ۱۸۵۸ء میں وفات پائی۔ برق کا ضخیم دیوان مطبع سلطانی لکھنؤ سے ۱۲۷۳ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ مخطوطہ زیر تبصرہ برق کی چھ غزلیں ہیں۔ ان میں سے پانچ غزلیں مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔ البتہ ان کے بعض بعض اشعار میں تبدیلیاں ہیں جو غزلیں دیوان میں شائع ہو چکی ہیں ان کا شائع کرنا فعل عبث ہے، صرف اختلافات کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔ البتہ غزل دیوان میں شامل نہیں ہو سکی ہے اسے ہم نے مکمل نقل کر دیا ہے

غزل (۱)

برق کی پہلی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

وہ رشک مہر عیسیٰ دم اگر پیدل رواں ہوگا   زمیں کی طرح زیر پائے عالی آسماں ہوگا

اس غزل کے صرف دو شعر ترمیم شدہ ہیں۔ ایک شعر مطبوعہ یوں ہے ؎

ہنسیں گے ہر دہانِ زخم سے گل کی طرح کشتے   تری تیغ دودم کا کھیت کشتِ زعفراں ہوگا

مخطوطہ میں پہلے مصرع کی تبدیلی کے ساتھ شعر اس طرح لکھا گیا ہے ؎

ہنسیں گے ہر دہان زخم گل کی طرح کشتے کے   تری تیغ دودم کا کھیت کشت زعفراں ہوگا

دوسرا شعر ؎

جدا ہوں گے نہ مثل بوح اپنے روح پرور سے   برنگ طائر نکہت، گل اپنا آشیاں ہوگا

مخطوطہ میں "روح پرور" کی جگہ "اوج پرور" ہے۔ اس کی غلطی ظاہر ہے۔

غزل (۲)

برق کی یہ غزل دیوان مطبوعہ میں نہیں ہے۔

مجھ کو نشانہ مژدۂ یار نے کیا   کارِ تفنگ روزنِ دیوار نے کیا

لٹیں فرقت میں دود شمع کی کیونکر نہ اڑ رہی ہوں
تصور ہے ہمارے دل کو یار زلف پیچاں کا

کلام بسمل

برق کے بعد بسمل کی دو غزلیں ہیں، ان کا نام اللہ داد بیگ لکھا ہے۔ لیکن حاشیہ میں درج ہے" یہ صاحب کون ہیں معلوم یں" دراصل صاحب بیاض سے نام لکھنے میں سہو ہوا ہے۔ محسن لکھنوی نے 'سراپا سخن' میں ان کا نام اس طرح لکھا ہے (ص ۳۵۹) ی بیگ عرف مرزا اللہ یار بیگ بسمل خلف اور شاگرد مرزا محمد امین بیگ طاہر باشندۂ لکھنؤ صاحب دیوان۔

اسی عبارت کو عبدالغفور خاں نساخ نے بھی نقل کیا ہے (سخن شعرا ص ۶۶)۔ بسمل بہت اچھے خطاط تھے ان کا لکھا ہوا دیوان عیشی قلمی خانہ خاص میں موجود ہے۔ چونکہ بسمل کا دیوان طبع نہیں ہوا، اس لئے دونوں غزلیں سالم درج کی جاتی ہیں۔

غزل اول

ہائے اس رشک قمر بن مجھ کو کیونکر چاندنی
چادر میت سی ہے گویا کہ مجھ پر چاندنی

روشنی حسن میں اس ماہرو کے ہمنشیں
ہے شب تاریک کے مجھ کو برابر چاندنی

اس طرح اس مہ کے پرتو سے ہیں چھپ جاتے حسیں
جوں چھپا دیتی ہے انجم کو نکل کر چاندنی

روئے تاباں سے الٹ دی زلف یوں اس ماہ نے
جیسے بدلی سے نکل آوے چمک کر چاندنی

سیر کی خاطر جو آوے بام پر وہ رشک ماہ
اس کے نور حسن سے ہو وے مکدر چاندنی

ہو بغل میں ساقی مہوش پئیں باہم شراب
تب مزا ہے گر دکھاوے یوں مقدر چاندنی

دور ہو تاریکی غم آ بہم ہووے شراب
چودھویں شب کی عجب ہے آج دلبر چاندنی

خاک پر اس رشک مہ کی جو ہیں کوچے میں مقیم
بہر بستر کیا کریں وہ لے کے چادر چاندنی

کر دیا ہے ماہ کو تسخیر یہ حالا نہیں
دیکھتا ہے آج شاید وہ فسوں گر چاندنی

پاس بیٹھا ہو مرے وہ ساقی رشک قمر
نکلی ہو کہ چودھویں شب کی چمک کر چاندنی

اور میں اس کی شراب وصل سے بسمل ہوں مست
آرزو ہے یوں دکھاوے گر [illegible]ر چاندنی

دوسری غزل

ادائے گرم ہے از بس جو نازنینوں میں
لگاتی آگ ہے یہ عاشقوں کے سینوں میں

ہزار رنگ سے ہوتا ہے جلوہ گر وہ گل
یہ کیونکہ فرق ہوا اہل جہاں کے دینوں میں

یہ تیری نرگس جادو کی کیا نگاہ تھی سحر
کہ عقل و ہوش رہا کچھ نہ خود بینوں میں

دکھائی دیتے ہیں انجم کی طرح گرد اس کے
وہ ماہ بیٹھے ہے جب محفل حسینوں[۲] میں

ر چاہئے۔ [۲] محفل حسینوں، غار آتشینوں اور حور جبینوں کر- میں ۔ حرف جار کے ساتھ مجرور بنانا قطعی غلط اور نا درست ہے
بسمل سے ہے۔

اس غزل کا مخطوطہ میں ایک شعر اس طرح ہے ؂

جو اپنے دل پہ گزرتی ہے ہم کہیں کس سے — کسی کو نسخۂ درد جگر نہیں آتا

لیکن مطبوعہ دیوان میں اس طرح درج ہے ممکن ہے کہ طباعت کے وقت اصلاح کی گئی ہو۔ ؂

گزرتی ہے جو دل پر وہ ہم کہیں کس سے

غزل (۴)

چوتھی غزل کا مطلع ہے ؂

قیدِ ہستی میں عشقِ خال رہا — دام میں دانے کا خیال رہا

مخطوطہ میں دونوں جگہ ردیف "ہوا" لکھی گئی ہے حالانکہ پوری غزل کی ردیف "رہا" ہے۔ اسی غزل کا ایک شعر دیوان میں اس طرح ہے ؂

رہے جب تک کہ آپ مجلس میں — ایسی حالت رہی کہ حال رہا

مخطوطے کے پہلے مصرعے میں مجلس کے بدلے محفل ہے۔ تبدیلی کی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس غزل کے مقطع میں بھی قدرے اختلاف ہے ؂

(دیوان)؛ میرے قاتل کے دور میں اے برقؔ — عاشقوں کا ہمیشہ کال رہا

(مخطوطہ)؛ میرے قاتل کے دور میں اے برقؔ — عاشقوں کا جہاں میں کال رہا

غزل (۵)

برقؔ کی پانچویں غزل کا مطلع یہ ہے ؂

ہولی میں کھیل ہے یہ مرے گلعذار کا — رنگ اڑ رہا ہے باغ میں روئے بہار کا

اس غزل کے آٹھ شعر مطبوعہ دیوان میں ہیں، لیکن مخطوطہ میں نو شعر ہیں، زائد شعر یہ ہے ؂

رونے کی میرے اس کو حقیقت ہو کیا صبا — نامہ نہیں یہ پارہ ہے ابر بہار کا

خدا جانے اس شعر کو دیوان میں کیوں مندرج نہیں کیا گیا۔ انداز بیان تو وہی ہے جو دوسرے اشعار کا ہے۔

غزل (۶)

برقؔ کی چھٹی غزل کا مطلع یہ ہے ؂

نہیں ممکن نظارا عارض رنگین جاناں کا — کیا ہے آئینے نے کام دیوار گلستاں کا

صرف ۵ شعر نقل کئے گئے ہیں حالانکہ پوری غزل ۲۲ اشعار کی ہے۔ اس غزل کا ساتواں شعر یہ ہے ؂

لٹیں فرقت میں دو دو شمع کی کیونکر نہ ابتر ہوں — تصور ہے ہمارے دل کو تار زلف پیچاں کا

دیوان مطبوعہ میں اس کی ترمیمی صورت یہ ہے ؛

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں[1] شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد
(۴) قدر زندے کی بشر کو نہیں ہوتی ہرگز[2] یاد آوے گی تجھے میری وفا میرے بعد
(۲) کیا عجب مرقدِ مجنوں سے جو نکلے آواز[3] میرے مجنوں! ترا کیا حال ہوا میرے بعد
(۱) اپنے مرنے کا مجھے غم نہیں پر یہ غم ہے کون ہوگا ہدفِ تیرِ بلا میرے بعد
(۳) میں نے زنداں میں ہی جان بلا سے تیری[4] باغِ عالم میں رہی گو کہ فزا میرے بعد
اب تو کرتے ہو بہت لطف و کرم تم لیکن بھول جانا نہ مجھے بہرِ خدا میرے بعد
بسکہ باعث تھا اسے شوخ کی بدنامی کا سجدۂ شکر کیا اس نے ادا میرے بعد
لاش مجھ کشتہ کاکل کی کہیں لٹکا دو تا نہ ہووے کوئی مجبوس بلا میرے بعد
اب تو ہنس ہنس کے لگاتا ہے وہ مہندی لیکن[5] خوں رلاویگا اسے رنگِ حنا میرے بعد
مجھ سا بدنام کوئی عشق میں پیدا نہ ہوا ہاں مگر قیس کا کچھ نام رہا میرے بعد
(۷) اٹھ گیا میں بھی جہاں گزراں سے تو ہوس خاک چھانے گی بہت بادِ صبا میرے بعد

جن سات اشعار کے شروع میں نمبر دیئے ہوئے ہیں وہ مصحفی کے ریاض الفصحا میں نمبروں کی مذکورہ ترتیب کے مطابق درج ہیں
ایک مطلع اور ہے جو بیاض میں موجود نہیں لیکن مصحفی نے ہوس کے انتخاب کلام میں دیا ہے ؎

بیکسی ہی نے نہ دنیا کو تجا میرے بعد غم بھی مرقد پہ مرے بیٹھ رہا میرے بعد

لا اعلم

ہوس کی اس غزل کے بعد، ایک غزل کے پانچ شعر نقل کئے گئے ہیں ان میں سے کسی میں شاعر کا تخلص نظم نہیں ہوا اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ غزل کس کی ہے لیکن اس بنا پر کہ ہوس کی غزل کے بعد نقل ہوئی امکان ہے کہ ہوس ہی اس کے مصنف ہوں۔ غزل یہ ہے :-

اپنی قسمت کے ہاتھوں داغ ہوں میں نفسِ عیسوی چراغ ہوں میں
ہوں فتادہ برنگِ نقشِ قدم رفتگاں کا مگر سراغ ہوں میں
دونوں عالم سے کچھ پڑی ہے نظر آہ کس کا دلِ فراغ ہوں میں
ہوں میں گلچینِ بوستانِ خلیل آگ میں ہوں پہ باغ باغ ہوں میں

---

[1] مخطوطے میں "دست" ہے
[2] مصحفی نے یہ مصرع اس طرح لکھا ہے "جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے"
[3] اصل میں "مرقد" ہے
[4] اصل میں "یہ صدا" ہے
[5] مصحفی نے یوں لکھا ہے "میں تو زنداں ہی میں دی جان بلا سے تیری"
[6] یہ شعر دیوانِ فائق مطبوعہ میں ہے -

پڑیگا فرق شرافت میں دیکھ کہنا مان — نہ جاکے بیٹھ کبھی یار تو کمینوں میں
عزیز خلق ہے نام خدا تو ایسا یار — کہ تیرا نام کھدلتے ہیں سب نگینوں میں
جو ہو رہے اہل ستم جان اس کے ہاتھوں کو — لیے ہیں اژدرے دو غار آستینوں میں
جو دیکھے جلوۂ خوبی ترا بہشتی رو — پری تو کیا نہ رہے تاب حور عینوں میں
فریب سامری کھا دے وہ کام کرتی ہے — نگاہ سحر تری سحر آفرینوں میں
سمجھتے جو نہیں نور اس کا شمع کعبۂ دین — یقیں ہے نور نہیں چشم بے یقینوں میں
نظر یوں آتے ہیں آنکھوں میں میرے دانۂ اشک — کہ جیسے ہو دیں لبالب گہر سفینوں میں
نہ دیکھیں شاہد معنی کی شکل اے بسمل — جو شمع آہ نہ ہو میرے ہم نشینوں میں

کلام ہوس

مرزا محمد تقی خاں نام. نواب مرزا علی خاں کے بیٹے تھے۔ سلسلۂ نسب مالک اشتر تک پہنچتا ہے. ابتدا میں میر حسن کے شاگرد رہے ان کی وفات کے بعد غلام ہمدانی مصحفی سے اصلاح لی۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں اور ایک اردو دیوان کے مصنف ہیں۔ مثنوی متعدد مرتبہ چھپ چکی ہے لیکن دیوان غیر مطبوعہ رہا البتہ اس کا انتخاب سید حسین بلگرامی نے کیا تھا اور ۱۸۹۶ء مطبع مفید عام آگرہ میں چھپا تھا۔ لیکن اس میں اس غزل کا کوئی شعر نہیں ہے

اس مخطوطہ میں ہوس کی جو غزل نقل ہوئی ہے اس کے کئی شعر تذکروں میں آتے ہیں اور کافی مشہور ہیں۔ مناسب ہے کہ پوری غزل ہی شائع کردی جائے۔ — ہ

آکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد[1] — نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد
وہ ہوا خواہ چمن ہوں میں کہ دہر ہے صبح و مسا[2] — پہلے میں آتا ہوں اور باد صبا میرے بعد
منہ پہ رکھ دامن گل روئیں گے مرغان چمن[3] — باغ میں خاک اڑائے گی صبا میرے بعد
سنگ سے پھوڑ کے ہر جام جو ہیں مست ہوا — کاٹ ڈالے گی صراحی بھی گلا میرے بعد
ہو گیا سلسلۂ مہر و محبت برہم — خوبرو بھول گئے ناز و ادا میرے بعد
س لیے چنتا ہوں میں آنکھوں سے خار صحرا — رنج کھینچے نہ کوئی آبلہ پا میرے بعد
گوشت کے زاغ و غلیواز کریں گے حصے — ہڈیاں بانٹیں گے آپس میں ہما میرے بعد
چاک کرتا ہوں (میں) اس غم سے گریبان کفن[4] — کون کھولے گا ترے بند قبا میرے بعد

---

[1] یہ مطلع اور یہ شعر معمولی تبدیلی کے ساتھ منور خاں غافل کے دیوان مطبوعہ میں بھی ہیں [2] مخطوطہ میں "پا" بن گئے، غلط نقل کیا گیا ہے۔

(۲) اصل شعر ؎	کر گیا ہنس ہنس کے وہ بت قطع الفت کے کلام	کس کو باور ہو اگر کہیے وہ ہنس کر لڑ گیا
اصلاح ؎	ــــــــ محبت کے ــــ	ــــــــــــــ
بیاض ؎	ــــــــ کل قطع الفت کا کلام	ــــــــــــــ
(۳) اصل شعر ؎	پانی پانی تو وہ فوراً شرم سے ہو جائے گا	ابر گر تجھ سے ہمارا دیدۂ تر لڑ گیا
اصلاح ؎	ــــــ دیکھ لینا رشک ــــــ	ابر تر سے گر ــــــــ
بیاض ؎	دیکھ لینا پانی پانی شرم سے ہو جائیں گے	ابر گر تجھ سے ہمارا دیدۂ تر لڑ گیا
(۴) اصل شعر ؎	مل گیا دل بھی وہیں جب چار آنکھیں ہو گئیں	شیشے سے شیشہ لڑا ساغر سے ساغر لڑ گیا
اصلاح ؎	ــــــ جب اُس سے ــــــ	ــــــــــــــ
بیاض ؎	دل کے ملتے ہی ہوا وہ مہر مجھ سے چشم چار	ــــــــــــــ
(۵) اصل شعر ؎	اوج پکڑا اس قدر اپنے ہمائے فکر نے	حضرت جبریل کے شہپر سے شہپر لڑ گیا
اصلاح ـ	بجنسہٖ	
بیاض ؎	جب اڑا میں سوئے گردوں بہر مضمون بلند	ــــــــــــــ
(۶) اصل شعر ؎	ہو کے بیخود اس پری کے عشق میں اُڑ جائیں گے	دیکھنا ساقی، لگا دے گی ہمارے پر شراب
اصلاح ؎	صورت طائر سوئے ملکِ عدم اُڑ جائیں گے	ہجر میں ساقی ــــــــ
بیاض ؎	ہو کے بیخود دخترِ رز کو دیکھیو اڑ جائیں گے	ساقیا اک دن ــــــــ

کلام حنا

کیا کیا بدل کے بھیس درِ یار پر گئے
بن کر کبھی فقیر، کبھی نامہ بر گئے

بوسہ دیا دہن کا تو جی سے گزر گئے
پہنچے کنارِ چشمۂ حیواں تو مر گئے

سر سے جو اپنے بزم جہاں میں گزر گئے
روشن بسانِ شمع وہی نام کر گئے

کیا کیا جہاں سے صاحبِ حشمت گزر گئے
دو دن کی دھوم قیصر و فغفور کر گئے

گل کھا کے جن کے عشق میں ہاتھوں پہ مر گئے
وہ پھول بھی وہ لا کے نہ تربت پہ دھر گئے

طوفاں کیا تلاطم[لہ] دریائے اشک نے
دریا نے جتنے میری نظر سے گزر گئے

ہمراہ لے کے مجھ کو جو وہ بام پر چڑھے
شرما کے کوہ طور سے موسیٰ اتر گئے

چمکا دیئے جگر کے تماشائے گل نے داغ
پتے ہلے تو زخم سے پھاہے اتر گئے

لہ مخطوطہ میں تلاطم ہے

عین کثرت میں دید وحدت ہے قید ہستی میں بافراغ ہوں میں

کلامِ حنا

حنا کا نام عبدالکریم خاں تھا، لکھنؤ کے باشندے تھے، یہ وہی حنا ہیں جن کے قلمی دیوان پر جناب سخاوت مرزا صاحب مفصل مضمون صحیفہ کی اشاعت اکتوبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔

سخاوت مرزا صاحب نے حنا کے حالات خمخانۂ جاوید اور سخن شعرا سے حاصل کئے ہیں اور ان دونوں تذکروں بعض باتیں درج نہیں ہیں۔ دراصل حنا کے حالات تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے جو ان کے ایک معاصر شناسا نے لکھا ہے۔ خوش معرکہ کا مصنف لکھتا ہے:

"مدتوں نخل حنا دست بدست رہا آخر میر مظفر علی کی آبیاری سے اس نے رنگ پکڑا۔ شعار حق ناشناسی سے ترک استاد کر کے میرو زیر صبا کا آشنا ہوا۔ کیا کیا رنگ لایا ہے۔ اگر چہ اب لکھنا اس کو یہاں گنجایش نہ رکھتا تھا۔ مگر میر مظفر علی اسیر کا حق مجھ سے تلف نہ ہو سکا۔" (نسخۂ پٹنہ)

اس اقتباس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، اول یہ کہ حنا نے اسیر کا شاگرد ہونے سے قبل لکھنؤ کے دوسرے اساتذہ سے بھی فیض اٹھایا تھا۔ اور ان اساتذہ میں شاید ناسخ یا ناسخ کا کوئی استاد نما شاگرد بھی شامل ہو۔ حنا کی اس غزل سے جو ناسخ کے مرثیے کے طرز پر لکھی گئی ہے اور جو اس بیاض کے کلام میں موجود ہے۔ اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

دوسرے یہ کہ حنا کے اس قلمی دیوان میں جو ۱۲۵۷ھ میں مکمل ہوا اگرچہ صبا کی اصلاح شدہ غزلیں ہیں لیکن ان میں وہ غزلیں بھی شامل ہوں گی جن پر اسیر نے اصلاح دی ہوگی اور اس طرح صبا نے اسیر کی اصلاح پر اصلاح کی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حنا نے صبا کے انتقال کے بعد پھر اسیر سے رجوع کر لیا تھا۔ کیونکہ گلدستۂ شعرائے لکھنؤ، ۲۷ کی اشاعتوں میں (صبا اس سے پانچ سال قبل وفات پا چکے تھے) عبدالکریم خاں حنا کی غزل کے عنوان میں شاگرد اسیر متواتر چھپتا رہا ہے۔

سخاوت مرزا صاحب نے اپنے مضمون میں حنا کے کلام پر صبا کی اصلاح کے جو اشعار درج کئے ہیں ان میں سے کچھ شعر اس میں بھی ہیں اور اصل شعر یا اصلاح شدہ صورت سے مختلف ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ترمیم کب ہوئی اور کس کے قلم سے ہوئی ترمیم کا فیصلہ قارئین خود کر سکتے ہیں۔

(۱) اصل شعر ؎ دیدۂ قاتل سے اپنا دیدۂ تر لڑ گیا زیر خنجر واہ کیا اپنا مقدر لڑ گیا

اصلاح ________ ________ کیا دم آخر ________

بیاض ________ ________ دیکھنا کیسا ________

یاد ہیں نیرنگیاں کیا صانعِ تقدیر کو
کج روی دی ہے کماں کو راستبازی تیر کو

جانتی پریاں ہیں مجھ دیوانے کی توقیر کو
صورتِ ہیکل پہنتی ہیں مری زنجیر کو

منہ دکھاؤ منہ دکھاؤ عاشقِ دلگیر کو
داغِ بے مہری نہ دو اس چاند سی تصویر کو

عیدِ قرباں کی خوشی روزِ شہادت ہو گئی
ماہِ نو سمجھا میں اس کی مغربی شمشیر کو

جب مرقع کو لگایا ہاتھ اس خورشید نے
دن کی صورت کر دیا روشن شبِ تصویر کو

دیدۂ فرہاد سمجھا ہجرِ شیریں میں شہید
(کذا) کوہ پر دیکھا جو میں نے جا کے جوئے شیر کو

عالمِ وحشت میں بھی رکھتا ہوں میں طبعِ کریم
مور چے کھلاتے ہیں میرے دانۂ زنجیر کو

اہلِ غیرت غیر کا احساں نہیں رکھتے قبول
حاجتِ شبنم نہیں ہے غنچۂ شمشیر کو

سبزۂ بیگانہ ساں ہے بسکہ بے کار چمن
(کذا) ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں خارِ دامنگیر کو

گردشِ گردوں سے میرے وحشیوں کا خوف کیا
آسیا کب پیستی ہے دانۂ زنجیر کو

لاکھ غم ہو اہلِ حیرت کو مگر رہتے ہیں چپ
نالہ کش ہرگز نہ دیکھا بلبلِ تصویر کو

حادثاتِ دہر سے محفوظ ہیں ہم اے جنوں
سیل کا خطرہ نہیں ہے خانۂ زنجیر کو

عالمِ حیرت میں ہے کب حاجتِ امدادِ غیر
کس نے سینچا ہے جہاں میں گلشنِ تصویر کو

نامۂ قسمت مرا لکھا خطِ معکوس پر
یہ نیا مضمون سوجھا کاتبِ تقدیر کو

کعبۂ دل کو نہ ہو کس طرح کعبہ پر شرف
ہاتھ سے اپنے بنایا حق نے اس تعمیر کو

اسقدر لکھئے کہ لکھ بھیجے مقدر کا لکھا
(کذا) اسقدر پڑھئے کہ پڑھ بھیجے خطِ تقدیر کو

میہمانی لشکرِ وحشت کی ہے مدِ نظر
دے خدا وسعت ہمارے خانۂ زنجیر کو

نام راحت کا نہیں ہے روزِ غم کا سامنا
اب حنا کیونکر مٹا دیں ہم خطِ تقدیر کو

(۳)

دل اپنا زلفِ شکن در شکن میں بیٹھ رہا
یہ شیر، جا کے سوادِ ختن میں بیٹھ رہا

ذقن سے چھوٹ کے دل قصرِ تن میں بیٹھ رہا
نکل کے چاہ سے یوسف وطن میں بیٹھ رہا

رُخِ صبیح کی الفت میں اسقدر رویا
لگا کے غوطہ میں نہرِ لبن میں بیٹھ رہا

حضورِ اس لبِ جاں بخش کے ہوا نہ فروغ
مسیح پردۂ چرخِ کہن میں بیٹھ رہا

[illegible]

کعبہ میں مثلِ دیر کہاں ہے وفا صنم — اچھے رہے وہی، جو ادھر سے ادھر گئے

آخر کو بے قراریِ دل نے کیا عروج — تربت سے لوٹ پوٹ کے ہم عرش پر گئے

خوں کر دیا جگر کا تماشائے صف نے بند — پیمانہ بھر گیا تو مرے زخم بھر گئے

نظروں پہ جن کے وہ مہ بے مہر چڑھ گیا — خورشید و ماہ اس کی نظر سے اتر گئے

بیتاب رات بھر یہ رہے انتظار میں — آئے اِدھر اُدھر سے اِدھر سے اُدھر گئے

دیکھا جو باغِ دہر میں بوٹا سا قد ترا — پارے کی طرح عاشقِ بیتاب مر گئے

سایہ کی طرح سر نہ قدم سے جدا کیا — ہم بھی اسی طرف کو گئے وہ جدھر گئے

دنیا میں نخلِ زیست سے حاصل ہوا پھل — مانندِ سرو، باغ سے ہم بے ثمر گئے

مستی خمیر کی تھی ہماری شراب میں — بے ہوش آئے دہر میں ہم بے خبر گئے

سمجھے یہ فرطِ ضعف میں گر دو قدم چلے — ہم بھی دو منزلہ رہِ ہستی میں کر گئے

بارش کا رنگ دیدۂ تر نے دکھا دیا — تھالے ہمارے اشک سے گلشن میں بھر گئے

پوچھا نہ حال قافلے والوں نے ایک دن — کوسوں جرس کی طرح سے ہم نوحہ گر گئے

روتے ہوئے جو عالمِ وحشت میں ہم چلے — گنگا کے پار ہو گئے جمنا اُتر گئے

آ آ کے پوچھتے تھے جو عشرت میں حالِ دل — عسرت میں وہ شفیق الٰہی کدھر گئے

واماندہ مثلِ گرد سواری میں رہ گیا — گھوڑے دبا دبا کے مرے ہم سفر گئے

ہم[1] سا کبھی نہ ہوگا ہوا خواہ گل کوئی — پہلے صبا سے باغ میں وقتِ سحر گئے

کس نوجواں کے چہرے کے تل آگئے پسند — اختر نگاہِ پیرِ فلک سے اتر گئے

ممنوں ہوا رسائیِ تقدیر کا میں رات — چوٹی کی طرح ہاتھ مرے تا کمر گئے

دریا کا زہرہ آب ہوا سیلِ اشک سے — نالوں سے میرے شیر نیستاں میں ڈر گئے

لیلیٰ سا ایک بھی نہ حسیں آج تک ہوا — مجنوں سے دشتِ نجد میں لاکھوں گزر گئے

کعبے کی راہ بھول کے پہنچے میانِ دیر
تھا قصد کس طرف کا گئے ہم کدھر گئے

(۲)

اے بوالہوس! چشمِ کم سے تم نہ دیکھو پیر کو — زورِ بازوئے کماں دیتا ہے طاقت تیر کو

---

[1] وہ ہوا خواہِ چمن ہوں کہ چمن میں ہر صبح ÷ پہلے میں جاتا ہوں اور بادِ صبا میرے بعد ۔ (اسد خاں غالب)

یہ اعتصار صفاتِ کلام ناسخ ہے   کہ معجزہ بخدا اس کا سارا دیواں ہے
تمام مصرع اشعار سلک گوہر ہے   ہر ایک صفحۂ اوراق ابر نیساں ہے
عجب نہیں ہے وہ ظلمت رہِ ہدایت ہو   ہوائے موت سے گل شمع بزم عرفاں ہے

حنا خلاف نہیں فعل ناسخ مغفور
دلِ مریض کو ناقص ہوائے درماں ہے

قضا نہیں تو مرض سے نہیں ضرر اصلا   جو ہے قضا تو شفا ہو یہ غیر امکاں ہے
یہ وہ بلا ہے کہ حیران سب اطبا ہیں   یہ وہ ہے قہر فلاطوں بھی جس سے بیجاں ہے
ملایا خاک میں اس نے کسے نہ واویلا   جو باکمال ہے اس کا یہ دشمن جاں ہے
نہ چھوڑا ایسے فصیح و بلیغ کو اس نے   کہ جس کے غم سے نہاں زیرخاک سحباں ہے
ہر ایک کی یہ دعا ہے جناب بالیں ہیں   یہ شخص دل سے ثنا خوانِ شاہ مرداں ہے
الٰہی بخش دے تو بہر پنجتن اس کو   کہ ہے یہ پنجتنی مغفرت کا شایاں ہے
ہوا ہے فرقت ناسخ میں اب یہ حال مرا   کہ غرق بحر تاَم میں کشتیٔ جاں ہے
عجیب دام الم میں پھنسا ہے طائر دل   غضب ہے فرقت استاد، قہر یزداں ہے
یہ اضطراب ہے سوز غم جدائی میں   برنگ طائر سیماب ہوش پرّاں ہے
اجل کے ہاتھ سے میں قیدِ دام ماتم ہوں   حصار فوج الم مجھ کو قعر زنداں ہے
خوشی ہے خواب مجھے کاروانِ ہستی میں   درا کی طرح سے دل ہر قدم پہ نالاں ہے
یہ دارِ ہستیٔ فانی ہے مشکل دار مجھے..   ہر ایک تار نفس میرے حق میں پیکاں ہے
خدا چھڑائے کہیں جلد قید ہستی سے   اجل جو ایسے میں آئے کمال احساں ہے
گراں ہے کوہ سے یہ سنگ حادثہ لے دل   بیاباں تا بکجا یہ غم فراواں ہے

حنا غزل ہو کوئی عاشقانہ اب تحریر
کہ سارے رنج سے افزوں فراق جاناں ہے

(۵)

خیال گردش آہوئے چشم جاناں ہے   خرام ہوش میں طرۂ رم غزالاں ہے
ہر ایک تار نفس رشک شمع سوزاں ہے   چراغ مہر سحر مجھ کو تیغ براں ہے
مآل کار جہنم ریاض رضواں ہے   غم فراق سے امید فضل جاناں ہے

ملا نہ عالمِ ہستی میں غیب کا مضمون
عدم کو جا کے بہ فکرِ رہنی میں بیٹھ رہا

کیا جو فکرِ سخن نے مجھے بہت لاغر
بسانِ معنیٔ نازک، سخن میں بیٹھ رہا

ملی نہ غم کو جگہ جب تمام عالم میں
وہ آن کر مرے بیت الحزن میں بیٹھ رہا

پھرا نہ کوچۂ دلدار سے کبوترِ دل
یقیں ہوا کہ وہ چاہِ ذقن میں بیٹھ رہا

بسمل کے رخ سے دلِ زار زلف تک پہنچا
حلب سے اٹھ کے مسافر یمن میں بیٹھ رہا

دل اپنا صحبتِ عشرت سے خود گریزاں ہے
یہ آئینہ تھا کہ وہ لطف و رہن میں بیٹھ رہا

ہوئی یہ صحبتِ اشراف ان دنوں ابتر
ہما بھی صحبتِ زاغ و زغن میں بیٹھ رہا

کبھی کسی نے نہ دیکھا مجھے وہ لاغر ہوں
شمیمِ گل کی طرح پیرہن میں بیٹھ رہا

تمام عمر غمِ ہجر نے نہ چھوڑا ساتھ
مثالِ روح مرے قصرِ تن میں بیٹھ رہا

مقامِ یار کا اقدس ہے عنبریں ہے حنا
ہمارا ماہ وہ ہفتہ گہن میں بیٹھ رہا (کذا)

(۴)

خزاں بہار میں آئی چمن بیاباں ہے
روش پہ چار طرف عندلیب نالاں ہے

جدھر کو دیکھتا ہوں باغِ دہر ویراں ہے
جو گل ہے میری نظر میں گلِ مغیلاں ہے

نہ کے کسی سے یہ منہ زور کب یہ امکاں ہے
سمندِ عمرِ رواں مثلِ برقِ رخشاں ہے

فصیحِ ہند تہِ خاک آج پنہاں ہے
زوالِ موت سے گویا کمالِ سحباں ہے

یہ وہ ہے آتشِ غم جس سے برق تاباں ہے
یہ وہ ہے بحرِ الم جس سے ابر گریاں ہے

یہ وہ ہے بارِ گراں جس سے چرخ گرداں ہے
یہ وہ ہے قہر کہ جس سے زمین لرزاں ہے

یہاں نظر سے نہیں مصحفِ رخِ ناسخ
ریاضِ دہر سے منسوخ آج قرآں ہے

زمینِ شعر میں مدفون ہوئی فصاحتِ ہند
میانِ کنجِ لحد آج رشکِ سحباں ہے

تمام حور و پری جن و انس روتے ہیں
ہر ایک مرغِ نوا سنج مرثیہ خواں ہے

تمام طائرِ مضموں سر پٹکتے ہیں
خیالِ میوۂ معانی سے باغ ویراں ہے

ہر ایک گل کا گریباں ہے چاک گلشن میں
ہجومِ غم سے ہر اک عندلیب نالاں ہے

اسی الم سے پریشاں ہے باغ میں سنبل
صدا یہ غنچے سے آتی ہے گل بھی نالاں ہے

ہر ایک پھول چمن میں بسانِ اخگر ہے
نظر میں غیرتِ گلشن ہر اک گلستاں ہے

جنوں میں بھی وہ ہوا خواہ باغ ہوں کہ مجھے
مہکائے نخل چمن دشت میں مغیلاں سے

شریک رنج ہمارا جہاں میں کوئی نہیں
فغاں ہے رعد میں تو چشم ابر گریاں ہے

یہ محو ہوں کہ نہیں آج تک مجھے معلوم
وہ حور ہو کہ پری ہے کہ رشک غلماں ہے

یہ اب کی سال جنوں خیز ہو چمن کی ہوا
تمام دشت میں آباد شہر ویراں ہے

خمار دانہ کرو یہ غزل سوئے تاتار
سراسر اس میں تذکرۂ وصف زلف پیچاں ہے

(۶)

جلے جو بزم میں اس کی پسند آتش پر
نہ کر سکے کبھی نالہ بلند آتش پر

یہ سوز عشق سے ہے بند بند آتش پر
بندھے گی دل میں سویدا سپند آتش پر

وہ مہرباں ہو تو گلخن بھی رشک گلشن ہے
نہ کچھ خلیل کو پہنچا گزند آتش پر

دکھاؤں اس کو اگر سوز بیقراری دل
تو بے قرار ہو پارہ دو چند آتش پر

خیال چہرۂ گلگوں میں آہ کرتا ہوں
لگا رہا ہوں دھوئیں کی کمند آتش پر

فراق دست حنائی میں جان جاتی ہے
رواں ہے عمر رواں کا سمند آتش پر

شب فراق سے جل جل کے یوں میں ہنستا ہوں
سپند جیسے کرے زہر خند آتش پر

شراب دست حنائی میں لب پہ سرخیٔ پان
جو یہ ہے قند پہ آتش وہ قند آتش پر

پسند جان سے ہم کو ہے روئے آتش رنگ
فدا ہے اپنا دل دردمند آتش پر

عذار یار پہ چھوٹے جو گیسوئے مشکبو
کہیں ہیں لوگ دھواں ہو بلند آتش پر

ملوں میں پائے حنائی پہ آنکھ کی پتلی
جو حکم ہو تو جلاؤں سپند آتش پر

یہ ایک معجزہ ہے پنجۂ حنائی کا
کہ پھپھولوں کو نہیں یاں گزند آتش پر

شفق پہ ہے رخ گلگون یار کا دھوکا
نگاہ پڑتی ہے اپنی بلند آتش پر

ہے روح رخ پہ فدا ڈر رہا ہوں لخت جگر
سمندراں میں ہے ادھر ہے سمند آتش پر

ثنائے گیسو و رخ میں رواں ہے توسن فکر
کبھی دھوئیں پہ کبھی ہے سمند آتش پر

سبک روؤں کا کبھی کوئی سد راہ نہیں
نسیم آب پہ ہے اور نہ بند آتش پر

عذاب سوز جدائی سے لاکھ بہتر ہے
جلائیں کاٹ کے گر بند بند آتش پر

کبھی نہ خط سے ہوا صاف عارض روشن
رہی سدا یہی نکہ آہ چند آتش پر

پسند دیدۂ حق بیں کو شمع طور ہوئی
پتنگ دل بھی ہوا تو بلند آتش پر

صفاتِ لب سے ملتبس تمام دیواں ہے
غزل ہر ایک مری کشورِ بدخشاں ہے

وہ گل نہیں تو چمن صورتِ بیاباں ہے
ریاضِ خلد مجھے وادیِ مغیلاں ہے

جنوں میں مجھ کو خیالِ شراب و جاناں ہے
چراغِ طور سے روشن مرا بیاباں ہے

کیا ہے دستِ حنائی کا ایسا نظارہ
ہر ایک تارِ نظر رشکِ شاخِ مرجاں ہے

یقیں ہے بعدِ فنا یار صافِ دل ہوگا
غبارِ دودِ نفس آئینہ میں پنہاں ہے

جنوں میں بارِ سلاسل ہے بارِ دامن کا
بسانِ طوقِ گراں حلقۂ گریباں ہے

دلا دکھائے گا شامِ فراقِ عشق دہن
عیاں ہے پردۂ ظلمت میں آبِ حیواں ہے

اسیر ہوں کسی زہرہ جبیں کی چاہ میں میں
مرے لئے یہی بابل چہِ زنخداں ہے

نظر میں پھرتی ہے چشمانِ یار کی گردش
جو میری آنکھ ہے نقشِ سمِ غزالاں ہے

بندھے ہیں زلف کے مضموں تمام دیواں میں
زمینِ شعر جو ہے دشتِ سنبلستاں ہے

خیالِ لب میں یہ لختِ جگر میں رویا ہوں
مرے طفیل میں ہندوستاں بدخشاں ہے

فراقِ آئینہ رخ میں رو رہا ہوں میں
حلب میں بارشِ ابرِ مژہ سے طوفاں ہے

کیا ہے قتل مجھے خنجرِ تبسم نے
برائے خرمنِ جاں عکس برقِ دنداں ہے

خیال دل میں ہے قاتل کے روئے گلگوں کا
ہر ایک زخمِ بدن روزنِ گلستاں ہے

خجل رہے اگر گردشِ گردوں مری عداوت سے
کمال بے سر و ساماں ہوں میں بیاباں ہے

سدا اکل کے سلاسل سے ہوگئی معدوم
جنوں میں گوشۂ عزلت خیالِ انساں ہے

کمال بوسہ محبت اسی میں پاتا ہوں
نفس کی آمد و شد شاخِ عشقِ پیچاں ہے

سوا اجل کے در آئے کوئی نہیں ممکن
بید ریاضِ عناصر پہ عمر درباں ہے

ہر ایک دم کو دمِ واپسیں سمجھتا ہوں
ثباتِ ہستیِ فانی یہ موتِ یاراں ہے

پھنسا ہوں خواہشِ زندہ میں خیالِ موت نہیں
ازل سے دشت ہوں میں یہ کتابِ نسیاں ہے

زوال ہجر میں حاصل ہوا کمال مجھے
ہجومِ داغ سے سینہ ریاضِ رضواں ہے

کراہی نظر سے مجھے دیکھتی ہے اب زنجیر
کسی کی نہ نظر مجھ کو العیب پیچاں ہے

صفائے بندشِ سلکِ دُرِ معانی سے
جو بحر شعر کی ہے بحرِ آبِ نیساں ہے

صدف ہیں شعر دُرِ شاہوار مضموں ہیں
غزل نہیں ہے کسی جوہری کی دکاں ہے

پھنسا ہوں جب سے میں گردابِ بحرِ فرقت میں
عجب طرح کی بلا میں یہ زورقِ جاں ہے

خط مرا جو لے گیا قسمت کا لکھا دیکھنا — راہ میں اپنی اجل سے وہ کبوتر لڑ گیا
دست و پا کا ہوش تھا مجھ کو نہ کچھ سر کی خبر — وصل کی شب ہاتھا پائی میں مرا سر لڑ گیا
رات بھر اس ماہ سے رنجش میں گزری اے حنا
صبحدم آخر کو وہ مجھ سے ستمگر لڑ گیا

۸

وصل کیا خود رفتہ ہوں میں ساقیا پیکر شراب — آپ سے کم ظرفوں کو کر دیتی ہے باہر شراب
دوستو مجھکو نہ دو مر جاؤں گا پیکر شراب — ہجر ساقی میں ہے مجھکو زہر سے بدتر شراب
نشہ ہے ہم کو خیال چشم مست یار سے — ساقیا پیتے ہیں ہم بے شیشہ و ساغر شراب
بیخودی ہم کو نہ ہو گی صاف دل ہیں ساقیا — جو ہیں بد باطن انھیں بہکاتی ہے اکثر شراب
مر گئے مستی میں ہم رو کر مآل کار کو — بے پیئے بھی لے چلی ہے ہمکو دامن تر شراب
فرق ہے گر محتسب ہو ہمیں کچھ غم نہیں — خلد میں پی لیں گے دست حور سے چل کر شراب (کذا)
ہیں وہ بیکس خلد میں ہم جام کوثر کے عوض — ساقی کوثر سے پائیں گے لب کوثر شراب
ہو کے بیخود دخت رز کو دیکھئے اڑ جائیں گے — ساقیا اک دن لگا دے گی ہمارے پر شراب
میکشی کے واسطے آتا ہے اب وہ مست ناز — میکدے میں ساقیا بہتر سے ہو بہتر شراب
تا ابد بیخود رہیں گے بادۂ الفت سے ہم — شیشۂ دل میں ازل سے ڈھلتے ہیں بھر کر شراب
مے کے پیتے ہی فراق یار میں ہم مر گئے — طائر روح رواں کو ہو گئی شہپر شراب
ہوش میں ہوتا تو ہجر یار میں جیتا نہ میں — ہو گئی فرقت میں میرے واسطے بہتر شراب
میکشی میں یار کے موئے کمر کا دھیان ہے — بال سے باریک کر دے گی مجھے لاغر شراب
دیکھتے ہی شکل کے میرا پھسل جاتا ہے دل — ساقیا پڑھ دیتی ہے مجھ پر کوئی منتر شراب
کر دیا مے نے شب فرقت مرا ٹکڑے جگر — جاتے ہی سینے میں میرے بن گئی خنجر شراب
یار کی شیریں لبی سے کیا تعجب ہے اگر — ذائقے میں صورت شربت ہو شیریں تر شراب
بزم میں ہے وہ گل نہیں بیٹھے سامنے آج ہم — پھول سی ہمکو پلا دے ساقیا لا کر شراب
آج کیا گردش میں ہے بام فلک پر آفتاب — چل رہی ہے یا کہ سقف قصر جاناں پر شراب
آتش غم شعلہ ور ہے ہو بھلا کیونکر سرور — خاک ہو جاتی ہے سینے میں مرے جل کر شراب
جیسے مینائے فلک سے جلوہ گر ہے آفتاب — اس طرح ہے شیشۂ دل سے مرے اختر شراب

کہیں رہتا گر سبب شیریں کی یاد میں پڑ جا   جلا دیں عقدت بتدوین تند آتش پر

یہ گرمیاں ہیں مرے مضمونِ گرم میں ہیں حنا

کہ سوتا ہے کسالِ خجند آتش پر

(۷)

اس غزل کے چار شعر اختلاف اصلاح میں آ چکے ہیں انھیں بھی شامل غزل رکھا گیا ہے۔

خط بنایا یار نے میرا مقدر لڑ گیا   آئینہ روشن ہوا بختِ سکندر لڑ گیا

دیدۂ قاتل سے اپنا دیدۂ تر لڑ گیا   زیرِ خنجر واہ کیا اپنا مقدر لڑ گیا

سکتہ داغِ جگر چمکے جو یاد آیا وہ ماہ   وصل کیسا یہاں خیالِ یار میں زر لڑ گیا

آفتابِ رخِ جاناں پر پڑی میری نظر   مہرِ زریں بن مرا مرغِ منور لڑ گیا (کذا)

خواب میں اس حور نے ہم کو دکھایا آئینہ   طالعِ بیدار سے بختِ سکندر لڑ گیا

سرد ہو جائیگا خجلت سے یقیں ہے روزِ حشر   داغ سے میرے اگر خورشیدِ محشر لڑ گیا

جب اڑا میں سوئے گردوں بہرِ مضمونِ بلند   حضرت جبریل کے شہپر سے شہپر لڑ گیا

آنکھ اس کے دل پہ پڑتی ہے ہماری آجکل   دیکھ اے ساقی یہاں شیشے سے ساغر لڑ گیا

وصل کی شب خوفِ ہجراں نے یہ لاغر کر دیا   صبحدم تن سے ہمارے تارِ بستر لڑ گیا

بخت چمکے جب نظر آئی مجھے اس ماہ کی   آنکھ کیا اس کی لڑی گویا مقدر لڑ گیا (کذا)

داغِ عصیاں خود بخود دھو جائیں گے [illegible]   دامن ترے مرا گر دیدۂ تر لڑ گیا

وہ لڑا کیا ساری محفل کو لڑایا یار نے   خم سے میخانہ لڑا شیشے سے ساغر لڑ گیا

دیکھ لینا پانی پانی شرم سے ہو جائیں گے   ابر گر تجھ سے ہمارا دیدۂ تر لڑ گیا

غیر سے لڑ کر چلا آیا مرے گھر وہ قمر   میری قسمت لڑ گئی میرا مقدر لڑ گیا

جرم کیا تھا، کیا خطا تھی، کیا مری تقصیر تھی   بے سبب، بے وجہ مجھ سے وہ ستمگر لڑ گیا

عین بیتابی میں آیا وہ دُرِ دریائے حسن   گوہرِ مقصود سے دستِ شناور لڑ گیا

صلح اس نے خواب میں بھی مجھ سے کی گر ایکبار   ظاہرا سو بار آ کر وہ ستمگر لڑ گیا

کر گیا ہنس ہنس کے وہ کل قطعِ الفت کا کلام   کس کو باور ہو اگر کہیے وہ ہنسکر لڑ گیا

دل کے ملتے ہی ہوا وہ پھر مجھ سے چشم چار   شیشے سے شیشہ لڑا ساغر سے ساغر لڑ گیا

کیا ستم مجھ پر کیا چرخِ ستم ایجاد نے   ہنستے ہنستے مجھ سے ناحق وہ ستمگر لڑ گیا

بزمِ اقبال[1]

سرگزشت الفاظ: یہ کتاب مولوی صاحب کی تصانیف ہی میں نہیں اردو ادب میں بھی ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی اور (اب تک آخری بھی) مستقل تصنیف ہے۔ سب سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد نے اس موضوع پر لکھا۔ مولوی احمد دین نے اپنے استاد ہی کی پیروی میں اس موضوع کو اپنی کتاب میں تفصیل سے پیش کیا۔ یہ کتاب مولانا آزاد ہی کے نام منسوب ہے۔ اس انتساب کے سلسلے میں احمد دین "سرگزشت الفاظ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"مولانا مولوی محمد حسین آزاد کا نام نامی زیب عنوان کیا ہے اور اس لئے کہ مولانا ادبیات اردو میں سلاست زبان، لطافت بیان اور لفظوں میں جان ڈال کر جیتی جاگتی تصویریں نظروں کے سامنے کھڑی کر دینے میں ناعالِ بے مثال ہیں۔ زبان اردو میں مولانا علم اللسان اور تحقیقات لفظی میں پیش رو ہیں۔ مؤلف کو مولانا کی شاگردی کا فخر حاصل ہے اور مولانا کی تصانیف سے کہیں اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں۔"[2]

یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی، حکومت پنجاب کے محکمۂ تعلیم نے اسے ۱۹۲۳ء میں صوبے کی بہترین تصنیف قرار دے کر مصنف کو ساڑھے سات سو روپے کا انعام دیا تھا۔ اور ٹکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے صوبے کے مدارس کے کتب خانوں کے لئے اس کے سوا تین سو نسخے خریدے تھے۔[3]

مولوی احمد دین کو تحقیقات لفظی سے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے اس کتاب کی داغ بیل ۱۹۰۱ء ہی میں ڈال دی تھی جبکہ مطالعۂ الفاظ کے عنوان سے ان کا ایک مقالہ دو قسطوں میں "مخزن"[4] میں شائع ہوا تھا۔ گویا ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۳ء تک وہ اس موضوع پر غور و فکر کرتے اور مواد جمع کرتے رہے اور اس طرح بائیس (۲۲) برس کی محنت کے بعد "سرگزشت الفاظ" وجود میں آئی

---

[1] تیسری اور آخری قسط

[2] سرگزشت الفاظ۔ مطبع کریمی لاہور۔ طبع اول ص ۴۔

[3] کتاب "اقبال" کے آخری سرورق پر سرگزشت الفاظ کا اشتہار ہے۔ یہ تمام معلومات اسی اشتہار سے لی گئی ہیں۔

[4] مخزن لاہور بابت ماہ اپریل ۱۹۰۱ء

مے کی کیا حاجت ہے مجھ کو مثل ناسخ اے حنا
ہے مری مستی کو عشقِ ساقیٔ کوثر شراب

(۹)

لال ہے غصہ سے واں اس بت بے پیر کی آنکھ
خون روتی ہے یہاں عاشق دلگیر کی آنکھ

چشمۂ نور بنے عاشق دلگیر کی آنکھ
صفحۂ دل پہ کھنچے گر تری تصویر کی آنکھ

جب سے آئی ہے نظر اس بت بے پیر کی آنکھ
ہمہ تن نور ہوئی عاشق دلگیر کی آنکھ

کس کے گیسوئے مسلسل کا میں دیوانہ ہوں
آج کل مجھ پہ کڑی پڑتی ہے زنجیر کی آنکھ

زیب و زینت کا نہیں ... تحیر کو خیال
کام سرمے سے نہیں رکھتی ہے تصویر کی آنکھ

کیوں نہ شرمندہ ہو قبضے کی کٹوری سے قمر
عین جوہر ہے ترے ہاتھ میں شمشیر کی آنکھ

بایا ہے کہ مقبول عام تحریکیں نئے الفاظ وجود میں لاتی ہیں اور پھر مولانا آزاد کے حوالے سے (صفحہ ۱۸۷) یہ بھی لکھا ہے کہ بعض دفعہ ناز حضرات بھی کسی خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے الفاظ وضع کر لیتے ہیں۔ نیز زمانے کی نئی ضرورتیں بھی الفاظ کی ایجاد میں حصہ لیتی ہیں۔ س سلسلے میں وہ لکھتے ہیں :۔

"زمانہ حال کی نئی ضرورتوں نے پچھلے چند سالوں میں ہی زبان میں کئی نئے الفاظ پیدا کر دیئے ہیں۔ سیاسی تحریک کی رو نے یک سرے سے دوسرے سرے تک ایشیائی ممالک کو تہ و بالا کر دیا ہے اور اہم تغیرات سیاسی اور نظامی جو وقوع میں آئے ہیں، نہوں نے نئے الفاظ ہر ایک ایسی مملکت کی زبان کو دیئے ہیں، اور چونکہ ہندوستان کی زبان ان ممالک کی زبانوں سے ایک واسطہ رکھتی ہے۔ یہاں بھی اسی تحریک کی رو کے دور دراز اور لہذا اکثر ور لہروں نے ان نئے الفاظ میں سے چند ایک ادھر بھی پھینک دیئے ہیں جو جوشی جن لئے گئے ہیں۔"[۱] وہ زبان کو بھی انسانوں کی طرح حیات و ممات کے اصولوں کا پابند بتاتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے :۔

"ایسے لوگ بھی گزرے ہیں اور ہیں جو زبان کی حقیقت اور اس کے اصولوں سے محض ناواقف ہونے کی وجہ سے جبراً اس کی ترقی کے مانع ہونے کے درپے ہوئے اور ہو جاتے ہیں انھیں خیال ہوتا ہے کہ اس کی نشو و نما کافی ہو گئی ہے یا ضروری نہیں اور اب زیادہ ترقی نہ در کار ہے اور نہ ہونی چاہئے لیکن انھیں معلوم نہیں کہ زبان میں بھی زندگی کے ویسے ہی اجزا ہیں جیسے کہ انسان میں یا درخت میں۔ انسان کی طرح اس کا نشو و نما مکمل ہوگا۔ ہاں اگر کوئی بیرونی اسباب زبردستی سے اس کی زندگی کا پیش از وقت خاتمہ کر دیں تو اور بات ہے اور انسانوں کی طرح ہی اس کی زندگی اصول زوال کے تحت میں بھی ہے۔ جنگل کے درخت کی طرح جب تک اس میں نشو و نما کی طاقت ہے۔ یہ ہر ایک کمزور رکاوٹ کو جو اس کے پھیلاؤ میں حارج ہوگی بے اعتنائی کی نظر سے دیکھے گی۔ اور درخت کی طرح ہی پرانے پتے جھاڑے گی اور نئے پتے نکالتی رہے گی۔ اس طرح کی سب کوششیں زبان کو ایک حد پر محدود کر دینے کی ناکامیاب رہی ہیں۔ ایسے حالات میں بھی جو کامیابی کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو سکتے تھے، زبان کی نشو و نما کی آبیاری عوام کے منہ میں ہے۔ فیشن کا خاص لوگوں سے عوام میں آنا تو درست، الفاظ۔ وہ الفاظ جو زبان کے خزانے میں حقیقی ایزادی دولت کا باعث ہیں، عوام سے خواص میں جاتے اور پھیلتے ہیں اور ان میں سے اکثر کوئی کوتاہ اندیش ادیب ان کی خواہ کتنی ہی مخالفت کرے یا انھیں جب تک چاہے نظر انداز کرے زبان میں اپنی جگہ باصرار لیں گے اور اس پر قائم رہیں گے اور وہاں سے انھیں نکالنا یا ہٹانا ناممکن ہے۔ دنیا کے ادیب، علما و فضلا بے شک اپنا زور لگا کر دیکھ لیں دنیا برابر آگے کو جا رہی ہے اور زبان کو بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔"[۲] چھٹی فصل میں مترادف الفاظ میں بحث کی گئی ہے انھوں نے تفصیل سے ان امور کی نشان دہی کی ہے جو مترادف الفاظ کو وجود میں لانے کے ذمہ دار ہیں۔ مترادف الفاظ میں جو معانی کا نازک فرق ہوتا ہے اس کی وضاحت بھی کی ہے۔ نیز ان الفاظ سے حاصل ہونے والے اخلاقی فائدے بھی گنوائے ہیں۔ اس بحث میں انھوں نے بہت دلچسپ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"بعض اوقات مترادف الفاظ کا استعمال اخلاقی فائدے سے خالی نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہمارے دل میں ہوتا ہے وہی ہم زبان

---

[۱] سرگزشت الفاظ، مطبع کریمی لاہور، طبع اول صفحات ۹۲-۱۹۱-

[۲] ـ ـ ۲۰۴

مولوی احمد دین نے دیباچے میں بتایا ہے کہ انھوں نے پادری ٹرنچ کی کتاب "مطالعۂ الفاظ" کو اپنے سامنے رکھا۔ "اس پیش کش میں "مطالعۂ الفاظ" کا طرزِ بیان ہی قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اور جہاں تک ممکن تھا پادری صاحب موصوف کے سلسلۂ تحریر کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ البتہ انگریزی، فرانسیسی، لاطینی الفاظ کی بجائے اردو، ہندی، فارسی اور عربی کے الفاظ منتخب کئے گئے ہیں۔"[1]

راقم الحروف کو ٹرنچ کی کتاب دستیاب نہیں ہو سکی۔ ورنہ دونوں کتابوں کے موازنے سے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ مولوی صاحب نے ٹرنچ سے کہاں تک استفادہ کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ احمد دین نے ٹرنچ کی کتاب کا چربا اتارا ہے۔ ترتیب بھی وہی ہے اور انداز بیان بھی قریب قریب اسی طرح کا ہے۔[2]

بہرحال یہ طے ہے کہ مولوی احمد دین نے ٹرنچ کی کتاب کو بطور نمونہ سامنے رکھا۔ البتہ الفاظ کی تحقیق ان کی ذاتی کاوش اور محنت کا نتیجہ ہے اور اسی بنا پر اس کتاب کا علمی پایہ بلند ہے اور اسے بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔

یہ کتاب سات فصلوں پر مشتمل ہے، جس میں ایک ہزار سے زائد الفاظ کی اصل سے بحث کی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر الفاظ تو فارسی الاصل ہیں۔ ابتدا میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ الفاظ کس طرح مختلف اوقات میں اپنے معانی بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ عروج سے زوال کی طرف آتے ہیں اور کبھی زوال سے عروج کی طرف۔ پہلی دو فصلوں میں زبان اور الفاظ کی حقیقت کے بارے میں تمہیدی باتیں لکھی ہیں۔ اور اسی ضمن میں بعض الفاظ کی اصل بطور مثال بیان کر دی ہے۔ زبان کو شجر نازک خیالی سے تشبیہ دے کر لکھا ہے کہ اس کے دامن میں بہت سے تاریخی اور اخلاقی حقایق ملتے ہیں۔ جس سے واقف ہونے کے لئے مطالعۂ الفاظ بہت ضروری ہے۔ زبان کے آغاز اور ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ زبان قومی ترقی کے ساتھ ہی ترقی کرتی ہے۔ الفاظ کو مصنف نے ایسے استعاروں سے تعبیر کیا ہے جو کثرتِ استعمال کی وجہ سے بادی النظر میں اس حسن کے حامل نظر نہیں آتے جو ان میں کارفرما ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے "کہکشاں"، "تہذیب" اور "قوس قزح" وغیرہ کی مثالیں دی ہیں۔

تیسری فصل میں الفاظ کی اخلاقی حیثیت پر بحث کی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ الفاظ اخلاقی اسباق کا خزانہ ہیں۔ انسان کے اخلاقی انحطاط اور عروج کی داستان سناتے ہیں۔ اور جس طرح انسان عروج و زوال کی منزلیں طے کرتا ہے اسی طرح الفاظ سرگرمِ سفر نظر آتے ہیں۔

چوتھی فصل میں الفاظ اور تاریخ کے تعلق کو واضح کیا ہے۔ اور یہ بیان کیا ہے کہ کس طرح لفظی تحقیق تاریخی حقائق کو بے نقاب کر سکتی ہے۔ پانچویں فصل میں "نئے الفاظ" پر بحث کی گئی ہے۔ یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ بعض اشیا یا شہروں کے نام پہلے کس طرح رکھے گئے اور پھر پہلے پہل ان کا استعمال کن وجوہ کی بنا پر ہوا۔ نئے الفاظ کے وجود میں آنے کے سلسلے میں انھوں

---

[1] یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ ٹرنچ کی کتاب دستیاب ہو گئی۔ "قومی زبان" کی آیندہ کسی اشاعت میں ٹرنچ کی کتاب اور "سرگزشت الفاظ" کا موازنہ پیش کیا جائے گا۔

[2] رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۲۴ء۔

کی پروا نہیں کی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ اور اس کے سوا اور ہونا بھی کیا تھا۔ کہ قابل قدر اور بیش بہا جواہر ہماری کم التفاتی اور بے رخی کے پاؤں میں مدتوں سے روندے جا رہے ہیں۔ اور ہمیں خبر تک نہیں۔ لہ "

اس کتاب میں کہیں کہیں بعض کوتاہیاں بھی رہ گئی ہیں، بابائے اردو نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اِن کوتاہیوں کی طرف رہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

" یہ موضوع بہت دلچسپ مگر ساتھ ہی بہت مشکل اور محنت طلب ہے اور اسی لئے اس میں کہیں کہیں لغزش یا کوتاہی کا ہو جانا لازم ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "میز" کی اصلیت کا پتہ لگانا سہل نہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ لفظ پرتگالی ہے۔ پرتگالی زبان میں اسے اس طرح لکھتے ہیں (MESA) ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ " اسلامی دنیا میں "صلوٰۃ" کا تقدس اور احترام مسلم ہے اور ایک مسلمان کی زبان پر اس کی عظمت و شان روز روشن کی طرح عیاں ہے، لیکن قوم کی مبکسری، خفتِ عقل، اور ضعفِ ایمان کا اس سے بڑھ کے اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس قابل تکریم و مقدس لفظ کو جمع کی صورت میں ایک ذلیل حرکت انسانی کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ کہاں "صلوٰۃ" اور کہاں "صلواتیں"؟ یہ صحیح ہے۔ لیکن اگر وہ "صلوٰۃ" کے لغوی معنوں کی تحقیق کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ لفظ کس طرح ادنیٰ سے اعلیٰ ہو گیا۔ اور پھر اردو میں جمع کی صورت میں کن ذلیل معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ یہی تو زمانے کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ ایک جگہ "چھوئی موئی" کے متعلق لکھا ہے کہ "چھوا تو موئی۔ بدن خشک، پژمردگی طاری اور بس "۔ بدن خشک کبھی نہیں ہوتا۔ بلکہ چھونے سے بدن سکڑ لیتی ہے۔ "شیلچی" کو لکھتے ہیں کہ اردو میں آ کر باورچی خانے میں برتن صاف کرنے کی صفت کے لئے مخصوص ہو گیا۔ ابھی تک تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ممکن ہے آئندہ یہی ہو جائے۔

" اٹکل " کے متعلق لکھا ہے کہ " اگرچہ ابتدا میں قیاس اور رائے قائم کرنا ہی تھا۔ لیکن اب قیاس اور رائے کی وقعت " اٹکل پچو " کی ترکیب میں ظاہر ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ " اٹکل " اب بھی قیاس اور اندازے ہی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ " مدرسہ تعلیم گاہ اور مکتب سے یقیناً اعلیٰ رتبہ کی چیز ہے۔ ہمارے خیال میں یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مدرسہ تعلیم گاہ سے ہر حالت میں اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔

" جلاب " انگریزی میں جیلپ مکسیکو کے ایک شہر جلاپا کے نام سے ہے :۔ قابل مصنف نے یہ نئی بات لکھی ہے جو درست نہیں معلوم ہوتی۔ ہماری تحقیق میں یہ لفظ گلاب کا معرب ہے۔ کراہت سے بچنے کے لئے مسہل کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ " رضائی " محمد رضا موجد کے نام پر ہے " جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ لفظ دراصل ' رزائی ' ہے۔ چونکہ یہ عموماً رنگے ہوئے کپڑے کی بنائی جاتی ہے اس لئے یہ نام پڑ گیا۔

لہ سرگزشت الفاظ۔ مطبع کریمی لاہور، ص ۹۔۴

سے نکالتے ہیں اور اس طرح ان مترادف الفاظ کی مدد سے ہم اپنے اظہارِ خیالات میں منافقت کے گناہ سے بچ جاتے ہیں۔ کسی امر کی تائید کرتے ہوئے ضروری نہیں کہ ہم دل سے اس کی راستی کے قائل ہوں۔ اور نہ ہی ہم تائید میں کوئی ایسا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم کسی امر کی تصدیق کر رہے ہیں تو ہم صاف صاف بتا رہے ہوں گے کہ ہم خود دل سے اس کے قائل ہیں اور دل سے موید۔" [۱]

آخری فصل میں "مدرس اور الفاظ" کے عنوان سے بتایا ہے کہ تعلیمی ترقی کے لئے زبان کا اچھی طرح جاننا ضروری ہے۔ الفاظ کے ذریعے طالب علم بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بے احتیاطی نہایت مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ فاضل مصنف "بے تکی تحقیقات" سے پرہیز کا مشورہ دیتے ہوئے الفاظ سے غفلت شعاری کو "ناقابل درگزر گناہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ الفاظ کی ظاہری صورت ہی بعض اوقات دھوکا دیتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقمطراز ہیں :۔

"تحقیقات کی کامیابی کے لئے ظاہریت اور دھوکا دینے والی شکل و صورت سے پرہیز کرنا لازمی ہے۔ ظاہری صورت کو بالائے طاق رکھ کر اصل چیز تک پہنچنا اور اسے قابو میں لانا ضروری ہے۔ الفاظ کا بہروپ رنگ کا ہے اور اس کی ماہیت معلوم کرنے کے لئے مستحکم ارادہ اور استقلال طبیعت درکار ہے۔ محنت اور تکلیف سے ہی الفاظ سے حسب منشا اور سچا جواب مل سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ پوچھنے والا ادھر ادھر کے جوابات سے نہیں ٹلے گا۔ انھیں چھوڑنے کا نہیں مضبوط ہاتھ سے پکڑے رکھنے پر مصر ہوگا تاوقتیکہ اصل روپ میں نمودار نہ ہوں۔ اور سوالات کا سیدھا جواب نہ دیں [۲]"

اسی ضمن میں الفاظ کے ہجوں کو اصوات کے مطابق لکھنے کی تجویز کی وہ مخالفت کرتے ہیں اور اس کے نقصانات گنواتے ہیں۔ مختلف الفاظ کے باہمی تعلق اور ایک ہی لفظ کے مختلف معانی میں رابطے کی بحثیں بھی اسی فصل میں آ گئی ہیں۔ مطالعہ الفاظ میں وطن پرستی اور قوم پرستی کے پہلو پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ آخر میں الفاظ اور مذہبی تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔

مذکورہ سطور میں پوری کتاب کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک ناول کی طرح دلچسپ ہے۔ اور یہ دلچسپی خالص علمی و فنی معاملات پر بحث کرتے ہوئے بھی قائم رہتی ہے۔ مصنف کا انداز تحریر نہایت شگفتہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی گفتگو کر رہا ہو۔ ایک مثال ملاحظہ ہو :۔

"پچھلی فصل میں ہم نے بیان کیا تھا۔ نہیں نہیں ہم ایک ایسی عمدہ بات کے موجد ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ ہم نے ایک بزرگ کا مقولہ نقل کیا تھا کہ زبان نازک خیالی متحجر ہے۔ یہ سچ ہے کہ نازک خیالی کا جادو جو الفاظ میں بھرا پڑا ہے ہم پر کچھ اثر نہیں کرتا۔ اور اگر کبھی کوئی اثر ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔ مدت کی واقفیت اور قدرے کم توجہی نے ہمیں الفاظ کی خوبیاں محسوس کرنے اور ان سے لطف اٹھانے سے محروم کر دیا ہے۔ کبھی کسی نے یہ خوبیاں ہمیں جتلانے

---

۱ سرگزشت الفاظ۔ مطبع کریمی لاہور۔ طبع اول ص ۲۴۰

۲ سرگزشت الفاظ۔ مطبع کریمی لاہور۔ طبع اول صفحات ۲۴۰-۰۰

اقبال:۔ مولوی احمد دین کی اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے طبع اور شائع ہونے کی تفصیل پیش کی جا چکی ہے۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا اور اس وقت وہی پیش نظر ہے۔

اس کتاب کا پورا نام یوں ہے "اقبال ۔ علامہ سر محمد اقبال کی اردو منظومات، ان کے مقصد شاعری اور خیالات کے نشو و نما، مضامین، کلام اور طرز بیان پر ایک نظر" یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے جو بالترتیب "کلام اقبال" (صفحات ۱۴۱ - ۱)، "مضامین کلام" (صفحات ۲۱۵ - ۱۴۲) اور "طرز بیان" (صفحات ۸۴ - ۱۹) کے عنوانات کے تحت ہیں۔

پہلے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اقبال کی ذہنی نشو و نما کن حالات میں ہوئی اور اس کی شاعری ان حالات کی آئینہ دار کس طرح ہے اور کیوں ہے؟ اس میں اقبال کی شاعری کے وہی تین دور لیے گئے ہیں جو بانگ درا میں ملتے ہیں اور پھر ہر دور کی خاص خاص نظموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز ڈرامائی انداز سے ہوتا ہے۔ مصنف نے بازار حکیماں لاہور کی ادبی محفلوں کی منظر کشی کرتے ہوئے اقبال کا تعارف کرایا ہے اور پھر اقبال کی شاعری کے دور اول کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے اقبال کی تین نظمیں "نالۂ یتیم" "ایک یتیم کا خطاب ہلال عید کو" اور "ابر گہر بار یا فریاد اُمت" کی تفصیل پیش کی ہے۔ یہ نظمیں "بانگ درا" میں شامل نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں احمد دین لکھتے ہیں:

"یہ تینوں نظمیں بانگ درا میں، جو علامہ اقبال نے شائع کی ہے، موجود نہیں۔ غالباً بعض اصلاحی وجوہات شاعری اور نظر ثانی کے لئے کم فرصتی کی بنا پر مجموعہ میں انھیں درج نہیں کیا گیا۔ ان میں خیال کی وہ بلندی اور بندشوں کی وہ مسلسل لطافت اور چستی بھی نہیں جو بعد کی نظموں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ تاریخی اعتبار سے مجموعۂ کلام اقبال میں یہ نظمیں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اقبال کے اس سلسلۂ منظومات میں جو اقبال کی شہرت کا باعث ہوئیں، منظومات جو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاسوں کے لئے لکھی گئیں اور پڑھی گئیں، یہ تینوں نظمیں ایسی کڑیاں ہیں جو چھوڑی نہیں جا سکتیں۔ علاوہ ازیں ان نظموں میں شاعری کا میلان طبیعت بھی اگرچہ سیدھے سادے الفاظ اور بندشیں ہیں نمایاں ہے۔ رسول عربی کا عشق اور قومی درد ایک ایک شعر میں ساری ہے[1]"

اس کے بعد اقبال کے مختصر حالات زندگی دیے گئے ہیں۔ جن میں تحصیل علم اور پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات کا ذکر ہے۔ اس تعلیم و تربیت کا کیا اثر ہوا؟ اس سلسلے میں مصنف رقمطراز ہیں:۔

"خاندان، مدرسہ اور کالج کی تعلیم و تربیت کا اثر جیسا کہ واقعات مابعد نے ظاہر کیا۔ اقبال کے دل میں مذہبی جذبات کا پیدا کرنا اور ابھارنا تھا۔ جذبات جو اس کے کلام میں مختلف صورتوں میں جلوہ آرا ہوتے ہیں، حسن و عشق، تصوف اصل اصول ہیں، صوفیانہ مذاق کی آبیاری نے حسن و عشق کی کشت زار میں خوب گل کھلائے۔ اور فلسفہ جو اقبال نے لاہور گورنمنٹ کالج کی عالی شان درسگاہ میں پڑھا تھا، مذہب کے سایہ میں گوناں گوں رنگ لایا[2]"

---

[1] اقبال۔ از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۵

[2] اقبال۔ از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۶۱

"پاکھنڈ" کے لغوی معنی مولف نے "وید" کے برخلاف "بدعت" بیان کئے ہیں۔ اور اصطلاحی معنی "وہ عبادت جو دکھاوے کی ہو۔ حرامزدگی، بدذاتی، شرارت" لیکن لفظ کی تحقیق سے گریز کیا ہے۔ "پاکھنڈ" مرکب ہے "پا" اور "کھنڈ" سے۔ "پا" کے معنی "پالنے والے یا حفاظت کرنے والے کے ہیں۔ جس سے مراد "دھرم" لی جاتی ہے۔ "کھنڈ" کے معنی "منتشر" کرنے اور توڑنے" کے ہیں۔

بعض الفاظ پردہ پوش ہوتے ہیں، بعض کسی مکروہ یا ناگوار شئے یا خیال کو اچھے اور خوشنما الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ مولف نے "متوالا" کے لفظ کو بھی انھیں میں شمار کیا ہے۔ وہ اسے "مت"، (سمجھ، عقل) اور "والا" سے مرکب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ لفظ "مد" اور "والا" سے مرکب ہے۔ "مد" کے معنی ہندی اور سنسکرت میں "عرق" "شراب" اور "مستی" کے ہیں۔ کثرت استعمال سے "د" "ت" سے بدل گئی ہے۔ ان دو حرفوں کا بدل باہم ہوتا ہے۔ "اسامی" کے ایک معنی "امیر" کے بھی لکھے گئے ہیں۔ درحقیقت یہ امیر کے معنوں میں نہیں آتا۔ بلکہ بعض اوقات "مالدار" سے مراد ہوتی ہے۔ مگر اس میں ہمیشہ ذم کا پہلو ہوتا ہے۔

مولف نے منجلہ اور بحثوں کے غیر مستعمل الفاظ کی طرف بھی توجہ فرمائی ہے جو کتابی خزانوں میں بند اور بے کار پڑے ہیں۔ اور جن سے ہم ناواقفیت یا کم فہمی کی وجہ سے کام نہیں لیتے ہیں۔ ہمیں اس خیال سے بالکل اتفاق ہے۔ درحقیقت ایسے الفاظ اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کا استعمال اب نہیں رہا یا جو ٹکسالی نہیں سمجھے جاتے۔ حالانکہ وہ بعض خیالات کے ادا کرنے میں بہت کام آ سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ قابل مولف نے اس بحث کو مختصر طور پر چند سطروں میں بیان کر دیا ہے۔ یہ چنداں قابل شکایت نہیں۔ کیونکہ اس مختصر کتاب میں ہر بحث تفصیل سے بیان نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن شکایت اس کی ہے کہ انہوں نے مثال کے طور پر ایک لفظ بھی تو ایسا نہیں لکھا کہ ان کی رائے میں رواج دینے کے قابل ہے۔ اگر وہ چند مثالیں بھی لکھ دیتے تو ناظرین کو مولف کے مطلب کے سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی۔ [1]"

اس طویل "تنقید" کے بعد بابائے اردو مرحوم نے یہ تسلیم کیا ہے کہ "الفاظ کی تحقیق میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے اور اس سے کتاب کی قدر و قیمت کم نہیں ہو سکتی۔ . . . . لائق مولف کی محنت قابل داد ہے۔ یہ کتاب طلبہ اور عام شائقین کے لئے بہت کارآمد ہے۔ اس سے ان کے دلوں میں الفاظ کی تحقیق، لغوی، صرفی اور اصطلاحی معنوں کے فرق، حالات زمانہ کے اثر سے معنوں میں تغیر و تبدل اور لفظوں کی اصل دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔ اور یہ ادب کی تحصیل میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔ [2]"

---

[1] تنقیدات عبدالحق۔ مرتبہ محمد تراب علی خاں باز۔ مطبوعہ شمس الاسلام پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن، زمانہ ۱۹۳۲ء صفحات ۱۱ - ۱۱

لحاظ سے یہ نظم وطن پرست ادبیات ہند میں لاجواب ہے[1]

اقبال کی دور اول کی شاعری میں فاضل نقاد کو عشق و عاشقی کے ساتھ ساتھ تصوف و حکمت کے عناصر بھی نظر آتے ہیں ۔ لیکن شاعر کے اپنے جذبات میں ابھی وہ کشش نہیں۔ اس کے اپنے دل میں ابھی وہ کیفیت وجدان نہیں جو اسے بزم قدرت کا رازدار کر دے جو اسے اسرار ہستی کا محرم بنائے۔ اس کی آنکھ ابھی پابند مجاز ہے۔ اس کا دل ابھی گرم نیاز ہے[2]۔

نقاد کو اقبال کے ہاں اس دور کی شاعری میں خیالات کی بلند پروازی اور نزاکت بیان کی دلربائی بھی نظر نہیں آتی۔ نیز وہ لطافت اور شوکت بھی محسوس نہیں ہوتی جو ولایت سے واپسی کے بعد اقبال کی شیوا بیانیاں گوناگوں ترکیبوں میں دکھا رہی ہیں (ص ۳۷) اس دور کی شاعری میں نقاد کو دو باتیں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں۔ ایک تو وطن کے بت کی پوجا کا پرچار۔ اور دوسری نظموں میں کسی خاص تعلیم، خاص تلقین کی عدم موجودگی ہے۔ اس خیال کی توضیح وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں

"اس میں کلام نہیں کہ اس دور میں بھی مسلمانوں کے عادات و اخلاق اہل ہند کے مختلف مذاہب کی باہمی رواداری پر مواعظ ہیں۔ جو سونے کے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہیں۔ لیکن شاعر کے دل میں ابھی تک وہ جذبہ پیدا نہیں ہوا اور وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی جو بعد میں اسے عجمیت سے متنفر اور حجازیت کا والہ و شیدائی بنائے ہوئے ہے۔ ابھی تک اس کے سامنے کوئی خاص منتہائے مقصد نہیں۔ اسے کسی خاص امر سے شغف نہیں۔ ابھی تک اس کا دل ان تاثرات سے خالی ہے جو چند سال بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر آپ اپنا جہان پیدا کر لیتے ہیں[3]۔"

ستمبر ۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ کے سفر کا عزم کرتے ہیں۔ یہیں سے ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آتا ہے وطن پرستی، ملت پرستی میں بدل جاتی ہے۔ اور یہی کیفیت اقبال کی شاعری کے دوسرے دور کا عنوان ہے۔ دوسرے دور کی نظموں کا جائزہ لینے کے بعد احمد دین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:۔

"دوسرے دور کی نظمیں فرنگستان کی آب و ہوا کی زائیدہ اور پروردہ ہیں۔ ان میں لطافت اور نزاکت دلفریبی کے انداز میں جلوہ گر ہے۔ خیالات کی پرواز عرش تک کی خبریں لا رہی ہے۔ اور تخیل کی سبک سیری ابتدائے آفرینش کی باتیں بتا رہی ہے۔ شاعر اب بزم قدرت کا رازدار ہو چلا ہے اب اسے عالم بالا کے کیمیاگر کی حرکات و سکنات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اور محبت کا نسخہ اور اس کی تاثیر اس سے مخفی نہیں رہی۔ لیکن اسے حسن اور خدائے لم یزل کی گفتگو سننے کا فخر حاصل ہے۔ صرف یہی نہیں اس گفتگو کے پرچے بھی محفل قدرت میں اس نے دیکھے اور سنے ہیں۔ مظاہر قدرت جو پہلے ہمارے فلسفی شاعر کے استفسارات

---

[1] اقبال از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۳۰

[2] ایضاً ایضاً ص ۳۵

[3] ایضاً ایضاً ص ۳۸

رسالہ "مخزن" لاہور اور شیخ عبدالقادر کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کی ان نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے، جو اس رسالے میں شائع ہوئیں۔ اس سلسلے میں تیرہ نظموں، "ہمالہ"، "خفتگانِ خاک سے استفسار" اور "پروانہ اور بچہ" وغیرہ پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ ہر نظم کے مختصر تعارف کے بعد وہ اشعار درج کئے ہیں جو ان نظموں کے مرکزی خیالات کے حامل ہیں۔ ان نظموں کے متعلق احمد دین کا مجموعی تاثر یہ ہے:-

"اس گلشنِ ہستی کے نظارے شاعر کی چشمِ بینا کے لئے حقایق کا ایک دبستان کھولے ہوئے ہیں۔ اور ان نظر فریب نظاروں میں فلسفی تجسس کی نگاہ حقیقت کے راز اور تصوف کے اسرار دیکھتی ہے اور جادو کی زبان سے بیان کرتی ہے[1]۔"

اس کے بعد اقبال کی ان پانچ نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے جو بچوں کے لئے ہیں (پہاڑ اور گلہری وغیرہ) "پرندے کی فریاد" کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے:

"اس کی خوبی اور لطافت بیان نہیں ہو سکتی۔ اس میں سوز و گداز دل ہلا دینے والا ہے۔ اور اس کی میٹھی میٹھی صدا اور درد انگیز شیرینی بے تاب کئے دیتی ہیں۔ یہ نظم کیا بلحاظ سلاست زبان اور کیا بلحاظ سوز بیان اقبال کی بہترین منظومات میں سے ہے۔ اس میں ایک خاص اہمیت بھی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں کچھ سیاسیات کی جھلک سی ہے۔ جھلک، جو اب سیاسیات کی طرف اقبال کے رجحان خیالات کا پیش خیمہ ہے[2]۔"

یہاں تک اقبال کے جس کلام کا ذکر آیا ہے وہ ان کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہونے کے پہلے کی تخلیق ہے۔ جب اقبال زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہوئے اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ طالب علمی کے احوال سے نکل کر انھیں نئے مشاہدات اور تجربات سے دوچار ہونا پڑا اور اس وجہ سے بقول احمد دین ان کے دل میں عشق رسول صلعم پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا۔ نیز انھیں "حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں ملک و ملت کی سیاسی پستی کے ڈراؤنے گڑھے دل ہلا دینے والے نظر آئے۔ ان حالات میں اقبال محب بہرا دل رکھتے ہوئے سیاسیات سے دیر تک الگ نہیں رہ سکتے تھے[3]۔"

اس کے بعد ان نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں سیاسی مسائل کی طرف اشارے تھے۔ اس ضمن میں اقبال کے دورِ اول کی ان نظموں کی تفسیر پیش کی گئی ہے جن میں قومی و ملی جذبات کارفرما ہیں۔ اور ہندوستانیوں کے باہمی اتحاد کے خواب دیکھے گئے ہیں۔ احمد دین نے ان نظموں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے تشریح و تطبیر کا انداز اختیار کیا ہے۔ "تصویرِ درد" کو خاص طور پر سراہا ہے اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی ہے:

"یہ نظم محض ملکی نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی تھی۔ اس میں امتیازِ ملت و آئین کو معیوب و ملعون ٹھیرایا ہے۔ وطن اور وطن پرستی اس کے موضوع اور فرقہ آرائی کو اس میں مذموم قرار دیا گیا ہے۔ خیالات کی بلند پروازی اور کلام کی فسوں کاری کے

---

[1] اقبال از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۱۲

[2] اقبال از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۱۹

[3] اقبال از احمد دین مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۲۰

اس کتاب کا دوسرا باب "مضامین کلام" ہے۔ اس میں اقبال کی شاعری کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے اور بڑی وضاحت سے یہ بتایا گیا ہے کہ اقبال نے کن کن مسائل کو توجہ کا مرکز بنایا۔ یہ حصہ چودہ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ آغاز میں مصنف نے محمد حسین آزاد کا اقتباس (از آب حیات) دیا ہے۔ جس میں یہ توقع کی گئی ہے کہ اردو نظم پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ عاشقانہ مضامین کے سوا کسی اور مضمون کے ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس کو ہمارے نوجوان دور کریں گے۔ ویسے نوجوان جو مشرقی و مغربی علوم پر قابض ہوں احمد دین آزاد کے اس خواب کی تعبیر اقبال میں دیکھتے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں حالی اکبر اور اقبال کے نظریات پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ حالی اور اکبر میں مشرق و مغرب کا ملاپ نظر نہیں آتا۔ اقبال آزاد کی خواہشات کے عین مطابق ہیں۔ کیونکہ انھوں نے "علوم مشرقی و مغربی میں دسترس پیدا کی ...... زمین شعر میں مشرق و مغرب کے سنگم سے وہ آبیاری کی کہ چپہ چپہ پر گل و گلزار کے تختے نظر آنے لگے۔ ... اقبال نے ہوس پرستی کی مضمون بندیوں سے آزاد ہو کر رفعت مقاصد اور عالی ہمتی کی فضاؤں میں بلند پروازیاں کیں۔ اور قومی و مذہبی، اخلاقی، فلسفی، صوفیانہ اور سیاسی مضامین پر اپنی سحر طرازیوں سے بے بہا موتی پرو کر اردو کے خزانے بھر دیے"[1]

اقبال کے موضوعات سخن کے سلسلے میں احمد دین نے سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ کلام اقبال میں جس امر کی طرف سب سے زیادہ اشارے ملتے ہیں وہ یہ ہے کہ ساری دنیا نور توحید کی والہ و شیدا ہو جائے۔

"اقبال پہنائے عالم میں توحید کے نعرے سننا چاہتا ہے اور ساری خدائی کو خدائے واحد کا پرستار دیکھنے کا خواہاں ہے۔ وہ مذہب کی پاکیزگی میں اور اس کے نزدیک مذہب میں وحدانیت کے بغیر مذہب میں پاکیزگی نہیں ۔ انسان کی زندگی کے مدارج اعلیٰ پاتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ انسانی ترقی اس کی حقیقی ترقی کی معراج یہی ہے ۔ یہی پاکیزگی ہے، مادی ساز و سامان چاہے کتنی ہی حیرت اور استعجاب کی نمائشیں کرے، سطوت و شوکت کے مظاہرے دکھائے اس سے حقیقی ترقی میسر نہیں۔ بلکہ اس میں نسل انسان کی تباہی اور ویرانی مضمر ہے ۔ انسان زمین پر اللہ کے نائب کی حیثیت میں ہے۔ اور اس کے فرض منصبی کی ادائگی میں مادیت کی جھنکار گرج اور گونج کا کوئی حصہ نہیں۔ کچھ واسطہ نہیں۔ یہاں دل کی تطہیر اور روح کی پاکیزگی درکار ہے۔"[2]

دوسری اہم بات جو انھیں اقبال میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال مستقبل کا شاعر ہے۔ وہ حالی کی طرح ماضی کی داستان تازہ کر کے رلاتا نہیں اور نہ اکبر کی طرح محض تہذیب حاضر کا مذاق اڑانے پر اکتفا کرتا ہے۔ بلکہ وہ مستقبل کو ایک شاندار مستقبل عقیدت کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور اپنے مدہوش اور گم کردہ راہ بھائیوں کو اس مستقبل کے جلوے دکھا کر اور تہذیب نو کی نظر فریبیوں سے ہٹا کر اسلام کی شاہراہ پر لے جانے پر مصر ہے"[3] موجودہ دور کے ایک ممتاز نقاد نے حالی اکبر اور اقبال کے بارے میں یہی بات دوسرے الفاظ میں کہی تھی۔ جسے بڑی شہرت حاصل تھی۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ احمد دین ہی وہ نقاد ہے جس نے سب سے پہلے اس حقیقت کی طرف

---

[1] اقبال از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۱۴۸

[2] اقبال، از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۱۰۴

پرکم توجہ دیتے تھے، اب خود اسے حال دل سناتے ہیں۔ اور اس کی ہمدردی کے متمنی نظر آتے ہیں[۱]"

تیسرے مرحلے میں اقبال کی شاعری فکر و نظر کی مزید منزلیں طے کرتی ہے۔ یا اس میں کچھ اور وسعت پیدا ہوتی ہے کچھ اور نئے خیالات راہ پاتے ہیں۔ اس دور کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں:-

"ان نظموں میں بتایا گیا ہے کہ مادہ پرستی سے سچی خوشی اور نسل انسان کی حقیقی ترقی ممکن نہیں اور تجربے یہ امر پایہ ثبوت کو بھی پہنچ چکا ہے کہ بنی آدم کی مسرت اور اس کے ارتقا کا راز روحانی زندگی میں ہی مضمر ہے۔ دنیا کو ظلمت اور تباہی سے بچانے کے لئے نور توحید سے اقصائے عالم کو منور کرنا ضروری ہے۔ اور اس لئے اسلامیوں کو جو امانت توحید کے حامل ہیں لازم ہے کہ اپنے فرض کی ادائیگی میں نور توحید پھیلانے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ اور مساوات و اخوت کا سبق جو ان کے پیارے نبی نے انھیں دیا تھا اس پر عمل پیرا ہوں۔ اور قول سے فعل سے اس سبق کی تعلیم عام کر دیں[۲]"

اس سلسلے میں "ترانۂ ملی"، "شکوہ"، "شمع و شاعر"، "جواب شکوہ"، "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" پر طویل تبصرے ہیں۔ ان چند نظموں کا تذکرہ تقریباً چوالیس صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ مولوی صاحب نے تفصیل سے ان نظموں کو پرکھا ہے اور ان محاسن کو اجاگر کیا ہے جن کی بنا پر یہ نظمیں کلام اقبال ہی میں نہیں اردو شاعری میں بھی امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس دور کی شاعری صاحب کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے:-

"اقبال کے اردو کلام کا بہترین حصہ اسی دور کا لکھا ہوا ہے۔ اس دور میں شاعر حقیقت کا ترجمان ہے اور قدرت کا رازدار۔ مظاہر قدرت اس کے ساتھ باتیں کرتے ہیں، وہ ان سے اسرار زندگی سیکھتا ہے۔ اور بسا اوقات انھیں اصول حیات کی تعلیم دیتا ہے۔ اور کمال زندگی حاصل کرنے کے گر بھی بتاتا ہے[۳]"

تینوں ادوار کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے احمد دین نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

"یہ دور شروع سے آخر تک تعمیری کام میں منہمک ہے۔ شاعر نے دور اول میں ذوق استفہام کی بدولت قدرت سے اصول زندگی اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بار بار اس کے تقاضوں پر دور دوم میں قدرت نے اپنے اسرار زندگی کے راز اسے بتائے ہیں۔ اور اب قدرت کے راز اس کے اسرار، اس کے آئین سے واقف ہو کر شاعر نے قوم کے لئے ملت کے قیام و دوام کی غرض سے لائحہ عمل تیار کرنے کی کوشش کی ہے[۴]"

---

۱ اقبال۔ از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء صفحہ ۹۱۔

۲ اقبال از احمد دین۔ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۶۸

۳ اقبال از احمد دین مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۱۳۳

۴ اقبال از احمد دین مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۲۶ء ص ۱۴۰

نئی کتابیں

نقد سرشار

مرتب :۔ تبسم کاشمیری

صفحات :۔ ۳۰۸

قیمت :۔ تین روپے پچھتر پیسے

ناشر :۔ سنگ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار لاہور

تبصرہ نگار :۔ نرگس صادق

سرشار کی حیات و تصانیف کے متعلق چند مضامین اور ڈاکٹر لطیف حسین ادیب اور پریم پال اشک کے تحقیقی مقالے شائع ہوئے ہیں۔ کاشمیری صاحب نے سرشار کے متعلق چند مضامین کا مجموعہ "نقد سرشار" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس کے بیشتر مضامین مطبوعہ ہیں۔ ان میں سے ایسے ہیں جن میں سرشار کی حیات تصانیف اور ان کے فن کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اور خود سرشار کا ایک مضمون "فن ناول نگاری" ان میں شامل ہے۔

مرتب کا مضمون "سرشار ـــــ تحقیقی جائزہ" اپنے تحقیقی مواد کی بنا پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں نہ صرف بعض غلط فہمیوں کو رفع کیا گیا ہے۔ بلکہ بعض نہایت اہم اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ سرشار کی متعدد تصانیف کا سراغ پہلے پہل اس مضمون میں ملا ہے۔

"فسانۂ آزاد" کی مقبولیت میں اس کی ظرافت کا بہت بڑا حصہ ہے سرشار نے اس میں قدم قدم پر ظرافت کے پھول کھلائے ہیں وہ واقعہ سے مزاح پیدا کرتا ہے کبھی کسی مضحکہ خیز صورت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور کبھی کسی کی حرکات سے ماحول کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔ صرف سرشار کا بلکہ اردو ادب کا لازوال کردار ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون اسی لازوال کردار کا تفصیلی مطالعہ ہے۔ آغا صاحب کی شکل و صورت اور قد و قامت وغیرہ بیان کرنے کے بعد اس کی شخصیت کی مختلف خصوصیات تفصیل کے ساتھ نمایاں کرتے چلے جاتے

اشارہ کیا۔ ان تینوں شاعروں نے ہماری قومی زندگی میں جو کردار ادا کیا ہے، اس کی صراحت احمد دین سے بہتر کسی نے نہیں کی۔ یعنی یہ کہ حالی، اکبر اور اقبال بالترتیب ماضی، حال اور مستقبل کے شاعر ہیں۔ احمد دین کو اقبال میں ایک خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس کی حاسّہ باطنی حالات اور واقعات ظاہری کو دل کی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ اس کا شاہدِ حقیقت کو بے نقاب پاتا ہے اور اس کا کلام رازِ حقیقت کے انکشافات سے لبریز ہے[۵۵] اور اس طرح وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمٰن ہے۔ کیونکہ اس کی بہت سی باتوں کو جو آئندہ زمانے سے متعلق تھیں، وقت نے صحیح ثابت کر دیا۔ اور اس طرح اقبال آنے والے دور کا شاعر ہے۔ اس کی آنکھوں پر اسرارِ حیات آشکارا ہیں۔ اور رازِ حقیقت عیاں[۵۶]۔

پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے۔

واہگہ کے اُس پار

مصنف :۔ رفیق چودھری

قیمت :۔ دو روپے

صفحات :۔ ۱۵۱

ملنے کا پتہ :۔ رچناب پبلشرز، کچہری بازار، گوجرانوالہ

تبصرہ نگار :۔ سید قدرت نقوی

ستمبر ۶۵ء کی سترہ روزہ جنگ ہماری قومی زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بھارت کا یہ اچانک اور منظم حملہ ہماری قومی غیرت کو ایک للکار تھی۔ ہم نے اس حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہماری قوم کا ہر فرد معروف جہاد ہو گیا۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی طبیعتوں کے جوہر دکھلائے، قوم میں اتحاد پیدا کیا اور حوصلے بڑھانے کی خدمت انجام دی افواج کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس طرح پورا ملک ملی ترانوں کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ قابل صد تبریک ہے۔ وہ جذبہ جس نے ہمارے اہل قلم سے یہ جوش انگیز، دلولہ خیز، ہمت افزا، ایثار زا یقین افروز اور وحشت سوز ادب پارے تخلیق کرائے، جن کو پوری قوم نے سراہا اور قبولیت عامہ کی سند عطا کی۔

شعراء کے دوش بدوش ادیبوں نے بھی کام کیا، فیچر پروگرام، ریڈیائی تمثیلچے اور تاریخی واقعات وغیرہ سپرد قلم کر کے قوم کو بہت کچھ دیا۔ یہ تمام امور فوری جذبے کے ردعمل تھے۔ ادیب و شاعر عوام سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ ان پر اس حادثے کا اثر ہونا ہی چاہئے تھا لیکن بعض حضرات ایسے بھی تھے جو ذہنی طور پر متاثر ہوتے ہوئے بھی اپنے جذبات و احساسات کو پیرایۂ اظہار نہ بخش سکے۔ اور اپنی کوتاہ قلمی کے احساس کو چھپانے کی خاطر یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ ہنگامی ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ اس میں آفاقیت نہیں ہے۔ ہم ایسے پہلو تلاش کر رہے ہیں کہ جن میں آفاقیت ہو اور ایسے انداز کی فکر میں ہیں جو جاوداں ہو۔ ہم اپنے غم کو عالمی غم کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ قول آج تک فعل کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ اس کا ایک جواب تو احمد ندیم قاسمی نے اسی کتاب کے پیش لفظ میں رفیق چودھری کی زبانی یہ دیا ہے۔

"میں نے انہیں بتایا کہ لاہور کے ادیب تو فی الحال اس تجربے کو، جس میں سے وہ گزرے ہیں۔ اپنے خون میں کھپانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور کسی بقراط نے تو شاید اپنی کوتاہ قلمی کو چھپانے کے لئے اس اعلان کے ساتھ اپنی ذہنی بلوغت کے انکشاف کی بھی کوشش کی ہے کہ اس نوع کے عظیم قومی واقعات کا فوری اثر قبول کرنیوالے ادیب ذہنی طور پر نابالغ ہوتے ہیں۔ رفیق چودھری نے مجھے بہت عمدہ جواب دیا انہوں نے کہا کہ اس عظیم ذہنی بلوغت کو اپنی اولاد کے لئے چھوڑے دیتا ہوں۔ اس لئے صدی نصف صدی بعد کی ذہنی بلوغت تو مستقبل کی نسل ہی کے مقدر میں ہے۔ میں تو ۱۹۶۵ء میں سانس لینے والا ایک پاکستانی ادیب ہوں۔ میں تو جب خوش ہوتا ہوں تو فوراً مسکراتا ہوں

رؤف ردولی صاحب نے "لکھنؤ اور سرشار" کے عنوان سے لکھنؤ کے اس مخصوص ماحول کا تجزیہ کیا ہے جس میں سرشار کی تصانیف عالم وجود میں آئیں۔ انہوں نے لکھنؤ کی پانچ تصویریں پیش کی ہیں اور یہ پانچوں مختلف افسانوی ادب سے لی گئی ہیں۔ پہلی تصویر سرور کے فسانۂ عجائب سے دوسری شرر کے گزشتہ لکھنؤ سے تیسری طلسمی داستانوں سے اور چوتھی رسوا کے ناولوں سے اور پانچویں سرشار کی تصانیف کی گئی ہے۔ اسکے بعد انہوں نے سرشار کی تصانیف کی مختلف خصوصیات بیان کی ہیں۔

"چنچل نار" نامی ناول کشن پرشاد شاد کے نام سے شائع ہوا تھا لیکن اسے سرشار کی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ ایک مضمون میں مختلف نقادوں کے خیالات اس ضمن میں پیش کئے گئے ہیں۔ کچھ لوگ اس کو شاد کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ اور کچھ سرشار کی۔ مضمون نگار نے مفصل بحث کی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ مسئلہ تصفیہ طلب ہی نظر آتا ہے۔

سرشار نے لکھنؤ اور حیدرآباد میں "اودھ اخبار" اور "دبدبۂ آصفی" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے تھے۔ تبسم کاشمیری نے سرشار کی دبدبۂ آصفی کی ادارت کی مدت کا تعین اپنے ایک مضمون "دبدبۂ آصفی اور سرشار" میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں "دبدبۂ آصفی پنڈت رتن سرشار کی ادارت میں حیدرآباد دکن سے ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ میں نکلنا شروع ہوا۔ لیکن سرشار زیادہ عرصہ اس خدمت کو انجام نہ دے سکے۔ تبسم صاحب کی اطلاع کے مطابق "ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ کا پرچہ اطلاع دیتا ہے کہ دبدبۂ آصفی سے ان کا تعلق ختم ہو گیا ہے۔ لیکن تبسم صاحب یہ نہیں بتایا کہ ۱۳۱۶ھ ذیقعدہ ہی سے ان کا تعلق منقطع ہوا یا اس سے قبل۔ تبسم صاحب نے سرشار کا سنہ وفات، ۲۷ جنوری ۱۹۰۲ء بتایا ہے۔ ۱۱ دبدبۂ آصفی حیدرآباد ۷ فروری ۱۹۰۲ء کا حوالہ دیا ہے لیکن آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "سرشار نے یہ دونوں کتابیں ۱۹۰۳ء سے قبل تیار کی تھیں ص ۲۱" جب ۱۹۰۲ء میں انتقال ہو چکا تھا تو ۱۹۰۲ء سے قبل لکھنا چاہیئے تھا نہ کہ ۱۹۰۳ء سے قبل۔ ممکن ہے یہ سہو کتابت ہو۔

سرشار نے اپنے مضمون "فن ناول نگاری" میں اس فن کے متعلق چند امور پیش کئے ہیں۔ اپنی تصانیف سے قبل کی افسانوی تصانیف کے متعلق لکھا ہے۔ "اردو زبان میں جو کتب قصص پیشتر کی ہیں وہ پرانی وضع کی۔ جغرافیے اور قیافوسی خیالات اور ان امور پر مبنی ہیں تاریخی امور پر مبنی ہیں جن کا عدم وجود برابر ہے اور حسب عادت محال اور حسب عقل غیر ممکن ہیں۔" اس کے بعد اپنے عہد کے افسانوی ادب کے متعلق لکھتے ہیں۔ "آج کل کے فرضی قصے واقعات پر مبنی ہیں۔ تاریخی امور پر مبنی ہیں۔ اخلاقی باتیں ان سے پیدا کی جاتی ہیں مادی نتائج نکلتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ پڑھا لکھا انسان ان کو پڑھے اور انتہا سے زیادہ دلچسپ معلوم نہ ہوں اور کیسے کہ ان میں تو وہ باتیں لکھی ہیں جو ہم روزمرہ دیکھتے اور سنتے اور کرتے ہیں۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرشار ناول اور افسانے کے لئے اپنے ہی ماحول کو موضوع بنانے پر زور دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناول نگار کو وہ ہدایت کرتے ہیں کہ واقعات و کردار کے بیان میں حقیقت اور واقعیت کو پیش نظر رکھا جائے۔ ناول میں عشقیہ عنصر کو عیب قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

مرتب نے ان بکھرے ہوئے مضامین کو یکجا کر کے سرشار کی حیات و تصانیف اور فن کا ایسا خاکہ مرتب کر دیا ہے جو ایک طرف آئندہ کام کرنے والوں کی رہنمائی کر سکتا ہے اور دوسری طرف عام قاری کو سرشار کی زندگی اور اس کی تخلیقات کے مختلف

سطح پر دیکھا ہے ۔ وہاں اپنے وجود کی معنویت کی تلاش فنکار کا سب سے بڑا مسئلہ ہوتی ہے ۔ اور اس تلاش میں اعجاز فاروقی نے اپنے پورے خلوص اور سچائی سے حقیقتوں کو تخلیقی اظہار کے ذریعہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کی تمام نظمیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ انہوں نے کھلے قلب اور ذہن کے ساتھ زندگی کی معنویت کو پانے اور اسے اتنے ہی مثبت انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے ۔ ان کا ذہن پہلے ہی سے کسی مخاصمت یا الجھن کا شکار نہیں تھا ۔ انہوں نے نہایت بالغ نظری کے ساتھ ہر مثبت قدر کو اپنایا ہے ۔ اور زبان و بیان کی ہر روایت کو قبول کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اظہار کے سلسلے میں اسلوب کوئی مسئلہ نہیں بنتا ۔ بہت واضح اور خوبصورت تراکیب ، الفاظ کا مناسب انتخاب اور جدید علامتوں کا واضح پیرایۂ بیان میں استعمال اس مجموعہ کی خصوصیت ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ فاروقی صاحب کے یہاں اردو شاعری کے معروف اور مستعمل اسالیب نظر نہیں آتے اور صرف معرّا اسلوب ہی سے کام لیتے ہیں ۔ مگر معرّا اسلوب میں اگر اس سے رکھ رکھاؤ سے کام لیا جاتا رہتا تو شاید وہ اتنی جلد غیر مقبول نہ ہوتا ۔

آدھی رات کا سورج جدید شعور کا ایک نمائندہ مجموعۂ کلام ہے جس کی سنجیدگی اور خلوص اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ جلد یا بدیر معرّا اسلوب پھر ایک مقبول صنف بن جائیگا ۔ بشرطیکہ اسے اعجاز فاروقی جیسے متوازن شاعر میسر آتے رہے اور اسے بغاوت کا محض ایک ذریعہ نہ سمجھا گیا ۔

آدھی رات کا سورج کی ہر نظم ایک تازہ واردات ہے ۔ جس میں کیف بھی ہے اور فکر بھی ـــــ

سحر نغمہ

مصنّف : صدر رضوی ساز

ناشر : نادیئے پبلیکیشنز حیدرآباد (پاک)

ضخامت : ۱۰۲ صفحات

قیمت : ۳۰ روپے

تبصرہ نگار : شمیم احمد

صدر رضوی ساز پرانے لکھنے والے ہیں ۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "سحر نغمہ" اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انہوں نے شاعری کو اپنے لئے ہمیشہ ایک محترم نعمت سمجھا ہے اور کاتا اور لے دوڑی کی مثال ان پر صادق نہیں آتی ۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً تیس سال شعر کہنے کے بعد ان کا پہلا مجموعہ کلام اب شائع ہوا ہے ۔ "سحر نغمہ" ایک طرح سے بہت بڑی سوغات ہے ۔ کیونکہ اس مجموعے سے اردو ادب کے گزشتہ ۵۰ سال کے عہد بہ عہد بدلتے ہوئے رویوں اور مخصوص موضوعات کا زمانہ ایک تصویر بن کر سامنے آجاتا ہے ۔

جو ہماری تاریخ ادب کا ایک دلچسپ اور سچا خاکہ ہمارے سامنے لاتا ہے مثلاً اس مجموعہ میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۱ء تک کا کلام اردو شاعری کے رومانی دور کا بڑی سچی یاد دلاتا ہے ۔ اور رومانی عہد کے ساری خصوصیات کو ایک بار ہمارے ذہن میں از سر نو تازہ کر دیتا ہے ۔ اس کے بعد بھی عمل ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۲ء تک کے کلام میں نظر آتا ہے ۔ جب سیاسی تحریکات اپنے عروج کو چھوتی ہیں ۔ اور ادب میں سماجی اور مادی حقائق

اور جب میرے دل پر چوٹ پڑتی ہے تو میں اپنے آنسو نہیں روک سکتا۔

دوسری بات جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ ہے کہ وہ بالطبع امن پسند ہیں۔ قتل و خونریزی، جنگ و جدل کو انسانیت سوز فعل سمجھتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ فعل اس کے لئے تو یقیناً مذموم ہے جو اس کا بانی ہو، مگر جس پر جنگ ٹھونسی جائے وہ مدافعت کیلئے مجبور ہوتا ہے مدافعت فطری عمل ہے۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ ایسے ادیب و شاعر جو اصناف ادب اختیار کئے ہوئے ہیں وہ اس جذبے کے اظہار کے لئے موزوں نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ یہ ایسا فوری حادثہ تھا کہ جس نے فکر پر گہرا اثر ڈالا۔ شاعروں کے لئے تو اس کے اظہار کے متعدد پہلو ہو سکتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار اور ناول نگار کے لئے اس تھوڑی مدت میں مواد فراہم ہونا کوئی بڑی بات تو نہیں تھی مگر اظہار ضرور وقت چاہتا تھا اور ہوا بھی یہی۔ مگر ناول میں اس جذبے کی آنچ کو جس نے سب سے پہلے جذب کیا وہ رفیق چودھری ہیں جنہوں نے بہت جلد، قلیل مدت میں اور غالباً نہیں بلکہ یقیناً سب سے پہلے اس موضوع پر ناول لکھ ڈالا۔ اگر آپ کا دل حب وطن کے جذبات سے لبریز ہے تو آپ کی چشم نم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور ایسا ہونا ایک ہی مقام پر موقوف نہیں، بلکہ بیشتر مواقع آپ کی آنکھوں کو نم آلود کریں گے۔

ناول، واہگہ کے اس پار سے شروع ہوتا ہے اور اس پار ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ادیب کی چشم تصور نے وہ سب کچھ دیکھ لیا۔ جو وہاں ہونا متوقع تھا۔ آپ ناول میں حقیقت کے خلاف کوئی بات محسوس نہیں کریں گے۔ غیر متوقع ناممکن العمل، مافوق الفطرت امور کا اس میں گزر بھی نہیں ہے۔ کہانی بڑی سادہ ہے۔ واقعات اکثر جگہ بڑے رقت انگیز ہیں۔ ناول قصہ گوئی کے طور پر آگے بڑھتا ہے۔ مگر قصہ گوئی کا کوئی انداز اس میں نہیں ملے گا۔ رفیق چودھری کی کوشش ایک کامیاب کوشش ہے۔ ہمارے ادیبوں کے لئے ایک دعوت ہے کہ وہ اس سانحہ اس حادثہ کو اظہار کے ایسے روپ دیں کہ آئندہ نسلوں کے لئے یہ سرمایہ افتخار ثابت ہوں۔ آئندہ نسلیں فخر و مباہات سے اپنا سینہ تان سکیں اور اپنا سر بلند کر سکیں۔

آدھی رات کا سورج

مصنف :- اعجاز فاروقی
ناشر :- جدید ناشرین۔ لاہور
ضخامت :- ۱۰۰ صفحات
قیمت :- سات روپے
تبصرہ نگار :- شمیم احمد

آدھی رات کا سورج جدید شاعری کا مجموعہ ہے۔ مگر ایسی جدید شاعری جو نا سمجھی اور محض شعر گفتن کی پیداوار نہیں ہے۔ جدید شعور کے اگر کوئی معنی ہیں تو وہ یہی ہیں کہ وہ ہمارے ذہن میں ایسے سوالات ابھارے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت پرانے ہونے کے باوجود جدید تر زمانے کے بعد فرد کے ذہن میں پہلی بار ابھرے ہوں۔ اسی لئے ہر سوال جتنا پرانا ہوتا ہے۔ اتنا ہی نیا ہوتا ہے۔ اعجاز فاروقی نے زندگی کو جس

بتاری پر کوئی مرثیہ لکھا۔ آج تک اس خطۂ پاک کی کوئی قابل اعتماد مفصل یا مختصر تاریخ بھی نہیں لکھی گئی تھی۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ مسعود حسن شہاب نے اس موضوع کی طرف توجہ کی ہے کہ مسعود حسن شہاب موصوف نے نہایت محنت اور جان کاہی سے اس خطے کی نہایت مستند، جامع اور مفصل تاریخ مرتب کردی۔ انہوں نے تمام بنیادی ماخذ اور اہم ذرائع سے کام لے کر تاریخ کے طالبعلموں اور مستقبل کے مورخوں کے لئے مستند مواد بہم پہنچایا ہے۔

مصنف نے اس کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اوّل اوچ کی قدامت، اس کے نام کی تحقیق اور اس کے محل وقوع کے مباحث کے لئے وقف ہے۔ دوسرے باب میں عہد قدیم اور اس کے بعد مسلمان سلاطین کے مختلف عہدوں میں اس کے عروج و زوال کی داستان بیان کی ہے۔ تیسرے اور چوتھے باب میں اوچ کا مرکز علم و عرفان کی حیثیت سے جائزہ لیا ہے اور اوچ کی علمی و روحانی شخصیتوں ان کی علمی اور تبلیغی اصلاحی خدمات اور علم و عرفان کے خانوادوں اور سلسلوں کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح چھٹے باب میں ایسے علما صوفیا اور بزرگان دین کا تذکرہ ہے۔ جن کا تعلق اگرچہ اس خطۂ پاک سے نہ تھا لیکن وہ یہاں آگئے تھے۔ اور اسے اپنے روحانی فیضان کا مرکز بنایا تھا۔ باب پنجم کا عنوان ہے۔

" اوچ ایک بستی ایک تحریک ایک تاریخ ساز شہر" یہ باب اگرچہ بہت مختصر ہے۔ لیکن انتہائی فکر انگیز اور اہم ہے۔ صرف اس باب کے مطالعے ہی سے اوچ کی عظمت کا نقش دل پر ثبت ہو جاتا ہے۔ یہ باب کتاب کی جان اور حکمتوں اور بصیرتوں کا مرقع ہے۔ کتاب کے دوسرے ابواب میں جو کچھ ہے وہ گویا اس کی تشریح و تفسیر ہے۔ میرے خیال میں اسے کتاب کا باب اوّل بنانا چاہیئے تھا۔

ساتواں باب اوچ کے آثار قدیمہ، علمی نوادر، مخطوطات اور دیگر تبرکات نیز اوچ کی زبان اور اس خطے کی مختلف اقوام مذاہب کے تذکرے اور تعارف کے لئے وقف ہے۔ باب ہشتم میں اس علاقے کی دیگر تاریخی بستیوں اور قلعوں کا تذکرہ کیا گیا ہے آخری باب میں تاریخ کی اس یادگار کی موجودہ حالت کا تذکرہ ہے اور محکمہ آثار قدیمہ کو بعض باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

کتاب میں دو درجن سے زیادہ تاریخی عمارات، آثار قدیمہ، علمی نوادر، مخطوطات وغیرہ کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ آخر میں کتب والہ کی مفصل فہرست بھی شامل ہے۔ جن سے مصنف نے اس کتاب کی تیاری میں استفادہ کیا ہے اور اشخاص، اماکن وغیرہ کے اشاریے بھی شامل ہیں جن سے کتاب کی افادیت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

تاریخ ادب اردو

مصنف :۔ رام بابو سکسینہ

مترجم :۔ مرزا محمد عسکری

مرتب :۔ تبسم کاشمیری

قیمت :۔ سفید کاغذ بارہ روپے۔ نیوز پرنٹ دس روپے

ناشر :۔ علمی کتب خانہ۔ اردو بازار۔ لاہور۔

کی تحریک شروع ہوتی ہے۔ اس دور کی نظموں میں بھی اردو ادب کے اس دور کے وہ تمام نقوش پوری تابانی کے ساتھ موجود ہیں جب زندگی کے تلخ حقائق رومانی طرز فکر کو بدل کر انقلابی اور قومی شعور میں تبدیل کر دیتے ہیں ۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء سے تا حال صدر صوفی ساز اپنی شاعری میں ابھرتی ہوئی نئی قومیت اور پاکستان کے مخصوص حالات کو اپنا موضوع بناتے نظر آتے ہیں جس کے ساتھ ماضی کی یادوں کی کسک بھی ہے ۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آخری حصے میں وہ تازگی اور شگفتگی مفقود ہے جو پہلے دونوں ادوار اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر پر ایک تھکن طاری ہے جس کو توڑ کر وہ خود کو نئی زندگی سے از سر نو نئے تازہ رشتوں میں نہیں جوڑ پا رہا ہے ۔ جن سے وہ ایک زمانہ میں وابستہ تھا۔ بحیثیت مجموعی سحر نغمہ ایک اوسط درجے کا شعری مجموعہ ہے جس میں گزشتہ تیس سال کے رجحانات اور رویوں کا پورا پورا عکس ملتا ہے ۔

خطۂ پاک اوچ

مصنف :۔ مسعود حسن شہاب

صفحات :۔ ۲۴۴

قیمت :۔ پندرہ روپے

ناشر :۔ اردو اکیڈمی بہاولپور

تبصرہ نگار :۔ ابو سلمان شاہجہانپوری

اوچ کی قدیم بستی کب بسی؛ اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی ۔ تاریخ کا آفتاب طلوع ہوا تو یہ بستی موجود تھی اور وقت سے یہ بستی مختلف حکومتوں کی راجدھانی، تہذیب و تمدن کا مرکز اور علم و حکمت کا سرچشمہ رہی ہے ۔ برصغیر پاک و ہند میں مسلم کی آمد کے بعد تو اس کی قسمت کو جیسے چار چاند لگ گئے اور یہ خطہ واقعی خطۂ پاک بن گیا۔ علم و حکمت اور فلسفہ و اخلاق کے دھارے یہاں سے پھوٹے مدت ہائے مدید تک اسلامی علوم و فنون اور تبلیغ و اشاعت اسلام کا مرکز ہونے کا شرف اسے حاصل رہا ہے۔ کتنے صوفیائے کرام اور علمائے عظام کی ولادت کی اس مقام نے سعادت پائی اور بہت سے بزرگان دین اور اولیا کبار ہیں جو تشریف لائے اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے انہوں نے اس خطۂ پاک کو عزت بخشی، فکر و نظر کے سوتے یہاں سے پھوٹے، سلاسل تصوف کے کاروانوں نے یہاں پڑاؤ ڈالا اور اسے اپنی تعلیم و تربیت و ارشاد کا مرکز بنایا۔ فکر و نظر کے قافلے یہاں سے مختلف سمتوں کو روانہ ہوئے علم و ادب نے یہاں اپنے نقش ثبت کئے۔ شہنشاہوں نے اپنے قلعوں کے لئے اس بستی کو پسند کیا۔ اسلامی تہذیب کے عظیم الشان مظاہر مساجد و مقابر نے یہاں اپنے سر بلند کئے۔ درس و تدریس کے اہم مرکز یہاں قائم ہوئے۔ غرض کہ برصغیر میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا قبلہ اول اور علوم و معارف کا پہلا سرچشمہ یہی اوچ تھا۔

لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مسلمان کے اس مرکز تہذیب و ثقافت کی ایک ایک اینٹ بکھر گئی اور علوم و معارف کا یہ چشمہ خشک ہو گیا۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی لیکن یہ امر ضرور تعجب خیز تھا کہ اس کے غم میں کسی آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا نہ کسی نے اس

گرد و پیش

۲۲ اپریل۔ سبی کے ریلوے گارڈ خواجہ غلام محمد نے تنخواہ لیتے وقت اردو میں دستخط کئے جس پر اسٹیشن ماسٹر نے انگریزی میں دستخط کرنے کو کہا۔ خواجہ غلام محمد نے دستور پاکستان کے مطابق قومی زبان اردو میں دستخط کرنے پر اصرار کیا جس کی بنا پر ان کی تنخواہ روک لی گئی۔

انگریزی سیکھے! کراچی میں ۲۲ اپریل کو وزیر قانون جناب ایس ایم ظفر نے عوام پر زور دیا کہ وہ انگریزی زبان سیکھیں، گویا وزیر قانون کے خیال میں انگریزی پاکستان میں نہیں سیکھی جا رہی ہے۔ حالانکہ حکومت اور وزرا کے سارے کے سارے بیانات کے باوجود پاکستان میں انگریزی تعلیم لازمی ہے۔ اور دستور پاکستان کی قومی زبانیں ابھی عملی طور پر قومی نہیں بنی ہیں اور صرف انگریزی ہی قومی اور سرکاری زبان ہے۔ البتہ ماہرین تعلیم اور سائنسدان، محب وطن، ماہرین سماجیات وغیرہ ضرور قومی زبانیں اختیار کرنے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔

مناسب وقت قیام پاکستان کے ۲۱ ویں سال میں بھی پاکستان کی قومی اسمبلی میں قومی زبانوں کو اعلا مدارج میں ذریعۂ تعلیم بنانے کا محض جائزہ لیا جا رہا ہے۔ وزیر تعلیم جناب قاضی انوار الحق نے فرمایا ہے کہ "اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری کارروائی مناسب مدت میں کی جائے گی"۔

اس بیان کی روشنی میں پاکستان اسمبلی گزشتہ ۲۰ سال سے صرف مناسب وقت اور مناسب کارروائی کے انتظار میں ہے یہ مناسب وقت کب آئے گا اس کا اندازہ موجودہ حالات میں کرنا ممکن نہیں ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

ایک ماہر تعلیم کی نظر میں ہیلی کالج برائے کامرس کا جلسۂ تقسیم اسناد ۱۲ اپریل کو لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے کالج کے پرنسپل جناب محمد مرتضیٰ خاں صاحب نے کہا کہ یہ درست نہیں کہ تجارتی مضامین کے لئے اُردو زبان ذریعۂ اظہار نہیں بنائی جاسکتی۔ انھوں نے کہا کہ دوسرے مضامین کی طرح تجارتی علوم کے لئے بھی قومی زبان

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو ادب کی مقبول ترین تاریخ اردو زبان میں نہیں، انگریزی میں لکھی گئی۔ رام بابو سکسینہ نے انگریزی زبان میں یہ تاریخ اس لئے لکھی ہے کہ انگریزی داں طبقہ اس سے واقف ہو سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں ادب کی کوئی ایسی مکمل تاریخ موجود نہ تھی اور اسی وجہ سے مرزا محمد عسکری نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ انہوں نے محض ترجمے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اکثر مقامات پر مفید مواد کا اضافہ کیا اور ایسے حواشی لکھے جن میں اصل کتاب کی بعض خامیوں کو دور کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ آج بھی برِ صغیر کی تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے اور باوجود اپنی کوتاہیوں کے اپنے موضوع پر مقبول ترین کتاب ہے۔ اصل کتاب ۱۹۲۷ء میں لکھی گئی تھی اور ترجمہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا، گزشتہ چالیس برس کے دوران اردو ادب کے بہت سے پہلوؤں پر قابلِ قدر کام ہوا ہے اور متعدد ایسے مآخذ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ جن سے اس کتاب کی تالیف میں مدد نہیں لی جا سکی تھی یہ حیرت کی بات ہے کہ اس تاریخ کی اشاعت کے بعد چند مصنفین نے اس موضوع پر کام کیا۔ لیکن وہ سکسینہ کے کام پر کوئی اضافہ نہیں کر سکے اسی صورت میں جبکہ ہمارے لئے اس تاریخ سے بہتر تاریخ لکھنا ممکن نہیں ہے تو پھر یہی مناسب ہے کہ اس تاریخ کو جدید تحقیق کی روشنی میں مرتب کیا جائے۔ یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ تبسم کاشمیری نے اس فریضے کو نہایت خوبی سے انجام دیا ہے۔ تبسم صاحب ہمارے ان نوجوان محققوں میں سے ہیں۔ جن کے بارے میں بلا تکلف یہ کہا جا سکتا ہے۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی !

انہوں نے اس کتاب پر جا بجا مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ جن سے اصل کی اغلاط کی تصحیح ہی نہیں ہوتی بلکہ تاریخ ادب کے مختلف گوشوں پر جو تحقیقی کام ہوا ہے، اس کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ فاضل مرتب نے ان حواشی میں وہ خلا بھی پُر کئے ہیں جو اصل اور پھر اس کے بعد ترجمے میں رہ گئے تھے۔ نیز بعض ایسے مقامات پر جہاں اجمال یا ابہام تھا وہاں تفصیل و توضیح سے کام لیا گیا ہے۔ موجودہ صورت میں یہ تاریخ ادب پہلے سے کہیں بہتر اور مفید نظر آتی ہے۔ طباعت کے اعتبار سے بھی یہ کتاب اچھی خاصی ہے۔ البتہ نول کشوری ایڈیشن میں جو تصاویر تھیں، ان کی عدم موجودگی کھٹکتی ہے۔

انہیں اس بات کا احساس نہیں دلایا گیا۔

مجلسِ مذاکرہ

دائرۂ علم و ادب جی باغ ضیاء الدین میموریل کالج کے زیرِ اہتمام ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کا موضوع تھا "پاکستانی کلچر اور اس کے مسائل" جن حضرات نے اُن میں شرکت کی اُن میں پروفیسر کرار حسین، جمیل جالبی، عقار زمی اور سلیم احمد کے نام شامل ہیں۔ مذاکرے کی صدارت جناب ڈاکٹر سید معین الحق نے فرمائی۔

اُردو اور بنگالی مصنفین سے اپیل

قومی کتاب مرکز کے ڈائرکٹر جناب ابن انشا نے کراچی میں ۱۴ اپریل کو اُردو مصنفین سے اپیل کی ہے کہ یونیسکو کی طرف سے اعلان کردہ سائنسی اور ثقافتی موضوعات پر مسودے درکار ہیں جن کی تاریخ ۲۵ مئی ۱۹۶۸ء تک بڑھا دی گئی ہے۔ انتخاب ججوں کی ایک کمیٹی کرے گی اور منتخب مسودات کا معاوضہ دو دو ہزار روپے ہوگا۔ ہر مسودہ تقریباً ۴۰ ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ دو اردو اور دو بنگالی کتابیں منتخب کی جائیں گی۔ موضوع حسبِ ذیل ہے "سائنسی انکشافات و ایجادات" "مہلک بیماریوں سے نجات اور انسان پرست تحریکیں" کتابیں پاکستان قومی کتاب مرکز، تھیوسوفیکل ہال بندر روڈ کے پتے پر بھیجی جائیں۔

سہ ماہی سیپ کا خاص نمبر

سہ ماہی ادبی مجلہ سیپ کا ۱۲واں اور خاص نمبر شائع ہو گیا ہے۔ جس کی ضخامت ۶۴۲ صفحات ہے اور قیمت چھ روپے ہے۔ سیپ میں برصغیر کے بعض اہم لکھنے والوں کی تخلیقات بھی شامل ہیں۔ اور دیدہ زیب سرورق مصنفین کی تصاویر کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

ہفت روزہ چٹان بند کر دیا گیا

حکومتِ پاکستان نے ۲۵ اپریل کو ہفت روزہ چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا۔ اور چٹان پرنٹنگ پریس ضبط کر لیا۔ اور ۲۲ اپریل کی تمام کاپیاں بھی ضبط کر لیں۔ ہفت روزہ چٹان کے مدیر جناب آغا شورش کاشمیری کے خلاف ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت کارروائی کی گئی ہے اور انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔

مجلس ترقیٔ ادب کی کارگزاری

جناب امتیاز علی تاج صدر مجلس ترقیٔ ادب لاہور نے ۲۵ اپریل کو ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ مجلس نے گزشتہ ۸ سالوں میں ۱۶۴ کتابیں شائع کی ہیں جو مجموعی طور پر ۸۳ ہزار دو سو ۷۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مجلس نے اس عرصے میں اوسطاً سالانہ ۲۱ کتابیں شائع کی ہیں اور یہ تمام کام مالی وسیلوں اور عملے کی کمی کے باوجود انجام دیا گیا ہے۔

تاریخ کی دو روزہ کانفرنس

پاکستان تاریخ سوسائٹی کے زیرِ اہتمام تاریخ کی سولھویں دو روزہ کانفرنس کراچی میں ۲۰ اپریل سے شروع ہوئی جس میں تقریر کرتے ہوئے مرکزی وزیرِ تعلیم نے فرمایا کہ "مؤرخین اسلاف کی جدوجہدِ آزادی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کریں اور نئی نسل کو قومی ورثے کی عظمت سے آگاہ کریں۔" کانفرنس سے جناب اشتیاق حسین قریشی، ۔۔۔ فد ۔۔۔ ا لو۔ محمد ۔۔۔ ڈاکٹر معصوم، الحق اور خالد اسحاق نے بھی خطاب کیا کانفرنس ہو ۔۔۔ مشرقی پاکستان

ہی بہتر ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ درس و تدریس میں غیر ملکی زبان کا استعمال تعلیمی نقطۂ نظر سے ایک غیر فطری جبر ہے۔

انجمن فروغ اردو کا قیام

گجرات میں انجمن فروغ اردو قائم کردی گئی ہے۔ اس کے یوم تاسیس پر سابق ایم این۔ اے جناب میاں محمد اکبر نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی اقدار کو اجاگر کرنے کے لئے قومی زبان کو فروغ دیا جائے۔ کیونکہ اردو زبان سے بے اعتنائی ہی کے باعث انگریزی زبان غیر ضروری اہمیت حاصل کر گئی ہے جس سے احساس کمتری کا زہر پھیل رہا ہے۔

برطانیہ میں ایک مطالبہ

ناٹنگھم میں پاکستان فرینڈز لیگ کے معتمد جناب محمد اسلم نے ۱۷ اپریل کو مطالبہ کیا ہے کہ شہر کے اسکولوں میں اردو زبان ایک زائد زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔ اس صورت میں پاکستانی بچے فرانسیسی یا جرمنی زبان کی جگہ اردو پڑھ سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ زبان جی۔ ای سی کی سطح تک آسانی سے پڑھائی جا سکتی ہے۔

بی بی سی کے اردو پروگرام

برطانیہ میں عوامی زندگی کے مختلف پہلو اور بی۔ بی۔ سی کے اردو پروگرام نہایت مقبول ہو رہے ہیں۔ اردو نیوز ریل جو پیر سے جمعرات تک نشر کی جاتی ہے بہت مقبول ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی، سماجی، اقتصادی، ثقافتی، ادبی اور کھیل کود کے حالات بہت ہی جامعیت کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ "آج کا ڈاکٹر" کتابوں پر تبصرہ اور "برطانیہ میں عوامی زندگی کے مختلف پہلو" نامی پروگرام بھی نہایت ذوق شوق سے سنے جاتے ہیں۔

علمی ادبی تعلیمی اور ثقافتی خبریں

کتاب گھر کا افتتاح

راولپنڈی میں ۱۳ اپریل کو ایک اعلیٰ درجے کے کتاب گھر کا افتتاح کرتے ہوئے وزارت اطلاعات کے معتمد جناب الطاف گوہر نے کہا کہ پورے ملک میں اعلیٰ درجے کے کتاب گھر قائم ہونے چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب گھر دوسری کتابوں کی دکانوں سے اس لئے مختلف ہے کہ اس کی آمدنی لوگوں کو اچھی کتابیں مہیا کرنے پر صرف ہوگی۔ اس منصوبے کے ناظم جناب عزیز احمد نے کہا کہ پاکستان پبلیکیشنز کا مقصد دولت کمانا نہیں ہے اس لئے اس کی کتابیں سستی ہیں۔ اور اس کے منافع میں ادیب اور فنکار بھی شریک ہیں۔

جلسہ تقسیم اسناد

سی۔ بی کالج راولپنڈی میں ۱۹ اپریل کو جلسۂ تقسیم اسناد میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے وزارت تعلیم کے معتمد جناب قدرت اللہ شہاب نے کہا کہ غیر ملکی حکمرانوں سے نجات پانے کے بعد ہم آزادی کی دولت سے مالامال ہوئے مگر طویل غلامی نے جو ذہنی انتشار اور معاشرتی رویئے ہماری رگوں میں دوڑا دیئے تھے وہ بعض طبقوں میں بدستور پرورش پاتے رہے چنانچہ انہوں نے اپنے ماضی سے نفرت، اپنی ثقافت سے حقارت اور غیر ملکی تہذیب و تمدن سے محبت کا رشتہ جوڑ لیا۔ جناب قدرت اللہ شہاب نے کہا کہ ہمارے ایسے طبقوں میں احساس کمتری اور اپنی قومیت سے نفرت اسی لئے پیدا ہو گئی ہے کہ

اقبال کونسل کے نام پیغامات ارسال کرنے والوں میں صدر پاکستان کے علاوہ شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی۔ صدر جمہوریہ عراق رحمٰن عارف۔ شاہ اُردن شاہ حسین۔ صدر ترکی۔ جودت سنائے۔ گورنر مغربی پاکستان محمد موسیٰ اور گورنر مشرقی پاکستان عبد المنعم شامل ہیں۔ تقریبات اقبال کے سلسلے میں پاکستان کے تمام اہم شہروں میں جلسے ہوئے۔

کراچی :۔ ۲۶ر اپریل :۔ اقبال کونسل کے زیر اہتمام ہفتہ اقبال منایا گیا اور فلیٹ کلب میں عام جلسہ ہوا جس کی صدارت صوبائی وزیر خزانہ واطلاعات جناب سید احمد سعید کرمانی نے کی۔ جلسے سے خطاب کرنے والوں میں دربار علی شاہ کمشنر کراچی۔ جناب ممتاز حسن اصفہانی ادیبہ وردلو۔ عابد علی عابد۔ جی الآنہ بشیر احمد ڈار۔ پروفیسر ایس۔ ایم۔ یوسف۔ اور ڈاکٹر پروین حسن کے نام قابل ذکر ہیں۔

۲۳ر اپریل کو فلیٹ کلب میں اپوا کے زیر اہتمام خواتین کا ایک اجلاس ہوا۔ جس کی صدارت بیگم سلمیٰ تصدق حسین نے فرمائی۔ بیگم سرہا بیت اللہ صدیق علیخاں بیگم مسعودہ جواد نے شاعر مشرق علامہ اقبال کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ ۲۱ر اپریل کو علامہ اقبال گرلز کالج کی اتحاد طالبات کے زیر اہتمام یوم اقبال کی تقریب میں افتخار احمد عدنی حسنین کاظمی۔ مرتضیٰ شفیع اور نوشابہ صدیقی نے حکیم الامت کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کراچی میں ۲۲ر اپریل کو صدر پاکستان کے مشیر سید فدا حسن نے علامہ اقبال لائبریری کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر کمشنر کراچی دربار علی شاہ اور بلدیہ کے وائس چیرمین ضیاء اللہ صاحب نے تقاریر کیں۔ یہ لائبریری حبیب بینک کی اعانت سے قائم کی گئی ہے۔

۲۴ر اپریل :۔ جامعہ کراچی میں اقبالیات پر ایک الگ لائبریری کا افتتاح کرتے ہوئے۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین نے تعلیمات اقبال کی اشاعت پر زور دیا

۲۸ر اپریل کو فلیٹ کلب میں اقبالیات پر ایک محفل موسیقی ترتیب دی گئی۔ جس میں شاعر مشرق کے کلام کو فن کاروں نے سامعین کے سامنے پیش کیا۔ ان میں ریحانہ یاسمین، نگہت سیما اور فریدہ خانم کے نام قابل ذکر ہیں۔ منظور احمد نیازی قوال پارٹی نے کلام اقبال پر مشتمل نذر پیش کی۔ ۲۷ر اپریل کو فلیٹ کلب میں اقبال کونسل کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ ہوا جس میں کراچی کے اور مغربی پاکستان کے ممتاز شاعروں نے اقبال شعر پیش کئے اور بیگم چودھری خلیق الزماں وزیر صحت و سماجی بہبود مغربی پاکستان نے صدارت کی۔ یہ مشاعرہ ریڈیو پاکستان کراچی سے ریلے بھی ہوا۔

لاہور :۔ مرکزی مجلس اقبال لاہور کے زیر اہتمام ایک جلسۂ عام ۲۱ر اپریل کو یونیورسٹی ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے چیف جسٹس جناب وحید الدین احمد نے فرمائی۔ جلسے سے خطاب کرنے والوں میں مشرقی پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب سید محبوب مرشد جناب جاوید اقبال، جناب شورش کاشمیری۔ جناب چودھری نذیر احمد۔ جناب محمد شفیع خاں پیر بخش قابل ذکر ہیں۔ مفکر پاکستان کی یاد میں لاہور کے ایک ظروف ساز نے ایک طلائی بیج اور ایک نقرئی بیج تحفے پیش کیا۔ سبز زمین پر حکیم الامت کی تصویر والا یہ بیج بہت مقبول ہوا۔

۲۷ر اپریل کو پاکستان کلچرل کونسل کے زیر اہتمام بی۔ این۔ آر سینٹر میں یوم اقبال منایا گیا۔ جس کی صدارت محکمہ امداد باہمی کے معتمد سید محمد قاسم رضوی نے کی۔ جلسے سے خطاب کرنے والوں میں ڈاکٹر سید عبداللہ۔ علامہ عبداللہ انور بیگ اور سید نذیر نیازی قابل ذکر ہیں۔

کے مندوبین کے علاوہ سعودی عرب، برطانیہ اور امریکہ کے مندوبین نے بھی شرکت کی۔

گلڈ کی خدمات وزارت تعلیم کے معتمد جناب قدرت اللہ شہاب نے ۲۷ اپریل کو ڈھاکا کی ایک تقریب میں کہا کہ ادارہ مصنفین پاکستان نے دونوں صوبوں کے ادیبوں کو قریب تر لانے کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یہ تقریب جناب شہاب کی ادبی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں منعقد ہوئی تھی۔

اس آئینہ خانے میں

پروفیسر مونتیل کے اعزاز میں ڈاکار یونیورسٹی (سینی گال) کے اسلامی علوم کے پروفیسر، فرانسیسی مستشرق اور فرانس کے صدر چارلس ڈیگال کے قریبی دوست جناب پروفیسر وانسینٹ مونتیل کے اعزاز میں لاہور میں ۱۶ اپریل کو ایک پارٹی دی گئی جس میں پروفیسر موصوف نے کہا کہ صدر ڈیگال مسلم ممالک کے مستقبل کو ایک بہت بڑا مسئلہ سمجھتے ہیں اور ان کا پختہ خیال ہے کہ ان ممالک کا مقدر خود مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ پروفیسر مونتیل نے کہا کہ میں ذاتی طور پر اسرائیل کو ڈاکو سمجھتا ہوں اور فلسطین کا مسئلہ مذہبی نہیں بلکہ یہودیوں کی ملک گیری کی ہوس کا نتیجہ ہے۔

حامد اللہ افسر میرٹھی کی آمد اردو کے ممتاز نقاد، نمایاں شاعر اور پرانے ادیب جناب حامد اللہ افسر میرٹھی ہندوستان سے مختصر قیام کے لئے کراچی تشریف لائے ہیں۔ ملنے کے خواہشمند حضرات اے ۲۸۴۔ اے شمالی ناظم آباد میں مل سکتے ہیں۔

میرزا ادیب کی خدمات لاہور میں ۳۰ اپریل کو رفاہ عام ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں میرزا ادیب کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ حلقہ احباب ادب کی جانب سے یہ تقریب مرزا ادیب کے ڈراموں کے مجموعہ "پس پردہ" پر آدم جی ادبی انعام ملنے پر اظہار مسرت کے لئے منعقد ہوئی تھی۔ عشرت رحمانی اور قتیل شفائی نے میرزا ادیب کو خراج تحسین پیش کیا۔

یادوں کے چراغ

شاعر مشرق کے حضور

حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال کی تیسویں برسی پاکستان کے طول و عرض میں بہت احترام، جوش اور ولولے سے منائی گئی۔ پاکستان کے باہر بھی اس مفکر شاعر کی یاد تازہ کی گئی۔ اس بار اقبال کونسل کے نام صدر پاکستان اور عالم اسلام کے متعدد حکمرانوں نے پیغام بھیجے اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے گورنروں نے شاعر پاکستان کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس تفصیل کی اجمالی کیفیت درج ذیل ہے۔

سیالکوٹ :- اقبال کے شہر سیالکوٹ میں شہریوں کی طرف سے یوم اقبال کی تقریب نہایت خلوص اور محبت سے منائی گئی اور لاہور اور دیگر مقامات سے ادبا اور شعرا کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ مقالات پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر محمد باقر۔ ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور بشیر احمد صاحب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جلسے میں علامہ اقبال کے سیالکوٹ والے مکان کو قومی اثاثہ قرار دینے کی تجویز اتفاقِ رائے سے منظور ہوگئی۔ سیالکوٹ میں ۲۱ اپریل کو بیادِ اقبال ایک مشاعرہ ہوا جس میں مقامی شعرا کے علاوہ احسان دانش۔ ناصر کاظمی۔ قتیل شفائی۔ بسمل صابری۔ مظفر وارثی اور منور سلطانہ لکھنوی نے حصہ لیا۔

عارف والا :- ۲۳ اپریل کو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیرِ اہتمام ایک اجتماع ہوا جس میں طلبہ نے شاعرِ مشرق کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ جلسے کی صدارت فیڈریشن کے صدر جناب ظفر اقبال نے کی۔

ان شہروں کے علاوہ بھی یوم اقبال کی تقریبات منائی گئیں اور مشاعرے ہوئے۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان بلکہ شہر کان پور میں علامہ اقبال کی یاد میں ایک ہوسٹل قائم کیا گیا ہے جس کا نام اقبال ہوسٹل ہے۔ یہ ہوسٹل ایک مقامی لائبریری "اقبال لائبریری" نے طلبہ کی سہولت کے لئے قائم کیا ہے۔ کویت میں مصر کی ممتاز مغنیہ اُمّ کلثوم نے پاکستانی سفیر جناب ایس۔ ایم حسین کی ایک استقبالیہ دعوت میں بتایا کہ وہ علامہ اقبال کی شاعری سے بے حد متاثر ہیں۔ یاد رہے کہ مادام ام کلثوم نے "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کا عربی منظوم ترجمہ گا کر سارے عرب میں دھوم مچا دی تھی۔

بیادِ مرزا غالب وزارتِ مواصلات نے راولپنڈی سے اطلاع دی ہے کہ محکمہ ڈاک و تار مرزا غالب کی ۱۰۰ ویں برسی پر فروری ۱۹۶۹ء میں ایک یادگاری ٹکٹ جاری کر رہا ہے۔ اور اس پر یکم فروری ۱۹۶۹ء کو ایک خاص مہر بھی استعمال کرے گا۔

علامہ شبلی کی یاد میں لاہور میں مرکزِ تعمیرِ نو میں علامہ شبلی نعمانی کی یاد تازہ کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ نے فرمائی۔ جلسے میں مولانا شبلی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں میں حافظ نذر محمد۔ پروفیسر محمد عثمان اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار قابلِ ذکر ہیں۔

ماتم میں ہم شریک

علامہ قاضی کی خودکشی ۱۳ اپریل کو سندھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر، ماہرِ تعلیم اور سندھ کے مایہ ناز سپوت آئی۔ آئی۔ قاضی نے اسی سال کی عمر میں دریائے سندھ میں کود کر خودکشی کرلی۔ ان کے جنازے میں سندھ کی تمام اہم شخصیات نے شرکت کی اور ان کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ حیدرآباد میں ۱۹ اپریل کو جامعہ سندھ میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس کی صدارت سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد صالح قریشی نے کی۔ اُردو اور سندھی کے ادیبوں، شاعروں اور علما کا ایک جلسہ تعزیت مرکزی اُردو بورڈ کے دفتر حیدرآباد میں بھی منعقد ہوا۔ جس میں اُن کی وفات پر گہرے رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے

۲۴ اپریل کو تحریک پاکستان کے قدیم کارکنوں کے زیر اہتمام یادِ اقبال ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب جسٹس شمیم قادری نے فرمائی۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ پائلٹ اسکول وحدت کالونی اور پوسٹ سینٹر کے علاوہ دیگر تعلیمی اداروں میں بھی یوم اقبال کی تقریبات منعقد ہوئیں۔

ڈھاکا:۔ ۲۶ اپریل کو نذرل اکیڈمی کے زیر اہتمام ڈھاکا یونیورسٹی میں ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد ہوئی جس میں ڈھاکہ کے دانشوروں کے علاوہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب جسٹس ایس اے رحمان نے بھی خطاب کیا۔ ۲۷ اپریل کو انجمن ترقی اردو ڈھاکا کے زیر اہتمام یوم اقبال منایا گیا۔ جس کی صدارت وزارت تعلیم کے معتمد جناب قدرت اللہ شہاب نے کی۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر اقبال عظیم نے کلام اقبال کو بنگالی میں منتقل کرنے پر زور دیا۔ جلسے میں ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی اور مس اُم عمارہ نے بھی مقالے پیش کئے۔

حیدرآباد:۔ ۲۴ اپریل کو اسٹوڈینٹس رائٹرز گلڈ کے زیر اہتمام کل پاکستان اردو سندھی محفلِ مقالات و شعر منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت تعلیمی بورڈ کے معتمد جناب مرزا عابد عباس نے کی۔ اشرف شاد۔ نقاش کاظمی۔ اقبال شیدائی۔ نثار بزمی اور دیگر حضرات نے شاعر مشرق کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مسلم ہائی اسکول لطیف آباد میں بھی ۲۳ اپریل کو یوم اقبال منایا گیا۔ اور اساتذہ اور طلبا نے شاعر مشرق کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

سکھر:۔ ۲۳ اپریل مجلس اقبال کے زیر اہتمام ضلع کونسل ہال میں فکر اقبال کے عنوان پر ایک مذاکرہ ہوا جس کی صدارت شیخ الجامعہ کراچی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی فرما رہے تھے۔ مذاکرے میں کراچی، حیدرآباد اور لاہور سے جو لوگ شریک ہوئے اُن میں مجتبیٰ حسین، سلیم احمد۔ سجاد باقر رضوی، اور نجم الحسن رضوی قابلِ ذکر ہیں۔ جلسے سے سید مظہر جمیل معتمد مجلس اقبال اور ڈپٹی کمشنر سکھر جناب آصف نصیح الدین نے بھی خطاب کیا۔

گجرات:۔ بزم اقبال کے زیر اہتمام زمیندار کالج گجرات میں یادِ اقبال تازہ کی گئی۔ اس تقریب کے مہمانِ خصوصی یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر محمد باقر تھے۔ تقریب میں شرکت کرنے والوں میں پروفیسر انور مسعود۔ پروفیسر شریف کنجاہی۔ عاصی کرنالی اور دیگر شعراء قابل ذکر ہیں۔

لائلپور:۔ زرعی یونیورسٹی لائل پور کے زیر اہتمام یوم اقبال ۲۸ اپریل کو منایا گیا جس کی صدارت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب حمید احمد خان نے فرمائی۔ جلسے سے خطاب کرنے والوں میں غلام رسول مہر، ڈاکٹر سید عبداللہ۔ احمد ندیم قاسمی۔ ڈاکٹر ظفر علی ہاشمی وائس چانسلر زرعی یونیورسٹی۔ حافظ لدھیانوی، خلیق قریشی اور ہوش ترمذی قابلِ ذکر ہیں۔ ۲۷ اپریل کو انجمن اقبال کی طرف سے ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں مفکر اسلام کی یاد تازہ کی گئی۔ جس کی صدارت سید کرامت حسین جعفری نے کی۔ م بش صاحب اور بشیر احمد جعفری نے مقالات پیش کئے۔

سانگلاہل:۔ ۳ اپریل کو اسلامیہ انٹر کالج کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد پر علامہ اقبال کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ جس کی صدارت صوبائی وزیر قانون اے۔ بی۔ اخوند نے فرمائی اس موقع پر مولانا بشیر احمد آنگر نے بھی اپنے خیالات پیش کئے۔

خواجہ احمد عباس کی خدمات کا اعتراف

چنڈی گڑھ سے ہریانا کے گورنر جناب بی۔ این۔ چکرورتی نے اعلان کیا ہے کہ اردو کے مشہور ادیب جناب خواجہ احمد عباس اور ہندی ادیب مول چند اور سنسکرت کے عالم اچاریہ بھگوان دیو کو ۵۔۵ ہزار روپے کی تھیلیاں پیش کی جارہی ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت انھیں "ابھینندن پتر" بھی پیش کرے گی۔ حکومت ہریانا کی طرف سے یہ اعزاز مختلف زبانوں میں اعلا ادبی خدمات پیش کئے ہیں۔

اردو گھر کا قیام

انجمن ترقیٔ اردو ھند کی عمارت "اردو گھر" کا سنگ بنیاد ۲۳ مارچ ۱۹۶۸ء کو محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ھند نے نئی دھلی میں رکھا۔ یہ عمارت راوز ایونیو نئی دہلی میں سپریم کورٹ اور تلک برج کے قریب واقع ہے۔ اور اسے دلی دروازے ترکمان گیٹ۔ رام لیلا گراونڈ۔ کوٹلا اور میر درد روڈ کا قرب حاصل ہے۔ یہ مقام نئی دھلی اور پرانی دلی کا گویا سنگم ہے۔ اردو گھر کی تقریب میں تمام اردو دوست جمع ہوئے۔ اور اجتماع میں اساتذہ۔ مصنفین۔ ادبا۔ شعرا۔ ناشرین۔ وزرا صحافی۔ اراکین پارلیمنٹ۔ سفرا۔ ھندو، مسلم، سکھ، مشاہیر اور دانشور کثیر تعداد میں تھے۔ تقریب کی اعزازی کارروائی بہت خلوص سے ہوئی۔ وزیر اعظم کا استقبال کرنے کے بعد جلسے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جناب آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقیٔ اردو ھند نے پیامات تہنیت پڑھ کر سنائے۔ صدر انجمن جناب پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے انجمن ترقیٔ اردو کی تاریخ اور خدمات پر روشنی ڈالی اور ایک تہنیتی نظم بھی پیش کی۔ وزیر اعظم ھند محترمہ اندرا گاندھی نے صاف اور شستہ اردو میں تقریر کرتے ہوئے اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس کا ملک کے کلچر میں ایک خاص حصہ ہے۔ انھوں نے اردو کی اہمیت اور تعریف کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا کہ اس زبان کے ساتھ پورا انصاف نہیں ہورہا ہے اور انھوں نے زور دے کر کہا کہ اردو کو جو نقصان پہنچا ہے وہ سارے ملک کا نقصان ہے۔ انجمن کے نائب صدر جناب آنند نرائن مُلا نے بہت دکھ سے اردو کے سلسلے میں حکومت ھند کے رویے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اُردو ایک مظلوم زبان ہے۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ جو زبان سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ جو دنیا کی زبانوں میں چوتھے نمبر پر ہے اور ھندوستان میں اس کی حیثیت تیسری بڑی زبان کی ہے اس کو علاقائی کہہ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ اس کا علاقہ بھی متعین نہیں کیا گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو ھند کے دوسرے نائب صدر جناب خواجہ غلام السیدین نے فرمایا کہ اردو ایک جاندار زبان ہے۔ اس کے فروغ اور ارتقا میں مختلف مذہبوں اور فرقوں کا ہاتھ ہے۔ اس زبان کی روشنی ملک کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسے عوام کی طاقت اور حمایت حاصل ہے اس لئے اس کا چراغ پھونکوں سے نہیں بجھایا جائے گا۔ اردو گھر کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب پر تمام اردو اخبارات نے اداریئے لکھے اور اردو کی دشواریوں کی نشان دہی کی۔ جلسے میں شرکت کرنے والوں میں ڈاکٹر سید عابد حسین۔ پنڈت سندر لال۔ ڈاکٹر عبد العلیم۔ رشید احمد صدیقی پروفیسر عبد القادر سروری۔ ڈاکٹر حامد الدین احمد۔ سید احتشام حسین۔ ڈاکٹر گیان چند۔ حیات اللہ انصاری۔ مولانا امتیاز علی عرشی ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ سید سجاد ظہیر۔ ڈاکٹر تارا چند۔ مالک رام۔ ڈاکٹر اختر اورینوی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ مولانا حبیب الرحمان۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

ان کی یادگار قائم کرنے پر زور دیا گیا۔ حیدرآباد پرنٹنگ پریس ورکرز ایسوسی ایشن، اسلامی جمعیت طلبہ، سچل سائنس اسکول اور دوسری تنظیموں کی جانب سے بھی تعزیتی جلسے ہوئے۔ سندھ کے تمام اہم شہروں اور ہالا اور سانگھڑ میں بھی تعز
ممتاز قانون داں جناب اے کے بروہی نے جو ان کے ناظم دمیت مقرر کئے گئے ہیں، کہا ہے کہ علامہ قاضی کے رہائشی بنگلے
دارالمطالعہ میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

علامہ لطیف انور کا انتقال

ممتاز مصنف، شاعر اور صحافی جناب علامہ لطیف انور کا انتقال ایک مخ
بعد لاہور میں ۱۷ اپریل کو ہو گیا۔ علامہ ریڈیو پاکستان کے نیوز ڈیپا
تھے اور نوائے پاکستان، زمیندار اور دیگر روزناموں میں کالم نگار اور مدیر کی حیثیت میں کام کرتے رہے تھے۔ ر
مجلس "نوائے وقت" کے زیر اہتمام ایک تعزیتی اجلاس میں علامہ کی موت کو اردو ادب اور صحافت کے لئے ایک ز
ہے اور ادارۂ مصنفین پاکستان سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ علامہ لطیف انور کے پسماندگان کے لئے ماہانہ وظیفے کا انتظ
ادارۂ مصنفین پاکستان کے ایک سرگرم رکن عبدالحمید اثر کے لئے بھی جن کا انتقال ٹریفک کے ایک حادثے میں ہو گیا تھا و
کی گئی ہے۔

ادارۂ قومی زبان ان سانحات پر دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہے اور پسماندگان سے دلی ہمدردی رکھتا ہے۔

آئینۂ ہند

کرشنا مینن کے خیال میں

ہندوستان کے سابق وزیر دفاع جناب کرشنا مینن نے
دہلی میں کہا ہے کہ غیر ہندی علاقوں میں ہندی کو زبردستی
ہے۔ انہوں نے زور دیا کہ علاقائی زبانوں کو بھی فروغ کا موقع ملنا چاہیئے۔ کرشنا مینن ایک سمپوزیم میں تقریر کر رہے تھے۔

فراق گورکھپوری پدما بھوشن

اُردو کے مشہور شاعر و نقاد۔ انگریزی ادبیات کے سابق پروفیسر ا
تحریکوں کے کارکن جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو ان کی ادبی
سلسلے میں ہندوستان کا اعلیٰ ترین اعزاز پدما بھوشن تفویض کیا گیا ہے۔ یہ اعزاز صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے ع
فراق صاحب کی شخصیت کو خراج تحسین پیش کیا۔

ادبی انعامات

حکومت اتر پردیش (یوپی) نے ۲ اپریل کو لکھنؤ سے اعلان کیا ہے
کے دوران ادب، سائنس، قانون اور اصول فلسفہ و تاریخ وغیرہ
پر ۱۵۰۰۰ کے انعامات تقسیم کئے جائیں گے۔ جس کے لئے تمام ہندوستان کے مصنفوں اور مترجموں سے ہندی، اردو اور سنسک
معیاری مسودے طلب کئے گئے ہیں۔

نئے خزانے

جولائی تا دسمبر ۱۹۶۷ء کے رسائل کا موضوع وار اشاریہ
قسط چہارم

مرتبہ
ابو سلمان شاہجہانپوری

انجمن ترقی اردو پاکستان
کراچی ۱

گنگا سرن سنہا، کرنل بشیر حسین زیدی۔ اور گوپی ناتھ امن وغیرہ شامل تھے۔ اس موقع پر صدر جمہوریۂ ہند اور حکومت ہند کے نائب صدر۔ نائب وزیر اعظم، وزیر رسل و رسائل اور پبلک ایڈمنسٹریشن کے پروفیسر شانتی کوٹھاری کے پیغامات بھی سنائے گئے۔

بہار اردو کانفرنس

بہار ریاستی انجمن ترقیٔ اردو کی ساتویں کانفرنس کے کھلے اجلاس میں اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ ہم اُردو کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے ہر قسم کی جدوجہد کریں گے۔ ایک قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ اردو کو آئین کی شق نمبر (۱۱۱) کے مطابق تمام قومی زبانوں کے برابر درجہ دیا جائے۔ اور بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبانوں کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ کانفرنس میں الہ آباد ہائی کورٹ کے سابق جج جناب شیو پرشاد سنہا نے اردو کو سرکاری زبان تسلیم کرانے کے لئے مطالبات پیش کئے۔ کانفرنس میں کمیونسٹ ممبران نے تقریر کرتے ہوتے اردو کے لئے بڑے زبردست عزم کا اظہار کیا۔

ہندی سیوک سنگھ کی دھمکی

سیٹھ گوبند داس۔ ایم۔ پی سیوک سنگھی نے دھمکی دی ہے کہ ہندی زبان کی ریاستوں میں اگر ہندی ۱۲ دسمبر تک رائج نہ کی گئی تو ایجیٹیشن پر شروع کر دیا جائے گا جس میں ہر قسم کی کارروائی شامل ہوگی۔

وزیر تعلیم کی رائے میں

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش کے ریاستی وزیر تعلیم۔ جناب ٹی۔ وی راگھولو نے مختلف نمائندہ اداروں کے ایک وفد سے کہا ہے کہ سہ لسانی فارمولے میں اردو والوں کے احساسات کے مطابق ردو بدل ممکن ہے۔ یہ نمائندہ وفد پروفیسر حبیب الرحمان کی قیادت میں وزیر تعلیم سے اُردو کے حقوق کے سلسلے میں ملا تھا۔ یہ وفد ریاست کے چیف منسٹر جناب برہمانند سے بھی ملے گا۔

آنند نرائن مُلّا کا خیال

دلی میں پنڈت آنند نرائن ملا نے فرقہ پرستی کے جنون اور سیکولر اسٹیٹ کے قیام پر تقریر کرتے ہوتے کہا کہ ان فرقہ پرست جماعتوں میں سب سے خطرناک جماعت جن سنگھ ہے۔ جن کا نعرہ ہے۔ ہندی۔ ہندو۔ ہندوستان " ملا صاحب نے کہا کہ جن سنگھی سمجھتے ہیں کہ ہندی ہی واحد زبان ہے جس نے ہندی ثقافت کو مضبوط بنا رکھا ہے۔ اور وہی اس کی پرداخت میں مدد دے سکتی ہے۔ ملا صاحب نے کہا کہ غالباً انھیں اصل خطرہ یہ ہے کہ اردو اگر زندہ رہی تو ہندی نہیں پنپ سکتی حالانکہ ایسا نہیں ہوگا۔

ہماچل پردیش میں

ہماچل پردیش کے وزیر تعلیم جناب رام لال نے شملہ میں اسمبلی کو بتایا کہ ہماچل حکومت نے اردو کو سہ لسانی فارمولے میں ایک لازمی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے جیسا کہ وزارت اعلیٰ کی کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا۔

اردو انعامات

لکھنؤ:۔ یوپی سرکار کمیٹی نے اردو کے ممتاز افسانہ نگار علی عباس حسینی کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں پانچ روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر وحید اختر کو ان کے مجموعہ کلام "پتھروں کے مغنی" پر غالب انعام (ایک ہزار پانچ سو روپے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کو ان کی تصنیف مرزا سودا پر اکبر الہ آبادی انعام (ایک ہزار دو سو روپے) محمد ابراہیم ان کی کتاب آثر دلاوری پر رام پرشاد بسمل انعام (آٹھ سو روپے) اور محمد عتیق صدیقی۔ حرمت الاکرام۔ قدر امام اور عبد المجیب سہالوی کو ان کی تصانیف پر ۵۔ ۵ سو روپے انعامات دیئے ہیں۔

الرحیم، سید	حمایت علی شاعر	نئی قدریں، ص ۴۹۶ تا ۵۰۴
جواد زیدی	اردو تحقیق کے چند سنگ میل اور ستون	آجکل، ص ۹۷ تا ۱۰۱، اگست
نصرت	گلوں کی خوشبو (مولانا صلاح الدین)	اردو زبان، ص ۶۲ تا ۶۵، جولائی
عبید اللہ	احمد ہمدانی کی غزل	نئی قدریں، ص ۵۷۱ تا ۵۷۶
چغتائی	ادیب سہارنپوری	جام نو، ص ۳ تا ۱۹، نومبر
عندلیب میرٹھی، حسن یحییٰ	مولوی محمد یحییٰ تنہا	جامعہ، ص ۹۰ تا ۹۷، اگست
"	"	صبح، ص ۱۵ تا ۲۰، جون تا ستمبر
...ان چشتی	اکبر کا اسلوب	ہندوستانی ادب، ص ۳ تا ۱۵، دسمبر
...نی، نثار احمد اور رشاد، نریش کمار	تلوک چند محروم سے دو انٹرویو ۔ بات چیت ۔ گفتگو	نقوش، ص ۱۶۹ تا ۱۸۱، ستمبر
ناصر ملک	احمد ندیم قاسمی کا آدم نو	نئی قدریں، ص ۱۴۷ تا ۱۴۹
...ان گورکھپوری	میر کی عالمگیر مقبولیت	ساقی، ص ۱۳ تا ۱۸، اکتوبر نومبر
رخ درانی	ایک سچا شاعر (قدم)	نئی قدریں، ص ۴۴۳ تا ۵۵۲
رشوک بدایونی، م م	ایک گمنام شاعر ۔ بشیر درانی	" ص ۵۸۴ تا ۵۸۹
زمان فتح پوری	جگر کے شاعرانہ مرتبے کا تعین	نقش، ص ۱۳۰ تا ۱۳۴
فضل عباس سفوزانی، سید	جگر مرادآبادی کی شاعری	امروز، ص ۲، یکم اکتوبر
قدسی، ارشاد الحق	اکبر کی طنزیہ شاعری	...بلک، ص ۷، ۲۴ ستمبر
قمر النساء خان	رشید احمد صدیقی اپنے خاکوں کی روشنی میں	صریر خامہ، ص ۲۲۵ تا ۲۳۰
قمر جمیل	اکیلی بستیاں سہانی (فراق)	نئی قدریں، ص ۵۵۴ تا ۵۶۲
کبریٰ منہاس	سماجی شاعری اور فیض	" ص ۱۱۳ تا ۱۲۱
گوپال متل	اثر لکھنوی اور شاہد احمد دہلوی	تحریک، ص ۴ تا ۹، جولائی
گیان چند، ڈاکٹر	اردو شاعری کے مجدد حالی	سب رس، ص ۳ تا ۶، دسمبر
"	سردار جعفری کی غزل اور مروجہ عروض	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴ [illegible]، ۲۲ اگست
لطیف حسین، ڈاکٹر	بریلی کے خاندان مفتیان کی شاعری کا مختصر جائزہ	معارف، ص ۱۰۵ تا ۱۲۲، اگست
ملک رام	غلام ربانی تاباں	نئی قدریں، ص ۴۷۴ تا ۵۵۴
ماہر القادری	شاہد احمد دہلوی	فاران، ص ۳ تا ۲۶، جون

اس مرتبہ جولائی تا دسمبر ۱۹۶۷ء چھ ماہ کا اشاریہ ایک ساتھ ترتیب دیا گیا ہے اور یہ اس کی چوتھی قسط ہے اس میں جنوری تا جون ۱۹۶۷ء کے بعض وہ رسائل بھی شامل ہیں جو بعد میں دستیاب ہوئے۔

اشاریے کی تیاری میں جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ صرف وہ حضرات لگا سکتے ہیں جو اس قسم کے کاموں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ رسائل کی فراہمی ایک بڑا مشکل کام ہے، اس کے لئے پوری کوشش کی جاتی ہے۔ پھر بھی رسالے نظر سے نہیں گزرتے۔ مدیران کرام کو بار بار خطوط لکھے جاتے ہیں اور

واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

کے مصداق وہ تعاون حاصل نہیں ہوتا جو اس قسم کے کاموں کے لئے ضروری ہے ہم نے اپنے وسائل کی حد تک اس اشاریے کو ہر اعتبار سے جامع بنانے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی ممکن ہے بعض رسائل نظر انداز ہو گئے ہوں اور ان کے حوالے اس میں موجود نہ ہوں۔ ہم اپنے قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر کوئی حوالہ اس اشاریے میں نہ ہو تو وہ ہماری رہنمائی فرمائیں تاکہ آئندہ اقساط میں اسے شامل کر لیا جائے۔

(ادارہ)

معین الزماں، سید	عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت و رحلت	اردو نامہ، ص ۵۳ تا ۵۵، جون
مغنی تبسم	فانی ـــ حیدرآباد میں	ترقی اردو، ص ۵ تا ۶، ۱۳ر اگست
مفتون، سردار دیوان سنگھ	ملا واحدی	ہمدرد صحت، ص ۱۹ تا ۲۸، اگست
مفتون کوثری	منیر شکوہ آبادی	اردو ادب، ص ۵۳ تا ۶۵،
مقصود زاہدی، ڈاکٹر سید	کیفی (چاندپوری) کی مینائے غزل	نئی قدریں، ص ۲۵ تا ۵۹،
مناظر حسین جونپوری، شیخ	مرزا جعفر علی خاں اثر	آج کل، ص ۲۰ تا ۲۲، ستمبر
مناظر عاشق ہرگانوی	ژاں پال سارتر ـــ ایک مطالعہ	شاعر، ص ۲۶ تا ۳۰، اکتوبر نومبر
منصور قیصر	شفق کا ہر رنگ تھا.... (باقی صدیقی)	نئی قدریں، ص ۲۵۳ تا ۳۰۰،
منظر ایوبی	مصطفیٰ زیدی	〃 〃 ۱۹۸ تا ۲۰۹،
منظور الحسن برکاتی، سید	حضرت تاج کی نعتیہ شاعری	معارف، ص ۴۳ تا ۵۲، جولائی
منور لکھنوی، علامہ	گل تازہ کا شاعر (صلاح الدین نیر)	خاتون دکن، ص ۷ تا ۱۹، جون جولائی
منیر، منیر احمد	مولانا ظفر علی خاں	چٹان، ص ۱۳، ۱۱ر دسمبر
مہر سلطانہ	آج کا شاعر	
〃	۱۔ استاد قمر جلالوی	جنگ، ص ۴، ۱۱ر ستمبر
〃	۲۔ بہزاد لکھنوی	〃 〃 ۴، ۱۸ر 〃
〃	۳۔ فیض	〃 〃 ۴، ۲۵ر 〃
〃	۴۔ ماہر القادری	〃 〃 ۴، ۲ر اکتوبر
〃	۵۔ رئیس امروہوی	〃 〃 ۴، ۹ر 〃
〃	۶۔ سراج الدین ظفر	〃 〃 ۴، ۱۶ر 〃
	۷۔ آل رضا	〃 〃 ۴، ۲۳ر 〃
	۸۔ عندلیب شادانی	〃 〃 ۴، ۳۰ر 〃
	۹۔ ذوالفقار علی بخاری	〃 〃 ۴، ۶ر نومبر
	۱۰۔ جمیل الدین عالی	〃 〃 ۴، ۱۳ر 〃
	۱۱۔ کنیز فاطمہ حیا	〃 〃 ۴، ۲۰ر 〃
	۱۲۔ شاعر لکھنوی	〃 〃 ۴، ۲۷ر 〃

... فضل	اختر شیرانی کی قومی شاعری	قندیل، ص ۱۴، ۲۰، ۱۸ اکتوبر
... باقر، آغا	مولانا (صلاح الدین) کی باتیں	اردو زبان، ص ۱۵ تا ۱۸، جولائی
... حسن قرشی، حکیم	چراغ حسن حسرت	کوہستان، ص ۱۰، ۱۳ جولائی
... سعید	رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی	مشرق لاہور، ص ۳، ۷ ستمبر
... اعظم، ملک	احمد ندیم قاسمی کی شاعری	نئی قدریں، ص ۱۹۵ تا ۱۶۲
... عظیم	آزاد کی تذکرہ نگاری	تخلیق، ص ۱۳ تا ۲۶
... عقیل، ڈاکٹر سید	ظفر اپنے غم کی یادیں	فنون، ص ۱۹۸ تا ۱۷۵، اکتوبر
محمود الرحمان (بہادر یار کاکوری)	تابش دہلوی	جام نو، ص جولائی
محمود عبدالرؤف	علی شیر نوائی — مشرق کا ایک عظیم شاعر	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲ تا ۷، مئی
محمود ہاشمی	پرانے موسموں کی آواز (کمار پاشی)	نئی قدریں، ص ۵۵ تا ۴۳
محمود جالندھری	پشکن روس کا عظیم ترین شاعر	سب رس، ص ۲۸ تا ۳۱، جولائی
محمد انور، صاحبزادہ	ریاض خیرآبادی — شاعر خمریات	قندیل، ص ۱۴، ۲۸، ۱۰ ستمبر
مرتضیٰ حسین بلگرامی	اصلاح صغیر بلگرامی (بر غزل آرزو بلگرامی)	آج کل، ص ۱۷ تا ۲۲، جولائی
مسرور دہلوی، مشتاق احمد	بیادِ شاہد (دہلوی)	لاہور، ص ۷ تا ۵۵، ۲۴ جولائی
مسعود احمد، پروفیسر محمد	عبدالرشید لائق	قومی زبان، ص ۱۵ تا ۶۰، اکتوبر
" "	"	" " ۱۴ تا ۵۸، نومبر
مشاہیر پاک و ہند	خراجِ عقیدت و غیر مطبوعہ کلام تلوک چند محروم	نقوش، ص ۲۳۲ تا ۲۸۵، ستمبر
مظفر احسانی، ملک	مولانا ظفر علی خاں	چٹان، ص ۵ تا ۶، ۱۰ نومبر
" "	"	" " ۱۵-۱۶، ۱۷ دسمبر
مظفر علی سید۔		
ناصر اسحاق (مترجم)	سرفراز احمد رفیقی	عالمی ڈائجسٹ، ص ۷۰ تا ۷۴، ستمبر
مظہر انصاری باقوت گنجوی	شمیم انصاری باقوت گنجوی	شان ہند، ص ۲۲، نومبر
مظہر یوسف زئی	احمد شاہ پطرس بخاری	کوہستان، ص ۴، ۸ دسمبر
" "	" "	مشرق لاہور، ص ۳، ۹ دسمبر
" "	اشک رام پوری	کوہستان، ص ۱۴، ۲۶ اگست

تاریخی و سیاسی شخصیات

اختر، شبیر محمد	چودھری غلام عباس مرحوم	قندیل، ص ۳، ۲۶ر دسمبر
اشرف عطا	اکبر خاں (جنگ آزادی کا ایک سپاہی)	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۰۱ تا ۱۱۰، دسمبر
اشرف حکیم عبدالرحیم	یادرفتگاں — شیخ حسام الدین	المنبر، ص ۵، ۲ر جولائی
بشارت علی، ڈاکٹر	شہریارِ دکن میر عثمان علی خاں مرحوم	چٹان، ص ۱۶ تا ۲۸، ۳ر جولائی
〃	〃 〃 〃	〃 〃 ۱۱ تا ۲۳، ۱۰ر 〃
〃	〃 〃 〃	〃 〃 ۱۶ تا ۱۸، ۱۷ر 〃
آفتاب احمد قریشی	تحریک آزادی کے نامور قائد — ظہیر الدین وال میاں کوہستان، ص ۵، ۸، ۲۰ر جولائی	
اختر، شبیر محمد	قائد اعظمؒ	قندیل، ص ۲، ۹ر ستمبر
اصفہانی، ایم اے ایچ	〃	مشرق، ص ۳، ۱۳ر اگست
آزاد رامپوری، مسیح حسین	مولانا محمد علی جوہر اور مسئلہ اتحاد	بصائر، ص ۵۵ تا ۹۰، اپریل
اکمل یزدانی	پورنیہ (بہار) کے دو مربیان علم — نواب صولت جنگ و شوکت جنگ	معارف، ص ۳۶۲ تا ۳۷۵، نومبر
آباد شاہ پوری	خیر الدین باربروسا	اردو ڈائجسٹ، ص ۱۲۵، نومبر
انجم اعظمی	نواب محسن الملک	افکار، ص ۲۲ تا ۳۴، دسمبر
برلاس، مرزا علی اظہر	نواب حیدر علی خاں بہادر چقماق جنگ والی میسور	بصائر، ص ۱۹ تا ۲۷، اپریل
بشیر احمد غازی آبادی، حافظ	شہید ملت لیاقت علی خاں[1]	جنگ، ص ۵، ۱۰ر اکتوبر
بوبیرے، عبدالحمید	نواب مہدی نواز جنگ[2]	صبح امید، ص ۵ تا ۷، اگست
جمیل احمد، خواجہ	الرازی — عظیم مسلمان سائنس داں	فکر و خیال، ص ۴۴ تا ۴۹، اگست و ستمبر

[1] جنگ کا یہ نمبر لیاقت علی خاں مرحوم سے متعلق مضامین کے لیے مخصوص ہے اس میں حافظ محمد اسلام، جمیل الدین فریدی، انعام درانی، رضوان احمد اور ضیا الحسن موسوی کے مضامین شامل ہیں۔

[2] صبح امید کی اس اشاعت میں نواب مہدی نواز جنگ کی وفات پر متعدد لوگوں کے تعزیتی بیانات اور تیج نارائن کا ایک مضمون بھی شامل ہے (صفحہ ۶ تا ۹)

مہر سلطانہ	آج کا شاعر — ۱۳۔ محشر بدایونی	جنگ، ص ۴، ۱۳ ستمبر
〃	۱۴۔ رعنا اکبرآبادی	〃 〃 ۴، ۱۵ر 〃
〃	۱۵۔ تابش دہلوی	〃 〃 ۴، ۲۵ر 〃
نارنگ، گوپی چند	کیفی دتاتریہ کی خدمات — لسانی محقق کی حیثیت سے	آج کل، ص ۷۷ تا ۸۲، اگست
نازؔ، ایس ایم	ظفریاد — ایک فن کار	قندیل، ص ۷، ۲۸ جولائی
〃	وجیہ الدین وجدی — دکن کا ایک قدیم گمنام	تخلیق، ص ۵۷ تا ۶۰،
نبیلہ شبنا رصدیقی	شعروشاعری اور شبلی	صریر خامہ، ص ۱۴۱ تا ۱۵۰،
نجمہ اشتیاق	وادی نیران کے اردو شاعر	نئی قدریں، ص ۸۵۹ تا ۸۶۱،
نظر، ڈاکٹر انصار اللہ	میر علی اوسط رشک	قومی زبان، ص ۴۵ تا ۵۸،
نکہت بریلوی	شاد عارفی	نئی قدریں، ص ۲۱۰ تا ۲۱۴،
نور الصباح بیگم	بیگم نواب اسمٰعیل خاں	جنگ، ص ۷، ۹ر نومبر
〃	بیگم عطیہ الٰہی علوی	〃 〃 ۴، ۱۱ر دسمبر
واقف، محمد ایوب	جگن ناتھ آزاد سے ایک ملاقات	صبح امید، ص ۴۷ تا ۴۹، جولائی
وحید النساء	چند دکھنی مرثیہ گو شعرا	سب رس، ص ۳۰ تا ۳۴، دسمبر
وحید قریشی، ڈاکٹر	نقش کف پا (جیلانی کامران)	نئی قدریں، ص ۲۶۳ تا ۲۶۷،
وزیر آغا	آزاد (محمد حسین) کا ایک مداح (مولانا صلاح الدین احمد)	اوراق، ص ۹۳ تا ۹۴،
〃	شہاب جعفری کی نظمیں	نئی قدریں، ص ۴۹۵ تا ۵۰۰،
〃	مولانا (صلاح الدین) سے میری پہلی ملاقات	اردو زبان، ص ۸ تا ۱۱، جولائی
وصی رضا، سید	جگر مرادآبادی	نئی قدریں، ص ۹۸ تا ۹۹،
ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی	پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی	ہماری زبان، ص ۸، ۸ر نومبر
〃	جوش ملسیانی	قومی زبان، ص ۲۶ تا ۳۰، دسمبر
〃	سحر عشق آبادی	〃 〃 ۱۱ تا ۱۴، جنوری
وی شنکر	چکبست کا رنگ تغزل	فروغ اردو، ص ۱۱ تا ۱۴، دسمبر
	انجم وزیرآبادی	شان ہند، ص ۴۳، جون
	مصطفٰی زیدی	چٹان، ص ۱۱ تا ۱۴، ۹ر اکتوبر

ن احمد	خواجہ ناظم الدین مرحوم	جنگ، ص ۱۵، ۲۳ر اکتوبر
ت احمد شہابی	نواب سعد اللہ خاں	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۷ تا ۱۲، دسمبر
عالم بہاری	علامہ عنایت اللہ المشرقی	کوہستان، ص ۴، ۲۰ر اگست
، ف م	قائداعظم	ساغر، ص ۳، ۲۵ر دسمبر
"	مولانا شوکت علی	" " ۴، ۳۰ر نومبر
ارن	آہ! مہدی نواز جنگ	سب رس، ص ۴۸، جولائی
ر، آل احمد	ایک تھا جواہر لال	ہماری زبان، ص ۱ تا ۲، ۱۵ر نومبر
"	سر سید کی یاد میں	" " ۱ تا ۲، ۱۵ر اکتوبر
محمد	حیدر بابات — شمالی قفقاز کا ایک مجاہد	اردو ڈائجسٹ، ص ۹۵ تا ۱۰۰، ستمبر
خاں پنی، ایم	جنوبی ہند کے دو گمنام مجاہد — نواب مبارز الدولہ	
"	اور نواب غلام رسول خاں بہادر پنی	چٹان، ص ۹ تا ۱۰+۲۲، ۳۰ر اکتوبر
"	" "	" " ۹، ۶ر نومبر
"	" "	" " ۱۰+۱۹، ۱۳ر
، انتظام اللہ	سلطان قطب الدین ایبک	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۲۰ تا ۴۰، اکتوبر
حسین، ڈاکٹر	جدید ترکیہ کا بطل جلیل انور پاشا	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۹۵ تا ۲۰۲، اپریل
کاشمیری، خواجہ	مشرقی پاکستان کے شعلہ بیان رہنما مولوی فرید احمد	چٹان، ص ۱۱ تا ۱۴، ۱۸ر ستمبر
" "	میاں عبد الباری سے ایک ملاقات	" " ۱۲ تا ۱۴، ۱۱ر ستمبر
رسلیمی	علامہ المشرقی — ایک تحریک — ایک عہد*	چٹان، ص ۲۸ر اگست
ق، بابائے اردو مولوی	شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی	العلم، ص ۱۲ تا ۲۷، اپریل تا جون
للہ، ڈاکٹر سید	قائداعظم اور اردو	قندیل، ص ۸، ۲۷ر دسمبر
اجمیری، محی الدین	حسین شہید سہروردی	جنگ، ص ۹، ۴ر دسمبر
۔ شاہجہانپوری	جسٹس محمد رستم کیانی مرحوم	ہمدرد، ص ۷، ۱۲ر نومبر
منہاس	لاہور کا ایک مورخ — دیوان امرناتھ اکبری	نقوش، ص ۱۴۱ تا ۱۴۹، ستمبر

---

*مہ مشرقی پر ایک مضمون قاری رشید کمال کا بھی چٹان کے اسی نمبر میں شامل ہے۔

جمیل الدین احمد	بابائے ملت لیاقت علی خاں[1]	مشرق، ص ۲، ۱۶ اکتوبر
حامد مجید	قائداعظم — قوم کے معمار عظیم	قندیل، ص ۱۲ - ۱۳، ۲۵ دسمبر
حمید عسکری	اسلامی دور کا ماہر طبیعیات ابن رشد	[illegible]، ص ۵۳ تا ۵۶، نومبر
خالد علی	مولانا شوکت علی	جنگ، ص ۳، ۲۸ نومبر
"	" "	" " ۱۹، ۱۱ دسمبر
"	" "	مشرق، ص ۳، ۱۲ دسمبر
خالد محمود	محترمہ فاطمہ جناح[2]	کوہستان، ص ۱۱ جولائی
خان، جی ایم	ڈاکٹر ذاکر حسین	ہندوستانی ادب، ص ۳ تا ۱۱، اپریل تا جون
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	قائداعظم — ان کی سالگرہ کے موقع پر ہمیں کیا سوچنا چاہیے	مشرق، ص ۴، ۲۵ دسمبر
دلاور حسین، سید	مہدی نواز جنگ مرحوم	سب رس، ص ۳ تا ۵، اکتوبر
ذاکر حسین، ڈاکٹر	بہادر شاہ ظفر	ہندوستانی ادب، ص ۹ تا ۱۰، اکتوبر
راشدی، پیر علی محمد	اسکندر مرزا (قسط نمبر ۲)	اخبار جہاں، ص ۵ تا ۹، ۵ جولائی
" "	" (" " ۳)	" " ۵ تا ۹، ۱۲ "
" "	" (" " ۴)	" " ۵ تا ۹، ۲ اگست
" "	" (" " آخری)	" " ۵ تا ۹، ۹ اگست
" "	مادر ملت فاطمہ جناح	جنگ، ص ۱۱ کالم ۲۲ جولائی
" "	میاں افتخار الدین مرحوم	اخبار جہاں، ص ۸، ۲۰ ستمبر
رشدی، محمد حبیب اللہ (مترجم)	[illegible]	ہمدرد صحت، ص ۹۹ تا ۱۰۳، اگست
رشک، عبدالقدیر	بزم واجد علی کی آخری شمع (میاں عبدالعزیز بادامی)	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۲۰۳ تا ۲۰۶، اپریل
رضوان احمد	قائداعظم بحیثیت وکیل	اخبار جہاں، ص ۵، ۲۰ دسمبر
"	خواجہ ناظم الدین احمد	" " ۳، ۲۵ اکتوبر

۱۔ اس نمبر میں شہید ملت پر ایک مضمون علی اختر رضوی کا اور شہید ملت کی ایک تقریر بھی شامل ہے

۲۔ اس نمبر میں خاتونِ پاکستان محترمہ فاطمہ جناح کی شخصیت کے بارے میں ان کی خدمات کے بیان [illegible] ۲۵ و ۲۶

، رشید احمد	حضرت خواجہ محمد باقی باللہ	الرحیم، ص ۴۰۹ تا ۴۲۲، نومبر
ل کھنڈوی، حافظ محمد	تیسری صدی کے حافظ الحدیث عبد بن حمید بن نصر الکسی البخاری	" " ۱۳۲ تا ۱۴۹، جولائی
پروفیسر ظہیر احمد	ابو القاسم الشابی	ثقافت، ص ۴۶ تا ۵۷، اگست
"	حضرت عمرؓ کا ادبی ذوق	فنون، ص ۱۰۳ تا ۱۱۵، جولائی و اگست
الم	کیا مودودی (مولانا سید ابوالاعلیٰ) نیشلسٹ تھے؟	فاران، ص ۳ تا ۲۵، دسمبر
احمد دین پیلدی	جہاد آزادی کا عظیم مجاہد — مولانا عبید اللہ سندھی	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۱۲۵ تا ۱۳۱، اگست
، ضیاء الدین احمد	مفتی محمد کفایت اللہ شاہجہانپوری	کتابی دنیا، ص ۳ تا ۷، جون جولائی
عبدالکریم	مشائخ دیوبند — حاجی امداد اللہ مہاجر مکی	چٹان، ص ۸، ۲۰ر نومبر
"	مولانا محمد قاسم نانوتوی	" " ۱۸، ۲۷ر "
"	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	" " ۹، ۴ر دسمبر
"	شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ	" " ۹، ۱۱ر "
لحق	مولانا انور شاہ کشمیری	بصائر، ص ۴۳ تا ۵۷، جولائی
بیگم	قاضی ارتضا علی خاں گوپاموی	" " ۹۳ تا ۱۰۷، اپریل
ندوی، مولانا محمد	ابو الحسن الاشعری	ثقافت، ص ۲ تا ۱۹، اگست
الدین احمد	حکیم سید عرفان علی شاہ (آگرہ کے ایک بزرگ)	انجمن اسلامیہ میگزین، ص ۳ تا ۴، دسمبر
احمد اکبر آبادی، مولانا	مولانا عبید اللہ سندھی	الرحیم، ص ۲۳۰ تا ۲۳۵، اگست
حمد	حارث بن اسد محاسبی	معارف، ص ۴۰۵ تا ۴۴۳، دسمبر
لرحمان	حاجی مولوی باغ دین مرحوم قادریؒ	ارژنگ، ص ۹ تا ۱۰، اکتوبر نومبر
احمد اسلم	مولانا محمد اسحاق رحمانی	المنبر، ص ۹، ۲۵ر ستمبر
جالپوری، مولوی احترام الدین	حضرت مخدوم صابر کلیریؒ	العلم، ص ۶۵ تا ۷۴، اکتوبر تا دسمبر
محمد اسلم	حضرت مجدد الف ثانیؒ	کوہستان، ص ۵، ۵ر اکتوبر
"	حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	" " ۵، ۱۹ر اکتوبر
"	شاہ اسماعیل شہید	" " ۵، ۱۲ر نومبر

نمبر میں سید ضیا جعفری، جگر کاظمی، ابو سعید، شیخ صابر اور دیگر حضرات کے حاجی صاحب مرحوم پر مضامین شامل ہیں۔ ص ۱ تا ۴۰

محسانی، مشتاق احمد	قائداعظم کی ولادت	ماہ نو، ص ۱۱، ۵ دسمبر
محمود، ظفر احسن	پیروی فکر پرویز	طلوع اسلام، ص ۱۹ تا ۲۹، ۔
محمود الرحمان	پروفیسر ایس ایم اے حلیم	قومی زبان، ص ۱۰۱ تا ۱۰۵، ستمبر
مدنی، محمود احمد	امروہہ کے شاہ حسین	اخبار جہاں، ص ۲۰ تا ۲۲، ۶ نومبر
مسکین حجازی	باری علیگ	امروز، ص ۷، ۱۰ دسمبر
معاون مدیر المنبر	وہ فقیر جو وزیر بنا رہا — چودھری علی اکبر خان	المنبر، ص ۵ تا ۱۰، ۱۳ اکتوبر
ملک، عبدالرؤف	رسوائے زمانہ فلسفی اپیقورس	عالمی ڈائجسٹ، ص ۱۰۰ تا ۱۰۸، جون
مناظر عاشق ہرگانوی	لطف اللہ مہندس	آج کل، ص ۴۳ تا ۴۴، ستمبر
منظور الٰہی	نقشِ جمیلہ از دلِ ما (میاں محمد شفیع کی یاد)	نقوش، ص ۹۴ تا ۱۰۱، "
مہر، مولانا غلام رسول	عزیز بھٹی شہید کا کردار	امروز، ص ۷، ۲ اگست
ناظر، ایس ایم	شہید ملت کی یاد	قندیل، ص ۲۰ تا ۲۲، ۱۸ اکتوبر
" "	مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح	" ۲۰ تا ۲۲، ۱۷ جولائی
نعیم ندوی صدیقی، مولانا محمد	اتحاد عالم اسلام اور سید جمال الدین افغانی	فاران، ص ۵ تا ۱۰، نومبر
وید پرکاش ایم اے	ملا موہن بہاری استاد اورنگ زیب	صبح نو، ص ۱۳ تا ۱۷، جولائی
ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی	شریمتی چاند رانی	ہماری زبان، ص ۳، ۴، یکم جولائی
یوسف سلیم چشتی	سلطان فیروز تغلق	ہمدرد صحت، ص ۴ تا ۸، ستمبر
" "	سلطان ناصر الدین محمود	" ۲۳ تا ۲۴، اگست
یونس ادیب	مکوڈین ڈانہر — ویت نام کی حریت پسندوں کی	
	خاتون جبریل	امروز، ص ۳، ۱۷ نومبر
———	ماسٹر تارا سنگھ	" ۳، ۱۳ نومبر
———	مولانا شوکت علی	چٹان، ص ۹، ۱۴ دسمبر

علماء، صوفیاء اور دیگر بزرگان دین

احترام مہدی، قاضی	حضرت عبدالقدوس گنگوہی	جنگ، ص ۲، ۳۰ اکتوبر
اختر، محمد نعیم	"	ثقافت، ص ۲۲ تا ۲۳، ستمبر

بشدی	۲- حضرت شاہ بدرالدین عالم زاہدی	الرحیم، ص ۲۹۰ تا ۲۹۹، ستمبر
"	۳- بزرگان سلہٹ	" " ۳۵۵ تا ۳۵۸، اکتوبر
"	۴- " "	" " ۳۴۳ تا ۳۴۷، نومبر
"	۵- " "	" " ۵۲۵ تا ۵۳۰، دسمبر
——	سید عطاء اللہ شاہ بخاری	المنبر، ص ۷، ۲۵ اگست

صحافت

۱

انشا	ادبی رسالوں کا بحران	ماہ نو، ص ۵ تا ۱۸، جولائی
ل الحق قریشی	لاہور کی صحافت مابعد تقسیم	ارمغان، ص ۱۹ تا ۴۱، نومبر
یٹ، ٹی ایس		
یل جالبی (مترجم)	صحافت اور ادب	نیا دور، ص ۹۳ تا ۹۶،
تب زیروی	اردو ہفتہ وار رسائل کے مسائل	لاہور، ص ۵ تا ۷، ۷ نومبر
شید، ڈاکٹر عبدالسلام	اسلامی صحافت کے ارتقاء میں قائداعظم کا حصہ	ساغر، ص ۷ تا ۸، ۲۵ دسمبر
"	نکتہ چینی اور صحافت	مشرق، ص ۱۷، ۱۲ دسمبر
ابد احمد دہلوی مرحوم	مشرقی پاکستان کے ادبی رسائل کا جائزہ	کتاب، لاہور، ص ۱۷ تا ۲۰، جولائی
ریف الحسن لاہرپوری	رسالہ دلگداز	ہماری زبان، ص ۳، ۸ جولائی
من، سید محمد باقر	اردو پنچ اور شیخ ممتاز حسین مرحوم	نگار پاکستان، ص ۴۵ تا ۵۳، ستمبر
یب انصاری	دور آصفی کے اردو رسائل	ہماری زبان، ص ۳ تا ۴ + ۹، ۱۵ ستمبر
"	"	" ۳ + ۴ تا ۸، یکم نومبر
ملی المتین	پیام یار	اردو ادب، ص ۱۴۱ تا ۱۴۴،
ل کاظمی	روزنامہ صباح دہلی	ہماری زبان، ص ۵ + ۱۲، ۱۵ نومبر
تن کوٹی	رسالہ آفتاب جھالاواڑ	شان ہند، دہلی ص ۱۷ تا ۲۲، نومبر
"	رسالہ نور بافت (زندگی کوٹھ (راجستھان))	" " ۱۹ تا ۲۴ + ۲۲، جون
ام سیتاپوری	انتخاب لاجواب[1]	قومی زبان، ص ۳ تا ۱۷، دسمبر

---

[1] ایک ہفتہ روزہ رسالہ جو مولوی محبوب عالم کی ادارت میں نکلتا تھا۔

ضیاء الحسن ملک	شیخ محی الدین ابن عربی	امروز، ص ۴ تا ۵، ۲۹، ۲ نومبر
عباد اللہ فاروقی	حضرت سید علی ہجویری ؒ	الرحیم، ص ۷۴ تا ۷۹، دسمبر
" "	علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی	لاہور، ص ۶، ۷، ۱۱، ۱۲ اگست
عبدالحلیم چشتی، محمد	امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیری	معارف، ص ۱۸۷ تا ۲۰۱، ستمبر
" "	" " "	" " ۲۴۵ تا ۲۶۱، اکتوبر
" "	" " "	" " ۳۳۹ تا ۳۵۲، نومبر
عضد الدین، محمد	خانوادہ شاہ ولی اللہ ؒ سے متعلق دو روایتوں کی تحقیق و تنقید	الرحیم، ص ۷۵ تا ۱۰۹، جولائی
فائق، کلب علی خاں	حیات خواجہ حسن	صحیفہ، ص ۱ تا ۸۴، "
فرحت شاہجہاں پوری	محمد حسین خاں جالندھری مرحوم	امروز، ص ۱۱، ۲۰ اگست
لیاقت بخاری	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ	قندیل، ص ۹، ۱۰ اکتوبر
محمد بیدری، سید	حضرت امین الدین ؒ	اردو نامہ، ص ۸۳ تا ۸۶، اکتوبر
محمد یحییٰ، پروفیسر	ابن الجوزی	ثقافت، ص ۵۰ تا ۵۹، جولائی
محمد یوسف، مولانا	خطابت کے ائمہ میں بخاری کا مقام[1]	امروز، ص ۲۰ اگست
مسعود احمد، پروفیسر محمد	شاہ محمد مسعود ؒ	ثقافت، ص ۳۱ تا ۴۶، نومبر
مغنیہ، محمد جواد		
ضیاء (مترجم)	ابو جعفر نصیر الدین طوسی	الرحیم، ص ۱۷۴ تا ۱۸۱، اگست
نسیم احمد فریدی، مولانا	سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی	" " ۱۱۰ تا ۱۲۲، جولائی
" "	" " "	" " ۱۶۵ تا ۱۷۳، اگست
" "	" " "	" " ۳۲۴ تا ۳۳۱، نومبر
" "	" " "	" " ۴۹۸ تا ۵۰۴، دسمبر
وفا راشدی	مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام	" "
"	۱۔ حضرت شاہ جلال کے چند ساتھی	" " ۲۰۴ تا ۲۰۸، اگست

[1] اسی نمبر میں حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری پر مجاہد الحسینی کا ایک مضمون ہے اور شاہ صاحب کا ایک مضمون اور ماسٹر تاج الدین کے نام ایک خط بھی شامل ہے ۔

———	سالک مرحوم اور اردو صحافت	مشرق، لاہور، ص ۴، ۱۰ ستمبر

فلسفہ

ابصار احمد	فلسفہ میں تالیفی نقطۂ نظر کے احیاء کی ضرورت	میثاق، ص ۴۴ تا ۵۱، جولائی
احمد رفاعی	ارسطو اور اس کے نظریے	بصائر، ص ۹۹ تا ۱۱۱، "
جونز، ڈبلیو ٹی	نکولائی میکیاولی	الرحیم، ص ۳۶۴ تا ۳۷۴، نومبر
"	"	" " ۵۳۱ تا ۵۴۹، دسمبر
عبدالقادر، قاضی	مارکسی نظام میں مغائرت کا تصور	چراغ راہ، ص ۱۸۲ تا ۱۸۹، دسمبر
و۔ع۔غ	رادھے شیام کے نام [1]	اوراق، ص ۲۳۰ تا ۲۳۳

فنون لطیفہ

احمد رسول خان	جمالیات — سائنس اور فلسفہ کی روشنی میں	نگار پاکستان، ص ۶ تا ۱۳، ستمبر
"	" " " "	" ۹ تا ۱۳، اکتوبر
ادیب سہیل	مشرقی پاکستان میں مصوری کا ارتقاء	امروز، ص ۱۳، ۱۳ اگست
"	میڈرک کالج ڈھاکہ	" " ۹ جولائی
ثریا خورشید	مغلیہ دور کی مصوری	سیارہ ڈائجسٹ، ص ۵۲ تا ۶۰، جو
ضیاء السلیم بلگرامی	علم موسیقی کا ایک ماہر — ابوالحسن علی بن نافع	جنگ، ص ۴، ۲۵ ستمبر
فیروز نظامی	سر اور ان کی حقیقت — سروں کی دو قسمیں	تخلیق، ص ۱۳ تا ۱۹
فیض، فیض احمد	علی امام کی مصوری	ماہ نو، ص ۳۳ تا ۳۶، جولائی
کلیم اختر	سید محمود خالد — ایک منفرد مصور	قندیل، ص ۲۰، ۲۴ دسمبر
منو بھائی	مسعود کوہاری اور اس کا فن	اخبار جہاں، ص ۱۳، ۲۸ دسمبر
———	سیٹھ صاحب (ایک آرٹسٹ)	ہمدرد ڈائجسٹ، ص ۱۵، نومبر

[1] فلسفہ ویدانت کے سلسلے میں ایک خط کا جواب

انجمن کی نئی مطبوعات

جو عنقریب شائع ہو رہی ہیں

۱ ۔ مقاماتِ ناصری ۔ میر ناصر علی کے انشائیوں کا مجموعہ — مرتبہ انصار ناصری
۲ ۔ تذکرہ عروس الاذکار ۔ مصنفہ نصیر الدین نقش — مرتبہ افسر امروہوی
۳ ۔ شمالی ہند کی نثری داستانیں (نظر ثانی شدہ ایڈیشن) — ڈاکٹر گیان چند
۴ ۔ شمالی ہند کی منظوم داستانیں — ڈاکٹر فرمان فتحپوری
۵ ۔ اشاریہ اردو ۔ رسالہ "اردو" کے چالیس سالہ شماروں کا اشاریہ
۶ ۔ لغت کبیر اردو (جلد اول) — بابائے اردو مرحوم
۷ ۔ انگریزی ادب کی تاریخ — ڈاکٹر احسن فاروقی
۸ ۔ تاریخ سلطنت مسلمان روس — مزمل حسین ۔
۹ ۔ اردو سٹیج — جلد چہارم — ڈاکٹر عبدالعلیم نامی
۱۰ ۔ تذکرہ ہمیشہ بہار ۔ مصنفہ کشن چند اخلاص ۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ

کراچی ۱



آپ کے اور
آفتاب کے مابین!
جب آپ لُو اور گرمی کے ہاتھوں پریشان، پژمردہ
اور بے جان ہوں تو رُوح افزا کے ایک گلاس سے تسکین،
تازگی اور فرحت حاصل کیجئے - یہ ایک صحت بخش مشروب
ہے جو آپ کو گرمی کے مُضر اثرات سے بچاتا ہے اور لُو لگنے
سے محفوظ رکھتا ہے - اسکے استعمال
سے آپکو فرحت اور تازگی کا احساس ہوگا۔
کوئی اور مشروب اس کا مقابل نہیں۔
رُوح افزا
مشروب مشرق
ہمدرد
SHARBAT
ROOH AFZA
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ
اب بآسانی دستیاب ہے
M R A 10/1089
UNITED

"غالباً کوئی دوسری ایئرلائن ایسی نہیں جو ایک نئے ملک کی تعمیر و ترقی میں اتنی بھرپور امداد دینے میں پی آئی اے کا مقابلہ کر سکے"

— اینڈریو ولسن
ڈیفنس اور ایوی ایشن کارسپانڈنٹ
اخبار "آبزرور" لندن

وہ اپنے حالیہ شائع شدہ مضمون میں کہتے ہیں: "پی آئی اے کے موجودہ ہوائی بیڑے کے نقطۂ نظر سے ہمیں صرف اس کی وسعت پر حیرت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کس طرح اس نے ہمیشہ قابل اعتماد آرام دہ اور اعلیٰ کارکردگی کے طیاروں کے حصول میں برابر کوشش کی ہے جو مختلف پروازوں میں استعمال کئے جا سکیں۔"

"ایک طرف تو پی آئی اے نے اندرونی اور بین الاقوامی پروازوں کا جال بچھا کر ملک کے مواصلاتی نظام کی ترقی میں مدد دی تو دوسری طرف اس نے ملک کی ٹیکنالوجی کے لئے بھی ایک بنیاد ڈال کر اتنی ہی اہم خدمت انجام دی ہے۔"

"اس کی کارکردگی کی سب سے نمایاں مثال کراچی ایئرپورٹ پر انجینیرنگ کا کارخانہ ہے جہاں گرد و غبار سے محفوظ ایئر کنڈیشنڈ ورکشاپ میں عظیم جیٹ ٹربائن سے لیکر چھوٹے الیکٹرونک پرزوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے جن پر جدید طیاروں کے تحفظ کا انحصار ہے۔"

"اور اسی طرح پی آئی اے نے جدید میٹیریل تکنیک کی بھی نئی بنا ڈالی ہے۔"

"اگر یہ سچ ہے کہ ترقی یافتہ مواصلاتی نظام سیاسی اور جغرافیائی بندشوں کو توڑ دیتے ہیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ پی آئی اے اور پاکستان نے اس امر کی سچائی کو منوا لیا ہے۔"



PIA پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز

QAOMI ZABAN

مدیر : مشفق خواجہ

عبد مصلح الدین صدیقی نے [illegible] پریس سے شائع ہوا ۔